فتاویٰ عثمانی
جلد سوم
حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم
ترتیب وتخریج
مکتبہ معارف القرآن کراچی

پینتالیس سالہ خود نوشتہ فتاویٰ کا مجموعہ

جلد سوم

کتاب الشرکۃ والمضاربۃ کتاب البیوع کتاب الربا والقمار والتامین کتاب الاجارۃ کتاب الرہن کتاب الھبۃ
کتاب الودیعۃ والعاریۃ کتاب للقطہ کتاب الغصب والضمان کتاب الجہاد کتاب الامارۃ والسیاسۃ
کتاب الدعویٰ والشہادات والقضاء کتاب الحدود کتاب الجنایات کتاب الصلح کتاب الوکالۃ کتاب القسمۃ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ترتیب وتخریج

مولانا محمد زبیر حق نواز

استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی

مکتبہ معارف القرآن کراچی

(Quranic Studies Publishers)

باہتمام : خضر اشفاق قاسمی

طبع جدید : رجب ۱۴۳۱ھ، جولائی 2010ء

مطبع : احمد برادرز پرنٹرز، کراچی۔

ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

فون : (021) 35031565,35031566

ویب سائٹ : www.onlineshariah.com
www.quranicpublishers.com

ای میل : info@quranicpublishers.com

ملنے کے پتے:

❁
(Quranic Studies Publishers)
فون: 35031565,35031566

فون: 35049733,35032020

اِجمالی فہرست

فہرستِ موضوعات فتاویٰ عثمانی جلد سوم	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی أحكام السّندات الماليّة والصّكوك والأوراق الماليّة﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات　　صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی أحکام البنوک﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی البطاقات وأحکامها﴾

﴿کتاب الإجارة﴾

﴿فصل فی نفس الإجارة﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی إجارة الأرض والأشجار والحیوان﴾

﴿فصل فی نفس الأجرة﴾

﴿فصل فی الإجارة علی المعاصی﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

﴿کتاب الرّهن﴾

﴿کتاب الهبة﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

﴿کتاب الودیعة والعاریة﴾

﴿کتاب اللّقطة﴾

﴿کتاب الغصب والضمان﴾

موضوعات | صفحہ نمبر

﴿کتاب الجهاد﴾

﴿کتاب الامارة والسياسة﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب الدّعویٰ والشهادات والقضاء﴾

موضوعات | صفحہ نمبر

﴿کتاب الحدود﴾

﴿فصل فی القصاص والدّیات﴾

﴿فصل فی التّعزیر﴾

موضوعات صفحہ نمبر

***

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہ وأصحابہ أجمعین، وعلیٰ کل من تبعھم باحسان إلیٰ یوم الدین

امابعد.

فتاویٰ عثمانی کی تیسری جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ جیسا کہ پہلی جلد کے شروع میں میں نے عرض کیا تھا، اگرچہ بزرگوں کے اِرشاد کی تعمیل میں فتویٰ نویسی کی خدمت عمر کے بالکل ابتدائی دور ہی میں شروع کردی تھی، اور مشاغل کے ہجوم کے باوجود اَب تک جاری ہے، لیکن یہ اِحساس ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ یہ بڑی نازک اور پُرخطر ذمہ داری ہے، اور اللہ تعالیٰ کی توفیق اور بزرگوں کی دُعائیں شاملِ حال نہ ہوں، تو اِنسان اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

یہ تیسری جلد بطورِ خاص ایسے مسائل پر مشتمل ہے جن کا تعلق زیادہ تر معاملات سے ہے۔ اور ہمارے دور میں معاملات کی ایسی نئی اور پیچیدہ صورتیں سامنے آگئی ہیں کہ بسااوقات اُن کا صریح حکم فقہ کی قدیم کتابوں میں نہیں ملتا، اس لئے فتویٰ کی ذمہ داری اور زیادہ مشکل اور نازک ہوجاتی ہے، کیونکہ ان مسائل میں فقہی اُصولوں کو صورتِ مسئلہ پر منطبق کرنے کے لئے فقہی نظائر سے حکم مستنبط کرنا پڑتا ہے۔ اس اِستنباط میں غلطی کا اِمکان بھی ہے، اور آراء کے اِختلاف کی بھی گنجائش رہتی ہے۔ بعض اوقات ایک ہی مسئلے کی کئی جہتیں ہوتی ہیں، اور ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینی پڑتی ہے۔ اس لئے یہ فتاویٰ لکھتے وقت اگرچہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اپنی بساط کے مطابق پوری تحقیق سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن بہرصورت! یہ ایک بشری کاوِش ہے، اور کاوِش بھی ایک ایسے شخص کی جسے اپنی کم علمی اور بے مایگی کا اِحساس ہے۔ اس لئے اسے اس توقع پر شائع کرنے کی اجازت دی ہے کہ اِن شاء اللہ وہ اہلِ علم کی نظر سے گذرے گی تو یا اُس کی تصدیق ہوجائے گی، یا کوئی غلطی ہوئی ہوتو اُس

پر متنبہ ہونے کا موقع مل جائے گا۔ میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر اَدا کروں کم ہے کہ فتاویٰ عثمانی کی پہلی دو جلدوں کو بہت سے اہلِ علم وفتویٰ نے محبت کی نظر سے دیکھا ہے، اور ان میں سے کچھ حضرات نے اُس کی بعض فروگذاشتوں پر بھی متنبہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ایسے اُمور کی تصحیح نئے ایڈیشنوں میں کردی گئی ہے، اور جہاں ضروری سمجھا گیا، اس کا اِعلان ماہنامہ ''البلاغ'' میں بھی شائع کردیا گیا ہے۔ اس تیسری جلد کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ حضرات اہلِ علم اُس کو بھی اپنی شفقتوں سے محروم نہیں فرمائیں گے۔

عزیز گرامی قدر مولانا محمد زبیر حق نواز صاحب نے اس جلد کی ترتیب وتہذیب اور تیاری میں بطورِ خاص جس عرق ریزی کا مظاہرہ کیا ہے، اور جس قابلیت اور سلیقے کے ساتھ اُسے پیش کیا ہے، اُس کو خراجِ تحسین پیش نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی۔ مختلف رجسٹروں، کاپیوں اور فائلوں سے فتاویٰ کا اِنتخاب کرکے اُن کی ترتیب کے ساتھ تخریج اور تعلیق میں انہوں نے غیر معمولی محنت اُٹھائی ہے، جس کا قارئین کو جزوی اندازہ ضرور ہوجائے گا، لیکن وہ اُن کی حقیقی محنت سے یقیناً بہت کم ہوگا۔ اُن کے لئے میں یہ دُعا ہی کرسکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُن کی عمر، اُن کے علم اور عمل میں ظاہری وباطنی ترقیات عطا فرمائیں، اور ان کو صدق واِخلاص کے ساتھ دِین کی خدمت کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

اگر اس کتاب کے کسی حصے سے کسی کو فائدہ پہنچے تو یہ محض اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم ہے، اور اُن سے میری درخواست ہے کہ وہ اس ناکارہ کو حیاً ومیتاً اپنی دُعاؤں میں یاد فرمالیں۔ **جزاھم اللہ تعالیٰ خیرًا. وما توفیقی إلّا باللہ العلیّ العظیم۔**

بندہ
محمد تقی عثمانی عفا اللہ تعالیٰ عنہ
دار العلوم کراچی

۵؍جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مرتب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی، اَمَّا بَعْدُ:

تقریباً تین سال پہلے حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کی دو جلدیں منظرِ عام پر آئیں جو ”کتاب الإیمان و العقائد“ سے ”کتاب الطلاق“ تک کے ابواب پر مشتمل تھیں۔ اب الحمدللہ ”فقہ المعاملات“ سے متعلق تیسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے جو ”کتاب الشرکۃ والمضاربۃ“ سے لے کر ”کتاب القسمۃ“ تک کے ابواب پر مشتمل ہے، اس جلد میں درج ذیل ابواب سے متعلق مسائل ہیں:-

کتاب الشرکۃ والمضاربۃ، کتاب البیوع، کتاب الربا والقمار والتأمین، کتاب الإجارۃ، کتاب الرھن، کتاب الھبۃ، کتاب الودیعۃ والعاریۃ، کتاب اللقطۃ، کتاب الغصب والضمان، کتاب الجھاد، کتاب الامارۃ والسیاسۃ، کتاب الدعویٰ والشھادات والقضاء، کتاب الحدود، کتاب الجنایات، کتاب الصلح، کتاب الوکالۃ، کتاب القسمۃ.

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ والا دامت برکاتہم کو علمی دُنیا میں جو اِمتیازی شان عطا فرمائی ہے، خصوصاً حدیث، فقہ اور فتویٰ کے میدان میں جو مقامِ بلند عطا فرمایا ہے اس کی بنا پر توقعات سے بڑھ کر بحمداللہ ان فتاویٰ کو اہلِ علم اور اَربابِ فتویٰ میں غیرمعمولی مقبولیت حاصل ہوئی، اور چونکہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے قلم میں خداداد کشش اور اَندازِ بیان نہایت آسان و دِلنشیں ہے اس لئے پچھلی دونوں جلدیں اہلِ فتویٰ کے علاوہ عوام الناس میں بھی نہایت مقبول ہوئیں۔ چنانچہ پچھلی جلدوں کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ان کے کئی ایڈیشنوں کی اشاعت، ان کی مانگ میں مسلسل اِضافہ اور مختلف زبانوں میں ترجمے کی درخواستوں سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے بلکہ اطلاع کے مطابق انگلش اور بنگلہ زبانوں میں اس کا ترجمہ جاری ہے اور حال ہی میں پشتو میں ترجمہ ہوکر یہ جلدیں منظرِ عام پر آگئی ہیں۔ اُردودان

عوامی طبقے میں بھی اس کتاب نے دیگر کتبِ فتاویٰ کی نسبت اِمتیازی حیثیت حاصل کی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کے سامنے جو حضرت کی شخصیت سے واقف ہو ان فتاویٰ کی اِشاعت کا ذِکر ہوتا ہے تو وہ نہایت بے چینی سے کتاب کے حصول کا متلاشی بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کتبِ تفسیر میں جس طرح حضرت کے عظیم اور جلیل القدر والد ماجد مفتیٔ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی معرکۃ الآراء تفسیر ''معارف القرآن'' کو بلندی اور مقبولیت عطا فرمائی ہے، اسی طرح کتبِ فتاویٰ میں ''فتاویٰ عثمانی'' کو بھی عوام وخواص میں ایسی ہی مقبولیتِ عامہ عطا فرمائی ہے، فللّٰہ الحمد ولہ الشکر۔

ایسی صورتِ حال میں بجاطور پر اَحباب کا اِصرار تھا کہ اگلی جلد فوری طور پر منظرِ عام پر آنی چاہئے، ان کا اِصرار اس وجہ سے بھی زیادہ تھا کہ یہ جلد معاملات سے متعلق مسائل پر مشتمل ہے جو حضرتِ والا دامت برکاتہم کا خصوصی میدان ہے، اور اس کی ضرورت بھی زیادہ پیش آتی ہے، نیز بندہ کی اپنی خواہش بھی یہی تھی کہ تیسری جلد حتی الامکان جلد تکمیل پذیر ہو، مگر بندہ کی کمزوری کے علاوہ ایک اہم سبب اس کی تاخیر کا یہ بھی تھا کہ یہ جلد فقہ المعاملات پر مشتمل تھی جس پر تحقیق وتخریج کا کام بقیہ حصوں کے مقابلے میں نسبتاً دُشوار اور زیادہ توجہ طلب تھا، خصوصاً جدید فقہی مسائل کی تخریج میں اُصولِ فتویٰ کے مطابق اوّلاً تو اس کا صریح جزئیہ اور حوالہ تلاش کیا جاتا ہے، ورنہ قریب ترین نظیر یا قدیم مثال سے استیناس کرنا پڑتا ہے، اور آخری درجے میں اُصولی عبارات سے مسئلے کا حل نکالا جاتا ہے، نیز محض حوالہ جات کے اِعتبار سے ہی نہیں بلکہ مسئلے کے عنوان، ابواب کی ترتیب، موضوعات کی تقدیم وتاخیر، غرض ہر پہلو سے اس جلد کے کام کا پہلی جلدوں کے مقابلے میں زیادہ ہونا ناگزیر تھا، تاہم اس کے باوجود بندہ اسے اپنی کمزوری قرار دیتے ہوئے اس تاخیر پر معذرت خواہ ہے، اب اِن شاء اللہ چوتھی جلد توقع سے پہلے منظرِ عام پر لاکر اس تاخیر کے اِزالے کی کوشش کی جائے گی۔

فتاویٰ کی دیگر جلدوں کے مقابلے میں اس جلد کو اس اِعتبار سے اِمتیاز حاصل ہے کہ یہ حصہ فقہ المعاملات سے متعلق ہے جو حضرتِ والا دامت برکاتہم کا خصوصی موضوع اور میدان ہے، اور ایک بزرگ کے بقول اس باب میں اللہ تعالیٰ نے حضرتِ والا دامت برکاتہم کو اپنے وقت کا ''اِمام محمدؒ'' بنایا ہے۔ دُنیا بھر میں معاملات کے متعلق جدید فقہی مسائل کے حل کے لئے اُمت کی نظریں حضرتِ والا دامت برکاتہم کی طرف اُٹھتی ہیں اور مشرق ومغرب کے لوگ جدید مسائل کے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کے پاس سوالات بھیجتے اور حضرت کی رائے کے منتظر رہتے ہیں۔ اور عرب وعجم میں ہر بڑے علمی فورم پر جدید مسائل میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے کا خصوصی وزن محسوس کیا جاتا ہے، چنانچہ اب تک کتبِ فتاویٰ میں سب سے زیادہ جدید مسائل اس کتاب میں ذِکر کئے گئے ہیں۔

کتاب میں آنے والے فتاویٰ سے متعلق یہاں چند عمومی باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے جو صرف اس جلد سے متعلق نہیں بلکہ دیگر جلدوں سے بھی متعلق ہیں۔ ایک یہ کہ بعض سوالات کے جوابات میں قاری کو اِجمال واِختصار معلوم ہوتا ہے، قاری یہ سمجھتا ہے کہ اس کا جواب کسی قدر تفصیلی ہونا چاہئے تھا۔ یہاں قارئین پر یہ بات واضح ہو کہ ایسے مقامات پر اِختصار کی کئی وجوہات ہوتی ہیں، ان میں ایک اہم وجہ جو درحقیقت قارئین کے علم میں نہیں ہوتی، یہ ہے کہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے پاس بذریعہ ڈاک جو سوالات آتے ہیں، ان میں بسااوقات مستفتی ایک تفصیلی سوال نامہ بھیجتا ہے، جس میں سائل نے کئی سوالات پوچھے ہوتے ہیں، مگر سائل کا اصل مقصود کوئی ایک سوال ہوتا ہے، جس کی سائل نے مکمل تفصیل طلب کی ہوتی ہے، اور مستفتی کے باقی سوالات جو مختلف نوعیت اور مختلف ابواب سے متعلق ہوتے ہیں ضمنی ہوتے ہیں، جن کے متعلق وہ صرف جواز وعدمِ جواز جاننا چاہتا ہے، زیادہ تفصیل کا وہ طلب گار نہیں ہوتا، چنانچہ حضرتِ والا دامت برکاتہم سائل کے مقصودی اور مرکزی سوال کا تو تفصیلی جواب مرحمت فرماتے ہیں، اور اس کے مختلف النوع ضمنی وجزوی سوالات کا مختصر جواب عنایت فرماتے ہیں۔

اس کے بعد احقر ان مختلف النوع سوالات کو الگ الگ کرکے ہر سوال کو اس کے متعلقہ باب میں منتقل کرتا ہے، قارئین چونکہ سائل کے اصل سوال اور اصل حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں، اس لئے جب وہ کسی سوال کا کوئی مختصر جواب دیکھتے ہیں تو اِجمال محسوس کرتے ہیں، حالانکہ حقیقتاً وہ کسی تفصیلی سوال نامے کا کوئی ضمنی سوال ہوتا ہے جس کے جواب میں اس مقام پر حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اُصولِ فتویٰ کے مطابق ضروری اِختصار سے کام لیا ہے۔

ایک وضاحت یہ بھی ضروری ہے کہ اس مجموعے میں بہت سے فتاویٰ ایسے ہیں جو کافی عرصہ تقریباً چالیس پچاس سال پہلے لکھے گئے تھے، اور اس عرصے میں بعض مسائل میں چونکہ تحقیق بدل گئی ہے، اس لئے کئی فتاویٰ میں حضرتِ والا دامت برکاتہم نے نظرِ ثانی کے دوران مناسب مقامات پر تبدیلی فرمادی ہے، تاہم اس کے باوجود اگر کہیں نفسِ مضمون یا فتویٰ یا حوالہ وغیرہ میں کوئی غلطی ہو تو اس کی ذمہ داری بندۂ ناچیز پر ہے، حضرتِ والا کی ذات اس سے مستثنیٰ ہے۔

نیز ایک بات یہ بھی ذِکر کرنا ضروری ہے جس کی طرف پہلی جلد میں اِشارہ کیا گیا تھا، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ والا دامت برکاتہم سے جو علمی وتحقیق کام لیا ہے، خصوصاً فقہ وفتویٰ کے میدان میں حضرت کی تحقیقات اور فتاویٰ کا کام اتنا ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے کہ اسے منضبط کرنا مشکل ہے، اس لئے اس جلد کے بعد چوتھی جلد بھی بحمداللہ تیاری کے مراحل میں ہے، اور بہت جلد اِن شاء اللہ منصۂ شہود پر

جلوہ گر ہوگی، تاہم چوتھی جلد کی اِشاعت کے بعد بھی یہ کہنا دُرست نہیں ہوگا کہ اس مجموعے میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے تمام فتاویٰ آگئے ہیں، بلکہ جیسا کہ پہلے ذِکر کیا گیا تھا کہ ''فتاویٰ عثمانی'' دراصل حضرت کے ان فتاویٰ کے مجموعے کا نام ہے جو دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کے رجسٹروں میں محفوظ ہوئے ہیں، جبکہ بعض فتاویٰ اِبتداء میں نقل وحفاظت کا اِنتظام نہ ہونے کی وجہ سے شاملِ اِشاعت نہیں ہوسکے، اور ایک بڑی تعداد ان فتاویٰ کی ہے جو حضرتِ والا دامت برکاتہم نے دُنیا بھر سے اُردو، انگریزی اور عربی میں آنے والے خطوط کے جوابات میں تحریر فرمائے، اور چونکہ خطوط کی نقل محفوظ رکھنے کا کوئی اِنتظام نہیں ہے اس لئے ایسے فتاویٰ بھی شاملِ اِشاعت نہیں ہوسکے۔ کچھ اہم نوعیت کے بعض خطوط محفوظ رکھے گئے ہیں، ان کو اگرچہ اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اسی طرح انٹرنیٹ پر بھی بذریعہ ای میل حضرت جوابات عطا فرماتے ہیں جو عموماً معاملات سے متعلق جدید اور اہم نوعیت کے ہوتے ہیں، وہ بھی اس مجموعے میں شامل نہیں ہیں، اسی طرح ''البلاغ'' انگلش میں بھی سوالات کے جوابات کا ایک مستقل سلسلہ ہے جو حضرتِ والا تحریر فرماتے ہیں، وہ فتاویٰ بھی اس میں شامل نہیں ہیں (البتہ انگریزی فتاویٰ کا ایک مجموعہ زیرِ طبع ہے)۔

بہرحال! اس مجموعے کی اشاعت کے بعد یہ سمجھنا کہ یہ حضرت کے تمام فتاویٰ ہیں، غلط ہوگا، بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی مجموعوں کی گنجائش ہے، ہماری دُعا ہے اور قارئین سے بھی اس خصوصی دُعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرتِ والا کو بعافیت عمرِ دراز عطا فرمائیں اور حضرتِ والا دامت برکاتہم کا سایہ تادیر سلامتی کے ساتھ ہم پر قائم رکھیں تاکہ علوم وعرفان کا یہ سلسلہ چلتا رہے اور اُمت اسی طرح حضرتِ والا کی ذات سے اِستفادہ کرتی رہے۔

آخر میں قارئین سے درخواست ہے کہ اگر وہ حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کے ساتھ بندہ اور اس کے والدین واساتذہ کو بھی اپنی نیک دُعاؤں میں یاد رکھیں گے تو یہ ان کا اِحسانِ عظیم ہوگا۔

والسلام

محمد زبیر حق نواز

۲ر ربیع الاوّل ۱۴۳۱ھ

***

کتاب الشرکۃ والمضاربۃ

(شرکت ومضاربت (پارٹنرشپ اور سرمایہ کاری) کے مسائل)

۱:- پندرہ فیصد نفع، نقصان کی بنیاد پر ''شرکت'' کا حکم
۲:- مضاربت میں مضارب کے لئے نفع کا ایک حصہ اور تنخواہ مقرّر کرنے کا حکم

سوال:- عرض اینکہ کسی شخص کا سرمایہ بندہ اپنی تجارت میں لگا رہا ہے، اس شخص کو سرمایہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ نفع ونقصان کی ایک خاص نسبت کی بنیاد پر مثلاً پندرہ فیصد منافع اور پندرہ فیصد نقصان کی بنیاد پر اپنے ساتھ شریکِ تجارت کر رہا ہوں، کیا از رُوئے شریعت ایسا کرنا جائز ہے؟

۲:- ایک شخص کا صرف سرمایہ ہے، دُوسرے کی صرف محنت ہے سرمایہ نہیں، محنت والے شخص کو مثلاً ۳۰ فیصد فائدہ اور ایک فیصد خاص مقدار تنخواہ بھی دی جائے، جبکہ یہ محنت والا شخص نقصان میں شریک نہیں ہے، از رُوئے شریعت ایسا کرنا جائز ہے؟

اُمتی گل، افغان اسٹور
(ابوظبی، متحدہ عرب امارات)

جواب:- اگر آپ اس شخص سے یہ طے کریں کہ آپ کے اور میرے سرمائے سے تجارت کرنے کے بعد جو کچھ نفع ہوا اس نفع کا ۱۵ فیصد آپ کا ہوگا، تو یہ صورت جائز ہے۔[۱] البتہ نقصان کی صورت میں ۱۵ فیصد کا تعین اسی صورت میں جائز ہوگا جب اس کا لگایا ہوا سرمایہ تجارت کے کل سرمائے کا ۱۵ فیصد ہو۔ اگر اس کا لگایا ہوا سرمایہ کل تجارت کے سرمائے کے ۱۵ فیصد سے کم یا زیادہ ہے تو اس صورت میں اُسے ۱۵ فیصد نقصان میں شریک کرنے سے شرکت فاسد ہوجائے گی۔ اُصول یہ ہے کہ نفع کا تناسب تو شرکاء باہمی رضامندی سے جو چاہیں مقرّر کرسکتے ہیں، لیکن نقصان ہمیشہ سرمائے کے تناسب کے مطابق ہونا ضروری ہے، یعنی جس نے جتنا فی صد سرمایہ لگایا اتنا ہی فیصد نقصان بھی اُٹھائے۔[۲]

(۱و۲) وفی کنز العمّال ج:۱۵ رقم الحدیث:۴۰۴۸۲ ص:۱۷۶ الوضیعة علی المال والرّبح علی ما اصطلحوا علیه. وکذا فی مصنف ابن ابی شیبة ج:۵ ص:۴ رقم الحدیث:۱۰ ومصنف عبدالرّزاق ج:۸ ص:۲۴۷ رقم الحدیث:۱۵۰۸۵.

وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۶۲ (طبع سعید) والوضیعة علٰی قدر المالین متساویًا ومتفاضلًا لأنّ الوضیعة اسم لجزء هالک من المال فیتقدر بقدر المال. وفی فتح القدیر کتاب الشرکة، فصل ولا تنعقد الشرکة الخ، ج:۶ ص:۱۷۷ (طبع مصطفٰی بابی مصر) وفی طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه ج:۵ ص:۳۹۷ الربّح علٰی ما شرطا والوضیعة علٰی قدر المالین الخ. وکذا فی التاتارخانیة ج:۵ ص:۶۵۵ (طبع ادارة القرآن) والمحیط البرهانی ج:۶ ص:۴۰۱ (طبع غفاریه کوئٹه)، وعامة کتب الفقه.

۲:- یہ صورت جائز نہیں ہے، آپ یا تو اس کا نفع میں کچھ فیصد حصہ رکھیں، پھر تنخواہ مقرّر کرنا جائز نہیں[1]، کیونکہ یہ مضاربت ہوگی[2]، یا تنخواہ مقرّر کریں اور وہ متعین رقم ہو، نفع کا فی صد نہ ہو، نفع میں بحیثیت شریک حصہ دار کوئی فیصد حصہ مقرّر نہ کریں، اس صورت میں یہ اجارہ ہوگا، دونوں چیزوں کو جمع کرنا دُرست نہیں۔[3]

واللہ اعلم

۱۲/۷/۱۴۰۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۶۵/۳۹ و)

(شرکت ومضاربت سے متعلق چند اہم سوالات اوران کے جوابات)

۱:- نفع کی ایک مقرّر مقدار تک مضاربت ختم نہ کرنے کے معاہدے کا حکم

سوال:- دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا رَبّ المال مضارب سے یہ معاہدہ کرسکتا ہے کہ جب تک مضارب ایک لاکھ نفع نہ کمالے اس وقت تک مضاربت ختم کرنے کا اختیار نہیں ہوگا؟ اگر یہ معاہدہ کرلیا تو کیا اِس کا پورا کرنا لازم ہوگا یا نہیں؟

جواب:- جو شرط آپ نے لکھی ہے، اس کا جواز نظر نہیں آتا[4]، کیونکہ یہ غیرمحدود مدّت تک مضارب کو پابند کرنے کے مرادف ہے[5]، اور اس میں فی الجملہ رَبّ المال کے نفع کی ضمانت بھی ہے۔[6]

(۱ و ۲) وفی ردّ المحتار ج:۴ ص:۳۲۶ کتاب الشرکة فصل فی الشرکة الفاسدة مطلب یرجع القیاس الخ (طبع سعید). لا أجر للشریک فی العمل بالمشترک.

وفی النتف فی الفتاویٰ کتاب الاجارة اجارة الشریک شریکه ص:۳۴۹ (طبع سعید) ولو کان طعام بین رجلین فقال أحدهما لصاحبه احمله الی الموضع کذا ولک فی نصیبی من الأجر کذا، أو قال اطحنه ولک فی نصیبی کذا من الأجر، جاز ذٰلک فی قول زفر ومحمد بن صاحب ولا یجوز فی قول ابی حنیفة وأبی یوسف ومحمد رحمهم الله تعالیٰ.

(۳) وفی المعجم الأوسط للطبرانیّ ج:۲ ص:۱۶۹ (طبع دار الحرمین قاهرة) قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ثم لا تحلّ صفقتان فی صفقة. وفی مجمع الزوائد ج:۴ ص:۸۴ (طبع دار الرّیان للتراث قاهرة و دار الکتاب العربی بیروت) عن عبدالله بن مسعود رضی الله عنه قال: نهٰی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن صفقتین فی صفقة واحدة.

(۴ و ۵) وفی البدائع للکاسانی ج:۶ ص:۱۰۹ (طبع سعید) وأما صفة هٰذا العقد یعنی المضاربة فهو أنه عقد غیر لازم ولکل واحد منهما اعنی رب المال والمضارب الفسخ لٰکن عند وجود شرطه وهو علم صاحبه.

نیز مضاربت کی توقیت اور لزوم کی دوصورتوں اور ان کے حکم سے متعلق تفصیلی حوالہ جات کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة ج:۲ ص:۱۷۳ تا ۱۷۶ ملاحظہ فرمائیں۔

(۶) دیکھئے صفحہ:۴۲ و ۴۸ کے حواشی۔

۲:- فسخِ مضاربت کی صورت میں سارا مال رَبّ المال کے حوالے کرنے کے معاہدے کا حکم

سوال:- کیا رَبّ المال مضارب سے یہ معاہدہ کرسکتا ہے کہ اگر مضاربت ختم کرنے کا ارادہ ہوا تو مضارب سارا مال رَبّ المال کے حوالے کردے، اور رَبّ المال کی جگہ پر لے جاکر اس کی سیٹنگ کردے، اگر ایسا معاہدہ کرلیا ہو تو کیا مضارب پر اس کی پابندی ضروری ہے؟

جواب:- فسخِ مضاربت پر اگر رقم نقد ہو تو مضارب اسے واپس کرنے کا پابند ہے، نقد نہ ہو تو تنضیض کا[1]، البتہ اگر رَبّ المال عروض خریدنا چاہے تو جائز ہے،[2] اس صورت میں اگر قیمتِ خرید میں نفع ہو تو وہ بھی جانبین میں تقسیم ہوگا، پہلے سے یہ شرط کہ فسخ ہونے پر مال رَبّ المال کو بیچا جائے گا، عقدِ مضاربت میں نہیں لگائی جاسکتی، ہاں اگر عقد اس شرط سے خالی ہو، اور بعد میں مضارب وعدہ کرلے تو جائز ہے۔ البتہ مالِ مضاربت اگر عروض کی شکل میں ہو، اور ربح ظاہر ہوچکا ہو، اور مضارب ربّ المال سے یہ مطالبہ کرے کہ یہ مال میں خریدنا چاہتا ہوں تو رَبّ المال اِنکار نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اِمام طحاویؒ فرماتے ہیں:-

> وان كان في تلك العروض فضل أجبر المضارب على بيعها على المضاربة حتى يستوفي رب المال رأس ماله، ويكون الفضل ان كان،

---

(۱) وفي الهداية كتاب المضاربة فصل في العزل والقسمة ج:۳ ص: ۲۷۰ و ۲۷۱ (طبع مكتبه رحمانيه) وفي طبع سعيد ج:۳ ص: ۲۲۱ وأن كانا يقتسمان الرّبح والمضاربة بحالها ثم هلك المال بعضه أو كلّه ترادا الربح حتى يستوفي ربّ المال رأس المال لأنّ قسمة الرّبح لا تصحّ قبل استيفاء رأس المال لأنّه هو الأصل وهذا بناء عليه وتبع له.
وفي المبسوط للسرخسيّ: الرّبح لا يظهر ما لم يسلم جميع رأس المال لربّ المال لأنّ الرّبح اسم للفضل فما لم يحصل ما هو الأصل لربّ المال لا يظهر الفضل فقال صلى الله عليه وسلم مثل المؤمن كمثل التاجر لا تخلص لهُ نوافله ما لم تخلص لهُ فرائضه فالتّاجر لا يسلم له الرّبح حتّى يسلم له رأس ماله .... الخ.
وفي بدائع الصنائع ج:٦ ص:۱۰۷ وانّما يظهر الرّبح بالقسمة وشرط جواز القسمة قبض رأس المال فلا تصحّ قسمة الرّبح قبل قبض رأس المال .... الخ.
دیگر ائمہ کے نزدیک بھی فسخ مضاربت پر نفع کی حتمی تقسیم کے لئے سرمایہ اور اثاثے کو نقد میں تبدیل کرنا ضروری ہے، دیکھئے: منهاج الطالبين ص: ۱۵، والشرح الصغير على اقرب المسالك ج:۳ ص: ۷۰۰ لعلّامه احمد الدردير المالكيؒ و المغني لابن قدامة ج: ۵ ص: ۳۳ (طبع دار الفكر)۔

(۲) وفي بدائع الصنائع ج:٦ ص: ۱۰۱ (طبع سعيد) ويجوز شراء ربّ المال من المضارب وشراء المضارب من ربّ المال وان لم يكن في المضاربة ربح في قول أصحابنا الثلاثة، وقال زفر لا يجوز الشراء بينهما في مال المضاربة وجه قول زفر ان هذا بيع ماله بماله .... ولنا أنّ لربّ المال في مال المضاربة ملك رقبة لا ملك تصرّف وملكه في حقّ التّصرّف كملك الأجنبي وللمضارب فيه ملك التصرّف لا الرقبة فكان في حق ملك الرقبة كملك الأجنبي حتّى لا يملك ربّ المال منعه عن التّصرف فكان مال المضاربة في حق كل واحد منهما كمال الأجنبي لذلك جاز الشراء بينهما .... الخ.
وفي الهندية الباب الرّابع (المضاربة) إذا باع ربّ المال مال المضاربة من المضارب أو باعه المضارب من ربّ المال فهو جائز سواء كان في المال فضل على راس المال أو لم يكن.

بینهما علٰى ما أشترطا، إلّا أن يشاء المضارب أن يعطى رَبّ المال رأس ماله وحصته من الربح ويحبس العروض بنفسه فلا يكون لربّ المال الامتناع عنه. (الشروط الصغير للطحاوى ج:۲ ص:۷۳۱ طبع بغداد)[۱]

جہاں تک سیٹنگ کی شرط کا تعلق ہے وہ اموالِ مبیعہ کی حالت پر موقوف ہے، اگر اموال ایسے ہیں جن میں گھر پر لے جا کر سیٹ کرنا تجار میں متعارف ہے، تو یہ شرط جائز ہے، ورنہ فاسد۔

۳:- نقدی کے بجائے ''مضاربت بالعروض'' کا حکم

سوال:- اگر ربّ المال نقدی کی بجائے عروض (سامان) مضارب کو دیتا ہے تو کیا اس طرح مضاربت دُرست ہے؟

جواب:- حنفیہ اور جمہور کے نزدیک مضاربت بالعروض دُرست نہیں،[۲] اِلَّا یہ کہ انہیں بیچ کر نقد بنالیا جائے، البتہ اِمام احمدؒ کی ایک روایت میں جائز ہے،[۳] اور وقتِ عقد کی قیمت کو رأس مال المضاربہ قرار دیا جائے گا۔[۴] (الانصاف للمرداوی ج:۵ ص:۴۰۹)۔[۵] حاجت کے وقت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے شرکۃ بالعروض میں مالکیہ کا قول[۶] اختیار کرنے کی گنجائش دی ہے۔ (امداد الفتاویٰ

---

(۱) وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۲۲ ص:۶۷ طبع مکتبہ غفاریہ کوئٹہ (باب نفقة المضارب) واذا اشترى المضارب بمال المضاربة متاعًا وفيه فضل أو لا فضل فيه فأراد المضارب أن يمسكهُ حتّى يجد به ربحًا كثيرًا وأراد ربّ المال أن يبيعهُ فان كان لا فضل فيه أجبر المضارب على أن يبيعه أو يعطيه ربّ المال برأس ماله لأنّهُ لاحق للمضارب في المال في الحال فهو يريد أن يحول بين ربّ المال وبين ماله بحقٍ موهومٍ ...... وان كان فيه فضل وكان رأس المال ألفًا والمتاع يساوى ألفين فالمضارب يجبر على بيعه لأنّ في تاخيره حيلولة بين ربّ المال وبين ماله وهو لم يرض بذٰلك حين عاقدهُ عقد المضاربة إلّا أن للمضارب هنا أن يعطى ربّ المال ثلثة أرباع المتاع برأس ماله وحصته من الرّبح ويمسك ربع المتاع وحصته من الربح وليس لربّ المال أن يأبى ذٰلك عليه لأنّ الربح حق والانسان لا يجبر على بيع ملك نفسه لتحصيل مقصوده. (محمد زبیر حق نواز)

(۲) وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۵۹ لا تصحّ الشركة في العروض. وفيه أيضًا معنى الوكالة من لوازم الشركة والوكالة التى يتضمنها الشركة لا تصحّ في العروض .... الخ. وكذا في المبسوط للسرخسيّ ج:۱۱ ص:۱۵۹.

وفي مجلّة الأحكام ج:۴ ص:۱۳۳۲ (طبع نور محمد كتب خانه) لا تصحّ الشركة على الأموال الّتى ليست معهودة من النقود كالعروض والعقار أى لا تجوز أن تكون هٰذه رأس مال للشركة.

(۳و۴) وفي المغني لابن قدامة ج:۵ ص:۱۰ و ۱۱ (طبع دارالفكر بيروت) فأمّا العروض فلا تجوز الشركة فيها فى ظاهر المذهب نصّ عليه أحمد. .... وعن أحمد رواية أُخرىٰ أنّ الشركة والمضاربة تجوز بالعروض وتجعل قيمتها وقت العقد رأس المال، قال أحمد اذا اشتركا في العروض يقسم الرّبح على ما اشترطا.

(۵) كتاب الشركة (طبع مكتبة علمية) فعلى الرّواية الثانية ويجعل رأس المال قيمتها وقت العقد ... الخ.

(۶) وفي الشرح الصغير على أقرب المسالك للدّردير ج:۳ ص:۴۵۹ وتصحّ (بعين) من جانب (وبعرض) من الأخر (بعرضين) من كلّ جانب عرض (مطلقًا) اتفقا جنسًا أو اختلفا كعبد وحمار أو ثوب.

وفي المغني لابن قدامة ج:۵ ص:۱۱ (طبع دارالفكر) ..... مقصود الشركة جواز تصرفهما في المالين جميعًا وكون ربح المالين بينهما وهٰذا يحصل في العروض كحصوله في الأثمان فيجب أن تصحّ الشركة والمضاربة بها كالأثمان.

ج:۳ ص:۴۹۵)۔[۱] یہ گنجائش یہاں بھی ہوسکتی ہے۔[۲]

۴:- مضارب کے لئے فسخِ مضاربت کے وقت رَبّ المال کے بجائے کسی اور کو مال فروخت کرنے کا حکم

سوال:- مضاربت ختم کرنے کا ارادہ ہوا تو رَبّ المال نے کہا: ''سارا مال مجھ کو فروخت کردو'' مگر مضارب کہتا ہے کہ: ''میں آپ کو نہیں دوں گا بلکہ میں اپنے فلاں دوست کو فروخت کروں گا'' تو کیا مضارب کو اس کا اختیار ہے کہ رَبّ المال کے بجائے اپنے دوست کو فروخت کرے؟

جواب:- اگر مضارب کا دوست زیادہ قیمت دے رہا ہو تو یقیناً وہ مقدم ہے، لیکن اگر قیمت دونوں برابر دینا چاہتے ہوں تو اس کا صریح جزئیہ تو یاد نہیں، لیکن قاعدے کا تقاضا یہ ہے کہ رَبّ المال اسے مجبور نہ کرسکے، کیونکہ مالِ مضاربت میں حقِ تصرف کلیۃً مضارب کو حاصل ہوتا ہے،[۳] رَبّ المال کو مداخلت کا حق نہیں ہوتا،[۴] اگرچہ دُوسری جہت یہ ہے کہ رَبّ المال کو ابتدائی ملکِ رقبہ حاصل ہونے کی بنا پر ترجیح دی جائے، لیکن بظاہر یہ محض اخلاقی ترجیح ہے، قضاءً اس پر مجبور کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

۵:- شرکت ومضاربت اِکٹھے کرنے کی صورت میں دونوں کا نفع اِکٹھا فیصد کے طور پر مقرّر کرنے کا حکم

سوال:- اگر ایک شخص دُوسرے کے ساتھ شرکت اور مضاربت دونوں معاملات اِکٹھے کرنا چاہتا ہے تو دونوں معاملات کا نفع اِکٹھے فیصد میں متعین ہوسکتا ہے؟ مثلاً ایک نے دُوسرے کو لاکھ روپیہ بطور شرکت اور لاکھ روپیہ بطور مضاربت دیا اور کہا کہ: ''مجموعی طور پر جو نفع ہو اس کا ۴۰ فیصد دینا'' تو کیا اس طرح دُرست ہے؟

---

(۱) طبع مکتبہ دار العلوم کراچی.

(۲) جیسا کہ المغنی لابن قدامۃ میں شرکت کے ساتھ مضاربت بالعروض کے جواز کی بھی صراحت کی گئی ہے۔
وفی المغنی لابن قدامۃ ج:۵ ص:۱۱ (طبع دارالفکر) .... مقصود الشرکۃ جواز تصرفهما فی المالین جمیعًا وکون ربح المالین بینهما وهذا یحصل فی العروض کحصوله فی الأثمان فیجب أن تصح الشرکۃ والمضاربۃ بها کالأثمان.
نیز جس مال سے شرکت جائز ہے اس سے مضاربت بھی جائز ہے، کما فی الهدایۃ ج:۳ ص:۲۱۳ طبع سعید وفی طبع مکتبہ رحمانیہ ج:۳ ص:۲۶۳ ولا تصحّ إلّا بالمال الّذی تصح به الشرکۃ .... الخ.

(۳ و ۴) وفی الهدایۃ ج:۳ ص:۲۱۴ (طبع سعید) واذا صحت المضاربۃ مطلقۃ جاز للمضارب أن یبیع ویشتری ویوکل ویسافر ویبضع ویودع. وفیها أیضًا قبلها ج:۳ ص:۲۱۴ (طبع سعید) ولا بدّ أن یکون المال مسلمًا الی المضارب ولا ید لربّ المال فیه .... الخ.

جواب:- یہ صورت اسی وقت متصوّر ہوسکتی ہے جب مضارب بھی اپنا سرمایہ لگا رہا ہو، لہٰذا اگر مجموعی کاروبار ایک ہی ہے تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ دو لاکھ بطور مضاربت دیئے اور مضارب کو اپنا سرمایہ لگانے کی اجازت دی[1]، اس صورت میں شرط صرف یہ ہے کہ رَبّ المال کا حصۂ نفع مالِ شرکت میں اس کے رأس المال کے تناسب سے زائد نہ ہو، لہٰذا چالیس فیصد نفع کا جواز اس بات پر موقوف ہے کہ مضارب اپنی طرف سے کتنا سرمایہ لگا رہا ہے؟ کیونکہ شرط عدم العمل کی صورت میں شریک اپنے رأس المال کے تناسب سے زیادہ حصہ متعین نہیں کرسکتا، وراجع البدائع[2]۔ ایسی صورت میں نفع کی تقسیم کے طریقے پر بندے نے اپنی اس انگریزی کتاب میں بحث کی ہے جس کا ترجمہ مولانا زاہد صاحب نے ''اسلامی بینکاری کے اُصول'' کے نام سے کیا ہے۔

۶:- ایک شریک بغیر عمل کے پانچ لاکھ روپے دُوسرا ایک لاکھ بمع عمل شرکت کریں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- دو شخص شرکت کا معاملہ اس طرح کرتے ہیں کہ ایک شخص ۵ لاکھ روپیہ دے گا لیکن کام نہیں کرے گا، اور دُوسرا ایک ہزار روپیہ دے گا لیکن ساتھ کام بھی کرے گا، لیکن نفع دونوں میں نصف نصف تقسیم ہوگا، تو کیا اس طرح دُرست ہے؟ اگر دُرست ہے تو اس میں اور مضاربت میں کیا فرق ہوگا؟ بندے کے خیال میں صرف دو فرق ہیں، ۱- کام کرنے والا $\frac{1}{500}$ نقصان بھی برداشت کرے گا، ۲- مال خریدنے کے بعد اس کی مالیت میں اضافہ ہوا تو $\frac{1}{500}$ کے بقدر کام کرنے والا بھی شریک ہوگا۔ ان دو کے علاوہ کیا کچھ اور بھی فرق ہے؟

بندہ محمد عامر عفی عنہ

خادم جامعۃ الرشید، احسن آباد

جواب:- فرق نمبر۱ دُرست ہے[3]، نمبر۲ دُرست نہیں، کیونکہ کام کرنے والا نفع کے اضافے میں $\frac{1}{500}$ کے حساب سے نہیں بلکہ طے شدہ تناسب (یعنی نصف نصف) کے حساب سے شریک ہوگا[4]۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲ محرم الحرام ۱۴۲۶ھ

---

(۱) وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۲۲ ص:۱۳۳ خلط ألف المضاربة بألف من ماله قبل الشراء جاز.

(۲) بدائع الصنائع ج:۶ ص:۶۳ (طبع سعید).

(۳ و ۴) وفی مصنف عبدالرّزاق ج:۸ ص:۲۴۷ رقم الحدیث:۱۵۰۸۵ وکنز العمّال ج:۱۵ ص:۱۷۶ رقم الحدیث:۴۰۴۸۲ الوضیعة علی المال والرّبح علی ما اصطلحوا علیه وکذا فی مصنّف ابن أبی شیبة ج:۵ ص:۴ وفتح القدیر ج:۵ ص:۳۹۷.

کم سے کم ۵ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۲۰ فیصد منافع دینے والے ادارے ''صمد پراپرٹی انوسٹمنٹ'' میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- عرض یہ ہے کہ آج کل کراچی میں کاروباری ادارے عوام سے رقم لے کر اپنے کاروبار میں لگاتے ہیں، اور اس کے منافع عوام میں بھی تقسیم کر رہے ہیں، یہ ادارے پہلے سے مقرّر کردہ منافع بھی دیتے ہیں، جو کہ سود ہے۔ بعض ادارے باقاعدہ منافع کی تقسیم کر رہے ہیں جو ہر ماہ کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے اور ان کا کام تقریباً بینک جیسا ہے، جو عوام کا پیسہ لے کر مختلف کاروباروں میں لگاتے ہیں اور منافع کھاتہ داروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک ادارہ ''صمد پراپرٹی انوسٹمنٹ کارپوریشن'' ہے جو زمینوں، پلاٹوں اور مکانات وغیرہ کا کاروبار کرتا ہے، اس کا منافع بھی بڑھتا یا کم ہوتا رہتا ہے، جو کہ سود کی تعریف میں نہیں آتا۔ پچھلے دنوں انہوں نے مختلف مہینوں میں سات فیصد، ساڑھے آٹھ فیصد اور نو فیصد منافع بھی دیا ہے، لیکن ان کے ساتھ حصے میں لکھا ہوتا ہے کہ پانچ فیصد سے بیس فیصد تک منافع دیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ:

۱:- کم سے کم منافع پانچ فیصد مقرّر کرنے سے کیا یہ سود کی تعریف میں آئے گا؟ جبکہ منافع بہرحال کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے۔

۲:- زیادہ سے زیادہ بیس فیصد حد مقرّر کردینے سے کوئی شرعی قباحت تو نہیں؟

۳:- اس کاروبار کو جائز شرعی صورت دینے کے لئے معاہدے میں کیا تبدیلی کرنی ہوگی؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب:- اس قسم کے کاروبار کا جائز یا ناجائز ہونا اس کاروبار کے مفصل طریقِ کار پر موقوف ہے، صرف ایک آدھی بات دیکھ کر کوئی حتمی حکم لگانا دُرست نہیں، لہٰذا جس کاروبار کے بارے میں حکم معلوم کرنا ہو، اس کے طریقِ کار کی تفصیل لکھئے تب جواب دیا جاسکے گا۔

۱:- اگر معاہدے میں یہ طے کرلیا جائے کہ سرمایہ کا کم سے کم پانچ فیصد نفع ضرور دیا جائے گا

تب یہ سود ہے۔[۱]

۲:- زیادہ سے زیادہ نفع مقرر کرنے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، متعلقہ کاروبار کی تفصیل لکھیں تو جواب دیا جاسکے گا۔ یہ دونوں باتیں اس وقت ہوں جب معاہدے میں کم سے کم منافع کی شرح سرمائے کے تناسب سے طے کی گئی ہو، لیکن اگر معاہدہ یہ ہو کہ جو کچھ بھی منافع ہوگا اس منافع کا ۵ یا دس فیصد دیا جائے گا، اور اگر کچھ منافع نہ ہو تو کچھ نہ دیا جائے گا،[۲] لیکن ساتھ ہی سرمایہ لگانے والے کو یہ بتادیا گیا کہ عموماً اس کاروبار میں اتنے فیصد تک نفع ہوتا ہے، تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

واللہ اعلم
۱۴۰۷/۱۱/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸۵۶/۳۸ ه)

مشترک مالِ تجارت باہر سے منگوانے کی صورت میں اگر جہاز ڈوب جائے تو شریک سے نقصان کی تلافی کرانے کا حکم

سوال:- ہم نے ایک مال چائنا سے منگوایا تھا، اس مال میں ایک صاحب کی شراکت تھی، نفع نقصان آدھا آدھا، مال منگوانے میں پورا پیسہ ہم نے لگایا کیونکہ ہمارا اور اُن کا اس طرح شرکت کا مال آتا رہتا ہے کہ کبھی ہم نے منگوایا، کبھی انہوں نے منگوایا، کبھی پیسہ بعد میں ہم نے دے دیا، کبھی پیسہ

(۱ و ۲) وفی الهندیة ج:۲ ص:۳۰۲ (طبع رشیدیه کوئٹه) وأن یکون الرّبح معلوم القدر فان کان مجهولًا تفسد الشرکة وأن یکون الرّبح جزأً شائعًا فی الجملة لا معیّنًا فان عینا عشرة أو مائة أو نحو ذٰلک کانت الشرکة فاسدة.

وفی الهدایة ج:۲ ص:۶۱۱ (طبع مکتبه رحمانیه) ولا یجوز الشرکة اذا شرط لأحدهما دراهم مسماة من الرّبح لأنّه شرط یوجب انقطاع الشرکة فعساه لا یخرج اِلّا قدر المسمّی لأحدهما ونظیره فی المزارعة.

وفی مجمع الأنهر ج:۲ ص:۵۴۴ (طبع مکتبه غفاریه) ورکنها الایجاب والقبول وشرطها عدم ما یقطعها کشرط دراهم معیّنة من الرّبح لأحدهما.

وفی الدّر المنتقی مع مجمع الأنهر کتاب المضاربة ج:۳ ص:۴۴۶ (طبع مکتبه غفاریه کوئٹه) وکون الرّبح بینهما مشاعًا فتفسد ان شرط لأحدهما عشر دراهم مثلًا.

وفی تبیین الحقائق ج:۴ ص:۲۴۸ کتاب الشرکة (طبع سعید) وتفسد ان شرط لأحدهما دراهم مسمّاة من الرّبح لأنّه شرط یوجب انقطاع الشرکة فی بعض الوجوه فلعلّه لا یخرج الّا القدر المسمّٰی لأحدهما من الرّبح.

وکذا فی البحر الرائق ج:۵ ص:۱۷۷ (طبع سعید) وخلاصة الفتاویٰ ج:۴ ص:۲۹۴ (طبع امجد اکیڈمی لاهور)

وفی شرح المجلّة لسلیم رستم باز رقم المادّة:۱۳۳۷ ج:۲ ص:۷۱۳ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) یشترط أن تکون حصص الرّبح الّتی تنقسم بین الشرکاء جزأً شائعًا کالنّصف والثلث والربع فاذا اتفق الشرکاء علٰی اعطاء أحدهم قدرًا معیّنًا کانت الشرکة باطلة. وکذا فی شرح المجلّة للأتاسی ج:۴ ص:۲۶۱ (طبع مکتبه حبیبیه کوئٹه).

بعد میں انہوں نے دے دیا، بہرکیف دس بارہ سال سے کاروباری تعلقات ہیں، اور ایک دُوسرے کو ایک دُوسرے پر پورا بھروسہ ہے۔ یہ مال جس جہاز پر آرہا تھا وہ خداوند قدوس کی مرضی سے پورا کا پورا ڈُوب گیا، کیا ہم اس مال کی جس کی ہم نے ادائیگی پوری کی پوری کردی ہے اس کی آدھی رقم حمید صاحب سے جو نفع ونقصان میں شریک تھے لے سکتے ہیں؟

جواب:- اگر مال منگوانے سے پہلے شرکت کا یہ معاہدہ ہوچکا تھا کہ مال منگوانے میں دونوں فریق آدھا آدھا روپیہ لگائیں گے اور نفع ونقصان میں نصف نصف شریک ہوں گے، اور پھر مال اسی معاہدے کے تحت ان کے علم اور اِطلاع سے منگوایا گیا تھا، تو اس مال کے منگوانے میں جو رقم خرچ ہوئی آپ کے شریک اس کا نصف حصہ آپ کو دینے کے ذمے دار ہیں، خواہ مال وصول ہوا ہو یا ڈُوب گیا ہو۔ بدائع میں ہے:

"واختلاط الربح یوجد ون اشتری کل واحد بمال نفسه علٰی حدة، لأن الزیادة وهی الربح تحدث علی الشرکة ...... حتّٰی لو هلک بعد الشراء بأحدهما کان الهالک من المالین جمیعًا لأنه هلک بعد تمام العقد."

(بدائع ج:٦ ص:٦٠)[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۲۸/ ۲۷ھ)

کاروبار میں شرکت کے لئے رقم دینے کے بعد نفع کے بجائے ماہانہ سود کا مطالبہ کرنے کا حکم

سوال:- دو سال ہوئے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، بوقتِ انتقال والد صاحب پر قرضہ تھا، جو کہ والد صاحب کے کاروبار سے ادا کیا جارہا ہے، اِن شاء اللہ حال ہی میں تمام قرضہ ادا ہوجائے گا۔ ایک شخص ایسا بھی ہے کہ اُس نے چلتے ہوئے کاروبار یعنی والد صاحب کی دُکان میں دس

---

(۱) طبع سعید، وفی فتح القدیر ج:۵ ص:۳۹۹ (طبع رشیدیه کوئٹه) .... بخلاف ما بعد الخلط حیث یهلک علی الشرکة لأنه لا یتمیّز فیجعل الهالک من المالین، وان اشتریٰ أحدهما بماله وهلک مال الآخر قبل الشراء فالمشتری بینهما علٰی ما شرطا لأن الملک حین وقع وقع مشترکًا بینهما لقیام الشرکة وقت الشراء ...الخ.
وفی درر الحکام شرح غرر الأحکام، أرکان الشرکة وشروطها وبعدهٗ أی بعد الخلط یهلک علیهما لأنهٗ لا یتمیّز فیهلک من المالین فان هلک مال أحدهما بعد شراء الآخر بمالهٖ فمشریه لهما علٰی ما شرطا لأنّ الملک حین وقع وقع مشترکًا بینهما لقیام الشرکة وقت الشراء فلا یتغیّر الحکم بهلاک مال الآخر. وراجع أیضًا الی الفتاوی الهندیة ج:۲ ص:۳۰۹ الی ص:۳۱۱ (طبع رشیدیه کوئٹه).

ہزار روپیہ لگا کر شراکت کی، لیکن دو ماہ کے بعد شرکت کی بجائے سود لینے کا مطالبہ کر دیا، ورنہ دس ہزار کی واپسی کا مطالبہ کر دیا، اس لئے مجبوراً ماہانہ سود دینا پڑا، اس طرح کچھ عرصہ سود دیا جاتا رہا لیکن دُکان دن بدن منڈی والوں کی مقروض ہوتی چلی گئی اور دُکان کا کاروبار ختم ہوگیا، مجبوراً والد صاحب بیرون ملک چلے گئے تاکہ اس شخص کا قرض ادا کیا جائے، قرض کی ادائیگی کے وقت سود کے نام پر جو رقم دی گئی ہے وہ منہا کر کے دی جائے یا پوری دی جائے؟

جواب:- سود کی رقم کا لین دین جائز نہیں ہے،[۱] دو ماہ بعد سود کے مطالبے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے شرکت ختم کر دی، ایسی صورت میں حساب ہونا چاہئے تھا، اور اس وقت نفع یا نقصان میں جو حصہ بنتا وہ ان کو دِیا جاتا، لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا، اس لئے اب اندازہ لگائیں کہ جب شرکت ختم ہوئی، اس وقت دُکان میں نفع تھا یا نہیں، اگر نفع تھا تو جو رقم سود کے طور پر دی گئی، وہ اگر نفع کے برابر ہو تو ٹھیک، اور زائد ہو تو اُسے منہا کر کے انہیں اصل رقم واپس کر دیں جو دس ہزار روپے ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۰/ ۲۸ ج)

تاج کمپنی لمیٹڈ میں ۱۵ تا ۲۰ فیصد منافع کی شرط پر سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- تاج کمپنی لمیٹڈ قرآنِ حکیم کی طباعت اور نشر و اشاعت کا ایک معروف ادارہ ہے، عوام الناس کو شرکت کی دعوت دیتا ہے، ۱۵ تا ۲۰ فیصد منافع کی پیشکش کرتا ہے، اس میں سرمایہ لگا کر منافع لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- یہ منافع اگر کاروبار کے مجموعی منافع کے بجائے لگائی ہوئی رقم کا ۱۵ یا ۲۰ فیصد ہوتا ہے تو یہ منافع نہیں بلکہ سود ہے،[۲] اور اس کا لین دین جائز نہیں،[۳] جائز صورت صرف یہ ہے کہ جو شخص جتنی رقم لگائے وہ کاروبار کے نفع و نقصان دونوں میں شریک ہو اور کل سرمایہ کی جتنی فیصد رقم اُس نے لگائی ہے نفع کا اُتنا ہی فیصد وصول کرے، دی ہوئی رقم پر معین شرح سے فیصد وصول کرے اور کاروبار خواہ قرآن مجید کی نشر و اشاعت کا ہو اس کی بنا پر سود جائز نہیں ہوسکتا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۶/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۳/ ۲۸ ب)

---

(۱) حوالے کے لئے دیکھئے ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر۱ اور ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔
(۲و۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۲، ۴۸، ۵۳ و ص:۵۴ کے حواشی اور ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

کھانے میں روٹی، سالن، گوشت اور سبزی وغیرہ مختلف اجناس مشترک ہونے کی صورت میں تقسیم میں مساوات ضروری ہے یا نہیں؟

سوال:- چند احباب نے برابر اپنے کھانے کے لئے پیسے جمع کئے اور ان پیسوں سے سالن روٹی وغیرہ تیار ہوئی، سالن میں بھی اور روٹیوں میں بھی ہر ایک کی برابر رقم لگی ہوئی ہے، دسترخوان پر ہر چیز میں برابر ہر ایک شریک ہے، لیکن کھانا جب کھایا جاتا ہے تو اس میں ظاہر ہے کمی زیادتی ہونا لازمی امر ہے، ایک عالم اس کو جائز کہتے ہیں، مختلف اجناس ہونے کی وجہ سے کمی زیادتی جائز ہے، دُوسرے صاحب کا کہنا یہ ہے کہ یہ شرکت اور اس میں بغیر تقسیم مال ہر ایک کا حصہ جدا کئے بغیر جائز نہیں، اور تقسیم بھی برابری میں ہو کیونکہ شرکت ہر چیز میں برابر ہے، ان کے دلائل یہ ہیں: فشركة الأملاك العين يرثها رجلان ويشتريانها فلا يجوز لأحدهما أن يتصرّف في نصيب الآخر الّا باذنه وكل واحد منهما في نصيب صاحبه كالأجنبي الٰى أن قال الّا في صورة الخلط والاختلاط فانه لا يجوز الّا باذنه. هدايه (ج:۲ ص:۶۰۵)۔[1] اور ردّالمحتار میں ہے: قوله من حيث الأمانة فان مال أحد الشريكين أمانة في يد الآخر كما ان مال المفقود أمانة في يد الحاضر. (ج:۴ ص:۲۹۸)۔[2]

اس لئے یا تو ہر ایک کا حصہ الگ پہلے کر دیا جائے اور سب کا برابر سالن بھی برابر اور روٹی بھی برابر یا روٹی کے بدلے سالن زیادہ لے یا سالن کے بدلے روٹی سب کی رضامندی سے ایسی شرکت کا امتیاز کرلیا جائے تو پھر صحیح ہے اور یہ مشکل ہے، اس لئے اس شرکت میں قباحتیں ہیں اُوپر کی دو مختلف اجناس میں کمی زیادتی جائز ہے، یہ اُصول تقسیم کا ہے جو یہاں واقع نہیں ہوا اس لئے جائز نہیں، اس لئے ایسا کرلیا جائے کہ یہ تمام احباب ایک شخص کو رقم دے دیں اور وہ ان سب کی اپنی طرف سے دعوت کر دے۔ پہلی صورت میں جواز کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں چونکہ روٹی، سالن، گوشت اور سبزی وغیرہ مختلف اجناس ہیں، اس لئے تقسیم میں مساوات رِبا سے بچنے کے لئے ضروری نہیں بلکہ باہمی رضامندی سے تفاضل جائز ہے، چنانچہ جب سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تو ہر شخص جتنا کھا رہا ہے وہ اس کا حصہ سمجھا جائے گا، بشرطیکہ تمام شرکاء راضی ہوں، لہٰذا کوئی اِشکال نہیں۔ البتہ اگر اس طرح صرف ایک ہی ایسی چیز خریدی جائے جو یا وزنی ہو یا کیلی تو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تقسیم میں مساوات ضروری ہوگی، لہٰذا یا تو اس

(۱) هداية، كتاب الشركة ج:۲ ص:۶۰۵ (طبع مكتبه رحمانيه).
(۲) ردّ المحتار، كتاب الشركة ج:۴ ص:۲۹۸ (طبع سعيد).

کے ساتھ کوئی دُوسری جنس کی چیز شامل کرلی جائے جیسے قربانی کے گوشت میں فقہائے کرام نے لکھا ہے، یا پھر سب لوگ مل کر اپنی اپنی رقم کا مالک ایک شخص کو بنادیں، وہ اپنے لئے وہ چیز خرید لے، پھر وہ اپنی خوشی سے سب کی دعوت کردے، جیسا کہ سوال میں لکھا گیا ہے۔ لیکن اِمام بخاریؒ نے کتاب الشرکہ میں اس قسم کے اشتراک کو ''نہد'' قرار دِیا ہے، اور عہدِ رسالت میں اس کی کئی مثالیں پیش کی ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

''لم یر المسلمون فی النھد بأسا، أن یأکل ھٰذا بعضا وھٰذا بعضا.

(صحیح البخاری، کتاب الشرکۃ ج:۱ ص:۳۳۷)

اس کے تحت حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''انھا لیس من باب المعاوضات التی تجری فیہ المماکسۃ أو تدخل تحت الحکم وانما ھی من باب التسامح والتعامل، وکیف تکون خلاف الاجماع مع انہ قد جری بہ التعامل من لدن عھد النبوۃ الٰی یومنا ھٰذا.

(فیض الباری ج:۳ ص:۳۴۲)[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۱۲/۱/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۵۹)

---

(۱) طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ.

وفی عمدۃ القاری شرح البخاری ج:۱۳ ص:۶۰ (طبع دار احیاء التراث) باب الشرکۃ فی الطعام والنھد والعروض وکیف قسمۃ ما یکال ویوزن مجازفۃ او قبضۃ قبضۃ لما لم یر المسلمون فی النھد بأسا أن یأکل ھٰذا بعضا وھٰذا بعضا وکذٰلک مجازفۃ الذھب والفضۃ والقران فی التمر أی ھٰذا باب فی بیان حکم الشرکۃ فی الطعام وقد عقد لھٰذا باب مفردا مستقلا یأتی بعد أبواب إن شاء اللہ تعالٰی قولہ والنھد بفتح النون وکسرھا وسکون الھاء وبدال مھملۃ قال الأزھری فی التھذیب النھد إخراج القوم نفقاتھم علٰی قدر عدد الرفقۃ یقال تناھدوا وقد ناھد بعضھم بعضا وفی المحکم النھد العون وطرح نھدہ مع القوم أعانھم وخارجھم وقد تناھدوا أی تخارجوا یکون ذٰلک فی الطعام والشراب وقیل النھد إخراج الرفقاء النفقۃ فی السفر وخلطھا ویسمی بالمخارجۃ وذٰلک جائز فی جنس واحد وفی الأجناس وإن تفاوتوا فی الأکل ولیس ھٰذا من الربا فی شیء وإنما ھو من باب الاباحۃ.

وفیہ أیضًا ج:۱۳ ص:۶۱ (طبع دار احیاء التراث) قولہ لما لم یر المسلمون اللام فیہ مکسورۃ والمیم مخففۃ ھٰذا تعلیل لعدم جواز قسمۃ الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ مجازفۃ أی لأجل عدم رؤیۃ المسلمین بالنھد بأسا جوزوا مجازفۃ الذھب بالفضۃ لاختلاف الجنس بخلاف مجازفۃ الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ لجریان الربا فیہ فکما ان مبنی النھد علی الاباحۃ وإن حصل التفاوت فی الأکل فکذٰلک مجازفۃ الذھب بالفضۃ وان کان فیہ التفاوت بخلاف الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ لما ذکرنا قولہ أن یأکل ھٰذا بعضا تقدیرہ بأن یأکل وأشار بہ الٰی أنھم کما جوزوا النھد الذی فیہ التفاوت فکذٰلک جوزوا مجازفۃ الذھب والفضۃ مع التفاوت لما ذکرنا قولہ والقران فی التمر بالجر ویروی والاقران عطف علٰی قولہ أن یأکل ھٰذا بعضا أی بأن یأکل ھٰذا تمرتین تمرتین وھٰذا تمرۃ تمرۃ.

وفیہ أیضًا ج:۱۳ ص:۶۲ (طبع دار احیاء التراث) مطابقتہ للترجمۃ تؤخذ من قولہ فأمر أبو عبیدۃ بأزواد ذٰلک الجیش فجمع ذٰلک کلہ ولما کان یفرق علیھم کل یوم قلیلًا قلیلًا صار فی معنی النھد واعترض بأنہ لیس فیہ ذکر المجازفۃ لأنھم لم یریدوا المبایعۃ ولا البدل وأجیب بأن حقوقھم تساوت فیہ بعد جمعہ فتناولوہ مجازفۃ کما جرت العادۃ.

......................(باقی اگلے صفحے پر)

کیا شرکت یا مضاربت میں اپنی لگائی ہوئی رقم واپس لی جاسکتی ہے؟

(الائنس موٹرز کمپنی میں جمع کرائی ہوئی رقم واپس لوٹانے کی شرط کا حکم)

وضاحت:- سائل نے پہلے یہ سوال دارالافتاء والارشاد میں بھیجا اور وہاں سے جواب حاصل کر کے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کیا، سوال اور دارالافتاء والارشاد کی جانب سے اس کا جواب اور پھر حضرتِ والا دامت برکاتہم کا جواب درج ذیل ہے۔ (محمد زبیر)

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ الائنس موٹرز کے نام سے آپ بخوبی واقف ہوں گے کہ یہ ایک پرائیویٹ کمپنی ہے، جس میں لوگ اپنا سرمایہ بھی لگاتے ہیں، اور کمپنی کی جانب سے انہیں ہر ماہ حاصل شدہ منافع کا چالیس فیصد حصہ دیا جاتا ہے۔ میں کمپنی کا مقرّر کردہ نمائندہ ہوں، اور کمپنی کے اُصول کے مطابق لوگوں سے سرمایہ وصول کر کے کمپنی پہنچادیتا ہوں۔ کمپنی کے اُصولوں میں سے ایک اُصول یہ بھی ہے کہ سرمایہ کار اگر اپنی جمع شدہ رقم کمپنی سے نکلوانا چاہے تو اُسے ایک ماہ پیشگی نوٹس دینا ہوتا ہے، جس کا منافع یعنی اس ماہ کا منافع سرمایہ کار کو نہیں ملتا۔

اب زید ایک سرمایہ کار نے اپنی رقم کمپنی سے نکلوانے کے لئے فرض کریں یکم جنوری کو نوٹس دیا، لہٰذا یکم فروری کو زید کی رقم لوٹادی جاتی ہے، جبکہ ماہِ جنوری کا منافع زید کو نہیں دیا گیا (کمپنی کے اُصول کے مطابق جس کا سرمایہ کار کو علم ہے)، خیال رہے کہ یکم فروری کو بکر کمپنی میں سرمایہ کاری کی غرض سے اتنی ہی رقم لے کر آئے تھے جتنی زید کو مطلوب تھی، لہٰذا یہی رقم زید کو لے کر دی گئی تھی، اور زید کی رقم بکر کی رقم شمار کی گئی، اب سوال یہ ہے کہ ماہِ جنوری کے منافع کا حق دار کون ہے؟ کمپنی کے اُصول کے مطابق یہ رقم مجھے دی گئی ہے، آیا میں اس کا حق دار ہوں یا نہیں؟

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)........ وفی فتح الباری، کتاب الشرکۃ ج:۵ ص:۱۷۰، ۱۷۱ (طبع مکتبۃ الرشد) وأما بفتحها فجمیع أصناف المال وما عدا النقد یدخل فیه الطعام فهو من الخاص بعد العام ویدخل فیه الربویات ولٰکنه اغتفر فی النهد لثبوت الدلیل علٰی جوازه واختلف العلماء فی صحة الشرکة کما سیاتی قوله وکیف قسمة ما یکال ویوزن أی هل یجوز قسمته مجازفة أو لا بد من الکیل فی المکیل والوزن فی الموزون وأشار الٰی ذٰلک بقوله مجازفة أو قبضة قبضة أی متساویة قوله لما لم تر المسلمون بالنهد بأسا هو بکسر اللام وتخفیف المیم وکأنه أشار الٰی أحادیث الباب وقد ورد الترغیب فی ذٰلک وروی أبو عبید فی الغریب عن الحسن قال اخرجوا نهدکم فانه أعظم للبرکة وأحسن لأخلاقکم قوله وکذٰلک مجازفة الذهب والفضة کأنه ألحق النقد بالعرض للجامع بینهما وهو المالیة لکن انما یتم ذٰلک فی قسمة الذهب مع الفضة أما قسمة أحدهما خاصة حیث یقع الاشتراک فی الاستحقاق فلا یجوز اجماعًا قاله ابن بطال وقال ابن المنیر شرط مالک فی منعه أن یکون مصکوکًا والتعامل فیه بالعدد فعلٰی هذا یجوز بیع ما عداه جزافا ومقتضی الأصول منعه وظاهر کلام البخاری جوازه ویمکن أن یحتج له بحدیث جابر فی مال البحرین والجواب عن ذٰلک أن قسمة العطاء لیست علٰی حقیقة القسمة لأنه غیر مملوک للآخذین قبل التمییز والله أعلم.

(جواب از دارالافتاء والارشاد ناظم آباد، کراچی)

جواب:- دراصل جس تاریخ کو نوٹس دیا جاتا ہے اس تاریخ میں سرمایہ کار کے حصص کمپنی خرید لیتی ہے، اور اس کے ثمن کی ادائیگی ایک ماہ بعد ہوتی ہے، لہٰذا وہ رقم آپ کے لئے حلال ہے۔

واللہ اعلم

محمد موسیٰ
دارالافتاء والارشاد، ناظم آباد کراچی
فتویٰ نمبر ۲۲۸۹۵

الجواب صحیح
عبدالرحیم
نائب مفتی دارالافتاء والارشاد، ناظم آباد کراچی

(جواب از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

شرکت یا مضاربت میں رقم لوٹانے کا سوال نہیں ہوتا، اور اس کی جو توجیہ دارالافتاء والارشاد کے مذکورہ جواب میں ذکر کی گئی ہے وہ دُرست ہوسکتی ہے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ یا تو رقم لگانے والے کو یہ اِختیار ہو کہ وہ اپنا حصہ جسے چاہے فروخت کردے، یا پھر حصے کی قیمت پہلے سے اتنی مقرّر نہ کی جائے جو اَصل لگائی ہوئی رقم کے برابر ہو، کیونکہ اس صورت میں راَس المال مضمون ہوجائے گا جو شرکت اور مضاربت دونوں میں جائز نہیں ہے، اس کے بجائے یا تو خریداری کے وقت اثاثوں کی بازاری قیمت پر خریدے، یا باہمی رضامندی سے کوئی قیمت وقت پر مقرّر کرلی جائے۔ اگر اس معاہدے میں یہ بات ہے تب تو دُرست ہے لیکن اگر ہر صورت میں اصل لگائی ہوئی رقم پر بیچنے کی شرط ہے تو اس سے راَس المال کے مضمون ہونے کی بنا پر یہ شرط فاسد ہوگی،[(۱)] البتہ مضاربت شرطِ فاسد سے فاسد نہیں

---

(۱) کیونکہ ایسی صورت میں اس شرط (یعنی اپنی لگائی ہوئی مکمل رقم واپس نکلوانے کی شرط) کا حاصل یہ ہوگا کہ نقصان برداشت نہ کرنے کی شرط لگائی گئی ہے، اور یہ شرط فاسد ہے۔

وفی مجمع الأنهر، کتاب المضاربة ج:۳ ص:۴۴۷ (طبع مکتبه غفاریه کوئٹه) ویبطل الشرط کشرط الوضیعة هی الخسران علی المضارب لأنّ الخسران جزء هالک من المال فلا یجوز أن یلزم غیر ربّ المال لٰکنه شرط زائدٌ یوجبُ قطع الشرکة فی الربح.

وفی الفتاویٰ التاتارخانیة کتابُ الشرکة الفصل الرابع فی العنان ج:۵ ص:۶۵۵ (طبع ادارة القرآن کراچی) وان شرطا أن یکون الرّبح والوضیعة بینهما نصفین فشرط الوضیعة بصفة فاسد ولٰکن بهٰذا لا تبطل الشرکة لأنّ الشرکة لا تبطل بالشروط الفاسدة وان وضعا فالوضیعة علیٰ قدر رأس مالهما.

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۶۴۸ (طبع سعید) کل شرط یوجب جهالة فی الرّبح أو یقطع الشرکة فیه یفسدها وألّا بطل الشرط. وفی الشامیة تحته (قوله بطل الشرط) کشرط الخُسران علی المضارب.

وفی المحیط البرهانی فی الفقه النعمانی ج:۲ ص:۴۰۱ (طبع غفاریه کوئٹه) وان شرط الوضیعة والرّبح نصفان فشرط الوضیعة نصفان فاسد لأنّ الوضیعة هلاک جزء من المال فکأن صاحب الألفین شرط ضمان شیء ممّا هلک من ماله علیٰ صاحبه وشرط الضمان علی الآخر فاسد ولٰکن بهٰذا لا تبطل الشرکة حتّی لو عملا وربحا فالرّبح بینهما علیٰ ما شرطا.

وفی تبیین الحقائق ج:۵ ص:۲۵۱ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ویبطل الشرط کشرط الوضیعة علی المضارب. وکذا فی شرح المجلّة ج:۲ ص:۷۵۷ (طبع مکتبه حنفیه کوئٹه).

ہوتی،[۱] لہٰذا مضاربت کا عقد اس کے باوجود دُرست ہے،[۲] ہاں خلافِ شرع شرط لگانے کا گناہ ہوگا اور یہ شرط واجب التعمیل نہ ہوگی۔[۳] چنانچہ اس کاروبار سے جو منافع تقسیم کیا گیا، اگر اس میں کوئی اور خلافِ شرع اَمر نہ ہو تو اس کا استعمال بھی جائز ہے۔ رہی یہ بات کہ مہینے کے شروع میں بکر نے جو رقم لگائی، وہی زید کو دے دی گئی، سو اس سے مسئلے پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اور اس کی وجہ سے بکر جنوری کے نفع کا مستحق نہیں ہوا، کیونکہ بکر کے دیتے ہی وہ رقم مالِ مضاربت میں شامل ہوگئی، اور نقود متعین نہیں ہوتے، لہٰذا چاہے وہ رقم زید کو دے دی گئی ہو، اس کا مطلب یہی ہے کہ زید کو اس کے حصے کی قیمت دی گئی۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۰۸/۱۱/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۸۸/۳۹ز)

والد کی طرف سے شروع کرائے ہوئے کاروبار میں والد کو بیٹوں کے حصے مقرّر کرنے اور ان میں کمی بیشی کا اِختیار ہے

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین بیچ اس مسئلے کے: زید کے والد عبداللہ کے چار لڑکے: زید، حارث، بکر، خالد۔ زید اپنے والد کے ساتھ دُکان پر کام کرتا ہے، زید کو اپنے والد کے ساتھ کام کرتے ہوئے جب تقریباً گیارہ سال کا عرصہ ہوا تو زید نے اپنی کوشش سے ایک دُکان کرایہ پر لی اور باپ نے الگ دُکان پر کام شروع کیا، اور اللہ کے حکم سے ایک اور کاروبار شروع کیا، یہ کاروبار رات کو شروع ہوتا ہے ٹرانسپورٹ کا، رات آٹھ بجے دُکان بند کرکے گیرج پر بسوں کی مرمت وغیرہ کا کام، تقریباً تین سال بعد یہ کام بند کردیا کیونکہ اس میں نقصان کا اندیشہ ہوا، اس دوران زید کی شادی ہوئی، شادی کے بھی نو ماہ بعد اتفاق سے کچھ قانونی کام کے لئے والد صاحب کی دُکان پر اور زید کی دُکان پر پارٹنرز بنانے کا سوال آیا، والد صاحب کی دُکان پر چاروں بھائی کے چار چار آنے حصہ مقرّر ہوا، زید کی

(۱ تا ۳) وفی ردّ المحتار، کتاب الشرکۃ ج:۴ ص:۳۱۶ (طبع سعید) .... لأنّ الشرکۃ لا تفسد بالشروط الفاسدۃ.
وکذا فی فتح القدیر، کتاب الشرکۃ، فصل ولا تنعقد الشرکۃ ج:۶ ص:۱۷۷ (طبع مصطفیٰ بابی مصر)
وفی المحیط البرھانی فی الفقہ النعمانی ج:۶ ص:۴۰۲ (طبع غفاریہ کوئٹہ) فالشرکۃ ممّا لا تبطل بالشروط الفاسدۃ ....الخ. وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۶۴۸ (طبع سعید) .... بطل الشرط وصحّ العقد وفی الشامیۃ تحتہ کشرط الخُسران علی المضارب .... الخ.
وفی مجمع الأنھر ج:۳ ص:۴۴۷ (طبع غفاریہ کوئٹہ) .... شرطٌ زائد .... فلا یفسد المضاربۃ لأنّھا لا تفسد بالشروط الفاسدۃ کالوکالۃ .... الخ. وکذا فی الدر المنتقیٰ علیٰ مجمع الأنھر ج:۳ ص:۴۴۷ (طبع غفاریہ) وفی الفتاویٰ التاتارخانیۃ ج:۵ ص:۲۵۵ (طبع ادارۃ القرآن کراچی) ان الشرکۃ لا تبطل بالشروط الفاسدۃ. (محمد زبیر حق نواز)۔

دُکان پر زید کے سات آنے، بکر، حارث، خالد کے تین تین آنے طے ہوئے، کیونکہ زید کو والد نے کام کے لئے روپے دیئے تھے، اور زید نے رات دن محنت کی تھی، زید رات دو تین بجے روز سوتا تھا، باپ نے زید کو تقریباً اٹھارہ ہزار روپے دیئے تھے، دُکان کر کے زید نے چھ سات سال بعد دُکان بھی خریدی، ۱۹۷۵ء میں والد صاحب حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، جانے سے پہلے وصیت نامہ تحریر کیا، تحریر کرتے وقت خود اپنی دُکان میں حسبِ سابق زید، بکر، حارث، خالد کو چار چار آنے کا حصہ دار مقرّر کیا، اور بعد میں فرمایا کہ زید کی دُکان میں سب کو چار چار آنے دیا جائے، زید نے والد صاحب کو یاددہانی کرائی کہ آپ نے پہلے زید کی دُکان میں زید کو سات آنے اور حارث کو تین آنے، بکر کو تین آنے، خالد کو تین آنے تحریر کئے ہیں، زید کے احتجاج پر والد صاحب نے زید کو سات آنے کا حصہ دار تسلیم کیا، زید کی دُکان میں حج سے آنے کے بعد ایک بار پھر پارٹنرز بنانے کا نیا معاہدہ تحریر کرنا پڑا تو والد صاحب نے فرمایا کہ زید کے لئے سات آنے کے بجائے چار آنے مقرّر کیا جائے، زید نے اپنے والد کو یاددہانی کرائی اور اپنی والدہ کو سب حالات سے آگاہ کیا، والدہ نے کہا کہ وہ والد سے بات کریں گی، والدہ نے بات چیت کے بعد کہا کہ میں نے تمہارے والد کو اس بات پر راضی کیا ہے کہ تم چھ آنے لے لو، زید نے کہا دو بار تحریر کرنے کے بعد چھ آنے کی کیا وجہ ہے؟ مجھ کو سات آنے دیا جائے، چھ آنے سات آنے کے مسئلے پر ایک یا ڈیڑھ سال یہ بات تفصیل میں رہی، ایک بار پھر چھ آنے سات آنے پر بات ہوئی تو والد صاحب چھ آنے کو چھوڑ کر فرمانے لگے کہ زید کو زید کی دُکان میں چار آنے دیئے جائیں۔ زید نے اپنی والدہ کو پھر آگاہ کیا کہ آپ نے فرمایا تھا کہ والد صاحب چھ آنے دینا چاہتے ہیں، لیکن وہ تو پھر چار آنے کی بات کر رہے ہیں، والدہ نے کہا کہ وہ پھر بات کریں گی، والدہ نے آٹھ روز بعد جواب دیا کہ میں نے بات کی چھ آنے تم کو دیئے جائیں گے، میں نے والدہ سے کہا کہ آپ والد صاحب سے کہیں کہ سات آنے کر دیا جائے اور کچھ تجاویز بھی میری طرف سے پیش کریں، ۱- تجویز اگر آپ زید کو زید کی دُکان میں سات آنے نہیں دینا چاہتے تو آج تک حساب کر کے زید کو زید کی دُکان سے تین آنے دے دیں، آئندہ زید کو زید کی دُکان میں سب کے برابر دیا جائے، زید کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا، حالانکہ زید کسی بھائی کو کچھ بھی نہ دینا چاہے تو کوئی کچھ نہیں کرسکتا، دُکان زید نے خریدی، زید کے نام پر ہے، تمام کاروبار زید کے نام پر ہے، لیکن زید اپنے وعدے سے نہیں پھرنا چاہتا، والد صاحب سے والدہ نے جو آٹھ روز پہلے بات کی تھی کہ زید کو چھ آنے دے دیا جائے اس بات کے بعد پھر اچانک فرمایا: نہیں! زید کو چار آنے دیا جائے، وجہ یہ بیان فرمائی کہ اگر زید کو سات آنے دے دُوں تو حارث، بکر، خالد کے ساتھ بے ایمانی ہوگی۔ زید والد سے یہ تو نہیں کہتا کہ آپ اپنی دُکان میں سات

آنے دیں، زید تو صرف اپنی کمائی ہوئی رقم سے سات آنے چاہتا ہے، جو والد کے وعدے کے عین مطابق ہے، یہ وعدہ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں کیا تھا اور پھر ۱۹۷۵ء میں تجدید کرلی۔ از راہِ کرم شریعت کی رُو سے ایسا کرنے پر والد صاحب کیا بے ایمانی کے مرتکب ہوتے ہیں؟ یا زید کو اس کا حق دیتے ہیں؟ زید کے بھائی حارث عمر ۲۷ سال نے صرف ڈیڑھ یا دو سال کام کیا، بکر نے آٹھ سال یا نو سال کام کیا، عمر ۲۰ سال، خالد نے ساڑھے تین سال کام کیا، عمر ۱۸ سال۔ زید عمر ۳۳ سال، بائیس سال کام کیا، ایک لڑکی، دو لڑکے، ۶ سال، ۵ سال، ۴ سال۔ زید عمر کا ایک بڑا حصہ والد صاحب کے ساتھ گزار چکا ہے، وہ کسی کام کی بے ایمانی نہیں کرنا چاہتا، اس لئے آپ کو یہ مسئلہ تحریر کر رہا ہے تاکہ وہ حق کی رہنمائی حاصل کر سکے اور کوئی بات غلط ہو تو اپنی غلطی دُور کرلے ورنہ یہ فتویٰ اپنے والد کے رُوبرو پیش کر کے فیصلہ ان پر چھوڑ دے، زید کی معلومات کے مطابق اسلام وعدے کی پابندی لازمی قرار دیتا ہے۔

جواب:- اگر زید کے والد نے زید کو تجارت کے لئے رقم دیتے وقت یہ طے کیا تھا کہ کاروبار میں سات آنے زید کے اور تین تین آنے باقی بھائیوں کے ہوں گے، تو اس پر اس طے شدہ معاہدے کی پابندی لازم ہے،[1] اور اس کی خلاف ورزی ہرگز جائز نہیں۔[2]

البتہ سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں زید کی دُکان پر زید تنہا کام کرتا تھا، اس کے بعد دُوسرے بھائی بھی کام میں شریک ہوتے گئے، اگر صورتِ حال یہی ہے تو سات آنے والے معاہدے کی پابندی اسی وقت تک لازم ہے جب تک زید تنہا کام کرتا رہا، اور جس تاریخ سے دُوسرا کوئی بھائی کام میں شریک ہوا اس تاریخ سے باپ کو نیا معاہدہ کرنے کا حق حاصل ہے،[3] جس میں زید کا حصہ کم کرکے دُوسرے کام کرنے والے بھائیوں کا حصہ زیادہ بھی کرسکتا ہے۔[4] اور اگر شروع ہی سے تمام بھائی کام میں شریک تھے، یا اس وقت سے شریک تھے جب سے سات آنے کا معاہدہ ہوا تو سوال لکھ کر اس صورت کا مسئلہ دوبارہ پوچھ لیا جائے، اس صورت میں یہ کاغذ بھی ساتھ ضرور روانہ کریں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۰۹/۳۰ د)

(۱ تا ۴) کیونکہ ایسی صورت میں یہ سارا کاروبار زید کے والد کی ملکیت ہوگا، اور زید کے والد نے زید اور اس کے بھائیوں کے لئے جتنا حصہ مقرر کیا ہو، وہ اُتنے ہی حصے کے حق دار ہوں گے۔

وفی الشامیۃ ج:۴ ص:۳۲۵ (طبع سعید) لما فی القنیۃ الأب وابنہ یکتسبان فی صنعۃ واحدۃ ولم یکن لھما شیء فالکسب کلّہ للأب ان کان الابن فی عیالہ لکونہ معینًا لہٗ .... الخ.

وفی الھندیۃ کتاب الشرکۃ الباب الرّابع فی شرکۃ الوجوہ وشرکۃ الأعمال ج:۲ ص:۳۲۹ (طبع رشیدیہ) أب وابن یکتسبان فی صنعۃ واحدۃ لم یکن لھما مال فالکسب کلّہ للأب اذا کان الابن فی عیال الأب لکونہ معینًا لہٗ، الا تریٰ انّہ لو غرس شجرۃً تکون للأب .... الخ. (باقی اگلے صفحے پر)

شرکت میں فریقین کے لئے علیحدہ علیحدہ مال متعین کر کے اس پر نفع نقصان حاصل کرنے کی مخصوص صورت کا حکم

سوال:- ایک شخص نے چار گنا رقم دُوسرے شخص سے زیادہ ایک کاروبار میں ڈالی اور کاروبار کی صورت یہ رکھی کہ وہ پہلا شخص جس کی چار گُنا رقم ہے دُوسرے شخص کو مال خرید کر دیتا ہے اور دُوسرے شخص کی رقم پہلے شخص سے چوتھائی ہے، اور جب مال خرید کر دُوسرے شخص کو دیتا ہے تو اس پر پانچ فیصد کے حساب سے نفع لگاتا ہے اور اس کے بعد نفع پہلے اور دُوسرے شخص کو تقسیم کیا جاتا ہے کہ پہلے شخص کو تین فیصد اور دُوسرے شخص کو دو فیصد نفع اس مال کی مالیت سے ملتا ہے، اور اس صورت میں سے شخص بَری ہوجاتا ہے کہ دُوسرے شخص کو مال میں سے نفع ہو یا نقصان، پھر دُوسرا شخص مال اِکٹھا کر کے پہلے شخص کو دیتا ہے اور وہ مال لاتا ہے اور پھر وہ اس طریقے سے نفع لگاتا ہے اور نفع دونوں میں تقسیم ہوتا ہے، کیا یہ کاروبار ازرُوئے شریعت دُرست ہے؟

جواب:- سوال مجمل ہے، غور کرنے سے معاملے کی صورت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ''الف'' اور ''ب'' میں شرکت کا معاملہ ہے، اصل سرمائے میں چار حصے ''الف'' نے اور ایک حصہ ''ب'' نے لگایا ہے، اس مجموعی سرمائے سے جو سامانِ تجارت خریدا گیا، اسے فروخت کرنے سے قبل دونوں نے اندازہ کرلیا کہ اس پر پانچ فیصد نفع ہوگا، اور پھر اس کو فروخت سے پہلے ہی اس طرح تقسیم کرلیا کہ تین حصے ''الف'' کے اور دو حصے ''ب'' کے قرار پائے۔ ''الف'' نے اپنے تین حصے وصول کر کے سامان فروخت کے لئے ''ب'' کے حوالے کردیا کہ اگر نفع زیادہ ہو تو بھی اس کا ہے، اور نقصان ہو تو بھی اس پر ہے۔ اگر معاملے کی صورت یہی ہے جو اُوپر لکھی گئی تو یہ صورت ناجائز ہے،[1] اس لئے کہ اس میں ''الف'' کا تین فیصد نفع معین ہے اور ''ب'' کا نفع مشتبہ ہے،[2] معاملہ اس طرح کرنا چاہئے کہ نفع کا فروختگی سے پہلے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) .... وفی تنقیح الفتاویٰ الحامدیة کتاب الشرکة ج:۱ ص:۹۵ (طبع میمنیة مصر) أب وابن اکتسبا ولم یکن لکھما مال فاجتمع لھما من الکسب اموال فالکل للأب لأنّ الابن اذا کان فی عیاله فھو معین لهٗ الا تریٰ انّه لو غرس شجرةً فھی للأب .... الخ.

وفی الفتاویٰ الکاملیة کتاب الشرکة ص:۵۱ (طبع رشیدیه) اذا کان الولد فی عیال ابیه ومعینًا لهٗ یکون جمیع ما تحصل من الکسب لأبیه .... الخ.

وفی شرح المجلّة لسلیم رستم باز رقم المادّة:۱۳۹۸ ج:۱ ص:۷۴۱ (طبع مکتبه حنفیه کوئٹه) اذا عمل رجل فی صنعة ھو وابنه الّذی فی عیاله فجمیع الکسب لذٰلک الرّجل وولده یُعدّ معینًا لهٗ وکذا اذا اعانهٗ ولده الّذی فی عیاله عند غرسه شجرةً فتلک الشجرة للأب لا یشارکه ولده فیھا .... الخ. (وکذا فیه شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۴ ص:۳۱۹ طبع مکتبه حبیبیه کوئٹه). (محمد زبیر حق نواز)

(۱و۲) تفصیلی حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص:۴۲ و ۴۸ اور اگلے صفحے کے حواشی۔

اندازہ کرنے کے بجائے مثلاً یہ طے کرلیا جائے کہ اس سامان کو فروخت کرکے اس سے جو نفع حاصل ہوگا اس کا ایک چوتھائی "ب" کا اور تین چوتھائی "الف" کا ہوگا۔[1] باہمی رضامندی سے نفع کا کوئی اور تناسب بھی طے کیا جاسکتا ہے، لیکن وہ تناسب نفع کا ہونا چاہئے، اصل مال کا نہیں۔[2] اور اگر معاملے کی صورت کچھ اور ہے تو کسی عالم کو سمجھا کر اس سے دوبارہ سوال لکھوائیں اور بھیج دیں، اس کا جواب دے دیا جائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۵/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۶۸۸/۲۲ب)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مضاربت میں تمام نقصان سرمایہ لگانے والے پر ہوگا، جبکہ شرکت (پارٹنرشپ) میں ہر فریق کو اپنے سرمائے کے بقدر نقصان برداشت کرنا ہوگا

سوال:- "Sleeping Partner" کے طور پر کسی کاروبار میں اس شرط کے ساتھ پیسہ لگانا کہ جو نفع ونقصان بھی ہوگا ایک متعین فیصد Sleeping Partner کے حصے میں آئے گا، مثلاً ۲۵ فیصد نفع اور نقصان دونوں میں۔ اس میں بھی دو ذیلی امکان موجود ہوں: ۱-Active Partner صرف محنت کر رہا ہے، اس کا سرمایہ شاملِ تجارت نہیں ہے، ۲-Active Partner نے محنت کے علاوہ سرمایہ بھی لگایا ہوا ہے۔

جواب:- اگر کام کرنے والا صرف محنت کر رہا ہے، اس کا کوئی سرمایہ شامل نہیں ہے، تو اس

(۱ و ۲) وفی شرح المجلّة لسلیم رستم باز رقم المادّة:۱۳۳۷ ج:۲ ص:۷۱۳ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) یشترط أن تکون حصص الرّبح الّتی تنقسم بین الشرکاء جزءًا شائعًا کالنصف والثلث والرّبع فاذا اتفق الشرکاء علیٰ اعطاء أحدهم قدرًا معیّنًا کانت الشرکة باطلة. وکذا فی شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۴ ص:۲۶۰ (طبع مکتبه حبیبیه کوئٹه) وکذا فی البحر الرّائق ج:۵ ص:۱۷۷ (طبع سعید) وخلاصة الفتاویٰ ج:۴ ص:۲۹۴ (طبع امجد اکیڈمی، لاهور).
وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۵۹ (طبع سعید) ومنها أن یکون الرّبح معلوم القدر .... ومنها أن یکون الرّبح جزءًا شائعًا فی الجملة لا معیّنًا فان عیّنا عشرة او مائة أو نحو ذلک کانت الشرکة فاسدة لأنّ العقد یقتضی تحقق الشرکة فی الرّبح والتعیین یقطع الشرکة لجواز أن لا یحصل من الرّبح الّا القدر المعین لأحدهما فلا یتحقق الشرکة فی الرّبح ....الخ. وفی الهدایة ج:۳ ص:۲۶۳ (طبع مکتبه رحمانیه) ومن شرطها أن یکون الرّبح بینهما مشاعًا لا یستحق أحدهما دراهم مسمّاة من الرّبح ..... الخ. (محمد زبیر حق نواز)

صورت میں نقصان کی کوئی ذمہ داری اس پر ڈالنا شرعاً جائز نہیں،[۱] معاملے کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ نفع کا کوئی فیصد حصہ دونوں کے لئے متعین کیا جائے، اور یہ طے کیا جائے کہ نقصان کی صورت میں تمام نقصان سرمایہ لگانے والے کا ہوگا۔[۲]

اور اگر کام کرنے والے نے محنت کے علاوہ کچھ سرمایہ بھی لگایا ہے تو دونوں کے درمیان نفع کا تناسب باہمی رضامندی سے طے ہوسکتا ہے،[۳] لیکن نقصان کی صورت میں دونوں اپنے اپنے لگائے ہوئے سرمائے کے تناسب سے اُسے برداشت کریں گے،[۴] مثلاً کام کرنے والے نے کل سرمائے کا دس فیصد اپنے پاس سے لگایا ہو، اور نوّے فیصد دُوسرے فریق نے لگایا ہو تو نقصان کی صورت میں پہلا فریق دس فیصد اور دُوسرا فریق نوّے فیصد کا ذمہ دار ہوگا۔[۵]

واللہ اعلم
۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۷۵/۴۰ و)

(۱ و ۲) وفی الدر المختار مع رد المحتار، کتاب المضاربۃ ج:۵ ص:۶۴۸ (طبع سعید) کل شرط یوجب جھالۃ فی الرّبح أو یقطع الشرکۃ فیہ یفسدھا وإلّا بطل الشرط وصحّ العقد.

وفی الشامیۃ (قولہ بطل الشرط) کشرط الخُسران علی المضارب .... الخ.

وفی مجمع الأنھر، کتاب المضاربۃ ج:۳ ص:۴۴۷ (طبع غفاریہ کوئٹہ) ویبطل الشرط کشرط الوضیعۃ أی الخُسران علی المضارب لأنّ الخُسران جزءٌ ھالکٌ من المال فلا یجوز أن یلزم غیر رَبّ المال لٰکنہ شرط زائد لا یوجب قطع الشرکۃ فی الرّبح ولا الجھالۃ فیہ فلا یفسد المضاربۃ لأنھا لا تفسد بالشروط الفاسدۃ .... الخ.

وفی تبیین الحقائق، کتاب المضاربۃ ج:۵ ص:۵۲۱ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت) ویبطل الشرط کشرط الوضیعۃ علی المضارب .... وشرط الوضیعۃ شرطٌ زائدٌ لا یوجب قطع الشرکۃ فی الرّبح ولا الجھالۃ فیہ فلا یکون مفسدًا وتکون الوضیعۃ وھو الخُسران علی ربّ المال لأنّہ ما فات جزءٌ من المال بالھلاک یلزم صاحب المال دون غیرہ. وکذا فی شرح المجلّۃ ج:۲ ص:۷۵۷ (طبع مکتبہ حنفیہ کوئٹہ).

نیز دیکھئے ص:۴۲ وص:۴۸ کے حواشی۔

(۳ تا ۵) وفی مصنّف عبدالرّزّاق ومصنّف ابن أبی شیبۃ: "عن علی رضی اللہ عنہ: الوضیعۃ علی المال والرّبح علیٰ ما اصطلحوا علیہ" (کنز العمّال ج:۱۵ ص:۱۷۶ رقم الحدیث:۴۰۴۸۲).

وفی موسوعۃ الاجماع: اتفقوا علیٰ أنّ الرّبح والخُسران فی الشرکۃ بین الشرکاء کل بقدر مالہ.

وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۶۲ (طبع سعید) والوضیعۃ علیٰ قدر المالین متساویًا ومتفاضلًا لأنّ الوضیعۃ اسم لجزء ھالک من المال فیتقدر بقدر المال.

وکذا فی فتح القدیر ج:۵ ص:۳۹۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

وفی المدوّنۃ الکبریٰ للامام مالکؒ ج:۳ ص:۶۰۹ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت) الوضیعۃ عند مالک علیھما علی قدر رؤس أموالھما.

وفی المجموع شرح المھذّب ج:۱۴ ص:۷۱ (طبع دار احیاء التراث بیروت) ویقسم الرّبح والخُسران علیٰ قدر المالین.

وفی المغنی لابن قدامۃ ج:۵ ص:۲۲ (طبع دارالفکر بیروت) الخسران فی الشرکۃ علیٰ کل واحد منھما بقدر مالہ فان کان مالھما متساویًا فی القدر فالخُسران بینھما نصفین، وان کان اثلاثًا فالوضیعۃ أثلاثًا لا نعلم فی ھٰذا خلافًا بین أھل العلم وبہ یقول أبو حنیفۃ والشافعی وغیرھما .... الخ.

مضارب کا مضاربت کے اختتام پر مالِ مضاربت کو قیمتِ اسمیہ پر خریدنے کی شرط کا حکم

سوال:- فضیلة الدكتور / عبدالستار أبو غدة المحترم[۱]
نائب رئيس هيئة الفتوىٰ والرقابة الشرعية ورئيس لجنتها التنفيذية وعضو الهيئة المنتدَب

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته،

تعرض احدى شركات الطاقة الكبرىٰ في أبوظبي على المصرف ترتيب اصدار صكوك مضاربة لصالحها بالتعاون مع بنك باركليز. والمسألة المتكررة دومًا، ونودُّ أن نعالجها من البداية، هي مسألة الثمن الذي يتعهد المضارب بشراء اصول المضاربة به، وما يجري عليه العمل - للأسف في معظم الصكوك - من اعتماد القيمة الاسمية مع المبالغ المتحققة وغير الموزعة من الأرباح. فهل يمكن للخروج من الاشكال الشرعي، أن نمسك العصا من الوسط، ونعالج الأمر على النحو الآتي:-

أوّلًا:- يذكر في اجراءات الاسترداد أنها تتم بإنهاء المضاربة باستخدام حامل الصك اشعارًا معينًا، ومن ثم يشتري المضارب اصول المضاربة منه.

ثانيًا:- ينصُّ في التعهد بالشراء بأن المضارب يتعهد بأن يشتري أصول المضاربة بالقيمة الاسمية ويكون هٰذا التعهد مضافًا الىٰ ما بعد انتهاء أو انهاء المضاربة بالنحو المتقدِم.

وبهٰذه الكيفية يكون تعهد المضارب مضافًا الى الوقت الذي لا يكون (لا يبقىٰ) فيه مضاربًا.

هٰذه هي المعالجة المقترحة بشكل مجمل، فهل ترونها مقبولة؟

وتقبلوا فائق الاحترام والتقدير.

محبكم
أسيد كيلاني

جواب:- الىٰ فضيلة الشيخ أسيد كيلاني، حفظه الله تعالىٰ

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

فان تعهد المضارب بشراء الأصول بالقيمة الاسميّة لا يجوز[۲]، ولو كان بعد انتهاء

(۱) سائل نے شیخ عبدالستار ابوغدّہ کی طرف یہ استفتاء بھیجا تھا اُنہوں نے جواب کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔
(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۷ اور ص:۴۷ کے فتاویٰ اوران کے حواشی۔

المضاربة، ما دام هٰذا التعهد موجودًا عند عقد المضاربة، بمعنى أنه يوقّع عند ابرام عقد المضاربة، سواء كان منصوصًا فى عقد المضاربة أو منفصلًا عنه. والله سبحانه أعلم

أخوكم

محمد تقى العثمانى عفا الله عنه

۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ

شرکتِ متناقصہ میں بینک کو قیمت کی ادائیگی سے قبل قلبِ دَین کی ایک مخصوص صورت کا حکم

(اسلامی بینک بنگلہ دیش کے ایک سوال کا جواب)

سوال:- فضيلة الشيخ / الأستاذ محمد تقى عثمانى حيّاه الله تعالىٰ

نائب رئيس دار العلوم كراتشى، باكستان،

وعضو مجمع الفقه الاسلامى التابع لمنظمة المؤتمر الاسلامى

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته وبعد:

فيسرنا أن نتقدم لفضيلتكم بأطيب التحيات وأخلص التقديرات متمنين لكم دوام الصحة والعافية، وبعد، فنرجو من فضيلتكم التكرم بابداء الرأى الشرعى فى الصورة التالية:

ان أحد عملاء البنك الاسلامى يتمتع بتسهيلات استثمارية تحت صيغة بيع المرابحة للآمر بالشراء بمبلغ قدره ۳۵ مليون تاكا، وكان يتعامل مع البنك بصفة مرضية حيث كان يشترى من البنك بضائعه المطلوبة مرابحة بالأجل فى حدود المبلغ أعلاه فيبيعها فى السوق فيسدد بقيمتها دينه المترتب عليه للبنك، قبل حلول الأجل. لٰكنه فى الآونة الأخيرة اشترى سيارات وشاحنات عددها ۲۶ بقيمة البضائع المباعة دون أن يسدد بها دينه المترتب عليه بغير اذن مسبق من البنك. والجدير بالذكر أن الأجل لتسديد الدين المترتب عليه لم يحل الى الآن. وفى هذا الوضع اقترح العميل للبنك اقتراحًا جديدًا من توقيع عقد جديد عقد اجازة بالبيع تحت شركة الملك حيث يشارك البنك مع العميل فى ملكية السيارات والشاحنات المذكورة بمقابل ۱۰ مليون تاكا من دين المرابحة الذى يستحقه البنك فبذٰلك يتخلص العميل من دين المرابحة بقدر ۱۰ مليون تاكا الذى كان عليه تسديده للبنك فيكون البنك مالكًا (أى شريكًا) للسيارات والشاحنات المذكورة أعلاه ويؤجرها للعميل ويدفع العميل للبنك أجرة معينة علىٰ أقساط كما أنه يشتريها من البنك تدريجيًا بدفع قيمتها علىٰ أقساط معينة. فهل يجوز للبنك أن يوافق علىٰ اقتراح العميل فى الصورة الموضحة أعلاه؟

شاکرین لکم حسن تعاونکم معنا، والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته.

مع أطیب التقدیرات

محمد سراج الاسلام

عضو وأمین اضافی هیئة الرقابة الشرعیة

بنک بنغلادیش الاسلامی المحدود

جواب:- حیث ان المعاملة المقترحة تکون شرکة متناقصة، ویراعی فی مبلغ الأجرة ربح للبنک فوق أجرة المثل، فان هٰذه المعاملة تکون من قبیل قلب الدَّین، فلا تجوز، أمّا اذا کانت أجرة السیارات أجرة المثل وکان شراء حصص السیارات من قبل العمیل علیٰ أساس القیمة السوقیة فلا بأس بهٰذه المعاملة، بشرط أن لا تکون عقود البیع والاجارة مشروطًا بعضها ببعض،[1] بل یکون کل عقد منفصلًا عن الآخر.[2] والله سبحانه وتعالیٰ أعلم

محمد تقی العثمانی

۴رشعبان ۱۴۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵/۹۸۹)

(میاں فارم ٹرانسوال افریقہ کی ایک فیملی شراکتی کمپنی سے متعلق مختلف سوالات کے جوابات)

(ایک معاہدۂ شرکت کی حیثیت)

۱:- والد کی طرف سے اپنی تجارت و جائیداد چار بیٹوں کو مشترکہ طور پر فروخت کرنے کے ایک معاہدۂ شرکت کا حکم

۲:- معاہدۂ شرکت کی خلاف ورزی کرنے والے شریک کا حکم

۳:- معاہدۂ شرکت میں سرمایۂ تجارت کی مقدار متعین طور پر نہ لکھی ہوئی ہو تو کیا حکم ہے؟

۴:- کسی شریک کے کام نہ کرنے یا غائب ہو جانے سے شرکت ختم ہو جائے گی یا نہیں؟

(۱ و ۲) وفی سنن أبی داوٗد ج:۲ ص:۲۸۳ (طبع رحمانیه) لا یحل سلف وبیع ولا شرطان فی بیع. وکذا فی جامع الترمذی ج:۳ ص:۵۳۵ (طبع سعید) وفی المعجم الأوسط للطبرانی ج:۴ ص:۳۳۵ ان النبی صلی الله علیه وسلم نهی عن بیع شرط. وفی الهدایة ج:۳ ص:۶۲ (طبع رحمانیه) لو باع عبدًا علیٰ أن یستخدمه البائع شهرًا أو دارًا علیٰ أن یسکنها ...... لأنه شرط لا یقتضیه العقد وفیه منفعة لأحد المتعاقدین ولأنه نهی عن بیع وسلف ولأنه لو کان الخدمة والسکنیٰ یقابلهما شیء من الثمن یکون اجارة فی بیع ولو کان لا یقابلها یکون اعارة فی بیع وقد نهی النبی صلی الله علیه وسلم عن صفقتین فی صفقة. نیز دیکھئے ص:۸۷ کا حاشیہ نمبر۱۔

۵:- یک طرفہ طور پر شرکت کو ختم کرنے کے لئے دُوسرے شرکاء کا فسخ کو قبول کرنا ضروری نہیں

۶:- معاہدے میں کسی شریک کے تحریراً اِستعفاء دینے کے چھ ماہ بعد اُس کی شرکت ختم ہوجانے کے اُصول کی شرعی حیثیت

۷:- کسی شریک کے مستعفی ہوجانے کے چھ ماہ بعد بھی دیگر شرکاء اُس کو حصہ دیتے رہے تو اس کی شرکت باقی ہوگی یا نہیں؟

۸:- فسخِ شرکت کے لئے دیگر شرکاء کو اِطلاع دینا ضروری ہے، محض استعفاء لکھ کر اپنے پاس رکھ لینے سے شرکت ختم نہیں ہوگی

۹:- کسی شریک کے انتقال کے بعد اس کی اولاد کاروبار میں شریک ہوگی یا نہیں؟ اور مرحوم شریک کی اولاد کو شریکِ کاروبار بنانے کی مجلس میں بعض شرکاء کے سکوت اِختیار کرنے کا حکم

سوال:- ضروری تمہید مختصراً:-

حاجی موسیٰ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حیات میں اپنی تمام جائیداد و تجارات کو اپنے چار فرزندوں کو زبانی طور پر فروخت کیا، بعد ازیں ان چار بیٹوں نے ان تجارات و جائیداد کو حاصل کر کے اور اس پر قبضہ پانے کے بعد ایک تجارتی شرکت جاری کی، اس تجارتی شرکت کو باقاعدہ چلانے کی غرض سے انہوں نے ایک معاہدۂ شرکت مرتب کیا، جو آنحضور کی خدمتِ عالی میں مع اِستفتاءِ ھٰذا کے ارسال ہے، اب دریافت طلب اُمور حسبِ ذیل ہیں، قوی اُمید ہے کہ حضرتِ والا توجہ خاص فرما کر جلد از جلد اِستفتاءِ ھٰذا کے جوابات مفصل و مدلل تحریر فرما کر مرہونِ منّت کریں گے، والاجر عند اللہ۔

۱- ملفوف کردہ دستاویز (معاہدہ نامہ)[1] آیا شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

۲- اگر کوئی معاہد اس معاہدے کے خلاف عمل کرے تو ایسی مخالفت از رُوئے شریعت مخالفت ہوگی یا نہیں؟

---

(۱) شراکت کا یہ تفصیلی معاہدہ اس سوال کے آخر میں درج ہے، جس میں اس معاہدۂ شراکت کی تمام جزوی تفصیلات اور دفعات موجود ہیں۔ (محمد زبیر)

۳- اگر معاہدہ نامے میں شرکتِ تجارت کا سرمایہ یعنی اس کی مقدار متعین طور پر مذکور نہ ہو، مگر کسی خاص وجہ سے اس کی متعین مقدار سالانہ گوشوارے میں مذکور ہو تو شرکت معتبر ہوگی یا نہیں؟

۴- اگر کوئی شریک معاہدے کے مطابق عمل کرنا چھوڑ دے یعنی تجارت میں ذاتی طور پر کام کرنا چھوڑ دے جبکہ تجارت میں ذاتی طور پر کام کرنا معاہدہ نامے میں شرط کے طور پر مذکور ہے، اور پھر کام چھوڑ کر کہیں چلا جائے اور پندرہ سال تک اسی طرح غائب رہے تو شرعاً ایسا غائب شریک تجارت میں شریک سمجھا جاتا ہے یا نہیں؟ اور اس کی شرکت ختم ہوجاتی ہے یا نہیں؟

۵- اگر کسی شریک کے مستعفی ہونے کے بعد باقی شرکاء ان کے اِستعفاء کا جواب. (یعنی ان کو باقی شرکاء ان کے استعفاء کی قبولیت یا عدمِ قبولیت کی اطلاع) نہ دے تو ایسا اِستعفاء جو معاہدے کی دفعہ کے مطابق دیا گیا، شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

۶- معاہدۂ شرکت میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کسی شریک نے تحریراً شرکت سے الگ ہونے کا اِستعفاء دیا تو اِستعفاء کی تاریخ کے چھ ماہ بعد اس کی شرکت ازخود ختم ہوجائے گی، آیا اس دفعہ کے مطابق اگر کسی شریک نے تحریراً اِستعفاء دیا تو اس کی شرکت ختم ہوجائے گی یا نہیں؟

۷- اگر کسی شریک کے اس طرح مستعفی ہونے کے بعد بھی باقی شرکاء ان کو شریکِ تجارت مانتے رہے یعنی تقسیمِ مال کے وقت ان کو باقی شرکاء ان کا چوتھا حصہ دیتے رہے تو آیا مستعفی ہونے کے بعد باقی شرکاء سے اپنا چوتھا حصہ ملنے کی بناء پر اس کی شرکت باقی رہتی ہے یا ختم ہوجاتی ہے؟

۸- اگر کسی شریک نے اپنی طرف سے اِستعفاء تحریر کیا لیکن اس کا علم کسی شریک کو نہیں ہوا، اب کئی برس کے بعد اتفاقاً کہیں سے مذکورہ اِستعفاء ملا تو جبکہ یہ اِستعفاء بظاہر کسی کے سامنے پیش نہیں کیا گیا، نہ کسی کو اس کا علم تھا، شرعاً معتبر ہوگا یا نہیں؟ اور اگر معتبر ہے تو کس تاریخ سے اس کا اعتبار ہوگا؟

۹- اگر کوئی شریک معاہدہ نامے کی مخصوص دفعہ کے خلاف اپنا اِستعفاء باقی شرکاء کو پیش کرے تو ایسا اِستعفاء شرعاً معتبر ہوگا یا نہیں؟

۱۰- ایک شریک کے انتقال کے بعد باقی تمام شرکاء نے ایک مجلس منعقد کر کے اس میں مرحوم شریک کی اولاد کو ان کی جگہ شریکِ تجارت بنانے کا عقد کیا، اب بعض شرکاء کا یہ کہنا ہے کہ اس مجلس میں یہ عقد ضرور کیا گیا اور ہماری موجودگی میں کیا گیا، اور ہم نے اس سے اس وقت انکار بھی نہیں کیا، لیکن ہم نے عقد ہونے کے وقت اس لئے اپنی نامنظوری اور انکار اور عدمِ رضاء ظاہر نہیں کی کہ ہمارا بڑا بھائی موجود تھا، اور چونکہ ان کی موجودگی میں ہم نے کبھی ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کیا تھا اس واسطے ہم نے بالارادہ سکوت اِختیار کیا، تو آیا شرعاً ایسے سکوت کے باوجود مرحوم کی اولاد شریکِ تجارت مانی جائے

گی یا نہیں؟ (از راہِ کرم ضمیمہ متعلق بسوال نمبر ۵ اور ۶ ملاحظہ فرمائیں)۔

دُعاگو

بندہ بشیر احمد سنجالوی غفرلہٗ ولوالدیہ

از جوہانسبرگ جنوبی افریقہ

مخدومی ومکرمی

اس مسئلے اور معاملے میں آنجناب کی خاص مدد کی اشد ضرورت ہے، پوری اُمید آنجناب سے وابستہ ہے کہ ہر طرح کی مدد فرمائیں گے، اللہ تبارک وتعالیٰ آنجناب کے درجات سرفراز فرمائیں، آمین۔

طالبِ دُعا

بندہ بشیر احمد

بندہ شعبہ غفرلہٗ

(ضمیمہ از مستفتی متعلق بسوال نمبر ۵ اور ۶)

۱- مذکورہ مستعفی نے زبانی طور پر اِستعفاء دیا، پھر دوبارہ تحریراً اِستعفاء دیا، اور اس کے بعد اپنے اِستعفاء کے پیش کرنے کی شرکاء یاددہانی کراتے رہے، اور اس کے بعد انہوں نے خود شرکت کی تمام تجارتوں کا مکمل حساب وگوشوارہ تیار کیا جس میں انہوں نے اپنی شرکت کے حصے کی مجموعی قیمت لگاکر تحریر کی، اس مجموعہ قیمت سے کسی شریک نے انکار نہیں کیا تھا، اب مذکورہ تمام اُمور یعنی اِستعفاء پیش کرنے، نیز یاددہانی کرنے اور نام بنام دُوسرے شرکاء سے اس مجموعہ قیمت کی نقلیں بھیج کر پھر تجارت سے دست بردار ہوکر کام چھوڑ کر چلے جانا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے اِستعفاء کی پختگی مقصود تھی، اور یہ کہ وہ ہر طرح سے مکمل طور پر مستعفی ہونے کو چاہتے تھے، اب ایسے شریک کا اس طرح اِستعفاء دینا آیا من حیث الشرع مسموع ومعتبر ہوگا یا نہیں؟

۲- نیز مذکورہ مستعفی اِستعفاء دینے کے بعد وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت مختلف رقمیں شرکت کی تجارت سے کچھ پندرہ بیس سال تک برابر وصول کرتے گئے، اب آیا ان مختلف رقموں کو کس چیز کے عوض میں شمار کیا جائے گا؟ آیا اس کی شرکت کا حصہ شمار ہوگا یا قرضہ مان لیا جائے؟ فقط۔

(معاہدۂ شرکت)

(تمہید)

الف:- چاروں شریکوں نے اقرار کیا کہ موسیٰ اسماعیل کی تمام جائیداد اور دیگر ملکیتوں کو انہوں نے حاصل کیا ہے۔

ب:- چاروں نے اس مجموعہ تجارت میں شریک بننے اور شرکت قائم کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی، اور انہوں نے اس شرکت کو قائم کیا۔

ج:- عقدِ شرکت کے شروط و قیود کو تحریری طور پر ایک دستاویز میں قلم بند کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی، جو حسبِ ذیل ہے:-

(دفعات)

۱- مذکورہ شرکاء اس بات کی رضاء ظاہر کرتے ہیں کہ وہ سب اس ''جنرل مرچنٹ'' کی تجارت میں شرکاء کی حیثیت رکھیں گے۔

۲- اس مجموعہ تجارت کی ظاہری صورت ''سلیمان اسماعیل میاں اینڈ کمپنی'' ہوگی، نیز یہ شرکت والی تجارت تینتالیس مارکیٹ اسٹریٹ سے جاری رکھی جائے گی، اور اس کے بعد جہاں سے شرکاء اپنی رضامندی ظاہر کریں گے۔

۳- باوجودیکہ شرکت شروع ہونے کی تاریخ اس دستاویز پر لکھی گئی ہے، لیکن اس شرکت کی ابتداء کی تاریخ پہلی جولائی انیس سو بتیس عیسوی ہوگی۔

۴- شرکتِ ھٰذا کے سرمایہ میں ہر شریک کا برابر حصہ ہوگا (لیکن دستاویز میں سرمایہ کی مقدار نہیں لکھی گئی، اور وہ درج نہیں ہے)۔

۵- اس تجارت کا نفع برابر حصوں میں شریکوں کا حق ہوگا، اور چاروں شریک برابر حصے سے تجارت کا نقصان اُٹھائیں گے۔

۶- تجارت کے حساب کے دفاتر باقاعدہ اچھی طرح سے رکھے جائیں گے، نیز ہر عقدِ تجارت اور ہر معاملۂ تجارت درج ہوتا رہے گا، اور مسلسل تاریخ بتاریخ اس کا ریکارڈ رکھا جائے گا، دیگر یہ کہ جہاں جہاں بھی تجارت جاری ہوگی وہاں بعینہٖ ہر جگہ ایسا دفتر رکھا جائے گا جس میں نقود و معاملات و حسابات پورے پورے لکھے جائیں گے، نیز یہ کہ ایسے دفاتر اور حسابات کے رجسٹر ہر شریک جب بھی چاہے گا ان کا معائنہ کرنے کا حق رکھے گا۔

۷- ہر سال کی تیس جون یا اس کے بعد جب بھی عملاً ممکن ہو ایک گوشوارہ نیز نفع/ نقصان کا حساب تیار کیا جائے گا، جس میں شریکوں کی ملکیتوں میں نفع/ نقصان درج کیا جائے گا، اور ہر شریک کا الگ حصہ اس کے نام پر درج کیا جائے گا، لیکن کسی شریک کا نفع بغیر تمام شریکوں کی تحریری اجازت کے نہیں نکالا جائے گا۔

۸- ہر شریک پر ضروری ہوگا کہ وہ حسبِ ذیل اُمور میں عملاً حصہ لے گا:-

الف:- ہر شریک اپنا پورا وقت اور پوری توجہ اس شرکت کی تجارت میں لگائے گا، اور اِشتیاق وایمان داری سے حتی الوسع اپنی ذمہ داریاں دیگر شرکاء کے باہم مشورے سے ادا کرے گا۔

ب:- شرکاء پر لازم ہوگا کہ وہ اپنے ہم شریک سے ایمان داری اور اِنصاف سے کام کرے گا، اور یہ کہ وہ ہر وقت آپس میں ایک دُوسرے کو باخبر رکھتے جائیں گے، اور جہاں بھی جس وقت بھی کوئی وضاحت طلب بات پیش آئے گی تو وہ بخوشی وضاحت کریں گے، بغیر کسی اِخفاء و جبر کے۔

ج:- حسبِ معمول تمام رُقومِ تجارت کو، نیز تمام چیکوں کو اور دیگر معاوضاتِ تجارت کو بینک کے کھاتے میں رکھا جائے گا۔

د:- ہر شریک پر ضروری ہوگا کہ وہ اپنا ذاتی قرضہ خود اَدا کرے تاکہ دُوسرے شرکاء ایسے اِخراجات سے ہر وقت بری اور منزہ رہیں۔

۹- ہر شریک حسبِ ذیل اُمور کا مستحق ہوگا:-

الف:- تجارت کی طرف سے چیک نکلوانا۔

ب:- اپنے نفع کے حصے سے ماہانہ پچیس پونڈ نکالنا جو اس کے حساب سے منہا کیا جائے گا یعنی منہا ہوتا رہے گا۔

ج:- ہر چار سال میں ایک برس کی تعطیل ملے گی۔

۱۰- کسی شریک کو بغیر دیگر حاضرین شرکاء کی سابق رضامندی کے حسبِ ذیل اُمور کا حق نہیں پہنچے گا:-

الف:- بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی اور الگ تجارت میں مشغول ہونا۔

ب:- خود اپنے ذاتی سرمائے کے حصے سے کچھ رقم فوقتاً فوقتاً نکالنا۔

ج:- ایسے لوگوں اور گاہکوں کے بارے میں جن کو دُوسرے شریکوں نے بھروسہ دار ماننے سے سابق طور پر تحریر کے ذریعہ منع کیا ہو، ان کو قرضہ دینا یا اُدھار پر مال فروخت کرنا۔

د:- کوئی بھی ایسا کام کرنا یا اپنی طرف سے کفالت یا ضمانت دینا جس سے شرکت کی تجارت یا جائیداد کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔

ر:- تجارت کے ایسے کاغذات پر تصدیق یا ادائیگی کا سکہ لگانا جس سے تجارت کو نقصان ہو۔

س:- اپنے حصے سے تجارت کی جائیداد یا منافع کو بیچنا، تحویل کرنا، یا رہن رکھنا۔

ص:- تجارت کی رقم یا مال ومتاع کو کام میں لانا یا رہن رکھنا، سوائے تجارت کے عام نفع کے لئے یا روزمرہ تجارتی کاموں میں۔

ط:- تجارت کے کسی ملازم کو ملازمت پر رکھنا یا اس کو معزول کرنا، بجز فحش بداخلاقی کی وجہ سے۔

ع:- تجارتی غرض سے ٹرانسوال صوبے کی حدود سے آگے سفر کرنا۔

ف:- ایک سو پونڈ سے زیادہ کا معاہدہ یا وعدہ یا اِجارہ کرنا، بشرطیکہ ایسا معاملہ معمولی تجارتی کارروائی کے خلاف نہ ہو۔

ی:- کوئی بھی ایسا معاہدہ انجام دینا جو اس تجارت کی روزمرہ کارروائی کے خلاف ہو۔

۱۱- ہر شریک کو یہ حق رہے گا کہ وہ جس وقت بھی چاہے مستعفی ہوسکتا ہے، بشرطیکہ وہ مستعفی ہونے سے چھ مہینے پہلے اپنا اِستعفاء شریکوں کو پیش کرے یعنی جون ماہ کی تیس تاریخ کو یا اگر دسمبر ماہ کی انیس تاریخ کو طالبِ فسخ اپنا اِستعفاء دینے کا ارادہ کرے تو پھر ایسے شریک کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنا اِستعفاء چھ ماہ پہلے پیش کردے یعنی جنوری کی پہلی تاریخ کو یا جولائی ماہ کی پہلی تاریخ کو، نیز اِستعفاء کا تحریری ہونا ضروری ہوگا، ایسے اِستعفاء کے پیش کردینے کے بعد چھ ماہ گزرتے ہی اس کی شرکت ختم ہوجائے گی بربناء اِستعفاء پیش کردینے کے، لہٰذا مستعفی شریک کی شرکت کو فسخ سمجھنے پر دفعہ نمبر۱۲ کی شرطیں اب مستلزم ہوجائیں گی گویا کہ فسخ کرنے والے شریک کا انتقال ہوگیا ہو، جس کی بنا پر وہی قواعد و ضوابط لازم سمجھے جائیں گے جو کہ کسی شریک کے انتقال کے وقت سمجھے جاتے ہیں، کسی شریک کی وفات یا اِستعفیٰ پر باقی شریکوں کے حق میں عقدِ شرکت قائم اور باقی سمجھا جائے گا۔

۱۲- شرکت جاری ہوتے ہوئے اگر کسی شریک کا انتقال ہوجائے تو باقی زندہ شرکاء میں سے ہر ایک اس کی موت کی تاریخ سے اپنے الگ حصے کے مطابق متوفی شریک کے تجارتی حصے میں مشترک طور پر مالک بن جائے گا، نیز تیس جون سے لے کر وفات تک جتنے ماہ گزرے ہیں ہر ماہ کے مقابلے میں ان کی اولاد کو ان کے حصے سے ماہانہ پچیس پونڈ مع ان کے تجارتی حصے کی قیمت ادا کی جائے گی (یعنی متوفی شریک کے حصے کو ان کی اولاد سے باقی زندہ شرکاء خرید لیں گے) جبکہ شریک دفعہ نمبر۱۱ کے مطابق مستعفی ہوجائے تو یا تو اِستعفاء کی تاریخ تیس جون کی ہے یا پھر اکتیس دسمبر کی ہے تو اگر تیس جون کی ہوگی تو اس سے اگلے سال کی تیس جون کو اس کے حصے میں جتنی رقم تھی اتنی ہی رقم کا حق دار ہوگا مع اس سال کے تجارتی نفع کے، اور اگر اکتیس دسمبر کی ہوگی تو پھر اس سال کے تیس جون کو اس کے حصے میں جتنی رقم تھی اتنی ہی رقم کا وہ حق دار ہوگا مع ایک سو پچاس پونڈ کے، جو جون کی تیس تاریخ سے لے کر اکتیس دسمبر تک اس کے حصے کا نفع سمجھا جائے گا۔ کسی مستعفی شریک کو یہ حق نہیں پہنچے گا کہ وہ پگڑی کی رقم طلب کرے، نہ اس کو یہ حق پہنچے گا کہ تجارتی نقصان جو حسابِ تجارت سے منہا کیا گیا ہے اس کی بابت وہ کچھ تبدیل کرانے کا مطالبہ کرے، مستعفی شریک یا متوفی شریک کے نمائندے کو ثمن

مبیع قسط وار ماہانہ پانچ سو پونڈ کے حساب سے چھتیس ماہانہ قسطوں میں (دونوں میں جو اَقل مقدار ہوگی) ادا کیا جائے گا۔

۱۳- شرکت کی بابت اگر کچھ جھگڑا یا نااتفاقی پیش آئے تو سب سے پہلے شریکوں کے والد محترم یعنی حاجی موسیٰ اسماعیل صاحب سے رُجوع کیا جائے گا، اور ان کی عدم موجودگی میں شریکوں کی والدہ یعنی حاجیانہ امینہ سے رُجوع کیا جائے گا، اور ان کی عدم موجودگی میں اس تجارت کے محاسب منشی سے رُجوع کیا جائے گا، اور ان کی عدم موجودگی میں دو حَکَم ایسے مقرّر کئے جائیں گے جن کا انتخاب فریقین کی طرف سے ہوگا، اور پھر یہ مقرّر کئے ہوئے دو حَکَم اس معاملے میں اپنی طرف سے کام شروع کرنے سے پہلے کوئی ایسے شخص کو نامزد کریں جو ان دونوں حَکَم کے درمیان میں حاکم قرار دیا جائے گا تاکہ یہ حَکَم حکمین کی نااتفاقی کی صورت میں قطعی فیصلہ کرسکے۔

۱۴- شرکاء تجارتِ ھٰذا اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب کوئی جھگڑا پیدا ہوگا درمیان تجارت کے مینیجر اور کسی شریک کے تو پھر یہی دفعہ نمبر۱۳ کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا، مذکورہ بالا شرطوں کے باوجود اگر شرکاء کے درمیان میں تجارت کے سلسلے میں کوئی نااتفاقی پیدا ہوئی تو اکثر شریکوں کی رائے کا اعتبار ہوگا، نیز یہ کہ اگر کوئی شریک حاضر نہ ہوسکے تو پھر اس کو حق پہنچے گا کہ وہ اپنی طرف سے کسی شخص کو وکیل مقرّر کرے۔ (ختم شد)

شاہد نمبر۱:- زید شاہد نمبر۲:- عمرو

امضاءات شرکاء

۱- ایوب ابن موسیٰ ۲- یونس بن موسیٰ

۳- ہارون بن موسیٰ ۴- سلیمان بن موسیٰ

جواب:- سوالات کے جوابات بالترتیب مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- صورتِ مسئولہ میں شرکت دُرست ہوگئی، اور اگرچہ حنفی مسلک میں ''شرکت بالعروض'' دُرست نہیں ہوتی،[1] لیکن چونکہ صورتِ مسئولہ میں حاجی موسیٰ اسماعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادوں نے تمام جائیدادیں اپنے والد سے مشترک طور پر خرید لیں، اس لئے ان کے درمیان ''شرکۃ الملک'' متحقق ہوگئی،[2] اور ''شرکۃ الملک'' کے تحقق کے بعد ''شرکۃ العقد'' عروض میں بھی دُرست

---

(۱) راجع للدّلیل والتفصیل إلیٰ بدائع الصنائع ج:۶ ص:۵۹ لا تصح الشرکۃ فی العروض، والمبسوط للسرخسی ج:۱۱ ص:۱۵۹ (طبع ادارۃ القرآن) والتاتارخانیۃ ج:۵ ص:۴۲۲ (طبع قدیمی کراچی) وفتح القدیر ج:۵ ص:۳۸۹ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) وشرح المجلّۃ لعلی حیدر ج:۱۰ ص:۳۷۴ رقم المادّۃ:۱۳۴۲ (طبع دار الکتب بیروت) ومجلّۃ الأحکام العدلیۃ ج:۴ ص:۱۳۴۲ (طبع نور محمد کراچی).

(۲) وفی البحر الرّائق، کتاب الشرکۃ ج:۵ ص:۱۶۶ (طبع سعید) أن یملک أثنان عینًا ارثًا أو شراءً بیان للنوع الأوّل منها وقولہ ارثا أو شراءً مثال لا قید .... والحاصل أنھا نوعان جبریۃ واختیاریۃ فاشار الی الجبریۃ بالارث والی الاختیاریۃ بالشراء کما فی المحیط .... الخ.

ہے، لما فی الھندیة:-

والحیلة فی جواز الشرکة فی العروض وکل ما یتعیّن بالتعیین أن یبیع کل واحد منھما نصف مالہ بنصف مال صاحبه حتی یصیر مال کل واحد منھما نصفین، وتحصل شرکة ملک بینھما، ثم یعقدان بعد ذٰلک عقد الشرکة فیجوز بلا خلاف کذا فی البدائع.

(عالمگیریة ج:۲ ص:۳۰۷، باب اوّل، فصل:۳).(۱)

لہٰذا صحتِ شرکت میں عروض کی وجہ سے اِشکال نہ رہا۔

جہاں تک اس معاہدۂ شرکت کا تعلق ہے، جو ضمیمے کی دستاویز میں قلم بند ہے، سو اس کی اکثر شرائط دُرست ہیں، لیکن اس میں بعض شرطیں فاسد بھی ہیں، مثلاً وہ شرط جو دفعہ۱۰ ذیل الف میں مذکور ہے کہ کوئی شریک بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنی کوئی الگ تجارت نہیں کر سکے گا۔ یہ شرط شرکتِ عنان کے مقتضا کے خلاف ہے، اور شرکتِ مفاوضہ کی شرائط یہاں موجود نہیں، لہٰذا یہ شرط فاسد ہے، لیکن شرکت میں اگر کوئی شرطِ فاسد لگادی جائے تو اس سے شرکت باطل نہیں ہوتی، بلکہ صرف وہ شرط فاسد ہوجاتی ہے اور اس پر عمل ضروری نہیں ہوتا۔

لما فی ردّ المحتار: لأنّ الشرکة لا تفسد بالشروط الفاسدة.

(شامی ج:۳ ص:۳۷۶).(۲)

ایک اور شرطِ فاسد معاہدے کی دفعہ۱۲ میں یہ مذکور ہے کہ کسی ایک شریک کی وفات کی صورت میں ۳۰؍جون سے لے کر وفات تک جتنے ماہ گزرتے ہیں، ہر ماہ کے مقابلے میں ان کی اولاد کو پچیس پونڈ ماہانہ مع ان کے تجارتی حصے کی قیمت ادا کیا جائے گا، انگریزی معاہدہ نامے میں یہ صراحت ہے کہ یہ پچیس پونڈ ماہانہ کی رقم اس نفع کے قائم مقام سمجھی جائے گی جو ۳۰؍جون کے بعد وفات کی تاریخ تک مرحوم کے حصے میں آئی ہو۔

دفعہ۱۱ میں بھی اسی قسم کی ایک شرطِ فاسد یہ ہے کہ اگر کوئی شریک ۳۱؍دسمبر کو شرکت ختم کردے تو وہ اتنی رقم کا حق دار ہوگا جو ۳۰؍جون کو اس کے حصے میں تھی، مع ایک سو پچاس پونڈ کے جو ۳۰؍جون سے ۳۱؍دسمبر تک اس کے حصے کا نفع سمجھا جائے گا، یہ شرط بھی مذکورہ بالا وجہ کی بناء پر فاسد ہے، اگر اس

---

(۱) (طبع مکتبة رشیدیه کوئٹه)

وفی بدائع الصنائع، کتاب الشرکة ج:۶ ص:۵۹ (طبع سعید) والحیلة فی جواز الشرکة فی العروض وکل ما یتعیّن بالتعیین أن یبیع کلّ واحد منھما نصف ماله بنصف مال صاحبه حتّی یصیر مال کل واحد منھما نصفین، وتحصل شرکة ملک بینھما ثم یعقدان بعد ذٰلک عقد الشرکة فتجوز بلا خلاف. وکذا فی الدّر المختار ج:۴ ص:۳۱۰ (طبع سعید) وکذا فی التاتارخانیة ج:۵ ص:۴۲۴ (طبع قدیمی کراچی).

(۲) ردّ المحتار، کتاب الشرکة ج:۴ ص:۳۱۶ (طبع سعید) وکذا فی الھندیة ج:۲ ص:۳۰۳ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه)　　(محمد زبیر حق نواز)

طرح کسی ایک شریک کے لئے کوئی متعین رقم بطورِ نفع اصل شرکت ہی میں مقرّر کر لی جاتی تو اس سے شرکت ہی فاسد ہو جاتی۔

لما فی الدر المختار: وتفسد باشتراط دراهم مسماة من الربح لأحدهما لقطع الشركة كما مر لا لأنه شرط، لعدم فسادها بالشروط.

(درمختار مع شامی ج:۴ ص:۳۷۶ و ۳۷۷)۔[1]

لیکن چونکہ اسی معاہدہ نامے کی دفعہ۵ میں شرکاء کے درمیان نفع کی تقسیم کا عام طریقہ شریعت کے مطابق ہے اور اس میں کسی بھی فریق کے لئے کوئی معین رقم مقرّر کرنے کے بجائے نفع و نقصان میں برابر کی شرکت طے کی گئی ہے، اور اصل شرکت کا معاہدہ اسی دفعہ پر مبنی ہے، اور دفعہ۱۱ و۱۲ میں جو طریقِ کار مقرّر کیا گیا ہے وہ دفعہ۵ سے متعارض ہے، اور صرف فسخِ شرکت کے وقت حساب کا ایک طریقہ طے کرنے کے لئے مقرّر کیا گیا ہے، بلکہ انگریزی متن میں معین رقم کو ''نفع کا قائم مقام'' قرار دیا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ نفع تو وہی ہوگا جو دفعہ۵ کے تحت مقرّر ہوگا، لیکن یہ معین رقم اس کے قائم مقام سمجھی جائے گی، اس لئے اس شرطِ فاسد کی وجہ سے اصل عقدِ شرکت باطل نہ ہوگا، البتہ یہ شرط باطل ہو جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ''معاہدۂ شرکت'' کی وہ دستاویز جو اِستفتاء کے ساتھ منسلک ہے، اس حد تک تو شرعاً معتبر ہے کہ اس کی بنیاد پر شرکت دُرست ہوگئی، لیکن اس میں جو شرائطِ فاسدہ مذکور ہیں، جن کا ذکر اُوپر آیا ہے، وہ شرائط شرعاً واجب العمل نہیں ہیں۔

۲:- جن شرائطِ فاسدہ کا ذکر سوال نمبر۱ کے جواب میں آیا ہے، ان پر تو عمل واجب نہیں،

---

(۱) الدر المختار ج:۴ ص:۳۱۶ (طبع سعید)

وفی الهداية ج:۲ ص:۶۱۱ (طبع رحمانیه) ولا يجوز الشركة اذ اشرط لأحدهما دراهم مسماة من الرّبح لأنّه شرط يوجب انقطاع الشركة .... الخ.

وفی الهندية ج:۲ ص:۳۰۲ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) وأن يكون الرّبح معلوم القدر فان كان مجهولًا تفسد الشركة وان يكون الرّبح جزءًا شائعًا فی الجملة لا معيّنًا فان عيّنا عشرة أو مائة أو نحو ذلک كانت الشركة فاسدة ..... الخ.

وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۵۹ (طبع سعيد) (ومنها) أن يكون الرّبح جزءًا شائعًا فی الجملة لا معيّنًا فان عيّنا عشرة أو مائة أو نحو ذلک كانت الشركة فاسدة لأنّ العقد يقتضي تحقق الشركة فی الرّبح والتعيين يقطع الشركة لجواز أن لا يحصل من الرّبح الّا القدر المعيّن لأحدهما فلا يتحقق الشركة فی الرّبح.

وفی فتح القدير، كتابُ الشركة ج:۵ ص:۴۰۲ (طبع رشيديه) ولا تجوز الشركة اذ اشرط لأحدهما دراهم مسماة من الرّبح قال ابن المنذر لا خلاف فی هذا لأحد من أهل العلم ووجههٗ ما ذكره المصنف بقوله لأنّه شرط يوجب انقطاع الشركة فعساهٗ لا يخرج الّا قدر المسمّٰى.

وفی تبيين الحقائق، كتابُ الشركة ج:۴ ص:۲۴۸ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وتفسد ان شرط لأحدهما دراهم مسمّاة من الرّبح لأنّه شرط يوجب انقطاع الشركة فی بعض الوجوه فلعلّه لا يخرج الّا القدر المسمّٰى لأحدهما من الرّبح. وكذا فی خلاصة الفتاوىٰ ج:۴ ص:۲۹۴ (طبع امجد اكيڈمی لاهور) والبحر الرّائق ج:۵ ص:۱۷۷ (طبع سعيد) وشرح المجلّة لسليم رستم باز رقم المادّة:۱۳۳۷ ج:۲ ص:۷۱۳ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).

(محمد زبیر حق نواز)

لیکن باقی تمام شرائط جو شرعاً دُرست ہیں، ان کی مخالفت کسی بھی شریک کے لئے جائز نہیں، لأنّ المسلمین علیٰ شروطھم الا شرطًا حرّم حلالًا أو أحلّ حرامًا۔[1]

۳:- اگر یہ بات متعین طور پر معلوم ہو یا کسی جگہ لکھی ہوئی محفوظ تھی کہ چاروں بھائیوں نے اپنے والد سے جو جائیدادیں خریدی ہیں، وہ کیا کیا ہیں؟ اور کہاں کہاں ہیں؟ تو پھر معاہدہ نامۂ شرکت میں ان کی جزوی تفصیلات اور مقدار بیان کرنا شرکت کی صحت کے لئے ضروری نہیں تھا، اس کے دو سبب ہیں:-

الف:- پہلا سبب یہ کہ سرمایۂ شرکت کی مقدار کا تعین عقد کے وقت عقد کی صحت کے لئے ضروری نہیں ہوتا۔

لما فی البدائع: وأما العلم بمقدار رأس المال وقت العقد فلیس بشرط لجواز الشرکۃ بالأموال عندنا وعند الشافعی رحمہ اللہ شرط ..... ولنا أن الجھالۃ لا تمنع جواز العقد لعینھا، بل لافضائھا الی المنازعۃ وجھالۃ رأس المال وقت العقد لا تفضی الی المنازعۃ، لأنہ یعلم مقدارہ ظاھرًا وغالبًا لأنّ الدراھم والدنانیر توزنان وقت الشراء فیعلم مقدارھا فلا یؤدی الی جھالۃ مقدار الربح وقت القسمۃ. (بدائع الصنائع ج:٦ ص:٦٣)[2]

ب:- دُوسری وجہ یہ ہے کہ صورتِ مسئولہ میں چاروں بھائیوں کے درمیان عقدِ شرکت عنان سے پہلے شرکتِ ملک قائم ہوچکی تھی، جیسا کہ سوال نمبر۱ کے جواب میں لکھا گیا ہے، اور سب کے حصے بھی برابر تھے، اور نفع بھی، اس لئے مقدار معلوم نہ ہونے سے جہالت مفضی الی المنازعہ کا کوئی اندیشہ نہیں تھا، شرکت فی العروض کا جو حیلہ سوال نمبر۱ کے جواب میں ذکر کیا گیا ہے، اس کے سلسلے میں علامہ ابنِ ہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:-

وھٰذا لأنّ المانع من کون رأس مال الشرکۃ عروضًا کل من أمرین: لزوم ربح ما لم یضمن، وجھالۃ رأس مال کل منھما عند القسمۃ، وکل منھما منتف، فیکون کل ما ربحہ أحدھما ما ھو مضمون علیہ، ولا تحصل جھالۃ

---

(۱) وفی جامع الترمذی رقم الحدیث: ۱۲۷۲ "المسلمون علیٰ شروطھم الّا شرطًا حرّم حلالًا أو أحلّ حراماً" (وکذا فی الصحیح للبخاری، کتاب الاجارۃ).

(۲) (طبع سعید) وفی الھندیۃ ج:۲ ص:۳۰٦ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) اما العلم بمقدار رأس المال وقت العقد فلیس بشرط عندنا.

فی رأس مال کل منهما، لأنه لا یحتاج الی تعرف رأس مال کل منهما عند القسمة حتی یکون ذٰلک بالحذر فتقع الجهالة لأنهما مستویان فی المال شریکان فیه فبالضرورة یکون کل ما یحصل من الثمن بینهما نصفان۔

(فتح القدیر ج:۵ ص:۳۹۶)[1]

۴:- محض کام چھوڑ دینے اور غائب ہوجانے سے شرکت ختم نہیں ہوتی۔

لما فی العالمگیریة: وان عمل أحدهما ولم یعمل الآخر بعذر أو بغیر عذر صار کعملهما معا، کذا فی المضمرات۔

(فتاویٰ عالگمیریة ج:۲ ص:۳۲۰، کتاب الشرکة باب:۳ فصل:۲)[2]

اگر دُوسرے شرکاء اس کے کام چھوڑ دینے کی صورت میں اس کے ساتھ شرکت پسند نہیں کرتے تھے تو ان کو اس کے ساتھ صراحۃً شرکت فسخ کردینی چاہئے تھی۔

۵:- یک طرفہ طور پر شرکت فسخ کرنے کے لئے شرعاً ضروری نہیں کہ فریقِ ثانی فسخ کو قبول کرے۔

لما فی الدر المختار: وتبطل أیضًا بانکارها وبقوله لا أعمل معک فتح وبفسخ أحدهما۔[3] (شامی ج:۳ ص:۳۸۴)

اور جو معاہدۂ شرکت صورتِ مسئولہ میں لکھا گیا ہے اس میں بھی اِستعفاء کے مؤثر ہونے کو دُوسرے شرکاء کی قبولیت پر موقوف نہیں رکھا گیا، لہٰذا جب کسی شریک نے معاہدے کے مطابق اِستعفاء دیا تو اس کی شرکت معاہدے میں مذکورہ مدّت سے ختم سمجھی جائے گی، خواہ دُوسرے شرکاء نے اِستعفاء قبول کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

۶:- ہوجائے گی، دلیل نمبر۵ میں گزرگئی۔

(۱ و ۲) (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

(۳) الدّر المختار، کتابُ الشرکة، فصل فی الشرکة الفاسدة ج:۴ ص:۳۲۷ (طبع سعید).

وفی الهندیة ج:۲ ص:۳۳۲ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) واذا قال أحد الشریکین لصاحبه لا أعمل معک بالشرکة فهو بمنزلة قوله فاسختک الشرکة.

وفی التاتارخانیة ج:۵ ص:۲۳۷ (طبع ادارة القرآن) واذا انکر أحد المتفاوضین المفاوضة انفسخت المفاوضة هکذا ذکر شیخ الاسلام فیجب أن یکون الحکم فی جمیع الشرکات هکذا وفی الظهیریة واذا أنکر أحد الشریکین الشرکة ومال الشرکة امتعة کان هٰذا فسخًا للشرکة.

وفی فتح القدیر ج:۵ ص:۳۸۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) لأن عقد الشرکة عقد غیر لازم فان لکل منهما ان یفسخه اذا شاء.

وفی درر الحکام شرح المجلّة لعلی حیدر، تحت المادّة رقم:۱۳۵۳ تنفسخ الشرکة بفسخ أحد الشریکین أو بانکاره الشرکة أو یقول أحدهما للآخر لا أعمل معک فانه بمنزلة فاسختک. (محمد زبیر حق نواز)

۷:- اُوپر گزر چکا ہے کہ معاہدے کے مطابق اِستعفاء دے دینے سے مستعفی شریک کی شرکت ختم ہوگئی، اب اس کو دوبارہ شریک قرار دینے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ اَزسرِنو عقدِ شرکت کیا جائے، لہٰذا اگر اس کے بعد دُوسرے شرکاء نے اس شخص کے ساتھ واضح طور پر دوبارہ تحریری یا زبانی عقدِ شرکت قائم کرلیا ہو، اور اس کی بناء پر وہ اسے چوتھا حصہ دیتے رہے ہوں تب تو وہ دوبارہ شریک سمجھا جائے گا، ورنہ نہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی نیا عقدِ شرکت نہیں ہوا اور اسے دُوسرے شرکاء محض چوتھا حصہ دیتے رہے تو اس میں کئی اِحتمالات ہیں، ایک یہ کہ شرکاء اسے تبرّعاً یہ رقم دیتے رہے ہوں، دُوسرے یہ کہ شرکت کے فسخ کی بناء پر مستعفی شریک کے جس حصے کی ادائیگی دُوسرے شرکاء پر واجب تھی یہ رقم اس کے حصے کے طور پر دیتے رہے ہوں، لہٰذا جب تک فریقین کے درمیان نئے عقدِ شرکت کا صریح معاہدہ نہ ہوا ہو ان احتمالات کی موجودگی میں محض چوتھے حصے کی ادائیگی کو عقدِ شرکت نہیں کہا جاسکتا، لأن الشركة لا تثبت بالاحتمال۔

۸:- شرعاً بھی شرکت کے فسخ کے لئے یہ ضروری ہے کہ فسخ کرنے والا دُوسرے شرکاء کو اپنے فسخ کی اطلاع دے، اس کے اطلاع دیئے بغیر شرکت فسخ نہیں ہوتی۔

لما في الدر المختار: وتبطل أيضًا بانكارها .... وبفسخ أحدهما ..... ويتوقف على علم الآخر لأنه عزل قصدي، وفي ردّ المحتار: (قوله لأنّه عزل قصدي) لأنّه نوع حجر فيشترط علمه دفعًا للضرر عنه فتح.

(ردّ المحتار ج:۳ ص:۳۸۴ و ۳۸۵)[1]

اور منسلکہ معاہدے میں بھی اِستعفاء کے لئے دُوسرے شرکاء پر پیش کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے، لہٰذا اگر کسی شریک نے اِستعفاء لکھ کر اپنے پاس رکھ لیا اور کسی دُوسرے شریک کو پیش نہیں کیا، تو اس سے شرکت فسخ نہیں سمجھی جائے گی، ہاں جب کبھی وہ شریک ازخود وہ اِستعفاء نکال کر دُوسرے شرکاء کو پیش کردے تو پیش کرنے کی تاریخ سے چھ ماہ بعد حسبِ معاہدہ شرکت فسخ ہوگی۔

---

(۱) ردّ المحتار ج:۴ ص:۳۲۷ (طبع سعيد كراچی)

وفي التاتارخانية ج:۵ ص:۳۳۷ (طبع ادارة القرآن) .... وهذا اذا فسخ بحضرة صاحبه اما لو فسخ بغيبة صاحبه ولم يعلم صاحبه بالفسخ لا يصح.

وفي الهندية ج:۲ ص:۳۳۵ (طبع رشيديه كوئٹه) ولو لم يمت لكن فسخ أحدهما الشركة ولم يعلم شريكه لا تنفسخ الشركة. وكذا في فتح القدير، كتاب الشركة ج:۵ ص:۴۱۳ (طبع رشيديه).

وفي شرح المجلّة لعلي حيدر ج:۱۰ ص:۳۹۰ (طبع دار الكتب بيروت) تنفسخ الشركة بفسخ أحد الشريكين ولكن يشترط ان يعلم الآخر بفسخه ولا تنفسخ الشركة ما لم يعلم الآخر فسخ الشريك.

۹:- یہ سوال واضح نہیں، معاہدہ نامے کی مخصوص دفعہ کے خلاف اِستعفاء پیش کرنے کی کیا شکل ہے؟ وضاحت سے لکھا جائے تو جواب ممکن ہوگا۔

۱۰:- یہ جزئیہ صراحۃً نظر سے نہیں گزرا، لیکن متعدّد دُوسرے جزئیات پر قیاس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صورتِ مسئولہ میں مرحوم شریک کی اولاد کو شریکِ کاروبار تصوّر کیا جائے گا۔ اصل یہ ہے کہ مرحوم کی وفات پر ان کے ساتھ شرکت ختم ہوگئی، اب ان کے دُوسرے شرکاء پر لازم ہوگیا کہ مرحوم کا حصہ ان کے ورثاء کو اَدا کردیں، اور اگر انہیں شریکِ کاروبار رکھنا چاہیں تو تمام شرکاء کی رضامندی لازمی ہوگی۔

لما فی الدر المختار: لا یملک الشریک الشرکة الّا باذن شریکه جوهرة. (ج:۳ ص:۳۷۸)[1]

اب یہ رضامندی عام حالات میں صریح الفاظ کے ساتھ ہونی چاہئے، لأنَ الساکت لا ینسب الیه قول،[2] لیکن جب دوشریکوں نے اسی غرض کے لئے مجلس منعقد کی، اور اس میں مرحوم کی اولاد کو شریک بنانے کا فیصلہ کیا تو یہ فیصلہ تمام شرکاء کی طرف سے کیا گیا، اس وقت ایک شریک موجود ہونے کے باوجود خاموش رہا، اور اس پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اس کے بعد مرحوم کی اولاد شریکِ کاروبار کی حیثیت سے مدّت تک تصرف کرتی رہی، پھر بھی اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا، تو یہ مجموعی طرزِعمل رضامندی ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

نظیره ما فی الاشباه: سکوته عند بیع زوجته أو قریبه عقارًا اقرار بأنّه لیس له علی ما افتی به مشایخ سمرقند.

وفیه بعد ذلک: راٰه یبیع أرضًا أو دارًا فتصرف فیه المشتری زمانا وهو ساکت یسکت دعواه.

اس کے تحت علامہ حموی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

فیه عما قبله زیادة تصرف المشتری بعد الشراء زمانا وهو ساکت فهو قید فی الأجنبی لا فی الزوجة والقریب کما یفهمه اطلاقه.

(شرح الاشباه والنظائر للحموی ج:۱ ص:۱۸۷)[3]

یہی مسئلہ درمختار اور ردّ المحتار میں اشباہ سے نقل کرکے اسی طرح کتاب الوقف میں

---

(۱) الدُّر المختار، کتابُ الشرکة ج:۴ ص:۳۱۷ (طبع سعید).

(۲) رد المحتار ج:۳ ص:۶۲ قاعدة لا ینسب الی ساکت قول. وکذا فی الأشباه والنظائر ج:۲ ص:۱۷۰ (طبع دار الکتب العلمیة).

(۳) القاعدة الثانیة عشر ج:۱ ص:۹۷ (طبع سعید).

بھی ذکر کیا گیا ہے۔ (ردّ المحتار ج:۳ ص:۴۸۹)[۱]

۱۱:- مستفتیٰ مذکور ہی کی طرف سے زیرِ بحث معاملے ہی کے متعلق ایک اور اِستفتاء بعد میں موصول ہوا، اس میں انہی سوالات کا اعادہ ہے جن کا جواب پیچھے آچکا ہے، البتہ اس میں ایک سوال زائد ہے، اور وہ یہ کہ معاہدہ نامے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ شرکت کا کاروبار صوبہ ٹرانسوال تک محدود رکھا جائے گا، بعد میں برضامندیٔ شرکاء اس کاروبار کو دُوسرے علاقوں تک بھی وسعت دی گئی، سوال یہ کیا گیا ہے کہ آیا اس عمل سے شرکت کی عرفی حیثیت پر کوئی فرق تو نہیں پڑا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تمام شرکاء کی رضامندی سے تجارت ٹرانسوال سے باہر لے جائی گئی تو شرکت کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑا، شرکت بدستور قائم ہے۔ اور اگر دُوسرے شرکاء کی رضامندی کے بغیر کوئی شریک مالِ تجارت ٹرانسوال سے باہر لے گیا تو شرکت تو پھر بھی باقی رہے گی، البتہ باہر تجارت کرنے سے اگر کوئی خسارہ ہوجائے تو خسارے کا تاوان صرف اس شریک پر آئے گا جو باہر لے گیا تھا۔

لما فی رد المحتار: وان خصّ له (أی المضارب) ربّ المال التصرف فی بلد بعينه أو فی سلعة بعينها لم يجز أن يتجاوز ذٰلک فان خرج الٰی غير ذٰلک البلد أو دفع المال الٰی من أخرجه لا يكون مضمونًا عليه بمجرّد الاخراج حتّٰی يشتری به خارج البلد، فان هلک المال قبل التصرف فلا ضمان عليه، وكذا لو أعاده الی البلد عادت المضاربة كما كانت علٰی شرطها، وان اشتری به قبل العود صار مخالفًا ضامنًا ..... والظاهر أن الشركة كذٰلک. (شامی ج:۳ ص:۳۰۸)[۲]

هٰذا ما ظهر لی والله سبحانه وتعالیٰ اعلم

وعلمه أتم وأحكم
۲۰؍ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۱۸۳۹ و)

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۴ ص:۴۸۲ (طبع سعید) (فی الاشباه السكوت كالنطق فی مسائل) عدّ منها سبعة وثلاثين. وفی الشامية تحته (مطلب المواضع الّتی يكون فيها السكوت كالقول) ..... ۲۴ سكوته عند بيع زوجته أو قريبه عقارًا اقرار بانّه ليس لهٗ علٰی ما أفتٰی به مشائخ سمرقند ..... الخ. ....۲۵ رآه يبيع عرضًا أو دارًا فتصرف فيه المشتری زمانًا وهو ساكت تسقط دعواهٗ.

(۲) ردّ المحتار كتاب الشركة ج:۴ ص:۳۲۱ (طبع سعيد)
وفی الهداية كتاب المضاربة ج:۳ ص:۲۶۵ (طبع مکتبہ رحمانیہ لاهور) وان خصّ لهٗ ربّ المال التّصرف فی بلدٍ بعينهٖ او فی سلعة بعينها لم يجز لهٗ أن يتجاوزها لأنّه توكيل وفی التخصيص فائدة فيتخصص وكذا ليس لهٗ أن يدفعه بضاعة الٰی من يخرجها من تلک البلدة لأنّه لا يملک الاخراج بنفسه فلا يملک تفويضه الٰی غيره فان خرج الٰی غير تلک البلدة فاشتریٰ ضمن وكان ذٰلک لهٗ ولهٗ ربحهٗ لأنّه تصرّف بغير امره وان لم يشتر حتّٰی ردّه الی الكوفة وهی الّتی عينها برئ من الضمان كالمودع اذا خالف فی الوديعة ثم ترک ..... الخ. (محمد زبیر)

شرکت میں ایک شریک کے انتقال کے بعد شرکت ختم ہوجاتی ہے

سوال:- زید اور بکر نے برابر کی شرکت سے ایک کاروبار کیا، کاروبار چالو ہوگیا، کچھ عرصہ بعد زید کا اچانک انتقال ہوگیا، مرحوم نے پسماندگان میں ایک بیوہ، تین نابالغ بچے، (جس میں ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں) اور ایک بڑا بھائی چھوڑا ہے۔

اب یہ بتایا جائے کہ آیا زید مرحوم کی شرکت اس کاروبار میں باقی ہے یا ختم ہوگئی؟ اگر ختم ہوگئی ہے تو اَب زید مرحوم کا حصہ کس شخص کے حوالے کیا جائے؟ بیوہ کہتی ہے کہ مجھے دے دو، لہٰذا شرعی حکم سے مطلع فرمایا جائے، نیز اگر بچوں اور بیوی کی رضامندی سے مرحوم کا یہ حصہ شرعی حصوں کے مطابق تقسیم کرکے ہر ایک حصہ اس کے حوالے کردیا جائے اور بچوں کا حصہ والدہ کے پاس رکھوادیا جائے تو کیا ایسا ہوسکتا ہے؟

جواب:- مذکورہ صورت میں زید کے انتقال ہوجانے کی وجہ سے مرحوم کی شرکت[1] بکر کے ہمراہ ختم ہوگئی، بکر پر واجب ہے کہ زید کا جس قدر حصہ کاروبار میں ہے، وہ جدا کردے اور پھر جو شخص مرحوم کے ترکے کی تقسیم کا انتظام کر رہا ہو، اُس کے حوالے کردے، اور بہتر یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے حوالے کردے تاکہ بعد میں کوئی فساد نہ ہو۔ اور ایسا بھی کرسکتا ہے کہ خود شرع کے مطابق تقسیم کرے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۶۵۸/ ۲۸ ب)

بیٹے کا مال اپنے کاروبار میں لگا کر ماہوار اسے متعینہ رقم دینے کا حکم

سوال:- میں نے اپنے بیٹے کو مثلاً دس ہزار روپے دے دیئے اور پھر اپنے ہی کاروبار میں اس کے نام سے شریک کرلئے اور ہر ماہ اپنے لڑکے کو ایک رقم مثلاً سو روپیہ ماہوار دیتا ہے، اور بیٹا نہ محنت میں شریک ہے اور نہ نقصان میں، تو کیا یہ صورت جائز ہے؟

---

(۱) فی الدر المختار ج:۴ ص:۳۲۷ (طبع سعید) وتبطل الشرکۃ أی شرکۃ العقد بموت أحدھما علم الآخر أو لا.
وفی الجوھرۃ النیّرۃ (قبیل کتاب المضاربۃ) ج:۳ ص:۱۲۸ واذا مات أحد الشریکین أو ارتد ولحق بدار الحرب بطلت الشرکۃ ....الخ.
وفی تبیین الحقائق فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ ج:۱۰ ص:۱۷۸ وتبطل الشرکۃ بموت أحدھما.
وفی فتح القدیر فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ واذا مات أحد الشریکین أو ارتدّ ولحق بدار الحرب بطلت الشرکۃ ....الخ.
وفی شرح مجلّۃ الأحکام للأتاسیؒ ج:۴ ص:۲۷۷ رقم المادّۃ:۱۳۵۲ (طبع مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ) اذا مات أحد الشریکین أو جن جنونًا مطبقًا تنفسخ الشرکۃ ....الخ.

جواب:- آپ اپنے بچے کے مال کو تجارت میں لگا سکتے ہیں، اس صورت میں وہ آپ کا شریک ہوگا، لیکن اس شرکت کی حیثیت سے اسے نقصان سے بَری رکھنا یا سو روپیہ ماہوار مقرّر کردینا شرعاً دُرست نہیں، تجارت چونکہ ایسا اَمر ہے جس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہے، لہٰذا آپ کو بحیثیت باپ کے اپنے بیٹے کا مال تجارت میں لگانے کا اختیار ہے اور اس کے بعد وہ نفع ونقصان دونوں میں شریک ہوگا، ہاں اگر آپ بنظرِ شفقت اپنے حصے میں سے سو روپے ماہوار اس کے لئے مقرّر کردیں تو یہ الگ بات ہے، یا ایسا کریں کہ سو روپیہ ماہوار اس کے حصۂ نفع میں سے علی الحساب دیتے رہیں، سال دو سال میں حساب سے جو صورت بنے اس کے مطابق کرلیں۔ وما تردد من العقود بین نفع وضرر کالبیع والشراء توقف علی الاذن. (شامی ج:۵ ص:۱۶۸)۔ (۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۳/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۸/۲۲ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱) الدر المختار ج:۶ ص:۱۷۳ (طبع سعید).

کتاب البیوع

(خرید وفروخت کے مسائل)

فصل فی البیع الفاسد والباطل والموقوف والمکروہ

(بیع فاسد، باطل، موقوف اور مکروہ کا بیان)

بیع اور اِجارہ کا معاملہ اِکٹھے کرنے کا حکم

سوال:- زید اپنی سوئی ہوئی بھینس بمع بچے کے بکر کو بیچتا ہے بعوض سترہ سو روپے کے، جبکہ اسی کے ساتھ زید زمین کی بٹائی کا معاملہ بکر سے کرتا ہے چالیس کنال زمین جس میں سے سترہ کنال گنا ہے، گنے کی قیمت چودہ سو روپے اور باقی زمین کی آئندہ بٹائی تیرہ سو روپے طے پایا۔

۲:- یہ تمام معاملہ طرفین میں چار ہزار چار سو کا ہوا، جن میں سے بکر نے ایک ہزار نقد زید کو دے دیئے، چودہ سو روپے ۱۵/۴/۱۹۷۷ء کو اور دو ہزار ۴/۷/۱۹۷۸ء کو دینے کا وعدہ کیا۔

۳:- زید مذکور نے ہی زمین عمرو کو مزارعت پر مطابق نصف پر لئے، اس کا حصہ زید نے دینا تھا، اب رہا بعد کا حساب تو ۳۱/۸/۱۹۷۶ء سے ۱۵/۵/۱۹۷۸ء تک زمین کے جملہ اِخراجات بکر مذکور پر ہوں گے، بکر نے زمین کی کاشت خود کرنے کا فیصلہ کیا تو مزارع عمرو نے ناراض ہوکر کہا کہ پھر میں تمہیں اس سال کا گنا جس میں نصف سے کہا گیا کہ تم بکر کو پندرہ سو روپے دے دو، زمین اور بھینس واپس لو جبکہ بکر نے بھینس کا بچہ ۱۷۰ روپیہ پر فروخت کیا ہے اور اس دوران زمین کی آمدنی گھاس وغیرہ بھی لیا ہے، وہ سب مفت میں، کیا شریعت کی رُو سے بکر کے لئے اس رقم کے لینے کا جواز ہے؟ حالانکہ معاملے کی ابتداء میں ایک ہزار روپیہ دیا گیا تھا۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ظاہر یہ ہے کہ زمین کے اِجارے کو بھینس اور اس کے بچے کی بیع کے لئے مشروط قرار دے کر بیع اور اِجارے کا معاملہ مجموعی طور پر کیا گیا تھا، لہٰذا یہ معاملہ ''صفقة فی

صـــفـــقة'' ہونے کی بنا پر فاسد[1] اور واجب الفسخ تھا،[2] اور فریقین نے اس کو جو منسوخ کیا وہ دُرست کیا، لیکن ایسی صورت میں بکر زید سے اتنی ہی رقم شرعاً وصول کرسکتا ہے جتنی اُس نے زید کو ادا کی ہے، اس سے زائد وصول کرنا اس کے لئے جائز نہیں بلکہ بھینس کے بچے کو بیچ کر جو قیمت اس نے وصول کی ہے وہ بھی زید کو واپس کرنی ضروری ہے۔ اور گھاس کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ خود رو گھاس تھی تو اسے بیچ کر جو پیسے بکر نے کمائے وہ اسی کے ہیں،[3] اور اگر وہ باقاعدہ کاشت کی ہوئی تھی تو اس کو بیچ کر جو رقم بکر نے حاصل کی وہ بھی زید کو واپس کرنی ضروری ہے، لما فی الدر المختار فی حکم فسخ البیع الفاسد لو نـقص فی ید المشتری بفعل المشتری أو المبیع أو بآفة سماویة أخذہ البائع مع الأرش. (شامی ج:۴ ص:۱۳۱)۔[4]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۴۳/۲۸ ب)

عورت کی خرید وفروخت اور اسے باندی بنانے کا حکم

سوال:- اگر ہم بازار سے کوئی لڑکی خریدیں تو اس سے باندیوں والے حقوق لے سکتے ہیں؟

جواب:- آج کل شرعی باندیوں کا کہیں وجود نہیں ہے، لہٰذا موجودہ حالت میں کسی لڑکی کو خریدنا بھی حرام ہے[5] اور اس سے باندیوں کی طرح اِنتفاع کرنا بھی حرام ہے۔　واللہ اعلم

محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۶/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۶/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

۱۳۸۸/۶/۱۶ھ

---

(۱) وفی المعجم الأوسط للطبرانیؒ ج:۲ ص:۱۶۹ (طبع دار الحرمین قاهرة) قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ثم لا تحلّ صفقتان فی صفقة. وفی مجمع الزوائد ج:۴ ص:۸۴ (طبع دار الرّیان للتراث قاهرة و دار الکتاب العربی بیروت) عن عبدالله بن مسعود رضی الله عنه قال: نهٰی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن صفقتین فی صفقة واحدة.

(۲) وفی الدر المختار ج:۵ ص:۹۰ و ۹۱ (و) یجب (علیٰ کلّ واحد منهما فسخه (أی فسخ البیع الفاسد) قبل القبض) ویکون امتناعًا عنه ابن ملک (أو بعده ما دام) المبیع بحاله جوهرة (فی ید المشتری) اعدامًا للفساد، لأنه معصیة فیجب رفعها بحر.

وفی الهندیة الباب الحادی عشر فی أحکام البیع الغیر الجائز ج:۳ ص:۱۴۷ (طبع رشیدیه) ..... ویثبت الملک قیاسًا واستحسانًا الّا أنّ هذا الملک یستحق النّقض ویکره للمشتری أن یتصرّف فیما اشتریٰ شراً فاسدًا بتملیک أو انتفاع .... الخ.

(۳) وفی المشکوة ص:۲۶۲ (طبع رحمانیه) المسلمون شرکاء فی ثلاث فی الماء والکلاء والنّار (الحدیث).

(۴) الدّر المختار ج:۵ ص:۱۰۰ (طبع سعید). وفی الهندیة ج:۳ ص:۱۴۸ (طبع رشیدیه) وان انتقص المبیع فی ید المشتری ان کان النّقصان بآفة سماویة فللبائع أن یأخذ المبیع مع أرش النقصان وکذٰلک النقصان بفعل المشتری أو بفعل المعقود علیه .... الخ.

(۵) وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۵۲ وبطل بیع ما لیس بمال کالدّم والمیتة والحرّ. وکذا فی الهدایة ج:۳ ص:۵۳.

ذبح سے پہلے جانور کے مختلف اعضاء کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:- جانور کے ذبح کرنے سے پہلے سر، پیر، کلیجی، دِل وغیرہ کا فروخت کرنا شرعاً کیسا ہے؟

جواب:- جانور کے کلیجی گردے اور دِل پھیپھڑے وغیرہ کی بیع انہیں نکالنے سے پہلے جائز نہیں ہے، قال فی الدر المختار: ولؤلؤ فی صدف للغرر وصوف علیٰ ظهر غنم .... وكذا كل ما اتصالهٗ خلقی كجلد حیوان ونوی تمروبن وبطیخ لما مرّ أنه معدومٌ عرفًا (شامی ج:۴ ص:۱۴۹)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۶۳۶/۱۹ الف)

یک طرفہ بیع مالک کی رضامندی پر موقوف ہے

سوال:- ایک خاندان کے دو حقیقی بھائیوں میں علیحدگی ہوگئی، ایک بھائی چند ماہ بعد ایک حادثے میں مبتلا ہوا اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ کام کرنے لگا، اور صرف خانگی اِخراجات لیا کرتا تھا، بعد میں پاکستان آگیا، مگر بیوی بچے ہندوستان ہی میں تھے، بڑے بھائی بیوی بچوں کو ۲-۳ سو روپیہ ماہوار دیا کرتے تھے، اس کے علاوہ اور ضروریات بھی پورا کیا کرتے تھے، چھوٹا بھائی ہندوستان سے پاکستان آتے وقت ایک چھوٹی سی جائیداد تقریباً ۹ بیگھ بڑے بھائی کے نام لکھ کر آیا تھا کہ فروخت کر کے روپیہ دے دیجئے گا، میرے بیوی بچے ہندوستان سے ۱۹۶۵ء میں پاکستان چلے آئے، یہاں جو روپیہ اور جائیداد میری تھی دُوسروں کے ہاتھ میں تھا، ان حالات میں ۱۹۷۰ء تک بڑے بھائی کو لکھا کہ جائیداد فروخت کر کے میری امداد کریں، مگر ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۰ء کوئی جواب نہیں آیا، ۱۹۷۱ء میں لڑکا ہندوستان گیا تو ۲۵ ہزار لڑکے کو دیا، لڑکا سمجھا کہ وہ امدادی طور پر دے رہے ہیں، لے لیا، ۱۹۷۶ء میں معلوم ہوا کہ رقم مذکور جو کھیت کی قیمت کے طور پر دی تھی اُس سے زیادہ قیمت تھی۔ اس واقعے کے بعد لکھا کہ ۲۵ ہزار

---

(۱) الدر المختار ج:۵ ص:۶۳ باب البیع الفاسد (طبع سعید) وفی البحر الرّائق ج:۵ ص:۲۷۶ (طبع سعید) وفی الخانیة ولو اشتریٰ لؤلؤة فی صدفه قال ابو یوسف رحمه الله تعالیٰ یجوز البیع وله الخیار اذا رای، وقال محمد رحمه الله تعالیٰ لا یجوز وعلیه الفتویٰ اهـ. وهكذا فی انولوالجیة معلّلا للفتویٰ بانها منه خلقة .... الخ.

وفی الهندیة ج:۳ ص:۱۲۹ الفصل التاسع (طبع رشیدیه): ولو باع الجلد والكرش قبل الذبح لا یجوز فان ذبح بعد ذلك ونزع الجلد والكرش وسلم لا ینقلب العقد جائزا كذا فی الذخیرة.

وفی شرح البدایة ج:۳ ص:۵۴ ولا بیع الحمل ولا النتاج ولا اللبن فی الضرع ولا الصّوف علیٰ ظهر الغنم وجذع فی السقف.

وكذا فی مجمع الأنهر ج:۳ ص:۸۱ وامداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۶۱ وامداد الأحكام ج:۳ ص:۴۱۷ و ۴۱۸.

روپیہ لے کر زمین واپس کردیں، بڑے بھائی کی صرف لڑکیاں ہیں، جائیداد اور نقد روپیہ لڑکیوں کو لکھ دیا، سوائے اس زمین کے اب وہ اس زمین کو بھی نواسے کے لئے لکھنا چاہتے ہیں، شریعت کی رُو سے کیا ہونا چاہئے؟ میں نہ صبر کرسکتا ہوں اور نہ بڑے بھائی دیتے ہیں۔

جواب:- اگر آپ کے بڑے بھائی نے آپ کی زمین کسی اور کو فروخت کئے بغیر اپنے پاس رکھ لی اور آپ کو یک طرفہ طور پر ۲۵ ہزار روپے دے دیئے تو یہ بیع آپ کی رضامندی پر موقوف تھی[1]، اگر آپ نے ۲۵ ہزار میں زمین اُن کو دینے پر رضامندی کا اظہار کردیا ہو تو بیع صحیح ہوگئی[2]، اور بڑے بھائی اس کے مالک ہوگئے، اس میں جو چاہیں کرسکتے ہیں، اور اگر آپ نے اس بیع کو مسترد کردیا تھا تو آپ کے بڑے بھائی پر واجب ہے کہ وہ زمین کو آپ کی امانت سمجھیں اور آپ پر واجب ہے کہ ان کے ۲۵ ہزار روپے واپس کردیں، لیکن اگر معاملہ اب تک مبہم چل رہا ہے تو آپ کو یہ چاہئے کہ ان کو خط لکھ کر بتادیں کہ آپ کتنی رقم میں وہ زمین فروخت کرنا چاہتے ہیں، اس صورت میں آپ کے بھائی اگر اتنی رقم میں لینا چاہیں گے تو لے لیں گے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۶۳۷/۲۸ ب)

مذکورہ فتویٰ کی مزید وضاحت

سوال:- چھوٹا بھائی اس بیع وشراء کو امانت ہی خیال کرتا ہے، ۲۵ ہزار روپے دے دینے سے بیع نہیں ہوسکتی، جبکہ طرفین سے خرید وفروخت پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی، یہ ضرور ہے کہ زمینِ مذکور چھوٹا بھائی کسی طرح بھی حاصل نہیں کرسکتا تھا اور نہ اب حاصل کرسکتا ہے، مجبورِ محض ہے۔ موجودہ زمانے میں یعنی ۱۹۷۱ء میں جائیداد کی قیمت لاکھوں تک پہنچ چکی تھی، چھوٹا بھائی نہ صبر کرسکتا ہے اور زرِ نقد جو اُنہوں

(۱ و ۲) وفی مشکوٰۃ المصابیح ص: ۲۶۱ (طبع رحمانیہ) باب الغصب والعاریۃ عن أبی حرّۃ الرقاشی عن عمّہٖ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ألا لا تظلموا ألا لا یحلّ مال امرئ الّا بطیب نفس منہ.
وفی شرحہ: أی بالأمر أو بالاذن.
وفی المجلّۃ: لا یجوز لأحد أن یأخذ مال أحد بلا سبب شرعی .... الخ.
وفی الشامیۃ ج:۴ ص:۶۱ (طبع سعید) اذ لا یجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعی. وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۰۶ .... من یتصرّف فی حقّ غیرہ بغیر اذن شرعی کل تصرّف صدر منہ تملیکًا کان کبیع وتزویج أو اسقاطًا کطلاق وأعتاق ولہ مجیز .... انعقد موقوفًا .... الخ.
وفی الھدایۃ کتاب البیوع فصل فی بیع الفضولی ج:۳ ص:۹۳ (طبع مکتبہ رحمانیہ) ومن باع ملک غیرہ بغیر أمرہ فالمالک بالخیار ان شاء اجاز البیع وان شاء فسخ. وکذا فی مجمع الأنھر ج:۳ ص:۱۳۴.
وفی مجلّۃ الأحکام کتاب البیوع رقم المادّۃ: ۳۶۸ البیع الّذی یتعلّق بہ حق الغیر کبیع الفضولی وبیع المرھون ینعقد موقوفًا علی اجازۃ ذٰلک الآخر .... الخ. وفی الھندیۃ ج:۳ ص:۱۵۲ (طبع رشیدیہ) اذا باع الرجل مال الغیر عندنا یتوقف البیع علی اجازۃ المالک .... الخ. نیز دیکھئے آگے صفحہ:۸۷ کا حاشیہ۔

نے دیا اس کو لینا چاہتا ہے، کل بھی اور آج بھی واپس کرنے کو تیار ہے۔ ۱۹۵۹ء سے قبل جب بیوی بچے ہندوستان میں تنگ دستی کے دن گزار رہے تھے، اگر یہ رقم قیمتِ جائیداد کہہ کر دیتے تو بہت ممکن تھا کہ یہ بات پیدا نہ ہوتی، اس لئے اتنی رقم سے بچے کچھ کام بھی کرتے اور تعلیم بھی جاری رکھتے، اور اللہ کی مرضی سے تنگ دستی بھی ختم ہوجاتی، جبکہ ایک شخص جائیدادِ مذکور کا ایک لاکھ سے بھی زیادہ دینے پر تیار ہوگیا تھا۔ چھوٹا بھائی اس وقت شریعت کا قانون جاننا چاہتا ہے اور اس پر عمل کرنا چاہتا ہے بڑا بھائی کروڑوں کا مالک ہے، چھوٹا بھائی اللہ تعالیٰ کی مرضی خیال کرتا ہے نہ کہ حسد و بغض۔

جواب:- آپ جواب غور سے پڑھتے تو دوبارہ سوال کی نوبت نہ آتی، جب آپ نے وہ ۲۵ ہزار روپے بطور امانت اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں اور بیع پر رضامندی بھی ظاہر نہیں کی تو زمین بدستور آپ کی ملکیت ہے، آپ کے بھائی پر واجب ہے کہ وہ زمین آپ کی رضامندی سے اس کو فروخت کرکے اس کی قیمت آپ کے حوالے کریں، اور آپ ۲۵ ہزار روپے واپس کردیں، لقوله تعالیٰ: "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ"۔ [1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱/۷/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۹۳/۲۸ ب)

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر قبضہ کرکے فروخت کرنے کا حکم

سوال:- تقسیمِ ہند کے بعد جب مہاجر پاکستان آئے تو ہنود کی کئی جگہوں پر قبضہ ہوا، عموماً ایسا بھی ہوا کہ جس کو جو گھر خالی مل گیا اس نے قبضہ کرلیا، وغیرہ۔ ایسے ہی ایک زمین پر ایک شخص کا قبضہ تھا، دُوسرے شخص نے اس سے وہ قطعہ خرید لیا اور قیمت ادا کردی، مگر بعد میں جب پیمائش کی تو سودے کی مقرّرہ مقدار سے ۳ یا ۴ مرلے زیادہ زمین مشتری کے پاس آگئی۔ اب اس کا کیا حل ہے؟ کیا ان چند مرلوں کی قیمت حکومت کو دیں یا بائع کے ورثاء کو دیں یا کچھ نہ کریں؟ کیونکہ قبضہ و مالکانہ تصرفات کا اختیار تھوڑے عرصے بعد ہی حکومت نے سنبھال لیا تھا، یہ معاملہ آج سے تقریباً ۳۸ سال قبل کا ہے۔ سائل متقی شخص ہے، کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مجھ پر اس کا وبال نہ آئے۔

جواب:- اس سوال کا جواب اس تنقیح پر موقوف ہے کہ جن لوگوں نے اس علاقے میں ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر قبضہ کیا، ان کا وہ قبضہ حکومت نے تسلیم کرکے ان کو مالک قرار دے دیا تھا یا

(۱) سورة النساء آیت نمبر: ۲۹.

نہیں؟ اگر مالک قرار دے دیا تھا تب تو یہ بیع دُرست ہوئی، اور جو زمین زائد مشتری کے پاس آئی وہ یا اس کی قیمت بائع کو لوٹانا ضروری ہے۔ لیکن اگر حکومت نے ان قابضین کو مالک قرار نہیں دیا تھا اور یہ بات مشتری کو بھی معلوم تھی تو یہ بیع دُرست نہیں ہوئی۔[1] اور اَب زائد زمین کی قیمت تو یقیناً حکومت ہی کو دینی ہوگی لیکن جتنی زمین پہلے قابض سے خرید کر حاصل کی اس کی قیمت بھی دیانۃً حکومت کو دینی چاہئے۔ ہاں! اگر مشتری کو یہ معلوم نہ تھا کہ قابض زمین کا مالک نہیں ہے، تو اس صورت میں بائع پر واجب ہے کہ وہ قیمت حکومت کو ادا کرے اور حکومت سے اس بیع کی اجازت حاصل کر کے مشتری کو دے، اگر حکومت نے قیمت قبول کر لی تو یہ حکماً اجازت ہوگی۔[2] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۱۱/۱/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۴۵/۸۵)

مشتری کے قبضے سے پہلے مبیع اگر ہلاک ہوجائے تو نقصان بائع کا متصوّر ہوگا

سوال:- مسمّٰی حافظ عبدالرشید صاحب نے ایک بھینس کا بچہ جس کی قیمت ایک سو دس روپیہ ٹھہری، بیعانہ میں پچاس روپے بائع کو دے دیئے، اور بائع نے یہ کہا: حافظ صاحب! یہ بھینس کا بچہ کس وقت لے جاؤ گے؟ حافظ صاحب نے کہا کہ: شام کو لے جاؤں گا یا کل آکر لے جاؤں گا۔ بیع کے وقت

---

(۱) کیونکہ ایسی صورت میں غیر مملوک کی بیع ہوئی جو دُرست نہیں۔
وفی جامع الترمذی وأبی داؤد والنسائی عن عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یحلّ سلف وبیع ولا شرطان فی بیع ولا ربح ما لم یضمن ولا بیع ما لیس عندک. (مشکوٰۃ المصابیح ص:۲۴۸).
وفی المرقاۃ ج:۶ ص:۸۷ عن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ قال: نہانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن أبیع ما لیس عندی. رواہ الترمذی فی روایۃ لہ ولأبی داؤد والنسائی: قال: قلت: یا رسول اللہ! یأتینی الرّجل فیرید منی البیع ولیس عندی فابتاع لہ من السوق، قال: لا تبع ما لیس عندک. ہٰذا یحتمل أمرین .... والثانی أن یبیع منہ متاعًا لا یملکہ ثم یشتریہ من مالکہ ویدفعہ الیہ وہٰذا باطل لأنّہ باع ما لیس فی ملکہ وقت البیع وہٰذا معنیٰ قولہ (قال ولا تبع ما لیس عندک) ای شیئًا لیس فی ملکک حال العقد.
وفی ردّ المحتار ج:۴ ص:۵۰۵ وشرط المعقود علیہ ستۃ: کونہ موجودًا مالًا متقوّمًا مملوکًا فی نفسہ وکون الملک للبائع فیما یبیعہ لنفسہ وکونہ مقدور التّسلیم فلم ینعقد بیع المعدوم .... ولا بیع ما لیس مملوکًا لہ .... الخ.
وفی بدائع الصنائع ج:۵ ص:۱۴۶ ومنہا وہو شرط انعقاد البیع للبائع أن یکون مملوکًا للبائع عند البیع فان لم یکن لا ینعقد .... وہٰذا بیع ما لیس عندہ، ونہٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع ما لیس عند الانسان.
وکذا فی المبسوط للسرخسی ج:۱۳ ص:۸ وشرح المجلّۃ ج:۲ ص:۳۴۹.
وفی الدّر المختار کتاب البیوع ج:۵ ص:۵۸ (طبع سعید) وبطل بیع ما لیس فی ملکہ.
(۲) اور حقیقتاً یا حکماً اجازت لینا اس لئے ضروری ہے کیونکہ فضولی کی بیع مالک کی اجازت پر موقوف ہوتی ہے، عبارات و جزئیات ص:۸۰ اور ص:۸۷ کے حاشیہ نمبر ۱ و ۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔

بچہ صحیح وسلامت تھا، پھر حافظ صاحب حسبِ وعدہ دُوسرے روز نہیں جاسکے، تیسرے روز بچہ لینے گئے تو وہ بچہ مرچکا تھا۔ اب بائع بقایا قیمت کا حق دار ہے یا نہیں جو ادائیگی سے رہ گئی تھی یا بائع کو مشتری سے جو رقم لے چکا ہے وہ واپس کرنا ہوگا؟ شرع کا کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بھینس کے بچے کے مرنے سے نقصان بائع کا ہوا، مشتری کا نہیں، بائع نہ صرف باقی قیمت کا حق دار نہیں ہے بلکہ جو پچاس روپے اس نے وصول کئے تھے اُن کو بھی واپس کرنا اس پر واجب ہے، کیونکہ فریقین کے درمیان پچاس روپے کے بیعانہ پر جو بات چیت ہوئی اگر اسے عقدِ بیع کے بجائے وعدۂ بیع قرار دیا جائے تو یہ حکم ظاہر ہے کہ ابھی بیع ہوئی ہی نہ تھی، اور اگر اس بات چیت کو عقدِ بیع قرار دیا جائے تب بھی مشتری نے اس پر قبضہ نہیں کیا، اور قبضے سے پہلے مبیع بائع کے ضمان میں ہوتی ہے، قال فی ردّ المحتار وفی الفتح والدر المنتقی: لو هلک المبیع بفعل البائع أو بفعل المبیع أو بأمر سماویّ بطل البیع ویرجع بالثمن لو مقبوضًا ...... (شامی ج:۴ ص:۴۲، قبیل باب خیار الشرط)۔[1]

وفی الدر المختار: ثم التسلیم یکون بالتخلیة علیٰ وجه یتمکّن من القبض بلا مانع ولا حائل، وقال الشامی: لو اشتری بقرًا فی السرح فقال البائع: اذهب واقبض ان کان یری بحیث یمکنه الاشارة الیه یکون قبضًا .... الخ. (ج:۴ ص:۴۳)۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۹۴۶/ ۲۸ ج)

---

(۱) ردّ المحتار ج:۴ ص:۵۲۰ (طبع سعید). وفی فتح القدیر ج:۵ ص:۴۹۲ (طبع رشیدیه کوئٹه) فلو هلک فی ید البائع بفعله أو بفعل المبیع بنفسه بأن کان حیوانًا فقتل نفسه أو بأمر سماویّ بطل البیع فان کان قبض الثمن أعاده الی المشتری .... الخ. نیز دیکھئے خلاصة الفتاویٰ ج:۳ ص:۹۰ (طبع رشیدیه کوئٹه).

(۲) الدّر المختار مع ردّ المحتار ج:۴ ص:۵۶۱ (طبع سعید). وفی فتح القدیر ج:۵ ص:۴۹۲ (طبع رشیدیه کوئٹه) فی التّجرید تسلیم المبیع أن یخلّی بینه وبین المبیع علیٰ وجه یتمکن من قبضه من غیر حائل.
وفیه أیضًا ج:۵ ص:۴۹۷ (طبع رشیدیه) اذ اشتریٰ بقرًا فی السّرح فقال البائع: اذهب واقبض ان کان یریٰ بحیث یمکنه الاشارة الیه یکون قبضًا .... الخ.
وفی البحر الرّائق کتاب البیوع ج:۵ ص:۳۰۸ (طبع سعید) وأمّا ما یصیر به قابضًا حقیقة ففی التّجرید تسلیم المبیع أن یخلّی بینه وبین المبیع علیٰ وجه یتمکّن من قبضه بغیر حائل وکذا تسلیم الثمن.
وفیه أیضًا ج:۵ ص:۳۰۹ وکذا لو اشتریٰ بقرًا فی السرح فقال البائع: اذهب فاقبض ان کان یریٰ بحیث یمکنه الاشارة الیه یکون قبضًا .... الخ.
وفی الهندیة ج:۳ ص:۱۶ وتسلیم المبیع هو أن یخلّی بین المبیع وبین المشتری علیٰ وجه یتمکن المشتری من قبضه بغیر حائل .... وأجمعوا علیٰ أنّ التّخلیة فی البیع الجائز تکون قبضًا .... الخ.
وکذا فی خلاصه الفتاویٰ ج:۳ ص:۸۹ (طبع رشیدیه کوئٹه) وبدائع الصنائع ج:۵ ص:۲۴۴ (طبع سعید).

رمضان میں بیکری کا سامان فروخت کرنے کا حکم

سوال:- رمضان میں روزے کے دوران بیکری کا سامان فروخت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور پتہ ہو کہ یہ شخص روزے کی حالت میں کھائے گا تو اُسے بھی فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

طلعت محمود، راولپنڈی

جواب:- برادرِ عزیز و مکرم جناب طلعت محمود صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

رمضان میں بیکری کا سامان فروخت کرنا جائز ہے، البتہ جس شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ بغیر کسی عذر کے دن کے وقت کھانے کے لئے خرید رہا ہے اسے بیچنا جائز نہیں[۱]، معلوم نہ ہو کہ کیا کرے گا تو جائز ہے۔[۲]

والسلام

واللہ اعلم

۸؍شعبان ۱۴۰۸ھ

ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، ٹی وی اور وی سی آر کے کاروبار کا حکم

سوال:- ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ اور ٹی وی، وی سی آر کی خرید و فروخت کا کیا حکم ہے؟ کرنا چاہئے یا نہیں؟

طلعت محمود راولپنڈی

جواب:- برادرِ عزیز و مکرم طلعت محمود صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر کی دُکان میں تو مضائقہ نہیں[۳]، لیکن ٹی وی اور وی سی آر کا کاروبار کراہت سے خالی معلوم نہیں ہوتا[۴]، لہٰذا اگر کوئی دُوسرا کاروبار کرسکیں تو زیادہ بہتر ہے، حتی الامکان اسی کی کوشش کریں۔

والسلام

۱۴۱۴/۴/۷ھ[۵]

(۱ و ۲) جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے ان دونوں صورتوں کا یہی حکم ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ''....اگر (بیچنے والے کو) علم نہ ہو کہ یہ شخص شیرۂ انگور خرید کر سرکہ بنائے گا یا شراب یا گھر کرایہ پر لے کر اس میں صرف سکونت کرے گا یا کوئی ناجائز کام فسق وفجور کا کرے گا، اس صورت میں یہ بیع و اجارہ بلاکراہت جائز ہے، اور اگر اس کو علم ہے کہ یہ شخص شیرۂ انگور خرید کر شراب بنائے گا یا مکان کرایہ پر لے کر فسق وفجور کرے گا یا سودی کاروبار کرے گا یا جاریہ خرید کر اس کو گانے کے کام میں لگائے گا وغیرہ تو ایسی صورت میں یہ بیع و اجارہ مکروہ ہے .....اور معصیت اس کے عین کے ساتھ متعلق ہو بغیر کسی تغیر وتصرف کے ....تو یہ صورت مکروہ تحریمی ہے۔ تفصیل کے لئے حضرت مفتیٔ اعظم رحمہ اللہ کا رسالہ "تفصیل الکلام فی مسئلة الاعانة علی الحرام" جواهر الفقه ج:۲ ص:۴۵۷ تا ۴۶۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۳ و ۴) وفی بدائع الصنائع ج:۵ ص:۱۴۴ (طبع سعید) ویجوز بیع آلات الملاهی من البربط والطبل والمزمار والدّف ونحو ذلک .... أنّه یمکن الانتفاع بها شرعًا من جهة أُخریٰ بأن تجعل ظروفًا لأشیاء ونحو ذلک من المصالح .... الخ.

وفی الفقه الاسلامی وأدلّته ج:۴ ص:۳۰۲۹ (طبع دار الفکر) والضّابط عندهم (أی عند فقهاء الحنفیة) أنّ کل ما فیه منفعة تحلّ شرعًا فان بیعه یجوز لأنّ الأعیان خلقت لمنفعة الانسان.

نیز مزید حوالہ جات کے لئے دیکھئے اگلا صفحہ: ۸۵ و ۸۶ کے حواشی۔

(۵) اس صفحے کے مذکورہ دونوں فتاویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ نے سائل موصوف کے خط کے جواب میں تحریر فرمائے۔ (محمد زبیر)

وی سی آر کے کاروبار کی شرعی حیثیت اور غلطی سے خریدے ہوئے وی سی آر کو بیچنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے اپنی حلال آمدنی سے دس یا بارہ ہزار کا ایک وی سی آر سیٹ خریدا تھا، جس پر وہ خود بھی فلمیں دیکھتا تھا، دُوسروں کو بھی دِکھاتا تھا، حق تعالیٰ نے دعوت و تبلیغ کے ذریعے اس کو ہدایت دی، بُرے کام چھوڑ دیئے اور صلوٰۃ و صوم کا پابند ہوگیا ہے، وہ اُسے بالکل استعمال نہیں کرتا۔ وہ پوچھتا ہے کہ اگر وی سی آر کو فروخت کروں تو وہ پیسہ میرے لئے حلال ہوگا یا حرام؟ یا کسی درجے میں کوئی حل ہے؟ اگر نہ بیچوں ویسے توڑ دوں تو مالی نقصان بہت ہے، جس وقت خریدا تھا وہ حلال آمدنی سے خریدا تھا، مزید یہ کہ جس کو فروخت کروں گا وہ فلمیں دیکھے گا، تو کیا اس کا گناہ بائع کو ہوگا؟

جواب:- وی سی آر کی بیع کو کاروبار کے طور پر اِختیار کرنا بحالتِ موجودہ تو دُرست نہیں،[1] لیکن جو اِتفاقی صورت آپ نے لکھی ہے، اس میں بھی وی سی آر کی بیع کراہت سے خالی معلوم نہیں ہوتی،[2] اس لئے احتیاط کے خلاف ہے۔ تاہم اگر صورتِ مسئولہ میں اُسے بیچ دیا تو چونکہ اس آلے کا کچھ صورتوں میں جائز طور پر استعمال کرنا بھی ممکن ہے، اس لئے اس آمدنی کو حرام نہیں کہا جائے گا۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

---

(۱) وفی الشامیة ج:۶ ص:۲۱۱ و ۲۱۲ (طبع سعید) (وضمن بکسر معزف) بکسر المیم آلة اللّهو. وقالا لا یضمن ولا یصحّ بیعها وعلیه الفتویٰ ملتقی.

وفی البحر الرّائق ج:۸ ص:۱۲۴ و ۱۲۵ (ومن کسر معزفًا ضمن) وهٰذا قول الامام وقالا لا یضمنها لأنّها معدة للمعصیة فیسقط تقومها کالخمر ـــــ والفتویٰ فی زماننا علیٰ قولهما لکثرة الفساد .... (وصح بیع هٰذه الأشیاء) وهٰذا قول الامام وقالا لا یجوز بیع هٰذه الأشیاء لأنّها لیست بمال متقوّم.

وفی الهندیة ج:۳ ص:۱۱۶ وما کان الغالب علیه الحرام لم یجز بیعه ولا هبته.

وفیها أیضًا ج:۵ ص:۱۳۱ ویجوز بیع البربط والطبل والمزمار والدّف والنّرد والاشباه ذٰلک فی قول ابی حنیفة رحمه الله وعندهما لا یجوز بیع هٰذه الأشیاء قبل الکسر .... والفتویٰ علیٰ قولهما .... الخ. وکذا فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیة ج:۲ ص:۳۵۴.

(۲ و ۳) وفی ردّ المحتار ج:۴ ص:۲۶۸ (طبع سعید) لا یکره بیع الجاریة المغنیة والکبش النطوح والدّیک المقاتل والحمامة الطیارة لأنّه لیس عینها منکرًا وانّما المنکر فی استعمالها المحظور .... وعرف بهٰذا أنّه لا یکرهُ بیع ما لم تقم المعصیة به کبیع الجاریة المغنیة والکبش النطوح والحمامة الطیارة العصیر والخشب الّذی یتخذ منه المعازف.

وفی بدائع الصنائع ج:۵ ص:۱۴۴ (طبع سعید) ویجوز بیع آلات الملاهی من البربط والطبل والمزمار والدّف ونحو ذٰلک عند أبی حنیفة رحمه الله، لکنه یکره وعند ابی یوسف ومحمد لا ینعقد بیع هٰذه الأشیاء لأنّها آلات معدّة للتّلهّی بها موضوعة للفسق والفساد .... ولأبی حنیفة انه یمکن الانتفاع بها شرعًا من جهةٍ اُخریٰ.

وفی فتح القدیر فصل فی غصب مالا یتقوم ج:۸ ص:۲۹۳ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) ومن کسر لمسلم بربطًا أو مزمارًا أو دفا أو اراق له سکرًا أو منصّفًا فهو ضامن وبیع هٰذه الأشیاء جائز وهٰذا .... (باقی اگلے صفحے پر)

’’بیعِ فضولی‘‘ کی ایک مخصوص صورت کا حکم

سوال:- مندرجہ ذیل فیصلہ ایک مولوی صاحب نے میری موجودگی میں کیا ہے، اُن کا کہنا ہے کہ یہ فیصلہ شریعت کے مطابق ہے۔ ایک عورت کو جہیز میں سامان کے ساتھ ایک بیل دیا گیا جس کی وہ مالک تھی، اُس کے شوہر نے وہ بیل چالاکی سے اپنی بیوی کے قبضے سے نکالنا چاہا، ایک آدمی کو اپنی بیوی کے پاس بھیجا کہ جاکر کہو کہ بیل تمہارا لڑکا مانگ رہا ہے، عورت نے اپنے فرزند کو دینے کے لئے وہ بیل آنے والے شخص کے حوالے کردیا۔ دُوسرے دن جب عورت کو معلوم ہوا کہ بیل لڑکے کو نہیں ملا تو اُسے تشویش ہوئی اور بیل لے جانے والے شخص سے معلوم کیا کہ بیل کہاں ہے؟ تو لے جانے والے شخص نے بتایا کہ وہ بیل دراصل تمہارے شوہر سے میں نے نو سو روپے میں خریدا ہے۔ اس پر عورت نے کہا کہ یہ بیل مجھے جہیز میں ملا ہے، میرے شوہر کی ملکیت نہیں ہے، تم نے کس طرح خریدا؟ مجھے بیل واپس کرو۔ عورت شوہر پر برہم ہوئی کہ تم نے پیسے کیوں لئے جبکہ یہ میری ملکیت ہے؟ مجھے واپس دِلاؤ، کیوں فروخت کیا؟ بیل خریدنے والے نے یہ بیل اپنے بھائی کے ہاتھ فروخت کردیا، عورت نے اُس کے بھائی سے کہا کہ یہ میرا بیل واپس کرو، اُس کے بھائی نے کہا کہ جتنے میں خریدا ہے میری رقم واپس کردو، بیل دے دُوں گا۔ بیل واپس لینے والے شخص نے اِس شخص کے بھائی کا اُونٹ خریدنے والے بھائی کو دے دیا کہ یہ تمہارے بھائی کا اُونٹ ہے، اس کو رکھ لو، وہ تمہارے بیل کے پیسے دے کر اُونٹ لے جائے گا، اور بیل اس عورت کی ملکیت ہے اسے واپس کرو۔ دُوسرے دن وہ چار آدمی لے کر بیل کے مالک کے پاس آئے اور کہا کہ بیل واپس کرو، شوہر نے کہا کہ بیل میرا نہیں ہے، میری بیوی کا ہے، وہ بیچنا نہیں چاہتی، اب تمہارے بیل کے پیسے جو میں نے بیل فروختگی کے عوض لئے تھے وہ رقم میری بقایا رقم چار ہزار میں سے وضع کرکے دیں، مجبوراً وہ لوگ واپس چلے گئے۔ تقریباً پندرہ یوم کے بعد وہ لوگ بیل چرا کے لے گئے، تھانے میں رپورٹ درج کرائی، معاملہ مولوی صاحب پر ڈالا گیا کہ وہ فیصلہ کردیں، بیل والی کے شوہر نے بیان دیا کہ بیل میں نے فروخت نہیں کیا تھا بلکہ زمین آباد کرنے کے لئے دیا تھا اور جو پیسے اس بیل پر لئے ہیں وہ میرے چار ہزار قرضے والی رقم سے وضع کرلیں۔ دونوں فریقین کے پاس بیل کے لین دین کا گواہ نہیں تھا، دونوں قرآن شریف اُٹھانے کو تیار تھے، اور کہتے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ..... عند ابی حنیفة، وقال أبو یوسف ومحمد رحمهما الله لا یجوز بیعها ولأبی حنیفةؒ أنها أموال لصلاحیتها لما یحل من وجوه الانتفاع وان صلحت لما لا یحل فصار کالأمة المغنیة وهٰذا لأنّ الفساد لفعل فاعل مختار فلا یوجب سقوط التقوّم.

وفی الدّر المختار ج:۶ ص:۳۹۱ وجاز بیع عصیر عنب ممن یعلم انه یتخذه خمرًا لأنّ المعصیة لا تقوم بعینه بل بعد تغیّره وقیل یکره لاعانته علی المعصیة .... بخلاف بیع امرد ممن یلوط به وبیع سلاح من أهل الفتنة لأن المعصیة تقوم بعینه. وکذا فی امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۱۰، وراجع للتفصیل جواهر الفقه ج:۲ ص:۴۳۹ الیٰ ص:۴۹۲ (طبع مکتبہ دارالعلوم).

کہ بیل جو ہم رات کو لے گئے یہ چوری نہیں ہے بلکہ اپنی خریدی ہوئی چیز لے گئے، دُوسرا فریق کہتا ہے کہ میں نے فروخت نہیں کیا، کوئی گواہ موجود ہو تو پیش کریں۔

مولوی صاحب کا فیصلہ

۱:- بیل فروخت ہوچکا ہے کیونکہ مالکہ سات سو روپے کے عوض بیل کیوں واپس لینے کو تیار تھی؟ آخر کیا مصلحت تھی؟

۲:- بیل چوری نہیں ہوا کیونکہ اُن کی خریدی ہوئی چیز تھی، اگر جرم ہے تو بیل فروخت کرنے والے کا، پھر تھانے میں کیوں رپورٹ درج کرائی؟ شوہر کہتا ہے کہ بیل میری بیوی کی ملکیت ہے، میرا چار ہزار باقی ہے اس میں یہ رقم منہا کرلی جائے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ فیصلہ صحیح ہے، فریقین کو ماننا پڑے گا۔

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات سب دُرست ہیں، تو بیل بدستور اُس عورت کی ملکیت ہے، اور اُس کے شوہر نے اگر اُس بیل کو فروخت کردیا ہو تب بھی یہ بیع دُرست نہیں ہوئی،[۱] کیونکہ وہ بیل کا مالک نہیں تھا، مالک اُس کی بیوی تھی جس نے نہ خود بیع کی اور نہ اس نے بیع کی اجازت دی، لہٰذا یہ بیع باطل ہوئی،[۲] اور اب جبکہ بیل اصل مالکہ کے پاس آگیا تو اس کی رضامندی کے بغیر اُسے وہاں سے لے جانا جائز نہیں۔ جو حالات سوال میں بیان کئے گئے ہیں ان کے مطابق مولوی صاحب کا فیصلہ دُرست نہیں، البتہ اُن کے سامنے معاملے کی کوئی دُوسری صورت لائی گئی ہو تو بات دُوسری ہے۔ عورت نے جو سات سو روپے کی ادائیگی کی پیشکش کی اُسے شرعاً بیع پر رضامندی نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ اپنے شوہر کے دَین کی ادائیگی پر تبرّعاً راضی ہوجانا ہے۔

والله سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۶۰/۲۷ و)

(۱ و ۲) وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۰۶ فصل فی الفضولی هو من یتصرّف فی حق غیره بغیر اذن شرعی کل تصرّف صدر منه تملیکًا کان کبیع وتزویج أو اسقاطًا کطلاق وأعتاق (وله مجیز) أی لهٰذا التصرّف من یقدر علیٰ اجازته حال وقوعه انعقد موقوفًا.

وفی الهندیة ج:۳ ص:۱۵۲ اذا باع الرجل مال الغیر عندنا یتوقف البیع علیٰ اجازة المالک .... الخ.

وکذا فی مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر ج:۳ ص:۱۳۴.

وفی الهدایة کتاب البیوع فصل فی بیع الفضولی ج:۳ ص:۸۸ ومن باع ملک غیره بغیر أمره فالمالک بالخیار ان شاء أجاز البیع وان شاء فسخ.

وفی مجلّة الأحکام کتاب البیوع رقم المادّة:۳۶۸ البیع الّذی یتعلّق به حقّ الغیر کبیع الفضولی وبیع المرهون ینعقد موقوفًا علیٰ اجازة ذٰلک الآخر.

سودی بینک کے لئے مکان یا پلاٹ فروخت کرنے کا حکم

سوال:- سودی بینک کے لئے کوئی مکان یا پلاٹ فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فروخت کرنے کی صورت میں ملنے والی رقم حلال ہے یا حرام؟ محمد عامر (اُستاذ جامعۃ الرشید)

جواب:- چونکہ بینک کے سرمایہ کی اکثریت حرام نہیں، اس لئے بیچنے کی گنجائش تو معلوم ہوتی ہے،(۱) لیکن کراہتِ تنزیہی سے خالی نہیں۔(۲)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۲۵/۲/۲۹ھ

اسمگل شدہ گھڑیوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:- اسمگلنگ کی گھڑیاں جو آدھی قیمت پر فروخت کی جاتی ہیں، ان کی خرید کیسی ہے؟

جواب:- اگر ان گھڑیوں کی خرید میں جھوٹ بولنا یا کسی اور گناہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو خریدنا جائز ہے۔(۳)

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۳۲/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

سگریٹ کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:- سگریٹ بیچنا کیسا ہے؟ دُکان پر دیگر اشیاء کے ساتھ سگریٹ بھی فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ طلعت محمود

(۱ و ۲) وفی ردّ المحتار ج:۴ ص:۲۶۸ باب البغاة (طبع سعید) قلت وافاد کلامهم ان ما قامت المعصیة بعینه یکره بیعه تحریمًا والّا فتنزیهًا (قوله نهر) وعبارته وعرف بهٰذا انّه لا یکره بیع ما لم تقم المعصیة به کبیع الجاریة المغنیة به والکبش النطوح والحمامة الطیارة والعصیر والخشب ممن یتخذ منه المعازف.
وکذا فی البحر الرائق ج:۵ ص:۱۴۳ (طبع سعید) وفی تنقیح الفتاویٰ الحامدیة کتاب الاجارة ج:۲ ص:۱۵۳.
نیز تفصیل کے لئے دیکھئے جواہر الفقہ ج:۲ ص:۴۵۷ تا ۴۶۲۔
(۳) ''اسمگلنگ'' سے متعلق تفصیلی حکم اور حوالہ جات کے لئے ص:۹۰ کا فتویٰ اور اس کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔ اور بیع میں جھوٹ اور دھوکے سے بچنے سے متعلق حوالہ جات ص:۱۰۲ تا ص:۱۰۴ کے حواشی میں ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- سگریٹ فروخت کرنا حرام نہیں ہے،[۱] لیکن کچھ اچھا بھی نہیں ہے، اگر اس کے بغیر کام چل سکے تو خیر، ورنہ بیچنے کی گنجائش ہے۔

والسلام
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۵؍شعبان ۱۴۰۷ھ

سگریٹ کی خرید و فروخت اور اس کی کمائی کا حکم

سوال:- سگریٹ ایجنسی کی کمائی کیسی ہے؟ اور سگریٹ پینا حرام تو نہیں؟

جواب:- سگریٹ پینا حرام نہیں، اس کی ایجنسی کی کمائی بھی حلال ہے۔[۲] واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۶/۱۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۷/۱۹ الف)

اسمگلنگ کی شرعی حیثیت

سوال ۱:- اسمگلنگ جائز ہے یا ناجائز؟ بعض حضرات اس کو جائز کہتے ہیں، جبکہ حکومت کی طرف سے یہ کاروبار بند ہے اور عزت کا بھی خطرہ ہے۔

۲:- اگر ملک کے اندر یہ چیزیں پہنچ جائیں تو بعد میں ملک کے اندر علی الاعلان اُس کی تجارت کی جاتی ہے، کیا ایسا سامان خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

۳:- بعض لوگ ملک کی سرحدوں پر رہتے ہیں، مثلاً ایران کی سرحد پر تو یہ لوگ اپنی ضروریات پاکستان اور ایران دونوں جگہ سے پوری کرتے ہیں، ان کے جواز کی صورت ہے؟

۴:- اگر کوئی شخص خود ایران نہ جائے بلکہ اپنے ایرانی دوست کو لکھ کر اپنے لئے سامان منگوائے اور وہ خرید کر روانہ کردے۔ مثلاً ایران سے آج کل موٹر سائیکلیں مکران کے راستے بہت آرہی ہیں، لوگ اُدھر خرید کر لوگ مجبوراً کراچی میں اُس کے کاغذات بنواتے ہیں، چونکہ بغیر کاغذات کے چلانا

(۱ و ۲) وفی الدّر المختار ج:۶ ص:۴۵۴ (طبع سعید) وصحّ بیع غیر الخمر ومفاده صحة بیع الحشیشة .... الخ.
وفی تنقیح الفتاویٰ الحامدیة مسائل وفوائد شتّی ج:۲ ص:۳۶۶ (طبع مکتبه حبیبیه کوئته) وبالجملة ان تثبت فی هذا الدخان اضرارٌ صرف خال من المنافع فیجوز الافتاء بتحریمه ان لم یثبت انتفاعه فالاصل حله مع ان فی الافتاء بحلّه دفع الحرج عن المسلمین فان أکثرهم مبتلون بتناوله مع ان تحلیله أیسر من تحریمه وما خیّر رسول الله صلی الله علیه وسلم بین أمرین الا اختار أیسرهما.
وفی مجموعة الفتاویٰ کتاب البیوع ج:۲ ص:۱۲۷ أما بیعها وشرائها فیجوز لامکان الانتفاع بها.
نیز دیکھئے: فتاویٰ رشیدیه ص:۴۸۸ و کفایت المفتی ج:۹ ص:۱۴۸ (طبع جدید دار الاشاعت).

منع ہے کراچی میں نمبر حاصل کرنے کے لئے ہزار ڈیڑھ ہزار خرچ ہوتا ہے، عوام وخواص اس میں مبتلا ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

جواب ۱ تا ۴:- اصل یہ ہے کہ شرعاً ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے مملوک روپے سے اپنی ضرورت یا پسند کا جو مال جہاں سے چاہے خرید سکتا ہے،[1] لہٰذا کسی بیرونی ملک سے مال خریدنا یا وہاں لے جاکر بیچنا شرعاً مباح ہے،[2] لیکن ایک صحیح اسلامی حکومت اگر عام مسلمانوں کے مفاد کی خاطر کسی مباح چیز پر پابندی عائد کردے تو اس کی پابندی کرنا شرعاً بھی ضروری ہوجاتا ہے،[3] اب موجودہ مسلمان حکومتوں نے چونکہ اسلامی قوانین کو ترک کرکے غیر اسلامی قوانین نافذ کر رکھے ہیں، لہٰذا ان کو وہ اختیارات نہیں دیئے جاسکتے جو صحیح اسلامی حکومت کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن اُن کے اَحکام کی خلاف ورزی میں چونکہ بہت سے منکرات لازم آتے ہیں، مثلاً اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے، نیز جان و مال یا

(۱ و ۲) وفی شرح المجلّة للأتاسیؒ رقم المادّة: ۱۱۹۲ ج:۳ ص:۱۳۲ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ) کل یتصرّف فی ملکه کیف شاء. وفی شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۴ ص:۱۴۰ رقم المادة:۱۱۹۷ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ) لا یمنع أحد من التصرّف فی ملکه أبدًا الّا اذا کان ضررهُ لغیره.

وکذا فی ردّ المحتار ج:۵ ص:۴۴۸ (طبع سعید).

وفی الهدایة ج:۴ ص:۴۷۲ (طبع مکتبہ رحمانیہ) ولا ینبغی للسلطان أن یسعر علی النّاس لقوله علیه السلام: "لا تسعّروا فانّ الله هو المسعر القابض الباسط الرّازق. ولأنّ الثمن حقّ العاقد فالیه تقدیره فلا ینبغی للامام أن یتعرّض لحقّه الّا اذا تعلّق به دفع ضرر العامة.

وکذا فی بدائع الصنائع ج:۵ ص:۱۲۹ والدّر المختار ج:۶ ص:۳۹۹.

وفی بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة ص:۸ وللبائع أن یبیع بضاعته بما شاء من ثمن ولا یجب علیه أن یبیعه بسعر السوق دائمًا وللتجّار ملاحظة مختلفة فی تعیین الاثمان وتقدیرها ..... الخ.

(۳) وفی أحکام القرآن للمحدّث العلّامة ظفر أحمد العثمانی رحمه الله ج:۲ ص:۲۹۱ وهٰذا الحکم ای وجوب طاعة الأمیر یختص بما اذا لم یخالف أمره الشرع یدل علیه سیاق الآیة فانّ الله تعالیٰ أمر النّاس بطاعة أولی الأمر بعد ما أمرهم بالعدل فی الحکم تنبیهًا علیٰ أن طاعتهم واجبة ما داموا علی العمل اهـ. وکذا فی تفسیر المظهری ج:۲ ص:۱۵۲ والجامع لأحکام القرآن ج:۵ ص:۲۵۹.

وفی الدّر المختار مطلب فی وجوب طاعة الامام ج:۴ ص:۱۷۲ (طبع سعید) تجب طاعة الامام فیما لیس بمعصیة. وفیها أیضًا ج:۶ ص:۴۲۰ وفی شرح الجواهر تجب اطاعته فیما اباحه الشّرع وهو ما یعود نفعه علی العامّة وقد نصّوا فی الجهاد علیٰ امتثال أمره فی غیر معصیة.

وفی ردّ المحتار ج:۵ ص:۱۶۷ (طبع سعید) (قوله یعزّر) لأنّ طاعة أمر السلطان بمباح واجبةٌ. وفی الدّر المختار کتابُ الجهاد باب البغاة ج:۴ ص:۲۶۴ (طبع سعید) لأنّ طاعة الامام فیما لیس بمعصیة فرض .... الخ.

وفی الأشباه والنظائر ج:۱ ص:۱۵۷ تصرّف الامام بالرّعیة منوطٌ بالمصلحة.

وفی تکملة فتح الملهم ج:۳ ص:۳۲۳ وص:۳۲۴ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی) المسلم یجب علیه أن یطیع أمیرهٗ فی الأمور المباحة فان أمر الأمیر بفعل مباح وجبت مباشرته وان نهی عن أمر مباح حرم ارتکابه .... ومن هنا صرّح الفقهاء بأن طاعة الامام فیما لیس بمعصیة واجبة .... هٰذه الطاعة کما أنّها مشروطة بکون أمر الحاکم غیر معصیة فانّها مشروطة أیضًا بکون الأمر صادرًا عن مصلحة لا عن هویٰ أو ظلم لأنّ الحاکم لا یطاع لذاته وانّما یطاع من حیث أنّه متولّ لمصالح العامّة اهـ.

وفی بحوث قضایا فقهیة معاصرة ص:۱۶۲ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی) کل من یسکن دولة فانّه یلتزم قولًا أو عملًا بانّه یتبع قوانینها وحینئذٍ یجب علیه اتباع أحکامها ..... الخ.

عزّت کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، لہٰذا ان کے جائز قوانین کی پابندی کرنی چاہئے۔ (۱) اس کے علاوہ جب کوئی شخص کسی ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ قولاً یا عملاً یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اس حکومت کے قوانین کا پابند رہے گا، اس معاہدے کا تقاضا بھی یہ ہے کہ جب تک حکومت کا حکم معصیت پر مشتمل نہ ہو اس کی پابندی کی جائے۔ (۲) اسمگلنگ کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اصلاً باہر کے ملک سے مال لے کر آنا یا یہاں سے باہر لے جانا شرعی اعتبار سے جائز ہے، لیکن چونکہ حکومت نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے اور اس پابندی کی خلاف ورزی میں مذکورہ مفاسد پائے جاتے ہیں، اس لئے علماء نے اس سے منع فرمایا ہے، اور اس سے اِجتناب کی تاکید کی گئی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۷/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۷۷۸ ج)

سوتر منڈی فیصل آباد میں پرچی کے ذریعے خرید وفروخت کا شرعی حکم

سوال:- بخدمت اقدس سیّدی ومرشدی حضرت شیخ الاسلام مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے حضرتِ والا بعافیت تمام ہوں، حق تعالیٰ حضرتِ والا کا قیمتی سایہ صحت وعافیتِ کاملہ کے ساتھ سلامت رکھیں، اور اس ناکارہ کو حضرتِ والا کے فیوض سے فہمِ سلیم کے ساتھ بہرہ ور ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔

یہاں سوتر منڈی میں پرچی کے کاروبار کی ایک صورت چل رہی ہے، جس کا حکمِ شرعی معلوم کرنے کے لئے احقر نے ایک تحریر مرتب کی ہے۔ یہ تحریر بغرضِ راہنمائی حضرتِ والا کی خدمت میں اِرسال کر رہا ہوں۔ چونکہ کاروباری طبقے کو حضرتِ والا کی رائے گرامی پر کافی اِعتماد ہے اس لئے حضرتِ والا سے درخواست ہے کہ اسے ملاحظہ فرمالیں۔ احقر اِن شاء اللہ کسی وقت فون پر اس کاروبار کی صورتِ حال ذِکر کر کے حضرتِ والا کی رائے معلوم کرلے گا۔

آخر میں حضرتِ والا سے دُعاؤں کی درخواست ہے۔

والسلام

خویدکم

محمد عالمگیر غفرلہٗ

دارالافتاء سوتر منڈی فیصل آباد

۱۴۲۴/۶/۱۸ھ

(۱و۲) دیکھئے پچھلے صفحے کے حواشی۔

مسئلے کی تفصیلی صورت

سوتر منڈی فیصل آباد میں کاروبار کی ایک صورت عام چل رہی ہے کہ ایک شخص کسی دُکان دار سے سوتر خریدتا ہے، دُکان دار نے جو مال فروخت کیا ہے وہ اس کے گودام میں موجود ہوتا ہے اور خریدار کو بھی فروخت کنندہ کے گودام میں مال کی موجودگی کا بھروسہ ہوتا ہے۔ سودا طے پا جانے کے بعد فروخت کنندہ اس مال کی وصول کی پرچی جسے ڈیلیوری آرڈر کہا جاتا ہے خریدار کے حوالے کر دیتا ہے۔ جس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ خریدار جب چاہے فروخت کنندہ کے گودام سے مال اُٹھوا سکتا ہے۔ ڈیلیوری آرڈر کی وصولی کے بعد خریدار عموماً گودام سے مال نہیں اُٹھواتا بلکہ اسی آرڈر کی بنیاد پر یہ مال آگے کسی تیسرے شخص کو فروخت کر دیتا ہے۔ خرید وفروخت کے مذکورہ معاملے کے بارے میں سوتر منڈی کے مختلف حضرات سے تفصیلات معلوم کرنے پر یہ اُمور سامنے آئے:

۱- جب تک فروخت شدہ مال اصل فروخت کنندہ کے گودام میں موجود ہے، اس وقت تک وہ مال اسی کے ضمان میں رہتا ہے، لہٰذا اگر خدانخواستہ گودام کو آگ لگ جائے یا گودام میں موجود مال کسی اور طریقے سے ضائع ہو جائے تو یہ نقصان خریدار (ڈیلیوری آرڈر وصول کرنے والے) کا نہیں بلکہ اصل فروخت کنندہ کا سمجھا جاتا ہے۔

۲- گودام میں سوتر کے بورے کثیر تعداد میں موجود ہوتے ہیں، لہٰذا خریدار کے لئے گودام کے اندر اپنا مال دُوسرے مال سے الگ جگہ پر رکھوانا یا کم از کم اس کی تعیین کرانا بہت مشکل ہے۔ اور اگر کوئی خریدار اس کا مطالبہ کر بھی لے تو پلے داروں (مال کی حفاظت اور اس کے اُٹھوانے پر مامور ملازمین) کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے کہ آپ کا خریدا ہوا مال پیچھے ہے، اور اس کے آگے دُوسرے بورے رکھے ہوئے ہیں، لہٰذا مال الگ جگہ رکھوانے یا اپنی جگہ پر رہتے ہوئے اس کی تعیین کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اس کے آگے موجود سارا مال اُٹھایا جائے اور پھر تعیین یا تمییز کی جائے، اور یہ ان لوگوں کے لئے بہت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔

۳- فروخت کنندہ کے گودام میں کثیر مقدار میں مال آتا بھی رہتا ہے اور ساتھ ساتھ نکلتا بھی رہتا ہے، اب فروخت کنندہ اپنے آپ کو اس کا پابند نہیں سمجھتا کہ جو مال اس نے ایک شخص کو فروخت کر دیا ہے وہ اسے اپنے گودام میں سنبھال کر رکھے بلکہ وہ بسا اوقات اسی مال کی ڈیلیوری کسی اور کو بھی کروا دیتا ہے، لیکن چونکہ اس کے گودام میں مال بکثرت آ بھی رہا ہوتا ہے اس لئے اسے اِطمینان ہوتا

ہے کہ جب بھی خریدار مال اُٹھوانا چاہے گا تو اسے مطلوبہ کوالٹی کا مال اُٹھوا دیا جائے گا۔

۴- نیز اس پرچی (ڈیلیوری آرڈر) کی بنیاد پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس مال کی خرید وفروخت ہوتی رہتی ہے جبکہ مال ابھی اصل فروخت کنندہ کے گودام میں ہی ہوتا ہے۔ بسااوقات ایک مختصر وقت میں یہ مال متعدّد ہاتھوں میں فروخت ہوچکا ہوتا ہے۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ آخری خریدار یہ مال سب سے پہلے فروخت کنندہ کے گودام سے اُٹھوالیتا ہے، محض فرق برابر کرنے یا سٹہ کرنے کا اِمکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب ایسی صورت میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مال کی تعیین یا تفریق پر پلے دار قطعاً آمادہ نہیں ہوں گے، جس کی وجہ سے اس کی تعیین مشکل ہے۔

مذکورہ بالا صورت کے شرعی حکم پر غور کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ پیچھے دی گئی تفصیل کے مطابق محض ڈیلیوری آرڈر کی وصولی شرعی قبضہ قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ ڈیلیوری آرڈر کی وصولی کے باوجود فروخت شدہ مال جب تک فروخت کنندہ کے گودام میں ہے اس وقت تک وہ اسی کے ضمان میں رہتا ہے، مارکیٹ کے عرف کے مطابق اس کا ضمان خریدار کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ لہٰذا گودام سے مال اُٹھوائے یا اپنا مال الگ کئے بغیر محض ڈیلیوری آرڈر کی وصولی کی بنیاد پر ہی یہ مال آگے فروخت کیا جارہا ہے، تو یہ بیع قبل القبض ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

اس صورت کے عدمِ جواز کے بارے میں مارکیٹ کے بعض متدین احباب سے جب گفتگو کی گئی تو ان کا سوال یہ تھا کہ اگر ہم مارکیٹ کے عام عرف کے خلاف دیانۃً خریدے ہوئے مال کا رِسک قبول کرلیں، مثلاً اگر خدانخواستہ فروخت کنندہ کے گودام کو آگ لگ جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس میں موجود مال جل کر ضائع ہوجاتا ہے تو اپنے خریدے ہوئے بوروں کی حد تک ہم اس نقصان کے ذمہ دار ہوں گے (اگرچہ خریدار کے اس ضمان کے بارے میں فروخت کنندہ کو بتایا نہیں جائے گا، کیونکہ اس صورت میں فروخت کنندہ کی طرف سے بد دیانتی کا خدشہ ہے) تو پھر ہمارے لئے محض ڈیلیوری آرڈر کی بنیاد پر اس مال کو آگے فروخت کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

اس سوال پر مزید غور و مشاورت کے بعد جو اُمور سامنے آئے، انہیں ذیل میں نمبروار درج کیا جارہا ہے:-

۱- قبضے میں بنیادی چیز اِنتقالِ ضمان (رِسک) ہے، لہٰذا اگر کسی جگہ حسی قبضہ نہ ہوسکے البتہ خریدی ہوئی چیز کا ضمان خریدار کی طرف منتقل ہوجائے تو اسے بھی قبضہ ہی تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس کی نظیر

کمپنی کے شیئرز ہیں۔ شیئرز کی خرید وفروخت درحقیقت کمپنی کے مشاع اثاثوں کی خرید وفروخت ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مشاع اثاثوں پر حسی قبضہ تو ہو نہیں سکتا، لہٰذا اِنتقالِ ضمان کو ہی کافی سمجھا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: فقہی مقالات ج:۱ ص:۱۵۴)۔

لہٰذا مسئولہ صورت میں بھی اگر خریدار رِسک قبول کرنے کے لئے تیار ہے تو اس کے لئے محض ڈیلیوری آرڈر کی بنیاد پر آگے خرید وفروخت جائز ہونی چاہئے۔

لیکن اس صورت کے جواز کا فتویٰ دینے میں کچھ اِشکالات ہیں جو ذیل میں درج ہیں:

الف:- شیئرز اور مجوث عنہ صورت میں واضح فرق ہے، وہ یہ کہ شیئر ہولڈرز اگر خریدے ہوئے شیئرز کی پشت پر موجود اَثاثوں کی تعیین یا ان کا افراز کرانا چاہے تو اس کے لئے یہ ناممکن ہے، اس لئے وہاں اِنتقالِ ضمان کو ہی کافی سمجھا گیا ہے، بخلاف مجوث عنہ صورت کے کہ اس میں فروخت شدہ مال کی تعیین وافراز مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ اور درحقیقت یہ مشکل بھی کاروباری طبقے کے عام رِواج اور کاروبار کی تیز رفتاری کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کمپنی کو اس مسئلے کی نظیر بنانا مشکل ہے۔

ب:- پھر شیئرز کی خرید وفروخت کی صورت میں اسٹاک ایکسچینج اور شیئرز کا کاروبار کرنے والے لوگوں کا عام عرف ہی یہ ہے کہ شیئرز خریدتے ہی رِسک خریدار کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، اگرچہ شیئر سرٹیفکیٹ پر ابھی تک قبضہ نہ ہوا ہو۔ جبکہ مجوث عنہ صورت میں عرف اس کے خلاف ہے، خریدا ہوا مال جب تک فروخت کنندہ کے گودام میں ہے اس وقت تک وہ اسی کے ضمان میں سمجھا جاتا ہے۔ اس عرفِ عام کے خلاف اگر کوئی شخص اِنفرادی طور پر اس مال کی ضمان قبول کرلیتا ہے تو اسے قبضہ قرار دینے سے دیگر کاروباری اَفراد کے غلط فہمی میں واقع ہوجانے کا خطرہ ہے، خاص طور پر جبکہ خریدار اپنی اس ضمان کے متعلق فروخت کنندہ کو آگاہ کرنے کے لئے بھی تیار نہیں۔

ج:- زبانی گفتگو کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ جو خریدار ڈیلیوری آرڈر ملتے ہی فروخت کنندہ کے گودام میں موجود خریدے ہوئے مال کا رِسک قبول کرنے کے لئے تیار ہیں وہ بھی صرف اس صورت میں رِسک قبول کریں گے جبکہ خدانخواستہ فروخت کنندہ کے گودام میں موجود سارا کا سارا مال ضائع ہوجائے۔ اس صورت میں یہ اپنے خریدے ہوئے مال کی حد تک ضامن بننے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اگر گودام میں موجود سارا مال نہیں بلکہ کچھ مال ضائع ہوتا ہے تو اس صورت میں یہ تعیین کہ کس کا مال ضائع ہوا ہے؟ بہت مشکل ہے، اور اس میں نزاع کا بھی شدید خطرہ ہے، نیز خریدار اس صورت میں

ضامن بننے کے لئے بھی تیار نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ خریدار نے خریدے ہوئے مال کا رِسک مکمل طور پر قبول نہیں کیا۔ جبکہ کمپنی میں یہ صورتِ حال نہیں، کیونکہ کمپنی کے تمام اثاثے مشاعاً تمام شیئر ہولڈرز کی ملکیت ہیں۔ لہٰذا جزوی طور پر اَثاثوں کے ضائع ہونے کی صورت میں تمام شیئر ہولڈرز اپنے حصے کے تناسب سے اس نقصان کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

د:- اور آخری اِشکال یہ ہے کہ محض ڈیلیوری آرڈر کی بنیاد پر آگے خرید وفروخت کو جائز قرار دینے سے کہیں سٹے کا دروازہ نہ کھل جائے، چنانچہ مارکیٹ کے بعض حضرات کی زبانی معلوم ہوا کہ کسی زمانے میں سٹے کا کاروبار رہا ہے، اور اَب بھی سٹہ چلتا ہے، لیکن بہت کم۔

ان چار وجوہ کی بنیاد پر خریدار اگر اپنے طور پر خریدے ہوئے مال کا رِسک قبول کر بھی لے تو بھی اس کے جواز کا فتویٰ دینے میں تردد ہے۔

۲- ایک تجویز یہ بھی ہے کہ جس وقت مال فروخت کنندہ کے گودام میں بوروں کی شکل میں آرہا ہے اسی وقت یا مال تیار کرتے وقت ملز کی طرف سے ہی ان بوروں پر کوئی سیریل نمبر لگادیا جائے۔ پھر جب بوروں کا سودا ہوا تو فروخت کنندہ ڈیلیوری آرڈر پر فروخت شدہ بوروں کا نمبر بھی لکھ دے۔ مثلاً اگر خریدار نے سو بورے خریدے ہیں تو دُکان دار ڈیلیوری آرڈر پر تعیین کردے کہ بورہ نمبر ۶۰۱ سے بورہ نمبر ۷۰۰ تک فروخت کیا گیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ فروخت شدہ مال کی تعیین کے لئے افراز یا کسی اور عمل کی ضرورت نہیں رہے گی اور خریدار مارکیٹ کے عرف کے خلاف اپنے طور پر اگر اس مال کا رِسک قبول کرنا چاہے تو یہ بھی ممکن ہوگا اور خدانخواستہ گودام میں موجود مال کا کچھ حصہ ضائع ہوجانے کی صورت میں یہ معلوم کرنا بھی آسان ہوگا کہ کس کا مال ضائع ہوا ہے؟ جس کی وجہ سے باہم نزاع کا اندیشہ نہیں ہوگا۔

لیکن اس تجویز کے بارے میں دو باتیں قابلِ غور ہیں:

الف:- جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ مارکیٹ کا عام عرف یہی ہے کہ مال جب تک فروخت کنندہ کے گودام میں موجود رہے گا، اس وقت تک وہ اسی کے ضمان میں رہے گا، خریدار کی طرف اس کا ضمان منتقل نہیں ہوگا۔ اور مجوّزہ صورت میں خریدار مارکیٹ کے عام عرف کے خلاف صرف اپنی دیانت پر خریدے ہوئے مال کا رِسک قبول کرے گا، اور قبولِ رِسک کے بارے میں فروخت کنندہ کو بالکل آگاہ نہیں کرے گا۔ کیونکہ اسے خطرہ ہے کہ اگر میں فروخت کنندہ کو اپنے رِسک کے متعلق آگاہ کروں گا تو وہ

بد دیانتی کا مرتکب ہوگا۔ مثلاً کسی تیسرے شخص کو یہی مال اُٹھوادے گا اور مجھے یہ کہے گا کہ آپ کا مال چوری ہوگیا ہے، اور چونکہ رِسک آپ کا تھا اس لئے یہ مال آپ کا ضائع ہوا ہے، میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس جیسے خطرات کے پیشِ نظر خریدار فروخت کنندہ کو اپنے رِسک کے متعلق آگاہ نہیں کرنا چاہتا۔ اب قابلِ غور یہ ہے کہ کیا قبضہ متحقق ہونے کے لئے اس طریقے پر رِسک قبول کرنا کافی ہوگا؟

ب:- بوروں پر سیریل نمبر لگانے کی تجویز گو فی نفسہٖ قابلِ عمل ہے، لیکن تجار کے اَحکامِ شرعیہ کے ساتھ قلّتِ اعتناء اور حلال وحرام کی فکر نہ ہونے کے پیشِ نظر اس پر عمل ہونا بظاہر ناممکن ہے۔ چند گنتی کے افراد اس تجویز کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں، لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو سوتر کے خریدار ہیں، نہ کہ گودام مالکان اور فروخت کنندگان، اس لئے یہ تجویز صرف تصوّر کی حد تک ہوگی جس کا کوئی عملی وجود نہیں ہوگا۔

۳- یہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے کہ خریدے ہوئے سوتر کو آگے فروخت کرنے کے لئے اس پر قبضے کو شرط قرار دِیا جائے جیسا کہ حنفیہ اور شافعیہ کا مذہب ہے۔ لیکن مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ صرف طعام میں بیع قبل القبض ناجائز ہے۔ طعام کے علاوہ باقی اشیاء میں بیع قبل القبض ناجائز نہیں۔ اِمام احمدؒ کی ایک روایت بھی یہی ہے۔ اس وقت خاص طور پر سوتر منڈی میں سوتر کی بیع قبل القبض کا عام اِبتلاء ہے، اور مارکیٹ کی صورتِ حال یہ ہے کہ گو کچھ افراد بیع قبل القبض سے بچنے اور قبضے کے بعد مال فروخت کرنے پر تیار ہوں گے، لیکن عام لوگوں کے اعتبار سے یہ ناممکن ہے۔ اس لئے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ اس صورتِ حال میں مالکیہ کے مذہب پر فتویٰ دے دیا جائے، کیونکہ معاملات میں توسع کی بناء پر اِفتاء بمذہب الغیر کے نظائر خاص طور پر موجودہ زمانے میں کم نہیں۔ نیز کاروبار کا ایک طریقہ جو لوگوں میں رِواج پاچکا ہے، اس سے انہیں ہٹانا خاصا دُشوار اور ان کے لئے حرج کا باعث ہے۔ چنانچہ علامہ شامیؒ نے پھلوں کی بیع کی ایک صورت میں ظاہر الروایۃ سے عدول کرنے کی وجہ یہی ارشاد فرمائی ہے، فرماتے ہیں:

(قوله وأفتى الحلواني بالجواز) وزعم أنه مروى عن أصحابنا و كذا حكى عن الامام الفضلي، وقال استحسن فيه لتعامل الناس وفي نزع الناس عن عادتهم حرج، قال في الفتح: وقد رأيت رواية في نحو هذا عن محمد في بيع الورد على الأشجار فان الورد متلاحق، وجوز البيع في الكل وهو قول

مالک قال الزيلعي: وقال شمس الأئمة السرخسي: والأصح أنه لا يجوز لأن المصير الٰى مثل هذه الطريقة ... عند تحقق الضرورة ولا ضرورة هنا لأنه يمكنه أن يبيع الأصول علٰى ما بينا .... قلت: لٰكن لا يخفى تحقق الضرورة في زماننا ولا سيما في مثل دمشق الشام كثيرة الأشجار والثمار فانه لغلبة الجهل على الناس لا يمكن الزامهم بالتخلص بأحد الطرق المذكورة، وان أمكن ذٰلک بالنسبة الٰى بعض أفراد الناس لا يمكن بالنسبة الٰى عامتهم وفي نزعهم عن عادتهم حرج كما علمت.
(شامی ج:۴ ص:۵۵۵).

لیکن مجوث عنہ صورت میں مالکیہ کے مذہب کے مطابق بیع قبل القبض کے جواز کا فتویٰ دینے میں سٹے کا دروازہ بھی کھلنے کا خطرہ ہے، اس لئے اس کے جواز کا فتویٰ دینے میں تردد ہے۔

آنجناب سے درخواست ہے کہ مذکورہ مسئلے کے متعلق اپنی قیمتی رائے سے آگاہ فرمادیں اور پیچھے ذِکر کی گئی صورتوں میں سے جوصورت زیادہ مناسب ہو یا کوئی اورصورت جوآنجناب کے ذہن میں ہوتحریرفرمادیں۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
محمد عالمگیر غفرلہٗ
دارالافتاء سوتر منڈی فیصل آباد
۱۴۲۴/۶/۱۷ھ

جواب:- پرچی کے ذریعے خرید وفروخت کے مروّج طریقے میں دوخرابیاں ہیں، ایک مبیع کا غیرمتعین ہونا، دُوسرے بیع قبل القبض۔ لہٰذا یہ طریقہ جائز نہیں ہے۔(۱) اوّل تو پہلی خرابی کی موجودگی میں بظاہر مالکیہ کے مسلک پر بھی بیع جائز نہیں ہوگی،(۲) دُوسرے اس قول پرفتویٰ دینے کی نہ صرف یہ کہ ضرورت نہیں ہے، بلکہ موجودہ دور میں سٹہ وغیرہ کی خرابیوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس پر فتویٰ نہ دیا جائے، خود مالکی علماء بھی آج کل اس پرفتویٰ دینے میں تردّد کرتے ہیں۔ البتہ مذکورہ کاروبار

(۱) بیع قبل القبض کے عدمِ جواز سے متعلق تفصیلی حوالہ جات کے لئے ص:۸۲ کا حاشیہ نمبر۱ اور ص:۲۲۳ کا حاشیہ نمبر۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفي مواهب الجليل لشرح مختصر الخليل ج:۶ ص:۸۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وجهل بمثمون أو ثمن ولو تفصيلًا يعني ان من شرطة صحّة البيع أن يكون معلوم العوضين فان جهل الثمن أو المثمون لم يصحّ البيع وظاهر كلامه أنّه متٰى حصل الجهل بأحد العوضين من المتبايعين أو من أحدهما فسد البيع وصرّح بذٰلک الشارح في الكبير وهو ظاهر التوضيح أيضًا.

کی جائز صورت صرف یہ ہوسکتی ہے کہ بوروں پر نمبر ڈال کر خریداری کے وقت نمبروں کے ذریعے ان کا تعین کرلیا جائے[۱]، اور پرچی پر وہ نمبر درج ہوں، نیز بائع اپنی طرف سے تخلیہ کردے، یعنی یہ کہہ دے کہ یہ بورے اب آپ کے ہیں، جب چاہیں اُٹھا کر لے جائیں، اب میں ان بوروں کا ضامن نہیں ہوں، جب تک میرے گودام میں رہیں گے آپ کی امانت کے طور پر رہیں گے، میں ان کے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوں گا۔ یہ بات پرچی پر بھی لکھ دی جائے۔ اس صورت میں چونکہ مبیع متعین بھی ہوجائے گی اور ضمان بھی بائع کے تخلیہ کے ذریعے مشتری کی طرف منتقل ہوجائے گا، اس لئے خریدار کے لئے آگے فروخت کرنا جائز ہوگا[۲]۔ صرف خریدار کا یہ سمجھ لینا کافی نہیں کہ مبیع میرے ضمان میں آگئی ہے، خواہ بائع اسے اپنے ضمان میں سمجھتا ہو، اور عرف بھی یہ ہو کہ گودام میں رہنے تک بائع کا ضمان ختم نہیں ہوتا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۶/۶/۱۴۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۶۴۴/۴)

زندہ جانور کو وزن کرکے فروخت کرنے کا حکم

سوال:- آج کل جانور مرغی اور بکری وغیرہ کو وزن کرکے اور تول کر فروخت کیا جاتا ہے، اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ (مفتی عبدالواحد)

جواب:- آپ نے فرمایا ہے کہ آج کل مرغی اور بکری جو تُل کر بیچی جاتی ہیں، اُن کے بارے میں احقر کی کیا رائے ہے؟ غالباً سوال کا مقصد یہ ہے کہ کیا اب اُن کو عددی کی بجائے وزنی قرار دے دیا جائے؟[۱] فی الحال احقر کا جواب نفی میں ہے۔[۲] میرا خیال یہ ہے کہ اب بھی وہ عددی ہیں[۳]، اور اُن کا تولنا درحقیقت آحاد میں سے کسی ایک کے انتخاب میں مدد لینے کے لئے ہوتا ہے۔ ''وزنی'' ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اُس چیز کو مشتری جتنے وزن میں چاہے، جب چاہے، خرید سکے۔ مرغی اور بکری میں یہ ممکن نہیں، کما ھو ظاھر۔ لہٰذا امرِ واقعہ یہ ہے کہ تولنے کے ذریعے یہ جاننا مقصود ہوتا ہے کہ جانور کتنا

(۱ و ۲) وفی الھندیۃ ج:۳ ص:۱۶ ویعتبر فی التسلیم أن یکون المبیع مفرزًا غیر مشغول بحق غیرہ ھٰکذا فی الوجیز للکردری واجمعوا علی أن التخلیۃ فی البیع الجائز تکون قبضًا ...الخ.

وفی البدائع ج:۵ ص:۲۴۴ فالتسلیم والقبض عندنا ھو التخلیۃ والتخلّی وھو أن یخلّی البائع بین المبیع وبین المشتری برفع الحائل بینھما علٰی وجہٍ یتمکن المشتری من التصرّف فیہ فیجعل البائع مسلّمًا للمبیع والمشتری قابضًا لہٗ اھ. نیز مزید حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص:۸۳ کا حاشیہ نمبر۲۔

پُرگوشت ہے؟ جب یہ بات تُلنے سے واضح ہوگئی تو سودا عدداً ہی ہوتا ہے، لہٰذا وہ عددی ہی شمار ہوگا۔ (۴)

والسلام
محمد تقی عثمانی
یکم صفر ۱۴۱۲ھ

(۱ تا ۴) جانور کے ہمیشہ عددی رہنے اور جانور کو وزن کر کے فروخت کرنے سے متعلق مذکورہ تمام اُمور کی وضاحت اور تفصیلی حکم کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کا مصدقہ درج ذیل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

زندہ جانور تول کر بیچنے کا مفصل و مدلل حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زندہ جانور مثلاً مرغی، بکرا وغیرہ کو وزن کر کے خریدنا اور فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً

اگر خریدار اور فروخت کنندہ زندہ جانور کو وزن کر کے خرید وفروخت پر راضی ہوں، تو زندہ جانور کو وزن کر کے نقد رقم یا غیرجنس کے ذریعے خریدنا اور فروخت کرنا دونوں جائز ہیں، بشرطیکہ متعین جانور کا فی کلو کے حساب سے نرخ طے کرلیا گیا ہو، نیز جانور کا وزن کرنے کے بعد اس کی قیمت بھی متعین کرلی گئی ہو۔ جس کی صورت یوں ہوگی کہ خریدار کو مثلاً ایک بکرے کی ضرورت ہے، تاجر کے پاس جا کر وہ بکروں میں سے ایک بکرا منتخب کرلیتا ہے اور تاجر اس کو بتادیتا ہے کہ اس بکرے کا نرخ پچاس روپے کلو ہے اور اس بکرے کو خریدار کے سامنے وزن کر کے بتادیتا ہے کہ مثلاً یہ بیس کلو کا ہے۔ اب اگر خریدار اس کو قبول کرلے تو بیع منعقد ہوجائے گی اور اس طرح کی گئی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے۔

مسئلہ مذکورہ میں اس بات کو ذہن نشین کرلینا ضروری ہے کہ یہاں دو باتیں الگ الگ ہیں۔ ایک یہ کہ جانور کو وزن کر کے بیچنا اور خریدنا۔ دُوسری بات یہ ہے کہ جانور کو موزون قرار دینا اور اس پر موزونی اشیاء کے فقہی اَحکامات جاری کرنا۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے کہ جانور کو وزن کر کے بیچنا اور خریدنا، تو یہ بلاشبہ جائز ہے، اس لئے کہ عدمِ جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

لیکن دُوسری بات کہ جانور کو موزون قرار دینا اور اس پر موزونی اشیاء پر جاری ہونے والے تمام اَحکامِ فقہیہ کو جاری کرنا۔ تو یہ دُرست نہیں۔ اس کی دو وجہ ہیں:-

۱- پہلی وجہ یہ ہے کہ جن چیزوں کا کیلی، وزنی یا عددی ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں منصوص یا معلوم ہو، ان کی وہ حیثیت تبدیل نہیں ہوتی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں جانوروں کا عددی ہونا معلوم ہے، البتہ جن اشیاء کا کیلی یا وزنی ہونا منصوص نہیں تو ان کا مدار عرف پر ہے۔ اگر عرف ان کے کیل کرنے کا ہے تو وہ کیلی ہیں، اور اگر عرف وزن کرنے کا ہے تو وہ وزنی ہیں۔ جیسا کہ عالمگیریہ میں ہے: وما لا نص فيه ولم يعرف حالهٗ على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم يعتبر فيه عرف الناس. فان تعارفوا كيلهٗ فهو كيلي وان تعارفوا وزنهٗ فهو وزني. كذا في المحيط۔ (العالمگیریۃ ج:۳ ص:۱۱۷) تو جب جانور کا عددی ہونا معلوم ہے تو اس کے عددی ہونے کی حیثیت وزناً بیع کرنے سے تبدیل نہ ہوگی، یہ الگ بات ہے کہ بیع صحیح ہوجائے گی، لعدم المانع۔

۲- دُوسری وجہ یہ ہے کہ جانور کو دیگر اشیاءِ موزونہ کی طرح حسبِ منشا کم یا زیادہ کر کے وزن کرنا ناممکن ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح دیگر اشیاءِ موزونہ کی جتنی مقدار مطلوب ہوتی ہے اتنی مقدار کو بلاتکلف وزن کر کے الگ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً چینی ۲۰ کلو ۱۵ گرام کی ضرورت ہے تو بلاتکلف چینی کی یہ مقدار وزن کے ذریعے الگ کی جاسکتی ہے، بخلاف جانور کے کہ اس میں یہ بات ممکن ہی نہیں مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ ۲۰ کلو ۱۵ گرام کا بکرا چاہئے، کچھ کم زیادہ نہ ہو، تو یہ بظاہر محال ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ جانور کو موزونی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)
اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اگر بالفرض جانور کو سارے جہان میں وزن کر کے بیع کرنے کا عرف قائم ہوجائے تو بھی جانور کو بنیادی طور پر موزونی قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ اس میں موزونی اشیاء والی صفات ہی نہیں پائی جاتیں، کما مرّ۔

مذکورہ تفصیل کے بعد جانور کی بیع وزناً کے جائز ہونے کا حاصل یہ ہے کہ فی کلو کے حساب سے جانور کی قیمت کا ایک معیار مقرّر کرلیا گیا ہے، جس کی بناء پر جانور کو وزن کر کے اس کے وزن کے اعتبار سے قیمت کا اندازہ لگا کر مناسب قیمت متعین کرلی جاتی ہے۔ صورتِ مذکورہ میں وزن کو صرف آلہ بنا کر قیمت متعین کرنے میں آسانی پیدا کی گئی ہے، لہٰذا عرفاً تو اس کو بیع وزناً کہا جاسکتا ہے لیکن حقیقتاً اس کا بیع وزناً ہونا محلِ تامل ہے۔ البتہ یہ بیع بہرحال جائز ہے جبکہ جانور بھی متعین ہوجائے اور قیمت بھی متعین ہو، **فافهم**۔

جانور کی اس بیع وزناً میں بعض لوگوں کو کچھ اِشکالات پیدا ہوسکتے ہیں۔ اس لئے ان متوقع اشکالات کو نقل کر کے ان کے مختصر جوابات دیئے جاتے ہیں، تاکہ اوہام رفع ہوسکیں اور کوئی انتشار باقی نہ رہے۔

۱- پہلا اشکال بعض لوگوں کو یہ ہوسکتا ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا جارہا ہے کہ **لیس بموزون** یعنی جانور وزن کی جانے والی چیز نہیں ہے، اور یہی کتبِ فقہ میں مصرّح ہے، لیکن دُوسری طرف آپ نے کہا ہے کہ اس کو وزن کر کے بیچنا جائز ہے، **فکیف التوفیق؟**

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اشکال اس وقت ہوسکتا ہے جب اس بیع کو حقیقتاً بیع وزناً مانا جاتا لیکن جب یہ حقیقتاً بیع وزناً ہے ہی نہیں، جیسا کہ ماقبل میں وضاحت ہوچکی تو کوئی اشکال وارد ہی نہیں ہوتا، نہ مذکورہ اِشکال اور نہ آئندہ آنے والے اشکالات، لیکن اگر اس کو بیع وزناً مان لیا جائے **ولو عرفًا ومجازًا** تو بھی اس کا جواب ماقبل کلام میں وضاحت سے ہوچکا کہ دونوں الگ الگ باتیں ہیں، جن کا مطلب بھی الگ الگ ہے۔ "**لیس بموزون**" کا مطلب یہ ہے کہ اس پر موزون اشیاء کے اَحکامِ فقہیہ جاری نہیں ہوں گے، مثلاً استقراض کا جائز ہونا، ربا الفضل کا اس میں جاری ہونا وغیرہ وغیرہ، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی بیع وزناً بھی جائز نہ ہو، بلکہ حدیث: **اذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شئتم** کا عموم اس بیع کے جواز کا مؤید ہے، اس حدیث کو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح کی کتاب المساقاۃ میں اور ابوداؤدؒ نے کتاب البیوع میں نقل کیا ہے۔ نیز کسی شیٔ کی بیع وزناً کے جواز کے لئے اس کا موزون ہونا ضروری اور شرط نہیں ہے، بہت سی اشیاء موزون نہیں لیکن وزن کر کے ان کو خریدا اور فروخت کیا جاتا ہے۔ آج کل کی بیوع میں اس کی واضح مثال یہ ہے کہ کپڑا بالاتفاق مذروع ہے یعنی ناپ کی جانے والی چیز ہے، لیکن بڑے شہروں کے بعض بازاروں میں کپڑے کو وزن کر کے "لاٹوں" کے حساب سے بیچا جاتا ہے۔ تو اگر کپڑا متعین ہو اور نرخ بھی طے ہو، تو اس طرح بیچنا بلاشبہ جائز ہے وغیرہ وغیرہ، اس قسم کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

۲- دُوسرا اِشکال بعض لوگوں کو یہ ہوسکتا ہے کہ جانور کے وزن کی پوری پوری مقدار معلوم کرنا دُشوار ہے "**لأنه یخفف نفسه مرة ویثقلهٔ أخریٰ**" یعنی اس لئے کہ وہ کبھی اپنے آپ کو ہلکا کرلیتا ہے اور کبھی بوجھل، اور یہ وجہ کتبِ فقہ میں بھی موجود ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو یہ بات یقینی نہیں کہ جانور اپنے آپ کو ہلکا اور بوجھل کرلیتا ہے بلکہ یہ صرف احتمال ہے۔ اور عبارتِ مذکورہ کو کتبِ فقہ میں بابِ ربا میں ذکر کیا گیا ہے اور بابِ ربا میں تفاضل کا احتمال بھی ممنوع ہے جیسا کہ شامی میں ہے: "**فانه لا یصح لاحتمال الربا واحتماله مانع کحقیقته**" (شامی ج:۴ ص:۵۳۱)۔ لہٰذا اگر جانور کو گوشت ہی کے بدلے میں خریدا جائے تو اس وقت تو بعض صورتوں میں منع کیا جاسکتا ہے کہ اس میں احتمالِ ربا ہے لیکن جب روپے کے بدلے خریدا جائے تو صرف اس احتمال کی بناء پر ممنوع نہ ہوگا۔

ثانیاً کہ اگر جانور کی اس حرکت کو "کہ وہ اپنے آپ کو کبھی ہلکا اور کبھی بوجھل کرلیتا ہے" تسلیم کرلیا جائے تو بھی یہ اس وقت عدمِ جواز کی دلیل نہیں بنتی جبکہ بیع روپوں کے عوض ہو رہی ہو، اس لئے کہ جانور کے اس عمل سے اگر وزن میں فرق پڑے تو وہ بہت قلیل ہوگا، اور اس کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وزن میں جہالتِ یسیرہ لازم آئے گی، اور عام بیوع میں جہالتِ یسیرہ کو برداشت کیا گیا ہے۔ اور جہالتِ یسیرہ کی وجہ سے عدمِ جواز کا قول کسی نے اختیار نہیں کیا، فتاویٰ شامی میں ہے: "**وقیدنا بالفاحشة لما قالوہ، لو باعهٔ جمیع ما فی هذہ القریة أو هذہ الدار والمشتری لا یعلم ما فیها لا یصح لفحش الجهالة، أما لو باعهٔ جمیع ما فی هذا البیت أو الصندوق أو الجوالق فانه یصح لأن الجهالة یسیرة**" (شامی ج:۴ ص:۵۲۹)۔ نیز ہمارے مسئلے میں جہالت کو بائع اور مشتری دونوں قبول کرنے پر راضی ہیں اور نزاع کا احتمال نہیں، اس لئے کہ بوقتِ بیع جانور نے حالتِ خفت اختیار کی ہوئی ہے یا حالتِ ثقل؟ اس کا بائع اور مشتری دونوں کو علم نہیں۔ حالانکہ حالتِ خفت میں بائع کا نقصان ہے کہ کم وزن کے پیسے ملیں گے ....

(باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اور حالتِ ثقل میں مشتری کا نقصان ہے کہ زائد پیسے ادا کرنے پڑیں گے، لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ اس نقصان کو برداشت کرنے پر راضی ہیں کیونکہ بیع بالتراضی ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہ جہالتِ یسیرہ اس بیع کے عدمِ جواز کی وجہ کسی طرح بھی نہیں بن سکتی نہ عرفاً نہ شرعاً۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ جب بیع روپوں کے عوض ہو رہی ہو تو یہ اشکال وارد ہوتا ہے۔ اس صورت میں اشکال اس لئے نہ ہونا چاہئے کہ بیع کے وقت کا وزن معتبر ہے، خواہ جانور حالتِ خفت میں ہو یا حالتِ ثقل میں ہو، کیونکہ حالتِ خفت میں یہ نہ کہا جائے گا کہ جانور میں سے کوئی چیز نکالی گئی ہے یا جدا کر لی گئی ہے جس کی وجہ سے وزن کم ہو گیا ہے، جیسا کہ حالتِ ثقل میں یہ نہ کہا جائے گا کہ اس میں باہر سے کوئی اور چیز شامل کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے وزن بڑھ گیا ہے، بلکہ ہر کوئی یہی کہے گا کہ خواہ حالتِ ثقل ہے یا حالتِ خفت اس وقت جانور کا یہی وزن ہے، اور یہ اسی جانور کا وزن ہے کسی خارجی چیز کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ لہٰذا بوقتِ بیع جانور کا جو وزن ہوگا وہی معتبر ہوگا، اسی وزن کے ساتھ بیع ہوگی جو کہ صحیح ہوگی۔

۳- تیسرا اشکال بعض لوگوں کو یہ ہو سکتا ہے کہ **"لا یجوز بیع صبرۃ طعام کل قفیز بدرھم"** کی طرح یہ بیع بھی ناجائز ہونی چاہئے کیونکہ جس طرح وہاں یہ علت پائی جاتی ہے کہ مبیع اور ثمن مجہول ہیں، پتہ نہیں کہ کتنے کلو اس ڈھیر میں ہوں گے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ کل درہم کتنے ادا کرنے پڑیں گے وغیرہ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بیع الحیوان وزناً کی صورتِ جواز بیان کرتے ہوئے یہ قید اسی لئے لگائی گئی ہے کہ "جانور کو مشتری کے سامنے وزن کر کے کل وزن بھی بتا دیا جائے" تاکہ جہالتِ مبیع اور جہالتِ ثمن دونوں رفع ہو جائیں۔ اس صورت میں یہ بیع جائز ہو جائے گی جیسا کہ اس صبرۂ طعام کی بیع کو جہاں ناجائز کہا ہے وہاں ساتھ ہی اس صورت کو جائز کہا ہے کہ جبکہ اس صبرۂ طعام کو اسی مجلس میں ناپ لیا جائے یا اس کی کل مقدار بتا دی جائے۔ لہٰذا فرمایا: **"وصح فی الکل ان کیلت فی المجلس لزوال المفسد قبل تقررہ أو سمی جملۃ قفزانھا"** (الدر المختار ج:۴ ص:۵۳۹)۔ اور اسی بحث کے تحت علامہ شامیؒ نے فرمایا ہے کہ: **"وأراد اصبرۃ مشارًا الیھا کما سیأتی، ولیست قیدًا بل کل مکیل أو موزون أو معدود من جنس واحد"** (فتاویٰ شامی ج:۴ ص:۵۳۹)۔ یعنی یہ صرف صبرۂ طعام کا حکم نہیں بلکہ ہر کیلی، وزنی اور عددی چیز جس کو وزن کر کے بیچا جائے اس کا بھی یہی حکم ہے کہ جب کل معلوم ہو جائے تو بیع صحیح ہو جائے گی۔

مذکورہ بالا عدمِ جواز کی ممکنہ وجوہات کہ جن کا جواب ہو چکا، ان کے علاوہ کوئی اور وجہ عدمِ جواز کی ہمیں ملی نہیں۔ **فاغتنم تحقیق ھذا المقام بما یرفع الظنون والأوھام ویندفع بہ التناقض واللوم عن عبارات القوم۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم بالصواب وعلمہ أتم۔**

العبد الضعیف
الیاس زمان رکن پوری
دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

الجواب صحیح
احقر محمود اشرف غفر اللہ لہ
۱۴۲۲/۱/۱۷ھ

الجواب صحیح
عبداللہ عفی عنہ
۱۴۲۲/۱/۲۳ھ

الجواب صحیح
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۲۲/۱/۲۱ھ

الجواب صحیح
محمد عبدالمنان عفی عنہ
۱۴۲۲/۱/۲۲ھ

الجواب صحیح
بندہ عبدالرؤف سکھروی
۱۴۲۲/۱/۲۲ھ

❊❊❊

﴿فصل فی الغرر والعیب﴾

(بیع میں دھوکا اور عیب کا بیان)

اصلی کمپنی کے خالی ڈبوں میں دُوسری قسم کا تیل ڈال کر فروخت کرنے کا حکم

سوال:- میں موبل آئل کا کام کرتا ہوں، وہ تیل گیلن والے ڈبوں میں بند ہوتا ہے، مختلف کمپنیوں کا ہوتا ہے، لیکن اکثر لوگ اصل کمپنی کے خالی ڈبوں میں اسی قسم کا تیل ڈال کر اپنی طرف سے کمپنی کا سیل لگا کر کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور پچھتر فیصد یہی تیل بکتا ہے، اور لوگ اصل سمجھ کر خریدتے ہیں، اگر انہیں اصل کمپنی کا تیل زیادہ نرخ پر دیا جائے تو نہیں خریدتے اور اصل تیل ملتا بھی نہیں، اور اگر کبھی ملتا ہے تو بہت مہنگا ملتا ہے، اصل تیل کی اتنی کمی ہے کہ میں دو بار تیل خریدنے گیا کرایہ میں ساٹھ روپے خرچ ہوگئے اور تیل نہیں ملا۔ جس کی وجہ سے کمپنی کے ڈبوں میں دُوسرا تیل جو بھرا ہوا ہوتا ہے اس کو یہ بتا کر فروخت کرتا ہوں کہ اصل تیل کمپنی کے ڈیلروں سے نہیں ملتا، ہم دُکان داروں سے لے کر آتے ہیں جیسا وہ لوگ دیتے ہیں ویسا ہی ہم آپ کو دیتے ہیں۔ آیا اس طریقے سے تیل بیچنا حرام ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر آپ گاہکوں کو اصل حقیقت بتا دیتے ہیں تو اس تیل کی فروخت آپ کے لئے جائز ہے،[1] اور زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ اصلی تیل بھی اپنے پاس رکھیں اور یہ دُوسرا تیل بھی، اور گاہکوں کو دونوں دِکھا کر دونوں کی قیمتیں بتا کر اور دونوں کا فرق واضح کر کے بیچا کریں۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۲/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۹/۲۸ ج)

(۱ و ۲) وفی صحیح البخاری ج:۱ ص:۲۷۹ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: البیعان بالخیار ما لم یتفرّقا أو قال: حتّی یتفرقا، فان صدقا وبیّنا بورک لھما فی بیعھما، وان کذبا وکتما محقت برکۃ بیعھما. وفیھا أیضًا قبلہ: بیع المسلم المسلم لا داء ولا خبثۃ ولا غائلۃ ..... وقال عقبۃ بن عامر لا یحلّ لامرئ ان یبیع سلعۃ یعلم أنّ بھا داءً الّا أخبرہ .... الخ.

(باقی اگلے صفحے پر)

کسی اور سے مال بنواکر اپنے نام کا مونوگرام لگانے کا حکم

سوال:- حکومتِ سندھ کا قانون ہے کہ جو کانٹے اور بٹے تولنے والے بنائے، وہ اپنا مونوگرام یعنی نام ڈالے، بعض مجبوریوں کی وجہ سے میں اپنا مال نہیں بنا سکتا اور پنجاب کے دُوسرے کارخانوں سے مال بنواتا ہوں اور اُن پر اپنے نام کا مونوگرام ڈلواتا ہوں یا ڈال دیتا ہوں، اگر حکومتِ پنجاب کا مونوگرام ڈلوادوں تو حکومتِ سندھ پاس نہیں کرتی، میرا لائسنس حکومتِ سندھ کا ہے، اُس کی سالانہ فیس بھرتا ہوں، مونوگرام کچھ اس طرح ہوتا مثلاً پنجاب کے بنانے والے کا نام عبدالشکور ہے تو وہ اُردو یا انگریزی میں اپنے نام کا مخفف ڈالے گا، اسی طرح میں محمد غیاث ہوں تو یہ مونوگرام ڈلواؤں گا ''جی ایچ'' اس سے گاہک کو دھوکا مقصود نہیں بلکہ حکومتِ سندھ کی خانہ پُری کرنا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب:- اگر یہ مال سندھ کے مروّجہ اوزان اور پیانوں کے مطابق ہے اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہے اور آپ پنجاب کے کارخانے سے آرڈر دے کر بنواتے ہیں، سارا مال آپ کی ملکیت ہوتا ہے تو آپ اُس پر اپنے نام کا مونوگرام ڈلواسکتے ہیں۔ لیکن اگر پنجاب کے مروّجہ اوزان اور پیمانے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ...... وفی مشکوٰۃ المصابیح ص: ۲۴۹ (طبع قدیمی کتب خانہ) من باع عیبًا لم ینبه لم یزل فی مقت الله أولم تزل الملئکة تلعنه. رواه ابن ماجة.

وفی تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۳۷۷ عن حکیم بن حزام رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: البیعان بالخیار ما لم یتفرّقا فان صدقا وبینا بورک لهما فی بیعهما وان کذبا وکتما محق برکة بیعهما. رواه مسلم. قوله فان صدقا وبینا أی صدق البائع فی اخبار المشتری صفة المبیع وبین العیب ان کان فی السعة اهـ.

وفی البحر الرائق: کتمان عیب السلعة حرام. (ج:۶ ص:۳۵).

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۴۷ (طبع سعید) لا یحل کتمان العیب فی مبیع أو ثمن لأن الغش حرام اهـ.

وفی الشامیة: ذکر فی البحر أوّل الباب بعد ذٰلک عن البزازیة عن الفتاوی: اذا باع سلعة معیبة علیه البیان. (ج:۵ ص:۴۷).

وفی الهندیة ج:۳ ص:۲۱۰ رجل أراد ان یبیع السلعة المعیبة وهو یعلم یجب أن یبیّنها فلو لم یبین قال بعض مشائخنا یصیر فاسقًا مردود الشهادة وقال الصدر الشهید: لا تأخذ به کذا فی الخلاصة.

وفی الفتاوی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج:۴ ص:۵۲۱ (طبع رشیدیه کوئٹه) وفی الفتاویٰ: اذا باع سلعة معیبة علیه البیان .... الخ.

وکذا فی امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۴۳. وامداد الأحکام ج:۳ ص:۴۰۳. وکفایت المفتی باب نمبر:۷ ج:۸ ص:۲۰ نیز دیکھئے اگلا فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔ (محمد زبیر)

سندھ سے مختلف ہیں تو یہ دھوکا اور ناجائز ہے،[1] خلاصہ یہ کہ جھوٹ اور دھوکے سے بچتے ہوئے اگر آپ پنجاب میں مال بنواکر اپنا مونوگرام ڈلوالیں تو اس میں کچھ حرج نہیں۔[2]　　واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰۴/ ۲۸ ج)

پاکستان کی بنی ہوئی چیز پر امریکا یا اِٹلی کا نام لکھ کر فروخت کرنے کا حکم

سوال:- حال ہی میں یہاں پر میں نے اپنی آمدنی کو بڑھانے کی غرض سے کچھ تجارت کا سوچا، پاکستان کی بنی ہوئی چند مصنوعات یہاں درآمد کی جاتی ہیں۔ ہم نے پاکستان سے تولیہ اور جوتوں کے Samples منگوائے، کوالٹی کے اعتبار سے دونوں بہت اچھے ہیں، لیکن جس دُکان دار کے پاس بھی گئے اس نے ایک ہی کہی کہ جب تک تولیہ پر "Made In USA" اور جوتوں پر "Made In Italy" نہ لکھا ہوا ہوگا، ہم انہیں لینے کے لئے تیار نہیں، کیونکہ یہاں کے عوام USA اور Italy کے لیبل کے بغیر خریدتے نہیں۔ یہاں پر مارکیٹ میں جتنا تولیہ بکتا ہے اس میں سے بیشتر پاکستان کا بنا ہوا ہے، لیکن اس پر سب لوگ Made in USA لکھوا کر لاتے ہیں، جس کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم بھی ان حالات میں ایسا کر سکتے ہیں؟ ہمارا پروگرام پاکستان سے منگوا کر دُکان داروں کو ہول سیل بیچنے کا ہے، ان دُکان داروں کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تولیہ پاکستان کا بنا ہے لیکن USA لکھا ہوا ہے۔ اگر ہم ان کو بیچتے وقت بتادیں کہ اصل بات یہ ہے تو

(۱ و ۲) وفی جامع الترمذی باب ما جاء فی کراھیة الغش فی البیوع ج:۱ ص:۲۴۵ (طبع سعید) عن أبی ھریرة رضی اللہ عنہ أنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ..... ثم قال: من غش فلیس منّا. وقال الترمذی: حدیث أبی ھریرة حدیث حسن صحیح والعمل علیٰ ھٰذا عند أھل العلم کرھوا الغش وقالوا: الغش حرام.

وکذا فی المشکوٰة ج:۱ ص:۲۴۸ من غشّ فلیس منا.

وفی جمع الفوائد ج:۱ ص:۳۲۸ المسلم أخ المسلم، لا یحل لمسلم باع من أخیه بیعًا فیه عیب الّا بیّنه له.

وفی اعلاء السنن ج:۱۴ ص:۵۴ من علم بسلعة عیبا لم یجز بیعھا حتی یبیّنه للمشتری فان لم یبیّنه فھو آثم عاص نصّ علیه أحمد لما روی حکیم بن حزام رضی اللہ عنه عن النبی صلی اللہ علیه وسلم أنّه قال: البیعان بالخیار ما لم یتفرقا، فان صدقا وبیّنا بورک لھما وان کذبا وکتما محق برکة بیعھما اھ.

وفی البحر الرائق ج:۶ ص:۳۵ (تنبیه) کتمان عیب السلعة حرام.

وفی البزازیة وفی الفتاوی اذا باع سلعة معیبة علیه البیان.

وفی الھندیة ج:۳ ص:۲۱۵ ولا بأس ببیع المغشوش اذا کان الغش ظاھرًا کالحنطة بالتراب وان طحنه لم یجز حتّی یبیّنه.

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۴۷ لا یحل کتمان العیب فی مبیع أو ثمن لأن الغش حرامٌ.

نیز: دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اُس کا حاشیہ۔ (محمد زبیر)

کیا شرعی اعتبار سے اس کی اجازت ہے؟ ڈاکٹر ظہور احمد بمعرفت مولانا خلیل احمد ابوظبی (امارات)

جواب:- پاکستان کی بنی ہوئی مصنوعات پر ایسا جملہ لکھنا جس سے اس کے امریکا یا اٹلی میں بننے کا دعویٰ کیا گیا ہو، صریح غلط بیانی ہے، جس کی شرعاً بالکل اجازت نہیں،(۱) ہاں! اگر کسی اور نے یہ جملہ لکھ دیا اور پھر آپ کو بیچنا پڑا تو لکھنے کا گناہ لکھنے والے کے سر ہوگا، آپ یہ کہہ کر عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ اگرچہ اس پر لکھا ہوا کچھ اور ہے لیکن یہ پاکستان کا بنا ہوا ہے۔(۲) رہا یہ عذر کہ لوگ ان مصنوعات کو اس کے بغیر خریدتے نہیں ہیں، تو اس کی وجہ سے غلط بیانی جائز نہیں ہو سکتی۔ واللہ اعلم

(۱و۲) حوالہ اور تفصیلی عبارات کے لئے سابقہ دونوں فتاویٰ اور اُن کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

﴿فصل فی أنواع البیوع المختلفة﴾

(بیع کی مختلف اقسام بیعِ وفاء، سلم، استصناع اور بیعِ اِستجرار کا بیان)

بیع بالوفاء کا حکم (فارسی فتویٰ)

(حاشیہ میں اس فارسی سوال و جواب کا اُردو ترجمہ کردیا گیا ہے)

سوال:- زید از حکومت ایک ہزار روپیہ قرض گرفت وقتیکہ حکومت طلب کرد چونکہ نزد زید روپیہ نہ بود البتہ نو ایکڑ زمین نزد حکومت رہن بود حکومت گفت کہ اگر قرضہ ادا نمی کنید زمین تو نیلام کنم ازیں ضرورت زید زمین خود را بہ عمرو فروخت کرد بعوض ۱۲۵۸ بایں شرط کہ اگر ایں رقم را وقتیکہ ادا کنم زمین من واپس کنید عمرو قبول کرد و نام عمرو بہ نیلام نوشت و روپیہ ۱۲۵۰ بحوالہ حکومت کرد و عمرو بر زمین قابض شد الحال زید بہ عمرو می گوید اکنون پیسہ شما را می دھم زمین بمن واپس کنید عمرو انکار کند و عمرو زمین را وقف کرد است سوال ایں است کہ زمین رہن را فروختن جائز است یا نہ؟ بر تقدیر جواز زید را از عمرو پیسہ واپس گرفتن جائز است یا نہ؟ واگر بیع اول جائز نیست پس زید کہ زمین خود را از حکومت وقتے نیلام بہ طور وکالت بنام عمرو گرفت و نام عمرو در نیلام نوشت درحق عمرو نافذ می شود یا نہ؟ عمرو را زمین زمین متنازع فیہا را وقف کردن جائز است یا نہ؟

جواب:- درصورتِ مسئولہ عقدے کہ میان زید وعمرو واقع شد بیع بالوفا است و اورا دراصل مذہب بیع فاسد است بیشتر فقہاء کرام بروا احکام رہن جاری کنند[1] و بیع را فاسد می گویند و نزد بعض فقہاء بیع صحیح است،[2] و مشتری راحق بود کہ از و نفع گیرد لکن اوراحق نمی بود کہ کسے را بیع کند در ردّ المحتار اقوال کثیر نقل کردہ قول جامع بایں طور ذکر میکند کہ قوله (وقيل بيع يفيد الانتفاع به) هذا محتمل لأحد القولين: الأوّل: أنّه بيع صحيح مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به الّا أنّه لا يملك بيعه قال الزيلعي فى الاكراه وعليه الفتوىٰ. الثاني: القول الجامع لبعض المحققين أنّه فاسد فى حق

---

(۱) وفى تنوير الأبصار ج:۵ ص:۲۷۶ قيل هو رهن. وفى الشامية تحت قوله (وصورته ...) هو أن يقول البائع للمشترى بعتُ منک علىٰ أن تبيعه منّى متىٰ جئتُ بالثمن فهٰذا البيع باطل وهو رهن وحكمه حكم الرهن وهو الصحيح.

(۲) وفى الدّر المختار (بحواله مذكوره) وقيل بيع يفيد به الانتفاع. تفصیلی عبارت آگے اسی فتویٰ میں آرہی ہے۔

بعض الأحكام حتّٰی ملك كل منهما الفسخ، صحيح في حق بعض الأحكام كحل الانزال ومنافع البيع، ورهن في حق البعض حتّٰی لم يملك المشترى بيعه من آخر ولا رهنه، وسقط الدّين بهلاكه فهو مركب من العقود الثلاثة كالزّرافة فيها صفة البعير والبقر والنّمر جوّز لحاجة الناس اليه بشرط سلامة البدلين لصاحبها، قال في البحر وينبغي أن لا يعدل في الافتاء عن القول الجامع. وفي النهر والعمل في ديارنا علىٰ ما رجحه الزيلعي. (ردّ المحتار، باب الصرف ج:۴ ص:۲۴۴)۔[1] ازیں معلوم شد کہ در بیع وفا مشتری را حق بیع ورہن ووقف وغیرہ نزد کسے حاصل نیست اختلاف فقط دریں صورت است کہ آیا اوراحق انتفاع حاصل است یا نہ کسانیکہ وایں عقد را رہن گویند انتفاع مشتری را جائز قرار نمی دہند،[2] وکسانیکہ ایں عقد را بیع گویند انتفاعش را نیز جائز گویند اما بیع ووقف وغیر نزد کسے جائز نیست،[3] پس دریں صورتِ مسئولہ وقفے کہ عمرو کردہ است، درست نہ شد، واکنون برو لازم است کہ رقم از زید وصول کردہ زمین بدو واپس کند ودر حکم ہیچ اختلاف نیست زیرا کہ اگر ایں عقد موافق قول بعضے فقہاء رہن است پس وقت ادائیگی رقم بر عمرو لازم بود زمین واپس دہد، واگر ایں بر قول بعض فقہاء بیع است، ایں انرا واپس گردانیدن نزد ایشاں ہم ضروری است۔

واللہ اعلم

الجواب صواب
محمد عاشق الٰہی بلند شہری

محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۸/ ۱۸ الف)

---

(۱) شامي ج:۵ ص:۲۷۶ (طبع سعيد) وكذا في البحر الرائق ج:۶ ص:۸ (طبع سعيد) وتبيين الحقائق ج:۵ ص:۱۸۳.

(۲) کیونکہ شئ مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

كما في البحر الرائق ج:۸ ص:۲۳۸ (طبع سعيد) ولا ينتفع المرتهن استخدامًا وسكنىٰ ولبسًا واجارةً واعارة لأن الرهن يقتضي الحبس الىٰ ان يستوفي دينه دون الانتفاع.

وفي ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر ج:۴ ص:۲۷۳ (طبع مكتبه غفاريه كوئته) وليس للمرتهن الانتفاع بالرّهن ولا اجارته ولا اعارته.

وفي ردّ المحتار ج:۶ ص:۴۸۲ (طبع سعيد) لا يحلّ له أن ينتفع بشئ منه بوجهٍ من الوجوه وان أذن له الرّاهن لأنّه اذن له في الرّبا .... الخ.

(۳) فتویٰ میں موجود حوالہ ملاحظہ ہو۔

(مذکورہ فارسی سوال و جواب کا اُردو ترجمہ)

”بیع بالوفا“ کا حکم

سوال:- زید نے حکومت سے ایک ہزار روپے بطور قرض لئے، اور (وقتِ مقرّرہ پر) حکومت نے اپنے قرض کا مطالبہ کیا، لیکن زید کے پاس پیسے نہیں تھے، ہاں البتہ اس کی نو ایکڑ زمین .... (باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)............ حکومت کے پاس بطورِ رہن موجود تھی اس لئے حکومت نے کہا کہ اگر پیسے ادا نہیں کروگے تو تمہاری اس زمین کو نیلام کردیں گے۔ لہٰذا مجبور ہوکر زید نے اپنی وہ زمین عمرو کو ۱۲۵۰ روپے کے عوض بیچ دی، لیکن شرط یہ رکھی کہ جب بھی میں آپ کو یہ رقم ادا کروں گا تو اپنی زمین واپس لے لوں گا، اور عمرو نے یہ شرط قبول کرلی، لہٰذا زید نے عمرو کا نام نیلام میں لکھوا کر ۱۲۵۰ روپے حکومت کے حوالے کردیئے اور عمرو زمین پر قابض ہوگیا۔ اب (پیسوں پر) قادر ہونے کے بعد زید، عمرو سے کہتا ہے کہ میں آپ کو آپ کے پیسے دیتا ہوں آپ مجھے میری زمین واپس کردیں، تو عمرو (ادائیگی سے) اِنکار کرتا ہے کیونکہ اس زمین کو وہ وقف کرچکا ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اَرضِ مرہونہ کو بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ برتقدیرِ جواز زید کو عمرو سے (یا عمرو کو زید سے) پیسے واپس لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر بیع اوّل جائز نہیں تو زید نے جو اپنی زمین نیلام کے وقت حکومت سے وکالۃً عمرو کے نام پر لے لی تھی اور عمرو کا نام نیلام میں لکھوادیا تو یہ بیع عمرو کے حق میں نافذ ہوگی یا نہیں؟ اور عمرو کا اَرضِ متنازع فیہا کو وقف کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- مسئلۂ مذکورہ میں زید اور عمرو کے درمیان جو عقد ہوا ہے، یہ بیع بالوفاء ہے، اور اس کے بارے میں اصل مذہب یہ ہے کہ یہ فاسد ہے، اکثر فقہائے کرام اس عقد (مسئلے) میں رہن کا حکم جاری کرتے ہیں، اور بیع کو فاسد قرار دیتے ہیں، جبکہ بعض فقہاء کے نزدیک یہ بیع صحیح ہے اور مشتری کو بھی اس سے نفع اُٹھانا جائز ہے، لیکن یہ حق حاصل نہیں کہ آگے کسی اور کو بیچ دے۔ اور ردّ المحتار میں اس کے متعلق کئی اقوال نقل کئے ہیں، لیکن جو قول جامع ہے اس کو بایں طور ذکر کرتے ہیں: قوله (وقيل بيع يفيد الانتفاع به) هذا محتمل لأحد القولين: الأوّل: أنه بيع صحيح مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به الّا أنّه لا يملك بيعه، قال الزيلعي في الاكراه وعليه الفتوىٰ. الثاني: القول الجامع لبعض المحققين أنّه فاسد في حق بعض الأحكام حتّٰى ملك كل منهما الفسخ، صحيح في حق بعض الأحكام كحل الانزال ومنافع البيع، ورهن في حق البعض حتّٰى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه، وسقط الدّين بهلاكه فهو مركب من العقود الثلاثة كالزّرافة فيها صفة البعير والبقر والنّمر جوّز لحاجة الناس اليه بشرط سلامة البدلين لصاحبها، قال في البحر وينبغي أن لا يعدل في الافتاء عن القول الجامع. وفي النهر والعمل في ديارنا علىٰ ما رجحه الزيلعي. (ردّ المحتار، باب الصرف ج:۴ ص:۳۴۲). (شامی ج:۵ ص:۲۷۶ طبع سعید والبحر الرّائق ج:۶ ص:۸ وتبيين الحقائق ج:۵ ص:۱۸۳) ۔اس ساری بحث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ بیع وفا میں مشتری کو بیع، رہن، وقف وغیرہ میں سے کسی کا بھی اختیار نہیں، اختلاف صرف اِس صورت میں ہے کہ مشتری کو فائدہ اُٹھانے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ لہٰذا جن حضرات نے اِسے عقدِ رہن قرار دیا ہے، ان کے نزدیک تو مشتری کا فائدہ اُٹھانا بھی ناجائز ہے، اور جن حضرات نے اسے عقدِ بیع قرار دیا ہے، ان کے نزدیک مشتری کا انتفاع جائز ہے، لیکن آگے کسی اور کو بیچنا یا وقف وغیرہ کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں، لہٰذا مذکورہ مسئلے میں عمرو کا آگے وقف کرنا ناجائز ہے، اور اُس پر لازم ہے کہ فی الفور زید سے رقم لے کر اُس کی زمین اس کو واپس کردے، اور اس حکم میں کسی کا بھی اختلاف نہیں کیونکہ اس عقد کو اگر ہم رہن قرار دیں اُن فقہاء کے قول کے مطابق جو اس کو رہن کہتے ہیں، تب بھی زید کے رقم کی ادائیگی کے وقت عمرو پر لازم ہے کہ وہ زمین اس کو واپس کرے، اور اگر اس عقد کو ہم بیع قرار دیں ان فقہاء کے قول کے مطابق جو اس کو بیع کہتے ہیں، تو ان کے نزدیک بھی اس کا واپس کرنا واجب ہے۔ واللہ اعلم

''اَحسن الفتاویٰ'' میں بیع الثمار قبل بدوّ الصّلاح کی صورت میں اسے بیع الأزھار مان کر جواز کا قول اختیار کرنے کا حکم

سوال:- بیع الثمار قبل الظہور کے سلسلے میں "تکملة فتح الملهم" ج:۱ ص:۳۸۳ تا ۴۰۰ اور کاپی درسِ ترمذی ج:۴ میں جو تفصیلی اور محققانہ بحث مذکور ہے اس کی رُو سے بیع الثمار قبل الظهور کسی طرح جائز نہیں سواءٌ جرىٰ به التعامل أو لا، اور بعض شرائط نہ پائی جانے کی وجہ سے اس کو بیعِ سلم میں بھی داخل کر کے جائز نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اس کے برعکس اس صورت کو مذہبِ مالک کی رُو سے، احسن الفتاویٰ ج:۶ ص:۴۸۶ تا ۴۹۲ میں بیعِ سلم میں داخل مان کر جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے کیونکہ مذہبِ مالک میں بعض شرائط ضروری نہیں بلکہ اَحسن الفتاویٰ میں تو حنفی مذہب کی رُو سے قبل بدوّ الصلاح یعنی صرف اَزھار کی صورت میں بیع الأزھار مان کر جواز کو اِختیار کیا گیا ہے کہ أزھار بعض جہات سے قابلِ اِنتفاع ہے۔

۱:- اب عرض یہ ہے کہ مالکی مذہب کی رُو سے جو فتویٰ ''اَحسن الفتاویٰ'' میں مذکور ہے آنجناب کی رائے میں وہ صحیح اور موجبہ ہے یا نہیں کہ عمومِ بلویٰ کے وقت مالکی مذہب کی طرف رُجوع کیا جائے۔

۲:- اور بیع الأزھار کی تأویل قبل بدوّ الأثر کے بارے میں آنجناب کی رائے کیا ہے؟

جواب:- احقر نے اس مسئلے میں ''اَحسن الفتاویٰ''[1] کی مراجعت کی، اس میں اِمام مالک رحمہ اللہ کا مسلک اس حد تک مفید ہوسکتا ہے کہ ثمن تین دن کے اندر اندر اَدا کر دیا جائے، یا بلاشرط اس سے زیادہ تاخیر ہو، لیکن جہاں تک مقدارِ ثمر کی جہالت کا تعلق ہے اُس کے ساتھ تو عقدِ سلم کسی کے نزدیک جائز نہیں، اور نصِ صریح: "فليسلم فی كيلٍ معلومٍ أو وزنٍ معلومٍ"[2] میں بھی علم مقدار و اَجل شرط ہے، ''اَحسن الفتاویٰ'' میں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جہالت مفضی الی النزاع نہیں، اس لئے قابلِ تحمل ہے، لیکن مقدارِ مبیع کی جہالت کو تراضیٔ طرفین کی وجہ سے قابلِ تحمل قرار دینا سخت محلِ نظر معلوم

(۱) ج:۶ ص:۴۸۷ تا ۴۹۰ (طبع سعيد).

(۲) فی جامع الترمذی كتاب البيوع ج:۱ ص:۲۴۵ (طبع سعيد) عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة وهم يسلفون فی الثمر فقال: من أسلف فليسلف فی كيلٍ معلومٍ ووزنٍ معلومٍ الىٰ أجلٍ معلومٍ. وفی الدر المختار ج:۵ ص:۲۱۴ (طبع سعيد) وشرطه بيان جنس ونوع وصفة وقدر وأجل وأقله شهر .... الخ، وهكذا فی البحر الرائق ج:۶ ص:۱۶۰

وفی المجلّة ج:۲ ص:۳۹۲ رقم المادّة: ۳۸۶ يشترط لصحة السّلم بيـ ن جنس المبيع مثلًا أنه حنطة ..... وبيان مقدار الثمن والمبيع .... الخ. (وكذا فی عامّة كتب الحديث والفقه).

حکیم الأمت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے خاص اس صورت (بيع قبل الأزهار کو سلم میں شامل کرنے) سے متعلق امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۰۵ میں یہ فتویٰ تحریر فرمایا ہے:-

(باقی اگلے صفحے پر)

ہوتا ہے کیونکہ جن عقود میں غررِ شدید ہو، وہ تراضیٔ طرفین سے بھی جائز نہیں ہوتے، شریعت متعاقدین میں سے ہر ایک کے جائز مفاد کا تحفظ کرتی ہے، خواہ وہ خود اپنے مفاد سے دست بردار ہوگیا ہو۔ لہٰذا ابھی تک احقر کو اس بات پر اطمینان نہیں ہوا کہ یہ امر مقدارِ مبیع کے تعین کی منصوص شرط چھوڑنے کے لئے کافی ہے، اور علامہ شامیؒ نے اس کو سلم قرار نہیں دیا، بلکہ ضرورت کی نظیر کے طور پر سلم کو ذکر فرمایا ہے،[1] البتہ جب أزہار کا ظہور ہوگیا ہو تو أزہار کی بیع (من حیث الأزهار) کی واقعی گنجائش معلوم ہوتی ہے اور اس کا ذکر "تکملة فتح الملهم" میں بھی کیا گیا ہے، اور خود فقہائے حنفیہ صاحبِ ہدایہ وغیرہ نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ رہا شرطِ ترک کا معاملہ تو وہ بھی متعارف ہونے کی بناء پر جائز قرار دینے کی گنجائش موجود ہے، مگر ظہورِ أزهار سے پہلے اس کو سلم قرار دے کر جائز کہنے پر ابھی تک اطمینان نہیں ہوا، ولعلّ الله يحدث بعد ذٰلك أمرًا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۲۰/۲/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳/۳۶۵)

شركة خليجية اور مجموعة سعودى بن لادن کے درمیان مشروع حرمین سے متعلق عقدِ اِستصناع کا مسئلہ

سوال:- نرسل اليك عقدًا تريد شركة خليجية أن تدخل فيه مع شركة سعودى بن لادن لانجاز مشروع الحرمين، بحيث تطلب شركة سعودى بن لادن صناعة هذا المشروع من شركة خليجية على أساس الاستصناع، ثم ان الشركة الخليجية تعقد استصناعا موازيا مع شركة محمد بن لادن، فهل هذا العقد صحيح شرعًا؟

عصام الطوارى

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)..... "خود ضرورتِ عامہ دلیل مستقل نہیں جب تک کسی کلیۂ شرعیہ میں وہ صورت داخل نہ ہو، جیسا عبارات مذکورۂ سوال میں صرف ضرورت کو جواز کے لئے کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ ضرورت کو داعی قرار دیا کسی کلیہ میں داخل کرنے کا مثل الحاق بالسلم وغیرہ کے، اور بیع قبل ظهور الثمار میں یہ الحاق ہو نہیں سکتا، اسی طرح کوئی دوسرا کلیہ بھی نہیں چلتا، فلا يقاس احدهما على الآخر، اور سلم میں اس کا داخل نہ ہونا ظاہر ہے، کیونکہ اگر اشتراط وجود مسلم فيه من وقت العقد الىٰ حلول الأجل سے قطع نظر کر کے شافعیؒ کا مذہب بھی لے لیا جائے کہ ان کے نزدیک صرف وجود وقت الحلول کافی ہے، تب بھی یہ اس لئے سلم نہیں کہ اوّلاً مقدار ثمار کی متعین نہیں، ثانیاً کوئی اجل معین نہیں، ثالثاً اجل پر مشتری بائع سے مطالبہ نہیں کرتا، بلکہ بائع اول ہی سے اشجار کو مشتری کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ اسی وقت سے اس پر قابض ہوجاتا ہے، پھر خواہ ثمر قلیل ہو یا کثیر ہو، اور خواہ نہ ہو، رابعاً اکثر ثمار عددی متقارب یا وزنی متماثل نہیں، خامساً اکثر پورا ثمن پیشگی یک مشت بھی تسلیم نہیں کیا جاتا، غرض یہ سلم کسی طرح نہیں ہوسکتا۔"

(۱) دیکھئے ردّ المحتار على الدّر المختار ج:۴ ص:۵۵۶ (طبع سعید)۔

جواب:- الی الأخ العزیز السیّد عصام الطواری حفظه الله

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته، وبعد:

فقد تسلمت الأوراق المتعلقة بمشروع الحرمین وطالعت فی ضوءها العقود المرسلة من قبل، فوجدت أن هٰذا العقد فی صورته الموجودة غیر مقبول شرعًا، والأسباب الأساسیة لهٰذا الحکم هی کالتّالی:-

۱- المفروض فی صیغة الاستصناع أن یکون هناک عقد استصناع بین شرکة الخلیج وبین مجموعة سعودی بن لادن، فیکون سعودی بن لادن هو المستصنع، وشرکة الخلیج هی الصانعة، ثم اذا شاءت شرکة الخلیجیة فانها تعقد الاستصناع بینها وبین محمد بن لادن بصفة کونہٖ صانعًا، وینبغی أن یکون هٰذا العقد منفصلًا کل الانفصال عن العقد الأوّل، ولٰکن العقد المقترح بین الشرکة الخلیجیة وبین سعودی بن لادن یوضح أنه قد وقع هناک عقد مسبق للمقاولة بین سعودی بن لادن ومحمد بن لادن، وان هٰذا العقد هو المشار الیه فی بند التعریفات وفی عدّة مواضع أخریٰ من العقد بما یدلّ بأن العقد حقیقةً انما وقع بین سعودی بن لادن ومحمد بن لادن، وان دخول الشرکة الخلیجیة فی هٰذا العقد لیس اِلَّا حیلة مصطنعة للتمویل فقط.

۲- ان کانت الشرکة الخلیجیة هی الصانعة الحقیقیة بازاء سعودی بن لادن، فینبغی أن تتحمّل جمیع المسئولیات لتسلیم المشروع بجمیع صفاته المطلوبة الیٰ سعودی بن لادن، ولٰکن فی بند (3.2) فقرة B الیٰ F من عقد الشرکة مع السعودی بن لادن، قد صرحت الشرکة بأنها لا تقبل أیّة مسئولیة تجاه المستصنع فی هٰذا الصدد، ان هٰذا البند یجعل الاستصناع فاسدًا لا یمکن أن یقبل من الناحیة الشرعیة.

۳- ان تسلیم المشروع الیٰ سعودی بن لادن قد جعل العقد متوقفًا علیٰ تسلیم محمد بن لادن، للمشروع الی الشرکة الخلیجیة، وذٰلک بحکم فقرة (4.1) وهٰذا أیضًا غیر جائز شرعًا، لأنّ عقد الشرکة الخلیجیة مع سعودی بن لادن یجب أن یکون منفصلًا تمامًا عن العقد مع محمد بن لادن، کما ذکرت سابقًا.

هٰذه هی النکات الأساسیة المخالف لأحکام الشرع، وهناک بنود فرعیة أیضًا تحتاج الیٰ تعدیل لا یمکن ذکرها بالمکاتبة، ویمکن أن تناقش فی الجلسة.

وانتظرت هاتفكم وحيث لم يتصل فاني أرسل رأيي عن طريق الفاكس.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

محمد تقي عثماني

ماہنامہ ''البلاغ'' کے قارئین کا پیشگی ماہانہ رقم کی ادائیگی کا معاملہ ''بیعِ اِستجرار'' میں شامل ہونے کی وضاحت

سوال:- بندہ ''البلاغ'' کا قاری ہے اور اس سلسلے میں بندے کو آنجناب سے ایک تردّد اور خلجان دُور کرنا مقصود ہے، اور وہ یہ کہ ''البلاغ'' کی جانب سے ذی الحجہ میں اگلے سال کے چندے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ ''البلاغ'' کے قارئین میں وہ حضرات بھی ہیں جو درمیانِ سال رسالے کے خریدار بنے ہیں اور اَب تک ان کی خریداری کی مدّت بھی پوری نہیں ہوئی، تو کیا ایسی صورت میں ماہِ ذی الحجہ میں ان قارئین سے خریداری کی مدّت پوری ہونے سے پہلے اگلے سال کے چندے کا مطالبہ شرعاً دُرست ہے؟ اسی طرح جب کسی قاری کا ''البلاغ'' سے سال بھر کا معاہدہ طے شدہ رقم میں ہوچکا ہے تو درمیانِ سال (مدّتِ خریداری پوری ہونے سے پہلے) کاغذ وغیرہ کی گرانی کی صورت میں ''البلاغ'' کا ان قارئین سے مزید چندے کا مطالبہ دُرست ہے؟ نیز فقہی اعتبار سے یہ معاملہ کہ رقم شروع میں جمع کرادی جائے، پھر ماہانہ رسالہ لیا جائے، کس زُمرے میں شامل ہوگا؟

جواب:- محترمی ومکرّمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گرامی نامہ باعثِ مسرّت ہوا، آپ نے جس دِینی مسئلے کی طرف توجہ دِلائی اس پر آپ کا شکرگزار ہوں۔ ''البلاغ'' میں چندے کے اضافے کا مطالبہ انہی خریداروں سے کیا گیا ہے جن کی مدّتِ خریداری ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ پر ختم ہو رہی ہے۔ اور ہمارے یہاں خریداروں کی بھاری اکثریت وہی ہے۔ جو خریدار دورانِ سال بنتے ہیں، انہیں بھی محرّم سے شمارے بھیج دیئے جاتے ہیں، اس کے باوجود جو حضرات یہ منظور نہ کریں، اور اثنائے سال سے خریداری شروع کریں، ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے، اور ان سے زیادہ پیسے بھیجنے کا مطالبہ بھی نہیں کیا گیا، ان کی خریداری ختم ہونے تک انہیں کسی اضافی رقم کے بغیر رسالہ جاتا رہے گا، اِن شاء اللہ۔

لیکن جہاں تک فقہی مسئلے کا تعلق ہے، اس کی رُو سے کاغذ وغیرہ کی شدید گرانی کی صورت میں خریداروں سے درمیانِ سال بھی مطالبہ کرنے کا شرعاً حق حاصل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ خریداروں کے

ساتھ ''البلاغ'' کا معاملہ فقہی اعتبار سے "بیع استجرار"[۱] کی تعریف میں آتا ہے، شرعاً جب تک کوئی چیز وجود میں نہ آجائے اس کی بیع نہیں ہوسکتی[۲]، لہٰذا پیشگی چندہ ''البلاغ'' کے پاس بطور امانت ہے، (اس امانت میں چونکہ مالک نے استعمال کی اجازت دے دی ہے اس لئے وہ فقہی اعتبار سے قرضِ مضمون بن گیا ہے)۔[۳] جب کوئی رسالہ شائع ہوجاتا ہے اس وقت بحصۂ رسدی بیع ہوتی ہے[۴] یہ امانت

(۱ و ۳ و ۴) وفی مؤطا الامام مالک کتاب البیوع باب جامع بیع الطعام ص: ۵۹۰ (طبع میر محمد کتب خانه) ولا بأس بأن یضع الرّجل عند الرّجل درهمًا ثم یأخذ منه بثلث أو بربع أو بکسر معلوم سلعةً معلومةً .... الخ.
وفی الدّر المختار ج:۴ ص:۵۱۶ (طبع سعید) ما یستجرّه الانسان من البیاع اذا حاسبه علیٰ اثمانها بعد استهلاکها جاز استحسانًا. وفی الشامیة تحت قوله (ما یستجرّه الانسان .... الخ) ذکر فی البحر أن من شرائط المعقود علیه أن یکون موجودًا فلم ینعقد بیع المعدوم ثم قال وممّا تسامحوا فیه وأخرجوه عن هٰذه القاعدة ما فی القنیة الأشیاء الّتی تؤخذ من البیاع علیٰ وجه الخرج کما هو العادة من غیر بیع کالعدس والملح والزّیت ونحوها ثم اشتراها بعد ما انعدمت صحّ فیجوز بیع المعدوم هنا .... وخرجها فی النّهر علیٰ کون المأخوذ من العدس ونحوه بیعًا بالتّعاطی وأنّه لا یحتاج فی مثله الیٰ بیان الثمن لأنّه معلوم اهـ. واعترضه الحموی بأن أثمان هٰذه تختلف فیفضی الی المنازعة قلت ما فی النّهر مبنی علیٰ أنّ الثمن معلوم لکنّه علیٰ هٰذا لا یکون من بیع المعدوم بل کلّما أخذ شیئًا انعقد بیعًا بثمنه المعلوم .... قلت ووجهه أن ثمن الخبز معلوم فاذا انعقد بیعًا بالتعاطی وقت الأخذ مع دفع الثمن قبله فکذا اذا تأخّر دفع الثمن بالأولیٰ وهٰذا ظاهر فیما کان ثمنه معلومًا وقت الأخذ مثل الخبز واللّحم أمّا اذا کان ثمنه مجهولًا فانّه وقت الأخذ لا ینعقد بیعًا بالتعاطی لجهالة الثمن فاذا تصرّف فیه الآخذ وقد دفعه البیاع برضاه بالدّفع وبالتّصرّف فیه علیٰ وجه التّعویض عنه لم ینعقد بیعًا وان کان علی نیة البیع لما علمت من ان البیع لا ینعقد بالنّیة فیکون شبیه القرض المضمون بمثله أو بقیمته فاذا توافقا علیٰ شیء بدل المثل أو القیمة برئت ذمّة الآخذ .... الخ. (شامیة ج:۴ ص:۵۱۶)
وراجع أیضًا الی الشّامیة تحت "مطلب فی بیع الاستجرار" (ج:۴ ص:۵۱۷).
وفی البحر الرّائق کتاب البیع ج:۵ ص:۲۷۴ (طبع رشیدیه کوئٹه) وممّا تسامحوا فیه وأخرجوه عن هٰذه القاعدة ما فی القنیة الأشیاء الّتی تؤخذ من البیاع علیٰ وجه الخرج کما هو العادة من غیر بیع کالعدس والملح والزّیت ونحوها ثم اشتراها بعد ما انعدمت صحّ فیجوز بیع المعدوم هنا.
وفی شرح المجلّة (سلیم رستم باز) رقم المادّة:۱۷۵ ص:۸۰ (طبع مکتبه حنفیه کوئٹه) ویصحّ أیضًا ولو کان الاعطاء من أحد الجانبین فقط وبه یفتیٰ وصورته أن یتفقا علی الثمن ثم یأخذ المشتری المبتاع ویذهب برضا صاحبه من غیر أن یدفع الثمن أو أن یدفع المشتری الثمن للبائع ویذهب بدون قبض المبیع فان البیع لازم علی الصّحیح.
وکذا فی شرح المجلّة للخالد الأتاسی رقم المادّة:۱۷۵ ج:۲ ص:۳۶ (طبع حقانیه پشاور)
وفی بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة البیع بالتعاطی والاستجرار ص:۶۷ والّذی یظهر لی أن هٰذا المبلغ دفعة تحت الحساب وهی وان کانت قرضًا فی الاصطلاح الفقهی من حیث انه یجوز للمدفوع له أن یصرفها فی حوائج نفسه من حیث کونها مضمونة علیه ولکنها قرض یجوز فیه شرط البیع اللّاحق لکونه شرطًا متعارفًا فانّ الدّفعات تحت الحساب لا یقصد بها الاقراض وانّما یقصد بها تفریغ ذمّة المشتری عن أداء الثمن عند البیع اللّاحق وان یتیسر له شراء الحاجات دون أن یتکلّف نقد الثمن فی کل مرّة فهذا قرض تعورف فیه شرط البیع والشرط کلما کان متعارفًا فانه یجوز عند الحنفیة وان کان مخالفًا لمقتضی العقد کما فی شراء النّعل بشرط أن یحذوه البائع.
نیز حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ''فقہ المعاملات'' سے متعلق اپنی ایک اہم غیر مطبوعہ کتاب میں مذکورہ مسئلے سے متعلق تحریر فرمایا:
"....ویتفرّع علیه حکم الاشتراک فی الصحف والمجلّات الدوریة فان العادة فی عصرنا أن الناس یدفعون بدل الاشتراک السنوی فی بدایة کل سنة الیٰ ناشر المجلّة وأنّهم یبعثون الیهم نشرة من المجلّة فی کل شهر أو فی کل أسبوع وهٰذا استجرار بثمن مقدّم ویقع بیع کل عدد من المجلّة عند ما تصل المجلّة الی المشتری فلو انقطعت المجلّة فی أثناء السّنة لزم علیٰ ناشرها أن یردّ ما بقی من بدل الاشتراک." نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۳۲۔ (محمد زبیر)
(۲) وفی مسند أحمد ج:۱۲ ص:۱۳۰ رقم الحدیث:۱۵۲۵۳ عن حکیم بن حزام رضی الله عنه قال: قلت یا رسول الله انی اشتری بیوعًا فما یحلّ لی منها وما یحرم علیّ؟ قال: فاذا اشتریت بیعًا فلا تبعه حتّی تقبضه. وکذا فی سنن البیهقی ج:۵ ص:۳۱۳، وراجع أیضًا الی جامع الترمذی ابواب البیوع ج:۱ ص:۲۳۳ (طبع سعید).
وفی الهدایة ج:۳ ص:۷۸ (طبع مکتبه رحمانیه) ومن اشتری شیئًا مما ینقل ویحول لم یجز له بیعه حتّی یقبضه لأنّه نهی عن بیع ما لم یقبض.
وکذا فی شرح المجلّة ج:۲ ص:۱۷۳ وتکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۳۵۱ وشرح مجلّة الأحکام للعلّامة سلیم باز، رقم المادّة:۲۵۳ ج:۱ ص:۱۲۸.

اس لئے رکھی ہوتی ہے کہ ہر ماہ اس میں سے رقم لے کر رسالہ خریدار کو بھیج دیا جائے۔ اور پچاس روپے میں بارہ رسالے دینا ایک وعدہ ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ اگر کوئی ناگزیر عذر پیش آجائے تو خریدار کو اس عذر سے آگاہ کر کے اس وعدے کو فسخ کیا جاسکتا ہے[1]، ایسی صورت میں اگر خریدار اضافی رقم دینے پر آمادہ ہو تو خیر ورنہ معاملہ فسخ ہوجائے گا، اور اس کی جتنی رقم اپنے پاس باقی ہے وہ واپس کرنی ہوگی۔

والسلام

۳۰/۱/۱۴۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۱/۴۱ الف)

(۱) ''وعدہ'' کی حیثیت اور حکم نیز عذر کی صورت میں استثناء کی گنجائش سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنی زیرِ تحریر غیر مطبوعہ کتاب میں تفسیر، حدیث اور ائمہ اربعہ کی کتب کے حوالے سے تفصیلی بحث فرمانے کے بعد فرمایا:-

فهذه الآيات والأحاديث بمجموعها لا تدع مجالًا للشک في أنّ الوفاء بالوعد واجب واخلافه اثم الّا اذا كان بعذر مقبول .... وبعد اسطر .... فالّذى يتخلص من القرآن والسُّنَة أن الوعد اذا كان جاذمًا يجب الوفاء به ديانةً ويأثم الانسان بالاخلاف فيه الّا اذا كان لعذر مقبول وجاء في مجلّة مُجمّع الفقه الاسلامى قرار رقم: ۲ و ۳ العدد الخامس ۱۵۹۹:۲ الوعد يكون ملزمًا للواعد ديانةً الّا لعذر .... الخ. (محمد زبير)

﴿فصل فی البیع بالتّقسیط﴾
(قسطوں پر خرید وفروخت کا بیان)

نقد کے مقابلے میں اُدھار مہنگے داموں فروخت کرنے کا حکم

سوال:- کچھ بیج ایک آدمی دُوسرے آدمی کو بیچتا ہے لیکن اُس وقت اُس آلو کے بیج کی قیمت ساٹھ روپے فی من تھی، اور یہ آدمی کہتا ہے کہ آپ لے لیں، جب آپ کی فصل تیار ہوگی اُس وقت قیمت سو روپے فی من ہوگی، اب میں سستا نہیں بیچتا، آیا شریعت میں یہ جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ اس کو سود کہتے ہیں، اس پر اکثر یہاں جنگ و جدل ہوجاتا ہے، یعنی اگر اب یہ بیج لیتے ہو تو ساٹھ روپے میں لے لو، ورنہ کچھ دنوں کے بعد سو روپے فی من دو گے۔

جواب:- اگر بیج فروخت کرنے والا یہ کہے کہ ''قیمت نقد ادا کرو تو بیج کی قیمت ساٹھ روپے من ہوگی، اور اُدھار خرید و تو سو روپیہ ہوگی'' اور پھر یہ طے ہوجائے کہ خریدنے والا اُدھار خرید رہا ہے تو یہ بیع جائز ہے،[1] اس میں سود نہیں ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۶/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۶۷۳ ب)

---

(۱) وفی جامع التّرمذی نهیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیعتین فی بیعة، وقال الترمذی: وقد فسّر بعض أهل العلم قالوا: بیعتین فی بیعة أن یقول: أبیعک هذا الثوب بنقدٍ بعشرة وبنسئة بعشرین ولا یفارقه علیٰ أحد البیعین فاذا فارقه علیٰ أحدهما فلا بأس اذا کانت العقدة علیٰ أحد منهما. (الترمذی کتاب البیوع باب ما جاء فی النهی عن بیعتین فی بیعة ج:۱ ص:۲۳۳ طبع سعید).

وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۱۳ ص:۸ و ۹ (طبع غفاریه کوئٹه) واذا عقد العقد علیٰ أنه الیٰ أجل کذا بکذا وبالنقد کذا أو قال الیٰ شهرین بکذا فهو فاسدٌ ..... وهذا اذا افترقا علیٰ هذا فان کان یتراضیان بینهما ولم یتفرّقا حتّی قاطعه علیٰ ثمن معلوم وانّما العقد علیه فهو جائز ..... الخ.

وفی ردّ المحتار ج:۵ ص:۱۴۲ ویزاد فی الثمن لأجله اذا ذکر الأجل بمقابلة زیادة الثمن .... الخ.

وکذا فی فتح القدیر ج:۶ ص:۲۶۲ (طبع مصطفیٰ بابی مصر).

وفی الهدایة ج:۳ ص:۷۸ (طبع مکتبه رحمانیه) لأنّ للأجل شبهًا بالمبیع ألا یریٰ أنّه یزاد فی الثمن لأجل الأجل.

وفیها أیضًا ج:۳ ص:۲۱ (طبع رحمانیه) ویجوز البیع بثمن حال ومؤجّل اذا کان الأجل معلومًا.

وفی البحر الرّائق ج:۶ ص:۱۱۴ لأنّ للأجل الا تریٰ أنّه یزاد فی الثمن لأجل الأجل.

وفی المجلّة رقم المادّة:۲۴۵ البیع مع تأجیل الثمن وتقسیطه صحیح.

وفی بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة ص:۷ أمّا الأئمة الأربعة وجمهور الفقهاء والمحدثین فقد أجازوا البیع المؤجّل بأکثر من سعر النقد بشرط أن یبتّ العاقدان بأنّه بیع مؤجّل بأجل معلوم بثمن متفق علیه عند العقد.

قسطوں کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت اور اُدھار کی وجہ سے قیمت میں اضافے کا حکم

سوال:- (خلاصۂ سوال) ہمارا علاقہ سیم زدہ ہے، موسمِ گرما میں سیم کا پانی تین فٹ زمین کی سطح پر رہتا ہے، سردیوں میں جب پانی خشک ہوجاتا ہے تو اس پر ایسی گھاس ہوتی ہے جو بیلوں کے ذریعے ہل چلانے سے نہیں اُکھڑتی، جس کے لئے ہمیں ٹریکٹر لانا پڑتا ہے، وہ دس روپیہ فی گھنٹہ سے کم ملتا نہیں، اور اس کے حصول کے لئے بینک کی طرف رُجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح بینک کے ذریعے سے پندرہ ہزار کا ٹریکٹر مل جاتا ہے، اس کی اقساط اور نفع ادا کرنے پر اَٹھارہ ہزار روپے ادا کرنے پڑتے ہیں، مذکورہ اقساط سات سال کی مدّت میں ادا کرنی پڑتی ہیں، اب اگر نقدی پر یہ ٹریکٹر خریدا جائے تب بھی اَٹھارہ ہزار روپے میں خریدا جاسکتا ہے، اب نقدی سے تو ہم مجبور ہیں، اب اقساط پر ہم ٹریکٹر حاصل کرسکتے ہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر اور وجہ معاملے کے ناجائز ہونے کی نہ ہو تو ٹریکٹر کو قسطوں پر خریدنا جائز ہے، اور اُدھار کی وجہ سے اصل قیمت پر کچھ اضافہ کردینا فقہاء کی تصریح کے مطابق معاملے کو ناجائز نہیں بناتا،(۱) بشرطیکہ مجلسِ عقد میں قیمت کا نقد یا اُدھار ہونا معین ہوگیا ہو، لہٰذا معاملے کی جو صورت سوال میں ذکر کی گئی ہے وہ جائز ہے،(۲) بشرطیکہ اس معاملے میں کوئی اور شرطِ فاسد نہ لگائی جائے۔

واللہ اعلم بالصواب
۱۳۸۷/۱۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۸۵/ ۱۸ الف)

نقد ایک لاکھ کا پلاٹ چوبیس ماہ کی اَقساط پر سوا لاکھ میں خریدنے کا حکم

سوال:- اگر پلاٹ، مکان، دُکان کی نقد قیمت ایک ہو، اور اَقساط پر اس سے زائد۔ مثلاً ایک پلاٹ نقد ایک لاکھ روپے میں اور ۲۴ ماہ کی اَقساط پر سوا لاکھ روپے میں ملتا ہو تو کیا یہ پلاٹ اَقساط پر خریدنا جائز ہے؟ یا ۲۵ ہزار روپے سود شمار کئے جائیں گے؟

(۱ و ۲) دیکھئے ص:۱۱۵ کا حاشیہ۔

جواب:- یہ اس شرط سے جائز ہے کہ جس وقت مکان وغیرہ کی خریداری عمل میں آئے اس وقت قیمت اور قسطیں کسی ابہام کے بغیر طے ہوجائیں[۱]، اور پھر جو قیمت اس طرح طے ہوئی ہے خریدار سے ہر حال میں اسی کا مطالبہ ہو[۲] ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے اس پر کوئی اضافہ نہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۷۶/۴۰ و)

گورنمنٹ سے قسطوں پر نیلام کی جانے والی زمین خریدنے کا حکم

سوال:- گورنمنٹ جو زمین نیلام کرتی ہے وہ رقم قسطوں میں بمع سود وصول کرتی ہے، یہ خریدنا جائز ہے؟

جواب:- اگر حکومت یہ اعلان کرے کہ زمین اگر نقد روپے سے خریدی جائے تو اس کی قیمت کم ہوگی اور اگر قسطوں پر اُدھار خریدی جائے تو قیمت زیادہ ہوگی، تو یہ صورت جائز ہے[۳]، لیکن اگر قسطوں کی صورت میں یہ کہے کہ قیمت تو وہی نقد کی ہے باقی سود لیا جائے گا، تو یہ صورت جائز نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۵ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۷۷/۱۹ الف)

قسطوں پر گاڑی خریدنے کے بعد اس کی ٹوٹ پھوٹ کا ذمہ دار خریدنے والا ہوگا

سوال:- زید ایک موٹر کار مبلغ پچاس ہزار میں لے کر ٹیکسی میں پاس کرواکر بکر کے ہاتھ مبلغ ستر ہزار روپے میں قسط وار ادائیگی کی شرط پر فروخت کردیتا ہے، اور ماہانہ دو ہزار روپے قسط ادا کرتا ہے۔ جس کے حوالے گاڑی کی ہے وہ تمام ٹوٹ پھوٹ اور دیگر مرمت کا ذمہ دار ہے، پوری قسط ہوجانے کے بعد زید گاڑی کے تمام مالکانہ حقوق بکر کو دے دیتا ہے، قسط کی ادائیگی کے درمیان گاڑی سے جو بھی نفع نقصان ہوگا بکر کا ہوگا، زید کا اُس سے کچھ تعلق نہیں۔ کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- مذکورہ معاملہ اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اس معاملے سے موٹر اس کی ملکیت

(۱ و ۲ و ۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۱۵ کا حاشیہ۔

ہوجائے گی،[1] اور قبضہ کرنے کے بعد اس کی تمام ٹوٹ پھوٹ وغیرہ کا ذمے دار وہ ہوگا، زید کو صرف قیمت یا اُس کی قسطیں وصول کرنے کا حق باقی رہے گا۔ اور قسط پوری ہونے کے بعد مالکانہ حقوق بکر کو دینے کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ اس وقت گاڑی بکر کے نام سرکاری کاغذات میں منتقل کردی جائے گی، اس لئے اس شرط میں کچھ حرج نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۲۰/۲۸ ج)

قسطوں پر خرید وفروخت کا حکم

سوال:- ایک شخص ''الف'' دُوسرے شخص ''ب'' کو مال دِلواتا ہے اور اُس سے وہی مال فوراً بڑھتی میں خرید لیتا ہے اور پیسے کی ادائیگی روزانہ تھوڑی تھوڑی کرتا ہے یا روزانہ ایک مقرّرہ رقم ادا کرتا ہے اور وہ مال خود کسی بڑھتی میں بیچ دیتا ہے اور اس پیسے سے اور کام کرتا ہے جس میں نفع سے دُوسرے فریق کا بالکل تعلق نہیں ہے تو کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟

جواب:- ''مال دِلوانے'' کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ ''ب'' اس کی خریداری میں مدد کرتا ہے، اس صورت میں اگر ''الف'' نے ''ب'' سے جو مال خریدا ہے اس میں قیمت کی ادائیگی کی مدّت اور اگر قسطیں مقرّر کی گئی ہوں تو قسطوں کی مقدار اور میعاد سب طے کرلی ہیں، تو مذکورہ طریقہ جائز ہے،[2] اور اس کے بعد ''الف'' جو مال آگے بیچ کر نفع کمائے گا وہ حلال ہوگا۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۹۵۱/۲۸ ج)

---

(۱) وفی ردّ المحتار کتاب البیوع ج:۴ ص:۵۰۶ (طبع سعید) وحکمہ ثبوت الملک ای فی البدلین لکل منھما فی بدل .... الخ.

وفی الھندیۃ کتاب البیوع الباب الأوّل فی تعریف البیع ورکنہ .... الخ ج:۳ ص:۳ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) وأمّا حکمہ فثبوت الملک فی المبیع للمشتری وفی الثمن للبائع اذا کان البیع باتًا .... الخ.

وفی شرح المجلّۃ ج:۲ ص:۳۷۳ البیع النّافذ یفید الحکم فی الحال ای ثبوت الملک فی البدلین لکل منھما فی بدل وھذا ھو الحکم الأصلی للبیع النّافذ .... الخ. وفی شرح المجلّۃ للأتاسی ج:۲ ص:۳۵۷ رقم المادّۃ: ۳۶۹ حکم البیع المنعقد الملکیۃ یعنی صیرورۃ المشتری مالکًا للمبیع والبائع مالکًا للثمن .... الملکیۃ تثبت بمجرّد العقد اذا استجمع البیع شرائط الانعقاد والصّحۃ واللّزوم النّفاذ .... الخ.

وفی الھدایۃ ج:۳ ص:۸ اذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منھما اِلّا مِن عیب أو عدم رؤیۃ .... الخ.

وکذا فی الھندیۃ ج:۳ ص:۸ (طبع بلوچستان بُک ڈپو).

وفی البحر الرّائق ج:۵ ص:۲۶۲ البیع یلزم بایجاب وقبول ای حکم البیع یلزم بھما.

وفی شرح المجلّۃ للأتاسی ج:۲ ص:۱۶۶ رقم المادۃ:۲۴۵ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ) البیع مع تأجیل الثمن وتقسیطہ صحیح.

نیز قسطوں پر خرید وفروخت کے جواز سے متعلق حوالہ کے لئے ص:۱۱۵ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲و۳) دیکھئے ص:۱۱۵ کا حاشیہ۔

قسطوں پر خرید و فروخت اور اس کی شرائط

سوال:- زید بجلی کا پنکھا خریدنا چاہتا ہے، قسطوں کی صورت میں اس کو زیادہ رقم دینی پڑتی ہے اور اگر پوری رقم ایک دفعہ دی جائے تو کم رقم آتی ہے، کیا ایسی صورت میں قسطوں پر خریدنا جائز ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر اور کوئی وجہ بیع کے فاسد ہونے کی نہ ہو تو اس طرح قسطوں پر پنکھا خریدنا جائز ہے، کیونکہ اُدھار کی صورت میں زیادہ قیمت کا لین دین فقہاء کی تصریح کے مطابق جائز ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۹۶۸/۱۸ الف)

لیکن معاملہ اس طرح نہ کریں کہ قیمت مثلاً سو روپیہ اور سود اس پر پچیس روپے، بلکہ شروع سے اُدھار کی وجہ سے ۱۲۵ قیمت مقرّر کرلیں۔
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(۱) فی الفتاویٰ الشامیة ج:۵ ص:۱۴۲ (طبع سعید) ویزاد فی الثمن لأجله اذا ذکر الأجل بمقابلة زیادة الثمن قصدًا.
وفی الهدایة ج:۳ ص:۷۸ (طبع مکتبه رحمانیه) لأن للأجل شبها بالمبیع ألا یریٰ انه یزاد فی الثمن لأجل الأجل،
کذا فی فتح القدیر ج:۶ ص:۲۶۲ کتاب البیوع. نیز مزید حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص:۱۱۵ کا حاشیہ۔

﴿فصل فی أحکام المال الحرام والمخلوط﴾

(مخلوط اور حرام مال کے اَحکام)

مالِ حرام سے خریدی ہوئی چیز کا بعینہٖ صدقہ ضروری ہے یا اس کے بقدر رقم؟
مالِ حرام سے خریدی ہوئی چیز کی موجودہ مالیت کا صدقہ ضروری ہے یا صرف حرام رقم کا؟
مالِ حرام سے خریدی ہوئی چیز کو حلال کرنے کا طریقہ؟

سوال۱:- حرام رقم سے خریدی ہوئی چیز کا بذاتِ خود تصدق بہتر ہے یا اس کے بقدر قیمت کا تصدق بہتر ہے؟

جواب۱:- اگر بعینہٖ حرام رقم سے خریدی گئی ہے تو بعینہٖ اس کا تصدق بہتر ہے،(۱) اور اگر حرام کو حلال سے مخلوط کر کے خریدی گئی ہے تو اس چیز کا تصدق ضروری نہیں، رقم کا تصدق کافی ہے۔(۲)

سوال۲:- حرام رقم سے خریدی ہوئی چیز کو حلال کرنے کے لئے کیا موجودہ مالیت کے بقدر تصدق لازم ہے یا فقط حرام رقم کے بقدر تصدق لازم ہے؟

جواب۲:- اُوپر کی صورتِ اُولیٰ میں موجودہ مالیت کے بقدر،(۳) ورنہ فقط حرام رقم کے بقدر۔(۴)

(۱ و ۳) وفی ردّ المحتار کتاب البیوع باب المتفرّقات مطلب اذا اکتسب حرامًا ثم اشتری فهو علیٰ خمسة أوجه ج:۵ ص:۲۳۵ (طبع سعید).
(قوله اکتسب حرامًا) توضیح المسئلة ما فی التّتارخانیة حیث قال رجل اکتسب مالًا من حرام ثم اشتریٰ فهٰذا علیٰ خمسة أوجهٍ امّا ان دفع تلک الدّراهم الی البائع أوّلًا ثم اشتریٰ منه بها أو اشتریٰ قبل الدّفع بها ودفعها أو اشتریٰ قبل الدّفع بها ودفع غیرها أو اشتریٰ مطلقًا ودفع تلک الدّراهم أو اشتریٰ بدراهم آخر ودفع تلک الدراهم .... قال الکرخی فی الوجه الأوّل والثانی لا یطیب وفی الثلاث الأخیرة یطیب وقال ابوبکر لا یطیب فی الکل لکن الفتویٰ الآن علیٰ قول الکرخی دفعًا للحرج عن النّاس اهـ.
وفی الهدایة کتاب الغصب ج:۳ ص:۳۷۵ و ۳۷۶ (طبع رحمانیه) امّا فیما لا یتعیّن کالثمنین فقوله فی الکتاب "اشتریٰ بها" اشارة الیٰ أن التّصدّق انّما یجب اذا اشتریٰ بها ونقد منها الثمن أمّا اذا أشار الیها ونقد من غیرها أو نقد منها وأشار الیٰ غیرها أو أطلق اطلاقًا ونقد منها یطیب له وهٰکذا قال الکرخی لأنّ الاشارة اذا کانت لا تفید التعین، لا بدّ أن یتأکد بالنّقد لیتحقق الخبث وقال مشائخنا رحمهم الله تعالیٰ لا یطیب له قبل أن یضمن وکذا بعد الضّمان بکل حال وهو المختار لإطلاق الجواب فی الجامعین والمبسوط.

(حاشیہ نمبر۲ و۴ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

سوال۳:- ایک شخص نے حرام رقم سے کوئی چیز خریدی، پھر وہ چیز کسی دُوسرے کو فروخت کردی، دُوسرے کو خیال آیا کہ یہ چیز تو حرام رقم سے خریدی ہوئی تھی، تو اب اِس کو حلال کس طرح کیا جائے؟ کیا حرام رقم کے بقدر بائع پر تصدق لازم ہے یا مشتری کا تصدق کرنا ہی کافی ہے؟ نیز مشتری کے تصدق کی صورت میں بائع کو بتانا ضروری ہے یا نہیں؟　　محمد عامر اُستاذ جامعۃ الرشید

جواب۳:- اصل حکم یہ ہے کہ چیز لوٹا کر رقم واپس لے لے،[1] اگر مجبوری ہو کہ بائع واپس نہ کرے تو بائع پر تصدق کا سوال ہی نہیں، کسی فقیر کو تصدق کرکے اس سے خرید لے (ثمنِ مثل پر)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

مالِ مخلوط کا نفع حلال ہے یا حرام؟

(''ہدایہ'' اور ''فتح القدیر'' کی عبارات کی وضاحت)

سوال:- بخدمت شیخی واُستاذی مدظلہم۔

چند مسائل میں حضرتِ والا کی رائے معلوم کرنی ہے:-

۱:- وہ مال جو حلال وحرام سے مخلوط ہو اس سے جب کاروبار شروع کیا جائے تو منافع حلال ہے یا نہیں؟ ''فتح القدیر'' کی درج ذیل عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مطلقاً حلال ہے چاہے حلال غالب ہو یا مغلوب۔ قال ابن الهمام رحمه الله تعالىٰ: **والخبث لفساد الملک دون الخبث لعدم الملک فيوجب شبهة الخبث فيما يوجب فيه عدم الملک حقيقة الخبث وهو ما يتعين**

(حاشیہ نمبر۲،۳ متعلقہ صفحہ گزشتہ) (۲ و ۳ و ۱) وفي ردّ المحتار ج:۲ ص:۲۹۲ (طبع سعيد) ان المراد ليس هو نفس الحرام لأنه ملكه بالخلط وانّما الحرام التّصرّف فيه قبل أداءِ بدله ..... نعم لا يباح الانتفاع به قبل أداء البدل في الصحيح من المذهب. وكذا في الطحطاوي على الدّر المختار ج:۴ ص:۱۹۲.

(۱) في الهندية ج:۵ ص:۳۴۹ (طبع مكتبه رشيديه) والسبيل في المعاصي ردّها وذلك ههنا بردّ المأخوذ ان تمكن من ردّه بأن عرف صاحبه .... الخ. وفي ردّ المحتار على الدر المختار ج:۵ ص:۹۹ (طبع سعيد) والحاصل انّه ان علم أرباب الأموال وجب ردّه عليهم والّا فان علم عين الحرام لا يحلّ له ويتصدّق به بنيّة صاحبه .... وبعد أسطر .... ومفاده الحرمة وان لم يعلم أربابه وينبغي تقييده بما اذا كان عين الحرام ليوافق ما نقلناه اذ لو اختلط بحيث لا يتميّز يملكه ملكًا خبيثًا لكن لا يحلّ له التّصرّف فيه مالم يؤدّ بدله .... الخ.

وفي الدّر المختار كتاب الغصب ج:۶ ص:۱۸۲ (طبع سعيد) ويجب ردّ عين المغصوب في مكان غصبه ويبرأ بردّها ولو بغير علم المالك .... أو يجب ردّ مثله ان هلك وهو مثلي.

وفي ردّ المحتار ج:۶ ص:۳۸۵ ويردونها علىٰ أربابها ان عرفوهم والّا تصدّقوا بها لأنّ سبيل الكسب الخبيث التصدّق اذا تعذر الرّدّ علىٰ صاحبه.

كالجارية في مسئلتنا ويتعدى الىٰ بدلها وشبهة الشبهة فيما يوجب فيه عدم الملك الشبهة وهو مالا يتعين وشبهة الشبهة غير معتبرة. (فتح القدير ج:٦ ص:١٠٤ باب البيع الفاسد، فصل في أحكامه)۔

چند ماہ قبل بندے نے اسی عبارت کے پیشِ نظر منافع کے حلال ہونے کا ایک فتویٰ لکھا تھا، جس پر اُستاذِ محترم مفتی ...... صاحب نے تصدیق بھی کر دی تھی، لیکن اب خیال ہوا کہ حضرتِ والا سے بھی رہنمائی حاصل کرلوں۔

محمد عامر اُستاذ جامعۃ الرشید کراچی

جواب:- مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

''فتح القدیر'' کی مذکورہ عبارت سے علی الاطلاق یہ حکم نکالنا دُرست معلوم نہیں ہوتا کہ ہر مخلوط مال کا رِبح حلال ہے، جس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ مخلوط کا جو حصہ حرام ہے، اگر اس میں حرمت عدمِ ملک کی وجہ سے آئی ہے، مثلاً غصب یا بحکمِ غصب ہے، یا عقدِ باطل کے ذریعے حاصل ہوا ہے، تو خود فتح القدیر کی اس عبارت میں تصریح ہے کہ یہ شبہۃ الخبث پیدا کرے گا جو معتبر ہے، اور غصب کی صورت میں تو محض شبہ نہیں، بلکہ حقیقتِ خبث پیدا کرے گا، کیونکہ غصب میں دراہم و دنانیر باتفاقِ حنفیہ متعین ہوجاتے ہیں۔[1] دُوسرے اگر حرمت فسادِ ملک کی وجہ سے آئی ہے تو بے شک ''فتح القدیر'' اور ''ہدایہ'' کے اس مسئلے کی وجہ سے رِبح حلال ہوگا۔ مگر یہ مسئلہ اُس قول پر مبنی ہے جس کی رُو سے دراہم و دنانیر عقودِ فاسدہ میں بھی متعین نہیں ہوتے، حالانکہ صاحبِ ہدایہ نے اَصح اس کو قرار دیا ہے کہ عقودِ فاسدہ میں دراہم و دنانیر متعین ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اسی مسئلے کے بارے میں صاحبِ عنایہ فرماتے ہیں: ''وهذا انما يستقيم على الرواية الصحيحة، وهي أنّها لا تتعين، لا على الأصح، وهي الّتي تقدمت أنّها تتعين في البيع الفاسد لأنها بمنزلة المغصوب.'' (عناية ج:٦ ص:١٠٤)[2] (اگرچہ علامہ ابنِ ہمامؒ نے اَصح بھی عدمِ تعیین کو قرار دیا ہے، کیونکہ جاریہ والا مسئلہ اَصحابِ مذاہب سے منقول ہے) البتہ عدمِ ملک کی صورت میں رِبح کے حلال یا حرام ہونے میں دخل اس بات کا نہ ہوگا کہ مالِ مخلوط میں غالب

---

(۱) وفي النتف في الفتاوىٰ ص:٤٥٤ ولو غصب دراهم أو دنانير أو غير ذٰلك من الكيلي والوزني فاتجر فيه وربح فانه يتصدّق بالرّبح. وكذا في فتح القدير ج:٨ ص:٢٥٥، والمبسوط للسرخسي ج:١١ ص:٧٧.
وفي بدائع الصنائع ج:٦ ص:١٤٩ اذا غصب الفًا فاشترىٰ جارية فباعها بألفين ثم اشترىٰ بالألفين جارية فباعها بثلاثة آلاف انّه يتصدّق بجميع الرّبح.
وفي الهداية ج:٣ ص:٣٧٣ (طبع رشيديه كوئٹه) ومن غصب عبدًا فاستغلّه فنقصته الغلّة فعليه النّقصان لما بيّنا ويتصدّق بالغلّة لأنّه حصل بسبب خبيث وهو التّصرف في ملك الغير.
وفي الشامية ج:٦ ص:١٨٩ (طبع سعيد) قوله وتصدق أصله ان الغلّة للغاصب عندنا لأنّ المنافع لا تتقوّم إلّا بالعقد والعاقد هو الغاصب فهو الّذي جعل منافع العبد مالًا بعقده فكان هو أوْلىٰ ببدلها ويومر أن يتصدّق بها لاستفادتها ببدل خبيث وهو التّصرّف في مال الغير.
(۲) دیکھئے فتح القدیر، باب البيع الفاسد فصل في أحكامه ج:٦ ص:١٠٤.

حلال ہے یا حرام، بلکہ دونوں صورتوں میں رِبح کا وہ حصہ حرام ہوگا جو حرام کے مقابل ہو، مثلاً ۱/۴ حلال تھا، اور ۳/۴ حرام، تو رِبح کا ۱/۴ حصہ حلال اور باقی حرام۔ اور فسادِ ملک کی صورت میں بھی احتیاط اسی میں ہے، کیونکہ صاحبِ ہدایہ نے اَصح تعیین الدراهم فی العقود الفاسدة[1] کو قرار دیا ہے۔

واللہ اعلم
۱۴۲۴/۳/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۲/۳۰)

مالِ مخلوط کے نفع سے متعلق مذکورہ فتویٰ کی مزید وضاحت اور ایک اِشکال کا جواب

سوال:- بخدمت شیخی وأستاذی حفظکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ نے گزشتہ علمی خط میں حضرتِ والا کی خدمت میں مالِ مخلوط کے منافع کی مطلقاً حلت کا خیال ذِکر کیا تھا اور اِس کے لئے فتح القدیر کی عبارت پیش کی تھی، حضرتِ والا نے جواب تحریر فرمایا کہ ''فتح القدیر کی مذکورہ عبارت سے علی الاطلاق یہ حکم نکالنا دُرست معلوم نہیں ہوتا کہ ہر مخلوط مال کا ربح حلال ہے، جس کی دو وجوہ ہیں، ایک یہ کہ مخلوط کا جو حصہ حرام ہے، اگر اس میں حرمت عدمِ ملک کی وجہ سے آئی ہے ......تو خود فتح القدیر کی اس عبارت میں تصریح ہے کہ یہ شبہۃ الخبث پیدا کرے گا جو معتبر ہے ......اگر حرمت فسادِ ملک کی وجہ سے آئی ہے تو بے شک فتح القدیر اور ہدایہ کے اس مسئلے کی وجہ سے ربح حلال ہوگا ....البتہ عدمِ ملک کی صورت میں ربح کے حلال یا حرام ہونے میں دخل اس بات کا نہ ہوگا کہ مالِ مخلوط میں غالب حلال ہے یا حرام، بلکہ دونوں صورتوں میں ربح کا وہ حصہ حرام ہوگا جو حرام کے مقابل ہو.......اور فسادِ ملک کی صورت میں بھی اِحتیاط اسی میں ہے ......واللہ اعلم۔''

اس بارے میں تردّد یہ ہے کہ حضرتِ والا نے مالِ مخلوط کے دو حصے بنائے ہیں اور ہر ایک حصے کے ربح کا حکم الگ کیا ہے، لیکن بندہ شرح التنویر کی درج ذیل عبارت کے پیشِ نظر یہ سمجھا ہوا ہے کہ مالِ مخلوط مکمل خالط کی ملک میں آجاتا ہے لیکن ملک خبیث ہوتی ہے اور خالط حرام رقم کے بقدر ضامن بن جاتا ہے۔

قال الحصكفي رحمه الله تعالى: أو اختلط المغصوب بملك الغاصب بحيث يمتنع امتيازه كاختلاط بره ببره أو يمكن بحرج كبره بشعيره

---

(۱) وفي الهداية ج:۲ ص:۶۸ (طبع رحمانيه) .... لأنها تتعين في البيع الفاسد وهو الأصح.

ضمنه وملكه بلا حل انتفاع قبل أداء ضمانه. (الدر مع الرد ج:٦ ص:١٩١)

اس عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مالِ مخلوط علی الاطلاق مضمون ہوتا ہے اور اِس میں فسادِ ملک ہوتا ہے، لہٰذا فتح القدیر کی تحقیق کے مطابق علی الاطلاق ربح بھی حلال ہونا چاہئے۔

حضرتِ والا سے مزید رہنمائی کی درخواست ہے۔

جواب:- وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس وقت بہت تدقیق کے ساتھ مراجعت کا تو موقع نہیں ہے، لیکن ہدایہ کے مسئلۂ جاریہ[1] کو غصب میں مالِ مخلوط کے مملوک ہوجانے کے مسئلے[2] سے ملاکر مذکورہ نتیجہ نکالنا بندے کو اَب بھی دُرست معلوم نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ اوّل تو خلط المغصوب بغیر المغصوب کے مسئلے میں ملکیت اِلتزام الضمان (بلکہ نیت اداء الضمان) سے آئے گی، جو شخص ضمان کا اِلتزام ہی نہ کرے اسے مالک کیسے قرار دِیا جاسکتا ہے؟ دُوسرے جو عبارت آپ نے لکھی ہے، خود اسی میں تصریح ہے کہ قبل اداء الضمان اس سے اِنتفاع حلال نہیں۔ اور استرباح اِنتفاع کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ اور مسئلہ اسی صورت میں مفروض ہے جب ضمان ادا نہ کیا ہو، ضمان ادا کردیا ہو تو پھر حلت میں کوئی اِشکال نہیں۔ البتہ آج کل بنک وغیرہ کے ملازمین کو جو ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی اور صورت گزارے کی نہ ہو تو اِلتزامِ ضمان کرکے اور اس کی ادائیگی کی پکی نیت رکھ کر اس رقم کو اِستعمال کرلیں، یا کاروبار میں لگالیں، اس کا مبنیٰ یہ ہے کہ وہ غصب نہیں، بلکہ جانبِ آخر کی رضامندی سے ایک ناجائز عقد کیا گیا ہے جس میں جانبِ آخر کوئی مطالبہ بھی نہیں رکھتا، لہٰذا معاملہ صرف حق اللہ کا رہ جاتا ہے اور توبہ، اِلتزامِ ضمان اور نیتِ اداء کی صورت میں اس کا وجوب علی الفور کے بجائے علی التراخی ہونے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، ضرورت کے وقت اس گنجائش سے فائدہ اُٹھانے اور ساتھ ساتھ اِستغفار کرتے رہنے کا مشورہ دے دیا جاتا ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۲۴/۵/۲۰ھ

مالِ حرام کو حلال کرنے کے لئے غیرمسلم سے قرض والے حیلے کی شرعی حیثیت

سوال:- حرام رقم کو حلال کرنے کا بعض علماء یہ حیلہ بتاتے ہیں کہ کسی غیرمسلم سے قرض لے لے اور حرام رقم سے قرضہ ادا کرے، کیا حضرتِ والا کے نزدیک یہ حیلہ دُرست ہے؟ اگر کسی نے

(۱) دیکھئے هداية ج:٣ ص:٦٨ و ٦٩ (طبع رحمانيه)۔

(۲) دیکھئے الدر المختار مع الرد المحتار ج:٦ ص:١٩١ (طبع سعيد)۔

ایسا کرلیا ہو تو اب کیا کرے؟　　(محمد عامر)

جواب:- اس حیلے سے حرام رقم حلال نہیں ہوتی،[۱] صرف اتنا ہوتا ہے کہ قرض سے جو کھانا خریدے گا وہ حلال ہوجائے گا،[۲] لیکن حرام رقم ملکیت میں لانے، اور حرام رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ملے گا۔[۳]　　واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

---

(۱) جیسا کہ امداد الفتاویٰ میں ہے: ''حرام کو حلال کرنے کے لئے کوئی حیلہ مفید نہیں''، تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۴۴ (طبع دارالعلوم کراچی) ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) وفی الهندية كتاب الكراهية الباب الثانی عشر فی الهدايا والضيافات ج:۵ ص:۳۴۲ (طبع بلوچستان بُک ڈپو) وفی شرح حيل الخصاف لشمس الأئمّة رحمه الله تعالیٰ ان الشيخ أبا القاسم الحكم كان يأخذ جائزة السلطان وكان يستقرض لجميع حوائجه وما يأخذ من الجائزة يقضی بها ديونه والحيلة فی هذه المسائل أن يشتری نسيئة ثم ينقد ثمنه من اىّ مال شاء، وقال أبو يوسف رحمه الله: سألت أبا حنيفةؒ عن الحيلة فی مثل هذا فأجابنی بما ذكرنا.

وفی الدر المختار ج:۶ ص:۳۸۵ وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر لصحّة بيعه بخلاف دين على المسلم لبطلانه الّا اذا وكل ذمّيا ببيعه .... الخ.

وفی خلاصة الفتاویٰ كتاب الكراهية الفصل الرّابع فی المال من الاهداء والميراث وغير ذٰلک ج:۴ ص:۳۴۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) وفی شرح حيل الخصاف لشمس الأئمّة الحلوانی رحمه الله ان الشيخ الامام أبا القاسم الحكيم كان ممن يأخذ جائزة السلطان وكان يستقرض بجميع حوائجه وما يأخذ من الجائزة كان يقضی به دينه فالحيلة فی مثل هذه المسائل ان يشتری شيئًا ثم ينقد ثمنه من اىّ مال أحبّ. قال أبو يوسف رحمه الله: سألت أبا حنيفةؒ عن الحيلة فی مثل هذا، قال: فأجابنی بما ذكرناه .... الخ.

وفی السراجية المغنية اذا قضی دينها من كسبها اجبر الطالب على الأخذ.

وفی الهندية كتاب الحيل الفصل الأوّل ج:۶ ص:۳۹۰ (طبع رشيديه) كل حيلة يحتال بها الرّجل ليتخلّص بها عن حرام أو ليتوصّل بها الیٰ حلال فهی حسنة. نیز دیکھئے: امداد المفتين ص:۸۰۲ و ۸۰۳، ومجموعة الفتاویٰ ج:۲ ص:۲۶۷ (طبع سعيد).

(۳) وفی سنن الترمذی ج:۱ ص:۲۴۹ (طبع مكتبه رحمانيه) ..... انّه لا يربوا لحم بنت من سحت إلّا كانت النار أولیٰ به. وفی صحيح ابن حبان ج:۵ ص:۹ (طبع مؤسسة الرسالة) يا كعب بن عجرة انّه لا يدخل الجنة لحمٌ نبت من سحتٍ.

وفی مسند أحمد بن حنبل رقم الحديث:۵۷۳۲ ج:۵ ص:۲۱۸ و ۲۱۹ (طبع دارالحديث القاهرة) عن ابن عمر رضی الله عنهما أنّ رسول الله صلی الله عليه وسلم قال: من اشتری ثوبًا بعشرة دراهم وفيه درهم حرام لم يقبل الله تعالیٰ له صلوٰة ما دام عليه.

وفی الصحيح للإمام المسلمؒ ج:۱ ص:۳۲۶ (طبع مكتبة الحسن) عن أبی هريرة رضی الله عنه فی حديث: .... ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أغبر يمد يديه الی السماء يا ربّ! يا ربّ! ومطعمه حرام ومشربه حرام وملبسه حرام وغذی بالحرام فأنّی يستجاب لذٰلک. (مسلم).

وفی مسند أحمد رقم الحديث:۳۶۷۲ ج:۳ ص:۵۳۹ (طبع دارالحديث القاهرة) عن عبدالله بن مسعود رضی الله عنه عن رسول الله صلی الله عليه وسلم قال: لا يكسب عبد مالًا من حرام فينفق فيه فيبارک له فيه ولا يتصدق به فيتقبل منه ولا يترک خلف ظهره الّا كان زاده الی النّار. الحديث (رواه أحمد).

ناجائز طریقے سے آئی ہوئی رقم غلطی سے استعمال ہو جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- کاروبار میں کبھی غلطی سے ناجائز اور حرام رقم آجاتی ہے، جو کبھی استعمال ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے بعد میں دِل میں کافی پریشانی پیدا ہو جاتی ہے اور اس پریشانی میں نماز چھوڑ دیتا ہوں، شرعاً کیا حکم ہے؟

طلعت محمود، راولپنڈی

جواب:- اگر کبھی غلطی سے کوئی ناجائز طریقے سے حاصل کی ہوئی رقم استعمال میں آجائے تو توبہ اور اِستغفار کرنا چاہئے، اور تلافی کے لئے اتنی رقم صدقہ کر دینا چاہئے۔[1] لیکن اس کی وجہ سے نماز چھوڑ دینا تو کسی طرح بھی جائز نہیں، اس کے بعد تو اور زیادہ اہتمام سے نماز پڑھنے کی ضرورت ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۵/۴/۲۸ھ[2]

ماں کے لئے مجبوراً بیٹے کی حرام کمائی استعمال کرنے کا حکم

سوال:- اگر کسی کا ایک ہی بیٹا ہو اور وہی اپنی ماں کا کفیل ہو، اور اُس کی آمدنی ناجائز ہو تو ماں کے لئے اُس کی کمائی جائز ہے یا نہیں؟ اور وہ مجبوراً اسی بیٹے کی کمائی کھاتی ہے جبکہ ظاہراً ماں اُس حرام مال کو دیکھ رہی ہے، لیکن کھانے پر مجبور ہے کیونکہ دُوسرا کفیل نہیں، ایسی عورت کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب:- حرام مال تو حرام ہی ہے، ایسی صورت میں ماں کو کوشش کرنی چاہئے کہ اُسے کسی حلال ذریعے سے آمدنی حاصل ہو جائے، نیز بیٹے کو حرام کمائی کے بجائے حلال کمائی پر آمادہ کرنا بھی اس کے ذمے واجب ہے اور جب تک انتظام نہ ہو، توبہ اور اِستغفار کرتی رہے اور حلال کی فکر اور کوشش

---

(۱) وفی الاختیار لتعلیل المختار ج:۳ ص:۶۱ والملک الخبیث سبیله التصدق به ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز ثم ان کان غنیًا تصدق بمثله وان کان فقیرًا لا یتصدق. نیز دیکھئے ص:۱۲۰ و ص:۱۲۱ کے حواشی۔

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے سائل موصوف کے جوابی خط میں تحریر فرمایا۔

جاری رکھے۔[1]

والله اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۷/۲۷ و)

باپ کی طرف سے صدقے کے لئے دی گئی حلال رقم خود استعمال کرکے مالِ حرام سے صدقہ کرنے کا حکم

سوال:- باپ نے بیٹے کو حلال رقم کسی نیک کام میں کوئی چیز خرید کر دینے کے لئے دی کہ اس رقم سے فلاں چیز خرید کر فلاں مستحق کو دے دو، بیٹے کے ذرائع آمدنی ناجائز ہیں، بیٹے نے باپ کی دی ہوئی وہ رقم خود خرچ کرکے بعد میں اپنی ناجائز آمدنی سے وہ چیز خرید کر مستحق کو دی۔ تو کیا اس صورت میں باپ کے ثواب میں فرق پڑے گا؟ کہیں باپ کا ثواب تو ختم نہیں ہوگا؟

طلعت محمود، راولپنڈی

جواب:- باپ کے ثواب میں تو اِن شاء اللہ اس صورت میں فرق نہیں پڑے گا، لیکن بیٹے کو یہ گناہ ہوگا کہ اس نے باپ کی دی ہوئی رقم خرچ کرلی، اور ناجائز آمدنی حاصل کی۔[2] اور باپ نے اسے پاک صاف مال سے خریدنے کو کہا تھا، اس نے ناجائز آمدنی سے چیز خریدی، لہٰذا بیٹے پر اوّل تو یہ واجب ہے کہ وہ ان گناہوں سے توبہ کرے اور ناجائز ذرائع آمدنی کو ترک کرے، دُوسرے! باپ جو مال کسی کام کے لئے دے، اسی سے خرچ کرے اور اسے الگ رکھے۔ وانما صح الشراء علیٰ قول

---

(۱) وفی الشامیة ج:۲ ص:۱۹۱ وفی جامع الجوامع: اشتری الزّوج طعامًا أو کسوةً من مال خبیثٍ جاز للمرأة أکله ولبسها والاثم علی الزّوج ....الخ.
وفی ردّ المحتار أیضًا ج:۲ ص:۳۸۲ (طبع سعید) امرأة زوجها فی أرض الجور اذا أکلت من طعامه ولم یکن عینه غصبًا أو اشتریٰ طعامًا أو کسوة من مال أصله لیس بطیب فهی فی سعة من ذٰلک والاثم علی الزّوج.
وکذا فی الخانیة علی الهندیة ج:۳ ص:۴۰۳.
وفی أحکام المال الحرام ص:۲۸۹، فاذا کان المال الحرام فی ید الوالد ینفق منه علیٰ نفسه وأبنائه لغیر حاجة أو فقرٍ فانّ الأب یکون آثمًا بهٰذا الانفاق اذا وجد المال الحلال أو کان قادرًا علیٰ تحصیله .... أمّا الأبناء ففی حکم انفاقهم من المال الحرام الّذی عند الأب ینبغی التّفریق بین حالتین، الأولی: أن یکون الابن غیر قادر علی تحصیل المال الحلال إمّا لعجزه أو لصغر سنّه وکانت نفقته واجبة علیٰ أبیه أو کان طالب علم لیس له مصدر رزق للعیش ودفع نفقات الدّراسة ألّا هٰذا المال الحرام الّذی عند الأب فانّ حکمه فی الأخذ من هٰذا المال حکم المضطر الیٰ دفع الأذیٰ عن نفسه بالمیتة فیجوز له أن یأخذ ما ینفقه علیه والده وان ینتفع به مع انکاره فی قلبه لهٰذا الأمر الیٰ أن یصبح قادرًا علی الاعتماد علیٰ نفسه فی تحصیل الکسب الحلال أو أن یأتیه مال من مصدر حلال فیستغنی به عمّا عند والده من مال حرام لأنّه عند حصول المال الحلال تزول ضرورته الی الانفاق علیٰ نفسه من المال الحرام ویکون لزامًا علیه أن ینفق علیٰ نفسه من هٰذا المال الحلال ویحرم علیه أن یقبل نفقة والده من المال الحرام.
نیز دیکھئے صفحہ:۱۲۵ کا حاشیہ نمبر۳۔
(۲) مالِ حرام حاصل کرنے اور استعمال کرنے کے گناہ سے متعلق احادیث ص:۱۲۵ کے حاشیہ نمبر۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔

الکرخی رحمہ اللہ تعالیٰ، وصحت الصدقۃ۔[1]

واللہ اعلم
۱۴۰۶/۶/۲۸ھ[2]

مالِ حرام سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کی ایک اہم تحقیق

(وضاحت از مرتب) مالِ حرام کے بارے میں عام طور پر فتاویٰ میں یہ بات درج کی جاتی ہے کہ اسے بلانیتِ ثواب کسی فقیر اور مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کردیا جائے، یعنی تصدق کے ساتھ ساتھ تملیک کی بھی شرط لگائی جاتی ہے، اور اسی کے مطابق پہلے دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی سے فتاویٰ جاری ہوتے تھے، مگر بعد میں حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ نے اس موضوع پر خاص طور پر تحقیق فرمائی کہ

---

(۱) وفی الشامیة مطلب اذا اکتسب حرامًا ج:۵ ص:۲۳۵ (طبع سعید) مطلب اذا اکتسب حرامًا ثم اشتری فهو علیٰ خمسة أوجه قوله (اکتسب حرامًا ...الخ) توضیح المسألة ما فی التتارخانیة حیث قال رجل اکتسب مالا من حرام ثم اشتری فهٰذا علیٰ خمسة أوجه أما ان دفع تلک الدراهم الی البائع أولا ثم اشتری منه بها أو اشتری قبل الدفع بها ودفعها أو اشتری قبل الدفع بها ودفع غیرها أو اشتری مطلقا ودفع تلک الدراهم أو اشتری بدراهم أخر ودفع تلک الدراهم قال أبو نصر یطیب له ولا یجب علیه أن یتصدق الّا فی الوجه الأول والیه ذهب الفقیه أبو اللیث لٰکن هٰذا خلاف ظاهر الروایة فانه نص فی الجامع الصغیر اذا غصب ألفا فاشتری بها جاریة وباعها بألفین تصدق بالربح وقال الکرخی فی الوجه الأول والثانی لا یطیب وفی الثلاث الأخیرة یطیب.
وقال ابوبکر لا یطیب فی الکل لٰکن الفتوی الآن علیٰ قول الکرخی دفعا للحرج عن الناس اهـ.
وفی الولوالجیة وقال بعضهم لا یطیب فی الوجوه کلها وهو المختار لٰکن الفتوی الیوم علیٰ قول الکرخی دفعا للحرج لکثرة الحرام اهـ.
وفی الهندیة، فصل فی الاحتکار ج:۳ ص:۲۱۵ (طبع رشیدیه کوئٹه) اکتسب مالًا من حرام ثم اشتریٰ شیئا منه فان دفع تلک الدراهم الی البائع أوّلا ثم اشتریٰ منه بتلک الدراهم فانه لا یطیب له ویتصدق به وان اشتریٰ قبل الدفع بتلک الدراهم ودفعها فکذٰلک فی قول الکرخی وأبی بکر خلافًا لأبی نصر وان اشتریٰ قبل الدفع بتلک الدراهم ودفع غیرها أو اشتریٰ مطلقًا ودفع تلک الدراهم أو اشتریٰ بدراهم أُخریٰ ودفع تلک التدراهم قال أبو نصر یطیب ولا یجب علیه أن یتصدق وهو قول الکرخی والمختار قول أبی بکر إلّا أن الیوم الفتویٰ علیٰ قول الکرخی کذا فی الفتاوی الکبریٰ.
وفی الهندیة، فصل فی تملک الغاصب الخ ج:۵ ص:۱۴۱ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) وان کان مما لا یتعین فقد قال الکرخی انه علیٰ أربعة أوجهٍ إمّا إن أشار الیه ونقد منه أو أشار الیه ونقد من غیره أو أطلق اطلاقًا ونقد منه أو أشار الیٰ غیره ونقد منه وفی کل ذٰلک یطیب له إلّا فی الوجه الأوّل وهو ما أشار الیه ونقد منه قال مشایخنا لا یطیب له بکل حال أن یتناول منه قبل أن یضمنه وبعد الضمان لا یطیب الربح بکل حال وهو المختار والجواب فی الجامعین والمضاربة یدل علیٰ ذٰلک واختار بعضهم الفتویٰ علیٰ قول الکرخی فی زماننا لکثرة الحرام وهٰذا کله علیٰ قولهما.
وفی العنایة شرح الهدایة: (اشتریٰ بها اشارة الیٰ أن التصدق انما یجب اذا اشتریٰ بها ونقد منها) قال فخر الاسلام: لأن ظاهر هٰذه العبارة یدل علیٰ أنه أراد بها اذا أشار الیها ونقد منها، أما اذا أشار الیها ونقد من غیرها أو نقد منها وأشار الیٰ غیرها أو أطلق اطلاقًا ونقد منها یطیب له، وهٰذه أربعة أوجه، ففی واحد منها لا یطیب، وفی الباقی یطیب.
وذکر فی المبسوط وجهًا آخر لا یطیب فیه أیضًا، وهو أنه اذا دفع الی البائع تلک الدراهم أوّلا ثم اشتریٰ منه بتلک الدراهم وهٰذا التفصیل فی الجواب قول الکرخی رحمه الله، لأن الاشارة اذا کانت لا تفید التعیین کان وجودها وعدمها سواء، فلا بد أن یتأکد بالنقد لیتحقق الخبث. قالوا: والفتوی الیوم علیٰ قوله لکثرة الحرام دفعا للحرج عن الناس.
(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اپنے جوابی خط میں تحریر فرمایا۔ (محمد زبیر)

''کسبِ خبیث'' واجب التصدق ہونے کے ساتھ ساتھ واجب التملیک بھی ہے یا نہیں؟ یعنی مالِ حرام کا صرف صدقہ کردینا کافی ہے یا اس کے ساتھ ساتھ کسی فقیر کو اس کا مالک بنانا بھی ضروری ہے؟

اس تحقیق کے نتیجے میں حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کا رُجحان اس طرف ہوا کہ کسبِ خبیث واجب التصدق تو ہے مگر واجب التملیک نہیں۔

حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ نے یہ تحقیق فرماکر یہ تحریر صدرِ دارالعلوم کراچی مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں بھیجی، جس پر حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے کئی جگہوں پر حواشی تحریر فرمانے کے بعد اس تحقیق کے آخر میں اپنا رُجحان بھی تحریر فرمایا۔

حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی یہ اہم تحقیق، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے حواشی اور ان کی رائے کے ساتھ درج ذیل ہے۔ (محمد زبیر)

مالِ حرام کے تصدق میں تملیک ضروری ہے یا نہیں؟

(خط از حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ بنام حضرت صدرِ دارالعلوم کراچی دامت برکاتہم)

بگرامی خدمت حضرت صدر صاحب[1] مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کسبِ خبیث جو واجب التصدق ہوتا ہے، اس کے بارے میں مدّت سے ذہن میں یہ تردّد تھا کہ اس کے ''واجب التملیک'' ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ مقصد اصل مالک کو ثواب پہنچانا ہے جو تملیک میں منحصر نہیں۔ بعد میں اس مسئلے کی کچھ تحقیق کی نوبت آئی، اس سلسلے میں کتبِ فقہ سے جو اُمور سمجھ میں آئے، وہ احقر نے منسلکہ تحریر میں اِملاء کرادیئے ہیں، مقصد یہ ہے کہ ان اُمور پر غور کیا جائے۔ آنجناب ملاحظہ فرماکر اپنی رائے تحریر فرمادیں، پھر حضرت ناظم صاحب اور مولانا محمود اشرف صاحب کو بھجوادیں تو کرم ہوگا۔ یہ سطور عجلت میں اسلام آباد جاتے ہوئے لکھ رہا ہوں۔

والسلام

محمد تقی عثانی

۱۴۱۹/۱۰/۲۷ھ

---

(۱) صدر جامعہ دارالعلوم کراچی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ۔

مولانا محمود اشرف صاحب سلمہٗ

میں نے یہ تحریر پڑھ لی ہے، کچھ اس پر لکھ بھی دیا ہے۔ آپ بھی دیکھ لیں، بعد ازاں حضرت ناظم صاحب مدظلہم کی خدمت میں پیش کردی جائے۔

والسلام

محمد رفیع عثمانی

۱۴۱۹/۱۲/۱۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ و کفٰی و سلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی أمّا بعد

کسی شخص کے پاس جو مال کسی حرام یا ناجائز ذریعے سے آگیا ہو، اور اس کو اصل مالک یا اس کے وارثوں تک پہنچانا ممکن نہ ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اسے نیتِ ثواب کے بغیر ہی اپنی جان چھڑانے کے لئے صدقہ کردیا جائے۔ عام طور سے تأثر یہ ہے کہ اس صدقے میں بھی تقریباً وہ تمام شرائط ملحوظ ہیں جو زکوٰۃ کے سلسلے میں معروف ہیں، چنانچہ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس صدقے میں بھی تملیکِ فقراء ضروری ہے، اور کسی رفاہی کام میں تملیک کے بغیر خرچ نہیں کیا جاسکتا، ہمارے بزرگوں میں سے بعض نے اس کے بارے میں صراحۃً فتویٰ بھی دیا ہے۔

دیکھئے (امداد المفتین ص:۴۵۴ کتاب الزکوٰۃ، طبع دار الاشاعت) البتہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کا رُجحان اس طرف ہے کہ اس قسم کا مال بحکم لقطہ ہے، اور لقطے کا حکم یہ ہے کہ وہ اصل مالکِ غیر معلوم کی طرف سے صدقۂ نافلہ ہے، اور اس میں تملیک ضروری نہیں، اس سلسلے میں اِمداد الاحکام جلد سوم میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم الامت رحمہ اللہ کا یہ رُجحان صراحۃً نقل فرمایا ہے اور وجداناً اسی قول کی طرف رُجحان کا اِشارہ کیا ہے، ان کی عبارت درج ذیل ہے:

> (الجواب) لقطہ کے بارے میں فقہاء کے اقوال سے اتنا تو ثابت ہے کہ غنی پر اس کا تصدق واجب ہے، لیکن آیا اس کا مطلب یہ ہے کہ لقطہ کا حکم وقت تصدق صدقہ واجبہ کا حکم ہے (حتی یجب فیه التملیک کالصدقات الواجبة) یا اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف تصدق واجب ہے اور صدقاتِ واجبہ کی طرح نہیں ہے "کما اذا جمع مالًا من کسب حرام فیجب التصدق به و لا یکون مثل صدقات واجبة حتی یبرأ ذمتهٗ بالتصدق علی ابنه الکبیر الفقیر" احقر اَب

تک اس کو مثلِ صدقات واجبہ کے لازم سمجھتا تھا، اور حضرت حکیم الامت واجب التصدق سمجھتے ہیں صدقہ واجبہ نہیں سمجھتے تھے، اور اَب تک کسی جزئیہ صریحہ سے یہ اختلاف مرتفع نہیں ہوا، البتہ رُجحان قول حکیم الامت کو معلوم ہوتا ہے وجداناً، بعد میں جزئیہ مل گیا کہ اس میں دونوں قول ہیں، مگر مشہور تملیک فقراء ہے۔

(امداد الاحکام ج:۳ ص:۴۷)[1]

(تتمة الجواب الأوّل) قال فی الدر فی مصارف بیوت المال ما نصه:

ورابعها الضوائع مثل مالا
یکون له أناس وارثونا
ورابعها فمصرفه جهات
تساوی النفع فیها المسلمونا[2]

قال الشامی: قوله الضوائع: جمع ضائعة أی اللقطات وقوله مثل مالا ای مثل ترکة لا وارث لها اصلا أو لها وارث لا یردّ علیه کأحد الزّوجین الخ وقوله ورابعها فمصرفه جهات الخ موافق لما نقله ابن الضیاء فی شرح الغزنویه عن البزدوی من انه یصرف الی المرضی والزمنی واللقیط وعمارة القناطر والرباطات والثغور والمساجد وما أشبه ذٰلک.[3]

اس کے علاوہ إمداد الفتاویٰ میں حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ کے ایک فتویٰ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کے صدقے کو واجب التملیک نہیں سمجھتے، کتاب الوقف میں اس سوال وجواب کی عبارت درج ذیل ہے:

سوال: زید نے بکر سے پتھر سنگِ مرمر خریدے اور ان پتھروں سے مسجد میں منبر ومصلیٰ بنوادیا، اب بعد میں زید کو معلوم ہوا کہ وہ پتھر جو بکر نے اس کے ہاتھ فروخت کئے تھے قبر کے پتھر تھے جو بکر نے قبرستان میں سے قبروں سے اُکھڑوادیئے تھے، اور جو قبریں اس کی ملکیت نہیں اس مصلیٰ پر نماز پڑھنا جائز ہے یانہیں؟ اور نیز پتھر مسجد میں لگے رہنے جائز ہیں یانہیں؟

(الجواب) پتھر قبر پر لگانے سے وقف نہیں ہوتا بلکہ لگانے والے کی ملک رہتا ہے،

---

(۱) ج:۳ ص:۴۸ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

(۲ و ۳) الدر المختار مع ردّ المحتار ج:۲ ص:۳۳۸ (طبع سعید)

پس اجنبی آدمی کا بیع کرنا اس کو صحیح نہیں ہوا لیکن اگر لگانے والا معلوم نہ ہو یا معلوم ہو مگر اس کا کوئی وارث موجود نہ ہو تو وہ حکم لقطہ میں ہے،[1] اور لقطہ کا حکم یہ ہے کہ کسی نیک کام میں صَرف کر دیا جائے اس صورت میں مسجد میں لگا رہنے دیا جاوے کہ اپنے مصرف میں لگ گیا ہے، البتہ جس نے بیع کیا ہے اس کے لئے قیمت دُرست نہیں اور اگر اس کا مالک یا مالک کا وارث معلوم ہو تو اس سے دریافت کیا جائے، اگر وہ اجازت دے، لگا رہنے دیا جائے خواہ مفت یا قیمت لے کر، اور وارث اگر اجازت نہ دے، اُکھاڑ دیا جاوے، اور اگر کئی وارث ہوں سب سے اجازت لینا ضروری ہے اور نابالغ کے حصے کی قیمت دینا ضروری ہے۔

(امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۵۸۷ سوال نمبر ۷۰۹ طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)

حضرت نے اس مسئلے میں قبرستان کے پتھر کو لقطہ قرار دے کر اس کا مسجد میں لگا رہنا جائز قرار دیا اور فرمایا کہ وہ اپنے مصرف میں پہنچ گیا، نیز یہ صراحت فرمائی کہ لقطے کا حکم یہ ہے کہ اسے کسی نیک کام میں صَرف کر دیا جائے، اس کے لئے تملیک کو ضروری قرار نہیں دیا اور ظاہر ہے کہ مسجد میں لگے رہنے سے تملیک متحقق نہیں ہوتی۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے اس رُجحان کے پیشِ نظر مسئلے کی تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی، تو حضرتِ والاؒ کی تائید میں متعدّد دلائل سامنے آئے، جو اہلِ علم کے غور کے لئے پیشِ خدمت ہیں۔

ملکِ خبیث کا واجب التملیک ہونا فقہائے مذہب کی کتابوں میں کہیں صراحت کے ساتھ نہیں بلکہ اس پر لفظ تصدق سے اِستدلال کیا گیا ہے کہ چونکہ صدقہ عموماً تملیکاً ہوتا ہے اس لئے ملکِ خبیث کو بھی واجب التملیک سمجھا گیا، حالانکہ خاص طور پر صدقۂ نافلہ میں لفظ صدقہ کا اِطلاق ان وجوہِ خیر میں خرچ کرنے پر بھی ہوا ہے جن میں تملیک کی ضرورت نہیں ہوتی، مثلاً حدیثِ معروف ہے کہ "اذا مات ابن آدم انقطع عمله اِلّا من ثلاث"[2] اس میں تیسرا عمل "أو صدقة جارية ينتفع بها"[3] قرار دِیا گیا ہے، یہ صدقۂ جاریہ واضح طور پر بغیر تملیک کے ہے، اسی طرح وقف پر صدقہ کا اطلاق بھی

---

(۱) حکم لقطہ میں ہونے پر احقر کو یہ اِشکال ہے کہ پتھر لگانے والے نے جہاں لگائے تھے وہیں لگے رہنے پر وہ راضی تھا، پس وہیں کیوں نہ لگے رہنے دیئے جائیں، یا وہیں کیوں نہ لگا دیئے جائیں کہ مالک نے ایک اَمرِ مباح میں ان کو اپنی مرضی سے لگا دیا تھا، اس اِشکال کا اثر اگرچہ ہمارے اپنے زیر بحث مسئلے پر نہیں پڑتا، لیکن ضمناً اسے ذِکر کرنا بھی ناچیز کو مناسب معلوم ہوا۔ رفیع

(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

(۲ و ۳) دیکھئے سنن ابن ماجه، باب ثواب معلم الناس الخير ص: ۲۱ (طبع سعید)، مشكوة المصابيح، كتاب العلم ج: ۱ ص: ۳۲ (طبع قديمى كتب خانه).

احادیث کی کتابوں میں شائع ہے، مثلاً صحیحین[۱] میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خیبر کی زمین کے بارے میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ان شئت حبست اصلها وتصدقت بها"[۲]

ترجمہ:- اگر تم چاہو تو اس اصل زمین کو روک رکھو اور اس کو صدقہ کر دو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مشورے پر جس طرح عمل کیا اس کے الفاظ یہ ہیں:

"فتصدق بها عمر أنه لا يباع أصلها لا يباع ولا يورث ولا يوهب قال فتصدق عمر في الفقراء والقربى هذا لفظ مسلم في كتاب الوقف.

(تکملة فتح الملهم ج:۲ ص:۱۱۷ تا ۱۲۰ طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)

لہٰذا صدقۂ نافلہ میں صرف لفظ صدقہ سے اس بات پر اِستدلال نہیں ہوسکتا کہ اس میں تملیک ضروری ہے، اس کے علاوہ بعض فقہائے کرامؒ نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ مالِ حرام کے لئے فقہائے کرامؒ نے جو صدقہ کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد محض تملیکاً صدقہ کرنا نہیں بلکہ عام مصارفِ خیر میں خرچ کرنا ہے، علامہ قرافیؒ نے لکھا ہے کہ:

انما يذكر الأصحاب صدقة في فتاويهم في هذه الأمور لأنه الغالب والا فالأمر كما ذكرته لك. (الذخيرة للقرافي بحواله أحكام المال الحرام ص:۱۹۰)[۳]

اگرچہ علامہ قرافی رحمہ اللہ مالکی المذہب ہیں اور وہ اپنے اصحاب کے قول کی تشریح فرما رہے ہیں لیکن اس سے کم از کم یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ باوجود صدقے کا لفظ استعمال کرنے کے مصارفِ خیر میں بدون تملیک خرچ کرنا بھی فقہاءؒ کی عبارتوں میں مراد ہوسکتا ہے۔

۲- فقہائے حنفیہؒ کی تصریحات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جو ملکِ خبیث واجب التصدق ہو وہ مصرف کے لحاظ سے من کل الوجوہ زکوٰۃ کی طرح نہیں ہے، بلکہ متعدّد جہات سے زکوٰۃ اور واجب التصدق کے مصرف میں فرق ہے، مثلاً یہ بات تقریباً تمام فقہائے حنفیہؒ نے بیان فرمائی ہے کہ یہ مال متصدق اپنی بیوی اور اولاد کو بھی دے سکتا ہے،[۴] چنانچہ علامہ حمویؒ لکھتے ہیں:

لو كان غنيا لم يحل له ذلك بل يتصدق على الفقير اجنبيا ولو زوجة أو

(۱ و ۲) الصحيح للبخاري، باب الشروط في الوقف ج:۱ ص:۳۸۲ (طبع سعيد) والصحيح للمسلم ج:۲ ص:۴۱ (طبع قديمي كتب خانه).

(۳) احكام المال الحرام ص:۲۸۹ (طبع ماريه اكيڈمی)

(۴) اس کی وجہ ناچیز کی سمجھ میں یہ آتی ہے کہ مالِ واجب التصدق کا صدقہ اصل مالک کی طرف سے ہوتا ہے اور متصدق کی بیوی اور اولاد اس کے حق میں اجنبی ہیں۔ رفیع (حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

قریبًا ولو اصلا أو فرعا کما فی التنویر اھ.

(حاشیة الاشباہ للحموی، کتاب الصید والذبائع ج:۲ ص:۱۰۶ طبع ادارۃ القرآن)

ومثلہ فی الدر المختار (ج:۴ ص:۲۷۸ تا ۲۸۰ طبع سعید) والّا تصدق بھا علیٰ فقیر ولو علیٰ أصلہ وفرعہ وعرسہ .... الخ.

نیز چونکہ یہ اصل مالک کی طرف سے صدقۂ نافلہ ہے اس لئے حنفیہ کے ظاہر الروایۃ کے مطابق یہ بنی ہاشم کو بھی دیا جاسکتا ہے، الدر المختار میں ہے:

جازت التطوعات من الصدقات وغلة الأوقاف لھم ای لبنی ھاشم سواء سماھم الواقف أو لا الخ. (ج:۲ ص:۳۵۱ طبع سعید)

اس کے تحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

نقل فی البحر عن عدة کتب ان النّفل جائز لھم اجماعًا وذکر أنہ المذھب وأنہ لا فرق بین التطوع والوقف کما فی المحیط وکافی النسفی ....

(رد المحتار ج:۲ ص:۳۵۱، کتاب الزکوٰۃ باب المصرف طبع سعید)

لیکن اس کے بعد علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے زیلعی کے حوالے سے اس مسئلے کو مختلف فیہ قرار دیا ہے، اور ذکر کیا ہے کہ علامہ ابنِ ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر میں دلیل کے اعتبار سے اس بات کو قوی قرار دِیا ہے کہ بنی ہاشم کے لئے صدقاتِ واجبہ اور نافلہ دونوں ناجائز ہیں، لیکن علامہ ابنِ نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے صدقۂ نافلہ میں جواز کا قول فقہائے حنفیہ کے متعدّد موثوق مراجع سے نقل کرنے کے بعد اسی کو مذہب قرار دِیا ہے، اور اس پر فقہائے مذہب کے اِجماع تک کا دعویٰ کیا ہے، اور علامہ ابنِ ہمامؒ کے بعض دلائل کی تردید کی ہے اور جواز کی وجہ بھی یہ بتائی ہے کہ زکوٰۃ تطہیرِ نفس کا موجب ہے لہٰذا اس کو اَوساخِ ناس سے تشبیہ دی گئی ہے، لیکن صدقۂ نافلہ تبرّع محض ہے، اس لئے وہ اوساخ میں داخل نہیں،[1] اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بنی ہاشم کے لئے صدقاتِ نافلہ جائز ہیں، چنانچہ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لقطے سے مبینہ انتفاع کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الا ان الصدقة الواجبة کانت لا تحل لھم وھٰذا لم یکن من تلک الجملة فلھٰذا استجاز علی رضی اللہ عنہ الشراء بھا لحاجتہ.

(المبسوط للسرخسی ج:۱۱ ص:۸ کتاب اللقطة طبع مطبعة السعادة مصر ۱۳۲۴ھ)

---

(۱) فرق کی یہ وجہ سمجھ میں نہیں آئی، جبکہ صدقۂ واجبہ کی طرح یہ بھی کفارۂ سیئات اور موجبِ رفعِ درجات ہوتے ہیں۔ رفیع (حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)۔

غالبًا یہی وجہ ہے کہ ہمارے متعدّد بزرگوں نے صاحبِ بحر کے قول ہی کو اِختیار کیا، چنانچہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ لقطے کے بارے میں فرماتے ہیں:

ونقول انه صدقة نافلة وهي جائزة لأهل البيت عند أكثرنا وان تردد فيه فخر الدين الزيلعي وابن همام ولذا قلنا يجوز اللقطة على الفروع (۱) والأصول فافترق الزكٰوة والتصدق باللقطة.

(۲)
(العرف الشذی، کتاب اللقطة ص:۲۵۷، طبع ایچ ایم سعید)

نیز علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وأيضًا فانّ بني هاشم انما لا تحل لهم الزكٰوة والعشر وصدقة الفطر وأما ما عدا ذٰلک من الصدقات النافلة فتحلّ لهم باتفاق أئمتنا رحمهم الله واللقطة ان كانت واجبة التصدق ليست من الصدقات الواجبة بل مصارفها مصارف الصدقة النافلة حيث جاز أن يتصدق بها علٰى فقير ذمي.

(اعلاء السنن ج:۱۳ ص:۲۶ طبع ادارۃ القرآن)

نیز حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مبسوط سرخسی کے ہی اس قول کی بنیاد پر اسی توجیہ کو اِختیار کیا ہے کہ صدقۂ نافلہ بنی ہاشم کے لئے جائز ہے۔ (بذل المجهود ص:۲۸۵)(۳)

اسی طرح زکوٰۃ ذمی کو نہیں دی جاسکتی لیکن واجب التصدق مال ذمی کو بھی دیا جاسکتا ہے جیسا کہ درمختار و شامی میں کوئی اختلاف نقل کئے بغیر ذِکر کیا گیا ہے۔ (شامی ج:۴ ص:۳۵۱)(۴)

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ واجب التصدق مال کے مصرف کو من کل الوجوہ زکوٰۃ کے مصرف کے مثل سمجھنا دُرست نہیں۔(۵)

---

(۱) ناچیز کی سمجھ میں یہ تعلیل بھی نہیں آئی، کیونکہ جواز اللقطہ علی الفروع والاصول کی وجہ بظاہر یہ نہیں ہے کہ یہ صدقۂ نافلہ ہے بلکہ وجہ ناچیز کو یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ اصل مالک کی طرف سے صدقہ ہے اور ملتقط کے اُصول وفروع اصل مالک کے اُصول وفروع نہیں، لہٰذا اصل مالک کی طرف سے اُن پر صدقہ جائز ہوا جیسا کہ اُس کی طرف سے ان کو زکوٰۃ دینا بھی جائز ہوتا۔ رفیع
(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

(۲) ص:۴۱۳ (طبع مکتبہ رحیمیہ سہارنپور)۔

(۳) ج:۲ ص:۵۰ طبع معهد الخليل وفي طبع دار الريان للتراث قاهرة ج:۸ ص:۱۹۵ وامّا آل النبي صلى الله عليه وسلم فقال اكثر الحنفية .... انّها تجوز لهم صدقة التطوّع دون الفرض. قالوا لان المحرم عليهم انّما هو أوساخ الناس وذٰلک هو الزكٰوة لا صدقة التطوع ...الخ.

(۴) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۳۵۱ (طبع سعيد) ولا تدفع الٰى ذمي وجاز دفع غيرها.

(۵) چنانچہ مصرف میں وہی فرق ہوگا جو صدقۂ واجبہ اور صدقۂ نافلہ کے مصرف میں ہے۔ رفیع
(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

۳- یہ بات تقریباً مُسلّم ہے کہ کسبِ خبیث کا واجب التصدق ہونا اس بناء پر ہے کہ اس کا صحیح مالک یا تو معلوم نہیں یا اس تک مال پہنچانا متعذر ہے، لہٰذا وہ لقطے کے حکم میں ہوگیا، اور لقطے کا حکم یہ ہے کہ وہ واجب التصدق ہے، اور چونکہ فقہائے حنفیہؒ نے بیت المال کے مصارف ذِکر کرتے ہوئے لقطے کا مصرف صرف فقراء کو قرار دِیا ہے، اس لئے اس سے یہ اِستنباط کیا گیا کہ زکوٰۃ کی طرح اس کی بھی تملیک ضروری ہے، لیکن یہ اِستنباط محلِ نظر ہے۔

اوّل تو بعض فقہائے حنفیہؒ نے لقطے کو صرف فقراء کے ساتھ خاص نہیں کیا بلکہ اسے تمام مصالح مسلمین میں خرچ کرنے کو دُرست قرار دِیا ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ نے علامہ بزدویؒ سے نقل کیا ہے:

أنه یصرف الی المرضی والزمنی واللقیط وعمارة القناطر والرباطات والثغور والمساجد وما أشبه ذلک.[1]

الدرالمختار میں علامہ ابن الشحنہ سے مصارف بیت المال سے متعلق جو اَشعار منقول ہیں ان میں بھی یہی موقف اِختیار کیا گیا ہے، البتہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے اس پر یہ اِعتراض کیا ہے کہ عام کتابوں میں لقطے کا مصرف فقراء کو قرار دِیا گیا ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

واما الرابع فمصرفه المشهور هو اللقیط الفقیر والفقراء الذین لا أولیاء لهم فیعطی منه نفقتهم وأدویتهم وکفنهم[2] وعقل جنایتهم.

(رد المحتار ج:۲ ص:۳۳۸ طبع سعید)

بیت المال میں لقطے کے مصرف کے بارے میں اور بھی متعدّد کتب میں یہی عبارت موجود ہے، لیکن اس عبارت پر غور کرنے سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ فقہاء نے فقراء کو لقطے کا مصرف قرار دِیا ہے، لیکن اس کے لئے تملیک ضروری نہیں قرار دی جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ فقیر اموات کی تکفین کو بھی لقطے کے مصرف میں شامل کیا گیا ہے، حالانکہ میّت کی تکفین میں تملیک متحقق نہیں ہوتی چنانچہ زکوٰۃ کے باب میں اکثر متون میں یہ صراحت ہے کہ اس کو تکفینِ میّت میں صَرف نہیں کیا جاسکتا، الدرالمختار میں ہے:

ویشترط ان یکون الصرف (ای الزکٰوة) تملیکًا لا اباحةً کما مرّ لا یصرف

---

(۱) رد المحتار ج:۲ ص:۳۳۸ (طبع سعید)۔

(۲) علامہ شامیؒ کے کلام میں کفن پر اس کو خرچ کرنے کا جواز تو علامت اس کی ہے کہ علامہ شامیؒ کے نزدیک اس کی تملیک واجب نہیں، لہٰذا عمارۃ القناطیر ونحو ذالک بھی اس کے مصرف ہوسکتے ہیں۔ رفیع

(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

الٰی بناء نحو مسجد ولا الٰی کفن میّت.

علامہ شامیؒ الٰی کفن میت پر لکھتے ہیں:

لعدم صحة تملیک منه. (رد المحتار ج:۲ ص:۳۴۴ طبع سعید)

اس سے یہ واضح ہوا کہ فقہائے کرام نے تکفینِ میّت کو تملیک قرار نہیں دیا، اس کے باوجود لقطے کے مصارف میں تکفین کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ لقطہ تملیک کے بغیر بھی فقراء پر صَرف کیا جاسکتا ہے۔

۴- لقطے اور کسبِ خبیث کے مصارف میں صرف فقراء کی تخصیص ائمہ اَربعہ میں سے صرف حنفیہؒ کے ہاں ہے، دُوسرے ائمہ کرامؒ یہ تخصیص نہیں فرماتے بلکہ وہ اس کو عام مصالح مسلمین میں خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، جیسا کہ درج ذیل عبارت سے واضح ہے:

(فی المعیار المعرب: ج:٦ ص:١٤٦)[1] وسئل بغض الفقهاء عمّن تاب وبیده مال حرام، لا یعرف أربابه، ولیس معه غیره هل یأخذ منه ما یقتات منه أم لا؟ فأجاب: قال الدودی: توبته تزیل ما بیده اما للمساکین أو للمساکین أو ما فیه صلاح المسلمین ...الخ.

وفی الذخیرة للقرافی[2] بحواله احکام المال الحرام ص:۲۹۰[3]

الأموال المحرّمة من الغصوب وغیرها اذا علمت أربابها ردت الیهم، والا فهی من أموال بیت المال تصرف فی مصارفه الأولی فالأولی من الأبواب والأشخاص علٰی ما یقتضیه نظر الصارف من الامام أو نوّا به أو من حصل ذٰلک عنده من المسلمین فلا تتعیّن الصدقة قد یکون الغزو أولٰی فی وقت أو بناء جامع أو قنطرة، فتحرم الصدقة لتعیین غیرها من المصالح.

وفی المجموع شرح المهذب (ج:۹ ص:۳۵۱)[4] (فرع) قال الغزالی اذا کان معه مال حرام وأراد التوبة والبراءة منه فان کان له مالک معین وجب صرفه إلیه أو إلٰی وکیله فان کان میتًا وجب دفعه الٰی وارثه وان کان لمالک لا یعرفه ویئس من معرفته فینبغی أن یصرفه فی مصالح المسلمین

---

(۱) طبع دار المغرب الاسلامی بیروت.

(۲) کتاب القراض الباب الاوّل ج:۵ ص:۱۲۷ (طبع دار الکتب العلمیة).

(۳) ص: ۲۸۹ (طبع ماریه اکیڈمی).

(۴) ج:۱۰ ص:۵۲۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت).

العامة كالقناطر، والربط، والمساجد، ومصالح طريق مكة، ونحو ذٰلك مما يشترك المسلمون فيه، وإلّا فيتصدّق به على الفقراء.

وفي نهاية المحتاج الٰى شرح المنهاج (ج:٥ ص:١٨٥)[1] أما مع جهلهم فان لم يحصل الياس من معرفتهم وجب اعطاؤها للإمام ليمسكها أو ثمنها لوجود ملاكها وله اقتراضها لبيت المال، وان أيس منها أى عادة كما هو ظاهر صارت من أموال بيت المال فلمتوليه التصرّف فيها بالبيع واعطاؤها لمستحق شيء من بيت المال. (كذا في تحفة المحتاج بشرح المنهاج ج:٦ ص:٤٥)[2]

وفي الانصاف للمرداوي (ج:١١ ص:٢١٣)[3] قوله: واختار الشيخ تقي الدين رحمه الله تعالٰى فيمن كسب مالًا محرما يرضى الدافع، ثم تاب كثمن خمر ومهر بغي، وحلوان كاهن، الٰى قوله: في مال مكتسب من خمر ونحوه يتصدق به، فاذا تصدق به فللفقير أكله ولولي الأمر أن يعطيه لأعوانه وقال أيضًا فيمن تاب ان علم صاحبه دفع اليه وإلّا دفعه في مصالح المسلمين وله مع حاجته أخذ كفايته.

(هٰكذا في كتاب الفروع لابن مفلح ص:٤٤٩)[4]

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۹/۱۰/۲۷ھ

اِضافہ از مولانا محمد افتخار بیگ:

حضرت اقدس مفتی کفایت اللہ دہلوی قدس سرہٗ کفایت المفتی میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں (سوال مسجد کے بنک میں جمع شدہ روپیہ پر سود کے استعمال سے متعلق ہے):

جواب:- جو روپیہ بنکوں میں جمع کیا جائے اس کا سود بنک سے وصول کرلیا جائے تا کہ اس کے ذریعے سے مسیحی مذہب کی تبلیغ اور مسلمانوں کو مرتد بنانے کی اعانت کا گناہ نہ ہو، وصول کرنے کے بعد اس روپے کو اُمورِ خیر میں جو رفاہِ عام سے متعلق ہوں، یا فقراء ومساکین کی رفعِ حاجات کے لئے مفید ہوں، مثلاً یتامیٰ

(١) طبع دار احياء التراث العربي بيروت.
(٢) تحفة المحتاج على صدر حواشي الشيرواني فصل فيما يطرأ على المغصوب.
(٣) طبع دار احياء التراث العربي بيروت.
(٤) ج:٦ ص:٤٤٨ (طبع عالم الكتب بيروت).

ومساکین اور طلباء مدارسِ اسلامیہ کے وظائف اور اِمداد کتب وغیرہ میں خرچ کرنا یا مسافرخانہ، کنواں، سڑک وغیرہ تعمیر کرنا، سڑکوں پر روشنی کرنا، یہ سب صورتیں جائز ہیں، البتہ مسجد پر خرچ نہ کی جائے کہ یہ تقدسِ مسجد کے منافی ہے، واللہ اعلم وعلمہٗ اتم۔

جواب از حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ: اوّل تو مسجد کا روپیہ بنک میں جمع کرنا جب دُوسرا طریق حفاظت کا ہو، خلافِ اِحتیاط ہے، اور اگر غلطی سے یا غفلت سے یا مجبوری سے ایسا اتفاق ہوگیا تو اس وقت وصول کرنے میں تو وہی عمل کرے جو مجیبِ اوّل نے تحریر فرمایا، البتہ جزوِ اَخیر یعنی مصارفِ مذکورہ میں صَرف کرنا اس میں ترمیم کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ خاص مسجد میں صَرف کرنا تو تقدسِ مسجد کے خلاف ہے، اور دُوسری جگہ صَرف کرنا ملکِ مسجد کا غیرِ مسجد میں صَرف ہے، اس لئے دونوں محذوروں سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ اس قدر روپیہ کسی سے قرض لے کر مسجد میں صَرف کردے اور اس سود کی رقم سے وہ قرضہ ادا کرے، اور یہ ثابت ہے کہ مسجد کی نیت سے جو قرض لیا جائے اس کا مسجد کی آمدنی سے ادا کرنا جائز ہے۔

کتبہ: اشرف علی عفی عنہ ۱۱رذیقعدہ ۱۳۵۴ھ

الجواب الثانی صحیح: بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مسعود احمد عفا اللہ عنہ

نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴رذیقعدہ ۱۳۵۴ھ

(کفایت المفتی ج:۷ ص:۱۰۴)[1]

اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضرت اقدس حکیم الامت قدس سرہٗ اموالِ خبیثہ کو تصدق علی الفقراء تملیکاً کے قائل نہیں، کیونکہ یہاں حضرتؒ نے اس رقم کو مسجد کی ملکیت قرار دیا ہے، البتہ مسجد میں یا کسی دُوسری جگہ صَرف کرنے کو دُوسری وجوہات کی بنا پر دُرست قرار نہیں دیا، اس کے بجائے صَرف علی المسجد کے لئے حیلہ بیان فرمایا، اور لقطہ کے بارے میں حضرتؒ کا موقف بالتفصیل شروع میں گزر چکا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

---

(۱) ج:۷ ص:۱۰۵ و ۱۰۶ (طبع دار الاشاعت).

(رائے گرامی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

ناچیز کا رُجحان عرصۂ دراز سے اسی طرف ہوتا تھا کہ کسبِ خبیث (اموالِ واجبۃ التصدق) کے تصدق میں تملیک واجب نہ ہونی چاہئے، کیونکہ یہ صدقہ اصل مالک کی طرف سے بہ طور صدقۂ نافلہ کے ہوتا ہے، اور صدقاتِ نافلہ میں صدقاتِ جاریہ بھی داخل ہیں، جن میں تملیک نہیں ہوتی۔

تحریرِ ھٰذا کو دیکھنے سے اس رُجحان میں اور اِضافہ ہوا، البتہ جن بزرگوں نے تملیک کو شرط یا واجب قرار دِیا ہے، تحریرِ ھٰذا میں ان کی دلیل صرف یہ مذکور ہے کہ ''فقہائے کرامؒ نے اسے صدقہ قرار دیا ہے، لہٰذا اس سے اِستنباط کیا گیا کہ اس میں بھی صدقاتِ واجبہ کی طرح تملیک واجب ہوگی'' اگر یہی دلیل ہے تو احقر کے مذکورہ بالا رُجحان میں اس سے کمی واقع نہیں ہوئی، کوئی اور دلیل بھی اگر ہو تو اُسے دیکھ کر ہی کچھ عرض کرسکتا ہوں۔

واللہ اعلم

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۴۱۹/۱۲/۱۱ھ

﴿فصل فی بیع الصّرف وأحکام الحلی والأوراق النقدیة﴾

(بیعِ صَرف، زیورات کی خرید وفروخت اور کرنسی نوٹوں کا بیان)

کاغذی کرنسی کا باہم تبادلہ ''بیعِ صَرف'' نہیں ہے

(حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی موقف)

سوال:- سونا، چاندی کا موجودہ نوٹوں سے مثلاً پاکستانی کرنسی یا ملائشیا کی کرنسی سے تبادلہ بیعِ صَرف ہے یا نہیں؟ یعنی اس کاروبار میں تقابض فی المجلس ضروری ہے یا نہیں؟ کیونکہ کاروبار عمومی طور پر نوٹوں کے ذریعے ہوا کرتا ہے، یہ اس لئے لکھا کہ حضرت کی تحقیق ''کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم'' سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نوٹ سونے یا چاندی کے حکم میں نہیں جیسا کہ صفحہ نمبر ۴۰ پر ہے: ''پھر ایک ہی ملک کے کرنسی نوٹوں کے درمیان تبادلے کے وقت اگرچہ کمی زیادتی جائز نہیں، لیکن یہ بیعِ صَرف بھی نہیں ہے کیونکہ یہ نوٹ کرنسی خلقی ثمن نہیں ہے بلکہ ثمنِ عرفی یا اصطلاحی ہیں۔'' نوٹوں پر زکوٰۃ کے بارے میں صفحہ نمبر ۲۳ پر علامہ احمد ساعاتی کی عبارت یوں نقل کی گئی ہے:

''فالذی أراه حقًا وادین اللہ علیہ ان حکم الورق المالی کحکم النقدین ....الخ''

میرے نزدیک صحیح بات جس پر میں اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہوں یہ ہے کہ زکوٰۃ کے وجوب اور اس کی ادائیگی کے مسئلے میں ان کاغذی نوٹوں کا حکم بھی بعینہٖ سونے چاندی کے حکم کی طرح ہے۔

چونکہ بندے سے یہ مسئلہ کئی دفعہ پوچھا گیا تو بندے نے جیسے اپنے اساتذۂ کرام خصوصاً مفتی عبداللطیف صاحب دارالعلوم سرحد پشاور سے سیکھا تھا کہ: ''یہ معاملہ بیعِ صَرف کا ہے، اس لئے اس میں اُدھار جائز نہیں'' بتادیا، حتیٰ کہ ہمارے علاقے کے جو لوگ ملائشیا میں سونے چاندی کا اُدھار پر کاروبار

کرتے ہیں تو حتی الوسع ان کو بھی اس کاروبار سے منع کیا اور بہت سے متعلقین اور سنار حضرات منع بھی ہوگئے، لیکن جب حضرت کے مقالے کا مطالعہ کیا تو تردّد پیدا ہوا، اس لئے بندے نے اپنے اُستاذِ محترم مفتی عبداللطیف سے رجوع کیا، حضرت اُستاذِ محترم نے مسئلۂ مذکورہ کے بارے میں فرمایا کہ یہ معاملہ بیع صَرف کا ہے، لہٰذا بغیر تقابض فی المجلس کے جائز نہیں۔ اسی طرح بندے نے بنوری ٹاؤن سے جواب منگوایا تو وہ بھی یہی تھا کہ یہ مذکورہ معاملہ بیع صَرف ہے، لہٰذا بغیر تقابض کے جائز نہیں۔ لہٰذا بندہ آپ کی طرف متوجہ ہوا کہ کرنسی نوٹ کے بارے میں ''ثمنِ عرفی ہونے کی وجہ سے باہم تبادلے کے وقت تقابض ضروری نہیں، احد البدلین کا قبض ہونا کافی ہے'' یہ حضرت کی ذاتی رائے ہے یا عصرِ حاضر کے فقہائے کرام وعلمائے عظام کی موافقت بھی شامل ہے؟ کیونکہ مسئلہ حلال حرام کا ہے، پھر عمل آپ محترم کی رائے پر کیا جائے یا اور حضراتِ محترمین کی رائے پر؟ کیونکہ اسی اُصول پر بہت سی جزئیات متفرّع ہیں۔

والسلام

بندہ شیر محمد، فاضل دارالعلوم سرحد پشاور

مدرسہ عربیہ مسجد بلال، بونیر

جواب:- مکرمی ومحترمی زید مجدکم السامی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، مختلف جنس کی کاغذی کرنسیوں کے باہم تبادلے کے بارے میں احقر کا موقف یہ ہے کہ یہ بیعِ صَرف نہیں ہے، لہٰذا تقابض فی المجلس ضروری نہیں، احد البدلین پر قبضہ کافی ہے۔ اور مختلف جنس کی کرنسیوں کے تبادلے میں تفاضل بھی جائز ہے اور نسیئہ بھی، البتہ چونکہ نسیئہ کو رِبا کے جواز کا حیلہ بنایا جاسکتا ہے اس لئے نسیئہ کی صورت میں یہ ضروری ہے کہ نسیئہ کی وجہ سے قیمت میں اضافہ نہ کیا جائے بلکہ ثمنِ مثل پر بیع ہو۔

آپ نے پوچھا ہے کہ کیا دُوسرے علماء بھی اس رائے سے متفق ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ احقر کی یہ رائے ہندوستان کے مولانا مجاہدالاسلام صاحب نے وہاں کے بہت سے مفتی حضرات کو بھیجی تھی، ان میں سے اکثر حضرات نے اس سے اتفاق فرمایا، البتہ صرف ایک صاحب کا اختلاف مجھے یاد ہے۔ پاکستان کے بعض علماء نے اتفاق فرمایا، اور اب آپ نے دو علماء کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا فتویٰ اس سے مختلف ہے، اب معلوم نہیں کہ احقر کے دلائل ان حضرات کے سامنے تھے یا نہیں تھے؟ البتہ عرب ممالک کے بیشتر علماء اس معاملے میں احقر سے اختلاف کرتے ہیں، واضح رہے کہ علامہ احمد ساعاتی رحمہ اللہ کی جو عبارت[1] احقر نے اپنے مقالے میں نقل کی ہے وہ صرف وجوبِ زکوٰۃ کی حد تک

(۱) شرح الفتح الرّبانی للساعاتی، آخر باب زکوٰۃ الذّھب والفضّۃ ج:۸ ص:۲۵۱.

ہے، مبادلے کے صَرف ہونے یا نہ ہونے کے متعلق انہوں نے کوئی بحث نہیں کی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اب یہ نوٹ تمام اَحکام میں سونے چاندی کے قائم مقام ہیں، لہٰذا ان پر بیعِ صَرف کے اَحکام کا ہی اطلاق ہوگا، احقر کو ابھی تک اس موقف پر اِطمینان نہیں ہوا جس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- کرنسی نوٹوں کا ثمن ہونا تو اَب واضح ہو چکا ہے، لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ اِن کو ثمنِ خلقی کہا جائے گا یا ثمنِ اعتباری اور ثمنِ عرفی؟ ظاہر ہے کہ انہیں ثمنِ خلقی قرار دینے کا کوئی راستہ نہیں، لازماً انہیں ثمنِ اعتباری یا ثمنِ عرفی ہی کہا جاسکتا ہے، لہٰذا ان کا حکم فلوس جیسا ہوگا، کیونکہ وہ بھی ثمنِ اعتباری ہیں، بلکہ نوٹوں کا ثمنِ اعتباری ہونا زیادہ واضح ہے، کیونکہ ان کی ذاتی قدر و قیمت فلوس سے بھی کم ہوتی ہے، انہیں ثمن بنانے والی چیز اعتبار اور اِصطلاح کے سوا کچھ نہیں، اور فلوس کے بارے میں فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ ان کا باہم تبادلہ صَرف نہیں، نہ اس میں تقابض فی المجلس ضروری ہے۔[1]

۲:- اگر کرنسی نوٹوں کے باہم تبادلے کو صَرف کہا جائے تو لازم آئے گا کہ جن اشیاء میں صَرف جاری ہوتا ہے، اُن میں ایک چیز کا اضافہ ہوگیا، یعنی نصوص سے صرف سونے چاندی میں صَرف جاری ہونا ثابت ہوتا ہے، اب لازم آئے گا کہ کرنسی نوٹ میں بھی سونے چاندی کے علاوہ صَرف جاری ہو، ''ما یجری فیہ الصَّرف'' میں اس اضافے کی کوئی بنیاد نصوص یا کلامِ فقہاء میں نہیں ملتی۔

۳:- یہ بات میں اپنے مقالے میں واضح کر چکا ہوں کہ نوٹوں کی پشت پر اب نہ کوئی سونا ہے، نہ چاندی ہے، لہٰذا ان کو سونے چاندی کا نمائندہ قرار دے کر بھی ان پر صَرف کے اَحکام جاری کرنا مشکل ہے۔

۴:- اگر ان میں صَرف جاری کیا جائے اور ساتھ ہی سونے چاندی میں بھی صَرف کو بدستور جاری سمجھا جائے تو سوال یہ ہے کہ کرنسی نوٹ سے سونا یا چاندی خریدنے کو صَرف کہا جائے گا یا نہیں؟ اگر کہا جائے گا تو عجیب بات یہ ہے کہ غالب الغش سکوں سے سونے یا چاندی کے تبادلے کو کلی طور پر صَرف نہ کہا جائے[2] جبکہ غالب الغش سکوں میں کچھ نہ کچھ سونا یا چاندی ہوتا ہے، اور صرف انہی کے وزن کی حد تک ان میں تقابض شرط ہوتا ہے، زیادہ میں نہیں، اور کرنسی نوٹوں کے تبادلے کو کلی طور پر صَرف کہا جائے جبکہ ان میں سونا چاندی بالکل موجود نہیں ہے۔

---

(۱) راجع للتفصیل الدّر المختار ج:۵ ص:۱۷۹ وفتح القدیر ج:۶ ص:۱۶۲ والعنایة للبابرتیؒ ج:۶ ص:۱۶۲ وتکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۵۸۷ الیٰ ۵۹۰.

(۲) راجع البحر الرّائق ج:۶ ص:۳۳۴ (طبع رشیدیه) وردّ المحتار ج:۵ ص:۲۶۵ و ۲۶۶ (طبع سعید) ومجمع الأنهر ج:۳ ص:۱۷۶ (طبع غفاریه) والهندیة ج:۳ ص:۲۱۹، وراجع للتفصیل الیٰ تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۵۸۶.

ان وجوہ سے ابھی تک احقر کو اس بیع کے صَرف قرار دینے پر اِطمینان نہیں ہوا، اگر اِن اِشکالات کا کوئی واضح جواب مل جائے تو احقر کو کوئی اِصرار نہیں ہے، لیکن ابھی تک بہت سے علماء سے گفتگو کے نتیجے میں ان اِشکالات کا کوئی جواب احقر کو نہیں ملا۔ عرب علماء کا بنیادی نکتہ یا تو یہ ہے کہ ذھب و فضّۃ میں اَحکامِ صَرف جاری ہونے کی علت ثمنیت ہے،[۱] اور مالکیہ کے مسلک کے مطابق وہ ثمنیتِ عرفیہ کو بھی شامل ہے،[۲] اور نوٹوں میں یہ علت پائی جاتی ہے، لیکن حنفیہ کے مسلک کے مطابق نہ ثمنیت علت ہے[۳] اور نہ ثمنیتِ عرفیہ تمام اَحکام میں ثمنیتِ خلقیہ کے مساوی ہے۔ یا پھر وہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ اگر تقابض شرط قرار نہ دیا گیا اور نسیئہ کو جائز کہا گیا تو رِبا کا یہ حیلہ آسان ہو جائے گا کہ قرض لینے والا کسی غیر ملکی کرنسی میں ثمنِ مثل سے زائد اُدھار ادائیگی کا معاملہ کرلے گا، لیکن اس کا حل احقر یہ عرض کرچکا ہے کہ نسیئہ کی وجہ سے قیمت میں اضافے کو ممنوع قرار دے دیا جائے اور نسیئہ کی صورت میں مبادلے کے لئے ثمنِ مثل کو ضروری قرار دیا جائے، اور کسی محظور سے بچنے کے لئے ثمنِ مثل کی پابندی فقہائے کرامؒ نے متعدّد مسائل میں ضروری قرار دی ہے، مثلاً بیع العینہ میں،[۴] نیز کتابتِ فتویٰ کی اُجرت میں،[۵] لہٰذا اس محظور کا سدِّ باب بآسانی ممکن ہے۔

دُوسری بات یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ جو عرب علماء کرنسیوں کے باہم تبادلے کو صَرف قرار دیتے ہیں، وہ ساتھ ہی اس بات کے بھی قائل ہیں کہ تقابض کے لئے دونوں طرف سے چیک پر قبضہ کرلینا کافی ہے، جو احقر کے نزدیک سخت محلِ اِشکال ہے۔ نیز ان میں سے بعض حضرات نوٹوں کو سونے چاندی

(۱ و ۲) لأنّ الثمنية علّة عند المالكية لتحريم ربا الفضل سواء كانت الثمنية حقيقية أو عرفية وجاء في المدوّنة الكبرىٰ للامام مالكؒ ج:۳ ص:۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) ولو أنّ النّاس اجازوا بينهم الجلود حتّى تكون لها سكة وعين لكرهتها ان تباع بالذّهب والورق نظرة ..... لأنّ مالكًا قال: لا يجوز فلس بفلسين ولا تجوز الفلوس بالذّهب والفضّة ولا بالدّنانير نظرة .... الخ.

وراجع للتفصيل الىٰ تكملة فتح الملهم ج:۱ ص:۵۸۷ الىٰ ص:۵۹۰.

(۳) تفصیل کے لئے تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۵۸۷ تا ۵۹۰ وفقہی مقالات ج:۱ ص:۳۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) وفي فتح القدير ج:۶ ص:۶۸ (ومن باع جارية بألف درهم حالّة أو نسيئة فقبضها ثم باعها من البائع قبل نقد الثمن) بمثل الثمن أو أكثر جاز، وان باعها من البائع بأقل لا يجوز عندنا.

وفي البحر الرّائق ج:۶ ص:۸۲ لم يجز شراء البائع ما باع بأقل ممّا باع .... الخ. ..... وقيّد بالأقل احترازًا عن المثل أو أكثر فانّه جاز.

وكذا في الدّر المختار ج:۵ ص:۷۳ ومجمع الأنهر ج:۳ ص:۸۸ وخلاصة الفتاوىٰ ج:۳ ص:۵۰ والكفاية ج:۶ ص:۳۲۳.

(۵) وفي الدّر المختار كتاب الاجارة مسائل شتّى ج:۶ ص:۹۲ (طبع سعيد) ويستحق القاضي الأجر علىٰ كتب الوثائق قدر ما يجوز بغيره كالمفتي، فانه يستحق أجر المثل علىٰ كتابة الفتوىٰ لأن الواجب عليه الجواب باللسان دون الكتابة بالبنان .... الخ.

وكذا في البزازية على الهندية ج:۵ ص:۴۹ وخلاصة الفتاوىٰ :۴ ص:۴۸ (طبع امجد اكيڈمى لاهور).

کے حکم میں قرار دینے کے بعد خود سونے یا چاندی کے عروضِ تجارت ہونے کے قائل ہوگئے ہیں، جس میں تفاضل اور نسیئہ کو جائز کہنے لگے ہیں، جو خلافِ نصوص ہے۔

جہاں تک برِصغیر کے بعض ان علماء کا تعلق ہے جو کرنسیوں کی بیع کو صَرف قرار دینے کی طرف مائل ہیں (اور ان کی تعداد احقر کے علم میں بہت کم ہے) اور احقر کو ان سے گفتگو کی نوبت آئی، سو ان میں سے اکثر کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوٹوں کی پشت پر سونا یا چاندی ہوتا ہے، لہٰذا اس پر سونے چاندی ہی کے اَحکام جاری ہونے چاہئیں، لیکن یہ بات بحالاتِ موجودہ واقعے کے بالکل خلاف ہے، جیسا کہ احقر اپنے مقالے میں اس کو تفصیل سے واضح کر چکا ہے۔

بہرکیف! یہ احقر کی سوچ بچار کا حاصل ہے، تاہم اگر آپ احقر کی یہ تحریر مع احقر کے مقالے کے ان علماء کی خدمت میں بھیج دیں جنھوں نے اس معاملے کو صَرف قرار دیا ہے (تاکہ احقر کے دلائل ان کے سامنے آجائیں) تو اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ مفید ہوگا۔ اگر وہ حضرات احقر کے مذکورہ بالا اِشکالات کا جواب عنایت فرمائیں تو براہِ کرم احقر کو بھی مطلع فرمادیں، اگر احقر کی سمجھ میں آگیا تو اِن شاء اللہ اس کا اعلان کردوں گا۔ مسئلہ حلال و حرام کا ہے، اس لئے اس میں تثبت ضروری ہے، اللّٰھم أرنا الحق حقًّا وارزقنا اتّباعه وأرنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابه۔

والسلام
۱۴۱۶/۵/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۹/۲۹)

ایک ملک کی کرنسی کے باہم تبادلے کی صورت میں تفاضل کے حرام ہونے کی بنیادی وجہ (عربی فتویٰ)

سوال:- يعلم من مؤلفاتكم - تكملة فتح الملهم والمقالات الفقهية- أن بيع الدولار بالروبيات الباكستانية نساءً يجوز. مع أنكم رجحتم مذهب الامام محمدؒ لئلا يفتح باب الربوا، فاذا كان كذٰلك فلا سبيل الىٰ جواز البيع المذكور لأنه اذا حرم التفاضل حرم النساء بدليل توقف حرمة التفاضل علىٰ وجود جزئى العلة (القدر والجنس) وتوقف حرمة النساء علىٰ وجود أحدهما، فبينهما عموم وخصوص من وجهٍ، وان كنتم تحكمون فى حرمة بمذهب الامام محمدؒ وفى جواز البيع المذكور بمذهب الشيخينؒ فهٰذا عند الأحقر، تلفيق، أرجو من سماحتكم أن تبينوا وتوجروا، والسلام۔

محمد حقانی
۱۴رشوال ۱۴۱۷ھ

جواب:- لا شک أنّ التفاضل الذی یحرم بوجود القدر والجنس یتلازم مع حرمة النسیئة ولکن التّفاضل الذی یحرم فی الفلوس لیس نتیجة لوجود القدر، لأنّ الفلوس عددیة بالاجماع ولیست وزنیة، وانما حرمة التّفاضل فیها عند اتحاد الجنس ناتجة عن کونها أمثالًا متساویة قطعًا،[1] فیؤدی التّفاضل فیه الی الفضل الخالی عن العوض، وهٰذا المعنیٰ صرّح به السرخسیّ فی المبسوط[2] والبابرتیّ فی العنایة،[3] ولعلّی نقلت عباراتهما فی بحثی علیٰ هٰذا الموضوع، وحرمة التفاضل فی مثله لا تتلازم مع حرمة النسیئة، ولهٰذا صرّح العلّامة ابن عابدینّ وغیره ان الفلس بالفلسین لا یجوز عند محمد رحمه الله،[4] والفلس بالفلس جائز بشرط أن یقبض أحد البدلین فی المجلس،[5] وهٰذا یدلّ علیٰ أنّه ان قبض أحد البدلین فی المجلس، وأُجّل البدل الآخر، فان ذٰلک یجوز، فهو تصریح بإباحة النساء مع حرمة التّفاضل عند محمد رحمه الله فی المتعینین، وعند کل من الأئمّة الثلاثة اذا کانت بغیر أعیانهما.[6] فلیس هناک تلفیق.

هٰذا ما ظهر لی

۲۵/۱۱/۱۴۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۰/۲۵۷)

(۱، ۳ و ۶) قال البابرتی رحمه الله فی العنایة علیٰ فتح القدیر (ج:۶ ص:۱۶۲ طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه): بیع الفلس بجنسه متفاضلًا علیٰ أوجه أربعة بیع فلس بغیر عینه بفلسین بغیر أعیانهما وبیع فلس بعینه بفلسین بغیر أعیانهما وبیع فلس بغیر عینه بفلسین بأعیانهما وبیع فلس بعینه بفلسین بأعیانهما والکل فاسد سوی الوجه الرابع. أما الأوّل فلأن الفلوس الرائجة أمثال متساویة قطعا لاصطلاح الناس علیٰ اهدار قیمة الجودة منها فیکون أحد الفلسین فضلًا خالیًا عن العوض مشروطًا فی العقد وهو الربا. وأمّا الثانی فلأنه لو جاز أمسک البائع الفلس المعین وطلب الآخر وهو فضل خال عن العوض. وأمّا الثالث فلأنه لو جاز قبض البائع الفلسین وردّ الیه أحدهما مکان ما استوجبه فی ذمته فیبقی الآخر له بلا عوض اهـ.

وفی تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۵۸۷ بیع فلوس غیر معینة بالتّفاضل، کبیع الفلس الواحد بالفلسین اذا لم یعین المتعاقدان أحد البدلین، فانه لا یجوز باتفاق العلماء الحنفیة، أما اذا کان البدلان غیر متعینین فلان الفلوس الرائجة امثال متساویة قطعًا لاصطلاح الناس علیٰ اهدار قیمة الجودة منها، فیکون أحد الفلسین فضلًا خالیًا عن العوض، مشروطًا فی العقد، وهو الربا. واما اذا کان الفلس الواحد متعینًا بعینه والآخران بغیر أعیانهما، فلأنه لو جاز أمسک البائع الفلس المعین وطلب الآخر، وهو فضل خال عن العوض، واما اذا کان الفلس الواحد غیر متعین والآخران متعینین، فلأنه لو جاز قبض البائع الفلسین، وردّ الیه أحدهما مکان ما استوجبه فی ذمته، فیبقی الآخر له بلا عوض اهـ.

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۷۹ باع فلوسًا بمثلها أو بدراهم أو بدنانیر فان نقد أحدهما جاز وان تفرقا بلا قبض أحدهما لم یجز.

وفی التکملة ج:۱ ص:۵۸۷ بیع الفلوس بمثلها، کالفلس الواحد بالفلس الواحد الآخر، وهٰذا انما یجوز اذا تحقق القبض فی أحد البدلین فی المجلس قبل أن یفترق المتبایعان فان تفرقا ولم یقبض أحد شیئًا فسد العقد لأن الفلوس لا تتعین فصارت دَینًا علیٰ کل أحد والافتراق عن دَین بدَین لا یجوز.

(۲) وفی المبسوط للسرخسیّ ج:۱۲ ص:۲۲۰ (طبع مکتبه غفاریه کوئٹه) ...... لأنّ الفلوس الرائجة أمثال متساویة قطعًا لإصطلاح الناس علیٰ سقوط قیمة الجودة فیها لیکون أحد الفلسین فضلًا خالیًا عن العوض.

(۴ و ۵) راجع الیٰ ردّ المحتار ج:۵ ص:۱۷۹ و ص:۱۸۰ (طبع سعید).

۱:- سو روپے والے نوٹ کو چالیس یا پچاس روپے کے بدلے فروخت کرنا

۲:- ایک ملک کی کرنسی کا دُوسرے ملک کی کرنسی کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا

۳:- ڈالر کی خرید و فروخت کا حکم

سوال ۱:- ہماری بری حکومت نے ملک برما میں استعمال کرنے کے لئے ایک سو والا نوٹ رائج کیا تھا، اب ۳ر نومبر ۱۹۸۵ء کو حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ آج سے ایک سو والا نوٹ منسوخ کر دیا گیا ہے لہٰذا آج سے پورے برما میں اس کا استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے جن جن لوگوں کے پاس ایک سو والا نوٹ موجود ہے وہ ۳۱ر دسمبر کے اندر اندر اپنے اپنے متعلقہ بینکوں میں داخل کر دیں، اس اعلان کے دو دن بعد یہ اعلان ہوا کہ ایک گھرانے کا صرف ایک ہی فرد ایک ہی مرتبہ بینک میں داخل ہوسکے گا اور جتنی رقم داخل کی جائے گی پانچ ہزار روپے تک فوراً تبدیل کر کے دے دیئے جائیں گے اور پانچ ہزار سے زائد ہوگا تو اس میں سے پچاس فیصد فوراً دیا جائے گا اور باقی پچاس فیصد پھر بعد میں تحقیق و تفتیش کے بعد واپس تبدیل کر کے دینے کے قابل ہوئے تو دے دیا جائے گا، ورنہ حکومت اس رقم کو ضبط کر لے گی۔ اس اعلان کے بعد ایک سو والے نوٹ کی خرید و فروخت شروع ہوگئی، اس طرح سو کا نوٹ چالیس، پچاس روپے میں بکنے لگا، کیونکہ جن لوگوں کے پاس لاکھوں کی تعداد میں سو کا نوٹ جمع ہے ان کو خطرہ ہوگیا کہ اگر زیادہ تعداد میں روپیہ جمع کیا جائے تو کہیں قانون کی زد میں نہ آجائے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس طرح سو کا نوٹ کمی بیشی کے ساتھ بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال ۲:- ایک ملک کے مروّجہ روپے کا دُوسرے ملک کے مروّجہ روپے سے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً ایک شخص پاکستان میں دُوسرے شخص کو پاکستانی سو روپے دیدے تو وہ شخص ملک برما میں دو سو برمی روپے اس کے بدلے میں دے تو یہ کمی بیشی جائز ہے یا نہیں؟

سوال ۳:- بہت سے لوگ ڈالر کی خرید و فروخت کرتے ہیں، شرعاً اس کا حکم کیا ہے؟

جواب ۱:- سو روپے کے نوٹ کو چالیس یا پچاس روپے میں خریدنا جائز نہیں،[۱] کیونکہ آج کل یہ نوٹ فلوس کے حکم میں آگئے ہیں اور بیع الفلس بالفلسین امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر مطلقاً اور شیخینؒ کے قول پر غیر معین ہونے کی صورت میں ناجائز ہے،[۲] اور فتویٰ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہے،[۳] لہٰذا نوٹوں کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں۔ اور جو حضرات نوٹوں کو فلوس کے بجائے دَین کی رسید قرار دیتے ہیں، ان کے قول پر بھی یہ بیع الکالیٔ بالکالیٔ ہونے کی بناء پر ناجائز ہوگی،[۴] لہٰذا سوال میں جو معاملہ مذکور ہے وہ کسی بھی طرح شرعاً جائز نہیں ہے۔[۵]

البتہ اگر اپنی مالیت کے نقصان سے بچنا ہو تو اپنے سو روپے کے نوٹ ایسے شخص کے ہاتھ سو ہی روپے میں فروخت کیے جائیں جس کے پاس پانچ ہزار سے کم نوٹ ہوں، تاکہ وہ یہ نوٹ بینک میں داخل کر کے متبادل نوٹ یقینی طور پر وصول کر سکے۔

جواب ۲:- مختلف ملکوں کی کرنسیوں کا کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے،[۶] بشرطیکہ کم از کم ایک فریق اپنے روپے پر مجلسِ بیع ہی میں قبضہ کرلے، لئلا یکون افتراقًا عن دَین بدَین۔

جواب ۳:- ڈالر کی خرید و فروخت کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر ڈالر کو ڈالر سے بیچا جائے تو مساوات ضروری ہے، اور اگر کسی اور ملک کی کرنسی سے بیچا جائے تو کمی بیشی جائز ہے،[۷] بشرطیکہ کم از کم ایک فریق أحد العوضین پر مجلسِ بیع ہی میں قبضہ کرلے۔[۸]

اگر مختلف ملکوں کی کرنسیوں کو سرکاری سطح پر مقرّر کردہ نرخ کے مطابق فروخت کیا جائے تو نمبر۲ و نمبر۳ میں ذکر کردہ تفصیل کے مطابق بیع بالکل جائز ہوگی، لیکن اگر اس نرخ سے کم و بیش نرخ مقرر کیا جائے تو اس میں تفصیل ہے کہ اگر ملک ایسا ہے کہ جہاں سرکاری طور پر مقرّر کردہ نرخ کی مخالفت قانوناً جائز نہیں ہے تو وہاں اس نرخ سے کمی بیشی کرنا سود تو نہیں ہوگا لیکن ملکی قوانین کی مخالفت[۹] اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کی بنا پر جائز نہیں ہوگا۔[۱۰]

واللہ اعلم

۱۴۰۶/۶/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۶۷۰/۳۷ ب)

(۱ و ۲ و ۳) فی الهداية ج:۳ ص:۸۵ (طبع رحمانيه) ويجوز بيع الفلس بالفلسين بأعيانها عند أبى حنيفة وأبى يوسف وقال محمد لا يجوز لأن الثمنية تثبت باصطلاح الكل فلا تبطل باصطلاحهما واذا بقيت اثمانا لا تتعين فصار كما اذا كان بغير اعيانهما.....اھ

(۴ و ۵ و ۶ و ۷ و ۸) فی المستدرک للحاکمؒ: ج:۲ ص:۶۵ و ۶۶ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) "عن ابن عمر رضى الله عنهما أن النبى صلى الله عليه وسلم نهٰى عن بيع الكالئ بالكالئ." رقم: ۲۳۴۲. "عن ابن عمر رضى الله عنهما عن النبى صلى الله عليه وسلم أنه نهٰى عن بيع الكالئ بالكالئ هو النسيئة بالنسيئة" رقم: ۲۳۴۳. والله اعلم.

(۹) "يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ" سورة النساء آیت:۵۹۔ نیز دیکھئے ص:۹۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

(۱۰) فی القرآن الكريم: "وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" سورة البقرة آیت:۱۹۵۔

مختلف ممالک کی کرنسی کے باہمی تبادلے کا حکم

سوال:- ایک ملک کی کرنسی کو دُوسرے ملک کی کرنسی کے مقابلے میں بیچنے اور شرحِ تبادلہ کے بارے میں حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- ایک ملک کی کرنسی کو دُوسرے ملک کی کرنسی سے بیچنا جائز ہے اور دونوں کے درمیان جو شرحِ تبادلہ باہمی رضامندی سے طے ہوجائے اس کا لین دین دُرست ہے۔

واللہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۸ھ

چیک سے سونا چاندی کی خرید وفروخت سے متعلق "تکملة فتح الملهم" کی ایک عبارت کی توضیح وتصحیح

سوال:- من العبد عبدالقادر العارفی عفی عنه، الیٰ سماحة أستاذی وشیخی العلّامة العثمانی حفظه الله ورعاه، السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته!

أرجو الله العلی القدیر لکم الصّحّة والعافیة الدائمة التامّة کما أدعوه تعالیٰ أن یبقیکم ذخرًا للاسلام والمسلمین ویرزقکم صحّة وعافیة دائمة، وأنا بخیر والحمدلله.

أستاذی المؤقر! أنا تلمیذکم من ایران، قد زرتکم بدار العلوم قبل خمسة أیّام بعد العصر ثم فی یوم الأربعاء صاحبتکم لصلاة الظهر بخارج دار العلوم فی معمل یقع أمام باب دار العلوم، وتکلّمت حول بعض المسائل ومنها: شراء الذّهب والفضّة نسیئة، وأیضًا شراء الذّهب والفضّة ودفع الشیک المصرفی بدل ثمنها؟ فأجبتمونی بأن هاتین المسئلتین جائزتان ولا غبار علیٰ جوازهما. ولٰکن جاء فی التکملة ۱/۵۱۵ فی مبحث الشیک المصرفی هٰکذا ولا یجوز اشتراء الذّهب والفضّة به لفقدان التقابض فی المجلس.

أرجو منکم الافادة ولکم الشکر الجزیل، وألتمس منکم الدُّعاء

تلمیذکم عبدالقادر العارفی
جامعه دارالعلوم أهل السُّنّة
خیابان خیام، مسجد مکی، زاهدان
بلوچستان، ایران

جواب:- عزیز گرامی قدر مولانا عبدالقادر عارفی صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ ملا، آپ نے واقعتاً بہت صحیح بات کی نشان دہی فرمائی۔ تکملة فتح الملهم

(ج:۱ ص:۵۱۵) پر میں نے جولکھا ہے کہ:"ولا یجوز اشتراء الذّهب والفضّة به لفقدان التقابض فی المجلس" اس میں احقر سے غلطی ہوگئی ہے، دراصل یہ حکم اس وقت تھا جب نوٹ یا سکے چاندی سونے کی نمائندگی کرتے تھے، لیکن اب جبکہ نہ سکہ چاندی سونے کا ہے، نہ نوٹ کی پشت پر چاندی سونا ہے، اور چیک نوٹ ہی کے جاری ہوتے ہیں اور سونے چاندی کی خرید وفروخت نوٹوں سے ہوتی ہے تو چیک سے سونے چاندی کی خرید وفروخت جائز ہے، کیونکہ وہ صَرف نہیں، اور تقابض شرط نہیں، کما أوضحته فی أحکام الأوراق النقدیة۔[1] چنانچہ "تکملة فتح الملهم"[2] میں تصحیح کردی گئی ہے۔

جزاکم الله تعالیٰ خیرا۔

والسلام

۱۴۱۹/۱/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۵۱/۳۰۹)

جیولری کے کاروبار اور سونے کی خرید وفروخت کے بارے میں اہم نوعیت کے مختلف سوالات کے جوابات (عربی فتویٰ)

سوال:- صاحب الفضیلة الشیخ مولانا محمد تقی العثمانی حفظه الله وأدام ثوابه

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته وبعد.

أسأل الله سبحانه وتعالیٰ أن یدیم علیکم نعمة العفو والعافیة وأن یحفظکم وآل بیتکم من کل سوء ومکروه، وأن یجزیکم عنا وعن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء، انه سمیع مجیب.

صاحب الفضیلة: سبب کتابتی هذه الرسالة الیٰ فضیلتکم کثرة السؤال عن بعض المعاملات التجاریة فی مجال بیع الذّهب والفضّة، ولا یخفی ما لفضیلتکم من باع طویل فی الدراسات الفقهیة، لا سیما الاقتصادیة منها، فأحببت أن أفید نفسی وغیری ناهلًا من عذبکم الفیاض، مسترشدًا بآرائکم القیّمة، آملًا عظیم الأجر لکم عند الله، راجیًا أن یعین ذلک السائلین علی السیر علی الصراط المستقیم.

صاحب الفضیلة: من المعاملات التی کثر عنها السؤال ما یأتی:

۱- زید تاجر ذهب فی المدینة المنوّرة یصنع مصوغاته لدی مصنع فی جدة، فیحتاج الیٰ شراء سبائک من الذهب بوزن (۱,۰۰۰) جم، فیتصل بالبنک أو بتاجر جملة للذّهب (بکر) لشراء الذّهب فیخبر بأن سعر الکیلو یساوی (۴۲,۰۰۰) ریال، فیطلب زید من

---

(۱) أحکام الأوراق النقدیة ص:۱۵۵ تا ۱۵۹۔

(۲) ج:۱ ص:۵۱۵ (طبع مکتبه دارالعلوم کراچی).

بکر أن یحجز له کمیة من الذّهب بالسعر المذکور ثم یبعث بالقیمة عن طریق الحوالة (بالکمبیوتر) فاذا استلم البائع المبلغ سلم الذّهب للمصنع.

۲- المعاملة الأُخریٰ والتی تسمّی بـ (الشراء علی السعر المفتوح) وصورتها کالتالی:

زید المرید شراء الذّهب عند ما أراد شراءه وکان یتوقع سعر الکیلو یساوی (۴۲,۰۰۰) ریال، وجد أن سعر الذّهب ارتفع فجاءة الیٰ (۴۴,۰۰۰) ریال، وهو یتوقع نزول السعر عمّا قریب، لکنه بحاجة الی الذّهب فیتفق مع بکر علیٰ أن یشتری منه الذهب ویرسل له المبلغ وقدره (۴۲,۰۰۰) ریال، علیٰ أن یبقی السعر مفتوحا، فاذا نزل السعر بعد فترة قفل السعر، وهنا یرد احتمالان:-

الاحتمال الأوّل: أن یرتفع السعر أکثر، ولنفترض أنه وصل الیٰ (۴۵,۰۰۰) ریال فیطلب البائع فرق السعر، فیضطر المشتری الی الدفع، وهو بعد ذٰلک بالخیار بین أن یقفل السعر بالسعر الحالی، أو ینتظر نزول السعر ویستمر علیٰ تلک الحالة.

الاحتمال الثانی: أن ینزل السعر الیٰ أدنی من (۴۲,۰۰۰) ریال، ولنفترض أنه وصل الیٰ (۴۱,۰۰۰) ریال فیطلب المشتری من البائع قفل السعر، فیقفل البائع السعر، ویرد له المبلغ المتبقی.

۳- یتعامل بعض الناس (بالشراء علی المفتوح) السابق الذکر لا لقصد شراء الذّهب نفسه، ولٰکن بقصد الاستثمار، وقصدهم من ذٰلک أن یشتروا الذّهب بسعر یومه، ولنفترض أنه (۴۲,۰۰۰) ریال، ثم اذا ارتفع السعر باعوه، لکن هٰذه المعاملة تبقی من حیث البیع والشراء الفعلی علی الورق فقط، اذ لا یکون فیه استلام ولا تسلیم لأنه غیر مقصود بذاته، بل المقصود هو الاستثمار فقط، وان کان البائع یلتزم بالبیع الفعلی وتسلیم الذّهب للمشتری لو طلب منه ذٰلک، وفی هذه المعاملة أمر آخر کذٰلک وهو أن البائع یتیح الفرصة للمستثمرین باستثمار کمیة کبیرة من الذّهب بمبلغ قلیل وعلیٰ سبیل المثال: یمکن للمستثمر أن یشتری ۱۰ کیلو جرام من الذّهب والذی یبلغ قیمته افتراضًا (۴۲۰,۰۰۰) ریال علیٰ أن لا یدفع سوی ۲۰٪ من قیمة الصفقة، ویبقی التعامل کما سبق ذکره فی الصورة السابقة، وواضح أن البائع لن یسلم الذّهب للمشتری لأنّه لم یستلم کامل القیمة بل یتولّی بنفسه بیعها لیأخذ قیمتها ویدفع المکسب للمشتری الأوّل ان کان هناک مکسب، فان حصلت الخسارة فی البیع أخذه من المشتری، لأنّه بمثابة الوکیل له.

۴- وضمن هذه الصّورة صورة أُخریٰ وهی أن یقوم بکر ببیع کمیة من الذّهب لزید دون أن یکون زید قد اشتری شیئًا ولنفترض أن بکرًا باع لزید کیلو ذهب بسعر (۴۲,۰۰۰)

ريـال، رغـم أن زيدًا لا يملكـ شيئًا من هٰذا الذّهـب، ولكن بكرًا باع هٰذا من عنده له، والقصد مـن هٰـذا البيـع أن لو نزل السعر فيما بعد فان زيدًا يشترى الذهب ويرده لبكر، فاذا زاد السعر خلاف المتوقع فان زيدًا سيخسر فرق السعر وان نزل السعر كسب بقدره.

ويـبـقـى أن أوضـح لـفضيلتكم أن بكرًا يستفيد من عمليتى البيع والشراء دلالة، وانه يـحتفظ بمبلغ من المال أكثر من المنصرف فى البيع والشراء تحاشيًا للخسارة فى حالة ما اذا تقاعس زيد عن تحمل الخسارة ان وجدت خلال عمليتى البيع والشراء.

۵- بيـع آخـر وهـو أن يـحتـاج الـمـرء لشراء الذّهب عندما يكون السعر ٤٠,٠٠٠ (أربـعـين ألف) ريال، فيبيع عليه تاجر الجملة بسعر ٤٥,٠٠٠ (خمسة أربعين ألف) ريال علىٰ أن يسدد له المبلغ بعد مدة (قد تطول الىٰ سنة).

هـٰذا وأرجـو من فضيلتكم التفضل بالاجابة عليها مدعما بالأدلّة، ولو لا يقيني بوقف حياتكم الكريمة فى خدمة الاسلام والمسلمين لما تجرأت بالكتابة الىٰ فضيلتكم لما أعلم من كثرة مشاغلكم والمسئوليات المنوطـة بفضيلـتكم، الا أن شدة حاجة الناس الىٰ ايجاد حل شـرعـى لهٰـذه المعاملات التى هم واقعون فيها شجعنى الى الكتابة اليكم، فأرجو قبول عذرى فى الكتابة، وقبول رجائى فى الاجابة.

أثابكم الله علىٰ ما تقومون به من خدمات الجليلة للاسلام والمسلمين، وجعل ذٰلكـ فى ميزان حسناتكم يوم الدِّين، ويوفقنى واياكم للعمل علىٰ نهج سيّد المرسلين.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

تلميذكم / محمد يعقوب محمد يوسف الدهلوى

۲۱/صفر ۱٤۱۸ھ المدينة المنوّرة

جواب:- الـى الأخ الـعـزيـز فـى الله السيّد محمد يعقوب محمد يوسف الدهلوى، حفظه الله تعالىٰ.

انـى أحـمـد الـيـكـم الله الـذى لا الٰـه الّا هـو، وأصلّى وأسلّم علىٰ نبيّه الكريم الهادى الأمين، وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين، وبعد:

فـلا أدرى كيف أعبّر عن ندمى فى التأخير فى الاجابة علىٰ أسئلتكم الكريمة، وليس لـى الّا أن أطـلـب مـنـكـم الـعـفـو والمعذرة فى ذٰلكـ، وأرجوكم أن تعذُرونى بسبب ازدحام الأشغال وتتابع الأسفار الذى أعانيه كلّ حين.

واليكم الجواب عن الأسئلة:

۱- هـٰذا الـطـريق للتعامل فى شراء الذّهب سليم من النّاحية الشّرعية، فان الاتصال بتـاجـر الـذّهب بجدّة وطلب حجز كمية من الذّهب ليس إلّا مساومة، والحجز التزام أو وعد

من قبل التاجر بأنه سيبيع هٰذا الذّهب عندما يتسلّم ثمنه، أمّا عقد البيع فانه يقع بعد ما يحوّل زيد ثمن الذّهب الىٰ حساب التّاجر، وفي الوقت نفسه يسلم التّاجر الذّهب الى المصنع، ولئن كان هناك فصل بين تسلّم الثمن وتسليم الذّهب، فالثمن يكون أمانة بيد التّاجر الىٰ أن يسلّم الذّهب الى المصنع، وحين يسلّم الذّهب اليه، فإن الأمانة تنقلب ثمنًا، وبهٰذا تصحّ المعاملة، حتّى علىٰ قول من يشترط التقابض في المجلس في مبادلة الذّهب بالأوراق النقدية،[١] أمّا علىٰ قول من يقول: انّ مبادلة الذّهب بالنقود الورقية ليست صرفًا،[٢] ولا يشترط فيها التّقابض، فلا اشكال أصلًا، وإن هٰذا القول هو الراجح عندي،[٣] وعند أغلبية علماء الهند وباكستان.

٢- الشّراء على السّعر المفتوح" كما شرحتموه في السؤال الثّاني، لا يجوز أصلًا لأنّ هٰذا البيع فيه غررٌ بجهالة الثّمن عند العقد، ولا يقاس جوازه علىٰ جواز البيع بما ينعقد عليه السّعر (كما أجازه الحنابلة وبعض الحنفية) لأنّ المراد من السّعر هناك سعر السّوق يوم العقد، أما في صورتنا المسئول عنها، فانّ المراد من السّعر ليس السّعر يوم العقد، وانّما المراد السّعر الذى تنتهي اليه السّوق بعد العقد الىٰ مدّة مجهولة، فلا شكّ في أنّ هٰذه الجهالة مفسدة للعقد، ولا يجوز البيع بهٰذا الطريق.

٣- انّ هٰذه الصّورة أشدّ حرمة، لأنه قد ازداد فيها محظور آخر غير الجهالة والغرر، وهو أنه ليس هناك بيع حقيقي يراد به التّسليم والتّسلّم، وانّما المقصود دفع فروق الثّمن، فهو أشبه بالمضاربة القمارية الرائجة في البُرصات، ولا يجوز بحال.

أمّا الصّورة الأخرى الّتي ذكرتموها في هٰذا السؤال، وهو أن البائع يتيح الفرصة للمستثمرين باستثمار كمية كبيرة من الذّهب بمبلغ قليل ... الخ، فان كان هٰذا علىٰ أساس السّعر المفتوح، فهو غير جائز كما بيّنا، أمّا اذا كان السّعر معلومًا متعيّنًا عند الشّراء، ولٰكن انما يدفع المشتري ٢٠٪ من الثّمن فقط، فلا يجوز عند من يشترط التقابض في شراء الذهب بالنقود الورقية. أما على القول الآخر، وهو عدم اشتراط التقابض في مبادلة الذّهب بالنّقود الورقية، وهو الراجح عندي، فانّما تجوز هٰذه المعاملة بشروط تالية:

(ألف)- أن يقع البيع باتًّا، ويكون الثّمن متعيّنًا غير مذبذب.

(ب)- أن يخلّي البائع بين الذّهب والمشتري، بحيث يمكن للمشتري أن يقبض الذّهب المبيع متىٰ شاء.

(ج)- أن يوكّل المشتري نفس البائع ببيع ذٰلك الذّهب نيابة عنه بعد التّخلية، ويجب أن لا يكون هٰذا التوكيل مشروطًا في عقد البيع.

(د)- أن يكون الذّهب المبيع مفصولًا عن غير المبيع، ويكون في ضمان المشتري،

(١ إلى ٣) راجع لتفصيل هذين المسلكين ودلائلهما إلى ص: ١٤١ إلى ص: ١٤٥ مع هوامشه.

بحيث إن هلك أو سُرِق فانه يهلك من مال المشترى، وليس من مال البائع.

وانما تشترط هٰذه الشروط فى ۸۰٪ من المبيع الّذى لم يدفع المشترى ثمنه، لئلّا يكون بيع الكالئ بالكالئ. أمّا ۲۰٪ من الذّهب المبيع الّذى دُفع ثمنه، فيصحّ فيه التّوكيل وان لم يقع الفصل والتّخلية، لأنّه لا يشترط قيام الأثمان فى ملك البائع أو فى قبضه عند العقد، كما فى مبسوط السرخسى ۱۴: ۲۴.

۴- الظّاهر من قولكم: "لو نزل السّعر فيما بعد، فان زيدًا يشترى الذّهب ويرده لبكر" أنّ الذّهب الّذى يبيعه بكر لزيد، فكأنّما يقرض بكرٌ زيدًا هٰذا القدر من الذّهب، ثمّ يوكّله زيد ببيعه نيابة عنه، فان كان هٰذا هو المقصود فانّ ذٰلك جائز بشرط أن يلتزم زيد أنه يرد عين ذٰلك المقدار الىٰ بكر سواء أنزل السّعر أم ارتفع، فمثلًا: يستقرض ۱۰۰۰ غرام من الذهب من بكر، ويلتزم ردّ ۱۰۰۰ غرام من الذّهب علىٰ سبيل القرض (دون البيع) ثمّ يوكله ببيع هٰذا الذّهب نيابة عنه دون أن يشترط التوكيل فى عقد الإقراض، وفى النهاية يردّ علىٰ بكر ألف غرام من الذهب، سواء أنزل السِّعر أم ارتفع، وفى هٰذه الحالة يجوز لبكر أن يطالب عمولة علىٰ خدماته كوكيل للبيع، ويجب أن تكون هٰذه العمولة مساوية لأجر مثل هٰذه الخدمات فى السّوق، ولا يزاد علىٰ أجر المثل لئلا يكون قرضا جرّ نفعا. وما ذكرتم من أن "بكرًا يستفيد من عمليتى البيع والشراء دلالةً .... الخ" ان كان المقصود منه أنه يتقاضى أجرة السمسرة فى عمليتى البيع والشراء، فقد ذكرت أن أجرة السمسرة انما تجوز علىٰ عملية البيع بالنيابة عن زيد. أمّا إقراض الذّهب كما ذكرت او بيع الذّهب الىٰ بكر فلا يجوز تقاضى الأجر عليه، وان كان المقصود غير ذٰلك فالمرجو الايضاح، فانى لم أفهم كلامكم هٰذا حق الفهم.

۵- هٰذا لا يجوز عند من يشترط التقابض فى مبادلة الذّهب بالعُملة الورقية، ولكن يجوز عند من لا يشترط ذٰلك، وهو الراجح عندى بشرط أن تكون مدّة التسديد معلومة عند العقد، أما الأدلة فقد بسطتها فى كتابى "أحكام الأوراق النقديّة". والخلاصة أن النّقود الورقيّة ليست أثمانا خلقيّة وانما هى أثمان اعتبارية، فهى بمنزلة الفلوس، فيجرى فيها حرمة التفاضل فيما بينها اذا كانت من جنس واحد، ولكن لا تجرى أحكام الصّرف فى مبادلة الذّهب بها، كما أنها لا تجرى فى مبادلة الفلوس بالذّهب. والله سبحانه وتعالىٰ أعلم وعلمه أتمّ وأحكم، وأرجو أن فى هٰذا الجواب كفاية، فان كان لديكم مزيد من الاستيضاحات، فالمرجو الاستفسار مرّة ثانية.

والله تعالىٰ هو الموّفق!

۱۴۱۸/۳/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۶/۴۶)

عالمی مارکیٹ میں کرنسی کے کاروبار کا طریقۂ کار اور اس کی شرعی حیثیت

(کمپنی کے ذریعے ڈالرز کی مخصوص مقدار کی لاٹ خرید کر کرنسی کے کاروبار کی شرعی حیثیت)

سوال:- عرض ہے کہ میں کرنسی کا کاروبار کرتا ہوں، جس کی نوعیت اس طرح سے ہے کہ امریکا سے پوری دُنیا میں مختلف ممالک کے کرنسی نوٹوں کی قیمتوں کا اجراء ہوتا ہے، ہم لاہور میں بیٹھ کر سیٹلائٹ کے ذریعے کمپیوٹر اسکرین پر وہ قیمتیں وصول کرتے ہیں، قیمتیں ملکی حالات کی وجہ سے کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہیں، ہم ان قیمتوں پر کرنسی کی خرید و فروخت کرتے ہیں، جس کا طریقہ اس طرح سے ہے کہ ہم براہِ راست کرنسی کی خرید و فروخت نہیں کرسکتے بلکہ ایک کمپنی کے ذریعے یہ کاروبار کرتے ہیں، انہوں نے ایک اُصول وضع کیا ہوا ہے، وہ یہ کہ دو لاکھ ڈالرز کی ایک لاٹ ہوتی ہے، جو آدمی خرید کر پھر اُس کو فروخت کرسکتا ہے، لیکن ہمیں صرف اس کا پانچ فیصد کمپنی کو اپنے نام پر جمع کروانا ہوتا ہے، جو کہ صرف ایک ہزار ڈالرز بنتا ہے، ایک ہزار ڈالرز سے اپنا اکاؤنٹ کھلوا کر اب ہم اس قابل ہیں کہ دُنیا کی مارکیٹ میں ہم ایک لاٹ خرید سکتے ہیں، ہماری طرف سے بقیہ رقم بطور زرِ ضمانت کمپنی جمع کرواتی ہے، اس طرح ہمارا بظاہر ایک ہزار ڈالرز کی سرمایہ کاری ہوئی، لیکن ہم کاروبار دو لاکھ ڈالرز کا کر رہے ہوتے ہیں، یعنی ہم دو لاکھ ڈالرز کی کرنسی کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ اب ہمیں نفع یا نقصان کیسے ہوتا ہے؟ اس کی صورت یہ ہے کہ ہم کمپیوٹر اسکرین پر دُنیا کے مختلف بینکوں کی طرف سے دی گئی قیمتوں کا جائزہ لیتے ہیں، کرنسی کے ماہرین اپنی رائے دیتے رہتے ہیں کہ آیا یہ کرنسی آئندہ قیمت میں بڑھ جائے گی یا کم ہوجائے گی، آپ کے علم میں ہوگا، بہرحال اگر مزید کسی بات کی وضاحت درکار ہو تو میں حاضر ہوں، لیکن اس خط و کتابت میں وقت لگ جائے گا۔ مجھے اس کے متعلق چند گزارشات سے مطلع فرمائیں:-

۱- کیا یہ سارا کاروبار ناجائز ہے یا اس کی کچھ جزئیات؟

۲- اگر کچھ جزئیات ناجائز ہیں تو ان کی مختصر وضاحت فرمائیں۔

۳- کس طریقے سے یہ کاروبار جائز ہوسکتا ہے؟

اس کے علاوہ ہمیں کرنسی کے متعلق مختلف ملکوں کی خبریں بھی وصول ہوتی رہتی ہیں، اور پھر کمپیوٹر پر ہی مختلف گراف کے ذریعے اُس کرنسی کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں کہ آئندہ لمحات میں اس کرنسی کی کیا صورتِ حال ہوگی۔ تو ان تمام قرائن کے ذریعے ہم ایک رائے قائم کر کے اس کو خرید

لیتے ہیں، مثلاً اسکرین پر ہمیں پاؤنڈ اسٹرلنگ کی قیمت 1.6700 نظر آرہی ہے، ہم کمپنی کے ذریعے بذریعہ ٹیلی فون اُس بینک سے اس قیمت کی تصدیق کرواتے ہیں کہ آیا آپ کی قیمتِ فروخت یہی ہے؟ وہ ہمیں اس قیمت کے معمولی فرق کے ساتھ قیمت بتاتے ہیں، تصدیق کے بعد ہم پہلے ان سے زبانی معاہدہ کرتے ہیں کہ ایک لاٹ ہم نے خریدلی، پھر اس معاہدے کو تحریری طور پر لکھ کر بذریعہ فیکس اُن تک پہنچاتے ہیں، اب یہ لاٹ ہم نے خریدلی، اور یہ ہماری ہوگئی، اب ہمیں ہر صورت میں اس کا نفع یا نقصان اُٹھانا ہوگا، اس خریداری میں اُس کرنسی پر حسی قبضہ تو ہوا نہیں، اور نہ ہی ہوسکتا ہے، اس لئے کہ وہ کرنسی ہمارے ضمان (رِسک Risk) میں آگئی، اب جب اُس کرنسی کی قیمت بڑھ گئی تو اسی طریقے پر بذریعہ ٹیلی فون ہم نے اس کو فروخت کردیا، مثلاً اگر 1.6700 پر خریدا اور 1.6710 پر اُس کو فروخت کردیا، اور اس قیمتِ خرید کا بھی تحریری معاہدہ ہوگیا، یہ جو 10 اعشاریہ ہمیں نفع میں بچے اس کی قیمت 125 ڈالرز ہوئی، وہ اس طرح کہ انہوں نے ایک پوائنٹ کی قیمت 12.50 ڈالرز طے کی ہوئی ہے، اس طرح 10 پوائنٹ کی 12.50 x 10 = 125 ہوئی جو ہمارا نفع ہے، اگر کرنسی کی قیمت کم ہوجائے تو اس شرح سے ہمیں نقصان اُٹھانا پڑے گا، قبضے کی صورت کا جو حوالہ میں نے عرض کیا ہے وہ آپ کی کتاب ''شیئرز کی خرید وفروخت'' میں سے اخذ کرکے لکھا ہے۔

کمپنی کا مفاد:- کمپنی ہمیں کاروبار کروانے کے لئے یہ ساری سہولتیں میسر کرتی ہے: ا- ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ، ۲- مارکیٹ جہاں بیٹھ کر ہم کاروبار کرتے ہیں، ۳- انٹرنیٹ سسٹم، ۴- دو لاکھ ڈالرز کا زَرِ ضمانت۔ اس کے علاوہ چند اور سہولتیں بھی۔ ان تمام سہولتوں کے ساتھ ہم ایک ٹریڈ (یعنی ایک دفعہ کرنسی کو خرید کر پھر فروخت کرنے سے ایک ٹریڈ مکمل ہوجاتی ہے) اس ایک ٹریڈ پر کمپنی ہم سے 60 ڈالرز کمیشن وصول کرتی ہے، اس ٹریڈ میں ہمیں نفع ہو یا نقصان، کمپنی کا 60 ڈالرز کا کمیشن طے ہے، یہ اُس صورت میں ہے کہ اگر ہم ایک کرنسی کو اُسی دن خرید کر فروخت کردیں، اگر آج ہم نے کرنسی خریدی ہے اور اُس کی قیمت مناسب نہیں مل رہی ہے، اُس کو ایک دن بعد یا چند دن بعد فروخت کرنا چاہتے ہیں تو کمپنی ہم سے 60 ڈالرز کے علاوہ ہر دن کے حساب سے 20 ڈالرز مزید وصول کرے گی، اس لئے کہ کمپنی کا دو لاکھ ڈالرز کاروبار میں بطور زَرِ ضمانت جمع ہوا ہے یا استعمال ہو رہا ہے، اس پر کمپنی 20 ڈالرز یومیہ وصول کرتی ہے، اگر ہم ایک ہی دن میں خرید وفروخت مکمل کرلیں تو پھر صرف 60 ڈالرز کمیشن ہی کمپنی لے گی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جواب عنایت فرمائیں۔

جواب:- کرنسی کے کاروبار کی جو تفصیل آپ نے اپنے خط میں لکھی ہے، اس تفصیل کے مطابق یہ کاروبار جائز نہیں، جس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس طرح کے کاروبار میں جب کوئی لاٹ خریدی جاتی ہے تو وہ خریدار کو متعین اور الگ کر کے حوالے نہیں کی جاتی[۱] بلکہ اس کے اکاؤنٹ میں تحریر کر دی جاتی ہے، پھر جب وہ خریدار اسے آگے کسی شخص کو فروخت کرتا ہے تو اس وقت اگر اُسے نفع ہو تو صرف نفع واپس کر دیا جاتا ہے، اور اگر نقصان ہو تو اس سے وہ نقصان طلب کر لیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ پوری خرید کردہ لاٹ تحویل میں نہیں دی جاتی بلکہ کاغذی طور پر اس کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی جاتی ہے، اور آخر میں نفع اور نقصان کا فرق برابر کر لیا جاتا ہے، جو سٹے کی ایک قسم ہے۔

۲- یہ واضح رہے کہ کرنسی کے حکمی قبضے کے لئے بھی یہ کافی نہیں ہے کہ کرنسی کی قیمت بڑھنے یا گھٹنے کا نقصان متعلقہ شخص کے ذمے ہو جائے، بلکہ قبضے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خریدی ہوئی کرنسی غیر خرید شدہ کرنسی سے بالکل ممتاز کر کے الگ کر لی جائے،[۲] اور خریدار یا تو خود قبضہ کرے یا اس کا کوئی وکیل اس کی طرف سے اسے اپنی تحویل میں اس طرح لے لے کہ وہ متعینہ کرنسی جل جائے یا چوری ہو جائے تو نقصان خریدار کے ذمے سمجھا جائے،[۳] ظاہر ہے کہ یہ صورت مذکورہ کاروبار میں نہیں کہ کرنسی کو الگ کر لیا گیا ہو، اور خریدار کے کسی نمائندے کی تحویل میں دے دیا گیا ہو۔

واضح رہے کہ شرعی اعتبار سے کرنسی اور دُوسری اجناس کی تعیین میں یہ فرق ہے کہ دُوسری اجناس اشارے یا علامتوں سے متعین ہو سکتی ہیں، لیکن کرنسی اس وقت تک متعین نہیں ہوتی جب تک کہ اس پر کوئی شخص خود یا اپنے کسی نمائندے کے ذریعے قبضہ نہ کر لے۔[۴]

۳- آپ نے جو طریقِ کار لکھا ہے، اس کی رُو سے خریدار صرف ایک ہزار ڈالرز کی ادائیگی کرتا ہے، باقی کی ادائیگی نہیں کرتا، اگرچہ باقی رقم بطور زَرِ ضمانت کمپنی جمع کراتی ہے، مگر رقم درحقیقت

(۱و۲و۳) وفی الهندیة ج:۳ ص:۱۶ ویعتبر فی التسلیم أن یکون المبیع مفرزًا غیر مشغول بحق غیره هکذا فی الوجیز للکردری، وأجمعوا علیٰ أن التخلیة فی البیع الجائز تکون قبضًا .... الخ.

وفی البدائع ج:۵ ص:۲۴۴ فالتسلیم والقبض عندنا هو التّخلیة والتخلّی وهو أن یخلّی البائع بین المبیع وبین المشتری برفع الحائل بینهما علیٰ وجهٍ یتمکن المشتری من التّصرّف فیه فیجعل البائع مسلّمًا للمبیع والمشتری قابضًا لهٗ اهـ.

(۴) وفی البدائع ج:۵ ص:۲۱۸ (طبع سعید) ان الدراهم والدنانیر وان کانت لا تتعیّن بالعقد ولٰکنّها تتعین بالقبض وقبضها واجب.

وفیه أیضًا ج:۵ ص:۲۱۹ ان الدراهم والدنانیر لا تتعین بالتعیین وانما تتعین بالقبض فشرطنا التقابض للتعیین لا للقبض.

وفی فتح القدیر ج:۶ ص:۱۶۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) فان الدّراهم والدنانیر لا تتعیّن مملوکة بالعقد الّا بالقبض الخ.

وفی المحیط البرهانی ج:۸ ص:۵۷ و ۶۷ (طبع رشیدیه کوئٹه) انّ الدّراهم والدّنانیر أن کانا لا یتعیّنان فی عقود المعاوضات یتعیّنان عند القبض، فینعقد العقد فیما بین المتعاقدین فی الحال مفیدًا الملک عند التعیین بالقبض الخ.

خریدار کے ذمے دَین ہوتی ہے۔

دُوسری طرف کرنسی بیچنے والا خریدار کو اس شرعی طریقے پر قبضہ نہیں دیتا جس کا ذکر اُوپر نمبر۲ میں کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ رقم دونوں طرف دَین ہوتی ہے، لہٰذا یہ بیع الکالی بالکالی میں داخل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔[1]

۴- درمیانی کمپنی جو کمیشن وصول کرتی ہے وہ یا تو ضمانت کی فیس ہے یا اس رقم کا معاوضہ ہے جو وہ خریدار کی طرف سے بیچنے والے کو اَدا کرتی ہے، پہلی صورت میں یہ "أجرت علی الکفالۃ" ہے اور دُوسری صورت میں یہ قرض پر سود ہے، اور دونوں طریقے ناجائز ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۲۰/۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۶/۳۶۳)

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے اور "نوٹ" کے بدلے سونے چاندی کی نقد اور اُدھار خرید وفروخت کا حکم

سوال:- الیٰ فضیلة الأستاذ القاضی مولانا محمد تقی العثمانی حفظه الله تعالیٰ ورعاه

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته، نتمنّٰی أن تکونوا بالصّحّة والعافیة وأن یجعلکم الله تعالیٰ علی الخیر فی الدارین وبعد:

أستاذنا الفاضل: نشتغل بتجارة بضاعة الزینة مصنوع من الفضّة بیعًا وشراءً، فی بلدنا أکثر التجارة یدور بالشّیک والسند موقوتًا وغیر موقوت، وأحیانًا دون الشّیک أی یدفع فی المستقبل بدون تعیین الوقت فی أثناء البیع. هٰکذا کُنّا نستمر بالتّجارة الیٰ أن نسمع أن بیع الفضّة والذّهب أو بضاعة الزینة مصنوع من الفضّة والذّهب لا یجوز بالشّیک والسند موقوتًا لا بد من دفع النّقود فی أثناء القبض. فنحن المسلمون ینبغی علینا أن نعیش بأحکام الشرعیة فی أمورنا الدنیویة من أجل ذٰلک ذهبنا الیٰ علمائنا الأتراک وسألنا عن المسئلة، بعضهم أجابوا بالجواز، لأن الفضّة فقدت کیفیة النقد وکأنها صارت کالبضاعة والسلعة. والآخرون قالوا لا یجوز بیع الموقوت ولو کان بالشّیک والسند، لأنّ فیه نص یحرمه.

بین هٰذین جوابین تحیّرنا وتعجّبنا، حتّی بعض مِنّا بدأنا أن نغیر عملنا ونبحث عن

---

(۱) عن ابن عمر رضی الله عنهما أن النبی صلی الله علیه وسلم نهیٰ عن بیع الکالی بالکالی هو النسیئة بالنّسیئة.
(مستدرک للحاکم ج:۲ ص:۶۵ و ۶۲ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) رقم الحدیث: ۲۳۴۲، ۲۳۴۳).
وشرح معانی الآثار ج:۴ ص:۲۱.

عمل جديد لنجتنب عن الشبهات ولنطمئن من كسبنا، وأنا منهم.

الرجاء من فضيلتكم توضيح مشكلتنا وتبيين الحقيقة عند الشرع، لو فضلتم جوابكم بالفاكس سريعًا فيكون أحسن.

بارك الله فيكم وجزاكم الله خير الجزاء في الدارين. بمناسبة شهر رمضان والعيد المبارك كل عام وأنتم بخير، تقبل الله طاعتنا، في أمان الله، والسلام عليكم.

جواب: – الى الأخ العزيز الأستاذ خيرالدين شاهين

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته!

أما الذّهب سواء كان تبرًا أو مصوغًا فقد أجمع الأئمّة الأربعة علىٰ أنه لا يعامل معاملة البضائع، وانما يعمل أحكام النّقود في جميع الأمور، لكن "الأوراق النّقدية" قد وقع فيه خلاف بين العلماء المعاصرين، وان كثيرًا من علماء البلاد العربية جعلوها في حكم الذّهب سواء بسواء، ولكن خالفتهم في رسالتي "أحكام الأوراق النّقدية" وذكرت أنها ليست قائمة مقام الذّهب في جميع الأمور، فلا تجرى فيها أحكام الصّرف، ولذٰلك يجوز عندى أن يشترى الذّهب أو الفضّة بالنّقود،[1] ويجوز أيضًا أن يشترى الذّهب نسيئة بالأوراق النقدية، ولكن يجب أن يكون تقابض أحد البدلين في المجلس اذا كان ذهبا خالصا، وأن يُعرف الأجل عند العقد وقد قبل هذا الموقف معظم علماء الهند وكثير من باكستان، والتفصيل في رسالتي "أحكام الأوراق النّقدية".[2]

أما كون الذّهب والفضّة فقدا صفة النقدية، فهٰذا غير مسلّم حتّى الآن.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

محمد تقى العثمانى

بقلم: عبدالله ميمن

۱۴۲۱/۹/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۴۸/۴۵۹)

---

(۱) وفى المبسوط للسرخسىؒ ج:۱۴ ص:۲۵ وان اشترىٰ خاتم فضّة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلوسًا وليست الفلوس عنده فهو جائز ان تقابضا قبل التّفرق أو لم يتقابضا لأنّ هٰذا بيع وليس بصرف فانّما افترقا عن عين بدين لأنّ الختام يتعين بالتّعيين بخلاف ما سبق فانّ الدّراهم والدّنانير لا يتعين بالتّعيين فلهٰذا شرط هناك قبض أحد البدلين فى المجلس ولم يشترط هنا.

وفى الهندية ج:۳ ص:۲۲۴ وان اشترىٰ خاتم فضّة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلسًا وليست الفلوس عندهٗ فهو جائز تقابضا قبل التّفرق أو لم يتقابضا لأنّ هذا بيع وليس بصرف.

وكذا فى ردّ المحتار ج:۷ ص:۴۱۴.

وفى البحر الرّائق ج:۶ ص:۱۹۴ (طبع سعيد) وقيد بالذّهب والفضّة لأنه لو باع فضّة بفلوس أو ذهبًا بفلوس فانه يشترط قبض أحد البدلين قبل الافتراق لا قبضهما، كذا فى الذخيرة.

وفى الهندية ج:۳ ص:۲۲۴ ولو باع تبر فضّة بفلوس بغير أعيانها وتفرقا قبل أن يتقابضا فهو جائز.

(۲) راجع للتفصيل اليه ص:۱۵۵ الى ۱۵۹.

سونے کا زیور فروخت کرنے میں ٹانکے اور سونے کی مجموعی یا الگ الگ قیمت لگانے کا حکم

سوال:- زرگروں کی کمائی حلال ہے یا حرام؟ جبکہ ان کے اُصول مندرجہ ذیل ہوں، ۱-سونا اور چاندی اصلی لگاتا ہو، ۲-نہایت قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ زرگر جب کوئی زیور بناتا ہے تو اس کو جوڑتے وقت اس میں ٹانکے لگاتا ہے، یہ بھی سونا ہوتا ہے، مگر بہت خراب، بغیر اس کے زیور کو جوڑ نہیں لگتا، جیسے موٹر وغیرہ کو ٹانکہ لگایا جاتا ہے، اور اس ٹانکے کی قیمت بھی ہم اصل سونے کے حساب سے لیتے ہیں، اور جب گاہک دوبارہ واپس دینا چاہتا ہے تو ہم اس ٹانکے کی قیمت اصل سونے کی نہیں دیتے، صرف اصل سونے کی قیمت ان کو دیتے ہیں۔

جواب:- بیچنے والے کو شرعاً اِختیار ہے کہ وہ اپنی مملوک چیز جس قیمت پر چاہے فروخت کرے،[1] لہٰذا اگر کوئی زرگر سونے کے ٹانکے کو بھی سونے کی قیمت پر فروخت کرے تو جائز ہے،[2] بشرطیکہ تلبیس نہ کرے اور دھوکا نہ دے،[3] یعنی بتادے کہ اس میں ٹانکے کی قیمت بھی شامل ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۶/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۶۲/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع
۱۳۸۸/۶/۷ھ

***

(۱ و ۲) وفی الھدایة ج:۴ ص:۴۷۱ (طبع مکتبه شرکت علمیه وفی طبع مکتبه رحمانیه ج:۴ ص:۴۷۲) .... لأنّ الثّمن حقّ العاقد فالیه تقدیره فلا ینبغی للامام أن یتعرّض لحقّه الّا اذا تعلّق به دفع ضرر العامّة .... الخ.

وکذا فی الدّر المختار ج:۶ ص:۳۹۹ (طبع سعید) وبدائع الصّنائع ج:۵ ص:۱۲۹.

وفی البحوث فی قضایا فقهیّة معاصرة ص:۸ وللبائع أن یبیع بضاعته بما شاء من ثمن ولا یجب علیه أن یبیعه بسعر السوق دائمًا وللتّجار ملاحظ مختلفة فی تعیین الأثمان وتقدیرها .... الخ.

وفی شرح المجلّة لسلیم رستم باز رقم المادّة:۱۱۹۲ ص:۶۵۴ (طبع حنفیه کوئٹه) کل یتصرّف فی ملکه کیف شاء.

وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۲ ص:۲۴ وان اشتریٰ خاتم فضّة أو خاتم ذهب فیه فصّ أو لیس فیه فصّ بکذا فلوسًا ولیست الفلوس عنده فهو جائز ان تقابضا قبل التّفرّق أو لم یتقابضا.

وکذا فی الهندیة ج:۳ ص:۲۲۴، وفتح القدیر ج:۶ ص:۲۷۸.

(۱) دیکھئے ص:۱۰۲ تا ۱۰۴ کے حواشی۔

﴿فصل فی أحکام السّندات المالیّة والصّکوک والأوراق المالیّة﴾

(مختلف مالی دستاویزات، بانڈز اور چیک وغیرہ کا بیان)

فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ خریدنے اور ان پر نفع حاصل کرنے کا حکم

سوال:- عرض اینکہ حکومت نے ان لوگوں کے لئے جو بیرونِ ملک رہتے ہیں اور اپنا زَرِ مبادلہ باہر سے لے کر آتے ہیں، ان کے لئے فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹس کے نام سے ایک اسکیم جاری کی ہے، جس کے ذریعے باہر سے لائے ہوئے زَرِ مبادلہ کے عوض یہ سرٹیفکیٹ جاری کئے جاتے ہیں، اور اس کا حامل اس کو اِسٹاک ایکسچینج میں بھی نفع پر فروخت کرسکتا ہے۔ از خود پاکستانی بینک بھی ایک سال کے بعد سو روپے کے سرٹیفکیٹ کو ½۱۴ روپے مزید نفع کے ساتھ دو سال کے بعد ۳۱، اور تین سال کے بعد ۵۲ روپے سود یا نفع کے ساتھ فروخت کرسکتے ہیں اور اگر چاہے تو اسی کے ذریعے بوقتِ ضرورت زَرِ مبادلہ بھی حاصل کرسکتا ہے۔ ان سرٹیفکیٹ کا خریدنا اور ان پر نفع حاصل کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

(گل رشید، ابوظہبی امارات)

جواب:- فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ کے بارے میں تحقیق سے ان کی یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ جو لوگ پاکستان سے باہر ملازمت کرتے ہیں، وہ اگر زَرِ مبادلہ پاکستان لے کر آئیں تو حکومت کا قانون یہ ہے کہ وہ بیرونی زَرِ مبادلہ اسٹیٹ بینک میں جمع کرائیں اور اس کے بدلے حکومت کے طے کردہ نرخ کے مطابق پاکستانی روپیہ وصول کریں۔ پاکستان میں رہتے ہوئے زَرِ مبادلہ اپنے پاس رکھنا بھی قانوناً جائز نہیں اور جب ایک مرتبہ یہ زَرِ مبادلہ اسٹیٹ بینک میں جمع کرادیا جائے تو اس کے بعد کسی وقت اس کو واپس لینا بھی قانوناً ممکن نہیں، اب حکومت نے یہ فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ اس مقصد سے جاری کئے ہیں کہ جو شخص باہر سے زَرِ مبادلہ لاکر ان کے بدلے یہ سرٹیفکیٹ حاصل کرلے تو اس کو تین فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

پہلا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ اس سرٹیفکیٹ کو دِکھا کر اس کا حامل جب چاہے کسی بھی ملک کی کرنسی تبادلے کے دن کی قیمت کے اعتبار سے وصول کرسکتا ہے۔

دُوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سال بھر تک یہ سرٹیفکیٹ اپنے پاس رکھے تو وہ اُسے ساڑھے بارہ فیصد نفع کے ساتھ پاکستانی روپیہ میں بھنا سکتا ہے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ سال گزرنے سے پہلے یا کسی بھی وقت وہ بازارِ حصص (اسٹاک ایکسچینج) میں جس قیمت پر چاہے فروخت کرسکتا ہے۔

چونکہ اس سرٹیفکیٹ کی وجہ سے اس کے حامل کو زَرِمبادلہ حاصل کرنے کا استحقاق پیدا ہوجاتا ہے، اس لئے عام طور پر اسٹاک ایکسچینج میں لوگ اُسے زیادہ قیمت پر خرید لیتے ہیں، مثلاً سو روپے کا سرٹیفکیٹ ایک سو دس روپے میں بک سکتا ہے۔

سرٹیفکیٹ کو دیکھنے اور اس کے متعلق مطبوعہ معلومات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ سرٹیفکیٹ غیرملکی زَرِمبادلہ کی رسید نہیں، بلکہ اس پاکستانی روپیہ کی رسید ہے جو کسی باہر سے آنے والے کو زَرِمبادلہ حکومت کے حوالے کرنے کے نتیجے میں حاصل ہوا، فرق صرف اتنا ہے کہ عام پاکستانی روپیہ یا اس کی نمائندگی کرنے والے تمسکات کی بنیاد پر زَرِمبادلہ حاصل کرنے کا کوئی اِستحقاق نہیں ہوتا، لیکن اس سرٹیفکیٹ کے حامل کو زَرِمبادلہ کے حقوق کا اِستحقاق حاصل ہے، لہٰذا فقہی اعتبار سے اس کی صورت یہ بنی کہ حکومت نے باہر سے آنے والا زَرِمبادلہ پاکستانی روپے کے عوض میں خرید لیا، لیکن یہ پاکستانی روپیہ فوراً ادا کرنے کے بجائے اُسے اپنے ذمے میں دَین بنالیا، اور اس دَین کی توثیق کے لئے یہ سرٹیفکیٹ جاری کردیا، اور اس کے حامل کو یہ اِختیار دے دیا کہ اگر وہ چاہے تو یہ دَین اپنے اصل پاکستانی روپے کی شکل میں وصول کرے یا اگر چاہے تو ادائیگی کے دن کی قیمت کے لحاظ سے زَرِمبادلہ کی شکل میں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ سرٹیفکیٹ حامل کے اس پاکستانی روپے کا وثیقہ ہے جو حکومت کے ذمے دَین ہے، اب اگر حکومت ایک سال کے بعد یہ سو روپے کا وثیقہ ایک سو ساڑھے بارہ روپے میں لیتی ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ دَین پر ساڑھے بارہ فیصد زیادہ ادا کر رہی ہے، جو شرعاً واضح طور پر سود ہے۔ اسی طرح اگر اس سرٹیفکیٹ کا حامل یہ وثیقہ بازارِ حصص میں اس کی اصل قیمت سے زیادہ قیمت پر فروخت کرتا ہے تو اس کے معنیٰ بھی یہ ہوئے کہ وہ اپنا دَین زیادہ قیمت پر دُوسرے کو فروخت کر رہا ہے اور یہ معاملہ بھی سود ہونے کی بناء پر ناجائز ہے۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ سرٹیفکیٹ غیرملکی زَرِمبادلہ کی رسید ہے، اور اس وجہ سے ان کو پاکستانی روپے میں کسی بھی طے شدہ نرخ پر فروخت کرنا جائز ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ غیرملکی زَرِمبادلہ

کی رسید نہیں ہے، جس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ اس سرٹیفکیٹ پر غیر ملکی زرِمبادلہ کے بجائے صراحۃً پاکستانی روپے کا نام لکھا ہوا ہوتا ہے۔

اور دُوسری وجہ یہ ہے کہ اس سرٹیفکیٹ کے ذریعے جب کبھی زرِمبادلہ حاصل کیا جائے تو اتنا زرِمبادلہ نہیں ملے گا جس کے بدلے یہ سرٹیفکیٹ حاصل ہوا تھا، بلکہ تبادلے کے دن غیر ملکی زرِمبادلہ کے نرخ کے مطابق زرِمبادلہ دیا جائے گا۔ مثلاً کسی شخص نے پچیس سعودی ریال دے کر سو روپے کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا، اور چھ ماہ بعد جبکہ سعودی ریال مہنگا ہو چکا ہے، تو اُسے اتنے سعودی ریال دیئے جائیں گے جتنے اس روز سو پاکستانی روپے میں حاصل ہوتے ہیں، مثلاً اس دن کے زر کی شرحِ مبادلہ اگر ۲۳ ریال ہو تو اُسے اس سرٹیفکیٹ کے ذریعے ۲۳ ریال ہی حاصل ہوں گے۔ پس یہ واضح دلیل ہے کہ یہ سرٹیفکیٹ سعودی ریال کا وثیقہ نہیں، بلکہ پاکستانی روپے کا وثیقہ ہے، لہٰذا اس سرٹیفکیٹ کو اس بناء پر خریدنا کہ اُسے زیادہ قیمت پر اسٹاک ایکسچینج میں بیچ دیا جائے گا، یا سال بھر گزرنے کے بعد اس پر حکومت سے ساڑھے بارہ فیصد نفع حاصل کیا جائے گا، سودی معاملہ ہونے کی بناء پر قطعاً ناجائز و حرام ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص اس غرض سے سرٹیفکیٹ خریدے کہ بوقتِ ضرورت اس کے ذریعے زرِمبادلہ حاصل ہو سکے، اور اُسے اسٹاک ایکسچینج میں فروخت کرنے یا حکومت سے اس پر منافع حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہ ہو تو اس غرض سے خریدنے کی گنجائش ہے، لیکن خریدنے کے بعد اُسے زیادہ قیمت پر بیچنا یا اس پر حکومت سے منافع حاصل کرنا ہرگز جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۸/۸/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۳۴ /۱۷ ۳۹ و)

اِنکم ٹیکس سے بچنے کے لئے فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ خریدنے کا حکم

سوال:- جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم

آپ کا مضمون ''فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ کا شرعی حکم'' نظر سے گزرا، اس مضمون میں آپ نے صفحہ نمبر ۴ پر تین فوائد ذکر کئے ہیں، جبکہ ان کا اہم مقصد ایک یہ بھی ہے کہ ان سرٹیفکیٹس کا حامل ان کو کیش کرانے کے بعد اس کی رقم کسی بھی کاروبار میں لگائے گا تو اس سے اس رقم کی پوچھ نہیں ہوگی، اور اِنکم ٹیکس میں رعایت دی جائے گی، یہ اس سرٹیفکیٹ کا اہم فائدہ ہے، اسی لئے یہ سرٹیفکیٹ اسٹاک ایکسچینج میں زیادہ قیمت پر فروخت ہوتے ہیں کہ لوگ اپنی Black Money کو White کر لیتے ہیں، اور کسی بھی کاروبار میں لگا سکتے ہیں۔

۱- اب معلوم یہ کرنا ہے کہ ان سرٹیفکیٹ کو اسٹاک ایکسچینج میں زیادہ قیمت پر خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ گورنمنٹ کے اِنکم ٹیکس کے قوانین اتنے پیچیدہ ہیں کہ ان سے بچنے کے لئے White کی رقم کی ضرورت پڑتی ہے جو کہ اس سرٹیفکیٹ سے مہیا ہوسکتی ہے۔

۲- اکثر حضرات ان سرٹیفکیٹوں کو باہر سے منگواتے ہیں لیکن ان کے کاروبار میں لگانے کی نوبت ایک سال بعد آتی ہے، اور جب ان کو کیش کروانے جاتے ہیں تو حکومت سے ساڑھے بارہ فیصد منافع کے ساتھ رقم ملتی ہے، اب ہم اس منافع کی رقم کا کیا کریں؟ کیونکہ بعض اوقات حالات کے مطابق دو سال بھی گزر جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہماری نیت صرف رقم کو White کرانا ہے، منافع حاصل کرنا نہیں، لیکن منافع اس کو کیش کرانے پر گورنمنٹ خود دیتی ہے، اب اس رقم کو ہم کہاں صَرف کریں؟

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ کے بارے میں یہ عرض ہے کہ جیسا کہ ''البلاغ'' کے فتوے میں کہا گیا ہے کہ اسٹاک ایکسچینج میں اس کو زیادہ قیمت پر بیچنا بھی ناجائز ہے، اور خریدنا بھی ناجائز، لہٰذا اِنکم ٹیکس سے بچنے کے لئے اگر ان کو خریدنا چاہیں تو اس کی جائز صورتیں صرف دو ہیں، ایک یہ کہ کوئی شخص واقعۃً باہر سے زَرِمبادلہ لے کر آیا ہو، اور اس کے عوض وہ یہ سرٹیفکیٹ حاصل کرے، اور دُوسرا راستہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ سرٹیفکیٹ ان کی اصل قیمت پر دینے پر راضی ہو تو برابر سرابر رقم پر اُسے حاصل کیا جائے، شرعاً یہ بیع نہیں ہوگی، بلکہ حوالہ ہوگا۔ مثلاً اگر پانچ سو روپے کے سرٹیفکیٹ ہیں تو ان کو پانچ سو روپے کے عوض حاصل کیا جائے، اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے اس شخص کو پانچ سو روپے نقد قرض دیئے اور اس نے اپنے قرض کا حوالہ حکومت پر کردیا اور اس حوالے کی توثیق کے لئے یہ سرٹیفکیٹ آپ کو دیئے۔ (یہ تشریح اس لئے ضروری ہوگی کہ شرعاً دَین کی خرید وفروخت جائز نہیں[1]، جس کو فقہاء ''بیع الدّین من غیر من علیه الدّین''[2] کہتے ہیں)۔

مذکورہ بالا دو طریقوں کے ذریعے اگر کوئی سرٹیفکیٹ حاصل کیا جائے اور پھر اس کو کیش کراتے وقت حکومت کی طرف سے زیادہ رقم ملے تو اوّلاً یہ زیادہ رقم لینی نہیں چاہئے، لیکن اگر کسی وجہ سے

(۱ و ۲) وفی بدائع الصّنائع ج:۵ ص:۱۴۸ (طبع سعید) ولا ینعقد بیع الدّین من غیر من علیه الدّین لأنّ الدّین امّا أن یکون عبارة عن مال حکمی فی الذّمة وامّا أن یکون عبارة عن فعل تملیک المال وتسلیمه وکل ذلک غیر مقدور التّسلیم فی حق البائع ولو شرط التّسلیم علی المدیون لا یصحّ أیضًا لأنّه شرط التّسلیم علیٰ غیر البائع فیکون شرطًا فاسدًا فیفسد البیع اھ.

وراجع للتّفصیل الی الشامیة ج:۴ ص:۵۱۷ (طبع سعید) و تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۳۶۳ وبحوث فی قضایا فقهیّة معاصرة ص:۲۱ (طبع مکتبة دار العلوم کراچی).

لینی ضروری ہوتو جتنی رقم زیادہ ملی ہے اس کو اپنی جان چھڑانے کی نیت سے کسی مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کردیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۸/۱۰/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۰۹۱/۳۹ ز)

''فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ'' کا شرعی حکم، چند شبہات اور ان کے جوابات

سوال:- معظم ومحترم جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم

شوال المکرم ۱۴۰۸ھ یعنی جون ۱۹۸۸ء کے ''البلاغ'' میں فارن کرنسی سرٹیفکیٹ کے بارے میں جنابِ والا کی تحقیق اور رائے نظر سے گزری، اس سلسلے میں کچھ معروضات پیشِ خدمت ہیں۔

۱- یہ مفروضہ کہ ہر پاکستانی کو وطن واپسی پر سارا فارن ایکسچینج حکومت کے پاس جمع کرانا ہوتا ہے، دُرست نہیں۔ عرصہ دراز سے حکومتِ پاکستان نے یہ اجازت دی ہوئی تھی کہ واپس آنے والے پاکستانی چھ ماہ تک غیر ملکی زَرِمبادلہ اپنے پاس فارن کرنسی اکاؤنٹ میں رکھ سکتے ہیں، پھر ۱۹۸۵ء کے آخر میں یہ مدّت بڑھا کر تین سال کردی گئی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ گزشتہ سال جب فارن کرنسی سرٹیفکیٹ جاری کئے گئے اس وقت خریدنے والے سارے حضرات یا بیشتر حضرات قانوناً اس بات کے مجاز تھے کہ حکومت کو زَرِمبادلہ نہ دیں، اور اپنے پاس ہی رکھیں، اور جن لوگوں نے یہ سرٹیفکیٹ خریدے، ان کے پیشِ نظر یا تو اور جگہوں سے ملنے والی منافع کی شرح تھی، یا وہ اپنے سرٹیفکیٹ کو لمسٹاک ایکسچینج میں فروخت کرکے حکومت کی مقرّر کردہ شرحِ تبادلہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

۲- جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ''سرٹیفکیٹ کا حامل جب چاہے کسی بھی ملک کی کرنسی تبادلے کے دن کی قیمت کے اعتبار سے وصول کرسکتا ہے'' یہ کچھ حد تک صحیح ہے، کیونکہ حامل کو یہ کرنسی پاکستان سے باہر ہی ملے گی، اگر وہ اس سے پاکستان میں فارن کرنسی اکاؤنٹ کھولنا چاہے گا تو اُسے اس بات کی اجازت نہ ہوگی، البتہ وہ حامل جس کا پہلے سے فارن کرنسی اکاؤنٹ موجود ہے وہ سرٹیفکیٹ اس اکاؤنٹ میں جمع کراسکتا ہے۔

۳- گو کہ یہ دُرست ہے کہ حکومت باہر سے آنے والا زَرِمبادلہ پاکستانی روپے کے عوض خرید کر فوراً ادا کرنے کے بجائے اُسے اپنے ذمے دَین بناتی ہے، لیکن فروخت کرنے والا صرف اس لئے حال کے بجائے مستقبل کے روپے میں (جو کہ اِفراطِ زَر کی وجہ سے روز بروز کمزور ہوتا جارہا ہے) اور حقیقی شرحِ تبادلہ سے کم لینے کو تیار ہوتا ہے کہ وہ مستقبل میں زَرِمبادلہ لینے کا اِستحقاق برقرار رکھتا ہے،

ماہرینِ معاشیات کے مطابق صرف اور صرف "Floating Rate" ہی کسی کرنسی کی حقیقی قیمت تبادلہ ہوتا ہے حکومتوں کے مقرر کردہ ریٹ کرنسی کی صحیح "Worth" یعنی "Intrinsic Value" کو "Reflect" نہیں کرتے، اب اگر حکومت مصنوعی طور پر فارن کرنسی کے بدلے کم قیمت دے گی تو بازار میں اس پر "Premium" زیادہ ہوگا۔ مثال کے طور پر آج اگر حکومت زبردستی پر اُتر آئی اور ڈالر کی قیمت دس روپے طے کر دے تو مارکیٹ میں ڈالر دس فیصد (موجودہ) "Premium" کے بجائے نوّے یا سو فیصد پریمیم پر بکے گا، جو کہ اس کی صحیح قیمت ہے۔ میں اس ضمن میں یاد دِلانا چاہتا ہوں کہ آج سے تقریباً پندرہ سال پیشتر جب حکومت نے ڈالر کی شرحِ تبادلہ "4.75" روپے مقرر کی ہوئی تھی، ڈالر بازار میں چودہ روپے کا ملتا تھا، اور حکومت خود چودہ روپے کی قیمت کو بلاواسطہ بونس واؤچر اسکیم کے ذریعے "Support" کر رہی تھی۔ مختلف کرنسیوں میں ایک دُوسرے کے مقابلے میں اُتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے جو کہ ان ممالک میں اِفراطِ زَر اور شرحِ سود کا ایک فنکشن ہے، لیکن جن ملکوں میں کرنسی کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں یا جہاں حکومت مصنوعی طور پر شرحِ تبادلہ طے نہیں کرتی، وہاں مارکیٹ کی شرح اور حکومت کی شرحِ تبادلہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا، کیونکہ دونوں شرحیں مقامی کرنسی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فقہی نقطۂ نظر سے کسی حکومت کو (جو کہ اِسلامی حکومت بھی نہیں) اس بات کا کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ عوام کو ان غیرممالک میں کمائی کی قیمت دے (جبکہ کسٹم، پولیس، عدالتیں، انکم ٹیکس، غرض ہر اِدارہ انہیں لوٹنے پر تیار بیٹھا رہتا ہے) اور اگر وہ کم قیمت دیتی ہے تو عوام اس بات کے کس حد تک مجاز ہیں کہ وہ اپنے زَرِمبادلہ کی صحیح قیمت بازار سے حاصل کرلیں خصوصاً جبکہ اسی حکومت نے زَرِمبادلہ کی بازار میں فروخت قانونی قرار دی ہوئی ہے؟

۴- دورانِ تحقیق جنابِ والا کے علم میں یہ بات ضرور آئی ہوگی کہ حکومتِ پاکستان کو ہنڈی کے کاروبار سے ہر سال کروڑوں روپے کا نقصان ہو رہا تھا، کیونکہ لوگ حکومت کی مصنوعی شرح کو چھوڑ کر پرائیویٹ اِداروں کے ذریعے رُقوم کی ترسیل کر رہے تھے۔ بیئرر فارن ایکسچینج سرٹیفکیٹ جاری کرکے اور ان کے اسٹاک ایکسچینج میں فروخت کو قانونی بنا کر دراصل حکومت نے ہنڈی کے کاروبار پر ضرب لگائی ہے، اور اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ لوگ زَرِمبادلہ کی صحیح قیمت حاصل کرسکیں، لہٰذا ہنڈی کے کاروبار کے سلسلے میں فقہی نقطۂ نظر سے آگاہ فرمائیں؟

ان باتوں کے پیشِ نظر کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ سرٹیفکیٹ کو بازار میں بیچنے سے جو دس یا بارہ فیصد منافع ہوتا ہے وہ جائز فارن کرنسی کی حقیقی قیمت ہونے کی وجہ سے؟ بالکل اسی طرح جس طرح کمپنیوں کے حصص وغیرہ بازار میں "Par Value" سے زیادہ یا کم اپنی "Intrensic Value" کی بناء پر

فروخت ہوتے ہیں، البتہ اس بات سے مکمل اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ سال بھر گزرنے کے بعد اس پر حکومت کی طرف سے جو ساڑھے بارہ فیصد منافع حاصل کیا جائے گا وہ سودی معاملہ ہونے کی وجہ سے قطعاً ناجائز وحرام ہوگا۔

۵- آخری پیراگراف میں جنابِ والا نے اجازت دی ہے کہ اگر کوئی شخص اس غرض سے یہ سرٹیفکیٹ خریدے کہ بوقتِ ضرورت اس کے ذریعے زَرِمبادلہ حاصل ہوسکے تو اس غرض سے خریدنے کی گنجائش ہے۔ یہ اجازت بھی عام آدمی کے لئے مسائل کھڑے کرسکتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص پاکستان واپسی پر صرف اور صرف اسی غرض سے یہ سرٹیفکیٹ لیتا ہے کہ بوقتِ ضرورت اس سے زَرِمبادلہ حاصل ہوسکے گا لیکن تین سال بعد جب اس کے بدلے زَرِمبادلہ لینا چاہتا ہے تو ایک لاکھ روپے کے سرٹیفکیٹ کی "Surrnder Value" ایک لاکھ باون ہزار روپے ہوجانے کی وجہ سے اُسے زیادہ زَرِمبادلہ ملتا ہے، یہ باون ہزار یقیناً سود ہے اور اس شخص کے پاس اس سے بچت کی کوئی صورت نہیں۔ حکومت یہ رقم اُسے زبردستی دے گی، ایسی صورت میں کیا وہ سود وصول کرنے کا گناہگار نہ ہوگا؟ بحالتِ مجبوری کیا وہ باون ہزار روپے خیرات کردے یا جتنی فارن کرنسی اس نے حکومت کو دی تھی اتنی لے کر باقی خیرات میں دیدے؟ لیکن ایسی صورت میں روپے کی قیمت میں کمی سود سے پوری ہوگی؟

جواب:- محترمی ومکرمی جناب منتسم مسعود صاحب، حفظہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا، جواب کے لئے جس ذہنی یکسوئی کی ضرورت تھی، وہ پچھلے دنوں مفقود رہی، اس لئے جواب میں قدرے تاخیر ہوگئی، شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔

آپ نے جس تفصیل کے ساتھ فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ کا پورا پس منظر بیان فرمایا ہے، اس پر میں تہِ دِل سے آپ کا شکرگزار ہوں۔ باہر سے زَرِمبادلہ پاکستان منتقل کرنے والوں پر جو پابندیاں قانوناً عائد ہیں، اور جن کی وجہ سے وہ مشکلات کا شکار ہیں ان کا کچھ اندازہ پہلے بھی تھا، آپ کی مفصل تشریح سے اور زیادہ ہوگیا۔ لیکن ان تمام باتوں سے فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ کی موجودہ شرعی حیثیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، ان مشکلات کا اصل حل تو یہ ہے کہ حکومت زَرِمبادلہ بازاری نرخ پر حاصل کرے، یا پھر شرعاً اس بات کی گنجائش بھی نکل سکتی تھی کہ حکومت ان سرٹیفکیٹس کو پاکستانی روپے کا نہیں بلکہ اس زَرِمبادلہ کا نمائندہ قرار دے جو حکومت کے حوالے کیا گیا ہے۔ اگر یہ سرٹیفکیٹ زَرِمبادلہ کا نمائندہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حکومت کے ذمے زَرِمبادلہ دَین ہے، اب اس کے بعد حکومت کسی بھی آئندہ مرحلے پر اُسے باہمی رضامندی سے طے شدہ قیمت پر خرید سکتی ہے، اور یہ قیمت بازاری قیمت سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے بشرطیکہ زیادہ قیمت پہلے سے طے نہ ہو، بلکہ خریداری کے وقت طے کی

جائے۔ نیز متبادل طور پر یہ بھی ممکن ہے کہ سرٹیفکیٹ کا حامل بازار میں اُسے بطورِ حوالہ دے کر اس کے ذریعے زیادہ پاکستانی روپے حاصل کرلے۔

لیکن شرعاً دُشواری یہاں سے پیدا ہوئی ہے کہ اس سرٹیفکیٹ کو زَرِمبادلہ کے بجائے پاکستانی روپے کا وثیقہ قرار دیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت نے اس وقت زَرِمبادلہ کو سرکاری نرخ پر پاکستانی روپے سے خرید لیا ہے اور اس پاکستانی روپے کے بدلے یہ سرٹیفکیٹ جاری کردیا ہے۔ اب زَرِمبادلہ اس شخص کی ملکیت میں نہیں رہا، جس کی بنیاد پر مذکورہ دوطریقوں سے اس کی بیع ممکن ہوتی۔

رہا یہ کہنا کہ موجودہ صورت میں اسٹاک ایکسچینج کے اندر جو دس یا بارہ فیصد منافع ہوتا ہے وہ زَرِمبادلہ کی حقیقی قیمت ہونے کی بناء پر جائز ہونا چاہئے۔ سو یہ توجیہ دو وجہ سے ممکن نہیں، اوّل تو اس لئے کہ وہ زَرِمبادلہ کی نہیں بلکہ پاکستانی روپے کی قیمت ہے، کیونکہ سرٹیفکیٹ پاکستانی روپے ہی کا وثیقہ ہے، اور روپوں کے ہم جنس تبادلے میں کمی بیشی جائز نہیں۔ اور دُوسری وجہ یہ ہے کہ سرٹیفکیٹ پر بازار میں جو دس یا بارہ فیصد منافع ملتا ہے، نہ وہ کلیۃً زَرِمبادلہ کے سرکاری اور بازاری نرخوں کے فرق پر مبنی ہوتا ہے، اور نہ اس فرق کے مساوی ہوتا ہے۔ اگر یہ منافع دس یا بارہ فیصد ہے تو سرکاری اور بازاری نرخوں کا فرق عموماً اس سے کم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سرٹیفکیٹ کو بازار میں بیچنے سے حامل کو ہنڈی کے ذریعے زَرِمبادلہ بھیجنے سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے، اس لحاظ سے جناب کا یہ فرمانا احقر کے نزدیک دُرست نہیں کہ حکومت کی طرف سے کھلے بازار میں اس سرٹیفکیٹ کی فروخت کی اجازت بازار سے زَرِمبادلہ کی صحیح قیمت حاصل کرنے کی اجازت کے مرادف ہے، اس کے برخلاف صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ حکومت نے بازار میں زَرِمبادلہ کو اس کی بازاری قیمت پر بیچنا تو ممنوع قرار دے رکھا ہے، لیکن اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ زَرِمبادلہ سرکار کو کم قیمت پر فروخت کرکے اس قیمت کی بنیاد پر سودی معاملہ کرکے اپنے اس نقصان کی تلافی کرسکتے ہو۔

یہ بات اپنی جگہ دُرست ہے کہ غیرملکی کرنسی کا سرکاری نرخ اس کے بازاری نرخ سے بہت کم مقرّر کرنا جبکہ کھلے بازار میں زَرِمبادلہ کی خرید وفروخت بھی قانوناً ممنوع ہو، ایک طرح کا ظلم ہے، جس کی عام حالات میں شرعاً اجازت نہیں ہے، لیکن اگر حکومت ایک غلط کام کررہی ہو تو اس سے سودی معاملے کی شرعی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، بلکہ وہ بدستور ناجائز ہی رہے گا۔

البتہ چونکہ حکومت نے سرٹیفکیٹ کے حامل سے زَرِمبادلہ جبراً کم قیمت پر خریدا ہے، اس لئے اگر حکومت اُسے سال بھر کے بعد سرٹیفکیٹ پر بارہ فیصد منافع دیتی ہے تو اگرچہ وہ سود ہے لیکن اس میں سے اتنی رقم رکھ لینے کی شرعاً گنجائش معلوم ہوتی ہے جو سرٹیفکیٹ خریدنے کے دن زَرِمبادلہ کے سرکاری

نرخ اور بازاری نرخ کے فرق کے برابر ہو، مثلاً کسی نے ایک سو ڈالر دے کر ۱۷۰۰ پاکستانی روپے کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا جبکہ اس کی بازاری قیمت ۱۷۵۰ روپے تھی، اس میں اس کو پچاس روپے کا نقصان سرکاری جبر کی وجہ سے ہوا جس پر وہ دِل سے راضی نہیں تھا، اب اگر سال بھر کے بعد حکومت اُسے سرٹیفکیٹ کے بدلے ۲۰۴۰ روپے دیتی ہے، تو ان روپوں میں سے ۵۰ روپے اگر وہ اپنے ذاتی نقصان کی تلافی کے طور پر وصول کرلے تو شرعاً اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن باقی روپے اپنے استعمال میں لانے کی اجازت پھر بھی نہیں ہوگی۔

لیکن اگر اسٹاک ایکسچینج میں سرٹیفکیٹ بیچ کر بارہ فیصد منافع حاصل ہو تو اس میں سے یہ پچاس روپے وصول کرنا بھی شرعاً جائز نہیں ہوگا، وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں یہ پچاس روپے کا نقصان اسی فریق سے وصول کیا جارہا ہے جس نے یہ نقصان پہنچایا تھا، اور دُوسری صورت میں منافع دینے والا فریق وہ نہیں ہے جس نے نقصان پہنچایا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ اگر ''الف'' کسی ناجائز طریقے سے ''ب'' کے ۵۰ روپے غصب کرے، پھر وہی ''الف'' سود کے نام سے اس کو اپنی طرف سے ۵۰ روپے ادا کرے تو ''ب'' کے لئے یہ ۵۰ روپے بحیثیتِ سود نہیں بلکہ بحیثیتِ تلافیٔ نقصان لینے کی گنجائش ہے، لیکن اگر ''ج'' اس کو اس کے کسی قرض پر ۵۰ روپے سود دے تو اس کا استعمال اس کے لئے اس بناء پر جائز نہیں ہوجائے گا کہ ''الف'' نے اسے ۵۰ روپے کا نقصان پہنچایا تھا۔

اس تفصیل سے آپ کے آخری سوال کا جواب بھی ہوجاتا ہے، اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص صرف زرِمبادلہ وصول کرنے کے حق کا تحفظ کرنے کے لئے فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ خریدتا ہے اور سال بھر کے بعد اس پر حکومت سود دیتی ہے تو اُسے کیا کرنا چاہئے؟ اس کا جواب یہی ہے کہ وہ سرٹیفکیٹ کی اصل قیمت (Face Value) اپنے استعمال میں لاسکتا ہے، اور اس سے زائد رقم لینے کی بھی گنجائش ہے جو سرٹیفکیٹ خریدنے کے دن (نہ کہ منافع وصول ہونے کے دن) اس کے ادا کردہ زرِمبادلہ کی بازاری قیمت اور سرکاری نرخ کے فرق کے برابر ہو۔ لیکن اس سے زیادہ جتنی رقم حکومت کی طرف سے ملے وہ یقیناً سود ہے اور اُسے ذاتی استعمال میں لانا جائز نہیں بلکہ اس سے اپنی جان چھڑانے کی نیت سے اُسے صدقہ کردینا واجب ہے۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ آپ نے جو لکھا ہے کہ ''بحالتِ مجبوری کیا وہ باون ہزار روپے خیرات کردے یا جتنی فارن کرنسی اس نے حکومت کو دی تھی، اتنی لے کر باقی خیرات میں دیدے'' اس کے بارے میں عرض ہے کہ جتنی فارن کرنسی اس نے حکومت کو دی تھی، اتنی لینا دُرست نہیں، بلکہ اس

فارن کرنسی کے دیتے وقت اس کی بازاری قیمت سرٹیفکیٹ کی اصلی قیمت (Face Value) سے جتنی زائد تھی، صرف اتنی وصول کرنے کی گنجائش ہے، اس سے زائد نہیں، اور اِحتیاط تو بلاشبہ اس میں ہے کہ اصلی قیمت (Face Value) پاس رکھ کر باقی سب صدقہ کردی جائے۔

ایک اور بات آخر میں قابلِ ذکر یہ ہے کہ آپ نے ایک جگہ اِفراطِ زَر کی بنیاد پر روپے کی قیمت میں کمی کا بھی ذکر فرمایا ہے، جس سے ایسا لگتا ہے کہ ادائیگیوں میں روپے کی قیمت میں کمی کا بھی لحاظ ہونا چاہئے۔ شرعی نقطۂ نظر سے قرض اور دیگر واجبات اور دیون کے لین دین میں اِفراطِ زَر کی شرح میں تبدیلی کا اعتبار نہیں ہوتا، اس لئے ادائیگی کے وقت اس پہلو کو مدِنظر نہیں رکھا جاسکتا۔ اس مسئلے کی مکمل تحقیق احقر نے اپنے ایک مفصل مقالے میں کی ہے جو اِن شاء اللہ عنقریب ''البلاغ'' میں شائع ہوجائے گا۔

دُعا میں یاد رکھنے کی درخواست ہے۔

والسلام

۱۴۰۸/۱۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۳۶/۳۹ ج)

فارن کرنسی بیئرر سرٹیفکیٹ کا شرعی حکم

سوال:- محترم مولانا مفتی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ابھی فون پر بات ہوئی FCBC اسکیم کی تفصیل ارسال ہے، اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ بصورت دیگر تجویز کریں کہ اس میں کیا ترامیم اس کو جائز بنانے کے لئے ضروری ہیں، اس اسکیم میں اصل زَر اور نفع دونوں ڈالر میں لے سکتے ہیں۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دِین اس مسئلے کے بارے میں کہ:-

حکومت نے فروری ۱۹۹۸ء میں نئے فارن کرنسی بیئرر سرٹیفکیٹ جاری کئے ہیں، یہ سرٹیفکیٹ امریکی ڈالر اور برطانوی پاؤنڈ کے ہوں گے، اس اسکیم کی مدّت تین سال ہے، کم از کم مالیت ایک ہزار ڈالرز یا پاؤنڈز ہیں۔ حکومت نے اس پر مندرجہ ذیل فوائد دینے کا اعلان کیا ہے:-

۱- اصل زَر اور منافع پر حکومتِ پاکستان کی گارنٹی۔

۲- تین سالہ مختصر تکمیلی مدّت۔

۳- اِنکم ٹیکس اور ویلتھ ٹیکس سے مستثنیٰ۔

۴- خریداری کی مالیت لامحدود۔

۵- زیادہ مدّت کے لئے خریداری پر زیادہ سے زیادہ منافع۔

۶- معینہ مدّت سے پہلے کیش کرانے پر کوئی کٹوتی نہیں۔
۷- اسٹاک ایکسچینج میں قابلِ خرید وفروخت۔
۸- مجاز ڈیلر سے سرٹیفکیٹ بنانے کی سہولت۔

اسٹیٹ بینک نے یہ اعلان کیا ہے کہ سرٹیفکیٹ کیش کراتے وقت حاملِ سرٹیفکیٹ کو اِختیار ہوگا کہ وہ سرٹیفکیٹ میں مذکور فارن کرنسی کے مطابق فارن کرنسی لے لے، یعنی اتنی ہی مقدار میں کرنسی لے جتنی مقدار کا سرٹیفکیٹ ہے، اور منافع بھی اسی شکل میں وصول کرے یا اس دن کے ریٹ کے مطابق پاکستانی روپے وصول کرے۔

واضح رہے کہ ان سرٹیفکیٹ پر فارن کرنسی ہی لکھی ہوئی ہوتی ہے، پاکستانی روپے نہیں، یعنی ایک ہزار امریکی ڈالرز دینے کے بعد بینک سے جو سرٹیفکیٹ جاری ہوگا اس میں ایک ہزار امریکی ڈالرز مذکور ہوں گے، جس دن سرٹیفکیٹ جاری ہوا اس دن کے ریٹ کے مطابق پاکستانی روپے مذکور نہیں ہوں گے، اس سرٹیفکیٹ کی جو اسکیم اسٹیٹ بینک نے جاری کی ہے، وہ سوال کے ساتھ منسلک ہے (سائل نے اِستفتاء کے ہمراہ انگریزی زبان میں اسکیم کی فوٹو کاپی منسلک کی تھی)۔ ان سرٹیفکیٹ کو خریدنا، اس پر منافع حاصل کرنا اور منافع پر اسی کرنسی میں یا پاکستانی روپے میں اسے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ (المستفتی: ارشد سعید)

جواب:- نئے فارن کرنسی بیئرر سرٹیفکیٹ کی جو صورتِ حال سوال میں مذکور ہے اس کے مطابق اس کا حکم یہ ہے کہ فارن کرنسی دے کر سرٹیفکیٹ حاصل کرنا دراصل حکومت کو فارن کرنسی قرض دینا ہے اور یہ سرٹیفکیٹ اس کی سند ہے۔ قرض پر نفع حاصل کرنا حرام ہے،[1] اور قرض کو حوالے کرنا جائز ہے، لہٰذا ان سرٹیفکیٹ کو نفع حاصل کرنے کی نیت سے لینا ناجائز وحرام ہے، اور یہ حاصل ہونے والا نفع سود کے حکم میں ہوگا۔ البتہ ٹیکس سے بچنے کی قانونی سہولت حاصل کرنے کی نیت سے یا رقم کو محفوظ کرنے کی نیت سے یا حکومت کو قرض دینے کی نیت سے اگر کوئی شخص یہ سرٹیفکیٹ خریدے، اور اس پر منافع حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہ ہو تو اس غرض سے خریدنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ جب اس پر منافع کی پیشکش کی جائے تو گورنمنٹ سے منافع لیا ہی نہ جائے، اور اگر اپنے اِختیار کے بغیر منافع ملے تو اسے بغیر نیتِ ثواب کے کسی مستحقِ زکوٰۃ پر صدقہ کردیا جائے۔

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۵ ص:۱۶۶ وفی الاشباہ کل قرض جر نفعا حرام (کتاب المداینات ص:۱۴۴، طبع سعید کراچی)۔ نیز دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

جہاں تک اس سرٹیفکیٹ کو بازار میں فروخت کرنے کا تعلق ہے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اسے ڈالر ہی میں فروخت کیا جائے تو اتنے ہی ڈالر لینے جائز ہوں گے جتنے ڈالر کا وہ سرٹیفکیٹ ہے، اس سے کم یا زائد میں بیچنا حرام اور سود کے حکم میں داخل ہے۔ اور اگر اس سرٹیفکیٹ کو پاکستانی روپے میں فروخت کیا جائے تو تبادلے کی شرح اس دن کی بازاری قیمت کے مطابق ہونی ضروری ہے۔ البتہ سرکاری شرحِ تبادلہ پر بیچنا ضروری نہیں، بلکہ مجاز ڈیلرز جس شرح پر اس دن ڈالر خرید رہے ہوں، اس شرح پر سرٹیفکیٹ بیچا جاسکتا ہے، مثلاً سرٹیفکیٹ ایک ہزار امریکی ڈالرز کا ہے، اور تبادلے کے دن عام بازار میں ڈالر کا نرخ چھیالیس روپیہ فی ڈالر ہے، تو یہ سرٹیفکیٹ چھیالیس ہزار ہی میں فروخت کیا جاسکتا ہے۔ چھیالیس ہزار روپے سے زائد قیمت لگا کر بیچنا جائز نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فقہی اعتبار سے سرٹیفکیٹ کی فروخت کا مطلب یہ ہے کہ نقد پاکستانی روپے کے عوض ڈالر نسیئۃ فروخت کئے، پھر جو ڈالرز واجب الذمہ ہوئے ان کا حوالہ سرٹیفکیٹ جاری کرنے والے (یعنی حکومت) پر کردیا۔ جو علماء نوٹوں کے تبادلے کو صَرف قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک تو اس بیع میں نسیئۃ بالکل ہی ناجائز ہے، اور احقر کے نزدیک اگرچہ یہ صَرف نہیں ہے، اس لئے اس میں تقابض شرط نہیں، لیکن نسیئۃ کی صورت میں ثمنِ مثل پر بیچنا اس لئے ضروری ہے تاکہ اسے رِبا کا ذریعہ نہ بنایا جاسکے۔ اور یہ سرٹیفکیٹ چونکہ اصلاً سودی ہے، اس لئے بازار میں کوئی بھی شخص اسے بازاری شرحِ تبادلہ سے زائد پر اس وقت تک نہیں خریدے گا جب تک اس کا ارادہ اس سرٹیفکیٹ پر عائد ہونے والے سود سے اِنتفاع نہ ہو، لہٰذا اس سرٹیفکیٹ کے معاملے میں بطورِ خاص ثمنِ مثل کی شرط کی رعایت ضروری ہے۔ البتہ ثمنِ مثل سرکاری قیمت نہیں، بلکہ وہ بازاری قیمت ہے جو مجاز ڈیلروں کے یہاں معروف ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ نفع حاصل کرنے کی غرض سے اس سرٹیفکیٹ کی خریداری جائز نہیں، البتہ نفع حاصل نہ کرنے کے مستحکم ارادے کے ساتھ اس نیت سے خریدا جاسکتا ہے کہ اس سے ٹیکس میں قانونی رعایت حاصل کی جائے یا اپنی رقم کی مالیت کا تحفظ کیا جائے، اور روپے کی گرتی ہوئی قیمت کے مقابلے میں اپنی ملکیت مستحکم کرنسی میں محفوظ کی جائے، یا حکومت کو بلاسود قرض دیا جائے۔ لیکن جب یہ سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا جائے تو خواہ حکومت کو واپس کیا جائے، یا بازار میں فروخت کیا جائے، دونوں صورتوں میں اس دن کی بازاری شرحِ تبادلہ کے مطابق ہی فروختگی ضروری ہے، بازاری شرحِ تبادلہ سے زائد پر فروخت کرنا جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۱۸/۱۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰۱/۲۲)

”نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ“ میں ملنے والے منافع کا حکم

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ میں سرمایہ کاری کرنا کیسا ہے؟ اور اس میں جو منافع ملتا ہے وہ سود ہے یا حلال ہے؟

جواب:- نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ پر جو منافع ملتا ہے شرعاً وہ سود ہے، اور اس کا لینا حرام ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۰۸/۱۱/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۵۱/۳۹ ز)

اِنعامی بونڈز کی شرعی حیثیت

سوال:- اِنعامی بانڈ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس کا خریدنا دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- اِنعامی بانڈ کا اِنعام لینا شرعاً جائز نہیں،(۱) اس میں سود بھی ہے اور قمار کی رُوح بھی۔

واللہ اعلم
۱۴۰۲/۷/۱۸ھ

پرائز بانڈز کی خرید وفروخت اور اِنعام کا شرعی حکم

(اور اس سلسلے میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کی حقیقت اور قانونی نکتے کی وضاحت)

(سائلِ موصوف نے اِستفتاء سے قبل حضرتِ والا دامت برکاتہم کو درج ذیل خط لکھا)

بگرامی خدمت مکرم ومحترم جناب حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب زادمجدکم

السلام علیکم، حضرتِ والا! ایک سوال یا مسئلہ وجہ اختلاف بنا ہوا ہے، وہ یہ کہ اِنعامی بانڈ اسکیم جو حکومتِ پاکستان نے جاری کی ہوئی ہے، اس میں کوئی رقم لگانا اور اِنعامی بانڈ خریدنا اور اِنعام نکلنے کی صورت میں اِنعام کی رقم حلال اور جائز ہے یا قمار اور حرام ہے؟ ہمارے ہاں بعض علماء اس کو حرام اور قمار کہتے ہیں، اور بعض دُوسرے اس کو حلال اور جائز کہتے ہیں۔ جو جائز کہتے ہیں وہ آپ کے فیصلے کو بنیاد بناتے ہیں، جو اس کو حلال اور جائز کہتے ہیں وہ شریعت اپیلٹ بنچ کے فیصلے مندرجہ PLD 1992

(۱) ربا کی حرمت سے متعلق حوالہ جات ص:۲۶۷ کے حاشیہ نمبر۱ اور قمار کی حرمت سے متعلق تفصیلی دلائل کے لئے جواہر الفقہ ج:۲ ص:۳۳۹ میں رسالہ ”احکام القمار“ میں ملاحظہ فرمائیں۔

S.C 153 میں آپ کے، پیر کرم شاہ صاحب مرحوم اور تیسرے جج صاحب کے مندرجات کو بنیاد بنا کر حلال کہتے ہیں۔ یہ آپ ہی واضح کر سکتے ہیں۔ فیصلے کی نقل فوٹو کاپی لف ھٰذا ہے، اور اِستفتاء بھی لف ہے، اس مسئلے میں فتویٰ صادر فرمائیں تاکہ ابہام اور اختلاف ختم ہو۔

نیازمند

کفایت اللہ

بودلہ کالونی

شجاع آباد

(اِستفتاء)

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین کہ گورنمنٹ پاکستان کی جاری کردہ اِنعامی اسکیم جس کو ''اِنعامی بانڈ'' (Prize Bond) کہتے ہیں، جس پر قرعہ اندازی کے ذریعے بعض نمبروں پر اِنعامات دیئے جاتے ہیں، جس کو اِنعام ملتے ہیں یا نہیں ملتے ان کی اصل رقم ہر حال میں محفوظ رہتی ہے، تو کیا ان بانڈز کا خریدنا، سرمایہ لگانا اور اِنعام ملنے کی صورت میں اِنعامی رقم حلال اور جائز ہے یا حرام یا قمار ہے؟ PLD 1992 SC 153 کی روشنی میں، بینوا توجروا (سائل: کفایت اللہ بودلہ، شجاع آباد، ملتان)

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا، پرائز بانڈ کے بارے میں بندہ کا فتویٰ شروع سے یہ ہے کہ اس کی خریداری اور اس پر ملنے والا اِنعام شرعاً ناجائز ہے۔[1] میرے جس فیصلے کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ پرائز بانڈ جائز ہے، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ جس وقت فیڈرل شریعت کورٹ نے اس کو ناجائز قرار دیا تھا، اس وقت اُسے مالیاتی معاملات میں کوئی حتمی فیصلہ دینے کا اختیار نہیں تھا، یہی موقف شفیع الرحمٰن صاحب کے فیصلے میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پرائز بانڈ کی حلت و حرمت کے مسئلے کو سپریم کورٹ کی طرف سے کسی آئندہ موقع کے لئے کھلا رکھا جائے۔ البتہ پیر کرم شاہ صاحب مرحوم پرائز بانڈ کے جواز کے قائل تھے، اس لئے انہوں نے اپنے فیصلے میں صراحۃً اس کو جائز قرار دیا، لیکن میرے اور شفیع الرحمٰن صاحب کے فیصلے میں اس کے جواز یا عدمِ جواز سے بحث کئے بغیر اس بناء پر اپیل مسترد کی گئی کہ فیڈرل شریعت کورٹ کو اُس وقت حتمی فیصلہ دینے کا اختیار نہیں تھا، اس میں یہ مفہوم قانونی طور پر پنہاں ہے کہ جب فیڈرل شریعت کورٹ کو مالی اُمور میں فیصلے دینے کا حق ملے گا، اس وقت وہ بھی حتمی فیصلہ جاری کرسکتا ہے۔ لہٰذا میرے اس فیصلے کو پرائز بانڈ کے جواز میں دلیل

(۱) تفصیل اگلے فتاویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

کے طور پر پیش کرنا دُرست نہیں ہے۔ اس کے عدمِ جواز پر میرے فتاویٰ جاری ہو چکے ہیں[1]، لیکن چونکہ اس فیصلے میں اس کے عدمِ جواز کا حکم لکھنے سے اس کی قانونی حیثیت کچھ نہ ہوتی، اور آئندہ اس مسئلے پر عدالتی چارہ جوئی کا راستہ بھی بند ہونے کا اِمکان تھا، اس لئے میں نے اس جملے پر اِکتفا کیا جو ''نتائجِ بحث'' کے عنوان کے تحت پیرگراف نمبر۳ میں درج ہے۔

والسلام
بندہ محمد تقی عثمانی
۱۴۲۵/۶/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۵۲/۲۰)

پرائز بانڈز اور اس پر ملنے والی اِنعامی رقم کا حکم

سوال:- اِنعامی (پرائز) بانڈ کا مسئلہ درپیش ہے، اس پر انعام نکلنے پر ان روپوں کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اور کن کن کاموں میں خرچ کر سکتے ہیں؟

جواب:- مروّجہ اِنعامی بانڈز پر جو اِنعام ملتا ہے تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس میں سود کو قمار کے ذریعے تقسیم کیا جاتا ہے، لہٰذا یہ اِنعام وصول کرنا شرعاً حرام ہے[2]، البتہ اگر کوئی رقم اس طرح غلطی سے وصول کرلی گئی ہو تو اُسے بغیر نیتِ ثواب کے صدقہ کر دینا ضروری ہے، اور یہ صدقہ ایسا ہے کہ اپنے مستحق قریبی رشتہ داروں کو بھی دیا جاسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۴۷/۲۷ھ)

پرائز بانڈز پر ملنے والی اِنعامی رقم کا حکم

سوال:- پرائز بانڈز کے جو اِنعامات ہیں وہ شرع کی رُو سے جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:- مروّجہ اِنعامی بانڈز میں سود کو قمار کر کے بطور اِنعام دیا جاتا ہے، اس لئے اس اِنعام کو وصول کرنا شرعاً حرام ہے[3]۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۱۰/۲۷د)

اِنعامی بانڈز اور اس کی رقم سے زکوٰۃ اور حج ادا کرنے کا حکم

سوال:- میری والدہ کی کفالت میرے ذمے ہے، علاوہ اس کے وہ اپنے تین بچوں کو تعلیمِ

(۱) یہ فتاویٰ آگے آرہے ہیں۔
(۲و۳) دیکھئے ص:۱۷۳ کا حاشیہ۔

قرآن بھی دیتی ہے، جو ہدیہ وہ وصول کرتی ہے وہ ان کے ذاتی مصرف کے علاوہ ہے۔ قربانی، زکوٰۃ، خیرات میں استعمال ہوتا ہے، اس رقم سے والدہ نے کچھ انعامی بانڈ بھی خرید رکھے تھے کہ وقتِ ضرورت کام آئے، قدرت کی کرم نوازی سے ان کے بانڈ پر ۵۰۰۰ روپیہ انعام آیا، رقم وصول ہوتے ہی جو زکوٰۃ واجب تھی وہ ادا کردی، نیز کچھ حصہ گھر کے خرچ میں ملایا گیا، باقی محفوظ ہے، والدہ کی خواہش ہے کہ حج کی سعادت نصیب ہو، کیا وہ اس رقم سے حج کرسکتی ہے؟

جواب:- اِنعامی بانڈز پر جو رقم بطورِ اِنعام دی جاتی ہے، قواعد وضوابط دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ خالصتاً سود کی رقم ہے، جسے قمار کے طریقے پر تقسیم کیا جاتا ہے، لہٰذا اس کا لینا جائز نہیں[1]۔ اور اگر یہ رقم غلطی سے لے لی ہے تو اسے نیتِ ثواب کئے بغیر صدقہ کرنا واجب ہے، اس رقم کو نہ حلال آمدنی کی زکوٰۃ پر خرچ کیا جاسکتا ہے، اور نہ اس سے حج کرسکتے ہیں، نہ ذاتی استعمال میں لاسکتے ہیں۔ لہٰذا جو رقم انہوں نے بطورِ زکوٰۃ نکالی ہے اگر وہ ان کی حلال آمدنی کی زکوٰۃ تھی تو وہ ادا نہیں ہوئی، دوبارہ زکوٰۃ دینا ضروری ہے، اور اگر اِسی اِنعام کی رقم کی زکوٰۃ نکالی تھی تو اسے دوبارہ نہ نکالا جائے، اور اس رقم میں سے جس قدر حصہ گھر کے استعمال میں لائی ہیں، اسے بھی صدقہ کرنا واجب ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۷/ ۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

اِنعامی بانڈز کا حکم

سوال:- اِنعامی بانڈز کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟

جواب:- تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہر بونڈ خریدنے والے کے نام پر ایک معین شرح سے سود لگایا جاتا رہتا ہے، لیکن پھر بجائے اس کے کہ ہر شخص کی رقم پر علیحدہ سود دیا جائے، تمام افراد کے سود کی مجموعی رقم کو قرعہ اندازی کے ذریعے صرف ان لوگوں پر تقسیم کیا جاتا ہے جن کا نام قرعہ میں نکل آئے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بانڈ کے اِنعام کی رقم سود کو قمار کرکے ادا کیا جاتا ہے، اس لئے یہ رقم لینا حرام ہے[2]۔ والسلام[3]

❊❊❊

(۱و۲) دیکھئے ص:۱۷۳ کا حاشیہ۔
(۳) یہ فتویٰ ''البلاغ'' سے لیا گیا ہے۔

﴿فصل فی أحکام الأسهم﴾
(شیئرز کے اَحکام)

حلال کاروبار کرنے والی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے

سوال:- شیئرز خرید کر کسی کمپنی میں حصہ دار بننا اور نفع حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بکر کہتا ہے کہ جائز ہے، میں نے مفتی رشید احمد اور مولانا ظفر احمد تھانوی صاحب سے پہلے فتویٰ حاصل کیا تھا۔

جواب:- اگر کمپنی کا کاروبار خلافِ شرع نہ ہو تو شیئرز خریدنے میں کوئی حرج نہیں۔

واللہ اعلم
۱۳۹۲/۱۲/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷.۸/ ۲۷.۰ و)

کونسی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے؟ نیز اسٹاک ایکسچینج والوں کو کمیشن دینے کا حکم

سوال:- کونسی کمپنی کے شیئرز خریدنا جائز ہیں؟ اور کس حال میں یعنی جب کمپنی کس حالت میں پہنچے تو اس کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہوگی؟ اور اسٹاک ایکسچینج والوں کو اس پر دلالی کا کمیشن دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر کمپنی کسی حرام کاروبار میں ملوّث نہیں ہے اور اس کے کچھ اثاثے وجود میں آچکے ہیں تو اس کے حصص کی خرید وفروخت جائز ہے،[1] اور اسٹاک ایکسچینج والوں کو اس پر دلالی کا کمیشن دینا بھی جائز ہے،[2] لیکن جو کمپنی حرام کاروبار میں ملوّث ہو، اس کے حصص کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔[3] نیز جس کمپنی کے اثاثے ابھی وجود میں نہ آئے ہوں، بلکہ اس کے سارے اثاثے نقد روپے کی شکل میں ہوں اس کے حصے کو اس کی اصل قیمت (Face Value) سے کم یا زیادہ میں خریدنا بیچنا بھی حرام ہے۔[4]

واللہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۷۵/۵۸)

(۱ تا ۴) ان مسائل کی تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' ص:۸۶ تا ص:۹۲ ملاحظہ فرمائیں۔

اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی خرید وفروخت اور شیئرز پر قبضے سے متعلق حکمِ شرعی کی تحقیق

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلے کے بارے میں کہ: آج کل شیئرز کی خرید وفروخت کثرت سے ہو رہی ہے، علمائے کرام کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ شیئرز کے قبضے میں آنے سے پہلے ان کو فروخت کرنا جائز نہیں، جبکہ اسٹاک ایکسچینج کی مروّجہ صورتِ حال کے پیشِ نظر شیئرز پر قبضہ کس طرح ممکن ہے؟ اور شیئرز پر قبضہ کب سمجھا جائے گا؟ اور کب شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہوگی اور کب جائز نہ ہوگی؟ براہِ کرم اس بارے میں شریعت کی روشنی میں تفصیلی جواب مرحمت فرمائیں۔

سائل: عبداللہ، کورنگی

جواب:-

الحمد للہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہ وأصحابہ أجمعین، وعلیٰ کل من تبعھم باحسان الیٰ یوم الدّین

آج کل کمپنیوں کے حصص کی بیع وشراء جن طریقوں سے ہوتی ہے، ان کی شرعی حیثیت کے بارے میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور پوچھے بھی جاتے ہیں، ان کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے اس طریقِ کار کی صحیح واقفیت ضروری ہے جو اس بیع وشراء میں اختیار کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس وقت گفتگو ان کمپنیوں کے حصص کے بارے میں ہو رہی ہے، جن کا کاروبار شرعاً حلال ہے اور ان کے حصص کی خریداری حضرت حکیم الأمت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کے فتویٰ ''القصص السنی فی حصص الکمبنی'' کی رُو سے جائز ہے۔

یہ معلومات حاصل کرنے کے لئے دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء سے اہلِ علم کی ایک جماعت نے کراچی کے اسٹاک ایکسچینج کا دورہ کیا، ایکسچینج کے ذمہ داروں سے عملی صورتِ حال معلوم کی، اور ان کے قواعد وضوابط حاصل کرکے ان کا مطالعہ کیا۔ اس تحقیق کے نتیجے میں جو صورتِ حال واضح ہوئی وہ ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

بنیادی طور پر قابلِ تحقیق اُمور مندرجہ ذیل تھے:-

۱- ڈے ٹریڈنگ، یعنی ایک ہی دن میں حصص خرید کر اسی دن بیچ دینا۔

۲- مستقبل کے سودے (Forward)۔

۳- بدلے کے معاملات۔

ڈے ٹریڈنگ

ڈے ٹریڈنگ کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص ایک ہی دن میں حصص خرید کر اسی دن کسی اور شخص کو وہ حصص بیچ دیتا ہے، یہ ڈے ٹریڈنگ فوری سودوں (Spot Transactions) میں بھی ہوتی ہے، اور مستقبل کے سودوں (Forward Trading) میں بھی۔ پہلے ہم فوری سودوں کی تحقیق کرتے ہیں۔

فوری سودے (Spot Trading)

فوری سودوں کا طریقِ کار یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کمپنی کے حصص خریدتا ہے تو اس خریداری کا اندراج فوری طور سے KAT میں ہوجاتا ہے، جو اسٹاک ایکسچینج میں ہونے والے سودوں کا کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ ہوتا ہے، اور اسٹاک ایکسچینج ان سودوں میں فریقین کی ذمہ داریوں کی ضمانت دیتا ہے، اس سودے کو حاضر سودا بھی کہا جاتا ہے، فوری سودوں میں ہر سودے کے تین دن بعد خریدار کو طے شدہ قیمت ادا کرنی ہوتی ہے، اور بیچنے والے کو بیچے ہوئے حصص کی ڈیلیوری دینی ہوتی ہے۔ ڈیلیوری کا مطلب حصص کی بیع میں یہ ہوتا ہے کہ جس کمپنی کے حصص بیچے گئے ہیں اس کمپنی کے ریکارڈ میں سی ڈی سی کے ذریعے ان حصص کی منتقلی خریدار کے نام ہوجاتی ہے۔

فقہی نقطۂ نظر سے یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی چیز خریدے تو اس کے لئے شرعاً ضروری ہے کہ پہلے اس چیز پر قبضہ کرے، پھر اس کے لئے آگے فروخت کرنا جائز ہوتا ہے، قبضے سے پہلے بیع جائز نہیں۔ اب حصص کی خریداری میں صورتِ حال یہ ہے کہ ڈیلیوری، خریداری کے تین دن بعد ہوتی ہے، سوال یہ ہے کہ خریداری اور ڈیلیوری کے درمیان جو تین دن کی مدّت ہے، کیا خریدار کے لئے جائز ہے کہ اس درمیانی مدّت میں وہ اپنے خریدے ہوئے حصص کسی اور شخص کو فروخت کردے؟

اگر ڈیلیوری کو شرعی قبضہ قرار دیا جائے تو ڈیلیوری سے پہلے فروخت کرنا بیع قبل القبض قرار پائے گا، اور ناجائز ہوگا، لیکن دُوسرا اِحتمال یہ ہے کہ ''ڈیلیوری'' شرعی قبضے سے عبارت نہیں، بلکہ کمپنی میں حصص کے خریدار کے نام پر اِندراج کو ''ڈیلیوری'' کہا جاتا ہے، ورنہ جہاں تک خریدے ہوئے حصص کے جملہ منافع اور نقصانات کا تعلق ہے، وہ خریداری کے متصل بعد خریدار کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں، یعنی اگر خریداری اور ڈیلیوری کی درمیانی مدّت میں کمپنی کو کوئی نقصان ہوجائے تو وہ نقصان خریدار ہی برداشت کرتا ہے، اور اگر کمپنی کو نفع ہوجائے تو اس نفع کا فائدہ بھی خریدار ہی کو پہنچتا ہے۔

یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ حصص کی بیع کا مطلب کمپنی کے حصصِ مشاعہ کی بیع ہے، لہٰذا یہ ''بیع المشاع'' ہے اور مشاع میں حِسی قبضہ ممکن نہیں ہوتا۔ دُوسری طرف بیع قبل القبض کی ممانعت کی علّت یہ ہے کہ جب تک مشتری مبیع پر قبضہ نہ کرے، یا کم از کم بائع تخلیہ نہ کرے، مبیع بائع ہی کے ضمان

میں رہتی ہے، یعنی اگر اس دوران وہ ہلاک ہوجائے تو بیع فسخ ہوجاتی ہے، لہٰذا اگر قبضہ کئے بغیر مشتری نے مبیع کسی اور کو فروخت کردی، بعد میں بائعِ اصلی ہی کے قبضے میں ہلاک ہوگئی تو پہلی بیع فسخ ہوجائے گی، تو اس کے نتیجے میں دُوسری بیع بھی فسخ ہوجائے گی، لہٰذا اس دُوسری بیع میں شروع ہی سے غررِ انفساخ پایا جاتا ہے۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ بیع قبل القبض کی ممانعت کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ولأنه بيع فيه غرر الانفساخ بهلاک المعقود عليه، لأنه اذا هلک المعقود عليه قبل القبض يبطل البيع الأوّل، فينفسخ الثاني.

(بدائع الصنائع ج:۴ ص:۳۹۴، مؤسسة التاريخ العربی)[۱]

بیع قبل القبض کی ممانعت کی اس سے زیادہ واضح علّت یہ ہے کہ اس سے ربح مالم یضمن لازم آتا ہے، کیونکہ قبضے سے پہلے مبیع کا ضمان مشتری کی طرف منتقل نہیں ہوتا، اب اگر وہ اسے آگے فروخت کرے اور اس میں نفع کمائے تو یہ ربح مالم یضمن ہوگا، جس کی ممانعت مندرجہ ذیل حدیث میں آئی ہے:-

لا يحل سلف وبيع ولا شرطان في بيع، ولا ربح مالم تضمن.

(سنن أبی داؤد ج:۳ ص:۲۸۳، کتاب البيوع، باب فی الرجل يبيع ما ليس عنده)[۲]

جامع ترمذی میں یہ حدیث ان الفاظ سے مروی ہے:-

لا يحلّ سلف وبيع ولا شرطان في بيع ولا ربح ما لم يضمن.

(جامع الترمذی ج:۳ ص:۵۳۵، باب ما جاء فی كراهية بيع ما ليس عندهٔ)[۳]

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

يريد به الربح الحاصل من بيع ما اشتراه قبل أن يقبضه وينتقل من ضمان البائع الىٰ ضمانه، فان بيعه فاسد، في شرح السُّنّة: قيل: معناه ان الربح في كل شيء انما يحل ان لو كان الخسران عليه، فان لم يكن الخسران عليه كالبيع قبل القبض اذا تلف فان ضمانه على البائع.

(مرقاة المفاتيح ج:٦ ص:۸۹)[۴]

---

(۱) ج:۵ ص:۱۸۰ (طبع سعید).

(۲) سنن ابی داؤد ج:۲ ص:۱۳۹ (طبع مکتبہ رحمانیہ).

(۳) ابواب البیوع، ج:۱ ص:۲۳۳ (طبع سعید).

(۴) ج:٦ ص:۸۲ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان).

اور علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

وربح ما لم یضمن، یرید به الحاصل من بیع ما اشتراه قبل أن یقبضه وینتقل من ضمان البائع الیٰ ضمانه، فان بیعه فاسد. (شرح الطیبی ج:۶ ص:۸۲)[1]

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

(وربح مالم یضمن) هو ربح مبیع اشتراه فباعه قبل أن ینتقل من ضمان البائع الأوّل الیٰ ضمانه بالقبض.

(حاشیة السندی علی المجتبی للنسائی ج:۷ ص:۲۹۵)[2]

اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:-

ولا ربح مالم تضمن، أی لا یحل ربح شیءٍ لم یدخل فی ضمانه وهو ربح مبیع اشتراه فباعه قبل أن ینتقل عن ضمان البائع الأوّل الیٰ ضمانه بالقبض.

(بذل المجهود ج:۱۵ ص:۱۸۰، کتاب البیوع، باب فی الرجل یبیع ما لیس عنده)[3]

حاصل یہ ہے کہ کسی چیز کی بیع قبل القبض اس لئے ناجائز ہوتی ہے کہ قبضے کے بغیر اس کا ضمان مشتری کی طرف منتقل نہیں ہوتا، لہٰذا اگر وہ نفع پر آگے بیچنا چاہتا ہے تو یہ ربح مالم یضمن میں داخل ہے، نیز جیسا کہ صاحبِ بدائع نے فرمایا، قبضے سے پہلے اگر مبیع ہلاک ہوجائے تو بائع کے ضمان میں ہونے کی بناء پر بیع فسخ ہوجائے گی، اور اس کے نتیجے میں اگلی بیع بھی فسخ ہوگی، لہٰذا اگلی بیع میں شروع ہی سے غررِ اِنفساخ پایا جاتا ہے۔

لیکن اگر ضمان حسّی اور حقیقی قبضے کے بغیر تخلیہ کے ذریعے مشتری کی طرف منتقل ہوجائے تو پھر چونکہ نہ ربح مالم یضمن کا اندیشہ ہے، نہ غررِ اِنفساخ کا، اس لئے مشتری کے لئے اسے آگے بیچنا جائز ہے، اسی لئے فقہائے کرام رحمہم اللہ نے تخلیہ کو قبضہ کے قائم مقام قرار دیا ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:-

وأجمعوا علیٰ أن التخلیة فی البیع الجائز تکون قبضًا، وفی البیع الفاسد روایتان والصحیح انها قبض .... رجل باع خلًّا فی دنّ فی بیته فخلّی بینه وبین المشتری فختم المشتری علی الدنّ وترکه فی بیت البائع فهلک

(۱) (طبع ادارة القرآن کراچی).

(۲) ج:۲ ص:۲۲۶ (طبع مکتبة الحسن).

(۳) کتاب الإجارة ج:۴ ص:۲۸۷ و ۲۸۸ (طبع معهد الخلیل الإسلامی).

بعد ذٰلک فانه یهلک من مال المشتری فی قول محمد، وعلیه الفتویٰ.[1]
(فتاویٰ عالمگیریة ج:۳ ص:۱۶، کتاب البیوع، باب:۴ فصل:۲)

اب دیکھنا یہ ہے کہ مُشاع کی بیع میں قبضہ کیسے متحقق ہوتا ہے؟ اس کے جواب میں بھی فقہائے کرام نے یہی فرمایا ہے کہ مشاع کی بیع میں تسلیم اور قبض کا تحقق تخلیہ ہی سے ہوتا ہے۔ علامہ سرخسی رحمہ اللہ اجارۃ المشاع (جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جائز نہیں) اور بیع المشاع کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

وهٰذا بخلاف البیع، لأن التسلیم هناک بالتخلیة یتم وذٰلک فی الجزء الشائع یتم. (مبسوط السرخسی ج:۱۵ ص:۱۴۶، کتاب الاجارة)[2]

صاحبِ ہدایہ رحمہ اللہ نے بھی اس فرق کو اس طرح بیان فرمایا ہے:-

ولأبی حنیفة أنه آجر ما لا یقدر علیٰ تسلیمه فلا یجوز، وهٰذا لأن تسلیم المشاع وحده لا یتصور، والتخلیة اعتبرت تسلیمًا لوقوعه تمکینًا، وهو الفعل الذی یحصل به التمکن، ولا تمکن فی المشاع، بخلاف البیع لحصول التمکن فیه.[3]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اجارہ میں چونکہ مقصود صرف اِنتفاع ہوتا ہے، مِلک نہیں، اور حصۂ مشاعہ میں تمکین اِنتفاع نہیں ہوسکتی، اس لئے اس میں تخلیہ متصور نہیں ہے، اس کے برخلاف بیع میں مقصود مِلک ہوتی ہے، لہٰذا تخلیہ کے ذریعے اس میں تمکین ہوسکتی ہے، چنانچہ صاحبِ عنایہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:-

بخلاف البیع فان المقصود به لیس الانتفاع، بل الرقبة، ولهٰذا جاز بیع الجحش فکان التمکن بالتخلیة فیه حاصلًا.[4]

اور صاحبِ کفایہ اس کو مزید واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

ان التخلیة اعتبرت تسلیمًا اذا کان تمکینًا من الانتفاع، وانما یکون تمکینًا اذا حصل بها التمکن، والتمکن لا یحصل به فلم یعتبر فعلهٗ تمکینًا

---

(۱) طبع رشیدیه کوئٹه.
(۲) باب اجارة الدّور والبیوت ج:۱۵ ص:۱۶۳ (طبع غفاریه کوئٹه).
(۳) هدایة کتاب الأجارات ج:۳ ص:۳۰۶ (طبع مکتبه رحمانیه) یہاں یہ بات واضح رہے کہ ہدایہ کے مذکورہ نسخے میں "انه آجر ما یقدر علیٰ تسلیمه" کے الفاظ ہیں، بظاہر وہ کتابت کی غلطی ہے کیونکہ ایسی صورت میں یہ اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل نہیں بن سکتی۔ صحیح الفاظ وہی ہیں جو حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اُوپر ذِکر فرمائے ہیں یعنی "انه آجر مالا یقدر علیٰ تسلیمه" اور فتح القدیر ج:۸ ص:۴۱ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) اور مکتبہ شرکت علمیہ ملتان کے طبع شدہ نسخۂ ہدایہ ج:۳ ص:۳۰۳ اور مکتبۃ البشریٰ کراچی کے طبع شدہ ہدایہ (ج:۶ ص:۲۹۸) کے نسخے میں بھی اسی طرح ہے۔
(۴) عنایة علیٰ فتح القدیر ج:۸ ص:۴۱ (طبع رشیدیه).

بخلاف البیع، لحصول التمکن ثمة من البیع والاعتاق وغیر ذٰلک.
(فتح القدیر مع العنایة والکفایة ج:۸ ص:۴۱ و ۴۲ باب الاجارة الفاسدة)[۱]

صاحبِ کفایہ کی خط کشیدہ عبارت سے یہ بات واضح ہے کہ مشاع میں حِسی قبضے کے بغیر تخلیہ قبضے کے قائم مقام ہوجاتا ہے اور مشتری کے لئے اس میں ملک کے تصرفات کرنا جائز ہوجاتا ہے، جن میں اسے آگے فروخت کرنا بھی شامل ہے۔

علامہ طوری رحمہ اللہ نے بھی تکملہ البحر الرائق میں فرق کی وضاحت صاحبِ ہدایہ اور صاحبِ عنایہ کے بیان کے مطابق کی ہے۔ (تکملة البحر ج:۸ ص:۳۶، باب الاجارة الفاسدة)[۲]

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مشاع کی بیع میں حسی قبضہ تو ممکن نہیں ہوتا، لیکن تخلیہ اور تمکین سے قبضے کا مقصود حاصل ہوجاتا ہے، اور مشتری کے لئے اس تخلیہ یا تمکین کے بعد اسی مُشاع کو آگے فروخت کرنا بھی جائز ہوجاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حصص کی بیع میں بائع کی طرف سے تمکین اور تخلیہ کا تحقق ہوجاتا ہے یا نہیں؟

اگرچہ اسٹاک ایکسچینج کے ذمہ دار اور اس میں کام کرنے والے اس بات پر متفق نظر آئے کہ سودا ہوتے ہی بیچے ہوئے شیئرز کے حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہیں، گویا شیئرز خریدار کے ضمان میں آجاتے ہیں (اور اس لحاظ سے اگر خریدار انہیں آگے بیچے تو "ربح مالم یضمن" لازم نہیں آتا) لیکن اسٹاک ایکسچینج کے قواعد وضوابط کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قبضۂ شرعی کا تحقق ڈیلیوری سے پہلے نہیں ہوتا، جس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- یہ بات فقہِ اسلامی میں طے شدہ ہے کہ "قبض کل شیء بحسبه"[۳] یعنی ہر چیز کا قبضہ اس شئ کی نوعیت کے لحاظ سے عرفاً مختلف ہوتا ہے، شیئرز کے بارے میں عرفِ عام یہی ہے کہ سودے کے وقت محض اسٹاک ایکسچینج کے فوری اندراج کو قبضہ نہیں کہا جاتا، بلکہ کہا جاتا ہے کہ "ڈیلیوری" تین دن بعد ہوگی، ڈیلیوری کے معنی ہی قبضہ دینے کے ہیں، لہٰذا عرف نے اسی کو قبضہ قرار دیا ہے۔

۲- اسٹاک ایکسچینج میں "بیع مالا یملک الانسان" (Short Sale) کا رواج عام ہے، جب ہم نے اسٹاک ایکسچینج کا دورہ کیا، اس وقت ہمیں یہ بتایا گیا کہ حاضر سودوں یعنی فوری سودوں میں شارٹ سیل ممنوع کردی گئی ہے، لیکن قواعد وضوابط سے پتہ چلتا ہے اور بعد میں اسٹاک ایکسچینج کے صدر

---

(۱) طبع رشیدیه.
(۲) ج:۸ ص:۲۱ (طبع سعید).
(۳) کما فی البحر الرّائق ج:۵ ص:۲۴۸ (طبع سعید) قبض کل شیء وتسلیمه یکون بحسب ما یلیق به. وفیه بعد أسطر: قبض کل شیء یکون بما یلیق به.

صاحب نے بھی اس کی تصدیق کی کہ جو چیز منع کی گئی ہے وہ بلینک سیل (Blank Sale) ہے، یعنی ایسی بیع جس میں بائع کے پاس نہ تو ملکیت میں ہوں، اور نہ اس نے شیئرز کی خریداری کے لئے کسی سے قرض کا معاہدہ کر رکھا ہو، لیکن حاضر سودوں میں شارٹ سیل کی اس شرط کے ساتھ اجازت دے دی گئی ہے کہ بیچنے والا خریدار کو بتادے کہ وہ شارٹ سیل کر رہا ہے اور یہ کہ اس نے وقت پر شیئرز کی ڈیلیوری کے لئے کسی سے قرض لینے کا انتظام کر رکھا ہے۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ حاضر سودوں میں شارٹ سیل کا امکان موجود ہے، اور اگر بالفرض قواعد کے لحاظ سے شارٹ سیل منع بھی ہو تو اس بات کی گارنٹی نہیں ہے کہ وہ اس قاعدے کی خلاف ورزی نہیں کر رہا۔

اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص شارٹ سیل کر رہا ہے، یعنی شیئرز اس کی ملکیت میں نہیں ہیں، پھر بھی بیچ رہا ہے تو نہ صرف یہ کہ "بیع مالا یملک" ہونے کی بناء پر یہ بیع شرعاً باطل ہے، بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ سودا ہوتے ہی شیئرز کے حقوق و التزامات خریدار کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں یا خریدار کے ضمان (Risk) میں آجاتے ہیں، وہ یہ بات شرعی مفہوم میں نہیں کہتے، کیونکہ یہ بات وہ شارٹ سیل کی صورت میں بھی کہتے ہیں، حالانکہ شرعی مفہوم میں شارٹ سیل کی صورت میں ضمان منتقل ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جب شیئرز بائع ہی کی ملکیت میں نہیں ہیں تو وہ خریدار کو تمکین یا تخلیہ کیسے کر سکتا ہے؟ اور اس سے شرعی مفہوم میں ضمان کیسے منتقل ہو سکتا ہے؟

۳- کراچی اسٹاک ایکسچینج کی طرف سے ہمیں جو قواعد و ضوابط فراہم کئے گئے، ان میں حاضر سودوں کے قواعد و ضوابط (Rules For Ready Delivery Contracts) کی پہلی دفعہ میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام حاضر سودوں کا تصفیہ آئندہ ہفتے میں پیر کے دن ہونا ضروری ہے، یعنی پیر کے دن بائع شیئرز کی ڈیلیوری دے گا، اور خریدار اس کی قیمت بائع کو ادا کرے گا، لیکن اسی دفعہ کی شق بی میں یہ صراحت ہے کہ اگر بائع نے مقررہ وقت تک ڈیلیوری نہ دی تو خریدار کو حق ہوگا کہ کسی کمپنی کے جتنے شیئرز اس نے بائع سے خریدے تھے، وہ بازار سے خرید لے (جس کو اسٹاک ایکسچینج کی اصطلاح میں "Buy In" کہا جاتا ہے) اور شق سی میں کہا گیا ہے کہ ایسی صورت میں اگر خریدار کو بازار سے خریداری کرنے میں کوئی نقصان ہو (مثلاً وہ شیئرز بازار سے زیادہ قیمت میں ملیں) تو بائع کا فرض ہوگا کہ وہ خریدار کے نقصان (Damages) کی تلافی کرے۔

یہ قاعدہ واضح طور پر اس بات کا اعتراف ہے کہ سودے کے وقت قبضہ نہیں ہوا تھا، کیونکہ بائع کی طرف سے ڈیلیوری نہ دینا، دو ہی صورتوں میں ممکن ہے، یا تو بائع نے شارٹ سیل کی تھی، یعنی

(1) Regulations For Short Selling Under Ready Market, 2002, Clause.

شیئرز کے ملکیت میں ہونے کے بغیر فروخت کردیئے تھے، اس صورت کا بطلان اُوپر نمبر۲ میں گزر چکا ہے، یا پھر اس نے شارٹ سیل نہ کی تھی، مگر خریدار سے سودا کرنے کے بعد اس کی رائے بدل گئی اور اس نے وہ خود رکھنے یا کسی اور کو بیچ دینے کا فیصلہ کرلیا، جب اس کے لئے رائے بدل کر شیئرز کو خود رکھ لینا یا کسی اور کو بیچنا ممکن ہے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ سودے کے وقت اس نے خریدار کو تمکین کردی ہے یا اس کے حق میں تخلیہ کردیا ہے؟ نیز اس صورت میں اسٹاک ایکسچینج کے قواعد یہ نہیں کہتے کہ جو شیئرز فروخت کئے گئے تھے بائع کو ان کی ڈیلیوری دینے پر مجبور کیا جائے، بلکہ خریدار کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ بائع کو ڈیلیوری پر مجبور کرنے کے بجائے بازار سے اسی کمپنی کے اسی مقدار میں دُوسرے شیئرز خرید لے، اور اس خریداری میں اسے کوئی نقصان ہو تو بائع کو اس کی تلافی پر مجبور کرے، جس کا حاصل یہ ہے کہ پہلی بیع یک طرفہ طور پر فسخ کرے، اور کسی تیسرے شخص سے نئی بیع کرے۔

۴- اسٹاک ایکسچینج کے حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ حاضر سودوں کے علاوہ فارورڈ سودوں میں بھی حقوق و التزامات فوراً منتقل ہوجاتے ہیں، صرف کمپنی کے ریکارڈ میں نام کی منتقلی حاضر سودوں کے مقابلے میں زیادہ تاخیر سے ہوتی ہے، حالانکہ فارورڈ سودوں میں شارٹ سیل کا رواج حاضر سودوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، اس سے پتہ چلا کہ یہ حضرات حقوق و التزامات کی جس منتقلی کا ذکر کر رہے ہیں وہ شرعی مفہوم میں ضمان کی منتقلی نہیں ہے۔ اور اس سارے مجموعے سے جو بات واضح ہو رہی ہے، وہ یہ ہے کہ جس چیز کو اسٹاک ایکسچینج کی اصطلاح میں حاضر سودا کہا جارہا ہے، اس میں سودے کے وقت شرعی مفہوم میں قبضہ متحقق نہیں ہوتا، اور جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ سودا ہوتے ہی تمام حقوق و التزامات خریدار کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں، وہ اس معنی میں کہتے ہیں کہ اسٹاک ایکسچینج معاملے کو اِنتہاء تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے، اور شیئرز کی قیمت بڑھے یا گھٹے، بائع اسی قیمت پر شیئرز کی ڈیلیوری کرنے کا، اور خریدار وہی قیمت ادا کرنے کا پابند ہے، اور اگر کوئی فریق اپنی یہ ذمہ داری پوری نہ کرے اور خریدار کی عدم ادائیگی کی صورت میں بائع کو بازار میں شیئرز فروخت کرنے (Sale Out) میں اور بائع کے قبضہ نہ دینے کی صورت میں خریدار کو بازار سے شیئرز خریدنے میں جو نقصان ہو، دُوسرا فریق اس کی تلافی کا ذمہ دار ہے۔

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں شرعی حکم یہ ہے کہ شیئرز کے خریدار کے لئے اس وقت تک شیئرز کو آگے بیچنا جائز نہیں ہے جب تک کہ ڈیلیوری نہ مل جائے۔ اگر بیچنے والے نے شارٹ سیل کی ہے یعنی شیئرز ملک میں لائے بغیر فروخت کئے ہیں تو یہ بیع ہی باطل ہے، اور اگر شیئرز بائع کی ملک میں

تھے، اور عقدِ بیع کے ارکان متحقق ہوگئے ہیں تو یہ بیع دُرست ہے، اسے بیع الکالی بالکالی[1] اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ کمپنی کے شیئرز بائع کی ملکیت میں ہیں اور بیع حال ہے، اور تأخیرِ تسلیم محض رسمی اجراآت کی وجہ سے ہے، یاحبس المبیع لاستیفاء الثمن[2] ہے، اور مبیع عین ہے دَین نہیں، لیکن خریدار کے لئے آگے بیع کرنا اسی وقت جائز ہوگا جب اسے باقاعدہ ڈیلیوری مل جائے، لہٰذا اس وقت جس طرح ڈے ٹریڈنگ ہورہی ہے (جس میں ڈیلیوری سے پہلے شیئرز آگے بیچ دیئے جاتے ہیں) وہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

مستقبل کے سودے (Futures)

مذکورہ بالا تفصیل حاضر سودوں کے بارے میں تھی، جنھیں "Spot Sales" یا "Ready Contracts" کہا جاتا ہے۔ جب حاضر سودوں میں صورتِ حال یہ ہے تو مستقبل کے سودوں میں جنھیں Forward یا Future کہا جاتا ہے۔ بطریقِ اَولیٰ یہ حکم ہوگا کہ ڈیلیوری کے بغیر شیئرز کو آگے بیچنا جائز نہیں، اس لئے کہ ان سودوں میں شارٹ سیل کا رواج حاضر سودوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، اور شارٹ سیل پر جو پابندیاں حاضر سودوں میں ہوتی ہیں، مستقبل کے سودوں میں اتنی پابندیاں نہیں ہیں۔

اسٹاک ایکسچینج کے دورے کے دوران ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ حاضر سودوں اور مستقبل کے سودوں میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ حاضر سودوں میں ڈیلیوری جلدی ہوجاتی ہے، اور مستقبل کے سودوں میں دیر سے ہوتی ہے، لیکن خریدے ہوئے شیئرز کے حقوق و التزامات فوراً منتقل ہوجاتے ہیں، لیکن ان حضرات کا یہ بیان اس بات کی دلیل ہے کہ حقوق و التزامات کی منتقلی کا لفظ وہ شرعی مفہوم میں استعمال نہیں کر رہے، بلکہ اس معنی میں استعمال کر رہے ہیں کہ شیئرز کی قیمت ڈیلیوری سے پہلے بڑھے یا گھٹے، ہرصورت میں بائع طے شدہ قیمت پر ڈیلیوری دینے اور خریدار طے شدہ قیمت ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مستقبل کے سودوں (Forward Sale) یا Future Sale کا حکم یہ ہے کہ:-

۱- اگر بیچنے والے کی ملکیت میں شیئرز نہیں ہیں اور وہ شارٹ سیل یا بلینک سیل کر رہا ہے تو یہ بیع مالا یملک ہونے کی وجہ سے ناجائز اور باطل ہے۔

---

(۱) مستدرک حاکم ج:۲ ص:۶۵ و۶۶ (طبع دار الکتب العلمیه بیروت).

(۲) فی الهدایة ج:۳ ص:۴۸ (طبع مکتبه رحمانیه) ...... فصار کحبس المبیع لمّا تعلّق زواله باستیفاء الثمن لا یزول دون قبض جمیعه.

۲- اگر بیچنے والے کی ملکیت میں شیئرز ہیں اور وہ ان کی ڈیلیوری بھی لے چکا ہے، اور آئندہ کی تاریخ کے لئے آج ہی ایجاب وقبول کے ذریعے بیع کی تکمیل کر رہا ہے، جسے (Forward Sale) کہا جاتا ہے، یعنی بیع آج ہی مکمل ہوگئی ہے، لیکن وہ بیع آئندہ تاریخ کے لئے ہے، تو یہ بیع مضاف الی المستقبل ہونے کی بناء پر ناجائز ہے۔

۳- اگر بیچنے والے کی ملکیت اور قبضے میں شیئرز ہیں (یعنی وہ ان کی ڈیلیوری لے چکا ہے) اور بیع آئندہ تاریخ کے لئے نہیں، بلکہ آج ہی کی تاریخ کے لئے ہوئی ہے، البتہ قیمت اُدھار رکھی گئی ہے کہ خریدار قیمت آئندہ کسی تاریخ پر اَدا کرے گا، تو اس صورت میں شیئرز کی ڈیلیوری خریدار کو دینی ہوگی، اور قیمت کی وصولی کے لئے ڈیلیوری دیئے بغیر شیئرز اپنے قبضے میں رکھنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ بیع مؤجل ہے، اور بیع مؤجل میں حبس المبیع لاستیفاء الثمن جائز نہیں ہے۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

قال أصحابنا رحمهم الله تعالیٰ: للبائع حق حبس المبیع لاستیفاء الثمن اذا کان حالًا کذا فی المحیط، وان کان مؤجّلًا فلیس للبائع أن یحبس المبیع قبل حلول الأجل ولا بعده، کذا فی المبسوط.

(فتاویٰ عالگمیریة ج:۳ ص:۱۵، باب:۴ من کتاب البیوع)[1]

۴- اگر بیچنے والے کی ملکیت اور قبضے میں شیئرز ہیں، اور وہ آج کی تاریخ ہی کے لئے خریدار کو بیچ رہا ہے، اور ان کی ڈیلیوری بھی خریدار کو دیتا ہے، لیکن قیمت، آئندہ تاریخ کے لئے اُدھار رکھی گئی ہے اور خریدار کو ڈیلیوری دینے کے بعد پھر وہی شیئرز (جو خریدار کے نام منتقل ہو چکے ہیں) اپنے پاس گروی رکھ لیتا ہے تو یہ صورت جائز ہے۔

علامہ حصکفی رحمہ اللہ، الدر المختار میں فرماتے ہیں:-

ولو کان ذٰلک الشیء الذی قال له المشتری: أمسکه، هو المبیع الذی اشتراه بعینه لو بعد قبضه، لأنه حینئذ یصلح أن یکون رهنًا بثمنه، ولو قبله لا یکون رهنًا، لأنه محبوس بالثمن.[2]

علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ اس کے تحت فرماتے ہیں:-

قوله: لأنه حینئذ یصلح ... الخ أی لتعیین ملکه فیه، حتّی لو هلک یهلک

---

(۱) (طبع مکتبہ رشیدیه).

(۲) الدر المختار ج:۶ ص:۴۹۷ (طبع سعید).

على المشترى، ولا ينفسخ العقد ط قوله "لأنه محبوس بالثمن" أى وضمانه يخالف ضمان الرهن، فلا يكون مضمونًا بضمانين مختلفين .... الخ. (رد المحتار، كتاب الرهن ج:٦ ص:٤٩٧)[1]

صورت نمبر۳ اور صورت نمبر۴ کا فرق بھی علامہ ابنِ عابدین رحمہ اللہ کی اس عبارت میں موجود ہے، اس کی مزید وضاحت بندہ کی کتاب "بحوث فی قضايا فقهية معاصرة" (ص:۱۶ تا ۱۸، طبع دارالقلم دمشق) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۵- پانچویں صورت یہ ممکن ہے کہ بیچنے والے کی ملک اور قبضے میں شیئرز ہیں، اور وہ بیع ابھی نہیں کرتا، بلکہ ایک خاص قیمت پر آئندہ بیچنے کا وعدہ کرتا ہے، اور خریدار آئندہ اس قیمت پر خریدنے کا صرف وعدہ کرتا ہے، بیع ابھی مکمل نہیں ہوتی، علمائے معاصرین کی ایک بڑی جماعت (جس میں مجمع الفقه الاسلامی جدة بھی داخل ہے) دوطرفہ وعدِ ملزم کو بھی عقد کے حکم میں قرار دے کر اسے ناجائز قرار دیتی ہے، اور جن فقہاء نے بعض معاملات (مثلاً بیع بالوفاء) میں وعدِ ملزم کو جائز قرار دیا ہے، وہ بھی اسے حاجتِ عامہ سے مشروط مانتے ہیں، چنانچہ فتاویٰ قاضی خان میں ہے:-

لأن المواعدة قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس. (الفتاوىٰ الخانية ج:۲ ص:۱۶۵)[2]

مذکورہ صورت میں کوئی ایسی حاجت نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے کوئی حرجِ عام لازم آئے، بلکہ اسٹاک ایکسچینج میں سٹہ بازی کے رُجحان کو روکنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "وعدہ" غیر ملزم ہی رہے،[3] لہٰذا اگر دونوں فریق وعدِ غیر ملزم (Non-Binding Promise) کرلیں تو یہ جائز ہے، اس صورت میں اگر کوئی فریق وعدے کو پورا نہ کرے تو وہ دیانۃً تو گناہگار ہوگا، لیکن قضاءً اسے مجبور نہ کیا جاسکے گا۔

بدلہ کے معاملات

اسٹاک ایکسچینج میں بدلہ کے معاملات اس طرح ہوتے ہیں کہ بعض اوقات ایک شخص بہت سے حصص خرید لیتا ہے، مگر قیمت ادا کرنے کے لئے اس کے پاس رقم نہیں ہوتی، ایسی صورت میں وہ خریدے ہوئے حصص کسی تیسرے شخص کو اس شرط کے ساتھ بیچ دیتا ہے کہ وہ ایک طے شدہ مدّت کے

---

(۱) (طبع سعید).

(۲) (طبع رشیدیه).

(۳) موجودہ قانون اور طریقِ کار میں یہ وعدہ ملزم ہوتا ہے، لہٰذا یہ صورت ناجائز ہے۔ (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم)۔

بعد خریدار سے وہی حصص زیادہ قیمت پر خرید لے گا، مثلاً الف نے ب سے یکم اپریل کو ایک لاکھ روپے کے دس ہزار حصص خریدے، لیکن اس کے پاس ایک لاکھ روپے نہیں ہیں، لہٰذا وہ یہ دس ہزار حصص ج کو اس شرط کے ساتھ بیچتا ہے کہ ۱۳ر اپریل کو وہ یہی حصص ایک لاکھ دو ہزار روپے میں واپس خرید لے گا۔

اس طریقِ کار میں شرعی اعتبار سے دو خرابیاں ہیں، ایک یہ کہ عموماً بدلے کا یہ معاملہ ڈیلیوری سے پہلے کیا جاتا ہے، جس کے بارے میں پیچھے بیان کیا جاچکا ہے کہ وہ بیع قبل القبض ہونے کی بناء پر ناجائز ہے۔ دُوسرے ج کو جو شیئرز بیچے جارہے ہیں وہ زیادہ قیمت پر واپس خریدنے کی شرط کے ساتھ بیچے جارہے ہیں، یہ شرط فاسد ہے، جو بیع کو فاسد کردیتی ہے، اور درحقیقت اس کا مقصد ایک لاکھ روپے لے کر ایک لاکھ دو ہزار روپے واپس کرنا ہے جو سود کی ایک شکل ہے، جس کے لئے اس بیع فاسد کو بہانہ بنایا گیا ہے، اس لئے بدلہ کے یہ معاملات بھی شرعاً ناجائز ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم وعلمہٗ اَتم واَحکم

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۲۱ر صفر ۱۴۲۶ھ - ۲ر اپریل ۲۰۰۵ء
(فتویٰ نمبر ۴۷/۸۰۳)

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۶/۵/۲۶ھ

نوٹ:- دار الافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کی مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ کا اجلاس بروز پیر بتاریخ ۲۶ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ مطابق ۴ر جولائی ۲۰۰۵ء منعقد ہوا، جس میں درج بالا تحریر لفظاً لفظاً پڑھی گئی اور مناقشہ کے بعد سب اہلِ مجلس نے اس سے اتفاق کیا۔ اس مجلس میں درج ذیل حضرات نے شرکت فرمائی:-

حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہم　(نائب مفتی جامعہ دارالعلوم کراچی)
حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب مدظلہم　(نائب مفتی جامعہ دارالعلوم کراچی)
حضرت مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب مدظلہم　(اُستاذِ حدیث جامعہ دارالعلوم کراچی)
مفتی محمد عبدالمنان صاحب مدظلہم　(نائب مفتی جامعہ دارالعلوم کراچی)
مفتی اصغر علی ربانی صاحب مدظلہم　(رفیق دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی)
مولانا عصمت اللہ صاحب مدظلہ　(رفیق دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی)
مولانا محفوظ احمد صاحب مدظلہ　(اُستاذ جامعہ دارالعلوم کراچی)
مولانا زبیر اشرف عثمانی صاحب مدظلہ　(اُستاذ جامعہ دارالعلوم کراچی)
مولانا محمد عمران اشرف عثمانی صاحب مدظلہ　(اُستاذ جامعہ دارالعلوم کراچی)

مولانا محمد یعقوب صاحب مدظلہ (رفیق دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی)

مولانا محمد افتخار بیگ صاحب مدظلہ (رفیق دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی)

مولانا خلیل احمد اعظمی صاحب مدظلہ (اُستاذ جامعہ دار العلوم کراچی)

مولانا احسان کلیم صاحب مدظلہ (اُستاذ جامعہ دار العلوم کراچی)

مولانا محمد زبیر حق نواز صاحب مدظلہ (رفیق دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی)

مولانا اعجاز احمد صمدانی صاحب مدظلہ (اُستاذ جامعہ دار العلوم کراچی)

۱:- ڈیلیوری سے پہلے شیئرز فروخت کرنے کا حکم

۲:- ایک ماہ بعد کے وعدے پر شیئرز فروخت کرنے کا حکم

۳:- شیئرز فروخت کرنے کے بعد وصولیٔ رقم کی ضمانت کے طور پر وہی شیئرز بطور رہن رکھنے کا حکم

محترم جناب حضرت جی، دامت برکاتہم حفظہ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

شیئرز سے متعلق جو آپ نے فرمایا ہے، اُس میں ایک بات کی سمجھ نہیں آئی، میں تفصیل علیحدہ لکھ رہا ہوں۔

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ شیئرز میں نے آج خرید لئے، ایجنٹ کی معرفت وہ شیئرز میں اُسی ایجنٹ کی معرفت فروخت کرنا چاہتا ہوں، ڈیلیوی یعنی CDC میں دو تین دن بعد آتا ہے۔

جواب:- مکرّم بندہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ڈیلیوری سے پہلے آگے فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔[1]

سوال:- شیئرز میں نے خریدے اور اُن کو مہینے بعد کے وعدے پر فروخت کردیئے، اُسی ایجنٹ کی معرفت جس سے لئے تھے، آپ نے فرمایا کہ یہ ٹھیک نہیں، البتہ آپ ادائیگی کرنے کے بعد اُس کی ڈیلیوری دیں، لیکن آپ نے جو یہ فرمایا کہ میں اس کو ضمانت کے طور پر رکھ سکتا ہوں، اس کی سمجھ نہیں آئی، ہوسکے تو مہربانی فرماکر وضاحت فرمادیں، آپ کی مہربانی ہوگی۔

والسلام طالبِ دُعا

الطاف حسین برخوردار یہ

---

(۱) تفصیل کے لئے سابقہ فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو ایک ماہ بعد فروخت کرنا ہے، اس میں دو کام ضروری ہیں، ایک یہ کہ آپ پہلے خریدے ہوئے شیئرز کی ڈیلیوری لے لیں[۱]، پھر اس کو فروخت کریں۔ دُوسرے یہ کہ ایک ماہ بعد کا سودا آج کرنا تو دُرست نہیں ہے[۲]، مگر یہ ہوسکتا ہے کہ آپ اسے فروخت تو آج ہی کردیں، اور ڈیلیوری بھی اس کو دے دیں[۳]، لیکن بعد میں وہی شیئرز آپ اس سے گروی کے طور پر رکھ لیں، تاکہ ایک ماہ بعد اس کو جو رقم ادا کرنی ہے، اس کی ضمانت میں یہ شیئرز رہن بن جائیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۲۶/۲/۵ھ

۱:- شیئرز کے نفع کو ذریعۂ آمدنی بنانے کی غرض سے شیئرز خریدنا
۲:- کاروبار میں سودی رقم شامل کرنے والی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم
۳:- تجارت کی غرض سے شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم

سوال ۱:- "Join Stock Companies" کے شیئرز خرید کر اس کے Dividend کو ذریعۂ آمدنی بنانا، شیئرز "Ordinary" ہیں، یعنی نفع ونقصان کی گارنٹی کے بغیر اور نفع ونقصان کے فیصد کے تعین کے بغیر ہیں۔ اور "Companies" جائز تجارت اور صنعت کا کاروبار کرتی ہیں۔ "Capital Financing" بھی بغیر سود کے کی گئی ہے۔

۲:- اُوپر والی صورت، مگر اس فرق کے ساتھ کہ "Financing" کے لئے رقم سود پر حاصل کی گئی ہے۔

۳:- نمبر۱ کی صورت، مگر اب شیئرز کی خرید "Dividend" کے بجائے کلیۃً اس شیئرز کی خرید وفروخت کے لئے کی گئی ہے، یعنی آمدنی کی صورت اب "Capital Gain" پر منحصر ہے، نہ کہ "Dividend" کی آمدنی پر۔

۴:- نمبر۲ کی صورت، مگر شیئرز کی خریداری صرف "Capital Gain" کے لئے ہے۔

(۱ تا ۳) تفصیل کے لئے ص:۱۸۷ تا ۱۹۰ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب ۱:- اس صورت میں شیئرز خریدنا جائز ہے۔ [۱]

۲:- اس صورت میں بھی شیئرز خریدنے کی گنجائش ہے، [۲] البتہ کمپنی والوں کو یہ لکھ دیا جائے کہ سود کے لین دین پر ہم راضی نہیں ہیں۔ اور کمپنی کے سالانہ اجتماع میں بھی اس بات کا اظہار کردیا جائے، خواہ پھر وہ اس پر عمل نہ کریں۔ [۳]

۳و۴:- خرید و فروخت کی غرض سے بھی شیئرز خریدنے میں کوئی حرج نہیں، [۴] البتہ سوال نمبر۳ کی صورت میں بھی سودی معاملے کے ساتھ اپنی عدم رضامندی کا اظہار کرنا چاہئے، جیسا کہ نمبر۲ میں گزرا۔ نیز ڈیلیوری سے پہلے آگے فروخت نہ کئے جائیں۔　　واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۷۵/۴۰ و)

اسلامی بینکاری اور شیئرز کے بارے میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے

(اسلامی بینکاری اور شیئرز سے متعلق خط و کتابت)

لندن کے ایک عالم مولانا موسیٰ کرماڈی صاحب نے ایک خط کے ذریعے حضرتِ والا دامت برکاتہم سے شیئرز کی خرید وفروخت سے متعلق دریافت کیا، لیکن وہ خط ڈاک کے ریکارڈ میں دستیاب نہ ہوسکنے کی بناء پر حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اُن کے فیکس کے جواب میں ''اسلامی بینکاری'' سے متعلق اپنی رائے تحریر فرمائی۔ بعد میں سائلِ موصوف کی طرف سے وہ سابقہ اصلی خط دوبارہ بھیجا گیا جس میں درحقیقت شیئرز سے متعلق دریافت کیا گیا تھا، چنانچہ پھر حضرتِ والا دامت برکاتہم نے شیئرز سے متعلق ان کے دریافت کردہ اُمور کا تفصیلی جواب دیا۔ یہ خط و کتابت ذیل میں پیش کی جارہی ہے۔ (محمد زبیر)

سوال:- محترم المقام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدہٗ اُمید ہے کہ آنجناب بخیر و عافیت ہوں گے، دیگر چار ہفتے پہلے الحاج الطاف حسین

(۱و۲) تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' ص:۸۵ تا ۸۹ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) تفصیل اور حوالہ کے لئے امداد الفتاوی ج:۳ ص:۴۹۱ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی) اور ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' ص:۸۷ وص:۸۸ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) شیئرز سے تجارت یعنی "Capital Gain" کے بارے میں علماء کی مختلف آراء اور تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' ص:۸۹ تا ۹۲ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

برخوردار یہ صاحب کی معرفت ایک تفصیلی مراسلہ[1] ارسال کیا تھا، نہ آنے پر یاد دہانی کے لئے فیکس کر رہا ہوں، سخت انتظار ہے، اُمید ہے کہ حضرتِ والا اپنی گوناگوں مصروفیات میں کچھ وقت فارغ کر کے جواب سے آگاہ فرمائیں گے۔ فقط والسلام

موسیٰ کرماڈی، لندن

جواب:- گرامی قدر مکرّم جناب مولانا موسیٰ کرماڈی صاحب مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ الطاف برخوردار یہ صاحب کی معرفت ایسے طریقے سے ملا کہ وہ جواب طلب ڈاک میں شامل نہ ہوسکا، اور کاموں کے ہجوم میں ذہن سے نکل گیا۔ اب آپ کا براہِ راست فیکس موصول ہوا تو یاد آیا، اور اَب وہ گرامی نامہ مل نہیں رہا ہے، تاہم جہاں تک یاد ہے، آپ نے یہ اِستفسار فرمایا تھا کہ کیا اسلامی بینکاری کے بارے میں میری رائے تبدیل ہوئی ہے؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ اسلامی بینکاری کے بارے میں جو کچھ بندہ نے اپنی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت و تجارت'' میں لکھا ہے، یا انگریزی کتاب ''انٹروڈکشن ٹو اسلامک فائنانس'' میں لکھا ہے، چند بہت جزوی معاملات کے سوا اس کے بارے میں بندہ کی رائے تبدیل نہیں ہوئی۔ اس پر تنقید میں جو رسائل نظر سے گزرے، جن میں سے ایک پر آنجناب کی تقریظ بھی ہے، اُن کے مطالعے کے بعد بھی بندہ کی رائے وہی ہے جو ان کتابوں میں مذکور ہے۔ البتہ اس بات کا اظہار میں نے متعدّد مقامات پر کیا ہے کہ میں اس موضوع میں ضرورت کی وجہ سے داخل ہوا تھا، یہ میری ذاتی دِلچسپی کا موضوع نہیں ہے، نیز میں سمجھتا ہوں کہ اِسلامی مالیاتی اِداروں کو مرابحہ، اِجارہ وغیرہ پر ہی قانع ہوکر نہ بیٹھنا چاہئے بلکہ شرکت اور مضاربت کی طرف پیش قدمی کرنی چاہئے۔ نیز میں اپنے دیگر علمی منصوبوں پر کام کرنے کے لئے اپنے آپ کو فارغ کرنا چاہتا ہوں، اس لئے ان اِداروں کے شریعہ بورڈ کی رُکنیت سے رفتہ رفتہ علیحدگی اِختیار کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ اس وضاحت سے بندہ کا موقف واضح ہوگیا ہوگا، اگر مزید کوئی بات دریافت طلب ہو تو بندہ سے براہِ راست رابطہ فرمالیں۔ والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۸/۱۲/۱۴۲۷ھ

---

(۱) یہ مراسلہ جوشیئرز سے متعلق کئی سوالات پر مشتمل تھا، آگے اس سوال کے جواب کے بعد آرہا ہے۔

۱:-شیئرز کی خرید و فروخت میں اُمت کی کونسی مجبوری اور اِضطرار ہے؟

(''اِمداد الفتاویٰ'' اور ''اسلام اور جدید معیشت و تجارت'' میں جواز کے فتویٰ کی روشنی میں اِضطرار و مجبوری کے مفہوم اور درجے کی وضاحت)

۲:-شیئرز کے فتویٰ جواز اور ''اِنعام الباری'' کی ایک عبارت کی وضاحت

محترم المقام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدہٗ اُمید ہے کہ آپ حضرت بخیر و عافیت ہوں گے۔ دیگر آنجناب کا ارسال کردہ فیکس موصول ہوا، میرا اگلا خط سامنے ہوتا تو شاید جواب تشنہ نہ رہتا، بہرحال اس خط کی کاپی دوبارہ اِرسالِ خدمت ہے۔ اس کے علاوہ مکتبہ دارالعلوم کراچی کی شائع کردہ کتاب ''اِمداد الفتاویٰ'' جلد:۳ کے صفحہ:۴۹۹ کی کاپی بھی اِرسال ہے، جس میں حضرت تھانویؒ نے پچھلے چند صفحوں کی دس باتوں پر عربی زبان میں تبصرہ فرماتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ:''یقول اشرف علی ان ھٰذا التوسع کلہ فی امثال ھٰذہ المعاملات لمن ابتلیٰ بھا او اضطر الیھا واما غیرہ فالتوقی الورع'' اس عبارت میں حضرتؒ نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ پچھلی ساری سہولتیں صرف اِضطراری یا مجبوری کی حالت میں ہیں۔

بناء بریں آنجناب نے ''اسلام اور جدید معیشت و تجارت'' کے صفحہ:۸۷،۸۸ پر جواز کی جو صورت نکالی ہے، اس میں اُمت کے سامنے شیئرز خریدنے کے لئے کونسی ایسی مجبوری ہے یہ میری ناقص سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ ''انعام الباری'' جلد:۶ میں شیئرز کو مثل سٹہ، سرمایہ دارانہ نظام اور عجیب وغریب قسم کا بازار جو لکھا ہے مجھے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، لہٰذا:-

۱-شیئرز کی خرید و فروخت کے جواز پر اُمت کے لئے کونسی ایسی اِضطراری اور مجبوری کی حالت آپ کے نزدیک ہے؟ کچھ وضاحت فرمائیں تو مناسب ہوگا۔ نیز

۲-شیئرز کے جواز اور جلد:۶ کی سٹہ ہونے میں کوئی تضاد تو نہیں؟ یا مجھے غلط فہمی ہو رہی ہے؟

برائے مہربانی تکلیف فرما کر مطلع فرمائیں تاکہ اطمینان ہو۔ فقط

موسیٰ کرماڈی، لندن

محترمی جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدہٗ اُمید ہے کہ آنجناب بخیر و عافیت ہوں گے۔ دیگر آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ تقریباً دو سال کی محنت کے بعد ہند و پاک اور برطانیہ کے مختلف مفتیانِ کرام کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فتاویٰ اور موجودہ زمانے کے پیچیدہ مسائل کافی تعداد میں میرے پاس جمع ہوگئے ہیں، جس کے سترہ سو صفحے کی تین جلدیں تیار ہوئی ہیں۔ اس کتاب کا نام ''عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل اور اُن کا حل'' تجویز کیا ہے۔

ان تین جلدوں میں آنجناب کے بھی حسبِ منشاء مختلف فتاویٰ شامل کئے ہیں، جن میں سے ایک فتویٰ ''اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی خرید و فروخت اور ان پر قبضے کا شرعی حکم'' اور دُوسرا ''شیئرز کی خرید و فروخت'' بھی شامل ہے۔

ان تین جلدوں کی کتابت، تصحیح وغیرہ مکمل ہونے پر طباعت کے لئے کراچی کا سفر کرنے ہی والا تھا کہ اس درمیان دارالعلوم لندن کے مہتمم حضرت مولانا مفتی محمد مصطفیٰ صاحب کا ایک تفصیلی فتویٰ بنام ''شیئرز کے متعلق ایک اِستفتاء اور اس کا جواب'' .... صاحب نے مجھے دیا، جس میں حضرتِ والا کے شیئرز کے جواز پر عدمِ اتفاق کا اظہار ہے (کاپی اِرسالِ خدمت ہے)۔

اس کے علاوہ مکتبہ حبیبیہ کراچی کا شائع کردہ رسالہ بنام ''تکملۃ الردّ الفقہی علیٰ جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی'' بھی پڑھنے کو ملا، یہ رسالہ بڑی تعداد میں برطانیہ کے علمائے کرام تک پہنچایا گیا ہے، اس کے مقدمے کے صفحہ نمبر۶ پر حضرت مفتی حبیب اللہ صاحب شیخ الحدیث وصدر مفتی جامعہ کلفٹن کراچی نے آپ کے متعلق لکھا ہے کہ:

چنانچہ مفتی صاحب نے اپنی کتاب انعام الباری شرح صحیح البخاری جلد:۶ صفحہ:۲۵۱ پر وضاحت کے ساتھ اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی خرید و فروخت کے متعلق لکھا ہے کہ ''شیئرز کی خرید و فروخت اسٹاک ایکسچینج میں سٹہ ہے، سرمایہ دارانہ نظام ہے، اور عجیب و غریب قسم کا بازار ہے'' بحوالہ ماہنامہ ''ندائے شاہی مرادآباد'' آگے اس صفحے پر مکۃ المکرمۃ کی ایک علمی گفتگو کا آنجناب کا فرمان نقل کیا ہے کہ ''یہ ایک حیلہ نکالا گیا ہے، اس کے حیلہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں، میں رفتہ رفتہ ان معاملات سے الگ بھی ہو رہا ہوں، اس لئے کہ بہت ہوگیا اور پوری سرگرمیاں اس پر لگا دینا نہیں چاہتا۔''

آگے صفحہ:۷ پر مفتی حبیب اللہ صاحب نے آپ حضرات نے جو اسٹاک ایکسچینج کا دورہ کیا تھا، اس کی رُوئیداد تحریر کر کے لکھا ہے کہ وہاں سے جو معلومات حاصل کیں اس کے نتیجے میں ان تمام طریقوں کو ناجائز، حرام، سود اور باطل قرار دیا ہے۔ جس پر آنجناب اور حضرت مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی کے علاوہ دارالعلوم کراچی کے دیگر مفتیانِ کرام کے دستخط موجود ہیں۔

آگے صفحہ:۷، ۸ پر مفتی حبیب اللہ صاحب نے جس درد و کرب کے ساتھ ''مایوس کن صورتِ حال'' کے ذیلی عنوان کے ماتحت جو کچھ لکھا، حقیقت یہ ہے کہ نہایت ہی قابلِ توجہ ہے ....

حاصلِ کلام:-

حضرت مفتی صاحب! چونکہ میں نے ''عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل اور اُن کا حل'' میں آنجناب کے ذکر کردہ یہ دو فتوے بھی شامل کئے ہیں، اور اس میں شیئرز کی حلت اور جواز موجود ہے، جبکہ حضرت مفتی حبیب اللہ صاحب کی عبارت کے مطابق شیئرز کے سٹہ ہونے، حرام، ناجائز اور باطل ہونے پر آنجناب کے تصدیق دستخط ہونے سے میں عجیب کشمکش کا شکار ہوگیا ہوں، میرے ناقص علم کے مطابق مجھے تو اس میں تضادِ بیان کا شبہ ہو رہا ہے، برائے مہربانی اوّل فرصت میں مجھے مطلع فرمائیں اور بتائیں:-

الف:- کیا آنجناب نے شیئرز کی حلت کے فتویٰ سے رُجوع فرمالیا ہے؟ جیسا کہ مفتی حبیب اللہ صاحب کے ''انعام الباری'' کے حوالے سے ظاہر ہوتا ہے۔

اگر رُجوع کرلیا گیا ہے تو صاف الفاظ میں وضاحت فرما کر ہمیں مطلع فرمائیں، اور اگر آپ اپنی سابقہ تحقیق پر قائم ہیں تو برائے مہربانی حسبِ بالا عبارت پر تبصرہ فرما کر ہمیں آگاہ فرمائیں۔ اُمید ہے کہ تکلیف فرما کر اطمینان بخش جواب سے جلد مطلع فرمائیں گے۔

نوٹ:- شاید آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا، پچھلے سال برطانیہ میں ایک دن کے لئے آپ کی تشریف آوری پر اوقاتِ نماز کے مشاہدات پر گفتگو کے لئے مولانا یعقوب مفتاحی صاحب سیکریٹری حزب العلماء (یو۔کے) کے ساتھ بندہ بھی حاضرِ خدمت ہوا تھا۔　　فقط والسلام

احقر موسیٰ کرماڈی، لندن

۱۴۲۶/۱۱/۶ھ

گرامی قدر مکرّم جناب مولانا موسیٰ سلیمان کرماڈی صاحب زید مجدکم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا گرامی نامہ بذریعہ فیکس موصول ہوا، اور اس کے ساتھ پچھلے گرامی نامے کی کاپی بھی

ملی۔ آپ نے اوّلاً ''اِمداد الفتاویٰ'' ص:۴۹۹ کی عبارت نقل کر کے فرمایا ہے کہ: ''اس عبارت میں حضرتؒ نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ پچھلی ساری سہولتیں صرف اِضطراری یا مجبوری کی حالت میں ہیں.....اُمت کے سامنے شیئرز خریدنے کے لئے کونسی ایسی مجبوری ہے؟'' اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ حضرتؒ نے یہ عبارت اوّل تو مالِ مخلوط کے سلسلے میں لکھی ہے، دُوسرے حضرتؒ نے خود شیئرز کی خریداری کو بشروط جائز قرار دیا ہے۔ اگر یہ اجازت صرف اِضطراری حالات کے لئے ہے تو یہ سوال حضرتؒ کی تحریر پر بھی ہوسکتا ہے کہ اُمت کے سامنے شیئرز خریدنے کے لئے کونسی ایسی مجبوری ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ حضرتؒ کا مقصد اِصطلاحی اِضطرار نہیں ہے جس میں میتہ کھانا حلال ہوجاتا ہے، بلکہ کاروباری حاجت اور اِبتلائے عام ہے، جیسا کہ خود حضرتؒ نے ص:۴۹۵ پر فرمایا ہے کہ: ''پس اِبتلائے عام کی وجہ سے اس مسئلے میں دیگر اَئمہ کے قول پر فتویٰ دے کر شرکتِ مذکورہ کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے'' نیز جو عبارت حضرتؒ نے ص:۴۹۹ پر لکھی ہے، اس میں "فالتوقي الورع" کے الفاظ واضح فرما رہے ہیں کہ یہ ورع یعنی تقویٰ کی بات ہے، جہاں تک فتویٰ کا تعلق ہے، فتویٰ جواز ہی کا ہے۔

ثانیاً آنجناب نے ''انعام الباری'' جلد:۶ کے حوالے سے پوچھا ہے کہ بندہ نے شیئرز کو سٹہ اور سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ بندہ نے صرف ''اِنعام الباری'' میں نہیں، بلکہ دُوسری متعدّد تحریروں میں بھی یہ عرض کیا ہے کہ شیئرز کی خرید و فروخت میں اگر اَحکامِ شریعت کی رعایت نہ کی جائے تو اُس سے سٹہ بازی کا دروازہ کھلتا ہے، لیکن اگر اَحکامِ شریعت کا لحاظ رکھا جائے تو سٹہ بازی ہو ہی نہیں سکتی، مثلاً شریعت کا حکم یہ ہے کہ کسی بھی چیز کی بیع قبل القبض نہیں ہوسکتی[1]، اگر تنہا اس حکم کو اسٹاک ایکسچینج پر نافذ کردیا جائے تو سٹہ بازی کا دروازہ مکمل طور پر بند ہوجاتا ہے، کیونکہ سٹہ کے کاروبار کی ساری بنیاد ہی بیع قبل القبض اور بیع مضاف الی المستقبل پر ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں ختم ہوجائیں تو سٹہ ختم ہوجائے۔ لیکن اگر شیئرز کی خرید وفروخت حاضر سودوں میں ہو، اور قبضے سے پہلے آگے بیع نہ کی جائے تو اس میں نہ سٹہ کا کوئی احتمال ہے، نہ سرمایہ دارانہ نظام کی کوئی اور خرابی اس میں لازم آتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے روئی، گندم اور دُوسری اَجناس میں بھی سٹہ ہوتا ہے، لیکن اس لئے ہوتا ہے کہ ان اَجناس کی بیع قبل القبض یا مضاف الی المستقبل کی جاتی ہے، ان محظوراتِ شرعیہ سے اِجتناب کے ساتھ اگر ان اَجناس کی خرید وفروخت ہو تو نہ اس میں سٹہ ہے، اور نہ وہ شرعاً ناجائز ہیں۔

ہم نے دارالعلوم کے علماء کے ساتھ اسٹاک ایکسچینج کا دورہ کر کے جس معاملے کی تحقیق کی تھی،

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۲۳ کا حاشیہ نمبر۳۔

وہ یہ تھی کہ شیئرز پر قبضہ کب اور کس طرح ہوتا ہے؟ اس کے نتیجے میں یہ بات ثابت ہوئی کہ قبضہ خریداری کے فوراً بعد نہیں ہوتا، بلکہ اس میں کچھ وقت لگتا ہے، لہٰذا ہم نے یہ فتویٰ[1] جاری کیا کہ جس دن خریداری ہوئی ہے، اگر اُس دن قبضہ نہیں ملا (جیسا کہ پاکستان میں یہی صورت ہے) تو پھر اُسی دن شیئرز کو آگے بیچنا جائز نہیں ہے، بلکہ قبضہ ملنے کے بعد بیچنا جائز ہوگا۔ نیز اسٹاک ایکسچینج میں بدلے کے نام سے جو سودے ہوتے ہیں وہ شرعاً جائز نہیں ہیں۔ ہماری یہ تحریر ''البلاغ'' میں شائع ہوچکی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر قبضے وغیرہ کی شرعی شرائط پوری کر کے کوئی خرید وفروخت کی جائے تو وہ بھی ناجائز ہے۔

مکہ مکرمہ میں بندہ کی جس گفتگو کا حوالہ دیا گیا ہے، اس میں میں نے شیئرز کی خرید وفروخت کو حیلہ نہیں کہا تھا، بلکہ اس کا صحیح سیاق و سباق اِسلامی بینکاری کے بعض طریقوں سے متعلق تھا، جس کی حقیقت میں اپنے پہلے خط میں آپ کو لکھ چکا ہوں۔

اُمید ہے کہ مذکورہ بالا گزارشات سے شیئرز کے بارے میں بندہ کا موقف واضح ہوگیا ہوگا۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِبَاعَه، وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَه۔ والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۱رمحرم الحرام ۱۴۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۹۳۶/۱۲)

"Vested Stock" کے شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:- محترم مفتی تقی عثمانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خط کا شکریہ، اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے، اس خط کے ساتھ دو اُمور کے کاغذات منسلک ہیں۔

۱- "Stock Options" پر زکوٰۃ کا مسئلہ، آپ کے ارشاد کی تعمیل میں میں نے کمپنی کے ذمہ دار اَفراد سے پوچھا کہ اسٹاک شروع میں کسی کی ملکیت میں ہوتا ہے اور "Issued Capital" کا حصہ ہوتا ہے یا نہیں؟ کمپنی کے لوگ مجھے تسلی بخش جواب نہیں دے سکے اور انہوں نے کسی اور "Tax Advisor" سے مشورہ کرنے کو کہا ہے۔ میں نے دُوسرے مسلمان برادران سے پوچھا جو اسی کمپنی میں

---

(۱) وہ فتویٰ اسی "فصل فی احکام الأسهم" کے ص:۱۷۸ تا ص:۱۹۰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

کام کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اسٹاک پہلے کمپنی کی ملکیت ہوتا ہے اور بعد میں ملازم کو دیا جاتا ہے، اس خط و کتابت کی نقل منسلک ہے، اب اس کے مطابق ایسا راستہ بتادیں کہ شک و شبہ رفع ہو جائے اور اگر زکوٰۃ دینی ہے تو دی جائے، پوری تفصیل دُوسرے کاغذ (پہلے خط) میں موجود ہے۔ والسلام

جواب:- محترمی و مکرّمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"Vested Stock" کے بارے میں آپ کا سوال دوبارہ موصول ہوا، جو جوابات آپ نے منسلک کئے ہیں ان سے صورتِ حال پوری طرح واضح نہیں ہوئی، لیکن ان سوالات کا مقصد اصل میں یہ تھا کہ "Vested Stock" کے حق کو اِستعمال کر کے ان شیئرز کو "Face Value" پر خریدنے کا جواز ان سوالات کے جواب پر موقوف ہے۔ لہٰذا ان سوالات کے واضح جواب کے بغیر میں یہ تو عرض نہیں کرسکتا کہ ایسے شیئرز لینا جائز ہے یا نہیں؟ لیکن جہاں تک آپ کے اس سوال کا تعلق ہے کہ جس شخص نے اپنا یہ حق ابھی استعمال نہ کیا ہو، یعنی شیئرز نہ لئے ہوں، اُس پر ان کی زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب واضح ہے کہ جب تک شیئرز عملاً نہ لئے ہوں، ان پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

والسلام

۱۴۱۹/۸/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۳۳۹/۹۱)

﴿فصل فی القرض والدّین﴾

(قرض اور دَین سے متعلق مسائل)

’’قرضِ حسن‘‘ سے کیا مراد ہے؟ اور قرضِ حسن کی واپسی کے اطمینان کا طریقہ

سوال:- ایک بیوہ اپنی زرخرید زمین پر اپنا ذاتی رہائشی مکان بنوانے کے لئے ایک کروڑ پتی شخص سے بلاسودی قرضہ بطور قرضِ حسنہ لینا چاہتی ہے، اور ہر ماہ قسط وار ادا کرتی رہے گی، وہ شخص بینک کے تحفظ پر قرضِ حسنہ دینے کو تیار ہے تاکہ اگر قسط کی ادائیگی میں تأخیر یا ناغہ ہو تو بینک عدالتی کارروائی کرکے وصول کرسکے۔ قرضِ حسنہ کی واپسی کے لئے مقروض کو عدالتی مروّجہ قوانین کے تحت پابند کرنا ضروری اور لابدی ہے یا نہیں؟ شرعاً قرضِ حسنہ کی واپسی کا اطمینان کس طرح کیا جائے؟ بیوہ کا کوئی ذاتی مکان نہیں ہے عزیز و اقارب کے یہاں رہ رہی ہے۔

جواب:- قرضِ حسن سے مراد وہ قرض ہے جس پر سود کا کوئی معاملہ نہ کیا جائے، البتہ قرض کی واپسی کے لئے اطمینان کا کوئی انتظامی معاملہ کرنا قرضِ حسن کے منافی نہیں ہے، مثلاً اگر کسی شخص کی کفالت طلب کی جائے،[1] یا کوئی چیز رہن رکھ لی جائے،[2] (بشرطیکہ اس رہن شدہ چیز سے قرض دینے والا کوئی فائدہ نہ اُٹھائے[3])، تو شرعاً جائز ہے۔ اسی طرح قرض لینے والے سے کوئی تحریر لے لی جائے جس کے تحت اسے عدالت کے ذریعے قرضے کی واپسی پر مجبور کیا جاسکے تو یہ بھی دُرست ہے۔ آپ نے بینک

---

(۱) وفی الهداية كتاب الكفالة ج:۳ ص:۱۲۲ (طبع مكتبه رحمانيه) وامّا الكفالة بالمال فجائزة معلومًا كان المكفول به او مجهولًا اذا كان دَينًا صحيحًا .... الخ.

(۲) وفی صحيح البخاری ج:۱ ص:۲۹۳ (طبع قديمی كتب خانه) عن الأعمش قال: ذكرنا عند ابراهيم الرّهن فی السلف فقال: لا بأس به .... الخ.

وفی الهداية كتابُ الرّهن ج:۴ ص:۵۱۸ (طبع رحمانيه) ولا يصحّ الرّهن الّا بدَينٍ مضمون لأنّ حكمه ثبوت يد الاستيفاء والاستيفاء يتلو الوجوب .... الخ.

(۳) فی الدّر المختار كتابُ الرّهن ج:۶ ص:۴۸۲ (طبع سعيد) لا يحلّ له أن ينتفع بشيءٍ منه بوجهٍ مّن الوجوه وان اذن له الرّاهن لأنّه أذن له فی الرّبا لأنّه يستوفی دينه كاملًا فتبقى له المنفعة فضلًا فيكون ربا وهذا أمرٌ عظيمٌ.

وفی ردّ المحتار ج:۶ ص:۴۸۲ لا يحلّ للمرتهن الانتفاع به مطلقًا .... الخ.

وكذا فی البحر الرّائق ج:۶ ص:۴۳۸ (طبع رشيديه) وملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر ج:۴ ص:۲۷۳ (طبع مكتبه غفاريه كوئٹه).

کے تحفظ کے بارے میں جو پوچھا ہے اس کی پوری صورت واضح نہیں ہوئی، اس معاملے کی تفصیل لکھیں تو اُس کا حکم بتایا جاسکتا ہے، البتہ مذکورہ بالا صورتوں میں سے جو صورت بھی اختیار کی جائے جائز ہے، اور اس سے مقروض کی امداد کا ثواب اِن شاء اللہ ضائع نہیں ہوگا۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۱۴/ ۲۸ الف)

سودی قرضے سے مکان بنواکر بینک ملازمت کی پنشن کی رقم قرض میں ادا کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص سودی بینک میں ملازم تھا، اُس نے اس دوران بینک سے قرضہ لے کر مکان بنوایا، بعد میں یہ شخص ریٹائر ہوگیا تو کیا یہ شخص پنشن خود لینے کے بجائے اس کو قرضے کی ادائیگی میں دیدے تو اس کی گنجائش ہے؟ (مولانا) محمد عامر

اُستاذ جامعۃ الرشید، احسن آباد کراچی

جواب:- سودی بینک سے جو قرض لیا گیا وہ قرض صحیح ہوگیا،[۱] اگرچہ سودی معاملہ کرنے کا سخت گناہ ہوا، اس اصل قرض کا لوٹانا حلال مال سے واجب ہے،[۲] لہٰذا اگر نوکری حرام تھی تو اس کی پنشن سے قرض ادا کرنا دُرست نہیں۔[۳] والسلام

۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

---

(۱) وفی بدائع الصنائع ج:۷ ص:۳۹۶ (طبع سعید) وأمّا حکم القرض فهو ثبوت الملک للمستقرض فی القرض للحال وثبوت مثله فی ذمّة المستقرض .... الخ.

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۶۴ (طبع سعید) ویملک المستقرض القرض بنفس القبض عندهما .... الخ.

اور بینک سے قرض لینے میں اگرچہ واپسی کے وقت ''سود'' دینے کی شرط ہوتی ہے، مگر اس کے باوجود ''قرض'' کا معاملہ دُرست ہوجائے گا کیونکہ ''قرض'' ان معاملات میں شامل ہے جو شرط لگانے سے فاسد نہیں ہوتے بلکہ شرط خود باطل ہوجاتی ہے۔

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۶۵ (طبع سعید) القرض لا یتعلّق بالجائز من الشروط فالفاسد منها لا یبطله ولٰکنه یلغو شرط. وفیه أیضًا ج:۵ ص:۲۴۹ وما یصح ولا یبطل بالشرط الفاسد .... سبعة وعشرون .... القرض .... الخ.

وفی الشامیة ما یصحّ أی فی نفسه ویلغو الشرط. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۶۹.

(۲ و ۳) وفی الهندیة باب:۲۷ ج:۵ ص:۳۶۷ (طبع رشیدیه) ولو کان الدَّین لمسلم علیٰ مسلم فباع المسلم خمرًا وأخذ ثمنها وقضاه صاحب الدَّین کره له أن یقبض ذٰلک من دَینه کذا فی السراج الوهاج.

وفی الدّر المختار ج:۶ ص:۳۸۵ (طبع سعید) وجاز أخذ دَین علیٰ کافر من ثمن خمر لصحة بیعه بخلاف دَین علی المسلم لبطلانه .... بخلاف المسلم لعدم تقومها فی حقه فبقی الثمن علیٰ ملک المشتری.

وفی البحر الرّائق ج:۸ ص:۲۰۱ (طبع سعید) اذا کان لشخصٍ مسلم دَین علیٰ مسلم فباع الّذی علیه الدَّین خمرًا وأخذ ثمنها وقضی الدَّین لا یحلّ للمدین أن یأخذ ذٰلک بدینه .... الخ.

وفی ملتقی الأبحر مع مجمع الأنهر کتاب الکراهیة، فصل فی البیع ج:۴ ص:۲۱۴ (طبع مکتبه غفاریه کوئٹه) ولو باع مسلم خمرًا وأوفیٰ دَینه من ثمنها کره لربّ الدَّین أخذه وان کان المدیون ذمّیًا لا یکروه.

وکذا فی الدر المنتقیٰ علیٰ مجمع الأنهر ج:۴ ص:۲۱۴ (طبع غفاریه).

وفی الهدایة کتاب الکراهیة ج:۴ ص:۴۶۸ (طبع امدادیه ملتان).

وفی تبیین الحقائق، کتاب الکراهیة، فصل فی البیع ج:۷ ص:۶۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت). (محمد زبیر حق نواز)

والدین سے قرض لی گئی رقم والدین کے انتقال کے بعد ان کے ورثاء میں تقسیم کرنا لازم ہے، اور والدین اور بہن بھائیوں پر خرچ کی گئی رقم ''قرض'' شمار ہوگی یا نہیں؟

سوال:- مکرمی و محترمی، السلام علیکم! براہِ کرم مندرجہ ذیل مسئلے کے متعلق جواب ارسال فرما کر مشکور فرمائیے۔ میری عمر اس وقت تقریباً ۷۰ سال ہے، میرے پانچ بھائی اور دو ہمشیرگان ہیں، قبلہ والد صاحب مرحوم گورنمنٹ ملازم تھے اور اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، ۱۹۳۵ء میں پنشن لے لی تھی، ۱۹۲۸ء سے میری صحت خراب ہوگئی تھی اس لئے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرسکا تھا، اور پریشان رہا کرتا تھا، جب والد صاحب ریٹائر ہوگئے تو میری پریشانیوں میں اضافہ ہوگیا، کیونکہ مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی فکر تھی، لہٰذا تجارت کو میں نے اپنا ذریعہ معاش بنانا چاہا تھا، جس کی والد صاحب نے رضامندی دے دی تھی اور میں نے دُکان داری شروع کردی تھی، والد صاحب ہمیشہ مذہبی خیال کے تھے اور تبلیغی کاموں میں دلچسپی لیا کرتے تھے، پنشن کا بیشتر حصہ اس قسم کے کاموں میں خرچ ہوا کرتا تھا، لہٰذا اِخراجات کا بیشتر بار مجھ پر پڑا، اس وقت میرے ایک بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی بہن سب زیرِ تعلیم ہی تھے، دُکان میں تھوڑی سی پونجی لگی تھی، آمدنی کم اور اِخراجات بہت زیادہ تھے، دیگر چیزوں کو ملاکر پندرہ بیس افراد کا خرچ تھا، میں نے سوچا کہ اس طرح تو دُکان کا دیوالیہ نکل جائے گا، لہٰذا اہلیہ کا زیور فروخت کیا اور دیگر لوگوں سے قرض لے کر تجارت میں لگایا اور شب و روز محنت کی، ڈاکٹروں نے مجھے کہا کہ آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے کہیں نکل جاؤں، مگر گھر کے حالات اور بھائی بہنوں کی تعلیم کا خیال کرتے ہوئے میں نے ایسا نہیں کیا، اور اپنی صحت کی بھی پروا نہیں کی، خداوند تعالیٰ نے فضل و کرم کیا اور سب بھائی بہن اپنی اپنی تعلیم مکمل کرچکے تھے اور برسرِ روزگار بھی ہوگئے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بن گیا، ہندوستان میں ہم سب ایک ہی جگہ رہتے تھے مگر ۱۹۴۸ء میں پاکستان آنے کے بعد شروع میں دو جگہ تقسیم ہوگئے تھے، چونکہ میرے پاس فلیٹ میں جگہ کم تھی اس لئے والدین مرحوم اور دیگر بھائی بہن دُوسرے بھائی کے ساتھ تھے، والدہ صاحبہ نے یہاں آنے کے بعد ہی حالات دیکھ کر مجھ سے اِخراجات دینے کی فرمائش کی، جس کی میں نے تعمیل کی، چونکہ یہاں تجارت کی ابتدا ہی تھی اور دو بھائیوں نے مجھے فریب دیا اس لئے میری مالی حالت جلد خراب ہوگئی اور میں مقروض ہوگیا، میں نے دُوسرے بھائیوں سے مدد طلب کی مگر بے سود، ''پڑھی نمازِ جنازہ بھی اپنی غیروں نے، مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے'' والدین سے ہی کچھ روپیہ بطورِ قرض لیا تھا، دُوسروں کا بھی ابھی تک

مقروض ہوں۔ ہندوستان میں میں نے نے بہت پریشانیاں اُٹھائیں اور پاکستان میں ان سے زیادہ ابھی تک اُٹھا رہا ہوں۔ ۱۹۵۷ء میں والد صاحب نے والدہ صاحبہ سے مشورہ کر کے مجھے ایک خط لکھ کر دیا تھا، جس میں لکھا ہے کہ یہ تمہاری جدوجہد و جانفشانی کا نتیجہ ہے کہ تمہارے بھائی بہن تعلیم حاصل کر سکے، ورنہ میری ذرا سی پنشن میں کیا ہوسکتا تھا، یہ سب خداوند تعالیٰ کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ والد صاحب اکثر والدہ صاحبہ سے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ عبدالقیوم کے ساتھ بہت بے انصافی ہوئی ہے اور نیز بہت ظلم ہوا ہے۔ والدین کا انتقال شروع میں ہوچکا ہے، میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ والدین سے جو رقم بطورِ قرض لی تھی مندرجہ بالا حالات میں اس کا کیا ہوگا؟ زکوٰۃ کا حساب کرنا ہے اس لئے براہِ کرم جلد از جلد جواب عنایت فرما کر مشکور و ممنون فرمایئے گا۔

جواب:- آپ نے والدین سے جو رقم قرض لی تھی، اگر انہوں نے قرض زندگی میں معاف نہیں کیا تو اس کی ادائیگی آپ پر واجب ہے، جب بھی موقع ملے یہ رقم والدین کے ترکے میں شامل کر کے ان کے دُوسرے ترکے کی طرح اس کو اُن تمام ورثاء پر تقسیم کریں جن میں خود آپ بھی شامل ہوں گے، یعنی جتنا حصہ آپ کے حصے میں آئے وہ چھوڑ کر باقی رقم ان کے دُوسرے ورثاء تک پہنچانی ہوگی، اس سے پہلے آپ نے اپنے والدین یا بہن بھائیوں پر جو خرچ کیا، اگر اس وقت اس تصریح کے ساتھ کیا تھا کہ یہ آپ ان کو قرض دے رہے ہیں تب تو آپ ان سے واپس لے سکتے ہیں، لیکن اگر خرچ کرتے وقت یہ تصریح نہیں کی تھی تو وہ آپ کی طرف سے ہدیہ شمار ہوگا، جس کا آپ کو اِن شاء اللہ ثواب ملے گا، لیکن آپ واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۹/۹/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۰۸/۳۰ ج)

قرض کے لین دین میں تحریر اور گواہی کا اہتمام کرنا بہتر ہے ضروری نہیں

سوال ۱:- رشتہ داری ہونے کی صورت میں دُوسرے کو ایسی رقم دینا جس کی واپسی ضروری ہو، گواہوں کی موجودگی میں تحریر لکھنا ضروری ہے یا نہیں؟

۲:- گواہ موجود ہونے کی صورت میں بھی کسی کو ایسی رقم دی جائے جس کا واپس لینا ضروری ہو اور تحریر نہ لکھی جائے تو کیا رقم دینے والا گنہگار ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- قرض کے معاملے میں بہتر یہی ہے کہ تحریر لکھی جائے اور دو گواہ موجود ہوں،

قرآنِ کریم[1] میں دیون کے سلسلے میں اسی طریقے کی تعلیم دی گئی ہے، لیکن اگر اس کے بغیر بھی قرض دے دیا جائے تو کچھ گناہ نہیں ہے۔

۲:- نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۴/۲۸ ب)

حوالہ میں محتال لہٗ (قرض خواہ) کی رضامندی ضروری ہے اور قرض کے حوالہ اور مقاصہ کی ایک مخصوص صورت

سوال:- عرض اینکہ میں عبدالمجید ولد نور محمد حلفیہ مندرجہ ذیل بیان لکھواتا ہوں کہ میرا سودا سیکورٹی آفیسر شکیل احمد کے ساتھ ایک کوارٹر کے بارے میں مبلغ دس ہزار روپے میں ہوا تھا، کوارٹر کے سودے میں متفق ہوکر امان گل دُکان دار کے پاس آئے، امان گل کے سامنے شکیل احمد نے کہا کہ ہم نے کوارٹر آٹھ ہزار روپے میں لیا، دو ہزار منافع لوں گا، سودا اس طرح ہوا کہ دو ہزار روپے نقد دو، باقی ایک ہزار روپے ماہانہ قسط میں ادا کی جائے۔ اس پر امان گل دُکان دار نے کہا کہ میں شکیل احمد کو اُوپر دُکان کے اُدھار پندرہ سو روپے ہے، باقی پانچ سو روپے میں نے امان دُکان دار سے قرضہ لے کر شکیل احمد کو دیئے، بعد میں شکیل احمد کو کوارٹر کا قبضہ دینے کے لئے کہا کہ کوارٹر ہم کو دو، اور کوارٹر کے لئے کاغذات لکھ کر دو، میں اور شکیل احمد عدالت میں گئے، اور شکیل احمد نے دستاویز لکھ دی۔ بعد میں ہم نے پندرہ سو قرضہ لے کر شکیل احمد کو دیئے۔ جب کوارٹر پر قبضہ دینے چلا تو اصل مالک آگئے اور پتہ چلا کہ شکیل احمد نے یہ مکان کرایہ پر لیا تھا، اس فراڈ کا کیس مکان کے مالک نے کیا، مجھے اور شکیل احمد کو تھانے میں بلایا گیا، وہاں جاکر معلوم ہوا کہ شکیل احمد بہت فراڈی آدمی ہے، جعلی کام کئی دفعہ کرچکا ہے، میں شکیل احمد کو تھانے میں چھوڑ کر امان کے پاس گیا اور اُس کے فراڈ کی تمام حالت بیان کی، پھر ہم امان گل کو تھانے میں لے کر آئے، امان گل کو کہا کہ یہ شکیل احمد فراڈی آدمی ہے لہٰذا دُکان فروخت نہ ہوگی، پندرہ سو روپے ان سے لے لو، میں اب ان پیسوں کا ذمہ دار نہیں ہوں، اور ابھی شکیل احمد جو اَب موجود ہے ان سے وصول کرو، میری ذمہ داری ختم ہے، آپ جانو اور شکیل احمد جانے، میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اس کے بعد شکیل احمد تین چار ماہ یہاں رہا، اب وہ چلا گیا۔ اس صورتِ حال کا شرعی حکم بیان فرمائیں۔

---

(۱) قال اللہ تعالیٰ فی کلامہ المجید: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاكْتُبُوْهُ" (سورة البقرة: ۲۸۲).

جواب:- اس معاملے کی حقیقت یہ ہوئی کہ عبدالمجید نے امان گل دُکان دار سے دو ہزار روپے شکیل احمد کو مکان کی قیمت میں ادا کرنے کے لئے قرض لئے، ان دو ہزار میں سے پانچ سو روپے نقد امان گل سے وصول کئے اور ڈیڑھ ہزار روپے کا شکیل احمد کے دَین سے مقاصہ کرلیا۔ بہر صورت! عبدالمجید پر اَمان گل کے دو ہزار روپے بطورِ قرض واجب ہوگئے، اس معاملے کا کوارٹر کی اس بیع سے کوئی تعلق نہیں ہے، جو عبدالمجید اور شکیل احمد کے درمیان ہوئی، لہٰذا اس بیع کے ختم ہوجانے سے اس قرض پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ عبدالمجید پر واجب ہے کہ وہ امان گل کا پورا قرضہ دو ہزار روپے ادا کرے، اور شکیل احمد نے اس کے ساتھ جو دھوکا کیا ہے اس میں شکیل احمد کے خلاف چارہ جوئی کرکے اپنے دو ہزار روپے اس سے وصول کرے، شکیل احمد سے وصول کرنے کی ذمہ داری امان گل پر ڈالنا جبکہ امان گل نے اس کو بطورِ حوالہ قبول نہیں کیا، شرعاً دُرست نہیں ہے،(۱) امان گل، عبدالمجید سے دو ہزار روپے کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے۔

واللہ اعلم
۱۴۰۸/۸/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۵۷/ ۳۹ و)

زکوٰۃ اور فطرے کی رقم سے مسجد کو قرض دینے کا حکم اور مسجد سے ایسا قرض اُتارنے کا طریقہ

سوال:- محترمی ومکرمی جناب مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

بحوالہ جناب کا فتویٰ مؤرخہ ۲۹؍ربیع الاوّل ۱۴۱۷ھ جس کی کاپی منسلک ہے، مزید صورتِ حال کی وضاحت کے لئے عرض ہے کہ:

۱:- جناب کے فتویٰ کی نقل سابقہ کمیٹی کے جملہ ممبران کو اس استدعا کے ساتھ ارسال کی گئی کہ حسبِ فتویٰ فطرے کی رقم کی وصولی کے لئے بندوبست کریں اور موجودہ کمیٹی تعاون کے لئے حاضر ہے، جواباً مکمل خاموشی ہے۔

---

(۱) وفی الدّر المختار کتاب الحواله ج:۵ ص:۳۴۱ (طبع سعید) الحوالة شرط لصحّتها رضا الکل بلا خلاف.
وفی الشامیة تحت (قوله رضا الکل) أمّا رضا المحتال فلأنّ فیها انتقال حقّه الیٰ ذمّة أخریٰ والذّمم متفاوتة .... الخ.
وفی البحر الرائق ج:۶ ص:۲۴۷ (طبع سعید کراتشی) وتصح فی الدین لا فی العین .... برضا المختال والمحال علیه لأن المحتال هو صاحب الحق وتختلف علیه الذمم فلا بدّ من رضاه لاختلاف الناس فی الایفاء.
وفی الهندیة ج:۳ ص:۲۹۵ و۲۹۶ (طبع رشیدیه کوئته) وأما شرائطها .... وبعضها یرجع الی المحتال له .... وأما الذی یرجع الی المحتال له .... ومنه الرضا.
وفی البدائع ج:۶ ص:۱۶ (طبع سعید کراتشی) وأما الشرائط .... وبعضها یرجع الی المحال .... وأما الذی یرجع الی المحال علیه فأنواع .... ومنها الرضا.
وفی الهدایة کتاب الحوالة ج:۳ ص:۱۳۶ (طبع رحمانیه) وتصحّ الحوالة برضاء المحیل والمحتال والمحتال علیه.

۲:- لوگوں کو یہ بخوبی علم ہے کہ مذکورہ رقم مسجد کے اِخراجات کے ساتھ بے جا عدالتی کارروائی پر خرچ ہوئی ہے، جس نے یہ اقدام کیا، وہی ذمہ دار ہے، قرض کی ادائیگی کے لئے چندہ دینے سے گریزاں ہیں، بات آگے بڑھتی نظر نہیں آتی، سات سال سے زیرِ تعمیر مسجد امریکا میں موجود اُمتِ مسلمہ کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے، اور ہماری بداعمالیوں کا مظہر بھی۔

۳:- موجودہ کمیٹی نے اپنے پہلے اجلاسِ عام میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ ایک مد کی رقم دُوسری مد میں خرچ کرنے کی رسم ترک کرتی ہے، اس اُصول پر سختی سے کاربند بھی ہے۔

اب لوگوں نے جو چندہ تعمیرِ مسجد کے لئے دیا ہے اسی اعتماد پر دیا ہے کہ ان کی رقم تعمیرِ مسجد پر خرچ ہوگی، اگر یہ رقم قرض کی ادائیگی میں صَرف کی جاتی ہے تو چندہ دہندگان کے ساتھ وعدہ خلافی اور آئندہ کے لئے عدم اعتماد کا باعث بھی ہوسکتی ہے، جس کا انہیں سابق میں تجربہ بھی ہوچکا ہے۔ موصولہ رقم چیک، ڈرافٹ کے علاوہ نامعلوم مسلمانوں کی نقد رقم بھی ہے، جس کی واپسی یا قرض میں ادائیگی کی اجازت محال ہے، مندرجہ بالا حالات کے پیشِ نظر از رُوئے فتویٰ نہ تو فی الحال قرضِ مذکورہ کی ادائیگی ممکن نظر آرہی ہے اور نہ ہی تعمیرِ مسجد کے اِمکانات، ہر دو کام فی الوقت مفلوج ہیں۔ تعمیری کام کو جاری رکھتے ہوئے قرضِ مذکورہ کی طرف لوگوں کو توجہ دِلاتے رہیں تو اُمید ہے کہ اس مد میں بھی وہ ابتداء کریں گے، جبکہ وہ اپنی رقم جو تعمیر پر خرچ کرنے کے لئے دی ہے خرچ ہوتے دیکھ لیں تو اطمینان ہوجائے۔

دریافت طلب مسئلہ اب یہ ہے کہ:-

الف:- کیا از رُوئے شرع ایسا ممکن ہوسکتا ہے کہ تعمیرِ مسجد کی مد میں جمع شدہ رقم تعمیرِ مسجد ہی پر صَرف کی جائے، یعنی تعمیرِ مسجد کو آگے بڑھایا جائے، اور کام کی ابتداء کی جائے جو رُکی ہوئی ہے؟

ب:- دریں اثناء قرض، فطرہ کی مد میں جو رقم وصول ہو اسی مد میں خرچ کی جائے۔ بینوا توجروا!

جواب:- زکوٰۃ اور فطرے کی رقم سے کسی ایسی مد کے لئے قرض لینا جائز نہیں جس کی وصول یابی یقینی نہ ہو، مسجد کے چندے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ اس کی وصول یابی یقینی نہیں، لہٰذا مسجد کو قرض دینا پہلی انتظامیہ کے لئے جائز نہیں تھا، لیکن اب جبکہ یہ رقم مسجد کے ذمے قرض ہوچکی ہے تو مسجد کے چندے سے اس کی ادائیگی ضروری ہے، اور پہلی انتظامیہ ہی اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ لوگوں سے مسجد کا قرض اُتارنے کے لئے چندہ کرے، اور اسے زکوٰۃ اور فطرے کے مستحقین پر خرچ کرے۔ مسجد کی نئی انتظامیہ کو بھی اس میں تعاون کرنا چاہئے، اور بہتر یہ ہے کہ دونوں انتظامیہ مل جل کر مسجد کے لئے چندہ فراہم کریں، تاکہ مسجد کا قرض اُتر جائے۔ چونکہ قرض کی رقم سے مسجد کے اِخراجات پورے کئے گئے تھے اس لئے جو لوگ مسجد میں قرض اُتارنے کے لئے چندہ دیں گے اِن شاء اللہ انہیں مسجد ہی کو

چندہ دینے کا ثواب ملے گا۔ جب تک یہ قرض ادا نہ ہو مسجد کی مزید تعمیر روک دینی چاہئے، اور قرض ادا کرنے کے بعد تعمیر شروع کرنی چاہئے، البتہ اس مسجد میں نماز پڑھنا بلاشبہ جائز ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۲۹؍ربیع الاوّل ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۷/۷۰)

۱:- راشی سے لئے ہوئے قرضے کی عدم واپسی کا حکم
۲:- بینک کی سودی رقم سے قرض ادا کرنے کا حکم

سوال ۱:- (خلاصۂ سوال) ایک افسر کا رِشوت کا روپیہ کسی شخص پر قرض ہے، اگر مقروض اس افسر کا قرضہ ادا نہ کرے جس طرح کہ سود کا روپیہ دینا ضروری نہیں ہے، اسی طرح رِشوت سے کمائے ہوئے روپے کا قرضہ نہ دیا جائے، کیا گناہ ہوگا؟ توبہ کی تو ضرورت نہیں ہے؟

سوال ۲:- اگر بینک سے سود لے کر کسی شخص کا قرضہ ادا کردیا جائے یا کہ جو قرضہ بلاسود ہے اس بلاسود قرضے کو بینک سے سود لے کر ادا کردیا جائے؟

جواب ۱:- رِشوت کا معاملہ کرنا ہی سرے سے ناجائز تھا، اس گناہ پر اِستغفار کرنا چاہئے[1]، پھر اگر ابھی تک وہ روپیہ اس نے رِشوت خور اَفسر کو نہیں دیا ہے تو وہ اسے اپنے پاس ہی رکھ سکتا ہے، لیکن معاملۂ رِشوت پر توبہ اِستغفار کرنا چاہئے، اور اگر اَفسر نے رِشوت کی رقم کسی دُوسرے سے وصول کر کے قرض دیا ہے تو اس کی ادائیگی ضروری ہے۔

جواب ۲:- جس شخص کا قرضہ ادا کیا جارہا ہے اگر وہ مستحقِ صدقہ ہے (خواہ قرض ہی کی وجہ سے ہو) تو ایسا کرنے کی گنجائش ہے کہ سود کی رقم اس کو دے دی جائے پھر وہ اپنا قرض ادا کردے، مگر خود اپنا دُوسرا قرضہ اس سے ادا کرنا جائز نہیں، اور بہرصورت بہتر یہی ہے کہ بینک سے سود لیا ہی نہ جائے۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق اِلٰہی بلند شہری

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۴؍۱۲؍۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۲۵/۱۸ الف)

---

(۱) فی المشکوٰۃ کتاب الامارۃ والقضاء ج:۱ ص:۳۲۷ (طبع مکتبہ رحمانیہ) "عن عبداللہ بن عمرو قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی."

سودی قرضہ لے کر کاروبار کرنے کا حکم

سوال ۱:- عرصہ سولہ سال سے میں ایک کمپنی میں بحیثیت تقسیم کار کے کاروبار کرتا ہوں، گزشتہ سال تک تو سرمایہ کافی تھا مگر اب کام کی خرابی کی وجہ سے سرمایہ بالکل قلیل ہے، شرکاء نے مجبوری سے بینک سے بذریعہ اوورڈرافٹ روپیہ لینا شروع کیا جس کا سود بھی دینا پڑتا ہے، ایسے کام کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

۲- مندرجہ بالا کاروبار کسی حیلے سے جائز ہوسکتا ہے؟

۳- اگر مندرجہ بالا کاروبار ناجائز ہے تو ہم اپنی حلال کمائی کیسے الگ کریں؟

۴- اِستغفار اور توبہ سے یہ گناہ معاف ہوجائے گا؟

جواب ۱و۲:- سود پر قرض لے کاروبار کرنا بالکل حرام ہے، اس سے بہرصورت بچنا ضروری ہے،[1] اب راستہ یہ ہے کہ آئندہ کے لئے سودی قرضہ نہ لینے کا عزم کر کے اپنے گناہوں پر توبہ و اِستغفار کیا جائے، اور آئندہ کاروبار چلانے کے لئے سود پر قرض لینے کے بجائے کسی صاحبِ ثروت شخص کو کاروبار میں شریک کرلیا جائے۔

۳- سود پر قرض لینے کا معاملہ ناجائز و حرام ہے،[2] لیکن چونکہ آمدنی میں کوئی سود کی رقم شامل نہیں ہے اس لئے توبہ اِستغفار کے بعد اس آمدنی کو اِستعمال کیا جاسکتا ہے۔[3]

۴- توبہ و اِستغفار خلوصِ دِل کے ساتھ اور اس کے آداب و شرائط کو ملحوظ رکھ کر کی جائے تو ہر گناہ کی مغفرت کی اُمید ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۱۲/ ۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری

کسی کا مقروض سے رقم لے کر اس کے قرض خواہ کو دینے سے قرض کی ادائیگی کی ایک مخصوص صورت اور اس کا حکم

سوال:- حاجی اِمام بخش کی سالی کے لڑکے کا لڑکا اللہ ڈنو اور حاجی اِمام بخش کے بھانجے

(۱ و ۲) فی الشامیة ج:۵ ص:۱۶۲ کتاب البیوع، کل قرض جر نفعًا .... الخ فهو حرام. کذا فی الأشباه والنظائر، الفن الثانی ص:۲۵۷ (طبع قدیمی). کذا فی تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۵۷۵ کتاب المساقات (طبع دار العلوم). نیز دیکھئے ص:۲۷۸ کا حاشیہ۔

(۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۰۱ کا حاشیہ نمبرا۔

سوڈھو، غلام قادر ہے، یہ سب اہلِ معاملہ ہیں، واقعے کی تفصیل یہ ہے:-

اللہ ڈنو نے غلام قادر سے ایک بوری گندم قیمتاً حاصل کی، اللہ ڈنو نے سوڈھو سے ایک عدد ریڈیو حاصل کیا، مگر مذکورہ بالا دونوں اشیاء کی قیمت ادا نہیں کی۔ کچھ عرصہ بعد اللہ ڈنو نے بھینس فروخت کی تو غلام قادر نے بزرگ ہونے کی حیثیت سے حاجی اِمام بخش سے کہا کہ: ''اللہ ڈنو کے پاس پیسے ہیں، ہمیں پیسوں کی ضرورت ہے، اس لئے ہمیں پیسے دِلا دیں، آپ کہیں گے تو وہ ہمیں پیسے دیدے گا ویسے نہیں دے گا۔'' غلام قادر کے دِل میں یہ بات تھی کہ اگر اللہ ڈنو پیسے دے گا تو ہم ریڈیو اور گندم میں قطع کرلیں۔

حاجی اِمام بخش نے اللہ ڈنو سے کہا کہ: ''کیا تمہارے پاس پیسے ہیں؟'' اللہ ڈنو نے جواب دیا: ''ہاں! پیسے ہیں'' حاجی اِمام بخش نے کہا کہ: ''دو سو روپے مجھے دے دو'' اللہ ڈنو نے اِمام بخش کو دو صد روپے دیئے جو اِمام بخش نے اپنے بھانجے غلام قادر کو اُسی وقت دے دیئے۔ کچھ دنوں کے بعد حاجی اِمام بخش اور بھانجوں مذکورہ بالا کے درمیان ناراضگی ہوگئی، ادھر اللہ ڈنو اور مذکورہ بالا دونوں بھانجوں میں دوستی بڑھ گئی۔ ایک فیصلے میں غلام قادر نے حاجی اِمام بخش سے کہا کہ: ''آپ نے جو اللہ ڈنو سے دوصد روپے لئے تھے وہ ادا کریں'' اس پر حاجی اِمام بخش نے کہا کہ: ''وہ روپے تو لے کر میں نے تم کو دے دیئے تھے، تم جانو اور وہ جانے، تم دونوں دوست ہو۔'' لیکن غلام قادر نے دوصد روپے کی وصولی سے قطعی انکار کردیا، حاجی اِمام بخش نے غلام قادر کے بڑے بھائی سوڈھو سے کہا کہ: ''میں نے دوصد روپے اللہ ڈنو سے لے کر غلام قادر کو دیئے تھے، اس میں سے ایک صد روپے غلام قادر نے آپ کو بعوض ریڈیو ادا کئے ہیں، کیا یہ دُرست ہے؟'' سوڈھو نے اقرار کیا کہ غلام قادر نے ریڈیو کے عوض ایک صد روپیہ دیا ہے، مگر غلام قادر نے انکار کیا کہ میں نے سوڈھو کو اپنی طرف سے ایک صد روپے دیئے۔ ایک فیصلہ کنندہ نے یہ بیانات سن کر کہا کہ: ''تم کو پیسے ملے ہیں، تم جھوٹے ہو'' دُوسرے فیصلہ کنندہ کا یہ اصرار ہے کہ: ''اِمام بخش نے اللہ ڈنو سے غلام قادر شاہد کے رُوبرو پیسے لئے ہیں، لہٰذا تم دو صد روپے بھرو۔'' اس مضمون پر غور فرما کر شریعت کا فیصلہ صادر فرمائیں۔

جواب:- اگر حاجی اِمام بخش نے اللہ ڈنو کو یہ بتا کر روپیہ لیا تھا یا بعد میں بتادیا تھا کہ اس روپے کے ذریعے غلام قادر کی واجب الادا رقم جو تمہارے ذمے تھی تمہاری طرف سے ادا کردی ہے، اور غلام قادر نے واقعۃً وہ رقم وصول کرلی ہے تو حاجی اِمام بخش پر کوئی تاوان نہیں آتا۔ اور غلام قادر کے انکار کا حل یہ ہے کہ حاجی اِمام بخش اس بات پر گواہ پیش کرے کہ اُس نے غلام قادر کو روپیہ دیا ہے، اگر

دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اس کے حق میں گواہی دیں تو فیصلہ اس کے حق میں ہوگا، اور اگر وہ گواہ پیش نہ کرسکے تو غلام قادر اللہ کی قسم کھائے کہ میں نے حاجی اِمام بخش سے مذکورہ روپیہ نہیں لیا، اگر وہ یہ قسم کھانے سے انکار کرے تب بھی حاجی اِمام بخش کے حق میں فیصلہ ہوگا، اور اگر قسم کھالے تو غلام قادر کے حق میں فیصلہ ہوجائے گا،[1] اور حاجی اِمام بخش کو یہ روپے بھرنے پڑیں گے، لیکن اگر غلام قادر نے جھوٹی قسم کھائی تو اس پر دُنیا و آخرت میں سخت وبال کا اندیشہ ہے،[2] لہٰذا وہ اپنی موت و آخرت کو دیکھ کر کام کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۲۱/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۷/ ۲۸ الف)

قرض لینے اور اُدھار یا قسطوں پر خریداری کا شرعی حکم
نیز حج اور عمرہ کی ادائیگی کے لئے قرض لینے کا حکم

سوال:- آج کل قرض لینے اور اُدھار یا قسطوں پر خریداری کا بہت رواج ہوگیا ہے، سوال یہ ہے کہ قسطوں پر قرض لینے یا اُدھار معاملہ کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ نیز حج اور عمرہ ادا کرنے کے لئے قرض لینے یا اُدھار معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- سود کے بغیر قرض لینا اگرچہ جائز ہے، جبکہ ادائیگی کی نیت پکی ہو، لیکن احادیث شریفہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مقروض بننا کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے، اور جب تک کوئی واقعی حاجت درپیش نہ ہو، حتی الامکان اس سے بچنا ہی بہتر ہے۔ اس ناپسندیدگی کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقروض بننے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یدعو فی الصلاۃ ویقول اللّٰھم انّی أعوذ بک من المأثم والمغرم، فقال لہ قائل: ما أکثر ما تستعیذ یا رسول اللہ من المغرم، قال: ان الرجل اذا غرم حدث فکذب ووعد فأخلف.

(صحیح البخاری، کتاب الاستقراض، باب من استعاذ من الدین ۲۳۹۷، طبع: دارالسلام)

---

(۱) فی مشکوٰۃ المصابیح، باب الأقضیۃ والشھادات ج:۲ ص:۳۳۸ (طبع مکتبہ رحمانیہ) عن عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدّہٖ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: "البیّنۃ علی المدعی والیمین علی المدّعیٰ علیہ." رواہ التّرمذی ج:۱ ص:۳۸۱ (طبع مکتبہ رحمانیہ).

(۲) فی صحیح المسلمؒ ج:۲ ص:۳۲۶ (طبع قدیمی) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "علیکم بالصّدق! فان الصّدق یھدی الی البر، وان البر یھدی الی الجنّۃ .... وایاکم والکذب! فان الکذب یھدی الی الفجور، وان الفجور یھدی الی النار ...."اھ (رقم الحدیث: ۶۷۲۱، باب قبح الکذب وحسن الصدق وفضلہ).

ترجمہ:- رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں دُعا فرمایا کرتے تھے، اور فرماتے تھے: یا اللہ! میں گناہ سے اور مقروض بننے سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ تو کسی کہنے والے نے آپ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ بکثرت قرض سے کیوں پناہ مانگتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: جب کوئی شخص مقروض بن جاتا ہے تو بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، اور وعدہ کرتا ہے تو اُس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

اور روایات میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی ایسے صاحب کا جنازہ لایا جاتا جن کا اِنتقال مقروض ہونے کی حالت میں ہی ہوگیا ہو، اور ان کے ترکے میں اتنا مال نہ ہو جس سے اُن کا قرض ادا کیا جاسکے تو آپ اُس پر بذاتِ خود نمازِ جنازہ پڑھانے کے بجائے دُوسرے صحابہ کو نماز پڑھانے کا حکم دیتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يؤتى بالرجل المتوفى عليه الدين، فيسأل: هل ترک لدينه فضلا؟ فان حُدِّث أنه ترک لدينه وفاء صلّٰى، والّا قال للمسلمين: صلوا علٰى صاحبكم.

(صحيح البخاري، كتاب الكفالة حديث:٢٢٩٨)[1]

اسی طرح ایک مرتبہ آپ نے ایک ایسے ہی جنازے کی نماز پڑھانے سے اِنکار فرمادیا، لیکن جب ایک صحابی (حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اِعلان فرمایا کہ میں ان کا پورا قرض اُتارنے کا ذمہ لیتا ہوں، تب آپ نے اُن کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

أن النبي صلى الله عليه وسلم أُتي بجنازة ليصلي عليها، فقال: هل عليه من دين؟ قالوا: لا، فصلى عليه، ثم أُتي بجنازة أُخرىٰ، فقال: هل عليه من دين؟ قالوا: نعم، قال: فصلوا علٰى صاحبكم. قال أبوقتادة: عليّ دينه يا رسول الله! فصلى عليه. (ايضًا حديث:٢٢٩٥)[2]

مستدرک حاکم میں اس پر یہ اِضافہ ہے کہ جب حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُس کا قرض ادا کردیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الآن بردت عليه جلدته" (رواه الحاكم في

---

(۱) ج:۱ ص:۳۰۸ (طبع سعيد).

(۲) الصحيح للبخاري ج:۱ ص:۳۰۶ (طبع سعيد).

کتاب البیوع، حدیث: ۲۳۴۶، وقال: صحیح، وأقره علیه الذهبی، طبع: دار الکتب العلمیة)۔

نیز حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں:

لا تخیفوا أنفسکم بعد أمنها، قالوا: وما ذاک یا رسول الله؟ قال: الدین.

(مسند أحمد، مسند عقبة بن عامر رضی الله عنه، حدیث: ۱۷۳۲۰، طبع: مؤسسة الرسالة)

ترجمہ:- تم اپنے آپ کو اَمن حاصل کرنے کے بعد خوف میں مبتلا نہ کرو۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا: یا رسول اللہ! وہ خوف کی بات کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: مقروض بننا۔

ان تمام روایات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مدیون یا مقروض بننا کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے، اسی لئے فقہائے کرامؒ نے فرمایا ہے کہ اپنے اُوپر قرض کا بوجھ کسی حقیقی حاجت کی وجہ ہی سے لینا چاہئے، اس کے بغیر نہیں۔

البتہ بعض صحابہؓ سے ایسی روایتیں بھی منقول ہیں کہ وہ مقروض یا مدیون بننے کو پسند کرتے تھے، مثلاً حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں روایت ہے کہ:

کانت میمونة تدّان فتکثر، فقال لها أهلها فی ذلک ولاموها ووجدوا علیها، فقالت: لا أترک الدین، وقد سمعت خلیلی وصفیّی صلی الله علیه وسلم یقول: ما من أحد یدّان دینا فعلم الله عزّ وجلّ أنه یرید قضاءهٗ الّا أدی الله عزّ وجلّ عنه فی الدنیا.

(السنن الکبریٰ للنسائی، کتاب البیوع، حدیث: ۶۲۸۵)[1]

ترجمہ:- حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اُدھار لیا کرتی تھیں، اور بہت لیتی تھیں، چنانچہ اُن کے گھر والوں نے اُن سے بات کی، اور انہیں ملامت کی، اور ناراضگی کا اِظہار کیا۔ اس پر حضرت میمونہؓ نے فرمایا: میں اُدھار لینا نہیں چھوڑ سکتی، جبکہ میں نے اپنے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ''جو شخص بھی کوئی ایسا اُدھار لیتا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اُس کا اِرادہ اُس اُدھار کو اَدا کرنے کا ہے، تو اللہ تعالیٰ اُس کی طرف سے دُنیا ہی میں ادائیگی فرمادیتے ہیں۔''

یہی حدیث اِمام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کی ہے، اور اُس کے الفاظ یہ ہیں:

عن میمونة أنها کانت تداین، فقیل لها: انک تداینین فتکثرین وأنت

---

(۱) طبع مکتبة الحسن.

موسرة؟ فقالت: انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: من اذان دینا ینوی قضاءہ کان معہ عون من اللہ علیٰ ذٰلک، فأنا ألتمس ذٰلک العون. (السنن الکبریٰ للبیھقی، کتاب البیوع، باب ما جاء فی جواز الاستقراض وحسن النیة، ج:۵ ص:۳۵۴، طبع: شرح السنة ملتان)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مالی اِعتبار سے خوش حال ہونے کے باوجود اُدھار کا معاملہ کرتی تھیں، اور اُسے حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کا وسیلہ قرار دیتی تھیں۔

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں روایت ہے کہ:

أنها کانت تداین فقیل لها: ما لک والدین، ولیس عندک قضاء؟ فقالت: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ما من عبد کانت لہ نیة فی أداء دینہ إلّا کان لہ من اللہ عون، فأنا ألتمس ذٰلک العون.

(السنن الکبریٰ للبیھقی، کتاب البیوع، ج:۵ ص:۳۵۴ طبع شرح السنة ملتان)

ترجمہ:- وہ اُدھار لیا کرتی تھیں، تو ان سے کہا گیا کہ: آپ کیوں اُدھار لیتی ہیں جبکہ آپ کے پاس ادائیگی کا اِنتظام نہیں؟ اس پر انہوں نے فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: جس بندے کی بھی یہ نیت ہوتی ہے کہ وہ اپنا قرض ادا کرے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی مدد ہوتی ہے، اس لئے میں وہ مدد تلاش کرتی ہوں۔

اور اِمام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کی مزید تفصیل اس طرح ذکر فرمائی ہے:

کان عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اذا صلی الصبح یمر علیٰ أبواب أزواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فرأی علیٰ باب عائشة رجلًا جالسا فقال: ما لی أراک جالسا ھٰھنا؟ قال: دین لی أطلب بہ أمّ المؤمنین، فبعث الیها عمر: یا أم المؤمنین! أما لک فی سبعة آلاف درھم أبعث بها الیک فی کل سنة کفایة؟" فقالت: بلیٰ! ولٰکن علینا فیها حقوق وقد سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: من اذان دینا ینوی قضاءہ کان معہ من اللہ عزّ وجلّ حارس، فأنا أحب أن یکون معی من اللہ عزّ وجلّ حارس.

(شرح مشکل الآثار للطحاوی، حدیث: ۴۲۸۹ طبع مؤسسة الرسالة)

ترجمہ:- حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب صبح کی نماز پڑھ لیتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کے دروازوں کے پاس سے گزرا کرتے تھے، اس طرح انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دروازے پر ایک شخص کو بیٹھا دیکھا، تو اُس سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ تم مجھے یہاں بیٹھے نظر آرہے ہو؟ اُس نے کہا کہ: میرا قرض ہے جو میں اُمّ المؤمنین سے مانگنے آیا ہوں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس پیغام بھیجا کہ: ''اُمّ المؤمنین! میں جو ہر سال سات ہزار درہم آپ کے پاس بھیجتا ہوں، کیا وہ آپ کے لئے کافی نہیں ہوتے؟'' حضرت عائشہؓ نے جواب دیا: ''بے شک کافی ہوتے ہیں، لیکن ہم پر ان میں بہت سے حقوق ہیں، اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ''جو شخص بھی ایسا اُدھار لے جس کی ادائیگی کا وہ اِرادہ رکھتا ہو، تو اللہ کی طرف سے اُس کے لئے ایک حفاظت کرنے والا مقرّر کردیا جاتا ہے'' لہٰذا میں یہ پسند کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حفاظت کرنے والا میرے ساتھ رہے۔''

ان احادیث وآثار سے اُدھار لینے کی جو بظاہر پسندیدگی نظر آرہی ہے، وہ اُن احادیث سے متعارض معلوم ہوتی ہے جو اُوپر ذِکر کی گئی ہیں، اس ظاہری تعارض کو حل کرنے کے لئے اِمام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ناجائز اور مذموم اُدھار وہ ہے جس میں انسان اُس کی ادائیگی سے غافل ہوجائے، اور غفلت میں پڑا رہنے کی وجہ سے وہ قرض اُس پر سوار ہوتا چلا جائے، اور اُس کا خوف اُس پر مسلط ہوجائے۔ چنانچہ وہ یہ حدیث روایت فرماتے ہیں:

عن عبداللہ بن عمرو بن العاص قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الغفلة فی ثلاث: الغفلة عن ذکر اللہ عزّ وجلّ، ومن لدن أن یصلی صلاة الصبح حتی تطلع الشمس، وأن یغفل الرجل عن نفسه فی الدین حتی یرکبه. (شرح مشکل الآثار للطحاوی حدیث: ۴۲۸۵)[1]

چنانچہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث: ''لا تخیفوا أنفسکم'' روایت کرنے کے بعد اِمام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فتأملنا هذا الحدیث لنقف علی المراد به ما هو ان شاء اللہ فوجدنا النهی

(۱) طبع مؤسسة الرسالة.

الـذی فیه مقصودا به الٰی اخافة الأنفس بالدیون و کان معقولًا أنه لا یخیف الأنـفـس الا مـا غـلـب عـلیها حتی صارت بذٰلک خائفة منه و کان ذٰلک کمثل ما قد روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم غیر ھٰذا الحدیث.

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث روایت کر کے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

و کان ما کان من الدیون التی لا ترکب من ھی علیه العمل فی خلاصه منها وبراءتـه مـنـهـا الٰـی أهلها بخلاف الدیون التی یغفل من ھی علیه عن براءته مـنـهـا والـخـروج منها الٰی أهلها فمن کان من أهل ھٰذه المنزلة الثانیة کان مـذمـومًـا وکـان مـخـیـفًـا لنفسه من الدین الذی علیه سوء العاقبة فی الدنیا بـسـوء الـمـطالبة وفی الآخرة بما ھو أغلظ من ذٰلک فأما ما کان من الدین الـذی ھو علیه علی الحال الأول من ھاتین الحالتین فغیر خائف علٰی نفسه مـا یـخـافه علٰی نفسه من کان علی الحال الأخریٰ فی الدین الذی علیه بل مـن کـان عـلـی الـحال المحمودة من ھاتین الحالتین فی الدین الذی علیه مـرجوا له الثواب فیما ھو علیه من ذٰلک والعون من اللہ عزّ وجلّ ایاه علٰی مـا ھـو عـلـیـه فـیـه کما روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فیه. (شرح مشکل الآثار للطحاوی، باب: ۲۶۴، ج: ۱۱ ص: ۶۷ الی ۶۹ طبع مؤسسة الرسالة)

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی تطبیق کا حاصل یہ ہے کہ جب انسان غفلت کی حالت میں کوئی قرض اپنے ذمہ لے، اور اُس کی ادائیگی کا اہتمام نہ ہو تو یہ ناجائز اور مذموم ہے، اور حضرت میمونہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے واقعات اس غفلت والے دَین میں داخل نہیں، بلکہ وہ چونکہ ادائیگی کا اِرادہ رکھتی تھیں، اور اس کے اسباب بھی اُن کے پاس موجود تھے، اس لئے اُن کا مدیون بننا جائز تھا، اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ اُدھار کسی حاجت ہی کی وجہ سے لیا ہوگا، اس لئے امام طحاویؒ نے اُس کو ذِکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور چونکہ ان کی نیت اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے کی تھی، اس لئے نہ صرف یہ کہ اُس میں کوئی کراہت نہیں تھی، بلکہ وہ موجبِ ثواب بھی تھا، لیکن ہر شخص اپنے آپ کو اُمہات المؤمنینؓ پر قیاس نہیں کرسکتا، جب کوئی مقروض بنتا ہے تو جس غفلت، خوف اور دُوسرے مذموم حالات کا ذِکر اَحادیث میں آیا ہے، اُن کا اِحتمال رہتا ہی ہے، اس لئے فقہائے کرام نے اِستقراض کے جواز کو حاجت کے ساتھ مشروط فرمایا ہے، جس کا مأخذ وہ حدیث ہے جس میں قرض دینے

کو صدقہ سے افضل قرار دِیا گیا ہے، اُس میں الفاظ یہ ہیں کہ:

فقلت: یا جبریل! ما بال القرض أفضل من الصدقة؟ قال: ان السائل قد یسئل وعنده والمستقرض لا یستقرض إلّا من حاجة.

(سنن ابن ماجة، أبواب ا۔دقات، حدیث: ۲۴۳۱ طبع دار السلام)

یہ حدیث اگرچہ ایک راوی خالد بن یزید کی وجہ سے ضعیف ہے، (کما فی مصباح الزجاجہ) لیکن اتنی بات کہ مستقرض کو کسی حاجت ہی کی وجہ سے قرض لینا چاہئے، احادیث کے مجموعی مزاج سے بھی واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ فقہائے کرامؒ نے حاجت کے وقت بھی جواز کے لئے "لا بأس" کی تعبیر اِختیار کی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ حتی الامکان اس سے پرہیز کرنا ہی بہتر ہے، چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں فرمایا گیا ہے:

لا بأس بأن یستدین الرجل اذا کانت له حاجة لا بد منها، وهو یرید قضاءها. (عالمگیریة، کتاب الکراهیة ج:۵ ص:۳۶۶)[1]

البتہ حاجت میں دُنیوی اور دِینی دونوں طرح کی حاجتیں داخل ہیں، اور ان کے تعین میں اِختلافِ رائے بھی ممکن ہے۔ اُمہات المؤمنینؓ کا جو عمل اُوپر ذِکر کیا گیا ہے، اُس میں یہ بات واضح ہے کہ اُن کو اپنے کھانے پینے کی ضروریات کے لئے قرض لینے کی اس لئے ضرورت نہیں تھی کہ اُن کا سال بھر کا نفقہ اُنہیں مل جایا کرتا تھا، حضرت عائشہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مذکورہ بالا سوال وجواب میں اس کی تصریح ہے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ اِعتراف بھی اُس روایت میں موجود ہے کہ اُن کو دِیا جانے والا سالانہ نفقہ اُن کے لئے کافی ہوتا ہے، لیکن انہوں نے کچھ دُوسرے حقوق کا ذِکر فرمایا ہے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ عمل متعدّد روایات سے ثابت ہے کہ وہ بکثرت صدقات وخیرات کیا کرتی تھیں، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ:

وکانت لا تمسک شیئًا مما جاءها من رزق الله إلّا تصدقت.

(صحیح البخاری، مناقب قریش، حدیث: ۳۵۰۵)[2]

لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ اُنہیں قرض لینے کی ضرورت صدقات وخیرات کی وجہ سے پیش آتی تھی، اور اُن کا مزاج یہ تھا کہ کسی ضرورت مند کو اُس کی ضرورت پوری کئے بغیر واپس کرنا اُنہیں گوارا نہیں تھا، چاہے اس کے لئے خود تنگی گوارا کرنی پڑے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دِینی اور دُنیاوی دونوں قسم کی

---

(۱) طبع رشیدیہ وبلوچستان بک ڈپو۔

(۲) الصحیح للبخاری ج۱ ص:۴۹۷ (طبع سعید).

حاجتوں میں قرض لینے کی گنجائش ہے۔

احادیث مذکورہ بالا، صحابہؓ کے آثار اور فقہائے کرامؒ کی تصریحات کی روشنی میں مندرجہ ذیل اَحکام مستنبط ہوتے ہیں:

۱- اگر قرض لیتے وقت ادائیگی کی نیت ہی نہ ہو تو ایسا قرض لینا حرام ہے، چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے: **"ولو استدان دينا وقصد أن لا يقضيه فهو آكل السحت"۔**[1]

۲- اگر کسی دِینی یا دُنیوی حاجت کے لئے قرض لیا جائے، اور ادائیگی کی نیت بھی ہو، اور ادائیگی کے ظاہری اسباب بھی موجود ہوں تو ایسا قرض لینا بلاکراہت جائز ہے۔

۳- اگر قرض کسی حاجت کے واسطے لیا جارہا ہو، اور لیتے وقت ادائیگی کی نیت تو ہو، لیکن ادائیگی کے اسباب موجود نہ ہوں، تو ایسا قرض لینا عام حالات میں مکروہ ہے، اِلَّا یہ کہ ضرورت کے درجے تک پہنچ جائے۔

۴- قرض لینے کی کوئی حقیقی دِینی ودُنیوی حاجت ہی نہ ہو، خواہ ادائیگی کی نیت اور اسباب بھی موجود ہوں، تو اُس صورت میں قرض لینا کم از کم مکروہ ضرور ہے۔

ان اُصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے آج کل اُدھار پر چیزیں خریدنے کا جو عام رُجحان پیدا ہوگیا ہے، اُس میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جو چیز اُدھار خریدی جارہی ہے، کیا اُس کی واقعی حاجت ہے؟ اگر واقعی کوئی ایسی حاجت کی چیز ہو جو ایک متوسط زندگی گزارنے کے لئے عرفاً ضروری سمجھی جاتی ہو، مثلاً وہ گھریلو سامان جو متوسط درجے کے آدمی کے گھر میں ہوتا ہی ہے، تو بے شک اُدھار یا قسطوں پر خریدنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ قرض کی ادائیگی کی نیت اور اُمید بھی ہو، لیکن صرف اشیائے تعیش کی خریداری کے لئے اپنے آپ کو مقروض بنانا کراہت سے خالی نہیں۔

جہاں تک دِینی حاجتوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں فقہائے کرامؒ نے اس مسئلے پر بحث فرمائی ہے کہ اگر کسی شخص پر زکوٰۃ یا حج فرض ہوگیا ہو، اور اُن کی ادائیگی کے لئے اُس کے پاس مال نہ ہو تو کیا وہ قرض لے کر حج یا زکوٰۃ ادا کرے؟

اس سلسلے میں ایک اثر حضرت طارق بن عبدالرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

سمعت ابن أبي أوفىٰ يُسئل عن الرجل يستقرض ويحج، قال:

---

(۱) ج:۵ ص:۳۶۶ (طبع بلوچستان بک ڈپو، ورشیدیه).

يسترزق الله، ولا يستقرض. قال: وكنا نقول: لا يستقرض إلّا أن يكون له وفاء.

(السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب الحج، باب الاستسلاف للحج ج:۴ ص:۳۳۳)[۱]

(واضح رہے کہ معرفۃ السنن والآثار (کتاب الحج، حدیث:۲۶۶۴)[۲] اور کتاب الأم (کتاب الحج ج:۵ ص:۳۵)[۳] میں یہ حدیث جس طرح نقل کی گئی ہے، اُس سے اس کے مرفوع ہونے کا شبہہ ہوتا ہے، لیکن بظاہر سنن کبریٰ کی اس روایت سے اس کا حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر موقوف ہونا زیادہ واضح ہے)

لیکن فقہائے کرامؒ کی تصریحات کی روشنی میں اس کا مطلب وجوبِ استقراض کی نفی ہے، جواز کی نفی نہیں۔ چنانچہ حضرت اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

ومن لم يكن في ماله سعة يحج بها من غير أن يستقرض فهو لا يجد السبيل، ولكن اذا كان ذا عرض كثير فعليه أن يبيع بعض عرضه أو الاستدانة فيه حتى يحج. (كتاب الأم للشافعي ج:۵ ص:۳۵ طبع: دار قتيبة)

اور حنفیہ میں سے اِمام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت تو یہ منقول ہے کہ اُس پر واجب ہے کہ قرض لے، لیکن دُوسرے فقہاء نے فرمایا ہے کہ واجب تو نہیں ہے، لیکن اگر اُس کا غالب گمان یہ ہے کہ وہ کوشش کرکے قرض ادا کردے گا تو اُس کے لئے افضل یہی ہے کہ وہ قرض لے کر فرض زکوٰۃ یا حج ادا کردے، لیکن اگر غالب گمان یہ ہو کہ ادائیگی کی نیت کے باوجود وہ قرض ادا نہیں کرسکے گا تو افضل یہ ہے کہ قرض نہ لے، چنانچہ درمختار میں ہے:

وقالوا: لو لم يحج حتّى أتلف ماله وسعه أن يستقرض ويحج ولو غير قادر علىٰ وفاءه، ويرجى أن لا يؤاخذه الله بذٰلك، أي لو ناويا وفاء اذا قدر كما قيده في الظهيرية.

اس کے تحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

"قوله وسعه أن يستقرض الخ" أي جاز له ذٰلك، وقيل: يلزمه الاستقراض كما في لباب المناسك، قال مُلّا علي القاري في شرحه عليه: وهو رواية عن أبي يوسف، وضعفه ظاهر، فان تحمل حقوق الله تعالىٰ أخف من ثقل حقوق العباد، انتهىٰ. قلت: وهٰذا يرد على القول الأوّل أيضًا ان كان

---

(۱) ص:۵۴۴ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).
(۲) باب الاستسلاف للحج ج:۷ ص:۳۶۳ (طبع موقع جامع الحديث).
(۳) باب الاستسلاف للحج ج:۲ ص:۱۱۶ (طبع دار المعارف).

المراد بقوله "ولو غير قادر علىٰ وفاءه" أن يعلم أنه ليس له جهة وفاء أصلا، أما لو علم أنه غير قادر في الحال وغلب علىٰ ظنه أنه لو اجتهد قدر على الوفاء فلا يرد، والظاهر أن هٰذا هو المراد أخذا مما ذكره في الظهيرية أيضًا في الزكٰوة حيث قال: ان لم يكن عنده مال وأراد أن يستقرض لأداء الزكٰوة فان كان في أكبر رأيه أنه اذا اجتهد بقضاء دينه قدر، كان الأفضل أن يستقرض، فان استقرض وأدى ولم يقدر علىٰ قضاءه حتى مات، يرجى أن يقضي الله تبارك وتعالىٰ دينه في الآخرة. وان كان أكبر رأيه أنه لو استقرض لا يقدر علىٰ قضاءه، كان الأفضل له عدمه، انتهى. واذا كان هٰذا في الزكٰوة المتعلق بها حق الفقراء، ففي الحج أولىٰ.

(رد المحتار، كتاب الحج ج:۲ ص:۴۵۷ و۴۵۸ طبع: ايچ ايم سعيد)

یہ ساری بحث حجِ فرض سے متعلق تھی، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر حج فرض ہو چکا ہو، اور کسی کے پاس ادائیگی کا اِنتظام نہ ہو، تو اُس کے لئے نہ صرف یہ کہ قرض لینا بلا کراہت جائز ہے، بلکہ اگر اُس کا غالب گمان یہ ہو کہ وہ کوشش کر کے قرض ادا کردے گا تو قرض لینا افضل ہے۔

عمرے کا معاملہ یہ ہے کہ مذہب میں راجح یہ ہے کہ عمر میں کم از کم ایک مرتبہ عمرہ کرنا سنت مؤکدہ ہے، اور اُس کے بعد مستحب ہے، چنانچہ درمختار میں ہے:

والعمرة في العمر مرة سُنّة مؤكدة على المذهب وصحح في الجوهرة وجوبها. (شامي ج:۲ ص:۴۷۲)(۱)

چونکہ عمرہ واجب نہیں ہے، اس لئے اگر کسی شخص کے پاس ادائیگی کا فوری اِنتظام نہ ہو تو اُس کے لئے عمرے کی خاطر قرض لینا بظاہر مکروہ ہوگا، اور اگر فوری طور پر رقم کا اِنتظام نہیں ہے، لیکن اُس کے ذرائع آمدنی کے لحاظ سے اُمید ہے کہ عنقریب اتنی رقم کا اِنتظام ہوجائے گا جو عمرے کے اِخراجات کے لئے کافی ہو تو اُس کے لئے بھی افضل یہ ہے کہ وہ اِنتظار کرے، اور قرض لینے کے بجائے اُس وقت عمرہ کرے جب اِنتظام ہوجائے، اس سے پہلے قرض لے کر عمرہ کرنا عام حالات میں خلافِ اَولیٰ ہے، کیونکہ فقہائے کرامؒ نے حج کو جانے والے کے لئے مستحب قرار دِیا ہے کہ اگر اُس کے ذمے پہلے سے کوئی دَین ہے تو حج کو جانے سے پہلے اُسے ادا کر کے جائے، اگر وہ دَین معجّل ہے تب تو اُس کی ادائیگی حج سے پہلے واجب ہے، اور اگر مؤجل ہے تو بھی افضل یہ ہے کہ دَین ادا کرے، پھر جائے۔ چنانچہ

(۱) طبع سعید.

غنیۃ المناسک میں ہے:

وکذا مدیون لا مال له یقضی، فانه یکره له الخروج الی الحج والغزو اِلّا باِذن الغریم .... هذا فی الدین الحال. أما فی المؤجل فله أن یسافر قبل حلول الأجل .... ولٰکن یستحب أن لا یخرج حتّٰی یوکل من یقضی عنه عند حلوله .... ولو کان له مال فیه وفاء للدین یقضی الدین أوّلاً وجوبا اذا کان معجلا، وان کان مؤجلا فالأفضل أن یقضی الدین.

(غنیۃ المناسک ص:۳۵)[1]

جب پہلے سے واجب دَین مؤجل میں بھی افضل یہ ہے کہ وہ اُسے ادا کر کے جائے تو خاص حجِ نفل یا نفلی عمرے کے لئے ایک دَین پیدا کرنا بھی یقیناً خلافِ اَولیٰ ہوگا۔

لیکن بعض صورتیں ایسی ہوسکتی ہیں جن میں اُسے یہ خیال ہو کہ جب رقم کا اِنتظام ہوگا، اُس وقت عملی طور پر عمرہ کرنا ممکن نہیں رہے گا، مثلاً یہ کہ اُس وقت ویزا نہیں مل سکے گا، یا کوئی عورت ہے جسے محرَم نہیں مل سکے گا، یا جن ساتھیوں کے ساتھ جانا چاہتا ہے، وہ میسر نہیں آسکیں گے، یا اُس کے اپنے حالات اُس وقت کسی اور وجہ سے سفر کی اِجازت نہیں دیں گے، تو اس صورت میں جبکہ اُس کے ذرائع آمدنی کے لحاظ سے قوی اُمید ہو کہ وہ قرض ادا کر سکے گا، تو اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ اُس کے لئے قرض لینا یا قسطوں پر اِخراجات کی ادائیگی کرنا خلافِ اَولیٰ بھی نہیں ہوگا، کیونکہ حجِ فرض کے لئے اگر ادائیگی کا اِنتظام نہ ہونے کے باوجود قرض لینا افضل قرار دِیا گیا ہے، تو حجِ نفل یا عمرے کے لئے ادائیگی کا اِنتظام ہونے کی شرط کے ساتھ ایسا کرنا بلاکراہت جائز ہونا چاہئے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

یہاں یہ بات بھی واضح کرنا مناسب ہے کہ قرض لینے کی جو کراہت یا مذمت ہے، اس سے مراد وہ صورت ہے جسے عرف میں مقروض بننا کہا جاتا ہے، لیکن بعض مرتبہ دو اَشخاص یا تاجروں کے درمیان اس قسم کے معاملات چلتے رہتے ہیں کہ وہ مال کی کمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ عملی سہولت کی بنا پر مختصر مدّت کے لئے اُدھار کے معاملات کرتے رہتے ہیں، پھر کسی قریبی تاریخ میں حساب کرلیتے ہیں، مثلاً بیع اِستجرار یا اُس کے مشابہ معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی اگرچہ ٹھیٹھ معنی میں اِستقراض ہی ہے، لیکن عرفِ عام میں اس کو قرض کا معاملہ نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ ہر شخص ہر وقت ادائیگی یا مقاصہ کرسکتا ہے، اور یہ اِستقراض کسی مالی تنگی کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ معاملات کی کثرت کی وجہ سے بار بار ادائیگی کرنے کے بجائے کئی معاملات کے اِکٹھے ہونے پر یکبارگی ادا کرنے کو فریقین آسان سمجھتے ہیں، اور اُسی کی

---

[1] (طبع ادارۃ القرآن).

بنیاد پر کام کرتے رہتے ہیں، لہٰذا بظاہر اس میں کوئی کراہت نہیں ہے، اور فقہائے کرامؒ نے بیع اِستجرار کو کسی کراہت کے بغیر جو جائز قرار دیا ہے،[1] وہ اس کی دلیل ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
محمد تقی عثمانی
دارالافتاء دارالعلوم کراچی
۱۳رشعبان ۱۴۳۰ھ

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۱۲ تا ص:۱۱۴ کا فتویٰ اور اُس کے حواشی۔

﴿فصل فی المسائل الجدیدة والمتفرّقة المتعلّقة بالبیع﴾

(خرید وفروخت کے جدید اور متفرّق مسائل)

۱- سی آئی ایف معاہدے کی شرعی حیثیت اور پورٹ تک پہنچنے سے پہلے مال بائع کی ملکیت ہے
۲- ایف او بی معاہدہ اور اس کی شرائط کا شرعی حکم

سوال:- قابلِ احترام جسٹس مولانا تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ میں ایک کتاب ''اسلام کا قانونِ معاہدہ'' تحریر کر رہا ہوں، یہ تصنیف انگریزی میں ہوگی، عنوان "Islamic Law of Contract" (اسلامک لاء آف کنٹریکٹ) ہے۔ چند عنوانات کے بارے میں مواد کافی کاوش کے باوجود نہیں مل سکا، براہِ کرم مجھے فتویٰ کی شکل میں اس کا جواب مہیا فرمائیں، جواب بے شک اُردو میں مہیا فرمائیں، میں انگریزی میں ترجمہ کرلوں گا، اگر جواب عربی میں دینا چاہیں تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ میں اُسے من وعن شائع کرسکوں گا۔ کتاب مذکورہ بالا آخری مراحل میں ہے اور اِن شاء اللہ جلد منصۂ شہود پر آجائے گی، شائع ہونے پر ایک کاپی آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا۔ ان سوالات پر فتویٰ درکار ہے جو دُوسرے صفحے پر ہیں۔[1]

---

(۱) یہ سوالات نقل فتاویٰ کے رجسٹر یعنی ریکارڈ میں موجود نہیں ہیں، لہٰذا اس خط میں سائل کے ذکر کردہ سی آئی ایف اور ایف او بی معاہدات اور ان کی شرائط کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکی۔ تاہم آگے حضرتِ والا دامت برکاتہم کے جوابات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال کی خریداری کے ان دو معاہدات میں سے سی آئی ایف میں ''انشورنس'' کی شرط کے علاوہ اس قسم کی شرائط طے کی گئیں کہ جن سے بائع کی طرف سے مال جہاز تک پہنچانے کے باوجود بائع کی ملکیت رہے گا، جبکہ ایف او بی معاہدہ میں اس قسم کی کئی شرائط طے کی گئیں جن کی رُو سے پورٹ پر مال پہنچنے کے بعد بائع کا ذمہ ختم ہوکر جہاز راں کمپنی خریدار کی وکیل طے پائی۔ بہرحال ان دونوں صورتوں میں خریدار کا قبضہ شرعاً کب متحقق ہوگا؟ اور پورٹ پر پہنچنے سے پہلے ہلاکت کی صورت میں نقصان کس کا متصوّر ہوگا؟ نیز پورٹ پر پہنچنے سے قبل خریدار مال آگے فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ان دونوں معاہدوں کی مختلف شرائط کی رُو سے الگ الگ جواب مرحمت فرمائے۔ سوالات کی کچھ مزید تفصیل خود حضرتِ والا دامت برکاتہم کے جوابات سے بھی معلوم ہوسکتی ہے۔ (محمد زبیر)

جواب:- سی آئی ایف معاہدے کی جو شرائط اُوپر ذکر کی گئی ہیں ان میں سے انشورنس کی شرط اس لئے دُرست نہیں کہ انشورنس کے مروجہ طریقے عموماً سود یا قمار پر مشتمل ہوتے ہیں[1]، باقی تمام شرائط دُرست ہیں۔ اور ان کا اثر یہ ہوگا کہ جب تک مال اس پورٹ پر نہ پہنچ جائے جہاں پہنچانا طے ہوا ہے، اس وقت تک یہ سمجھا جائے گا کہ مال ابھی بیچنے والے کی تحویل میں ہے، خریدار کے قبضے میں نہیں آیا، لہٰذا اگر اس دوران مال ضائع یا خراب ہو تو بیچنے والے کا نقصان سمجھا جائے گا۔[2] نیز جب تک مال مذکورہ پورٹ تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک خریدار اُسے اپنی ملکیت ہونے کی بناء پر آگے کسی کو فروخت نہیں کرسکتا۔[3] اس کے علاوہ اگر انشورنس اسلامی اُصولوں کے مطابق ہو تو پہنچنے سے پہلے نقصان کی صورت میں ہرجانے کا دعوے دار خریدار کے بجائے بیچنے والا ہوگا۔

---

(۱) تفصیل کے لئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ "بیمۂ زندگی" ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی خلاصة الفتاویٰ ج:۳ ص:۹۰ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) هلاک المعقود علیه قبل القبض ان کان بآفة سماویة أو بفعل البائع او بفعل المعقود علیه بأن کان المعقود علیه حیوانًا فقتل نفسه فانّ البیع یبطل فی هٰذا کلّه امّا اذا کان الهلاک بآفة سماویة أو بفعل المعقود علیه فلا یشکل وکذٰلک اذا کان بفعل البائع لأنّ المبیع فی یده مضمون بالثمن قبل القبض بدلالة انّه لو هلک سقط ثمنه من المشتری ولا یجوز أن یکون مضمونًا بالقیمة .... الخ.

وفی الشامیة ج:۴ ص:۵۲۰ (طبع سعید) لو هلک المبیع بفعل البائع أو بفعل المبیع أو بأمر سماوی بطل البیع ویرجع بالثمن لو مقبوضًا .... الخ. وکذا فی فتح القدیر ج:۵ ص:۴۹۶ (طبع رشیدیه).

(۳) کیونکہ ایسی صورت میں یہ بیع قبل القبض ہوگی جو ناجائز ہے۔

وفی مسند أحمد ج:۳ ص:۴۰۲ عن حکیم بن حزام رضی الله عنه قال: قلت: یا رسول الله! انی اشتری بیوعًا فما یحل لی منها وما یحرم علیّ؟ قال: فاذا اشتریت بیعًا فلا تبعه حتی تقبضه.

وفی سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۱۵۵ وسنن ابی داؤد رقم الحدیث: ۳۰۴۱ وسنن النسائی رقم الحدیث: ۴۵۵۱ عن عبدالله بن عمرو رضی الله عنهما قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لا یحلّ سلف وبیع ولا شرطان فی بیع ولا ربح مالم یضمن ولا بیع ما لیس عندک. (بحواله مشکوٰة المصابیح ص:۲۴۸).

فی الهدایة ج:۳ ص:۷۸ و۷۹ (طبع مکتبه رحمانیه) ومن اشتری شیئًا مما ینقل ویحول لم یجز له بیعه حتّٰی یقبضه لأنّه نهیٰ عن بیع مالم یقبض ولأن فیه غرر انفساخ العقد علی اعتبار الهلاک اهـ.

وفی فتح القدیر ج:۵ ص:۲۶۲ قال أبو حنیفةؒ وابو یوسفؒ یمتنع البیع قبل القبض فی سائر المنقولات ویجوز فی العقار الذی لا یخشیٰ هلاکه اهـ.

وفی المبسوط للامام السرخسیؒ ج:۱۳ ص:۸ قال ومن اشتری شیئًا فلا یجوز له أن یبیعه قبل أن یقبضه ولا یولیه احدًا ولا یشرک فیه .... لیس لمشتری الطّعام أن یبیعه قبل أن یقبضه لما روی أن النبی صلی الله علیه وسلم نهیٰ عن بیع الطعام قبل أن یقبض وکذٰلک ما سوی الطعام من المنقولات لا یجوز بیعه قبل القبض عندنا اهـ.

وفی الدر المختار ج:۵ ص:۱۴۷ (فلا) یصح .... (بیع منقول) قبل قبضه ولو من بائعه اهـ.

وفی البدائع ج:۵ ص:۱۴۶ (ومنها) وهو شرط انعقاد البیع للبائع أن یکون مملوکًا للبائع عند البیع فان لم یکن لا ینعقد وان ملکه بعد ذٰلک بوجه من الوجوه الا السلم خاصة وهٰذا بیع ما لیس عنده ونهیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع ما لیس عند الانسان ورخص فی السلم اهـ.

وفی تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۳۵۱ (طبع مکتبه دار العلوم) قال ابو حنیفةؒ وأبو یوسفؒ یمتنع البیع قبل القبض فی سائر المنقولات، ویجوز فی العقار لا یخشیٰ هلاکه.

۲:- ایف او بی معاہدے کی جو شرائط اُوپر ذکر کی گئی ہیں، ان کی رُو سے یہ معاہدہ شرعاً دُرست ہے، اور ان کا اثر یہ ہے کہ جس جہاز پر سامان لادا گیا ہے، اس کی جہازراں کمپنی کو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ خریدار کی طرف سے مال پر قبضہ کرنے کی وکیل یا ایجنٹ ہے، اس کے جہاز پر مال سوار ہونے سے یہ سمجھا جائے گا کہ بیچنے والے کی تحویل ختم ہوگئی اور خریدار نے اپنے نمائندے کے ذریعے مال پر قبضہ کرلیا، اب اگر سامان راستے میں خراب یا ضائع ہو تو اس کی ذمہ داری خریدار پر ہوگی[1]، اور خریدار کے لئے یہ بھی جائز ہوگا کہ جب اُسے یہ اطلاع مل جائے کہ جہازراں کمپنی نے مال وصول کرلیا ہے تو اس کے بعد وہ اُسے آگے کسی اور کو فروخت کردے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۹/۲/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۹/۴۰ الف)

دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کے ''بزناس'' کے فتویٰ پر ڈاکٹر عبدالواحد صاحب کا اِشکال اور اس کا جواب

سوال:- بخدمت گرامی حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

کچھ عرصے سے دارالعلوم کے دارالافتاء سے چند ایک ایسے فتوے دیئے گئے ہیں جن پر تعجب ہوا، اور خیال ہوا کہ توثیق و تصحیح سے قبل جناب کو ان پر بھرپور نظر ڈالنے کی فرصت نہ ملی ہوگی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ میں ان کو صحیح طریقے سے نہ سمجھ سکا ہوں گا اور میں نے اصل کتب سے صحیح نتیجہ اخذ نہ کیا ہوگا۔ بہرحال میرے لئے یہ یقیناً ایک اُلجھن کی بات بن گئی ہے کیونکہ جناب کی ذات اور دارالعلوم کا ادارہ عام لوگوں میں ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے، لوگ جب معارضے کے طور پر آپ کا نام استعمال کرتے ہیں تو کچھ کہنا بہت مشکل ہوجاتا ہے، فوری اہمیت کے چند ایک مسائل یہ ہیں:-

۱:- Biznas کے بارے میں فتویٰ، اس کے بارے میں جو میں نے لکھا تھا اس کی ایک کاپی ملفوف ہے۔ دارالعلوم سے ۱۴۲۳/۶/۲۰ھ کو جو فتویٰ لکھا گیا اس میں اوّل تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ دُوسری صورت میں اگر Product کی قیمت بازاری قیمت سے زیادہ لی گئی ہو تو واضح قمار ہوگا، کمپنی

---

(۱) وفی الهدایة ج:۳ ص:۱۹۰ باب الوکالة بالبیع والشراء (طبع مکتبه رحمانیه) فان هلک المبیع فی یده قبل حبسه هلک من مال المؤکل ولم یسقط الثمن لأن یده کید المؤکل فاذا لم یحبسه یصیر المؤکل قابضًا بیده.
وکذا فی البحر الرائق ج:۷ ص:۱۵۶ باب الوکالة بالبیع والشراء (طبع سعید) فلو هلک فی یده قبل حبسه هلک من مال المؤکل ولم یسقط الثمن لأن یده کید المؤکل فاذا لم یحبس یصیر المؤکل قابضًا بیده.
وکذا فی خلاصة الفتاوی ج:۴ ص:۱۵۸ الفصل الخامس فی الوکالة بالشراء.

کے حق میں اس کا رِشوت ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، قمار نہیں، واللہ اعلم۔ بہرحال یہ تو پریشانی کی چیز نہیں، لیکن اس کے بعد جو یہ لکھا ہے کہ: ''اب رہی یہ بات کہ یہ فیس زیادہ ہے یا برابر ہے یا کم ہے، اس کی تحقیق مفتی کی ذمہ داری نہیں، بلکہ جو شخص اس میں شامل ہونا چاہتا ہے وہ خود تحقیق کرے، اگر تحقیق کے نتیجے میں اس کا دِل اس بات پر مطمئن ہو کہ پروڈکٹ کی جو فیس اس نے ادا کی ہے وہ واقعۃً بازاری قیمت کے برابر ہے تو اس میں شمولیت اختیار کرے ورنہ اس سے اجتناب کرے۔''

حالانکہ عام لوگ اس کی کیا تحقیق کر سکتے ہیں؟ دارالعلوم کے مفتی صاحبان تو اپنے جاننے والوں سے اس کی بآسانی تحقیق کر سکتے ہیں، وہ معلوم کر کے حتمی جواب لکھتے تو عام لوگوں کو سہولت ہوتی۔ ہم لوگ کمپنی والوں سے پوچھیں گے جو ان کو بازاری قیمت کے برابر یا کم ہونے کا ہی یقین دِلائیں گے۔

تیسری صورت میں یہ تو لکھا ہے کہ: ''اگر پروڈکٹ کی بازاری قیمت جمع کردہ رقم کے کم از کم برابر بھی ہو تب بھی پروڈکٹ کے مقصود نہ ہونے کی وجہ سے یہ قمار کے مشابہ ضرور ہے، نیز اس میں کمیشن ایجنسی پروڈکٹ کی خریداری کے ساتھ مشروط ہونے کی خرابی بھی ہے، لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہئے'' ممبر شپ حاصل کرنے والوں کی عظیم اکثریت اسی تیسری صورت میں داخل ہے، اس حقیقت اور واقع نفس الامری کو نظرانداز کر کے ''اگر'' کے ساتھ جواب دینا عجیب لگتا ہے، پھر اس بات کو اگلی بات کہہ کر بالکل ہی کمزور کر دیا، یعنی ''اس میں وکالت پروڈکٹ کے معاملے کے ساتھ مشروط ہے ....الخ۔''

پھر جو اِشکال اور اس کا جواب لکھا گیا ہے وہ بھی ناقابلِ فہم ہے، شاید اصل صورتِ حال ذہن میں مستحضر نہ رہی ہو، اس کو میں نے اپنے جواب میں خاصی وضاحت سے لکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ''بزناس'' والے ہر ایک کے سامنے آپ کے فتوے کو اپنے حق میں پیش کر رہے ہیں۔

والسلام علیکم

عبدالواحد غفرلہٗ

۱۳؍رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

(مذکورہ اِستفتاء کے ساتھ ڈاکٹر عبدالواحد صاحب نے اپنا درج ذیل مضمون بھی ارسال فرمایا)

بزناس یا دِین و دُنیا کا ناس

توجہ فرمایئے

(حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر عبدالواحد صاحب، جامعہ مدنیہ لاہور)

کچھ عرصے سے بزناس (Biznas) کے نام سے ایک کمپنی کام کر رہی ہے، کراچی اور اسلام

آباد کے بعد اس نے لاہور میں زور پکڑا ہے، یہ کمپنی انٹرنیٹ (Internet) پر کام کرتی ہے، اور ستر ڈالر کی فیس کے عوض ممبر کو کمپیوٹر کے کچھ کورس اور ویب سائٹ کی پیش کش کی جاتی ہے، اس حد تک تو معاملہ بظاہر ٹھیک نظر آتا ہے، کیونکہ جس کو پیش کش سے فائدہ اُٹھانے میں دِلچسپی ہو وہ فیس دے تو معاملہ جائز ہے۔

لیکن اس کمپنی کے کام کے پھیلاؤ کا راز اس کے کام کے دُوسرے رُخ کی وجہ سے ہے۔ وہ رُخ یہ ہے کہ ستر ڈالر کی فیس دے کر بننے والے ممبر کو کمپنی آگے کمائی کرنے کی پیش کش کرتی ہے، جس کے مطابق اگر یہ ممبر براہِ راست اور بلاواسطہ دو مزید ممبر بنائے اور ان دونوں میں سے ہر ایک آگے مزید دو دو ممبر بنائے یہاں تک کہ بالآخر کم از کم نو ممبر بن جائیں تو کمپنی پہلے ممبر کو اپنی کمائی میں حصہ دار بنالیتی ہے۔
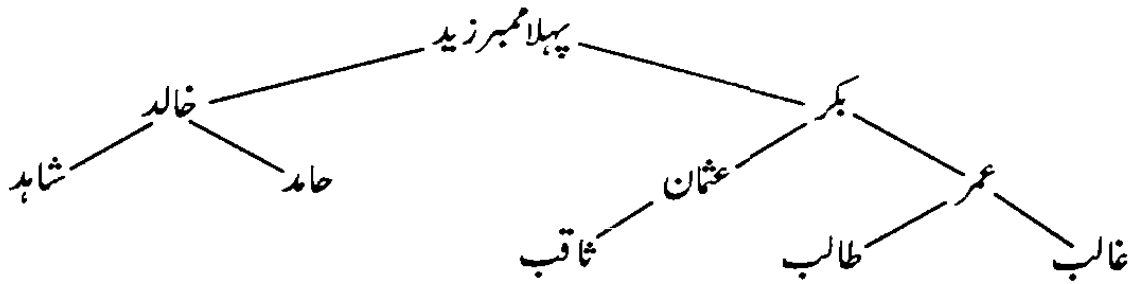
دائیں طرف تین ممبر اور بائیں طرف چھ ممبر ہوئے۔

کمپنی والے کہتے ہیں کہ کل ممبر جب مثلاً چودہ ہوجائیں گے تو کمپنی آپ کو پچاس ڈالر دے گی، اور جب کُل تیس ہوجائیں تو وہ آپ کو سو ڈالر دے گی، بلاواسطہ مزید ممبر بنانے پر وہ آپ کو پانچ ڈالر فی کس اور دے گی۔

حکم:

یہ کاروبار مکمل طور پر ناجائز ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ دلالی کی صورت ہے لیکن اس میں دلالی کی شرائط مفقود ہیں۔ دلال (Broker) کو اپنی محنت پر دلالی ملتی ہے لیکن بزناس کے گورکھ دھندے میں اپنی محنت پر اوّلاً تو کوئی اُجرت نہیں ملتی اور اگر اُجرت ملتی ہے تو دُوسرے کی محنت کی شرط پر۔ مثلاً اُوپر دیئے گئے نقشے کے مطابق زید نے اپنی محنت سے دو ممبر بنائے یعنی بکر اور خالد، لیکن فقط اس محنت پر جو کہ زید کی اپنی محنت ہے، زید کو کوئی اُجرت و کمیشن نہیں ملتی، اگر زید آگے مزید محنت نہ کرے اور صرف بکر اور خالد محنت کریں اور ممبر بنائیں اور وہ بھی آگے ممبر بنائیں یہاں تک کہ دیئے گئے نقشے کے مطابق کم از کم نو ممبر بن جائیں تب زید کو کمیشن ملے گا جو کہ تمام ممبران کے عدد کے تناسب سے ہوگا، اور اگر بکر اور خالد بھی آگے محنت نہ کریں اور ممبر سازی کا سلسلہ آگے نہ

چلے تو زید کو اپنی محنت پر بھی کچھ نہ ملے گا، حاصل یہ ہے کہ اس معاملے میں مندرجہ ذیل خرابیاں ہیں:-

۱:- زید کی اپنی محنت کی اُجرت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ آگے سات ممبر اور بنیں، اور وہ بھی وہ سات ممبر جو دُوسروں نے بنائے ہوں۔ اُجرت کو اس طرح کی شرط کے ساتھ مشروط کرنے سے خود معاملہ فاسد اور ناجائز ہوجاتا ہے۔

۲:- زید دو ممبر بنانے کے بعد بالکل محنت نہ کرے، بنائے ہوئے ممبر آگے محنت کریں اور یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا جائے تو دُوسروں کی محنت کے معاوضے میں زید بھی شریک ہوتا ہے، اس لئے کمپنی چودہ ممبر پورے ہونے پر زید کو پچاس ڈالر دیتی ہے اور تیس ممبر مکمل ہونے پر زید کو سو ڈالر دیتی ہے، یہ بھی ناجائز ہے اور حرام ہے۔

عام طور پر یہ مغالطہ دیا جاتا ہے کہ آگے جو ممبر بنے آخر ان کی بنیاد زید ہی کی تو محنت تھی، اگر وہ بکر اور خالد کو ممبر نہ بناتا تو آگے سلسلہ کیسے چلتا؟ علاوہ ازیں زید اب بھی دُوسروں کو محنت کی ترغیب تو دیتا ہے، اس مغالطے کا جواب یہ ہے کہ محض محنت کی ترغیب دینا تو خود محنت نہیں ہے، جس کا عوض ہو، اِلَّا یہ کہ کسی کو اس کام پر ملازم رکھ لیا جائے، دُوسرے کو کام کر۔ ز کی ترغیب دینے کو دلالی نہیں کہتے۔ اس لئے زید صرف اپنی محنت پر عوض کا حق دار ہوسکتا ہے، اس کی بنیاد پر آگے جو دُوسرے لوگ کام کریں ان کے محنتانہ میں شریک نہیں ہوسکتا۔

تنبیہ:- شریعت کا ضابطہ ہے کہ: "الأمور بمقاصدها" یعنی کاموں اور معاملات کا دار و مدار مقاصد پر ہوتا ہے، جب ہم بزناس (Biznas) کمپنی کے کام کی نوعیت کو دیکھتے ہیں تو اس کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ حصہ جس کو وہ اپنی Products کہتے ہیں، یعنی کمپیوٹر کے ٹریننگ کورس اور ویب سائٹ کی فراہمی۔ دُوسرا وہ حصہ جس کو وہ Marketing کہتے ہیں، یعنی آگے ممبر بنانا، اور اس پر اپنے ممبروں کو اپنی آمدنی میں شریک کرنا۔ ان دو حصوں میں سے کمپنی کا جو اصل مقصد ہے وہ اس کی Marketing یعنی ممبر سازی کا حصہ ہے، اور Products کا حصہ تو محض یہ دِکھانے کے لئے ہے کہ وہ فی الواقع تجارتی بنیادوں پر کام کر رہی ہے۔ ہمارے اس دعوے پر یہ مشاہدہ کافی دلیل ہے کہ اس کمپنی کے جو لوگ ممبر بن رہے ہیں ان میں سے اکثریت کے پاس تو اپنے کمپیوٹر بھی نہیں ہیں اور ان کو کمپیوٹر کی الف ب سے بھی کوئی واقفیت نہیں ہے، اور نہ ہی کسی کمپیوٹر کورس یا ویب سائٹ سے ان کو کوئی دِلچسپی ہے، یا اس سے ان کا کوئی بھی مفاد وابستہ ہے۔ غرض کمپنی کا اصل مقصد تو مارکیٹنگ (Marketing) ہے اور اس کے طریقۂ کار کے بارے میں ہم وضاحت سے بتاچکے ہیں کہ وہ سرے سے ناجائز اور حرام ہے، اور اصل بات یہ ہے کہ یہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ اس سے ملتے جلتے طریقے پہلے بھی چلائے گئے اور

چلائے بھی جارہے ہیں، یہ سب درحقیقت لوٹ کھسوٹ کے طریقے ہیں، البتہ حکمت یہ اختیار کی ہے کہ لوٹ کھسوٹ میں دُوسروں کو بھی شریک کرلو تاکہ اصل جرم لوگوں کی نظروں میں نہ آئے بلکہ وہ خود مال کے لالچ میں زیادہ سے زیادہ لوٹ کھسوٹ کروائیں۔

عبدالواحد
جامعہ مدنیہ لاہور

جواب:- گرامی قدر مکرم جناب مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب، زید مجدکم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں انتہائی ندامت کے ساتھ آپ کے ایک گرامی نامے کا جواب غیر معمولی تاخیر سے دے رہا ہوں، جو غالباً شوال میں مجھے ملا تھا اور اس میں دارالعلوم سے جاری ہونے والے تین فتووں[1] کے بارے میں توجہ دِلائی گئی تھی، جو خطوط مراجعت اور غور وفکر چاہتے ہیں، ان کی میرے پاس الگ ترتیب رہتی ہے، اور اب صورتِ حال ایسی ہوگئی ہے کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی فوری تقاضا مسلط رہتا ہے، آنے والوں کی کثرت، فوری ڈاک کی بھرمار اور اَسفار کا سلسلہ، ان کی وجہ سے قابلِ مراجعت اُمور ٹلتے چلے جاتے ہیں۔ آنجناب کے مکتوب میں چونکہ تین مسائل تھے، کسی وقت ایک مسئلے پر کچھ دیر غور یا مراجعت کا وقت ملا، مگر پھر کوئی عارض سامنے آگیا، اسی طرح باوجودیکہ وہ مکتوب ہر روز میری میز پر رہا، لیکن جواب لکھنے کی پوزیشن میں نہ آسکا، یہاں تک کہ یہ وقت آگیا۔ بہرحال! اس تاخیر پر تہِ دِل سے معذرت خواہ ہوں، اور ساتھ ہی شکرگزار ہوں کہ آپ نے ان اُمور کی طرف توجہ دِلائی۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ: ''توثیق وتصحیح سے قبل جناب کو ان پر بھرپور نظر ڈالنے کی فرصت نہ ملی ہوگی'' واقعہ یہ ہے کہ اپنی طرف سے کوشش تو یہی کرتا ہوں کہ دُوسرے فتاویٰ کی توثیق سوچ سمجھ کر ہی کروں، چنانچہ ایسے اوقات میں لوگوں کو فتوے لانے سے روکتا ہوں جب ذہن فارغ نہ ہو، لیکن فتویٰ کا کام ہی ایسا ہے کہ ہر وقت غلطی کا ڈر لگا رہتا ہے، بالخصوص ایسے مسائل میں جہاں صریح جزئیہ دستیاب نہ ہو، اور میرے پاس زیادہ تر ایسے ہی مسائل دارالافتاء سے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی سے دُعا ہے کہ وہ حفاظت فرمائیں۔

اب ان تین مسائل کے بارے میں اپنی گزارشات عرض کرتا ہوں۔

۱:- پہلا مسئلہ بزناس کا ہے، بندے نے آنجناب کے ارشادات پر بار بار غور کیا، اس سلسلے میں آنجناب نے تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں، پہلی یہ کہ ''اگر پروڈکٹ کی قیمت بازاری قیمت سے زیادہ لی گئی ہو تو کمپنی کے حق میں اس کا رِشوت ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، قمار ہونا نہیں۔'' بندے کی ناقص رائے میں اس میں قمار کا پہلو اس طرح ہے کہ جو قیمت زیادہ دی جارہی ہے وہ اس موہوم اُمید پر داؤ پر لگائی

(۱) مزید سوالات اور ان کے جوابات متعلقہ باب کے تحت آئیں گے، ان شاء اللہ۔ (محمد زبیر)

جارہی ہے کہ مارکیٹنگ سسٹم کے نتیجے میں اس سے کہیں زیادہ رقم حاصل ہوگی، اور اس طرح اس میں تعلیق التملیک علی الخطر پایا جارہا ہے، البتہ اگر اس کو اس پہلو سے دیکھا جائے کہ یہ زائد قیمت دلالی کا عقد کرنے کے لئے دی جارہی ہے تو اس میں رِشوت کا پہلو بھی ہے، بہرصورت یہ حرام ہے۔

آنجناب نے دُوسری بات یہ لکھی ہے کہ: ''پروڈکٹ کی قیمت کے کم یا زیادہ ہونے کا فیصلہ عام آدمی پر چھوڑنے کے بجائے خود تحقیق کرکے اس کا حکم لکھنا چاہئے تھا'' تو واقعہ یہ ہے کہ ہم نے متعدّد جاننے والوں سے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ پروڈکٹ کی قیمت یا فیس بازار میں مروّج قیمت سے زیادہ نہیں ہے، لیکن چونکہ ہم اس کی تکنیکی باریکیوں سے براہِ راست واقف نہیں، اس لئے بہ نظرِ احتیاط مناسب سمجھا کہ اس واقعے کے بیان کی ذمہ داری خود لینے کے بجائے متعلقہ افراد کو پابند کیا جائے کہ وہ خود بھی اس کی تحقیق کرلیں۔

تیسری بات آپ نے جو فتوے میں لکھی ہے کہ: ''دلال کو اپنی محنت پر دلالی ملتی ہے، لیکن بزناس کے گورکھ دھندے میں اپنی محنت پر اوّلاً تو کوئی اُجرت ملتی نہیں، اور اگر اُجرت ملتی ہے تو دُوسرے کی محنت کی شرط پر۔'' یہ بڑی اہم بات ہے، اور فتویٰ لکھنے سے پہلے بندے نے اس پر خصوصی اہمیت کے ساتھ فتویٰ لکھنے والے صاحب کو متنبہ کیا تھا، لیکن پھر انہوں نے متعلقہ افراد سے تحقیق کی اور صراحۃً بتایا کہ ہر شخص ابتدا میں جو دوگا ہک یا ممبر بناتا ہے، اس پر بھی اس کو ساٹھ روپے فی ممبر ملتے ہیں، جیسا کہ ان کے بیان کردہ پلان اور اِستفتاء میں صفحہ:۴ اور ۵ پر یونی لیول پلان کے زیرِ عنوان بیان کیا گیا ہے۔ بندے نے اسی فہم کی بنیاد پر مذکورہ فتوے کی توثیق کی ہے، آنجناب کے ارشاد کے بعد بندے نے ان سے مکرّر اس پہلو کی تصدیق کے لئے کہا، اور انہوں نے تصدیق کی، لیکن اگر واقعۃً صورتِ حال وہی ہے جو آپ نے بیان فرمائی ہے کہ اپنی محنت پر کچھ نہیں ملتا، بلکہ کمیشن دُوسروں کی محنت پر موقوف رہتا ہے، اور یہ بات ثابت ہوجائے تو بندہ اس فتوے سے یقیناً رُجوع کرلے گا، اگر اس بارے میں یقینی بات آپ کو بہ درجۂ ثبوت معلوم ہو تو ضرور مطلع فرمائیں۔

اور اگر یہ ثابت نہ بھی ہوسکے تب بھی چونکہ اس قسم کی اسکیمیں یکے بعد دیگرے آرہی ہے، اس لئے ان کے بارے میں اجتماعی غور وفکر مناسب معلوم ہوتا ہے، اور بندے نے اپنے دارالافتاء کے حضرات سے کہا ہے کہ وہ اہلِ فتویٰ کی ایک مجلس میں اس مسئلے کو رکھ کر اِجتماعی غور کا اہتمام کریں۔

والسلام

۱۴۲۴/۶/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۶۴۱/۱۸)

حضرتِ والا دامت برکاتہم کی کتاب ''فقہی مقالات'' (جلد اوّل) میں قسطوں پر خرید وفروخت، مرابحہ موَجلہ، حقوقِ مجردہ کی خرید وفروخت وغیرہ سے متعلق چند شبہات اور ان کے جوابات

(وضاحت)

(دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے مفتی غلام قادر نعمانی صاحب نے بیع بالتقسیط، مرابحہ موَجلہ اور بینکوں میں اس کے اجرا قرض، حقوقِ مجردہ کی خرید وفروخت اور مروّجہ پگڑی سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کے مقالوں پر کچھ اِشکالات تحریر فرمائے، اور حضرتِ والا دامت برکاتہم کو خط لکھا جس کے ساتھ ان شبہات پر مشتمل اپنی مطبوعہ تحریر بھی بھیجی۔ پہلے وہ خط، اس کے بعد ان کی تحریر، پھر حضرتِ والا دامت برکاتہم کا جوابی خط اور اِشکالات کے جوابات پر مشتمل فتویٰ ذیل میں پیشِ خدمت ہیں) (مرتب عفی عنہ)

(خط از مفتی غلام قادر نعمانی صاحب)

گرامی قدر محترم المقام جناب شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ العالی

سلامِ مسنون کے بعد، اُمید ہے مزاجِ گرامی خیریت سے ہوں گے، گزارش یہ ہے کہ بندے نے ''فقہی مقالات'' جلد اوّل کا کچھ سرسری مطالعہ کیا، اس میں کچھ اِشکالات سامنے آئے، وہ اِرسالِ خدمت ہے، اُمید ہے کہ ہمیں جواب سے نوازا جائے گا۔

والسلام

اخوکم فی اللہ

غلام قادر عفی عنہ

دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک

(شبہات پر مشتمل تحریر)

دورِ حاضر کے محقق اور جدید معاشیات کے ماہر شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی کی فقہی خدمت قابلِ تعریف ہے۔ مولانا عثمانی صاحب نے اس دور کے نو وارِد جدید مسائل کے حل کا راستہ تلاش کیا ہے، اور علمائے اُمت کے لئے اکثر مسائل میں راہنمائی فرما کر تحقیق کی راہ ہموار کی۔ اور علماء خصوصاً اور عوام عموماً ان کی تحقیق کے فائدے سے مستفید ہوئے۔ لیکن یہ بھی ظاہر بات ہے کہ قدیم زمانے سے اکثر مسائل میں علماء کا اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، اور اس اختلافِ رائے کی وجہ سے اسلام میں مذاہبِ اربعہ مرتب ہوئے ہیں، اور اُمتِ مسلمہ نے تسلیم کئے ہیں۔ تاہم بندے نے جنابِ والا کی گراں قدر تصنیف ''فقہی مقالات'' جلد اوّل کا مطالعہ کیا، اس تصنیف میں بعض مسائل میں مصنف صاحب نے اپنی رائے قائم کی ہے، اور اس رائے میں کچھ اِشکالات ہیں، لہٰذا مصنف صاحب

کی آراء پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے تا کہ یہ اِشکالات زائل ہوکر کتاب کی تنقیح کی جاسکے۔ اور چونکہ یہ کتاب عام ہوچکی ہے لہٰذا مناسب یہ ہے کہ یہ تحریر نشر کی جائے تا کہ قارئین حضرات کے شکوک وشبہات رفع ہوجائیں۔ ترتیب یہ ہے کہ ہم پہلے وہ مسئلہ لکھتے ہیں جس مسئلے میں مصنف صاحب نے اپنی رائے قائم کی ہے، اور پھر مصنف صاحب کی رائے ذکر کرتے ہیں، اور اس کے بعد اِشکال لکھتے ہیں۔

اِشکال ا:- مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کچھ سامان وغیرہ اشیاء نفع کے ساتھ قرض فروخت کردیتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ بائع نفع کی مقدار بیان نہ کرے اور سامان فروخت کردے۔ دُوسری صورت یہ ہے کہ بائع نفع کی مقدار بیان کرے، مثلاً یوں کہے کہ دس مہینے تک مدّت قرض ہوگی اور اصل قیمت کے علاوہ ایک ہزار نفع ہوگا۔ فقہ میں پہلی صورت کو مساومہ کہتے ہیں اور دُوسری صورت کو مرابحہ مؤجلہ کہتے ہیں۔ اب دونوں صورتوں میں بیع تام ہونے کے بعد اگر بائع، مشتری سے یہ کہے کہ اگر آپ قرض کی مدّت پوری ہونے سے پہلے قرض ادا کریں تو میں اس مدّت کے عوض میں آپ کو اتنی رقم معاف کردُوں گا۔ تو یہ مدّت کے مقابلے نفع میں معافی اور کمی بیعِ مساومہ میں جائز نہیں ہے، اور مرابحہ مؤجلہ کی صورت میں اس تعجیل کی وجہ سے نفع میں کمی کرنا جائز ہے۔ بلکہ فقہائے کرام نے تصریح کی ہے کہ جب دائن مدیون سے تعجیلِ دَین کا مطالبہ کرے تو اس تعجیل کی صورت میں بقدرِ تعجیلِ مدّت دائن مدیون سے نفع میں کمی کرے گا۔ مثلاً بائع نے دس مہینوں تک ایک ہزار نفع پر مرابحہ مؤجلہ کا معاملہ کیا ہے، اب بائع پانچ مہینے پہلے دَین کا مطالبہ کر رہا ہے، تو اس مطالبے کی صورت میں مدیون سے پانچ مہینوں کے حساب سے نفع کم لیا جائے گا، تو ایک ہزار کے نفع میں پانچ سو نفع چھوڑ دے گا، اور پانچ سو نفع وصول کرے گا۔ مصنف صاحب نے اس مسئلے کی توثیق کے لئے اپنی کتاب ''فقہی مقالات'' ج:۱ ص:۱۱۶ پر متعدّد کتابوں کے حوالے پیش کئے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں (ردّ المحتار لابن عابدین ج:۶ ص:۷۵۷ آخر الحظر والاباحۃ) یہی مسئلہ کتاب البیوع میں فصل فی القرض سے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ علامہ حانوتی، علامہ نجم الدین اور علامہ ابوالسعود نے بھی اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ دیکھئے: شامی ج:۵ ص:۱۶۰۔ اور یہی مسئلہ حاشیۃ الطحطاوی علی الدر میں بھی مذکور ہے، دیکھئے: ج:۳ ص:۱۴۰ و ج:۴ ص:۳۶۳۔ بعینہٖ یہی مسئلہ تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ میں بھی مذکور ہے۔ ان حوالہ جات کے علاوہ جناب مصنف صاحب کی عبارت میں ص:۱۱۷ پر اسی مسئلے پر فتاویٰ الانقروی، التنویر اور شرح المجلۃ للاتاسی کے حوالے بھی مذکور ہیں۔ مصنف صاحب کے حوالوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ان مذکورہ کتابوں میں اسی پر فتویٰ ہے کہ تعجیلِ دَین کی صورت میں مرابحہ مؤجلہ میں بائع نفع میں کمی کرے گا۔

مصنف صاحب کی رائے:- مذکورہ بحث کے بعد مصنف صاحب ص:۱۱۸ پر اپنی رائے قائم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس مسئلے میں بیعِ مساومہ اور بیعِ مرابحہ کا کوئی فرق نہیں ہے (یعنی فقہائے کرام نے جو فرق بیان کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے) اس کے بعد فرماتے ہیں: لہٰذا میری رائے میں بیع بالتقسیط اور بیع مرابحہ کے وہ معاملات جو اِسلامی بینکوں میں رائج ہیں ان میں مندرجہ بالا فتویٰ پر عمل کرنا مناسب نہیں ہے۔

مصنف صاحب کی رائے پر اِشکال:- اِشکال یہ ہے کہ اتنے بڑے بڑے فقہائے کرام نے (جو مذکورہ بالا حوالہ جات میں ان کا ذکر کیا گیا ہے) بیعِ مساومہ اور بیع مرابحہ کے حکم میں فرق کیا ہے اور مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ بیع مساومہ اور بیع مرابحہ کا کوئی فرق نہیں ہے۔ فقہائے کرام کے فرق سے انکار محلِ تأمل ہے۔ اور فرق یقیناً موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بیعِ مساومہ میں مدّت کے مقابلے میں قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہے، جبکہ مرابحہ مؤجلہ میں مدّت کے مقابلے میں قیمت میں اضافہ ہے۔ دُوسرا فرق یہ ہے کہ جہاں فقہائے کرام نے نفع میں کمی بیشی کو ناجائز قرار دیا ہے وہ مشروط ہے، اور جہاں فقہائے کرام نے نفع میں کمی کا قول کیا ہے تو اس صورت میں ہے کہ پہلے سے کمی بیشی مشروط نہ ہو۔ اور مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ وہ معاملات جو اِسلامی بینکوں میں رائج ہیں ان میں مندرجہ ذیل فتویٰ پر عمل کرنا مناسب نہیں ہے۔ تو جہاں تک بینک کے معاملات کا تعلق ہے تو عدمِ جواز اس صورت میں ہے کہ بینک کے معاملات میں سامان کی اصل قیمت میں تردّد ہو یا تعینِ اجل میں تردّد ہو اور اگر مرابحہ مؤجلہ میں سامان کی قیمت بھی متعین ہو اور اَجل بھی متعین ہو تو اس صورت میں جواز ہے اور مصنف صاحب نے اس صورت کے جواز پر ص:۸۳ پر قول کیا ہے، اور اس کے جواز پر ائمہ اَربعہ اور جمہور فقہاء کا مسلک نقل کیا ہے، لہٰذا فقہائے کرام کا فتویٰ مطلقاً غیر مناسب سمجھنا دُرست نہیں ہے، بلکہ مناسب مسئلے کی تفصیل ہے، تاکہ مسئلے کی نوعیت بھی واضح ہو اور فقہائے کرام کا فتویٰ بھی مجروح نہ ہو۔ مصنف صاحب نے اپنی رائے کی توثیق کے لئے یہ وجہ بیان کی ہے کہ اگر مندرجہ بالا فتویٰ پر عمل کیا گیا تو اس صورت میں بیعِ مرابحہ اور قسطوں پر بیع کی ان سودی معاملات سے زیادہ مشابہت ہوجائے گی جن میں مختلف مدتوں کے ساتھ ارتباط کی وجہ سے اصل واجب ہونے والی رقم میں شک رہتا ہے کہ وہ کم ہوگی یا زیادہ۔ مصنف صاحب نے اپنی رائے کی توثیق کے لئے جو وجہ بیان کی ہے، یہ انتہائی کمزور ہے، اس وجہ سے کہ فقہائے کرام کے فتویٰ پر عمل کرنے سے اگرچہ سودی معاملات سے مشابہت ہوجائے گی لیکن یہ مشابہت نقصان دہ نہیں ہے، اس لئے کہ فقہاء نے مرابحہ مؤجلہ میں قلتِ نفع پر قول کیا ہے، اور سودی معاملات میں زیادتِ نفع پر اصرار کیا جاتا ہے، لہٰذا قلتِ نفع پر قول کرنے

سے سودی معاملات سے مشابہت کم ہوجائے گی، اور زیادتِ نفع پر قول کرنے سے سودی معاملات سے مشابہت زیادہ ہوجائے گی، جیسا کہ مصف صاحب کی رائے ہے، لہٰذا فقہائے کرام کی رائے راجح ہے، اور مصنف صاحب کی رائے مرجوح ہے۔

اِشکال ۲:- مسئلہ یہ ہے کہ اگر قرض کی ادائیگی کی مدّت پوری ہونے سے پہلے مدیون کا انتقال ہوجائے تو کیا وہ دَین پہلے کی طرح مؤجل ہی رہے گا یا وہ دَین فی الفور واجب الاداء ہوگا، اور دائن کو مدیون کے ورثاء سے اس دَین کی ادائیگی کا فوری مطالبے کا حق حاصل ہوجائے گا یا نہیں؟ اس مسئلے میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں۔ حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کے جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے دَین مؤجل فوری واجب الادا ہوجاتا ہے، اور اِمام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک روایت اسی طرح منقول ہے، لیکن حنابلہ کے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ اگر مدیون کے ورثاء اس دَین کی توثیق کردیں اور اس کی ادائیگی پر اِطمینان دِلادیں تو اس صورت میں وہ دَین مدیون کی موت سے فوری واجب الادا نہیں ہوگا، بلکہ وہ پہلے کی طرح مؤجل ہی رہے گا۔

مصنف صاحب کی رائے:- مصنف صاحب مذکورہ مسئلے میں اپنی رائے قائم کرتے ہوئے ''فقہی مقالات'' ج:۱ ص:۱۳۷ پر لکھتے ہیں: میرے نزدیک اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ اگرچہ جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت سے وہ دَین فی الفور واجب الادا ہوجائے گا لیکن بیع بالتقسیط اور مرابحہ مؤجلہ جن میں ثمن کا کچھ حصہ مدّت کے مقابلے میں بھی ہوتا ہے اگر ان میں ہم فوری واجب الادا کے قول لے لیں تو اس صورت میں مدیون کے ورثاء کا نقصان ہے، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ دو قولوں میں سے ایک قول کو اِختیار کرلیا جائے، یا تو متأخرینِ حنفیہ کا قول لے لیا جائے کہ ادائے دَین کی جو مدّت متفق علیہ تھی اس کے آنے میں جتنا وقت باقی ہے اس وقت کے مقابلے میں جتنا ثمن آتا ہے، وہ ساقط کردیا جائے، لہٰذا مدیون کے ترکے میں سے صرف اَیامِ گزشتہ کے مقابل جو ثمن ہو وہ وصول کرلیا جائے۔ یا پھر حنابلہ کا قول اِختیار کرتے ہوئے جس طرح وہ دَین مؤجل تھا اب بھی اسی طرح مؤجل رہنے دیا جائے البتہ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ مدیون کے ورثاء کسی قابلِ اعتماد ذریعے سے اس دَین کی توثیق کردیں۔ شاید حنابلہ کا یہ قول اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ مدتوں کے اختلاف کی وجہ سے ثمن میں جو تذبذب کی صورت ہوتی اور جس کی وجہ سے صورۃً سودی معاملات سے مشابہت ہوجاتی ہے وہ تذبذب اس صورت میں نہیں۔

مصنف صاحب کی رائے پر اِشکال:- اس رائے میں دو قسم کے اِشکال ہیں:-

۱- اپنا مذہب چھوڑ کر کسی دُوسرے مذہب کو اِختیار کرنا اس وقت جائز ہے جب کوئی ضرورتِ

شدیدہ پیش آجائے اور جب کوئی ضرورتِ شدیدہ نہ ہو تو دُوسرے مذہب کو اِختیار کرنا یا ترجیح دینا اُصولِ اِفتاء کے خلاف ہے اور تقلید کے منافی ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: "ان اختیار مذهب الغير في بعض المسائل والافتاء به يجوز للمجتهد فلا يجوز الا بشرائط" اس بحث کے آخر میں فرماتے ہیں: "فلا يجوز الا بشروط الضرورة الشديدة وعموم البلوىٰ والاضطرار" (جواهر الفقه ج:۱ ص:۱۶۶)۔

۲- حنابلہ کے مذہب کو ترجیح دینے میں یہ اِشکال ہے کہ اگر ترکہ تقسیم نہ کیا جائے، اور مدّتِ قرض تک موقوف کیا جائے تو پھر یتیموں اور بیواؤں کے ان حقوق میں تاخیر آجائے گی جو ترکۂ میت سے متعلق ہیں، اور اگر ترکہ تقسیم کیا جائے یعنی دَین ادا کرنے سے پہلے تو اس ترکے سے دَین متعلق ہے، اور دَین کی ادائیگی سے پہلے ترکہ تقسیم کرنا اِرشادِ خداوندی کے خلاف ہے، اِرشادِ خداوندی ہے: "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِىْ بِهَا اَوْ دَيْنٍ"۔

۳- مصنف صاحب نے اس سے پہلے بیع بالتقسیط کے جواز کا قول کیا ہے، اس قول کے بعد مرابحہ مؤجلہ میں تاویلات کی کیا ضرورت ہے، کیونکہ بیع بالتقسیط اور مرابحہ مؤجلہ کا حکم ایک ہی ہے۔

اِشکال ۳:- مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی صاحب کا حقِ شرب یعنی کسی نہر یا چشمے سے پانی لینے کا حق ہو، تو اس حقِ شرب کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ اس حقِ شرب کی بیع کے بارے میں فقہائے اَحناف کے اقوال مختلف ہیں، چنانچہ حنفی مسلک کی ظاہر روایت یہ ہے کہ حقِ شرب کی بیع جائز نہیں ہے، اور بعض فقہائے کرام نے عرف کی بنیاد پر حقِ شرب کی بیع جائز قرار دی ہے، لیکن جمہور کا مسلک یہ ہے کہ حقِ شرب کی بیع جائز نہیں ہے، چنانچہ ردّ المحتار، مبسوط السرخسی، فتح القدیر، عنایۃ، ان کتابوں میں عدمِ جواز پر فتویٰ ہے۔

مصنف صاحب کی رائے:- جناب مصنف نے "فقہی مقالات" ج:۱ ص:۱۸۷ پر اس مسئلے پر تحقیق قلم بند کی ہے، اور اپنی رائے صراحۃً قائم نہیں کی ہے۔ لیکن ان کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف صاحب کی رائے حقِ شرب کی بیع کے جواز کا ہے۔ مصنف صاحب کی عبارت ملاحظہ فرمائیں، مصنف صاحب لکھتے ہیں: حنفی مسلک کی ظاہر روایت یہ ہے کہ حقِ شرب کی بیع جائز نہیں ہے، پھر بہت سے مشائخ نے عرف کی بنیاد پر حقِ شرب کی بیع جائز قرار دی ہے۔ (اس کے بعد لکھتے ہیں) لیکن نظرِ غائر سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جن فقہاء نے حقِ شرب کی بیع کا عرف قائم ہونے کے باوجود اس کے جواز سے منع کیا ہے، ان حضرات نے غرر اور جہالت کی وجہ سے منع کیا ہے، اس وجہ سے نہیں کہ حقِ شرب مال نہیں۔ اور ص:۱۹۸ پر لکھتے ہیں: اِمام سرخسیؒ نے دوبارہ یہ مسئلہ کتاب المزارعۃ میں

زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اور اَخیر میں بیعِ شرب کو عرف کی وجہ سے جائز کہنے والے مشائخ متأخرین کا قول ذکر کیا اور ان کے قول پر کوئی تنقید نہیں کی ہے۔ اور اسی صفحے کے اَخیر میں لکھتے ہیں: بعض متأخرینِ اَحناف نے لکھا ہے جن حقوق کی بیع جائز نہیں ہے، مثلاً حقِ تعلّی، حقِ مسیل، حقِ شرب، ان کا عوض لینا بطریقِ بیع تو جائز نہیں ہے، لیکن صلح کے طریقے پر ان کا عوض لینا جائز ہے۔ علامہ خالد اتاسیؒ مال کے بدلے میں وظائف سے دستبرداری کا مسئلہ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "اقول وعلیٰ ما ذکروہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ بمال ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن حق التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال ...الخ" جناب مصنف صاحب کی ص:۱۹۲ پر عبارت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جناب مصنف صاحب حقِ شرب کی بیع کے جواز کی طرف رُجحان رکھتے ہیں۔

مصنف صاحب کی رائے پر اِشکال:- مصنف صاحب ص:۱۸۷ پر فرماتے ہیں کہ ظاہر روایت یہ ہے کہ حقِ شرب کی بیع جائز نہیں ہے، پھر بہت سے مشائخ نے عرف کی بنیاد پر حقِ شرب کی بیع جائز قرار دی ہے۔ مصنف صاحب کا یہ دعویٰ دُرست نہیں ہے کہ بہت سے مشائخ نے حقِ شرب کی بیع جائز قرار دی ہے، کیونکہ مصنف صاحب نے حقِ شرب کی بیع کے جواز پر دو حوالے پیش کئے ہیں، جبکہ خود مصنف صاحب نے عدمِ جواز پر چار حوالے پیش کئے ہیں، اور عدمِ جواز ظاہر روایت ہے، اور جواز بعض متأخرین کی رائے ہے۔ پھر کیسے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہت سے مشائخ نے حقِ شرب کی بیع جائز قرار دی ہے۔ دُوسری بات یہ ہے کہ مصنف صاحب نے اپنی رائے کے اِثبات کے لئے مبسوط سرخسی کا حوالہ دیا ہے اور یہ حوالہ محلِ تأمل ہے کیونکہ صاحبِ مبسوط نے حقِ شرب کی بیع کا عدمِ جواز صراحۃً نقل کیا ہے، اور جواز کا قول ضمناً نقل کیا ہے۔ اور پھر اس جواز کے قول پر رَدّ بھی کیا ہے۔ نیز مصنف ص:۱۸۹ پر لکھتے ہیں: اِمام سرخسیؒ نے دوبارہ یہ مسئلہ کتاب المزارعۃ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور اَخیر میں بیعِ شرب کو عرف کی وجہ سے جائز کہنے والے مشائخ متأخرین کا قول نقل کیا ہے اور ان کے قول پر کوئی تنقید نہیں کی ہے۔ "وبعض المتأخرین من مشائخنا ....الخ" مصنف صاحب نے اہتمام کے ساتھ مبسوط کا حوالہ نقل کیا ہے اور اس کی نسبت مشائخ متأخرین کی طرف کی ہے۔ حالانکہ اسی جگہ یہ تصریح ہے کہ جمہور متأخرین نہیں بلکہ بعض متأخرین مراد ہیں اور اس بعض متأخرین کا مصداق صاحبِ مبسوط کے نزدیک ایک ہی شیخ ہے، صاحبِ مبسوط لکھتے ہیں: "وکان شیخنا الاسلام یحکی عن استاذہ انہ کان یفتی بجواز بیع الشرب ....الخ" پھر ایک ہی شیخ سے بہت سے مشائخ سے تعبیر کرنا بے جا ہے۔ نیز مصنف صاحب نے ص:۱۸۹ پر اپنی رائے کے اِثبات کے لئے بعض متأخرین کا قول

نقل کیا ہے اور جمہور کے قول سے چشم پوشی کی ہے۔ جبکہ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ دونوں اقوال نقل کرتے۔ اور جمہور کے مقابلے میں بعض متأخرین کے قول کو ترجیح دینا اُصولِ اِفتاء کے خلاف ہے۔
مصنف صاحب ص:۱۸۹ پر لکھتے ہیں کہ بعض متأخرینِ اَحناف نے لکھا ہے کہ حقِ شرب کی بیع جائز نہیں ہے، لیکن صلح کے طریقے پر ان کا عوض لینا جائز ہے۔

مصنف صاحب نے اس تحریر کے بعد علامہ خالد اتاسیؒ کا قول نقل کیا ہے، یہاں بھی یہ وہم ہوتا ہے کہ متأخرینِ اَحناف کوئی جماعت ہے، حالانکہ مصنف صاحب نے ایک ہی عالم خالد اتاسیؒ کا قول نقل کیا ہے، اور خالد اتاسیؒ نے فتویٰ نہیں دیا ہے، انہوں نے ایک تجویز پیش کی ہے، وہ لکھتے ہیں:
"اقول وعلیٰ ما ذکروہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردة بمال ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن حق التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال ....الخ" اور مصنف صاحب نے علامہ خالد اتاسیؒ کی تجویز کو جواز پر حمل کر کے متأخرینِ اَحناف کو منسوب کیا، مطلقاً متأخرینِ اَحناف کو جواز کی نسبت دُرست نہیں ہے۔

اِشکال۴:- مسئلہ یہ ہے کہ حقوقِ مجردہ یعنی آں حقوق کہ اعیان نہ ہو، ان میں ایک حق اسبقیت ہے، حقِ اسبقیت سے مراد یہ ہے کہ مباح الاصل چیز پر سب سے پہلے قابض ہونے کی وجہ سے انسان کو مالک بننے کا جو حق یا اس مال کے ساتھ جو خصوصیت حاصل ہوتی ہے، اس کو حقِ اسبقیت کہا جاتا ہے، مثلاً افتادہ بنجر زمین کو قابلِ استعمال بنانے سے مالک بننے کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔

مصنف صاحب کی رائے:- مصنف صاحب ص:۱۹۷ پر لکھتے ہیں: فقہائے اَحناف اور مالکیہ کی کتابوں میں مجھے نہیں ملا کہ کس فقیہ نے حقِ اسبقیت کی بیع کا مسئلہ چھیڑا ہوا، فقہائے اَحناف اور مالکیہ نے تو یہ ذکر کیا ہے کہ افتادہ بنجر زمین پر نشان لگانے سے وہ شخص زمین کے استعمال کرنے اور زمین کا مالک بننے کا زیادہ حق دار ہوجاتا ہے، لیکن مجھے اس حق کی بیع کی بحث ان فقہاء کے یہاں نہیں ملی، قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے نزدیک بھی حقِ اسبقیت کی بیع جائز نہ ہو، الاَّ یہ کہ دست برداری کے طور پر ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ بعض فقہاء اس بیع کو جائز کہتے ہیں، لیکن فقہاء کی بڑی جماعت کی رائے اس کے عدم جواز کی ہے، البتہ حقِ اسبقیت سے مال لے کر بطورِ صلح کے دست بردار ہوجانا فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔

مصنف صاحب کی رائے پر اِشکال:- مصنف صاحب پہلے یہ فرماتے ہیں کہ فقہائے اَحناف اور مالکیہ کی کتابوں میں مجھے نہیں ملا کہ کس فقیہ نے حقِ اسبقیت کی بیع کا مسئلہ چھیڑا ہو، اور

بعد میں فرماتے ہیں البتہ حقِ اسبقیت سے مال لے کر بطور صلح کے دست بردار ہو جانا فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔

۱- مصنف صاحب کے کلام میں تعارض ہے، کیونکہ پہلے یہ فرماتے ہیں کہ مجھے فقہائے اَحناف اور مالکیہ کی کتابوں میں نہیں ملا، اور بعد میں یوں کہتے ہیں کہ حقِ اسبقیت سے مال لے کر بطور صلح کے دست بردار ہو جانا فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ جب مصنف صاحب کو پہلے یہ مسئلہ کتابوں میں ملا نہیں پھر فقہاء سے جواز کہاں سے ثابت ہوا؟ لہٰذا فقہائے اَحناف کی طرف یہ نسبتِ جواز دُرست نہیں ہے۔

۲- مصنف صاحب نے حقِ اسبقیت کے مسئلے میں اَحناف کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی ہے، محض قیاس آرائی پر مسئلہ حل کیا ہے۔ آخر اس قیاس آرائی کی کیا ضرورت ہے؟ راجح یہ ہے کہ حقِ اسبقیت کی بیع بھی جائز نہیں ہے جیسا کہ فقہائے کرامؒ نے تصریح کی ہے، اور حقِ اسبقیت سے دستبرداری کے طور پر بھی مال لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ اگر جواز کا فتویٰ دیا جائے تو بہت سے لوگ سرکاری زمینوں میں نشانات لگا کر اس کی بیع اور دستبرداری کے طور پر مال لینے میں مصروف ہو جائیں گے۔

اِشکال ۵:- مصنف صاحب ص:۲۱۷ پر لکھتے ہیں: ہمارے زمانے کی موجودہ پگڑی جو مالک کرایہ دار سے لیتا ہے جائز نہیں ہے۔ اور پگڑی کے نام پر لی جانے والی یہ رقم شریعت کے کسی قاعدے پر منطبق نہیں ہوتی، لہٰذا یہ رقم رِشوت اور حرام ہے، البتہ پگڑی کے مروّجہ نظام میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں ممکن ہیں۔

۱- مالکِ مکان و دُکان کے لئے جائز ہے کہ وہ کرایہ دار سے خاص مقدار میں یکمشت رقم لے لے، جسے متعینہ مدت کا پیشگی کرایہ قرار دیا جائے، یہ یکمشت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی۔ اس یکمشت لی ہوئی رقم پر اِجارہ کے سارے اَحکام جاری ہوں گے۔ یہاں مصنف صاحب مروّجہ پگڑی کی متبادل صورت بتا رہے ہیں، اور اس متبادل صورت میں اسی مروّجہ پگڑی کو فروغ ملتا ہے، کیونکہ مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ یہ یکمشت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی، جب یہ یکمشت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہو پھر تو یہ وہی پگڑی ہوگی جو پہلے اس کی حرمت پر بحث کی گئی ہے، لہٰذا عبارتِ ھٰذا کی وضاحت چاہئے۔

اِشکال ۶:- مصنف صاحب مکان و دُکان کے اِجارے کے مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے ص:۲۱۷، ۲۱۸ پر لکھتے ہیں: اگر اِجارہ متعین مدّت کے لئے ہو تو مالکِ مکان و دُکان کے لئے جائز نہیں کہ شرعی عذر کے بغیر اِجارہ فسخ کردے، اگر مالک عذرِ شرعی کے بغیر دورانِ مدّت اِجارہ فسخ کرنا چاہے

تو کرایہ دار کے لئے جائز ہے کہ اس سے عوض کا مطالبہ کرے اور اس کا یہ اِقدام بالعوض اپنے حق سے دستبرداری ہوگی، یہ عوض اس کے علاوہ ہوگا جس کا کرایہ دار اپنی یکمشت دی ہوئی رقم میں سے اِجارہ کی باقی مدّت کے حساب سے حق دار ہوگا۔ مجمع الفقه الاسلامی جدہ نے اپنے چوتھے اجلاس منعقدہ ۱۴۰۸ھ میں یہی فیصلہ کیا ہے۔

مصنف صاحب کی رائے:- مصنف صاحب آگے چل کر ص:۲۱۹ پر لکھتے ہیں: اَحناف کے یہاں راجح یہ ہے کہ حقِ وظیفہ کی بیع جائز نہیں ہے، لیکن مال کے بدلے میں اس سے دستبرداری جائز ہے، اسی طرح مکان یا دُکان کے حقِ کرایہ داری کی بیع جائز نہیں ہے، لیکن مالی معاوضہ لے کر اس سے دستبردار ہونا جائز ہے۔

مصنف صاحب کی رائے پر اِشکال:- مصنف صاحب نے حقِ وظیفہ سے دستبرداری کی صورت میں مالی معاوضہ اور اسی طرح حقِ کرایہ داری سے دستبرداری کی صورت میں مالی معاوضے کو جائز قرار دیا ہے، اور اس جواز کی نسبت فقہائے اَحناف کی طرف کی ہے۔ یہ جواز کی نسبت فقہائے اَحناف کی طرف دُرست نہیں ہے (یعنی حقِ کرایہ داری کے معاوضے کی نسبت)، کیونکہ مکان یا دُکان سے دستبرداری کی صورت میں مالی معاوضہ لینا یہ اَحناف کا مسلک نہیں ہے، اور نہ مصنف صاحب نے اس پر اَحناف کی کوئی دلیل پیش کی ہے، بلکہ یہ مصنف صاحب کا قیاس ہے جو انہوں نے ص:۲۱۷ پر قائم کیا ہے۔ البتہ اگر اس کو علمائے جدہ کا فیصلہ کہا جائے تو دُرست ہے، جیسا کہ مصنف صاحب نے ص:۲۱۸ پر اس کی تصریح کی ہے۔

(جوابی خط از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

گرامیٔ قدر مکرّم جناب مفتی غلام قادر صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ مؤرخہ ۹؍دسمبر ۲۰۰۰ء آپ کے اس مضمون کے ساتھ ملا جس میں آپ نے احقر کے ''فقہی مقالات'' کے بارے میں کچھ اِشکالات ذکر فرمائے تھے۔ میں نے اس کا جواب اسی زمانے میں لکھنا شروع کردیا تھا، لیکن بعض مسائل میں مراجعت کی ضرورت تھی، اس لئے دُوسری مصروفیات حائل ہوگئیں، اور میں جواب مکمل نہ کرسکا۔ اتفاق سے مولانا محمد زاہد صاحب کچھ عرصہ پہلے تشریف لائے اور اَحقر نے آپ کی تحریر انہیں دِکھائی، میرا مقصد یہ تھا کہ وہ بھی اس پر غور فرمالیں، انہوں نے باقی ماندہ حصے کے بارے میں اپنی رائے خود ہی لکھ دی، میں نے اسے دیکھا تو مجھے وہ

دُرست معلوم ہوئی، اب یہ تحریر جس کا تقریباً نصف حصہ میرا لکھا ہوا ہے اور باقی نصف مولانا محمد زاہد صاحب کا (اور اَحقر کو اس سے اتفاق ہے) آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، اور تاخیر پر شرمندہ و معذرت خواہ ہوں۔

والسلام
محمد تقی عثمانی
۱۴۲۲/۷/۲ھ

(اِشکالات کے جوابات از حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ)

گرامی قدر و مکرّم جناب مفتی غلام قادر صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ اور اس کے ساتھ منسلک تحریر موصول ہوئی، آپ نے جس دِقتِ نظر کے ساتھ اَحقر کے ''فقہی مقالات'' کا مطالعہ کیا، اور اس سلسلے میں اپنی آراء سے نوازا، اس کے لئے میں آپ کا تہِ دِل سے شکرگزار ہوں۔ اَحقر کی جب کوئی فقہی تحریر اہلِ علم کی نظر سے گزرتی ہے تو اَحقر کو خوشی ہوتی ہے، اور اس بات کی توقع قائم ہوتی ہے کہ اس سے تحریر پر نظرِ ثانی کا موقع ملے گا، جس سے غلطیوں کی اِصلاح ہوسکتی ہے۔ چونکہ آپ نے تبصرہ اِرسال فرماکر اَحقر سے بھی رَدِّعمل معلوم کیا ہے، اس لئے چند گزارشات پیشِ خدمت ہیں:-

۱- ''مرابحہ موَجلہ'' کے سلسلے میں اَحقر نے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی متعلقہ عبارتیں[1] نقل کرنے کے باوجود جو خیال ظاہر کیا ہے کہ مصارفِ اسلامیہ کو اس پر عمل نہیں کرنا چاہئے، اس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:-

(الف) مرابحہ کے سلسلے میں یہ فتویٰ جو علامہ ابنِ عابدینؒ اور علامہ نجم الدین وغیرہ نے دیا ہے، یہ اصحابِ مذہب سے منقول نہیں، اصحابِ مذہب کا قول ''ضع وتعجل'' کے سلسلے میں معروف ہے،[2] جو اَحقر نے بھی نقل کیا ہے، اس میں اصحابِ مذہب نے مرابحہ اور غیر مرابحہ میں کوئی تفریق نہیں فرمائی،[3] لہٰذا یہ علمائے متأخرین کا فتویٰ ہے، جسے نہ اصحابِ مذہب کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے، اور نہ اسے اس درجے کی قوت حاصل ہے جو اَصحابِ مذہب کے اقوال کو ہوتی ہے۔

---

(۱) دیکھئے ردّ المحتار ج:۶ ص:۷۵۷، قبیل کتاب الفرائض، و ج:۵ ص:۱۶۰، و حاشیة الطحطاوی علی الدرّ المختار ج:۳ ص:۱۰۴، و ج:۴ ص:۳۶۳.

(۲ و ۳) وفی شرح السیر الکبیر للسرخسیّ رقم:۲۷۳۸ ج:۴ ص:۱۴۱۲ ضعوا وتعجّلوا ومعلوم ان مثل هٰذه المعاملة لا یجوز بین المسلمین فان من کان لهٗ علیٰ غیره دَین الیٰ أجل فوضع عنه بعضه بشرط أن یعجّل بعضه لم یجز کره ذٰلک عمر و زید بن ثابت وابن عمر رضی الله عنهم.

نیز دیگر حوالہ جات کے لئے ''فقہی مقالات'' ج:۱ ص:۱۰۰ تا ۱۱۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(ب) یہ دُرست ہے کہ ''مرابحہ مؤجلہ'' میں قیمت کا کچھ حصہ ''اجل'' کے مقابلے میں ہوتا ہے، لیکن ''اجل'' کے مقابلے میں ''عوض'' کا کچھ حصہ ہونا اس وقت جائز ہے جب یہ معاوضہ کسی بیع کے ضمن میں ہو، چنانچہ جہاں "اعتیاض عن الأجل" کو جائز کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اصل بیع کسی اور چیز کی ہے، اور ضمن میں ''اجل'' کی وجہ سے اس مبیع کی قیمت میں اضافہ کردیا ہے۔ اسی کو ''ھدایۃ''[1] میں ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے: "الا ترى أن الثمن يزاد لأجل الأجل"[2] لیکن ''اجل'' ہی کو مقصود بنا کر اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں، جس کو صاحبِ ہدایہ نے فرمایا: "الاعتياض عن الأجل حرام"[3] لہٰذا اگر اَصل مرابحہ میں اجل کی وجہ سے مبیع کی قیمت میں اضافہ کیا گیا تو یہ "اعتیاض عن الأجل" ضمنی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ یہ "اعتیاض عن الأجل" ہے ہی نہیں، بلکہ پورا ثمن مبیع ہی کا ہے، البتہ اس کے تعین کے وقت ''اجل'' کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

لیکن اگر متأخرین کے مذکورہ بالا فتویٰ پر عمل کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ اگر مشتری ''اجل'' سے پہلے ادائیگی کردے تو وہ قیمت میں کمی کا حق دار ہے تو اس صورت میں یہ "اعتیاض عن الأجل" ضمنی نہیں، بلکہ مقصود ہوگا، کیونکہ قیمت میں کمی کے وقت سوائے اجل کے اور کوئی چیز موجود نہیں۔

(ج) یہ کہنا کہ چونکہ ثمن میں اضافہ ''اجل'' کی وجہ سے کیا گیا ہے، لہٰذا تعجیل کے وقت وہ اضافہ ساقط ہونا چاہئے، اس لئے بھی محلِ نظر ہے کہ یہ اِستدلال اس وقت دُرست ہوسکتا ہے جب بائع نے اپنے طور پر مشتری کو تعجیل پر مجبور کیا ہو، لیکن جہاں مشتری خود اپنی طرف سے ثمن جلدی لے آیا، جبکہ بائع نے ایسا کوئی مطالبہ مشتری سے نہیں کیا تو یہ اِستدلال دُرست نہیں بنتا، کیونکہ اجل مشتری کا حق ہے، اور یہ حق بائع نے اس کو دیا ہوا ہے، پھر مشتری اس کو اِستعمال کرے یا نہ کرے، اس سے عقد کے مؤجل ہونے پر کوئی فرق نہیں پڑتا، یعنی بائع اب بھی اس بات کے لئے تیار ہے کہ وہ اجل کو استعمال کرے، لہٰذا اپنی طرف سے تعجیل کی صورت میں ثمن میں کمی کا لازمی مطالبہ دُرست نہیں۔

(د) مصارفِ اسلامیہ کے حالات کے پیشِ نظر میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اگر وہاں اس فتویٰ پر عمل کیا گیا تو مآلِ کار سود کا وہی میٹر چلنا شروع ہوجائے گا۔

اِشکال نمبر۲:-

مرابحہ مؤجلہ اور بیع بالتقسیط میں حنابلہ کا یہ قول[4] اختیار کرنے کی تجویز دی گئی ہے کہ مدیون

(۱ و ۲) وفی الهداية كتاب البيوع ج:۳ ص:۷۸ (طبع مكتبة رحمانيه) الا يرىٰ انه يزاد فى الثمن لأجل الأجل.

(۳) وفی الهداية كتابُ الصلح بابُ الصلح فى الدَّين ج:۳ ص:۲۵۷ (طبع مكتبه رحمانيه) .... وذلك اعتياض عن الأجل وهو حرام.

(۴) دیکھئے: المغنى لابن قدامة كتاب المفلس ج:۴ ص:۴۸۶۔

کی موت کی صورت میں اگر ورثہ دَین کی رہن یا کفیل وغیرہ کے ذریعے توثیق کردیں تو دَین بدستور مؤجل رہے گا[۱]، اور موت کی وجہ سے حال نہیں ہوگا۔ اس پر یہ اِشکال کیا گیا ہے کہ یہ اِفتاء بمذہب الغیر ہے جو بلاضرورتِ شدیدہ جائز نہیں۔ تو اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ عام مسائل میں بالعموم اور معاملاتِ مالیہ کے مسائل میں بالخصوص ضرورتِ شدیدہ کی بجائے محض حاجتِ عامہ یا اِبتلائے عام کی وجہ سے بھی اکابر سے اِفتاء بمذہب الغیر منقول ہے[۲]، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے بھی حکیم الاُمت حضرت تھانویؒ کو یہ نصیحت فرمائی تھی[۳]، اور اِمداد الفتاویٰ جلد سوم میں بھی اس کی متعدّد مثالیں ملتی ہیں[۴]، لہٰذا جن بزرگوں نے ضرورتِ شدیدہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے، ان کی مراد بھی ضرورت سے حاجت ہی ہے، اور فقہائے کرامؒ کے کلام میں حاجت پر لفظِ ضرورت کے اطلاق کی مثالیں بہت سی ہیں[۵]۔ یہاں جس حاجت کی وجہ سے یا جس مشقت اور ضرر سے بچنے کے لئے یہ تجویز دی گئی ہے اس کا ذکر مذکورہ مقالہ ''قسطوں پر خرید و فروخت'' میں موجود ہے۔ باقی یہ بات کہ ایسی کوئی حاجت یا مشقت متحقق ہے یا نہیں تو اس کا تعلق اَمرِ واقعہ سے ہے جس میں ذوق یا تجربے یا مشاہدے کے اختلاف کی وجہ سے اختلاف ہوجانا کوئی بعید بات نہیں۔ مذکورہ مقالہ دراصل مالیاتی اِداروں کے معاملات کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے، اور مالیاتی اِداروں کے معاملات میں مدیون کی موت پر دَین کے حال ہوجانے سے بہت سی مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں، جس کا اندازہ ان اِداروں کے ساتھ تعامل رکھنے والوں کو بخوبی ہے، تاہم اگر یہ مشکل کسی طرح حل کرلی جائے تو یقیناً دَین کا حال ہوجانا راجح ہوگا۔

رہی یہ بات کہ اس صورت میں دَین اگر مؤجل رکھا جائے اور ترکہ حلول اجل سے پہلے تقسیم

---

(۱) دیکھئے: المغنی لابن قدامۃ کتاب المفلس ج:۴ ص:۴۸۶۔

(۲) نیز حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فتویٰ میں بھی تحریر فرمایا کہ: ضرورت کے وقت روایتِ غیر مفتیٰ بہا پر اور مذہبِ غیر پر عمل کرنا دُرست ہے، اگرچہ اَولیٰ نہیں خصوصاً اِضطراری وعمومِ بلویٰ میں۔ کذا فی ردّ المحتار، دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۹۸ (طبع قدیم ایچ ایم سعید)۔

(۳ و ۴) جیسا کہ حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۰۶ میں سلم کے ایک مسئلے (وقتِ میعاد تک مبیع کے برابر پائے جانے میں ضرورت کی بناء پر امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک پر، اور ج:۳ ص:۴۹۵ میں شرکت کے ایک مسئلے (عروض میں شرکت) میں ابتلائے عام کی بناء پر امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک پر فتویٰ دیا ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی مثالیں موجود ہیں۔

(۵) منھا ما جاء فی تبیین الحقائق للزیلعیؒ کتاب الکراھیۃ ج:۷ ص:۲۷ (طبع سعید) ولا یقبل قول الکافر فی الدّیانات وانما یقبل قوله فی المعاملات خاصّة للضرورة .... والحاجة ماسة الٰی قبول قوله لکثرة وقوع المعاملات ولا یقبل فی الدّیانات لعدم الحاجة .... الخ.

وفی الاشباہ والنظائر لابن نجیمؒ ج:۱ ص:۱۲۶ الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة کانت أو خاصّة.

کرلیا جائے تو آیت: ''مِنْ بَعْدِ وَصِیَّۃٍ یُّوْصِیْ بِھَا اَوْ دَیْنٍ'' (النساء:۱۲) کے خلاف ہوگا تو اس کے بارے میں گزارش ہے کہ آیت کا مقصود یہ ہے کہ انفاذِ وصیت اور ادائے دَین کے بعد جو کچھ بچے ورثہ کا حق صرف اسی میں ہے، یہ مقصد نہیں کہ عملاً بھی جب تک دَین ادا نہ ہوجائے اس وقت تک ورثہ کے لئے ترکے میں سے اپنا حصہ لینا بھی ناجائز ہے، آخر دَین کو حال قرار دے کر بھی تو یہ ممکن ہے کہ دائن از خود ورثہ کو مہلت دیدے، ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس مدتِ مہلت کے دوران ورثہ ترکہ تقسیم کرلیتے ہیں تو فقہِ حنفی کی رُو سے بھی یہ ناجائز نہیں ہوگا۔

اِشکال نمبر۳:-

اس اِشکال کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے بطور تمہید یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ ''حقوقِ مجردہ کی خرید وفروخت'' کا اصل مقصود (جیسا کہ اس رسالے کی تمہید میں بھی ذکر کیا گیا ہے) حقِ مرور، حقِ تعلّی، حقِ تسییل اور حقِ شرب وغیرہ ان حقوق کے حکم کی تحقیق نہیں ہے جو فقہاء کے کلام میں صراحۃً مذکور ہیں، بلکہ اصل مقصود اس دور میں نئے پیدا ہونے والے حقوق جن کی خرید و فروخت آج کل بکثرت ہورہی ہے کا حکم جاننے کی کوشش کرنا ہے، اس کے لئے ظاہر ہے کہ حقوق کی قدیم اقسام کے بارے میں فقہاء کی عبارات اور دلائل میں غور کرکے ان اُصول کا اِستنباط کرنا ہوگا جن کی بنیاد پر فقہاء نے یہ اَحکام ذکر کئے ہیں، اور ان اُصول کی روشنی میں حقوق کی جدید اقسام کی بیع یا نزول بعوض کا حکم معلوم ہوسکے گا۔

حقِ شرب کے بارے میں بھی رسالہ مذکورہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصود بھی بذاتِ خود حقِ شرب کی بیع کے جواز یا عدمِ جواز کے بارے میں فیصلہ کن بات کہنا نہیں ہے، یہ ایک مستقل مسئلہ ہے، اصل مقصود اس مسئلے میں بھی فقہاء کی عبارات سے عمومی ضابطے کا اِستنباط ہے، اور لبِ لباب پوری بحث کا یہ ہے کہ بعض فقہاء نے تو عرف کی وجہ سے حقِ شرب کی بیع کو جائز قرار دیا ہے، اور جن حضرات نے عرف کے باوجود ناجائز قرار دیا ہے اس کی وجہ بھی یہ نہیں ہے کہ یہ عرف وتعامل کے باوجود قابلِ بیع نہیں بنا، بلکہ ناجائز ہونے کی اصل وجہ ان فقہاء کے نزدیک غرر اور جہالت ہے، اور یہ بات ثابت کرنے کے لئے متعدّد عبارات کا حوالہ دیا گیا ہے اور آخر میں ان سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:-

> فقہائے اَحناف نے بیعِ شرب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے حقوق کے مسئلے میں بعینہٖ وہی باتیں معلوم ہوئیں جو حقِ مرور اور حقِ تسییل کی بیع کے مسئلے میں ان کی بحثوں سے معلوم ہوئیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''حق اگر کسی عین مال

سے متعلق ہو تو اس کی بیع جائز ہوگی، بشرطیکہ وہاں کوئی مانع مثلاً غرر اور جہالت وغیرہ نہ پایا جائے۔[1]

جناب کے اِشکال کا بغور مطالعہ کرنے کے باوجود اس میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکی جو رسالے میں ذکر مذاہب اور عبارات سے اس قاعدے کے اِستنباط میں مانع ہو۔

باقی رہی جناب کی یہ بات کہ مذکورہ رسالے میں بیع شرب کے بارے میں صراحۃً رائے قائم نہیں کی گئی لیکن مصنف کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جواز کے قائل ہیں۔ تو صریح رائے ذکر نہ کرنے کی وجہ وہی ہے جو اُوپر تمہید میں ذکر کی گئی کہ بذاتِ خود اس مسئلے کی تحقیق مقصود نہیں بلکہ مقصود اُصول کا اِستنباط ہے، مصنف کی رائے جو پوری بحث سے سمجھ میں آتی ہے وہ مطلقاً جواز کی نہیں ہے بلکہ پوری بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ شرب کی بیع غرر اور جہالت کی وجہ سے ناجائز ہے، اس وجہ سے نہیں کہ وہ عرف اور تعامل کے باوجود قابلِ بیع بننے کی بذاتِ خود صلاحیت نہیں رکھتا، لہٰذا اگر کہیں اس کی بیع کا عرف ہو اور غرر اور جہالت بھی نہ پائی جائے (مثلاً جدید آلات سے پانی کی پیمائش ممکن ہو) تو ان فقہاء کی عبارات کی رُو سے یہ بیع جائز ہوگی، اور یہ محض ایک آدھ فقیہ کی رائے نہیں ہے بلکہ رسالے میں ذکر کردہ تمام عبارات سے یہی بات نکلتی ہے۔

اِشکال نمبر۴:-

جناب نے یہ اِشکال فرمایا ہے کہ پہلے تو لکھا گیا ہے کہ فقہائے مالکیہ وحنفیہ کے ہاں حقِ اسبقیت کی بیع کا حکم ان کی کتابوں میں نہیں ملا، اور پھر آگے چل کر حکم لکھ بھی دیا ہے، ان دونوں باتوں میں تعارض ہے۔ تو عرض یہ ہے کہ حکم لکھتے وقت یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ یہ حکم ان کتابوں میں مصرّح ہے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ حکم ان کے قواعد سے سمجھ میں آتا ہے اور یہ قواعد رسالے میں پہلے تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں۔ جناب نے تحریر فرمایا ہے: ''آخر اس قیاس آرائی کی کیا ضرورت ہے؟ راجح یہ ہے کہ حقِ اسبقیت کی بیع بھی جائز نہیں'' مذکورہ رسالے میں بھی عدمِ جواز ہی کو قیاس کا تقاضا قرار دیا گیا ہے، البتہ اگر یہ بات قیاس آرائی کے بغیر کسی صریح جزئیہ سے ثابت ہو رہی ہے تو اُمید ہے کہ جناب اس سے مطلع فرما کر احسان فرمائیں گے۔

باقی رہی حقِ اسبقیت سے نزول بعوض کی بات تو یہ بات پہلے ص:۱۶۶ پر بیری، شامی اور

---

(۱) ''فقہی مقالات'' ج:۱ ص:۱۸۹ (طبع میمن اسلامک پبلشرز)۔

ص:۱۹۰ پر اتاسی کے حوالے سے لکھی جاچکی ہے کہ جو حق اِصالۃً ثابت ہو دفعِ ضرر کے طور پر نہ ہو ان سے صلح کرنا اور عوض لینا جائز ہے، یاد رہے کہ یہ قاعدہ اتاسی نے اپنی رائے کے طور پر نہیں لکھا بلکہ دُوسرے فقہاء سے نقل کیا ہے، چنانچہ ان کی عبارت ان لفظوں سے شروع ہوتی ہے: "أقول: وعلیٰ ما ذکروہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ بمال ....الخ."[1]

اِشکال نمبر ۵ و ۶:-

اس اِشکال کا حاصل بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پگڑی کی مروّجہ شکل کا جو متبادل پیش کیا گیا ہے اس میں بھی اسی پگڑی کی اجازت دے دی گئی ہے۔ یہ اشتباہ بظاہر درج ذیل اُمور کی طرف دھیان نہ جانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے:-

۱- مروّجہ پگڑی میں لی گئی رقم شرعاً کسی بھی قابلِ اعتیاض چیز کا عوض نہیں ہے، بلکہ یہاں پیشگی لی گئی رقم اُجرت کا حصہ ہے، یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ یکمشت رقم ماہانہ یا سالانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کرائے کا حصہ ہی نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ کرایہ کو دوحصوں میں تقسیم کرلیا گیا ہے، ایک حصہ یکمشت پیشگی وصول کرلیا گیا ہے اور دُوسرا ماہانہ یا سالانہ وصول ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی عذر کی وجہ سے اِجارہ فسخ ہوجائے تو یکمشت رقم میں سے باقی ماندہ مدّت کے مقابل جو رقم آئے گی وہ موٴجر مستأجر کو واپس کرے گا، اسی طرح اگر مالکِ مکان یا دُکان مستأجر کو مقرّرہ مدّت سے پہلے نکالنا اور بغیر عذرِ شرعی کے اِجارہ کرنا چاہتا ہے اور مستأجر نے عوض کا مطالبہ کئے بغیر رضامندی سے اِجارہ فسخ کردیا تو بعد میں کسی عوض کا مطالبہ نہیں کرسکتا صرف باقی ماندہ مدّت کی رقم وصول کرسکتا ہے۔

۲- مکان یا دُکان مقرّرہ مدّت سے پہلے خالی کرنے کی صورت میں مستأجر پگڑی کی جو رقم واپس لیتا ہے وہ مروّجہ پگڑی میں کسی ثابت شدہ حق کا عوض نہیں ہوتا، جبکہ یہاں مدّتِ مقرّرہ تک اِجارہ کرنے سے اسے قرار کا حق حاصل ہوگیا ہے جو ایک عین کے ساتھ متعلق ہے، اور شفعہ کی طرح صرف دفعِ ضرر کے لئے مشروع نہیں ہے، اس لئے اس کی بیع جائز نہ بھی ہو تب بھی پہلے ثابت شدہ قاعدے کے مطابق نزول بعوض جائز ہے، یہاں مستأجر کو اصل حق رقم وصول کرنے کا نہیں مل رہا، بلکہ قرار کا حق مل رہا ہے، لہٰذا اس کے پاس پہلا اختیار یہی ہے کہ وہ اَڑ جائے کہ میں مقرّرہ مدّت سے پہلے نہیں نکلوں گا، معاوضۃً لے کر دستبرداری تو صلح کی ایک شکل ہے۔

(۱) دیکھئے: "فقہی مقالات" ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع میمن اسلامک پبلشرز)۔

جناب نے یہ جو کہا ہے کہ حقِ کرایہ داری کا عوض لینے کے جواز کی نسبت فقہائے حنفیہ کی طرف دُرست نہیں، بلکہ یہ محض مصنف کا قیاس اور علمائے جدہ کی رائے ہے، تو اصل بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ کتبِ فقہ میں صراحۃً تو مذکور نہیں، جس طرح جواز مصرّح نہیں، اسی طرح عدمِ جواز بھی مصرّح نہیں، ایسی صورت میں دُوسری فقہی نظائر اور قواعد سے ہی حکم لگانا پڑتا ہے، یہاں بھی یہ حکم پہلے تفصیل سے ذکر کردہ قواعد اور نظائر ہی کی روشنی میں لگایا گیا ہے۔(۱)

حکومت کی طرف سے ملنے والی چیز اگر ضرورت سے زائد ہو تو اسے فروخت کرنا جائز ہے

سوال:- میں جو دھندا کرتا ہوں اُس کے لئے چینی کی ضرورت ہوتی ہے، اور مجھے حکومت کی طرف سے ڈیڑھ من چینی ملتی ہے، دھندا کم ہونے سے کبھی وہ چینی بچ جاتی ہے، کیا یہ چینی مناسب نفع پر بیچ سکتا ہوں؟

جواب:- بیچ سکتے ہیں۔　　واللہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۴ھ

مکان بنا کر کرایہ پر دینے یا این.آئی.ٹی یونٹ میں شرکت کرنے میں سے کونسی صورت بہتر ہے؟

سوال:- زید کے پاس کچھ رقم ہے، اس کے ذہن میں آمدنی حاصل کرنے کی چند صورتیں ہیں، آپ ہی اس کا فیصلہ کریں۔ ایک تو یہ کہ مکان بنا کر کرایہ پر دیں۔ ثانیاً گورنمنٹ کے جاری کردہ این.آئی.ٹی یونٹ میں شرکت ہے۔ بعض لوگ تجارتی مکان بنانے کو دُرست نہیں جانتے۔

جواب:- مکان بنا کر کرایہ پر دینا بلاشبہ جائز ہے، اور اس کام میں رقم لگائی جاسکتی ہے۔ البتہ این.آئی.ٹی کے طریقۂ کار کی ہمیں تحقیق نہیں ہے، اس کا مفصل طریقۂ کار معلوم کرکے آپ بھیج دیں تو جواب دیا جاسکے گا، خاص طور سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم کی جائیں: ۱-اس میں نفع کسی معین شرح سے تقسیم ہوتا ہے یا متناسب طریقے سے؟ ۲-یونٹ خریدنے والا نقصان کی صورت میں نقصان برداشت کرتا ہے یا نہیں؟ ۳-عوام کی رقم کس کام میں لگائی جاتی ہے؟　　واللہ اعلم

۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۱۸/۱۹ الف)

---

(۱) تفصیل کے لئے ”فقہی مقالات“ ج:۱ ص:۲۱۷ و ۲۱۸ (طبع میمن اسلامک پبلشرز) ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

حکومت کے لئے اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول کرنے کا حکم

سوال:- جن چیزوں پر کمپنی کی طرف سے قیمت نوٹ ہوتی ہے ان سے زائد رقم پر ڈیلر فروخت کرسکتا ہے؟ اور جن چیزوں پر گورنمنٹ نے کنٹرول کردیا ہے ان کو مقرّرہ قیمت سے زائد پر فروخت کرنا کیسا ہے؟

جواب:- جب عوام کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو تو حکومت کو اَشیاء کے نرخ پر کنٹرول کرنا جائز ہے، ایسی صورت میں متعین قیمت سے زائد میں مال فروخت کرنا تاجروں کے لئے جائز نہیں ہے۔ درمختار میں ہے: "اذا تعدی لأرباب غیر القوتین وظلموا علی العامة فیسعّر علیھم الحاکم بناء علی ما قال ابو یوسفؒ ینبغی أن یجوز"۔[1] اور علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں: "ان الامام یری الحجر اذا عم الضّرر کما فی المفتی الماجن والمکاری المفلس والطبیب الجاھل وھٰذہ قضیة عامة فتدخل مسئلتنا فیھا لأنّ التسعیر الحجر معنًی لأنه منع عن البیع بزیادة فاحشة وعلیه فلا یکون مبنیًا علیٰ قول ابی یوسفؒ" فقط۔ (شامی ج:۵ ص:۳۵۳)[2]۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۱/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۰۱/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۱/۴ھ

دُکان دار کے بیٹے کا اپنے والد کی دُکان سے مال کسی کے ہاتھ کم قیمت پر فروخت کرنا

سوال:- ایک شخص دُکان دار ہے، اس کے تین بیٹے ہیں، دو دُکان پر والد کے ساتھ کام کرتے ہیں، ایک تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اس شخص کا بڑا لڑکا جو ہے وہ بندہ کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ آپ کی چھوٹی سی دُکان ہے، غریب آدمی ہیں، آپ میرے سے سامان قیمتِ خرید پر کم وبیش خرید لیا کریں، میں رعایت پر دے دیا کروں گا بشرطیکہ میرے والد اور میرے چھوٹے بھائی کو

---

(۱) الدر المختار ج:۶ ص:۴۰۰ کتاب الحظر والاباحة، فصل فی البیع (طبع سعید).

(۲) ردّ المحتار علی الدر المختار ج:۶ ص:۴۰۱، وکذا فی البحر الرائق ج:۸ ص:۳۷۰، کتاب الکراھیة (طبع رشیدیه)، کذا فی المحیط البرھانی ج:۸ ص:۲۶۸ (طبع مکتبه غفاریه).

علم نہ ہو، اگر ان کو علم ہوگیا تو وہ ناراض ہوں گے۔ آپ فتویٰ دیں کہ بندہ لے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- وہ بڑا لڑکا اگر بحیثیت ملازم کے دُکان پر کام کرتا ہے تو اس کے لئے مالک یعنی والد کی مرضی کے بغیر رعایۃً سامان فروخت کرنا جائز نہیں،(۱) ایسی صورت میں اس سے رعایت پر سامان خریدنا بھی جائز نہ ہوگا،(۲) اور اگر وہ دُکان میں حصہ دار ہے تب بھی یہی حکم ہے کہ باقی شرکاء کی مرضی کے بغیر ایسی رعایت سے سامان فروخت کرنا اس کے لئے جائز نہیں جو عام طور سے تاجر نہ کرتے ہوں،(۳) ہاں اگر دُکان کا مالک وہی ہو اور باپ اور بھائی اس میں بطورِ ملازم یا تبرّعاً کام کرتے ہوں تو اس صورت میں اس کے لئے رعایت کرنا بھی جائز ہے،(۴) اور آپ کے لئے اس سے رعایت پر سامان خریدنا بھی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۵۹۸ ج)

---

(۱) فی مشکوٰة المصابیح ج:۱ ص:۲۶۱ (طبع رحمانیه) "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الا لا تظلموا، الا لا يحل مال امرئ الا بطيب نفس منه."

فی الدر ج:۶ ص:۲۰۰ لا يجوز التصرف فی مال غيره بلا اذنه ولا ولايته .... اهـ.

(۲) فی الدّر المختار ج:۵ ص:۹۸ (طبع سعید) الحرمة تتعدد مع العلم بها. وقال الشاميّ تحته: امّا لو رأى المكاس مثلًا يأخذ من أحد شيئًا من المكس ثم يعطيه آخر ثم يأخذ من ذٰلك الآخر فهو حرامٌ.

وفيه أيضًا قبل ذٰلك وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لا يتعدى ذمتين سألت عنه الشهاب بن الشلبي فقال: هو محمول علىٰ ما اذا لم يعلم بذٰلك.

وفی الاشباه الحظر والاباحة ص:۸۸ الحرمة تتعدى مع الأموال مع العلم الّا فی حق الوارث ....الخ.

(۳) وفی شرح المجلّة لسليم رستم باز ص:۶۵۴ رقم المادّة:۱۱۹۲ (طبع حنفيه کوئٹه) کل يتصرّف فی ملکه کيف يشاء.

وكذا فی شرح المجلّة للأتاسیّ ج:۴ ص:۱۳۲ (طبع مکتبه حبيبيه کوئٹه).

وفی بدائع الصنائع كتاب الشرب ج:۶ ص:۱۶۰ (طبع سعید) وحق الكل متعلق بالماء ولا سبيل الى التصرف فی الملك والمشترك والحق المشترك الا برضاء الشركاء.

وفی تبيين الحقائق شرح كنز الدّقائق كتاب الشركة ج:۳ ص:۲۳۵ (طبع سعید) وكل اجنبی فی قسط صاحبه أی وكل واحد منهما أجنبی فی نصيب صاحبه حتّى لا يجوز لهٗ أن يتصرّف فيه الّا باذنه كما لغيره من الأجانب .... الخ.

وفی مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر أوائل كتاب الشركة (الشركة ضربان) (وكل منهما) أی كل واحدٍ من الشريكين أو الشركاء شركة ملك أجنبی فی نصيب الآخر حتّى لا يجوز له التّصرف فيه الّا باذن الآخر كغير الشريك لعدم تضمنها الوكالة .... الخ.

(۴) وفی الهداية باب الكراهية فصل فی البيع ج:۴ ص:۴۷۲ (طبع رحمانيه) ولأنّ الثمن حق العاقد فاليه تقديرهٗ ....الخ.

وفی الهندية ج:۳ ص:۱۷۳ حطّ بعض الثمن صحيح ويلتحق بأصل العقد عندنا كالزيادة .... الخ.

وفی الهداية ج:۳ ص:۸۰ (طبع رحمانيه) ويجوز للمشترى ان يزيد البائع فی الثمن ويجوز للبائع ان يزيد للمشترى فی المبيع ويجوز ان يحط عن الثمن ويتعلق الاستحقاق بجميع ذٰلك .... الخ.

وكذا فی الدّر المختار فصل فی التصرف فی المبيع والثمن قبل القبض والزيادة والحط فيهما ج:۵ ص:۱۵۴.

Sky Biz 2000 کی ویب سائٹ خریدنا اور اس کمپنی کا ممبر بن کر تعلیم حاصل کرنا

سوال:- محترم ومکرم عالی جناب قبلہ حضرت مفتی محمد تقی صاحب، زادکم اللہ علماً وشرفاً

بعد سلامِ مسنون، امریکا میں تلسا اوکلا میں دسمبر ۱۹۹۸ء میں ایک کمپنی کی ابتداء ہوئی ہے، اس کمپنی کا نام ''اسکائے بیز۲۰۰۰'' (Sky Biz 2000) ہے، اس کمپنی کا کام ملٹی لیول مارکیٹنگ (Multy Level Marketing) کا ہے۔

۱- سوال یہ ہے کہ میں نے اس کمپنی کی ویب سائٹ (Web-Site) خریدی ہے جس کے ذریعے میں اپنے کاروبار کو پوری دُنیا میں پھیلا سکتا ہوں، جبکہ اخبارات کے ذریعے یہی اِشتہار اگر دیا جاتا تو جہاں تک وہ اخبار جاتا ہے وہاں تک اپنے کاروبار کی پبلسٹی (Publicity) ہوتی ہے، لیکن ویب سائٹ کے ذریعے عالمی پیانے پر پبلسٹی ہوسکتی ہے۔ اس کمپنی کے ممبر بننے سے دُوسرا فائدہ یہ ہے کہ کمپنی انٹرنیٹ کے ذریعے مختلف قسم کی تعلیمات دیتی ہے، مثلاً یہ کمپنی حسبِ ذیل تعلیم اپنے ممبران کو دیتی ہے:

۱-ونڈوز ۹۵ (Windows 95)، ۲-ونڈوز ۹۸ (Windows 98)، ۳-ونڈوز ۳.۱ (Windows 3.1)، ۴-انٹرنیٹ ایجوکیشن، ۵-ویب سائٹ ایجوکیشن، ۶-ویب بلڈر (Web Builder)، ۷-لنک سرچنگ، ۸-ہوم بیزک بزنس وغیرہ۔

اگر مذکورہ تعلیمات مجھے اور میرے گھر کے افراد کو کسی کلاس میں جاکر حاصل کرنا ہو تو اس سب ہی افراد کی مجھے الگ الگ فیس دینی پڑے گی۔ دوم یہ کہ ہمیں اس کلاس کے اوقات کی پابندی کرنی ہوگی، جبکہ اس کمپنی سے ویب سائٹ خرید کر اور ممبر بن کر ایک ہی فیس سے میں اور میرے گھر کے سارے افراد اپنی فرصت کے وقت مذکورہ تعلیمات حاصل کرسکتے ہیں، جس میں ظاہر ہے کہ پیسوں کی بھی بچت ہے اور وقت کی عدمِ پابندی یہ بھی بہت بڑا فائدہ ہے۔

۲- اس کمپنی سے جو بھی چھ ہزار ایک سو روپے دے کر ویب سائٹ خریدتا ہے یا اس کمپنی کا ممبر بن کر تعلیم حاصل کرتا ہے تو کمپنی اپنی ویب سائٹ کے خریدار کو ایک کاروبار بھی دیتی ہے، اپنی کمپنی کے ممبر کو ایک ایجنسی دیتی ہے، جس میں کمپنی کی طرف سے یہ شرط ہے کہ بننے والا ممبر کمپنی کے نو ویب سائٹ کے خریدار کو تیار کرے جس میں ایک دایاں اور ایک بایاں (Left, Right) ہوتا ہے، ایک ہی طرف نو ممبر نہ ہوں، بلکہ ایک طرف چار ہوں تو دُوسری طرف پانچ، ایک طرف چھ تو دُوسری طرف تین، اس طریقے سے ویب سائٹ کے خریدار کو تیار کرنے پر کمپنی ستر ڈالر کا چیک ایجنٹ پر بھیجتی ہے، اسی

طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے مثلاً نو خریدار تیار کرنے پر ستر ڈالر، پھر اٹھارہ پر ۳۵ ڈالر، پھر ۲۷ پر ۳۵ ڈالر، پھر ۲۶ پر ۷۰ ڈالر علیٰ ہذا القیاس، اسی طرح یہ کمپنی اپنے ایجنٹ کو کمیشن دیتی رہتی ہے۔

۳- یہ کمپنی کمپیوٹر سوفٹ ویئر، ہارڈ ویئر، اور پہننے کے کپڑے وغیرہ بناتی ہے، تو اس طریقے سے ویب سائٹ خرید کر ایجنٹ بن کر کاروبار کرنے میں جس کی تفصیل اُوپر بتائی گئی ہے، نیز ویب سائٹ کے خریدار کو تیار کرنے میں ہمیں اپنا وقت لگانا پڑتا ہے، اپنی گاڑی، اپنا فون استعمال کرنا ہوتا ہے، یعنی کہ اچھی خاص محنت کے بعد خریدار تیار ہوتے ہیں، جس کے نتیجے میں کمپنی کمیشن کے طور پر اپنے نفع میں سے ایجنٹ کو نفع دیتی ہے، جس کی تفصیل اُوپر ذکر کی گئی۔

اب دریافت طلب اَمر یہ ہے کہ میں اس کمپنی سے ویب سائٹ خرید کر انٹرنیٹ کے ذریعے اپنے کاروبار کو عالمی پیمانے کا بنانا چاہتا ہوں، نیز کمپنی کا ممبر بن کر مذکورہ بالا تعلیمات حاصل کرنا چاہتا ہوں، نیز ایجنٹ اس طریقے پر محنت کرکے کمپنی کے ویب سائٹ کے خریدار تیار کرکے اپنی محنت کے عوض کمپنی سے کمیشن لینا چاہتا ہوں، تو میرا یہ کمیشن لینا کیسا ہے؟ کیا شرعی اعتبار سے مجھے اجازت حاصل ہے یا نہیں؟ اُمید ہے کہ جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

والسلام
محمد علی سیر گر
نگینہ محل، راندیر، سورت

عارف حسن عثمانی	محمد اکرام الدین غفرلہٗ	محمد کلیم لوہاروی
خادم دارالافتاء دارالعلوم اشرفیہ راندیر	خادم دارالافتاء اشرفیہ، راندیر	خادم دارالافتاء اشرفیہ

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ویب سائٹ خریدنا اور اس کمپنی کا ممبر بن کر تعلیم حاصل کرنا، نیز اس کمپنی کا ایجنٹ بن کر کمیشن حاصل کرنا جائز ہے، البتہ یہ تمام معاملات الگ الگ ہونے چاہئیں،[۱] یعنی کمپنی کا ممبر بن کر تعلیم حاصل کرنا ایجنٹ بننے سے مشروط نہ ہو،[۲] بلکہ تمام معاملات ایک دُوسرے سے الگ ہوں۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۱/۱۲/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۴۷۰/۳۸)

مختلف کمپیوٹر سوفٹ ویئرز خریدنے کا حکم
(جبکہ بعض سوفٹ ویئرز چوری کے ہوتے ہیں)

سوال:- میں ایک کمپیوٹر سائنس کالج کا طالب علم ہوں، ہمیں سوفٹ ویئر کی اکثر ضرورت

(۱و۲و۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۷۸ کا حاشیہ نمبر۱ وص:۵۷ کا حاشیہ نمبر۱و۲۔

رہتی ہے، اور نئے سے نئے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ہم کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں پوری دُنیا کے برابر چل سکیں، اس ضرورت کے پیشِ نظر ہم چند طلباء نے مل کر ایک سوسائٹی کے تحت یہ کام شروع کیا کہ ہم کالج کے پیسوں سے یا طلباء کے پیسوں سے مختلف اور نئے سوفٹ ویئرز خرید کر طلباء کو مفت گھر میں Instalation کے لئے دیں، کیونکہ تمام طلباء یہ سوفٹ ویئرز نہیں خرید سکتے اس کے لئے کالج نے اجازت اور سرمایہ بھی ہمیں دے دیا تھا، مگر چند لوگوں نے کہا کہ پاکستان میں استعمال ہونے والے سوفٹ ویئرز چوری کے (Pirated) ہوتے ہیں، پھر لوگ اس کی کاپیاں کر کے تقسیم کرتے ہیں، کیا تعلیم اور فلاح و بہبود کے لئے ایسا سوفٹ ویئر استعمال کرنا جائز ہے؟

جواب:- مکرم بندہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کلی طور پر یہ کہنا تو ممکن نہیں کہ پاکستان میں استعمال ہونے والے تمام سوفٹ ویئرز چوری کے ہوتے ہیں، لہٰذا اس مفروضے پر خریداری کو بالکلیہ ناجائز نہیں کہہ سکتے۔ جو شخص سوفٹ ویئر بیچ رہا ہے، اس بات کا ذمہ دار وہ خود ہے کہ وہ کہاں سے کس طرح لایا؟ جب تک ہمیں متعین طور پر یقین سے معلوم نہ ہو کہ یہ چوری کا ہے، ہم خرید سکتے ہیں۔[1]

والسلام

۱۴۲۰/۹/۲۵ھ

---

(۱) وفی فیض القدیر رقم الحدیث:۸۴۴۳ ج:۱۱ ص:۵۲۵۴ (طبع مکتبہ مصطفیٰ الباز، الریاض) من اشتریٰ سرقةً وهو یعلم أنّها سرقة فقد شرک فی عارها واثمها.

وفی الشامیة ج:۵ ص:۹۸ نقل الحموی عن سیدی عبدالوهاب الشعرانی أنه قال فی کتابه المنن، وما نقل عن بعض الحنفیة من أن الحرام لا یتعدی ذمتین سألت عنه الشهاب بن الشلبی فقال هو محمول علیٰ ما اذا لم یعلم بذٰلک، اما لو رای المکاس مثلًا یاخذ من أحد شیئًا من المکس ثم یعطیه آخر ثم یاخذ من ذٰلک الآخر فهو حرام.

وفی أحکام المال الحرام ص:۲۳۳ فمن علمت أنه سرقة أو خانه فی أمانة .... لم یجز ان أخذه منه لا بطریق الهبة ولا بطریق المعاوضة .... الخ.

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۹۸ الحرمة تتعدّد مع العلم بها الّا فی حقّ الوارث .... الخ.

وفی الهندیة ج:۵ ص:۳۶۴ کل عین قائمة یغلب علیٰ ظنّه أنّهم اخذوها من الغیر بالظّلم وباعوها فی السّوق فانّه لا ینبغی أن یشتری ذٰلک وان تداولتها الأیدی.

وفی خلاصة الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۵۴ رجل علم بجاریة أنّها لرجل فرأی یبیعها ویقول وکلنی صاحبها ببیعها وسعه أن یبتاعها منه.

نیز ''چوری کے مال کی بیع'' سے متعلق دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۴۹۹ (طبع سعید)۔

اخبار کا بِل ایڈوانس دینے کی صورت میں اخبار کے ادارے کی طرف سے مختلف رعایتوں اور گاہک کی انشورنس کرانے کا حکم

سوال:- میں یہاں پر شائع کردہ انگریزی زبان کا اخبار روزانہ خریدتا ہوں، اس کی Payment کی صورت مندرجہ ذیل طریقے سے ہوسکتی ہے:-

ہر ماہ کے اختتام پر مہینہ کا بل دے دیا جائے۔

ہر۳ ماہ کا ایڈوانس دے دیا جائے۔

ہر٦ ماہ کا ایڈوانس دے دیا جائے۔

پورے ایک سال ایڈوانس دے دیا جائے۔

ان تینوں صورتوں میں اخبار والوں کی طرف سے دو سہولتیں ملتی ہیں، ۱-اخبار مجموعی طور پر سستا پڑتا ہے،۲-اخبار والے بغیر کوئی اضافی رقم لئے اسی اخبار کے ایڈوانس میں اتنی ہی مدّت کے لئے Accident Insurance کرلیتے ہیں، یعنی اگر موت کسی حادثے کی وجہ سے ہوجائے تو اخبار کی طرف سے لواحقین کو مخصوص رقم دے دی جاتی ہے۔ یہ طریقہ اخبار والوں نے اپنے اخبار کی Sale کو بڑھانے کے لئے کیا ہوا ہے، کیا اس ٹائپ کی Insurance کروانا جائز ہے؟ جہاں کہ کوئی اضافی Premium وغیرہ نہ دینا پڑے۔

ڈاکٹر ظہور احمد بمعرفت مولانا خلیل احمد صاحب

(ابوظبی، متحدہ عرب امارات)

جواب:- اخبار کا بل ایڈوانس دینے کی صورت میں جو رعایت خریدار کو ملتی ہے، اس کی دو حیثیتیں ہیں، ایک حیثیت سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ خریدار نے ادارے کو رقم قرض دے دی ہے، اس لئے وہ قرض کے مقابلے میں رعایت دے رہا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ رعایت جائز نہ ہو،[1] کیونکہ یہ ایک نفع ہے جو قرض سے حاصل کیا گیا۔[2] لیکن دُوسری حیثیت یہ ہے کہ یہ رعایت قرض کی وجہ سے نہیں، بلکہ خریدار کے مستقل گاہک ہونے کی وجہ سے ہے، اور چونکہ یہ تاجروں کا طریقہ ہے کہ اپنے

(۱ و ۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

مستقل گاہکوں کو رعایت دیا کرتے ہیں، اس لئے وہ یہ رعایت دے رہے ہیں اور پیشگی رقم کا مطالبہ یہ اطمینان حاصل کرنے کے لئے ہے کہ یہ شخص واقعۃً مقرّرہ مدّت تک اخبار خریدتا رہے گا۔ اس صورت میں یہ رعایت شرعاً جائز ہے،[۱] اور مذکورہ معاملے میں احقر کو یہی صورت راجح معلوم ہوتی ہے،[۲] تاجروں کا عرف اور علمائے عصر کا تعامل بھی اس کی تائید کرتا ہے،[۳] لہٰذا احقر کے نزدیک راجح یہی ہے کہ اس رعایت کو لینے کی شرعاً گنجائش ہے۔ رہا انشورنس کا معاملہ! سو اگر انشورنس کی یہ رقم اخبار کا ادارہ خود ادا کرتا ہے، اور یہ کسی بیمہ کمپنی سے وصول نہیں کرنی پڑتی، تو مذکورہ صورت میں اس کے لینے کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس انشورنس کے لئے اخبار کے خریدار نے کوئی پریمیم ادا نہیں کیا، یہ یک طرفہ اِنعام ہے، اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے مختلف تاجر اپنی مصنوعات کو فروغ دینے کے لئے یک طرفہ طور پر مختلف اِنعامات کا اعلان کرتے رہتے ہیں، خریدار کو اپنی رقم کا پورا پورا معاوضہ خریدی ہوئی چیز کی صورت میں مل جاتا ہے، اور ملنے والا اِنعام تاجر کی طرف سے یک طرفہ اِنعام ہوتا ہے۔[۴]

البتہ اگر یہ رقم انشورنس کمپنی سے وصول کرنی پڑتی ہو، تو وہ دو وجہ سے ناجائز ہے، اوّل تو اس لئے کہ اس صورت میں اخبار کا ادارہ ضرور انشورنس کمپنی کو کوئی پریمیم ادا کرے گا، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ کمپنی کے ساتھ سود اور قمار کا معاملہ کرے گا، اور یہ رقم اس حرام معاملے کے نتیجے میں حاصل ہوگی، دُوسرے یہ کہ انشورنس کمپنی کی بیشتر آمدنی سود یا قمار پر مشتمل ہوتی ہے، اس لئے اس سے رقم لینا بھی جائز نہ ہوگا۔

والسلام

۱۴۱۴/۱۱/۲۲ھ

(۱ تا ۳) وفی الشامیة ج:۴ ص:۵۱۶ ولو أعطاه دراهم وجعل یأخذ منه کل یوم خمسة أمناء ولم یقل فی الابتداء اشتریت منک یجوز وھٰذا حلال وان کانت نیته وقت الدفع الشراء لأنه بمجرد النیة لا ینعقد البیع وانما ینعقد البیع الآن بالتعاطی والآن البیع معلومٌ فینعقد البیع صحیحًا قلت ووجهه ان ثمن الخبز معلوم فاذا انعقد بیعًا بالتعاطی وقت الأخذ مع دفع الثمن قبله ... الخ. اور جب یہ رقم اخبارات کا ثمن ہے تو ثمن میں رعایت شرعاً جائز ہے۔

وفی الھندیة ج:۳ ص:۱۷۱ (طبع رشیدیه) الزیادة فی الثمن والمثمن جائزة حال قیامهما ... الخ (الباب السادس عشر فی الزیادة فی الثمن والمثمن والحط والابراء عن الثمن).

وفی الھدایة ج:۳ ص:۸۰ (طبع رحمانیه) ویجوز للبائع أن یزید للمشتری فی المبیع ویجوز أن یحطّ عن الثمن ویتعلّق الاستحقاق بجمیع ذٰلک. وفی حاشیته لأن الزیادة لما التحقت بأصل العقد صارت کالموجودة عند العقد.

نیز تفصیل کے لئے دیکھئے ص:۱۱۳ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ تا نمبر۴۔

(۴) وفی الھندیة ج:۳ ص:۱۷۳ حطّ بعض الثمن صحیح ویلتحق بأصل العقد عندنا کالزّیادة .... الخ.

وفی شرح المجلّة لخالد الأتاسی ج:۲ ص:۱۸۲ رقم المادّة:۲۵۶ حطّ البائع مقدارًا من الثمن المسمّٰی بعد العقد صحیحٌ ومعتبرٌ وکذا حطّ جمیعه ...... وبعد أسطر ...... وھٰذا اذا کان بلفظ الحطّ ومثله. وکذا فی شرح المجلّة.

وکذا فی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۵۴ فصل فی التصرّف فی المبیع والثمن قبل القبض والزّیارة والحطّ فیها .... الخ.

وکذا فی مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر ج:۴ ص:۱۱۶.

کیا نفع کی شرعاً کوئی حد متعین ہے یا نہیں؟

سوال:- کیا کاروبار میں نفع کی کوئی حد شرعاً مقرّر ہے؟ شرعی نقطۂ نظر سے اگر کوئی شخص زیادہ نفع لے تو یہ دُرست ہے؟ طلعت محمود، راولپنڈی

جواب:- کاروبار میں شرعاً نفع کی کوئی حد مقرّر نہیں ہے،[۱] البتہ دھوکا نہیں ہونا چاہئے،[۲] پھر اپنے حالات کے لحاظ سے جتنا نفع کوئی لینا چاہے اس پر شرعاً کوئی پابندی نہیں ہے۔[۳] والسلام

۱۴۱۱/۶/۲۸ھ

تجارتی اِنعامی اسکیموں کا شرعی حکم

حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب نے تجارتی اِنعامی اسکیموں سے متعلق درج ذیل مضمون لکھ کر حضرتِ والا دامت برکاتہم سے رائے طلب کرنے کے لئے ارسال فرمایا، جس کا حضرتِ والا دامت برکاتہم نے جواب تحریر فرمایا، مضمون اور اس پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے درج ذیل ہے۔ (مرتب)

اِنعام وہ ہوتا ہے جو کسی مطلوب وصف پر حوصلہ افزائی کے لئے دیا جاتا ہے، مثلاً امتحان میں اوّل و دوم وغیرہ آنے پر اِنعام دیا جاتا ہے تاکہ علم میں جس کا سیکھنا مطلوب وصف ہے طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جائے یا گھڑدوڑ میں جو اوّل و دوم آئے اس کو اِنعام دیا جاتا ہے کیونکہ گھڑدوڑ میں جہاد کی تربیت ہے اور یہ تربیت حاصل کرنا وصفِ مطلوب ہے، پیدل دوڑ اور تیراکی وغیرہ بھی جہاد کی تربیت کی نیت سے ہوں تو یہ بھی مطلوب ہیں۔

ولا بأس بالمسابقة فی الرمی والفرس والبغل والحمار والابل وعلی الأقدام لأنه من أسباب الجهاد فکان مندوبًا وعند الثلاثة لا یجوز فی الأقدام أی بالجعل أما بدونه فیباح فی کل الملاعب. (در مختار ج:۵ ص:۲۸۵).

(۱ و ۳) وفی سنن ابن ماجة باب من کره أن یسعّر ص:۱۵۹ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أنس بن مالک رضی الله عنه قال: غلا السّعر علیٰ عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فقالوا: یا رسول الله! قد غلا السعر فسعّر لنا، فقال: ان الله هو المسعر القابض الباسط الرّازق.

وفی الهندیة ج:۳ ص:۱۳۱ (طبع رشیدیه) من اشتریٰ شیئًا وأغلی فی ثمنه جاز .... الخ.

وفی الهدایة ج:۴ ص:۴۷۲ (طبع مکتبه رحمانیه) ولا ینبغی للسلطان أن یسعر علی الناس لقوله علیه السلام: لا تسعّروا فانّ الله هو المسعّر القابض الباسط الرّازق. ولأنّ الثمن حقّ العاقد فالیه تقدیره فلا ینبغی للامام أن یتعرّض لحقّه الّا اذا تعلّق به دفع ضرر العامّة.

وکذا فی بدائع الصنائع ج:۵ ص:۱۲۹ والدّر المختار ج:۶ ص:۳۹۹ (طبع سعید)

وفی البحوث فی قضایا فقهیة معاصرة ص:۸ وللبائع أن یبیع بضاعته بما شاء من ثمن ولا یجب علیه أن یبیعه بسعر السوق دائمًا وللتّجار ملاحظ مختلفة فی تعیین الأثمان وتقدیرها .... الخ.

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۰۲ تا ص:۱۰۴ کے حواشی۔

(قولہ فیباح فی کل الملاعب) أی التی تعلم الفروسة وتعین علی الجهاد لأن جواز الجعل فیما مر انما ثبت بالحدیث علیٰ خلاف القیاس فیجوز ما عداها بدون الجعل وفی القهستانی عن الملتقط من لعب بالصولجان یرید الفروسیة یجوز وعن الجواهر قد جاء الأثر فی رخصة المصارعة لتحصیل القدرة علی المقاتلة دون التلهی فانه مکروه. (ردّ المحتار ج:۶ ص:۴۰۲).

حل الجعل وطاب ..... ان شرط المال فی المسابقة من جانب واحد وحرم لو شرط فیها من الجانبین لأنه یصیر قمارًا الّا اذا أدخلا ثالثًا محللًا بینهما بفرس کفؤ لفرسیهما یتوهم أن یسبقهما والّا لم یجز ..... وکذا الحکم فی المتفقهة فاذا شرط لمن معه الصواب صح. (در مختار ج:۶ ص:۴۰۳) وان شرطاه لکل علیٰ صاحبه ولا والمصارعة لیست ببدعة الّا للتلهی فتکره ..... وأما السباق بلا جعل فیجوز فی کل شیء (أی مما یعلم الفروسیة ویعین علی الجهاد بلا قصد التلهی...... (در مختار و ردّ المحتار ج:۶ ص:۴۰۴).

مذکورہ بالا ان عبارتوں کا حاصل یہ ہے کہ مسابقت یا تو علم میں مہارت حاصل کرنے میں جائز ہے یا صرف ان کاموں میں جائز ہے جن میں جہاد کی تربیت ہو اور وہ بھی جبکہ جہاد کی نیت سے ہو، اگر محض کھیل کود کے طور پر ہو تو اس وقت مسابقت اگرچہ بغیر اِنعام کے ہو مکروہ ہے، جہاد کی تربیت کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ اس کے لئے دوطرفہ اِنعام تک کو جائز رکھا، مگر قمار سے نکالنے کے لئے اس میں محلل کو داخل کیا۔

اب ہم کاروباری اِنعام کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

۱:- پہلی بات یہ ہے کہ زیادہ خریداری خواہ دُکان دار کی ہو یا صارف کی، یہ کوئی وصفِ مطلوب نہیں ہے، اس میں نہ تو جہاد کی تربیت ہے، نہ علمی مہارت کی تحصیل ہے، اور نہ ہی کسی اور پسندیدہ خلق مثلاً خدمتِ خلق وغیرہ کی تحصیل ہے، لہٰذا اس میں مسابقت کی ترغیب دینا اُصولی طور پر غلط بات ہے۔

۲:- دُوسری بات یہ ہے کہ بائع جس کسی صورت میں بھی مبیع میں اضافہ کرتا ہے خواہ وہ اِنعام کے نام سے ہو، وہ اصل مبیع کا حصہ قرار پاتا ہے، اور مشتری قیمت میں جس نام سے بھی اضافہ کرے وہ اصل قیمت میں اضافہ شمار ہوتا ہے۔

وصح الزیادة فی المبیع ولزم البائع دفعها ان فی غیر سلم زیلعی وقبل المشتری وتلتحق أیضًا بالعقد، فلو هلکت الزیادة سقط حصتها من الثمن وکذا لو زاد فی الثمن عرضًا فهلک قبل تسلیمه انفسخ العقد بقدره. (در مختار ج:۴ ص:۱۸۷).

جب یہ بات واضح ہوئی کہ مزعومہ اِنعام کی صورت درحقیقت مبیع یا ثمن میں کمی بیشی ہوتی ہے تو اس میں مندرجہ ذیل شرطوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:-

۱:- اِنعام ایسی چیز ہو جو مبیع اور ثمن بن سکے۔
۲:- اس کے وجود میں خطر و اندیشہ نہ ہو کہ نہ جانے ہو یا نہ ہو۔
۳:- اس کی مقدار میں جہالت یا تردّد نہ ہو۔

اگر ایسی صورت پائی جائے کہ جس میں یہ تینوں شرطیں پائی جاتی ہوں تو وہ اِنعام صحیح ہوگا، اور اگر کوئی ایسی صورت ہو جس میں پہلی یا دُوسری یا تیسری شرط یا تینوں ہی مفقود ہوں تو اِنعام صحیح نہ ہوگا۔

اِنعام صحیح ہونے کی مثال

لپٹن چائے کی پیکنگ کے اندر بسکٹ کی ایک چھوٹی پیکنگ ملتی رہی ہے، اسی طرح کسی ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ دانتوں کا برش رکھ دیا جائے یا کسی فریج کے ساتھ ٹوسٹر یا سینڈوچ میکر دیا جائے یا گھی کی مقدار میں ۲۰ فیصد اضافہ دیا جائے تو صحیح ہے کیونکہ یہ اشیاء مبیع بھی بن سکتی ہیں اور ان کے وجود اور ان کی مقدار میں کسی قسم کی جہالت اور تردّد نہیں ہے۔

اِنعام صحیح نہ ہونے کی مثالیں

۱:- پہلی شرط مفقود ہو

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی والا یہ طے کرے کہ جو ہم سے اتنی مالیت کا سامان خریدے گا، ہم اس کو عمرہ کرائیں گے یا ہم اس کو ڈرائیور سمیت گاڑی فراہم کریں گے جس پر وہ مری کی سیر کے لئے جاسکتا ہے۔ ان صورتوں میں کمپنی منافع مہیا کر رہی ہے جن پر اِجارہ ہوتا ہے بیع نہیں ہوتی، لہٰذا وہ مبیع بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لئے یہ اِنعام بھی دُرست نہیں ہے۔

۲:- دُوسری شرط مفقود ہو

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی دُکان داروں سے یا کوئی بھی بائع اپنے خریداروں سے کہے کہ جو لوگ اتنا اتنا سامان خریدیں گے ہم ان کو کوپن دیں گے اور ان کے درمیان قرعہ اندازی کریں گے جس کے ذریعے صرف ان خریداروں کو اِنعام ملے گا جن کے نام کا قرعہ نکلے گا۔ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ زید کے نام کا قرعہ نکلے اور ہوسکتا ہے کہ نہ نکلے۔

۳:- تیسری شرط مفقود ہو

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی دُکان داروں سے کہے کہ جو ہم سے اتنا سامان خریدیں گے ہم سب کو اِنعام دیں گے، لیکن قرعہ اندازی سے خریداروں کو کم و بیش مالیتوں کے اِنعام دیں گے۔

۴:- تینوں شرطیں مفقود ہوں

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی اپنے خریداروں سے کہے کہ جو کوئی ہم سے اتنی اتنی خریداری

کرے گا ہم اس کو کوپن دیں گے، اور پھر قرعہ اندازی کریں گے، جس کے نام کا قرعہ نکلے گا اس کو ہم عمرہ کرائیں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سعودیہ آنے جانے کا اور وہاں رہائش کا بندوبست کریں گے، لیکن اس کو ٹکٹ نہیں دیں گے۔

۳:- تیسری بات یہ ہے کہ چونکہ اِنعام مشروط ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں شرط فاسد ہوتی ہے تو اس سے سودا بھی فاسد ہوجاتا ہے۔

۱- جب کمپنی کے اعلان کے مطابق خریدار سامان خریدتے ہوئے یوں کہے کہ میں اس شرط پر اتنا سامان خریدتا ہوں کہ آپ کو مجھے عمرہ کرانا ہوگا یا مری کی سیر کے لئے گاڑی فراہم کرنا ہوگی، چونکہ یہ شرط سودے کے تقاضے کے خلاف ہے اور اس میں خریدار کا فائدہ ہے، لہٰذا یہ شرط فاسد ہے، اور اس کی وجہ سے سارا سودا ہی فاسد ہوجاتا ہے، اور بائع اور خریدار دونوں گناہگار ہوتے ہیں، اور دونوں پر لازم ہے کہ وہ اس سودے کو ختم کریں اور اگر چاہیں تو اس شرط کے بغیر نئے سرے سے سودا کریں۔

۲- اِنعامی اسکیم یہ ہو کہ جو اتنا سودا خریدے گا اس کو کار کی قرعہ اندازی میں شریک کیا جائے گا، اب جو شخص اس اِنعامی اسکیم کے مطابق سودا خریدتا ہے اور کوپن بھر کر دیتا ہے تو جیسا کہ ہم نے اُوپر ذکر کیا کار بھی مبیع کا حصہ بنے گی لیکن چونکہ یہ معلوم نہیں کہ وہ ملے گی یا نہیں، اس لئے مبیع کی مقدار بھی مجہول ہے، اس لئے اس میں قمار کے ساتھ بیع بھی فاسد ہوئی۔

تنبیہات

۱- بعض اوقات کمپنی کے ملازم، خریدار کو کہتے ہیں کہ اگر تمہیں اس اِنعامی اسکیم میں کچھ تردّد ہے تو ہم تمہاری طرف سے کوپن خود بھر دیتے ہیں، اور اس کو قرعہ اندازی میں شامل کردیتے ہیں۔

کمپنی کے ملازم کے اس طرح کرنے سے قباحت میں کچھ کمی نہیں آتی کیونکہ جب انہوں نے کہا کہ ہم کوپن خود بھر دیتے ہیں تو وہ خریدار کے وکیل بن گئے اور وکیل کا تصرف مؤکل کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ دُوسری بات یہ ہے کہ جب یہ ایک منکر ہے تو اس وقت ملازموں کے کہنے پر خاموشی دُرست نہیں بلکہ نہی کرنا واجب ہے۔

۲- کمپنیوں والے جو اتنے بیش قیمت اِنعامات دُکان داروں کو دیتے ہیں یہ سرمایہ دارانہ نظام کا طریقہ ہے، اصل ہمدردی تو صارف سے ہونی چاہئے کہ اس کو رعایت ملے، ورنہ دُکان داروں کو دیئے گئے اِنعامات کا بوجھ بھی بالآخر صارفین پر پڑے گا، کیونکہ عام طور سے اِنعامات کو بھی اِخراجات میں شمار کرکے اشیاء کی قیمت طے کی جاتی ہے۔

۳- بعض اوقات کمپنی والے اپنی مصنوعات کی کسی ایک یا چند ایک پیکنگ میں انعامی پرچی

رکھ دیتے ہیں تا کہ لوگ اس اِنعام کے لالچ میں زیادہ خریداری کریں، چونکہ وہ اِنعام کسی ایک کا یا چند ایک کا نکلنا ہے اس لئے ہر خریدار کے لئے اس اِنعام کے نکلنے کا وجود خطر و اندیشے کا شکار ہے، اور چونکہ جوئے کے معنی میں یہ بات شامل ہوتی ہے اس لئے جو خریدار اس موہوم اِنعام کے لالچ میں وہ سامان خریدتا ہے وہ ایک درجے میں جوا کرتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اسی کی مثل ایک صورت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مختلف قسم کی نمائشوں کے اندر داخلے کا ٹکٹ ہوتا ہے، اور نمائش کے منتظمین یہ اعلان کرتے ہیں کہ جو شخص مثلاً دس روپے کا ٹکٹ یک مشت خریدے گا وہ اپنے اس ٹکٹ کے ذریعے عام لوگوں کی طرح نمائش میں بھی داخل ہو سکے گا اور ان ٹکٹوں پر بذریعہ قرعہ اندازی کچھ اِنعام مقرّر ہوتے ہیں، جس کا نمبر نکل آئے اس کو وہ اِنعام بھی ملتا ہے۔

یہ صورت صریح قمار سے تو نکل جاتی ہے کیونکہ ٹکٹ خریدنے والے کو اس ٹکٹ کا معاوضہ بصورت داخلہ نمائش مل جاتا ہے، لیکن اب مدار نیت پر رہ جاتا ہے، جو شخص موہوم اِنعام کی غرض سے یہ ٹکٹ خریدتا ہے وہ ایک گونہ قمار کا ارتکاب کر رہا ہے'' (جواہر الفقہ ج:۲ ص:۳۵۱)۔

ایک شخص نے ایسی کوئی شے خریدی اور اس میں اِنعامی پرچی نکل آئی جبکہ اس کو پرچی اسکیم کا علم تھا اور اگر علم نہ تھا تو اس نے شے کو اپنی ضرورت سے خریدا تھا، اِنعام کے لالچ میں نہیں خریدا تھا، اس صورت میں بھی اس شخص کو اس پرچی پر اِنعام لینا جائز نہیں، کیونکہ ایک تو اس میں ناجائز اسکیم کے ساتھ تعاون اور شراکت ہے اور دُوسرے نیت تو ایک مخفی چیز ہوتی ہے لہٰذا حکم اس پر نہیں لگتا بلکہ ظاہر پر لگتا ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ جب یہ اِنعام وصول کر رہا ہے تو اسی کے لئے اس نے شے خریدی ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

عبدالواحد

(حضرتِ والا دامت برکاتہم کا جواب)

جواب:- گرامی قدر مکرم جناب مولانا مفتی عبدالواحد صاحب زید مجدکم السامی

آپ کا مضمون ''تجارتی اِنعامی اسکیموں کا شرعی حکم'' دار الافتاء کے توسط سے بندے کو موصول ہوا، آنجناب نے چونکہ فرمائش کی ہے کہ اس پر اپنی رائے کا اظہار کروں، اس لئے عرض ہے کہ بندے کے خیال میں یہ اِنعام زیادۃ فی المبیع نہیں ہے، بلکہ ایک ہبۂ متبدأہ کا یک طرفہ وعدہ ہے۔ بائع اور مشتری میں سے کوئی بھی اسے زیادۃ فی المبیع نہیں سمجھتا، نہ عرفِ عام میں اسے زیادۃ فی المبیع سمجھا جاتا ہے، اور شرعاً بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ بیع تام ہونے کے بعد جب بھی بائع مشتری کو کوئی چیز بلا قیمت دے تو اسے زیادۃ فی المبیع قرار دیا جائے، نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ اِنعام ہمیشہ مسابقت پر ہی دیا جائے،

نہ یہ ضروری ہے کہ جو ہبہ اِنعام کے نام سے کیا جائے وہ مسابقت کی مشروعہ صورتوں سے منسلک ہو۔[1]

آنجناب نے "جواهر الفقه" کی عبارت پر جو اِشکال فرمایا ہے کہ: ''نیت تو ایک مخفی چیز ہے لہٰذا حکم اس پر نہیں لگتا'' اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ قضاء کا حکم تو واقعی اکثر نیت پر نہیں لگتا، لیکن دیانت کے بہت سے اَحکام نیت پر موقوف ہیں، کما لا یخفی علیکم، مثلاً کوئی چیز جو معصیت اور غیر معصیت دونوں میں استعمال ہوسکتی ہو اسے بہ نیتِ معصیت خریدنا ناجائز ہے، اور نیت معصیت کی نہ ہو تو جائز،[2] اور "جواهر الفقه" میں حکم دیانت ہی کا بیان فرمایا گیا ہے، قضاء کا نہیں۔

لہٰذا آنجناب کی تحریر بار بار پڑھنے اور غور کرنے کے باوجود صحیح بات وہی معلوم ہوتی ہے جو حضرت والد صاحب قدس سرہٗ نے "جواهر الفقه" میں تحریر فرمائی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
بندہ محمد تقی عثانی
۱۴۲۸/۴/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۹۶۱/۳۷)

---

(۱) اِنعام کا کسی مسابقت یا مسابقتِ مشروعہ کے ساتھ مختص و منسلک ہونا ضروری نہیں جیسا کہ اِنعام سے متعلق درج ذیل عبارات سے واضح ہے:
فی مجموعة قواعد الفقه ص:۱۹۴ والانعام بالكسر عرفا الارض التي أعطاها السلطان أو نائبه.
فی القاموس الفقهی ص:۷۳ الجائزة العطية.
فی تاج العروس ج:۴ ص:۱۹ الجائزة العطية من اجاز يجيز اذا أعطاه وأصلها ان أميرًا وافق عدوا بينهما نهر فقال: من جاز هذا النهر فله كذا، فكلما جاز منهم واحدًا أخذ جائزة. وقال أبوبكر فی قولهم أجاز السلطان فلانا بجائزة. أصل الجائزة أن يعطى الرجل الرجل ماء ويحيره ليذهب لوجهه فيقول الرجل اذا ورد ماء لقيم الماء اى أعطنی ماء حتّٰی اذهب لوجهی وأجوز عنه ثم كثر هذا حتّٰی العطية جائزة فقال الجوهری اجازه بجائزة سنية أی بعطاء ..... ومن المجاز الجائزة التحفة واللطف ..... ومثله فی جمهرة اللغة.
فی القاموس المحيط ج:۴ ص:۲۵۶ أنعمها الله تعالیٰ عليه وأنعم بها ونعيم الله تعالیٰ عطيته ونعم الله تعالی بك عينا وانعمك ونعمك وانعم بك عيناً أقر بك عين من تحبه أو أقر عينك بمن تحبه. وفيه ج:۲ ص:۲۴۳ الجائزة العطية والتحفة واللطف ومقام الساقی من البئر.
فی روح المعانی ج:۱ ص:۲۵۸ والانعام ايصال الاحسان الی الغير من العقلاء كما قاله الراغب فلا يقال أنعم علی فرسه ولذا قيل ان النعمة نفع الانسان من دونه بغير عوض.
فی البيضاوی ج:۱ ص:۴۰ (طبع رحمانيه) والانعام ايصال النعمة وهی فی الأصل الحالة الّتی يستلذه الانسان فأطلقت لما يستلذها من النعمة وهی اللين.
فی البحوث لشيخنا العثمانی حفظه الله ورعاه ج:۲ ص:۲۲۹ وان مثل هٰذه الجوائز الّتی تمنح علیٰ أساس عمل عمله أحد لا تخرج عن كونه تبرعا وهبة لأنّها ليس لها مقابل وان العمل الذی عمله الموهوب له لم يكن علیٰ أساس الاجارة أو الجعالة حتّٰی يقال ان الجائزة أجرة لعمله وانما كان علیٰ أساس الهبة للتشجيع وجاء فی الموسوعة الفقهية (الكويتية) الأصل اباحة الجائزة علیٰ عمل مشروع سواء كان دينيًا أو دُنيويًا لأنه من باب الحث علی الخير والاعانة عليه بالمال وهو من قبيل الهبة.
نیز ''اِنعام'' سے متعلق مزید تفصیلات کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی کتاب بحوث فی قضايا فقهية معاصرة میں رسالہ "أحكام الجوائز" ج:۲ ص:۲۳۳ تا ۲۴۴ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) وفی قاضی خان ج:۲ ص:۲۸۱ ويكره أن يبيع المكعب المفضّض من الرّجال اذا علم أنه يشتری ليلبس .... الخ.
نیز دیکھئے ص:۸۴ تا ص:۸۶ کے حواشی۔

فروختگی کے لئے وکیل کو دیا ہوا سامان چوری ہوجائے تو نقصان وکیل کا ہوگا یا مالک کا؟

سوال:- زید نے مبلغ دس ہزار کی شکر بازار سے خرید کر بکر آڑھتی کی دُکان کرایہ پر اس کے اندر جمع کردی، اور بکر سے کہہ دیا کہ بازار جب مہنگا ہو تو اس کو فروخت کردینا، میں آپ کو کمیشن دے دُوں گا۔ دُکان کی چابی بھی زید نے بکر کے سپرد کردی تو اب اس آڑھت سے شکر تقریباً آٹھ بوری چوری ہوگئی، تو اس کا تاوان زید پر ہوگا یا بکر پر؟ جبکہ یہ تمام شکر بکر کے قبضے میں ہو اور بازار کا قانون یہ ہے کہ جو چیز آڑھتی کے قبضے سے چوری ہو اس کا ذمہ دار آڑھتی ہوگا مالک نہیں ہوگا، شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر چوری بکر کی بے احتیاطی کی وجہ سے نہیں ہوئی تو نقصان کا بار زید پر ہوگا، اور اگر بکر کی بے احتیاطی کی وجہ سے چوری ہوئی تو وہ نقصان کا ذمہ دار ہوگا،[1] کیونکہ وہ وکیل بالبیع ہے، اور وکیل کا قبضہ قبضِ امانت ہوتا ہے۔[2] اور اگر بازار میں شکر کی قلّت ہو تو اس طرح کی ذخیرہ اندوزی کرنا سخت گناہ ہے۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۱/۴ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۳۵۷/۱۸ الف)

کاروبار بیچنے کے بعد مشتری کی طرف سے مقرّرہ مدّت تک ثمن ادا نہ کرنے کی صورت میں بیع کو فسخ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

سوال:- اگر ایک شخص دُوسرے کو کاروبار بیچے لیکن مشتری نے مقرّرہ مدّت تک مکمل ثمن یا اس کا کچھ حصہ ادا نہیں کیا، جبکہ وہ دیوالیہ بھی نہیں ہوا ہے، تو چونکہ مشتری نے معاہدہ توڑ دیا ہے تو کیا بائع کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بیع کو فسخ کرے اور اس کے نتیجے میں اپنا کاروبار واپس لے لے، اور ثمن کا

(۱و۲) حوالہ کے لئے دیکھئے شرح المجلۃ لسلیم رستم باز ص:۷۸۴ رقم المادۃ:۱۴۶۳ وص:۴۳۶ رقم المادۃ:۷۸۷ (طبع مکتبۃ حنفیہ کوئٹہ)۔

(۳) وفی شعب الایمان للبیھقی ج:۱۳ ص:۵۱۱ رقم الحدیث:۱۰۷۰۲ عن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: بئس العبد المحتکر اذا رخص اللہ الأسعار حزن واذا غلی فرح.

وفی المستدرک علی الصحیحین للحاکم ج:۲ ص:۱۴ کتاب البیوع رقم الحدیث:۲۱۶۴ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: المحتکر ملعون. وکذا فی مصنف عبدالرزاق، باب الحکرۃ ج:۸ ص:۲۰۴ رقم الحدیث:۱۴۸۹۳.

وفی الدر المختار ج:۶ ص:۳۹۸ وکرہ احتکار قوت البشر کتین وعنب ولوز والبھائم فی بلد یضر بأھلہ.

وفی الھدایۃ ج:۴ ص:۳۹۸ ویکرہ الاحتکار فی أقوات الآدمیین والبھائم اذا کان ذٰلک فی بلد یضر الاحتکار بأھلہ.

وکذا فی البدائع للکاسانی ج:۵ ص:۱۲۹ وخلاصۃ الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۵۳ والبحر الرائق ج:۸ ص:۲۰۲.

جتنا حصہ وصول کر چکا ہے وہ مشتری کو واپس لوٹادے؟ مثال کے طور پر بائع نے ایک کروڑ روپے کا کاروبار بیچا اور مشتری نے اس پر قبضہ بھی کرلیا لیکن مقررہ مدّت تک مکمل ثمن یا اس کا کچھ حصہ ادا نہیں کیا جبکہ وہ دیوالیہ بھی نہیں ہوا ہے، تو چونکہ مشتری نے اس معاہدے کے مطابق ثمن ادا نہیں کیا تو کیا یہ جائز ہے کہ بائع بیع کو فسخ کر کے اپنی مبیع (کاروبار) واپس لے لے اور جتنا ثمن اس نے وصول کیا ہے وہ مشتری کو واپس لوٹادے؟ مجھے اس کے جواز کی کوئی عبارت فقہاء کے کلام میں نہیں ملی ہے، کیونکہ جب بیع مکمل ہوگئی تو بائع کا حق صرف ثمن میں باقی ہے اور وہ کاروبار بائع کی ملکیت سے نکل کر مشتری کی ملکیت میں منتقل ہوگیا ہے، لہٰذا بائع کے لئے اسے واپس لینا جائز نہیں۔ برائے مہربانی یہ وضاحت کیجئے کہ کیا ایسا کرنا بائع کے لئے جائز ہے؟

المستفتی

ایم ایس عمر ایڈووکیٹ
ڈربن، جنوبی افریقہ

جواب:- اگر کسی چیز کے بیچتے وقت عقد میں یہ شرط لگائی جائے کہ: ''اگر خریدنے والے نے مقررہ مدّت تک کل رقم یا اس کا کچھ حصہ ادا نہیں کیا تو یہ بیع ختم ہوجائے گی'' تو یہ صورت ''خیار النقد'' کی ہے اور بیع میں یہ شرط لگانا جائز ہے، اور یہ شرط اپنے وقت پر مؤثر بھی ہوگی، چنانچہ فقہائے کرام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر خریدنے والے نے مقررہ مدّت تک کل رقم یا اس کا کچھ حصہ ادا نہیں کیا تو یہ بیع فاسد ہوجائے گی[1] اور خریدنے والے اور بیچنے والے دونوں پر واجب ہوگا کہ اس بیع کو فسخ کریں،[2] لہٰذا ایسی صورتِ حال میں اگر وہ مبیع اس حالت پر باقی ہو جس حالت میں اسے بیچا گیا تھا تو ایسی صورت میں بائع کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مبیع خریدنے والے سے واپس لے لے اور ثمن کا جتنا حصہ اس نے وصول کیا ہے وہ خریدنے والے کو واپس لوٹادے۔

تاہم اگر بیع میں ''خیار النقد'' کی شرط نہ لگائی جائے تو ایسی صورت میں بیچنے والے کے لئے یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنا اور مبیع کو خریدنے والے سے واپس لینا جائز نہیں کیونکہ جب ایک بار طرفین کی رضامندی کے ساتھ ایجاب وقبول ہوکر بیع مکمل ہوجائے تو فریقین میں سے کسی کے لئے بھی یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنے کا حق حاصل نہیں رہتا بلکہ ایسی صورت میں بیچی ہوئی چیز خریدنے والے کی ملکیت میں منتقل ہوجاتی ہے اور بیچنے والے کا حق صرف ثمن میں باقی رہتا ہے، جس کی ادائیگی پر وہ خریدنے والے کو مجبور کرے گا، لیکن اگر اس کے باوجود وہ ثمن ادا نہ کرے تو ایسی صورت میں بیچنے والے کو دو اختیار حاصل ہیں:-

(۱و۲) حوالہ جات اسی فتویٰ میں آگے آرہے ہیں۔

۱:-خریدنے والے کو راضی کر کے اصل ثمن پر اقالہ کرے۔

۲:-ثمن کی وصول یابی کے لئے اس کے خلاف مقدمہ دائر کرے۔

البتہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''اَحسن الفتاویٰ'' ج:۲ ص:۵۳۳ میں تحریر فرمایا ہے کہ: ''بلکہ بدونِ شرط بھی جب مشتری سے ثمن کا وصول کرنا متعذر ہوجائے تو بائع کو فسخِ بیع کا حق حاصل ہے'' ان کے اس فتویٰ کی بنیاد صاحبِ ہدایہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت ہے:-

ولأنه لمّا تعذر استيفاء الثمن من المشتری فات رضا البائع، فيستبد بفسخه. (هداية ج:۳ ص:۱۵)[1]

ترجمہ:- جب مشتری سے ثمن کا وصول کرنا متعذر ہوجائے تو اس بیع میں بائع کی رضامندی فوت ہوگئی ہے، لہٰذا بائع کو بیع کے فسخ کرنے کا حق حاصل ہے۔

لیکن درحقیقت صاحبِ ہدایہ کی مذکورہ عبارت سے ذکر کردہ مسئلے پر استدلال کرنے میں تسامح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ صاحبِ ہدایہ کی یہ عبارت خاص اس صورتِ حال سے متعلق ہے جس میں خریدنے والے نے اس بات سے انکار کردیا ہو کہ وہ بائع سے مبیع خرید چکا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ بیع پہلے ہی خریدنے والے کو تسلیم نہیں ہے، لہٰذا اگر بیچنے والا بھی ثمن وصول نہ ہونے کی وجہ سے اس بیع کو ختم کردے تو یہ فسخ فریقین کی طرف سے ہوجائے گا جو کہ معتبر ہے۔ لیکن یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنا صاحبِ ہدایہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی جائز نہیں، چنانچہ صاحبِ ہدایہ نے اسی صفحے پر آگے جاکر یہ بیان فرمایا ہے کہ جب بیع ایک بار مکمل ہوجائے تو بائع اور مشتری دونوں میں سے کسی کو بھی یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، عبارت درج ذیل ہے:-

لأن أحد المتعاقدين لا يتفرد بالفسخ كما لا يتفرد بالعقد. (هداية ج:۳ ص:۱۵)[2]

ترجمہ:- متعاقدین میں سے کوئی ایک یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ نہیں کرسکتا جس طرح ان دونوں میں سے کوئی ایک یک طرفہ طور پر عقد نہیں کرسکتا۔

اس کے برخلاف آپ نے سوال میں جس صورتِ حال کو ذکر کیا ہے وہ بالکل ہی مختلف ہے، اس میں نہ تو مشتری نے کاروبار کے بائع سے خریدنے سے انکار کیا ہے اور نہ اس نے بائع کو بیع کے فسخ کرنے کی پیشکش کی ہے، بلکہ وہ صرف وقتِ مقرّرہ پر ثمن ادا نہیں کرسکا ہے، ایسی صورتِ حال میں بائع

---

(۱) کتاب ادب القاضی ج:۳ ص:۱۵۳ (طبع مکتبہ رحمانیہ).
(۲) کتاب ادب القاضی ج:۲ ص:۱۵۴ (طبع مکتبہ رحمانیہ).

کے لئے یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، اِلَّا یہ کہ بیع کرتے وقت خیار النقد کی شرط لگائی جائے، جس کی تفصیل اُوپر ذکر کی جاچکی ہے۔

فی شرح المجلة ج:۲ ص:۲۵۷

المادّة: ۳۱۳ اذا تبايعا علىٰ ان يؤدى المشترى الثمن فى وقت كذا وان لم يؤده فلا بيع بينهما صح البيع، وهٰذا يقال له خيار النقد (الىٰ قوله) وان بين المدة أكثر من ثلاثه أيام، قال أبو حنيفة رحمه الله: البيع فاسد، وقال محمد رحمه الله: البيع جائز. وفى البحر عن غاية البيان ان أبا يوسف مع الامام فى قوله الأوّل والذى رجع اليه انه مع محمد، وقد اختارت جمعية المجلة قول محمد رحمه الله مراعاة لمصلحة الناس فى هٰذا الزمان، كما صرحت بذٰلك فى تقريرها المتقدم للمرحوم عالى باشا الصدر الأعظم.[۱]

فی شرح المجلة لسليم رستم باز ص:۱۶۲

المادّة: ۳۱۴ اذا لم يؤد المشترى الثمن فى المدّة المعيّنة كان البيع الذى فيه خيار النقد فاسدًا[۲] ولكل من العاقدين فسخه اذا بقى المبيع علىٰ حاله.

وفى الكفاية بهامش فتح القدير ج:۶ ص:۴۲۱

والعلّامة النسفى ذكر فى الكافى اشكالًا فى هٰذا الموضع فقال ذكر فى الهداية لأن أحد المتعاقدين لا يتفرد بالفسخ كما لا يتفرد بالعقد لأنه حقهما فبقى العقد فعمل التصديق وذكر قبله ولأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشترى فات رضا البائع فيستبد بفسخه، والتوفيق بين كلاميه صعب، قلت لا تناقض بين كلاميه فيحتاج الى التوفيق لأن مراده بقوله لأن أحد المتعاقدين لا يتفرد بالفسخ فيما اذا كان الآخر على العقد معترفًا به كما اذا قال أحدهما اشتريت وأنكر الآخر لا يكون انكاره فسخًا للعقد، اذ لا يتم به الفسخ وفيما اذا قال اشتريت منى هٰذه الجارية وأنكر فالمدعى للعقد هو البائع والمشترى ينكر العقد والبائع بانفراده على العقد فيستبد بفسخه أيضًا.[۳]

---

(۱) رقم المادّة: ۳۱۳ ج:۲ ص:۲۵۷ (طبع مكتبه حبيبيه كوئٹه).
(۲) شرح المجلة للأتاسیؒ رقم المادة: ۳۱۴ ج:۲ ص:۲۵۸ (طبع مكتبه حبيبيه كوئٹه).
(۳) طبع رشيديه كوئٹه.

وفی بدائع الصنائع ج:۵ ص:۳۰۶

وأما بیان ما یرفع حکم البیع فنقول وبالله التوفیق حکم البیع نوعان، نوع یرتفع بالفسخ وھو الذی یقوم برفعه أحد العاقدین وھو حکم کل بیع غیر لازم کالبیع الذی فیه أحد الخیارات الأربع والبیع الفاسد ونوع لا یرتفع الا بالاقالة وھو حکم کل بیع لازم وھو البیع الصحیح الخالی عن الخیار.[۱]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۲۷/۵/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۴۹/۸۷۳)

ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے جائیداد خریدنے کا حکم

سوال:- مولانا مفتی عبدالواحد صاحب نے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی خدمت میں ایک سوال بھیجا جس میں اُنہوں نے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے تفصیلی طریقۂ کار کا ذِکر فرما کر حضرت سے رائے دریافت کی، یہ سوال ریکارڈ میں موجود نہیں، مگر جواب سے سوال کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ H.B.F.C کے تفصیلی طریقۂ کار کی روشنی میں اس سے جائیداد خریدنا یا بنوانا جائز ہے یا نہیں؟ حضرتِ والا دامت برکاتہم کا جواب درج ذیل ہے۔ (مرتب)

جواب:- ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن جس طریقِ کار پر عمل کر رہی ہے، اس کا جائزہ[۲] لینے کے بعد دارالعلوم اور احقر کی طرف سے جو فتویٰ دیا جارہا ہے، وہ یہی ہے کہ یہ معاملہ بحیثیت مجموعی جائز نہیں۔

آپ نے جو مسائل اُٹھائے ہیں، ان میں سے دو مسئلے تو ایسے ہیں جن کا شرعاً کوئی جواز نہیں ہے، ایک شریک سے ابتدائے معاملہ میں فیس وصول کرنا، اور دُوسرے عدم ادائیگی کے نوٹس کی قیمت رقم کے تناسب سے مقرّر کرنا

البتہ جہاں تک معدوم کے اِجارے یا معدوم کی بیع کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ہمارے ذہن میں جو صورت تھی وہ یہ تھی کہ یہ "شرکتِ ملک" (نہ کہ شرکتِ عقد) قرار دے کر شرکت، اجارہ اور بیع، تینوں عقود الگ الگ اپنے اپنے وقت پر کئے جائیں۔ البتہ شروع میں فریقین کے درمیان ایک

---

(۱) طبع سعید.

(۲) H.B.F.C کے ذریعے جائیداد خریدنے اور بنوانے کے بارے میں ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ کو جامعہ دارالعلوم کراچی میں مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ کا اِجلاس ہوا، جس میں طویل غور وفکر کے بعد عدمِ جواز کا فیصلہ کیا گیا تھا، جس کی تفصیل حضرتِ والا دامت برکاتہم کے جواب میں مذکور ہے۔

معاہدہ طے پاجائے کہ فلاں تاریخ سے ''شرکتِ ملک'' منعقد ہوگی، اس کے بعد فلاں تاریخ یا فلاں مرحلے پر ''اِجارہ'' ہوگا، اور فلاں تاریخ یا فلاں مرحلے پر بیع بالاقساط ہوگی۔ پھر ان میں سے ہر عقد اپنے اپنے وقت پر اَنجام پائے۔ معاہدے کی حیثیت میں فریقین پر لازم ہو کہ وہ معینہ اوقات پر ان عقود کا اِنشاء کریں۔ اس صورت کے جواز پر بہت سے علماء اور مفتی حضرات سے مشورہ بھی کرلیا گیا تھا۔ لیکن جب عملاً یہ اسکیم نافذ کی گئی ہے تو یہ شرائط بھی ملحوظ نہ رہ سکیں۔ چنانچہ اس اسکیم کے اِجراء کے بعد احقر نے مالیاتی اِداروں کے ایک اِجتماع میں جس میں ایچ بی ایف سی کے سربراہ بھی موجود تھے یہ مسائل اُٹھائے، لیکن جو غلط طریقِ کار چل نکلا تھا، وہ بدل نہیں سکا۔ احقر کئی سال سے مالیاتی اِداروں کے طریقِ کار کے دُرست کرنے کے لئے کوشاں ہے، لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ [۱]

جو صورت احقر نے اُوپر لکھی ہے، اس پر اپنی رائے سے بھی مطلع فرمائیں، اور اگر ایچ ایف بی سی کو کسی اور بہتر طریق پر چلانا آپ کی رائے میں ممکن ہو تو اس سے بھی احقر کو آگاہ فرمائیں۔ احقر چونکہ ان مسائل پر کام کرتا رہتا ہے اس لئے آپ کی رائے اور تجاویز احقر کی رہنمائی کریں گی۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

والسلام

۲۰ ربیع الاوّل ۱۴۰۷ھ

(۱) گزشتہ صفحے کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

کتاب الرّبوٰا والقمار والتّأمین

(سود، جوے اور انشورنس وغیرہ سے متعلق مسائل)

﴿فصل فی الرّبٰوا وأحکام ربٰوا البنوک والمؤسّسات المالیة الحدیثة﴾

(سود کے اَحکام اور مختلف بینکوں اور جدید مالیاتی اداروں سے متعلق مسائل کا بیان)

۱:- حربی یا ذمی کافروں سے سود لینے کا حکم
۲:- حفاظت کی غرض سے بینک میں رقم رکھوانے کا حکم اور اس کی صورت
۳:- بینک کے سود کا حکم

سوال ۱:- کیا حربی یا ذمی کافروں سے سود لینا جائز ہے یا نہیں؟

۲:- بینک میں رقم جمع کرنا حفاظت کی غرض سے جبکہ اُس پر سود نہ لیا جائے جائز ہے یا نہیں؟

۳:- بعض عالم کہتے ہیں کہ بینک سے سود حاصل کرلو، پھر اس کو غریبوں میں تقسیم کردو، تو اس میں کوئی حرج تو نہیں؟

جواب ۱:- سود قرآن وسنت کے صریح ارشادات کے مطابق حرامِ قطعی ہے، اس کا لینا دینا سب ناجائز ہے،[1] مسلمان اور ذمی سے سود کے لین دین کی حرمت پر تو اِجماع ہے،[2] البتہ دار الحرب کے

---

(۱) قال اللہ تعالیٰ: "وَأَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" (البقرۃ:۲۷۵).
"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا" (البقرۃ:۲۷۸)
"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً" (آل عمران:۱۳۰)
وفی صحیح المسلمؒ: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الرّبا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواءٌ. ج:۲ ص:۲۷ (طبع قدیمی کتب خانہ) وجامع الترمذی کتاب البیوع ج:۱ ص:۲۲۹ (طبع سعید) وسنن أبی داؤد ج:۲ ص:۱۱۷ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان).

(۲) وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۸۶ (طبع سعید) ولا ربٰوا بین حربی ومسلم. وفی ردّ المحتار احترز بالحربی عن المسلم الأصلی والذّمی وکذا عن المسلم الحربی. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۵۷.

کافروں سے سود کا لین دین بعض فقہاء جائز کہتے ہیں[۱]، دُوسرے فقہاء اسے بھی ناجائز قرار دیتے ہیں[۲] اور فتویٰ اسی پر ہے۔[۳]

۲:- بینک میں حفاظت کی غرض سے رقم رکھوائی ہے تو سب سے بہتر اور بے غبار صورت یہ ہے کہ لاکر میں رکھوائے، البتہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانے کی بھی گنجائش ہے جس پر سود نہیں لگایا جاتا، اور جن مدّات پر سود لگتا ہے مثلاً سیونگ اکاؤنٹ یا فکسڈ ڈپازٹ، ان میں رقم رکھوانا دُرست نہیں۔

۳:- سود بینک سے وصول نہ کرنا چاہئے، اگر غلطی سے وصول کرلیا ہو تو صدقہ کردے[۴]، کیونکہ وصول کر کے صدقہ کرنا ایسا ہے جیسے گناہ کر کے کفارہ کیا جائے، اس سے بہتر یہ ہے کہ شروع ہی سے گناہ نہ کرے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۸/۲/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۲/۲۹ الف)

اس فتویٰ کے جواب نمبر۳ سے متعلق اس مقام پر حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ نے ایک اہم وضاحت تحریر فرمائی ہے جو درج ذیل ہے:

(اہم وضاحت از حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ)

یہ اور آگے بھی اس قسم کے متعدّد فتاویٰ میں یہی موقف اِختیار کیا گیا ہے کہ بینکوں سے سود لیا ہی نہ جائے، اور عام حالات میں یہی موقف اِحتیاط کا تقاضا بھی ہے، لیکن بعد میں بعض علمائے کرام،

(۱ تا ۳) وفی الدّر المختار کتاب البیوع باب الرّبا ج:۵ ص:۱۸۶ (طبع سعید) ولا ربا بین حربی ومسلم ثمه لأنّ ماله ثمة مباح فیحلّ برضاه مطلقًا بلا عذرٍ .... الخ.

وفی البحر الرّائق باب الرّبا ج:۶ ص:۱۳۵ (طبع سعید) لا ربا بینهما فی دار الحرب عندهما خلافًا لأبی یوسف .... الخ.

وراجع أیضًا هدایة باب الرّبوٰا ج:۳ ص:۸۷ (طبع رشیدیه کوئٹه) و تبیین الحقائق ج:۴ ص:۴۷۲ وفتح القدیر ج:۶ ص:۱۷۸ واعلاء السنن ج:۱۴ ص:۳۴۵ و أحکام القرآن للتهانویؒ ج:۱ ص:۶۷۴.

دراصل جمہور فقہاء حضرت اِمام مالک، اِمام احمد بن حنبل، اِمام شافعی رحمہم اللہ اور علمائے اَحناف میں سے امام ابویوسف رحمہ اللہ کے نزدیک دار الحرب میں کفار سے سود لینا ناجائز ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک اس کی گنجائش ہے، تاہم احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے مطلقاً احتراز کیا جائے، جیسا کہ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں تحریر فرمایا ہے، تفصیل کے لئے امداد المفتین ص:۸۴۹ تا ۸۵۱، اور امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۵۸ ملاحظہ فرمائیں۔ نیز دیکھئے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة ج:۱ ص:۳۵۶ (طبع: دار القلم)۔

(۴) اُوپر حضرتِ والا کی اہم وضاحت کے ساتھ ساتھ صفحہ نمبر:۱۲۰ و ۱۲۱ و ۱۲۸ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

بالخصوص حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ کے توجہ دِلانے پر اس موقف میں بھی وزن معلوم ہوا کہ سود کی رقم لے کر بغیر نیتِ ثواب صدقہ کردی جائے، چنانچہ بہت سے علماء کا فتویٰ یہی ہے، اور خاص طور پر غیر مسلم ممالک میں رکھی ہوئی رُقوم کے بارے میں اب بندہ کا رُجحان بھی یہی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۴۳۱/۵/۱۰ھ

غیر مسلم ممالک میں بینک کے سود کا حکم (عربی فتویٰ)

سوال:- فضيلة الشيخ حضرة مولانا مفتى محمد تقى عثمانى حفظہ اللہ

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

فانى اعرض الیٰ سماحتكم أن يفتينى بما أشكل علىّ، أوّلا أعرفكم بما أشكل علىّ، نحن نسكن فى سنكيانغ كاشغر فيض آباد (الصين الشعبيّة) كما تعرف أحوالنا والناس يضع الفلوس فى البنك والبنك للدولة والدولة كافرة وسياستهم وقانونهم الشيوعية. اذا يضع الفلوس يرجع مع الربح اذا أخذ الفلوس يرجع مع الربح هل يجوز ربح البنك أم لا؟ والمسئلة فى الهداية: "لا ربا بين المسلم والكافر" أفتونى بما نزل والحديث والاجماع والقياس والواضح لأنكم عندى أفقه الأمة فى هٰذا العصر.

جواب:- السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

تسلمت رسالتكم واليكم جواب الأسئلة التى قد ارسلتموها الىّ:

۱- ان الربح أو الفائدة التى تعطيها البنوك اليوم داخلة فى الرّبا قطعًا، وقد أفتیٰ معظم الحنفية بأن الرّبا حرام فى دار الحرب أيضًا، وما ذكرتم من المسئلة المذكورة فى الهداية[۱] من أنه لا ربا بين المسلم والحربى، فان ذٰلک قول مرجوح لم يأخذ به الفقهاء المحققون، وان أدلة ذٰلک مبسوطة فى المجلد الثالث من امداد الفتاویٰ للشيخ أشرف على التهانوى رحمه الله تعالیٰ.[۲] والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

۱۴۱۴/۶/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۴۸/۱۲۳)

بینک سے سود لینا، اس میں اکاؤنٹ کھولنا اور بینک میں ملازمت کرنا

سوال:- بینک سے سود لینا اور بینک میں اکاؤنٹ کھولنا جائز ہے یا نہیں؟ اور بینک کی

(۱) هداية باب الرّبوٰا ج:۳ ص:۸۷ (طبع رشيديه).

(۲) وراجع للتفصيل الیٰ ص:۱۵۷.

ملازمت کا کیا حکم ہے؟

جواب:- بینکوں کا سود لینا اور دینا حرام ہے،[1] شدید ضرورت ہو تو روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوایا جائے، اور تصریح کردی جائے کہ اس روپیہ پر سود نہ لگائیں، بینکوں میں چونکہ زیادہ تر سود کا کاروبار ہوتا ہے اس لئے اس میں ملازمت دُرست نہیں۔[2] واللہ اعلم

۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/۱۸ الف)

بینک کی طرف سے ملنے والے منافع کی مختلف صورتیں اور اس کے استعمال کا حکم

سوال:- میری عمر تقریباً ۶۵ سال ہے، کئی سال سے بیمار ہوں، نمازیں مسجد میں جماعت سے ادا کرنے سے قاصر ہوں، گھر میں بھی فرض نماز کے علاوہ بقیہ نمازیں بیٹھ کر ادا کرتا ہوں، میں اس قابل نہیں رہا کہ کوئی تجارت، ملازمت یا ٹیوشن وغیرہ کرسکوں، نہ کوئی ایسا ادارہ ہے جہاں روپے رکھنے سے اندیشہ نہ ہو، میرے پاس جو پیسہ تھا میں نے سال بہ سال اس کی زکوٰۃ ادا کی ہے اور بینک سے جو سود ملا اس کو اس سال تک اپنے اُوپر صرف نہیں کیا ہے، ضرورت مندوں اور مستحقین کو دے دیا ہے، کیونکہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ بینک میں جو پیسہ سود کا چھوڑ دیا جاتا ہے وہ ناجائز طریقوں میں خرچ کرلیا جاتا ہے۔ مئی ۱۹۷۵ء میں، میں اپنا مکان فروخت کرکے اور جو کچھ پیسہ تھا وہ لے کر لاہور اپنے لڑکے کے پاس جو بینک میں ملازم ہے چلا آیا تھا، یہاں پہنچ کر میں بہت زیادہ بیمار ہوگیا اور جب سے اب تک مختلف حکیموں اور ڈاکٹروں کا علاج کرا رہا ہوں، جس میں کافی روپیہ خرچ ہوگیا، میرے لڑکے نے وہ روپے بینک میں جمع کردیئے کہ اس سے جو سال بہ سال منافع ملے گا وہ خرچ کرتے رہیں گے، چنانچہ میں نے یہی کیا، پانچ سال کے لئے روپیہ جمع کرنے کے بعد جو رقم میرے پاس تھی اس میں سے کچھ باقی ہے باقی پیسہ خرچ ہوچکا ہے۔ دوم مجھے علاج کے لئے دُوسری جگہ جانے کا مشورہ دیا جاتا ہے مگر اب میرے پاس ضروری اخراجات کے لئے بھی پیسہ نہیں ہے، اور نہ بینک سے پانچ سال تک نکل سکتا ہے، اب کیا ایسا کرسکتا ہوں کہ: ۱- اکتوبر ۱۹۷۶ء میں جو منافع کا پیسہ ملے گا اس کو میں اپنے مذکورہ بالا اخراجات میں صَرف کرسکتا ہوں؟ اور پانچ سال بعد جب اصل رقم ملے گی اس میں سے کسی مستحق کو

(۱) دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴ نیز مزید دیکھئے ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۲) یہ بینک کی اُس ملازمت کا حکم ہے جس میں براہِ راست سودی معاملات انجام دیئے جاتے ہوں۔ اور جس ملازمت کا سودی معاملات سے تعلق نہ ہو اُس کا یہ حکم نہیں۔ بینک ملازمت کی یہ دو قسمیں اور ان کی مکمل تفصیل کے لئے اسی جلد کی کتاب الاجارۃ میں ص:۳۹۳ تا ص:۳۹۶ ملاحظہ فرمائیں۔

دے دُوں گا۔ ۲:- دُوسری صورت یہ ہے کہ کسی سے بلاسودی قرض لے لوں، جب منافع کا پیسہ ملے اس کو ادا کردوں؟ ۳:- یا جب اصل رقم واپس ہو اس وقت یہ سب حساب کرکے اس میں سے نکال دوں، اگر مذکورہ بالا تینوں شکلیں جائز نہ ہوں تو پھر کیا صورت جائز ہوسکتی ہے؟

جواب:- بینک، منافع کے عنوان سے جو کچھ دیتا ہے شرعاً وہ سود ہے[1] جو قطعاً حرام ہے، اس کا لینا دینا، کھانا اور کھلانا سب حرام ہے،[2] قرآن وحدیث میں اس کے متعلق سخت سخت وعیدیں آئی ہیں،[3] ایک حدیث کی رُو سے سودخوری کا ادنیٰ درجہ ایسا ہے جیسے اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنا،[4] اس لئے مذکورہ حالات میں بھی سود لینا حلال نہیں بلکہ سود لینے کی نیت سے پیسہ جمع کرنا بھی دُرست نہیں، اگر بینک میں روپیہ رکھنا ہی ہو تو ایسے اکاؤنٹ میں رکھنا لازم ہے جس میں سود نہ ملتا ہو، جیسے کرنٹ اکاؤنٹ اور لاکرز وغیرہ، اور موجودہ جمع شدہ رقم پر اگر بینک نے سود دے دیا ہے تو اس کا وصول کرنا جائز نہیں ہے،[5] صرف اصل جمع شدہ رقم واپس لے سکتے ہیں، غرباء کو دینے کی نیت سے بھی سود نہیں لے سکتے، البتہ اگر غلطی سے وصول کر ہی لیا ہے تو اس حرام سے جان چھڑانے کی نیت سے کسی غریب محتاج کو دے دیں،[6] مذکورہ صورتیں ناجائز ہیں۔

اگر آپ کی بیوی اور کوئی نابالغ اولاد نہیں ہے اور کوئی ایسا عزیز رشتہ دار بھی نہیں ہے جس کا نفقہ آپ پر واجب ہو تو آپ پر مذکورہ بالغ لڑکے اور اس کی بہو کا کوئی نان نفقہ کسی طرح کا واجب نہیں، صرف آپ پر اپنا خرچ واجب ہے جسے آپ اپنی موجودہ رقم سے کرتے رہیں، بالفرض اگر یہ رقم ختم ہوگئی اور آپ کمانے کے لائق نہ ہوئے تو شرعاً آپ کا نفقہ آپ کے بالغ لڑکے کے ذمے ہوگا، وہ برداشت کرے گا۔ بہرحال حرام کے استعمال کا کوئی راستہ نہیں، البتہ جو صورت آپ نے لکھی ہے کہ بینک فی الحال جو رقم سود کے نام سے دے رہا ہے اُس کو وصول کرکے خرچ کرلیں پھر پانچ سال بعد جو اصل رقم ملے اُس میں سے سود کی رقم کی مقدار صدقہ کردیں، شرعاً اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، جب اکتوبر میں بینک کچھ رقم منافع کے نام سے دے، اُس کو آپ اس نیت سے وصول کریں کہ یہ آپ کے اصل قرض

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

(۲ و ۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۴) وفی مشکوٰۃ المصابیح باب الرّبٰوا الفصل الثالث ج:۱ ص:۲۴۶ (طبع قدیمی کتب خانہ)

عن أبی هریرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: الرّبٰوا سبعون جُزأً أیسرها أن ینکح الرّجل اُمّه.

وفی المرقاة ج:٦ ص:٦٥ ان ینکح الرّجل أمّه ای یطأها، وفی روایة الرّبا ثلاثة وسبعون بابًا أیسرها مثل أن ینکح الرّجل اُمّه.... وفی روایة الرّبا اثنان وسبعون بابًا أدناها مثل اتیان الرّجل أمّه ..... الخ.

(۵ و ۶) دیکھئے ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص:۱۲۰ وص:۱۲۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

کی رقم ہے، اور پھر جب پوری رقم اس طرح واپس مل جائے تو اُس کے بعد حاصل ہونے والی رقم کو صدقہ کردیں، کیونکہ بینک میں روپیہ رکھوانے کا معاملہ شرعاً قرض ہے اور قرض دینے والے کو اختیار ہے کہ وہ اپنی رقم جب چاہے واپس کرنے کا مطالبہ کردے، خواہ قرض مؤجل کہہ کر دیا گیا ہو۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۹/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۹۱/۲۷ و)

بینکوں کا سود وصول کرکے صدقہ کیا جائے یا وصول ہی نہ کیا جائے؟

سوال:- بینک میں جمع شدہ رقم سے اگر ہم سود حاصل نہ کریں تو بینک اس کو خلافِ شرع کاموں میں خرچ کریں گے، خلافِ شرع کاموں سے اس رقم کو بچانے کے لئے اگر ہم سود لے کر کسی غریب طالب علم، بیوہ یا یتیم بچے کی مدد کردیں تو جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ بینک آپ کے جمع شدہ روپے پر جو رقم سود کے طور پر لگاتے ہیں وہ شرعی اعتبار سے آپ کی ملک نہیں ہوتی، اور جو رقم آپ کی ملکیت نہ ہو، آپ کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی اور کو صدقہ یا ہبہ کریں، یہ دُرست ہے کہ بینک عام طور سے یہ رقم ناجائز کاروبار سے حاصل کرتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص حرام مال کمائے تو یہ اس کا اپنا فعل ہے، آپ اسے نصیحت تو کرسکتے ہیں مگر اس سے وہ مال ناجائز طریقے سے لے کر کسی غریب کو نہیں دے سکتے۔

رہا یہ معاملہ کہ سود کی رقم اگر بینکوں میں چھوڑ دی جائے تو اس سے ان کے ناجائز کاموں میں اعانت ہوگی، سو اس قسم کی اعانت تو محض بینک میں روپیہ جمع کرانے سے بھی ہوتی ہے، اسی لئے علماء کا کہنا یہ ہے کہ بینک میں روپیہ جمع کرانا ضروری ہو تو اُسے چالو کھاتہ (Current Account) میں جمع کرایا جائے، جس میں گردش کا احتمال چونکہ کم ہوتا ہے اس لئے اس پر عام طور سے سود لگایا ہی نہیں جاتا۔

خلاصہ یہ کہ سود کی رقم ازخود لینا تو جائز نہیں، ہاں اگر اتفاقاً کسی وجہ سے سود آپ کے پاس پہنچ جائے تو مجبوراً اس کا راستہ یہ ہے کہ اُسے کسی غریب پر صدقہ کردیا جائے۔[1] واللہ اعلم

۱۳۸۷/۳/۵ھ[2]

(۱) ملاحظہ ہو ص:۲۶۸ پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص:۱۲۰، ۱۲۱ کے حواشی اور ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴ اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) یہ فتویٰ ''البلاغ'' شمارہ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ کا حکم اور غلطی سے سودی اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے کی صورت میں ملنے والے سود کا حکم

سوال:- بینک میں رقم جمع کرنے پر کچھ سود بھی ملتا ہے، اگر سود بینک سے نہ لیا جائے تو بینک کا عملہ سود کی رقم اپنے مصارف میں لاتا ہے، اگر لیا جائے تو اس کا کیا مصرف ہے؟

جواب:- بینک میں اکاؤنٹ رکھنا ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ یا لاکرز میں رکھنا چاہئے، جس پر سود نہیں لگایا جاتا، اور غلطی سے اگر سود والے اکاؤنٹ میں رکھ دیا اور اس پر سود لگ گیا تو سود کی رقم کسی غیر صاحبِ نصاب آدمی کو صدقہ کردی جائے، لیکن ابتداء سے ہی اپنے اختیار کے ذریعے سودی اکاؤنٹ میں روپیہ رکھوانا اور سود وصول کرنا جائز نہیں۔ (۱)

واللہ اعلم
۲/۱/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳/ ۲۸ الف)

حفاظت کی غرض سے بینک میں رقم رکھوانے کا حکم

سوال:- کیا بینک میں حفاظت کی غرض سے رقم رکھوانے کی اجازت ہے؟

جواب:- بینک میں اگر حفاظت کی غرض سے رقم جمع کرائی جائے اور اس پر سود نہ لیا جائے تو اس کی شرعاً اجازت ہے۔

واللہ اعلم
۱۳/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۰/ ۲۱ ج)

بینک سے سود وصول کرکے غرباء میں تقسیم کرنے کا حکم

سوال:- سود لے کر غرباء میں تقسیم کردیا جائے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکومتی قانون کے خلاف ہے، شریعت میں کیا حکم ہے؟

جواب:- بینکوں سے سودی رقم کے بارے میں تحقیق یہی ہے کہ اس کو وصول ہی نہ کیا

---

(۱) ملاحظہ ہو ص:۲۶۸ پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص:۱۲۰، ۱۲۱ کے حواشی اور ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴ اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

جائے[1]، البتہ اگر کسی وجہ سے وصول ہو جائے تو اس کو غرباء میں صدقہ کر دیا جائے۔[2] واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۳۸/ ۱۸ الف)

۱:- ڈاک خانے میں جمع کرائی گئی رقم پر ملنے والے اضافے کا حکم
۲:- پراویڈنٹ فنڈ پر ''سود'' کے نام سے ملنے والے اضافے کا حکم

سوال ۱:- ہم چند افراد ایک ادارے کے ملازم ہیں، ہم لوگوں کا کچھ روپیہ بطور ضمانت کافی عرصہ ہوا محکمے نے ہماری تنخواہوں سے وضع کر کے پوسٹ آفس میں جمع کرادیا ہے، اب کافی عرصے کے بعد ہم نے وہ روپیہ ڈاک خانے سے مع سود وصول کیا جو وقتی طور پر ہم لوگوں کو اصل رقم کے ساتھ مل گیا، باقی احتیاطاً ہم نے یہ ضرور کیا کہ اصل رقم ہم نے صَرف کردی، مگر سود کو صَرف نہ کیا، اب اگر یہ رقم کسی مستحق کو بغیر نیت ثواب دے دیں تو جائز ہے؟

جواب ۱:- آپ کو ڈاک خانے سے جو سود کی رقم ملی ہے، اسے کسی غیر صاحبِ نصاب آدمی پر بغیر نیتِ ثواب کے صدقہ کردیں،[3] کیونکہ اس کا معاملہ پراویڈنٹ فنڈ سے مختلف ہے۔

سوال ۲:- جی پی فنڈ کی رقم مع سود وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ (یعنی گورنمنٹ جو رقم تنخواہ سے وضع کر کے ریٹائر ہونے کے بعد مع سود دیتی ہے)۔

جواب ۲:- پراویڈنٹ فنڈ پر جو زیادتی ''سود'' کے نام سے دی جاتی ہے، وہ درحقیقت سود نہیں ہے، لہٰذا اس کو حاصل کر کے استعمال کرنا جائز ہے۔[4] واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۳/ ۱۹ الف)

(۱ تا ۳) دیکھئے ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت، نیز مالِ حرام کے صدقہ کے بارے میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کی ایک اہم تحقیق کتاب البیوع کی "فصل فی أحکام المال الحرام والمخلوط" میں ص:۱۲۹ تا ص:۱۴۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) تفصیل کے لئے دیکھئے رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ'' از مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۵۲ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

بینک میں جمع کرائی گئی رقم پر ملنے والے منافع کا حکم

سوال ۱:- جو رقم بینک میں جمع کرائی جاتی ہے اس پر جو منافع ملتا ہے کیا وہ سود ہے؟

۲:- اگر بینک سے ملنے والا نفع سود ہے تو اس رقم پر اگر سود لگ چکا ہو تو اس سود کا مصرف کیا ہے؟

۳:- اگر بینک میں اس شرط پر رقم جمع کرائی جائے کہ سود نہیں لیا جائے گا کیا یہ جائز ہے؟ اور اس طرح سودی کاروبار میں معاون تو شمار نہیں ہوگا؟ جبکہ رقم کی حفاظت کا کوئی اور ذریعہ نہ ہو۔

جواب ۱:- جی ہاں سود ہے۔[۱]

۲:- اسے وصول نہ کریں[۲] اور اگر وصول کرلیا ہو تو کسی غریب کو بلانیتِ ثواب صدقہ کردیں،[۳] اس سے سود وصول کرنے کا کفارہ ہوجائے گا۔

۳:- جب رقم کی حفاظت کا اور کوئی ذریعہ نہ ہو تو اس شرط کے ساتھ بینک میں روپیہ رکھوانے کی گنجائش ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۸/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۸۹۶/۲۸ ج)

بینک کے سود کا حکم

سوال:- بینک سے حاصل کئے ہوئے سود کا کیا حکم ہے؟

جواب:- بینک سے سود نہ لینا چاہئے، بلکہ روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائیں جس پر سود نہ لگے، البتہ اگر غلطی سے وصول کرلیا ہو تو کسی فقیر کو بغیر نیتِ ثواب صدقہ کردیں۔[۴] واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۹۷۰/۲۸ ج)

سودی رقم مستحقِ زکوٰۃ کو دینے کا حکم

سوال:- میرے پاس کچھ سودی رقم تھی، چونکہ میں خود سود نہیں لیتا اس واسطے میں نے اپنی ایک عزیزہ کو وہ سودی رقم دے دی، کیا میں بری الذمہ ہوگیا؟

جواب:- اپنی جس عزیزہ کو آپ نے سود کی وہ رقم دی، اگر وہ مستحقِ زکوٰۃ تھیں (یعنی ان کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کے مساوی نقد یا سونا موجود نہیں تھا)[۵] تو آپ کا یہ فعل

(۱ تا ۵) ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت ملاحظہ فرمائیں، نیز دیکھئے ص:۱۲۰ وص:۱۲۱ کے حواشی، ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴ اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

دُرست تھا، اس کے بعد آپ پر اس سلسلے میں کوئی ذمہ داری نہیں ہے، انہیں یہ بتادینا بھی ضروری نہیں تھا کہ یہ رقم سود کی ہے۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۷۷۶/۱۹ الف)

بینک میں رقم رکھوانے اور کرنٹ اکاؤنٹ کا حکم

سوال:- مکرمی محترمی عالی جناب مفتی صاحب، کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دِین شرعِ متین درمیان اس مسئلے کے کہ:- زید کو اتفاق سے امسال پہلی مرتبہ بینک سے ۶۵۰ روپے بینک سے سود کے طور پر ملے، اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا، اب زید اس رقم کو لینا نہیں چاہتا، مگر یہ سود والی رقم بینک میں چھوڑ دی جاوے تو وہ لوگ خرد برد کرلیں گے۔ یا یہ رقم کسی غریب یتیم، مسکین، محتاج، اپاہج مجبور لوگوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے یا کسی غریب بیوہ عورت کو سلائی مشین خرید کر دی جاسکتی ہے؟ تاکہ وہ اپنی گزر بسر کرسکے یا نقدی کی صورت میں ضرورت مند کو دی جائے تاکہ وہ صاحب اپنے کام میں لاسکے، جواب سے مطلع فرماویں۔ انتظار ہوگا۔

جواب:- اگر بینک میں رقم رکھوانی ہو تو یا کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانی چاہئے جس پر سود نہیں دیا جاتا، یا اپنے اکاؤنٹ کے ساتھ بینک کو لکھ کر دینا چاہئے کہ میری رقم پر سود نہ لگایا جائے، آئندہ آپ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کرلیں، البتہ اب جو سود کی رقم آپ کے اکاؤنٹ میں جمع ہوگئی ہے اسے کسی غریب کو صدقہ کرسکتے ہیں، نیت اس میں حرام مال سے جان چھڑانے کی ہونی چاہئے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۸۹/۳۰ ج)

فِکسڈ ڈپازٹ میں رقم رکھوانے اور اس پر ملنے والے اضافے کا حکم

سوال:- فِکسڈ اکاؤنٹ کے انٹرسٹ کی رقم اگر مسلم بینک کے ذمہ داران اُصولِ تملیک پر عمل کرکے وہ رقم بشکل چندہ کسی دینی ادارے کو دے دیں تو آیا اس رقم کا دِینی اداروں میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۱) حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص:۱۲۰، وص:۱۲۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

جواب:- فِسکڈ ڈپازٹ پر چونکہ سود دیا جاتا ہے اس لئے اس میں رقم رکھوانا جائز نہیں،[1] رقم کی حفاظت کے لئے بینک میں رکھوانا ضروری ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائی جائے، جس پر سود نہیں دیا جاتا، لیکن اگر غلطی سے رقم فکسڈ ڈپازٹ میں رکھ دی اور اُس پر سود مل گیا تو اسے بغیر نیتِ ثواب کے صدقہ کردینا چاہئے، البتہ جسے صدقہ کیا گیا، وہ مالک ومختار ہونے کے بعد کسی دباؤ کے بغیر اپنی مرضی سے کسی دِینی ادارے میں چندہ دیدے تو اس دِینی ادارے کے لئے اس کا استعمال جائز ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۵/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۵۵۸/۲۹ ب)

بینکوں کے سود اور پراویڈنٹ فنڈ کا حکم

سوال:- ۱- بینک کا سود، ۲- پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کا سود، کیا قابلِ قبول اور قابلِ استعمال ہے؟ یا ان کو مذکورہ اداروں کے پاس ہی چھوڑ دیا جائے؟

جواب ۱:- بینکوں میں جس سود کا لین دین ہوتا ہے وہ بلاشبہ ''سود'' اور ''رِبا'' کی تعریف میں داخل ہے،[2] اور اس کا لین دین حرام اور گناہِ کبیرہ ہے، لما فی الجامع الصغیر من الحدیث المرفوع أو الموقوف : کل قرض جرّ منفعة فھو ربًا۔[3] لہٰذا اگر بینک میں رقم رکھوانی ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائی جائے تاکہ اس پر سود نہ لگے، اور اگر لاعلمی کی حالت میں رقم پر سود لگ جائے تو اسے وصول نہ کرنا چاہئے یا وصول کرکے صدقہ کردینا چاہئے۔

۲:- پراویڈنٹ فنڈ اگر جبری ہو تو اس پر جو زیادتی محکموں کی طرف سے ملتی ہے وہ شرعاً ''سود'' کی تعریف میں داخل نہیں، لہٰذا اس کا لینا جائز ہے،[4] البتہ احتیاط اس میں ہے کہ اس زیادہ رقم کو صدقہ کردیا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم وعلمہ اتم واحکم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۲۱/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۷/۱/۲۷ھ

(۱، ۲ و ۳) تفصیلی حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

(۴) تفصیل کے لئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ'' ملاحظہ فرمائیں۔

پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والی زائد رقم کا حکم

سوال:- پراویڈنٹ فنڈ پر جو سود دِیا جاتا ہے وہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- احتیاط تو اسی میں ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کے طور پر جو رقم ملازم نے اپنے اختیار سے کٹوائی ہے اس پر ملنے والی زیادہ رقم کو صدقہ کردیا جائے۔ لیکن شرعی نقطۂ نظر سے یہ زیادہ کی رقم سود کے حکم میں نہیں ہے، اس لئے اسے اپنے استعمال میں لانے کی گنجائش ہے۔[1] واللہ اعلم

۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۱۸/۱۱۹ الف)

بینک کے سود اور جبری پراویڈنٹ فنڈ کا حکم

سوال:- میں محکمہ زراعت میں ملازم ہوں، میری تنخواہ سے جی پی فنڈ مبلغ پانچ روپے ماہانہ کاٹے جاتے ہیں، اس رقم پر حکومت ایک مقرّرہ فیصد سالانہ سود اَدا کرتی ہے، میں نے ان کو لکھ دیا ہے کہ میں اس رقم پر سود نہیں لوں گا، اور اصل زر کا حق دار ہوں گا، اس طرح بینک اور ڈاک خانے میں بھی رقم بحیثیت اصل جمع ہے تو کیا میں حکومت سے سود کی رقم لے کر کسی غریب کو دے سکتا ہوں؟

جواب:- جہاں تک بینک کے سود کا تعلق ہے وہ تو ناجائز اور حرام ہے،[2] اور اس میں بہتر یہ ہے کہ اسے لیا ہی نہ جائے،[3] جس کی شکل یہ ہے کہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھوائی جائے، ہاں اگر کبھی غلطی سے سود لگ کر مل گیا تو اسے بغیر نیتِ ثواب صدقہ کردینا چاہئے۔ البتہ جبری پراویڈنٹ فنڈ پر جو زیادہ رقم محکمے کی طرف سے ملتی ہے وہ شرعاً سود کے حکم میں نہیں ہے،[4] اسے وصول کرکے اپنے استعمال میں لانا بھی شرعاً جائز ہے، ہاں اگر کوئی شخص تقویٰ اور احتیاط پر عمل کرے تو اسے رقم لے کر صدقہ کردینا چاہئے،[5] اور یہ صدقہ ایسا ہے کہ اپنے بیوی، بچوں اور دُوسرے اعزہ اور رشتہ داروں پر بھی صَرف کیا جاسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۹۱/۵/۲۴ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۸۲/۲۲ ب)

(۱و۴و۵) تفصیل کے لئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ'' ملاحظہ فرمائیں۔

(۲و۳) ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت کے ساتھ ساتھ دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴ اور مزید تفصیل کے لئے ص:۱۲۰ وص:۱۲۱ کے حواشی اور ص:۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

بینک کا سود صدقہ کرنے کی صورت

سوال:- میں کئی سالوں سے موجودہ پاکستانی بینکوں میں پیسہ جمع کر رہا ہوں، اس دوران بینک کی طرف سے میری جمع شدہ رقموں میں بہت سود بھی شامل ہوگیا ہے، سود جس قدر ہے اس کا اندازہ بینک والوں کو ہے، اب میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سود کی رقم کسی فقیر یا بیوہ، نادار شخص کو دی جاسکتی ہے؟ یا اس رقم کو کسی اور جگہ لگایا جاسکتا ہے؟

جواب:- بینک سے سود کی رقم لینا جائز نہیں،(۱) بلکہ اگر رقم بینک میں رکھوانی ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائی جائے جس پر سود نہیں دیا جاتا، تاہم اگر غلطی سے سود وصول کرلیا تو یہ رقم اپنی جان چھڑانے کی نیت سے کسی فقیر یا مسکین کو صدقہ کردیں،(۲) اس میں بھی مالک بنا کر دینا ضروری ہے، تعمیر وغیرہ رفاہی کاموں میں یہ رقم استعمال نہیں ہوسکتی۔(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۷/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۸۰۱/۲۹ ب)

بینک کے سود کا حکم

سوال:- ہم بینک سے سود لے کر صدقہ یا کسی رفاہی کام میں لگادیں تو اچھا ہے یا سود ہی نہ لیں؟

جواب:- اوّل تو بینک میں روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانا چاہئے، جس پر عموماً سود نہیں لگایا جاتا، اور اگر بینک کی طرف سے اس پر سود لگادیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ وہاں سے سود لیا ہی نہ جائے، لے کر صدقہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ گناہ کر کے کفارہ کیا جائے، اور نہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ سرے سے گناہ کیا ہی نہ جائے۔ ظاہر ہے کہ دُوسری صورت افضل ہے۔ موجودہ بینک عام طور سے ایسی رقموں کو رفاہی کاموں میں خرچ کرتے ہیں، اس لئے اسے چھوڑنے میں کوئی قومی نقصان بھی نہیں ہے۔(۴)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۹/۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۶۷۸/۱۹ الف)

---

(۱) دیکھئے ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲ و ۳) دیکھئے ص:۱۲۰ وص:۱۲۱ کے حواشی اور تملیک کی شرط کے بارے میں دُوسری تحقیق کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

(۴) دیکھئے ص:۲۶۸ پر اہم وضاحت نیز ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

ایک اکاؤنٹ سے سود لے کر دُوسرے اکاؤنٹ میں سود ادا کرنے کا حکم

سوال:- گزارش یہ ہے کہ ایک بینک اکاؤنٹ میں سود ملتا ہے اور دُوسرے بینک اکاؤنٹ میں سود دینا پڑتا ہے، یعنی سود لینا دینا دونوں بینک ہی میں ہے، کوئی اور اس میں Involve نہیں ہے، تو کیا ایسی صورت میں سود سے سود اَدا کر سکتے ہیں؟

جواب:- بینک میں سودی اکاؤنٹ کھولنا بھی جائز نہیں،[1] رقم رکھوانا ضروری ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائی جائے، اور بینک سے سودی قرض لینا بھی جائز نہیں۔[2] لہٰذا مذکورہ طریقے پر بینک کے سود کو بینک ہی کے سود میں محسوب کرنے کی غرض سے سودی اکاؤنٹ کھولنا یا سودی قرض لینا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر ماضی میں غلطی سے سودی اکاؤنٹ میں پیسے رکھوا دیئے گئے ہیں اور سودی قرض لے لیا گیا تو اس طرح تصفیہ کر سکتے ہیں کہ ایک اکاؤنٹ سے لے کر دُوسرے میں دے دیں، بشرطیکہ لیا ہوا سود دیئے ہوئے سود سے زائد نہ ہو، برابر ہو جائے، لیکن آئندہ کے لئے یہ سلسلہ بالکل بند کر دیں۔

واللہ اعلم
۱۴۰۹/۹/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۵۶/۴۰ د)

بینک سے وصول شدہ سود کا حکم

سوال:- اگر زید بینک میں رقم رکھتا ہے اور اُسے سود بھی دیا جاتا ہے، سود لینا حرام ہے اور چھوڑ دینا گویا متعلقہ افراد کو حرام کھانے کا موقع دینا ہے، اب لینا بہتر ہے یا چھوڑ دینا؟ کیا کسی عمومی فائدے میں یہ رقم خرچ کی جا سکتی ہے؟

جواب:- بینک میں رقم رکھوانی ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانی چاہئے جس پر سود نہیں لگتا، اگر غلطی سے دُوسرے اکاؤنٹ میں رکھوادی ہو اور اس پر سود لگ گیا ہو تب بھی سود وصول کرنا دُرست نہیں، اور اگر غلطی سے وصول کرلیا تو اُسے کسی غیر صاحبِ نصاب کو بغیر نیتِ ثواب صدقہ کر دیا جائے۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۲/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۴/۲۸ الف)

(۱ و ۲) حوالہ کے لئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴ اور ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) دیکھئے ص:۲۶۸ پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر۱، وص:۱۲۰ وص:۱۲۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

ڈاک خانے کے ڈپازٹ سرٹیفکیٹ پر ملنے والے منافع کا حکم

سوال ۱:- میرے پاس ڈاک خانے کے خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ ہیں، اُن پر ہر سال ساڑھے گیارہ فیصد منافع ملتا ہے، کیا یہ حلال ہے؟

۲:- اگر منافع جائز ہے اور سود حرام ہے تو پھر فرق کیسے ہوا؟ کیا یہ رقم سود کے زُمرے میں آتی ہے؟

جواب:- ڈاک خانے کے ڈپازٹ سرٹیفکیٹ پر جو رقم زیادہ دی جاتی ہے وہ خواہ منافع کہہ کر دی جائے یا سود کہہ کر دے دی جائے، شرعی طور پر وہ سود ہی ہے، اور اس کا وصول کرنا جائز نہیں،[1] اور اگر غلطی سے وصول کرلی گئی تو اسے نیتِ ثواب کے بغیر صدقہ کردینا ضروری ہے۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴۴۲/ ۲۷ د)

بینک کا سود وصول کر کے صدقہ کیا جائے یا وصول ہی نہ کیا جائے؟

سوال:- بینک میں بغرضِ حفاظت روپیہ رکھا جاتا ہے، بینک باقاعدہ حساب کر کے رقم سود والے حساب میں جمع کردیتا ہے، میرے حساب میں جو رقم سود کی جمع ہوتی ہے بغیر نیتِ اَجر فوراً غریبوں کو دے دیتا ہوں، بڑی رقم سود کی، دِینی مدارس کے یتیم نادار بچوں کے خرچے کے لئے بھیج دیتا ہوں، مفتیٔ اعظم صاحب کو بھی ایک مرتبہ زکوٰۃ اور سود کی رقم بھیجی تھی، رسید آگئی، اس معاملے میں جناب کی رہبری کی ضرورت ہے۔

جواب:- اصل مسئلہ یہی ہے کہ بینک سے سود وصول ہی نہ کرنا چاہئے[1] بلکہ ایسے اکاؤنٹ میں رقم رکھوانی چاہئے جس پر سود لگایا ہی نہ جاتا ہو، کیونکہ سود کا معاملہ کرنا اور اُسے وصول کرنا بذاتِ خود گناہ ہے، غریبوں کو بغیر ثواب کی نیت کے دے دینا اس گناہ کا کفارہ ہے، اور گناہ کر کے کفارہ کرنے سے بہتر یہ ہے کہ گناہ کیا ہی نہ جائے۔ لہٰذا آئندہ آپ سود وصول ہی نہ کیا کریں۔ حضرت مفتیٔ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ یہی تھا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۱/ ۲۸ الف)

(۱و۲و۳) دیکھئے ص:۲۶۸ پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر۱، وص:۱۲۰ وص:۱۲۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

بینک میں رقم رکھوانے اور کرنٹ اور سیونگ اکاؤنٹ کا حکم

سوال ۱:- بینک میں پیسہ رکھا جاسکتا ہے یا نہیں؟

۲:- اس کے علاوہ سیونگ کھاتہ میں سود ملتا ہے، وہ سود لیا جائے یا بینک والوں کے پاس ہی چھوڑ دیا جائے یا لے کر خیرات کردیا جائے؟

جواب:- بہتر تو یہ ہے کہ روپیہ کی حفاظت کا خود کوئی انتظام کیا جائے یا بینک میں لاکر کرایہ پر لے کر اس میں روپیہ رکھوایا جائے، لیکن اگر ان دونوں صورتوں میں شدید دُشواری ہو تو بینک کی اس مد میں روپیہ رکھوایا جائے جس میں سود نہیں لگتا، مثلاً کرنٹ اکاؤنٹ۔

۲:- سیونگ اکاؤنٹ میں چونکہ سود لگتا ہے، اس لئے اس میں روپیہ رکھوانا دُرست نہیں،[1] اگر غلطی سے رکھوادیا تو سود کی رقم وصول نہ کی جائے،[2] اور اگر غلطی سے وصول بھی کرلی تو صدقہ کردی جائے۔[3]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۵/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۴۵۶/ ۲۸ ب)

مسلم ممالک کے لئے غیر مسلم ممالک کے بینکوں میں رقم جمع کراکر سود وصول کرنے کا حکم

سوال:- اکثر سننے میں آیا ہے کہ امیر مسلمان ممالک اپنا فالتو سرمایہ امریکا یا یورپ کے بینکوں یا سودی کاروبار میں لگاتے ہیں، کیونکہ فی الحال ان کے اپنے وسائل اتنے نہیں کہ اپنے ملک کے اندر تمام سرمایہ لگاسکیں، عام معلومات یہ ہیں کہ یہ امیر مسلمان ممالک حاصل شدہ سودی رقم غریب برادر ممالک کو اسلحہ اور اس قسم کی دیگر ضروریات کے لئے صَرف کرتے ہیں۔

جواب:- اگر آپ کا سوال یہ ہے کہ غیر مسلم ممالک کے بینکوں میں روپیہ جمع کراکر اُس پر سود وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض فقہاءؒ نے دار الحرب کے کفار سے سودی معاملے کی گنجائش دی ہے،[4] مسلمان ممالک ضرورت کے مواقع پر غریبوں کی اِمداد کے لئے اس گنجائش پر عمل کرسکتے ہیں اور بلا ضرورت اس سے احتراز واجب ہے۔[5]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۷/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۶۸۳/ ۲۸ ب)

(۱ تا ۳) دیکھئے ص:۲۶۸ پر اہم وضاحت اور ص:۱۲۰ وص:۱۲۱ کے حواشی اور ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴، مزید اہم تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

(۴و۵) دیکھئے ص:۲۶۷ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کا فتویٰ اور ص:۲۶۷ وص:۲۶۸ کے حواشی۔

سیونگ اکاؤنٹ کے سودی منافع سے متعلق جامعہ ازہر کے شیخ طنطاویؒ کے فتویٰ کی حیثیت

سوال:- عرض ہے کہ میرے پاس کچھ نقد رقم ہے، میرا ذہن کاروباری نہیں کہ میں اس رقم سے کوئی کاروبار شروع کرلوں اور نہ ہی مجھے زمینوں کے جھگڑے نبٹانے آتے ہیں کہ میں اس رقم سے فروخت کرنے کی غرض سے کچھ زمین خریدلوں۔ لہٰذا میں اپنی اس نقد رقم کو حکومتِ پاکستان کے قومی بچت (نیشنل سیونگ) میں رکھنا (اِنوسٹ کرنا) چاہتا ہوں، تاکہ اس رقم سے میں منافع (پرافٹ) حاصل کرسکوں۔ اس لئے کہ کچھ عرصہ پہلے ایک اُردو اخبار میں جامعہ ازہر قاہرہ، مصر کا ایک فتویٰ شائع ہوا تھا جس میں روپے پیسے کو قومی بچت کے بینکوں میں رکھنا اور اس رقم پر منافع (پرافٹ) لینے کو جائز قرار دیا گیا ہے شریعت کی رُو سے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس سلسلے میں فتویٰ دیں، جوابی لفافہ موجود ہے، جواب/فتویٰ جلد از جلد ارسال کیجئے، شکریہ والسلام۔

جواب:- مذکورہ سیونگ اسکیم پر ملنے والا منافع شرعاً سود ہے، اس کا لینا اور اپنے استعمال میں لانا شرعاً حرام ہے۔[1] جامعہ ازہر کے شیخ طنطاوی کا جو فتویٰ شائع ہوا ہے، اس کو عالمِ اسلام کے تقریباً تمام علماء نے سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے، اور وہ فتویٰ قرآن وسنت کے دلائل کی رُو سے صحیح نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۸/۹/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹۶/۳)

سیونگ اکاؤنٹ پر ملنے والے سود کا حکم، نیز حکومت کا بینک سے زکوٰۃ وصول کرنا

سوال:- زید بینک کا کیشئر ہے، اس نے ۲۷/جون کو مسمّٰی بکر کے سودی کھاتہ کی اصل رقم مبلغ ایک ہزار روپے کے ساتھ سالانہ سود مبلغ ۷۵ روپے بحساب ساڑھے سات روپے فی صد ملادی، پھر ۵/جولائی کو کل رقم ایک ہزار پچھتر روپے سے زکوٰۃ کاٹی جو کہ ۲۵ روپے بنتی ہے، لیکن یہ وضاحت نہ کی گئی کہ اصل رقم سے زکوٰۃ کاٹی گئی ہے یا کل سے۔ مندرجہ بالا صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں؟ نیز اگر کل سے کٹوتی سرکاری طور پر ہوئی ہے بحیثیت ممبر مشاورتی کونسل جناب کے نوٹس میں یہ بات ہوگی کہ کل رقم سے کٹوتی کی صورت میں بندے کے ذہن کے مطابق سود کی

---

(۱) دیکھئے حوالہ ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

آمیزش ہوگئی جو کہ شرعی طور پر قابلِ مؤاخذہ ہے۔

جواب:- سیونگ اکاؤنٹ چونکہ سودی اکاؤنٹ ہے، اس لئے اس میں رقم رکھوانا جائز نہیں،(۱) بلکہ اگر بینک میں رقم رکھوانی ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانی چاہئے جس پر سود نہیں لگتا، تاہم آپ نے سیونگ اکاؤنٹ میں جو رقم رکھوائی تھی اُس پر حکومت کی طرف سے جو زکوٰۃ کاٹی گئی شرعاً وہ ادا ہوگئی،(۲) اصل میں زکوٰۃ تو آپ کی رکھوائی ہوئی رقم پر واجب تھی اور اسی سے زکوٰۃ وضع کی جاتی ہے، اور پچھتر روپے جو بطور سود آپ کی رقم پر اضافہ ہوا تھا آپ کے ذمے واجب تھا کہ وہ بینک سے نہ لیں، یا اگر لیں تو اس کا صدقہ کردیں، اس میں سے کچھ رقم اگر زکوٰۃ فنڈ میں چلی گئی تو اس سے آپ کی زکوٰۃ کی ادائیگی پر کچھ فرق نہیں پڑا، بہرصورت آپ کی مندرجہ رقم کی زکوٰۃ ادا ہوچکی ہے،(۳) آئندہ اپنی رقم کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائیں تاکہ سود نہ لگے، یا پھر سیونگ اکاؤنٹ ہی میں یہ لکھ دیں کہ ہماری اس رقم پر سود نہ لگایا جائے۔

واللہ اعلم بالصواب

۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷۰۶ ج)

سیونگ اور ڈپازٹ سرٹیفکیٹ پر اصل رقم سے زائد ملنے والی رقم ''سود'' ہے

سوال:- حکومتِ پاکستان کی جانب سے سرمایہ لگانے کی بہت ساری اسکیمیں ہیں، ۱-ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹس، ۲-نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ، ۳-خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹس وغیرہ، کیا ان کو خریدنے کے بعد حکومت سے مقررہ نفع وصول کرنا جائز ہے؟

جواب:- سیونگ سرٹیفکیٹ اور ڈپازٹ سرٹیفکیٹ پر جو رقم اصل رقم سے زائد ''انٹرسٹ'' کے نام سے دی جاتی ہے، وہ شرعاً سود ہے،(۴) اور اُس کا وصول کرنا حلال نہیں، اگر غلطی سے وصول کرلی

---

(۱) دیکھئے اسی صفحے کا حاشیہ نمبر۴۔

(۲، ۳) بینکوں سے زکوٰۃ کی کٹوتی سے متعلق تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کا مقالہ ''بینکوں اور مالیاتی اداروں سے متعلق'' اور اُس پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تازہ اہم نوٹ فتاویٰ عثمانی ج:۲ ص:۸۰ تا ص:۱۲۵ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) کیونکہ وہ قرض پر اضافہ ہے جو ''سود'' ہے۔

وفی کنز العمّال رقم الحدیث:۱۵۵۱۲ ج:۶ ص:۲۳۸ کل قرض جرّ منفعة فهو ربا. وكذا فی الجامع الصغیر ج:۲ ص:۹۴.

وفی اعلاء السنن ج:۱۴ ص:۴۹۸ (باب کل قرض جرّ منفعة) عن علیّ أمیر المؤمنین رضی الله عنه مرفوعًا: كل قرض جرّ منفعة فهو ربا. وأخرجه البیهقی ج:۵ ص:۳۵۰ وكذا فی المرقاة ج:۶ ص:۶۷ و ۶۸ وارواء الغلیل ج:۵ ص:۲۳۴ و درّ منثور للسیوطی ج:۵ ص:۳۵۰ والمطالب العالیة لابن حجر ص:۱۳۷۳.

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۶۶ وفی الأشباه كل قرض جرّ نفعًا فهو حرام............. (باقی اگلے صفحے پر)

جائے تو کسی غریب کو صدقہ کردی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۵۶۱/۲۸ ب)

ضرورت کی بناء پر بینک سے سودی قرض لینے کا حکم

سوال:- کیا بینک سے سودی قرض بضرورت لینا جائز ہے؟

جواب:- بینک سے سود پر قرض لینا جائز نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۶/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۶۷۷/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

بینک میں رقم رکھوانے کا حکم

سوال:- بینک میں رقم جمع کرانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- بینک میں رقم رکھوانا ضروری ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائے جس پر سود نہیں دیا جاتا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۳/۲۹ الف)

مستحق کے لئے سود کی رقم کسی بھی ضرورت میں استعمال کرنا جائز ہے

سوال:- ایک شخص نے سود کی رقم ایک فقیر کو دی، اور وہ اس موصوفہ رقم کو سود کی معلوم ہونے پر کھانے پینے کے علاوہ کرایہ وغیرہ میں استعمال کرے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ کھانے میں اس لئے استعمال نہیں کرتا کہ وہ خود اگرچہ فقیر یا ضرورت مند ہے لیکن صاحبِ تقویٰ ہے، مجبوری کی وجہ سے ان دیگر مدات رقم استعمال کر لیتا ہے، کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ نیز اگر ایک شخص کے اکاؤنٹ میں سود کی رقم لگ جائے، وہ اس کو رفاہی کاموں میں استعمال کرے، کیسا ہے؟ یا مسجد یا مدرسے کے غسل خانے اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
وفی بدائع الصنائع ج:۷ ص:۳۹۵ وامّا الّذی یرجع الیٰ نفس القرض فھو أن لا یکون فیہ جرّ منفعة فان کان لم یجز کأن ..... أقرضہ وشرط شرطًا لہ فیہ منفعة.
وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۱۴ ص:۳۵ انّ المنفعة اذا کانت مشروطة فی الاقراض فھو قرض منفعة.
وفی البحر الرائق ج:۶ ص:۱۲۱ ولا یجوز قرض جرّ نفعًا. وکذا فی فی الھندیة ج:۳ ص:۲۰۲ وشرح المجلّة ج:۲ ص:۴۵۴ اشارة الیٰ ھذا وقال شمس الأئمة الحلوانی انہ حرام لانہ قرض جر منفعةً۔ نیز بینکوں کے سود سے متعلق تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۵۵ میں حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کا رسالہ "رافع الضنک عن منافع البنک" اور امداد المفتین میں ص:۸۴۹ تا ۸۵۱، اور حضرتِ والا دامت برکاتہم کا رسالہ پی ایل ایس اکاؤنٹ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

بیت الخلاء بنوادے تو کیسا ہے؟ کیا سودی کاروبار کرنے والے کا ہدیہ کسی فقیر صاحبِ تقویٰ عالم کے لئے کرایہ وغیرہ میں لگانا جائز ہے؟

جواب:- سود کی رقم اگر اصل مالک کو واپس پہنچانا ممکن نہ ہو تو بغیر نیتِ ثواب کے اس کا صدقہ کرنا واجب ہے۔[1] ایسی صورت میں جس فقیر کو وہ رقم دی جائے، اس کے لئے اُسے اپنے ہر استعمال میں لانا جائز ہے، خواہ کھانا پینا ہو، یا کرائے میں دینا ہو، تاہم اگر کوئی فقیر تقویٰ کے لحاظ سے اُسے کھانے پینے میں استعمال کرنے سے پرہیز کرے تو اس میں بھی کچھ حرج نہیں۔ اور اس مسئلے میں عالم غیر عالم کا کوئی فرق نہیں ہے، ہاں اگر کسی عالم کے سود کی رقم لینے سے اندیشہ ہو کہ لوگوں کے دِل سے سود کی حرمت کی سنگینی میں کمی آئے گی تو ایسی صورت میں عالم کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ سود کی رقم معلوم ہونے کے بعد نہ لے۔ واللہ سبحانہ اعلم بالصواب

۱۴۱۲/۱/۱۶ھ

قرض پر منافع حاصل کرنے کی دو صورتوں کا حکم

سوال ۱:- برادرانِ اسلام، السلام علیکم، کے بعد عرض یہ ہے کہ کیا فرماتے ہیں علمائے دِین اس مسئلے میں کہ محمد حسین نامی شخص کو پیسوں کی سخت ضرورت پڑی، اس نے تمام شہر سے سوال کیا کہ مجھے پندرہ سو روپے دے دیں، مگر کسی نے نہ دیا، لیکن ایک شخص بنام سردار نے کہا کہ میں تجھے پندرہ سو روپے دیتا ہوں مگر اس شرط پر کہ تیرا فلاں رقبہ جو پانچ ایکڑ ہے اس کا نصف فصل جو تجھے ملے وہ بھی مجھے دے دیں اور یہ پندرہ سو روپیہ بھی واپس کردیں یا روپے مذکورہ اور پانچ ایکڑ۔ رقبہ مذکورہ محمد حسین نے پہلے کسی دُوسرے شخص کو بٹائی پر دیا ہوا تھا اس کا نصف فصل مذکورہ محمد حسین نے لیا تھا اس وقت محمد حسین نے یہ شرط قبول کرلی۔ اور پندرہ سو روپے لے لیا، اب یہ رقم شرعاً حلال ہے یا نہیں؟ اگر حرام ہے تو سود بنتا ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب سے مطلع فرماویں۔ شکریہ۔

۲:- ایک شخص پندرہ ایکڑ رقبہ اس شرط پر دیتا ہے کہ رقبہ پندرہ ایکڑ کے بدلہ دو ہزار روپے مجھے دیدے اور رقبہ تو کاشت کرلے، اس سے حاصل فصل جتنا بھی ہو نصف تیرا، نصف میرا، جب تک میں دو ہزار روپیہ واپس نہ دُوں یہ رقبہ تم کاشت کرتے رہو، جب رقم ادا کردوں گا رقبہ واپس لے لوں گا، یہ جائز ہے یا نہیں؟ ہمارے علاقے میں یہ بیماری بڑی ہوگئی ہے برائے مہربانی جلدی جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

---

(۱) دیکھئے ص:۱۲۰ وص:۱۲۱ کے حواشی اور ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

جواب ۱:- مذکورہ معاملہ بلاشبہ سود ہے،[۱] اور اس طرح کا معاملہ فریقین کے لئے حرام ہے، اس معاملے کو فوراً ختم کرنا واجب ہے۔[۲]

۲:- یہ معاملہ بھی ناجائز ہے، کیونکہ دو ہزار روپے جب واپس کرنے کی غرض سے لئے گئے تو وہ شرعاً قرض ہوئے، اور اس کے ساتھ زمین بٹائی پر لینے کی شرط لگانا "کل قرض جرّ منفعة"[۳] میں داخل ہے، اور دُوسری طرف اگر اس معاملے کی توجیہ یوں کی جائے کہ زمین بٹائی پر دینے کے لئے دو ہزار روپے قرض دینے کی شرط لگائی گئی ہے تو بٹائی میں اس طرح کی شرطِ فاسد لگانا بھی جائز نہیں، لہٰذا یہ معاملہ شرعاً ناجائز ہے۔[۴] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۷۳۷ د)

مسجد کا چندہ سودی اکاؤنٹ میں جمع کراکر سود وصول کرنے کا حکم

سوال:- مسجد کمیٹی ضیاء المساجد نواب شاہ سکھر نے مسجد کی اعانت کے سلسلے میں وصول ہونے والی عطیات کی رقم ایک بینک میں جمع کرکے حساب وکتاب کھلوایا ہے، بینک والوں نے اب اس رقم پر کچھ سود کی رقم جمع کی ہے، مسجد کمیٹی اس سلسلے میں شرعی حکم معلوم کرنے کی خواہش مند ہے۔

جواب:- مذکورہ سود کی رقم بینک سے وصول نہ کی جائے،[۵] اور اگر غلطی سے وصول کرلی جائے تو غریبوں میں صدقہ کردی جائے،[۶] مسجد پر خرچ نہ کی جائے، اور آئندہ اگر مسجد کا روپیہ بینک میں رکھوانا ضروری ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوایا جائے جس پر سود نہیں لگتا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۱/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۱۷۹ ج)

ایل.سی کھولتے وقت پوری رقم جمع نہ کرانے کی صورت میں دوخرابیوں کی وجہ سے معاملہ ناجائز ہے

سوال:- امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار جو اور لحاظ سے جائز ہو مگر L/C کی وجہ سے ان

(۱و۲و۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔
(۴) دیکھئے هداية، كتاب المزارعة ج:۴ ص:۴۲۶ (طبع شركت علميه ملتان)
الدر المختار ج:۶ ص:۲۷۶ (طبع سعيد)
البحر الرائق ج:۸ ص:۲۹۳ (طبع رشيديه كوئٹه)
وشرح المجلة رقم المادة:۱۴۳۵ ج:۲ ص:۷۶۱ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).
(۵و۶) دیکھئے ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز ص:۱۲۰ و ص:۱۲۱ کے حواشی اور اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

کے اخراجات آمدنی میں ایک قلیل عنصر سود کا شامل ہوجاتا ہے، مثال کے طور پر جس دن بینک Retire Documents کرنے کے لئے Advice دیتا ہے، اس دن بھی کاغذات Retire کرنے پر ایک دن کا Interest ادا کرنا پڑتا ہے، کیا یہ مجبوری اِضطراری شمار ہوگی؟ اور اس طرح یہ آمدنی جائز قرار دی جائے گی؟

جواب:- اگر ایل.سی کھولتے وقت پوری رقم جمع نہ کرائی جائے تو اس میں صرف یہی خرابی نہیں ہے جو آپ نے ذکر کی، بلکہ اس میں ایک اور خرابی بھی ہے، اور وہ یہ کہ بینک گارنٹی کی فیس دینی پڑتی ہے، شرعاً وہ بھی ناجائز ہے،[1] لہٰذا شرعی اعتبار سے جائز طریقہ یہ ہے کہ ایل.سی کھولتے وقت پوری رقم جمع کرادی جائے،[2] یا کسی ایسے بینک سے معاملہ کیا جائے جو اِسلامی اُصولوں کے مطابق کام کرتا ہو۔

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۷۵/۴۰ و)

بینک کا کسی کمپنی کو ڈالر کے ڈسکاؤنٹ پر ایل.سی کھول کر بعد میں اداشدہ ڈالر کی قیمت سے زیادہ وصول کرنا

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم ایک پارٹی کو پاکستان سے باہر مال بیچتے ہیں تو اس کے لئے بینک میں ایل.سی کھولتے ہیں، فرض کریں کہ ہم نے ایک ڈالر کے حساب سے کوئی چیز تین ماہ کی ادائیگی پر بیچی ہے، تو بینک یہ سہولت دیتا ہے کہ ہم بینک سے فوراً ادائیگی لے لیں، اور بینک ہماری پارٹی سے تین ماہ کے بعد ہمارے بجائے خود ادائیگی وصول کرے گا۔ اس میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ جب بینک ہمیں ادا کرے گا تو وہ ادائیگی کے وقت ڈالر کا جو ریٹ ہوگا اس سے کرے گا، اور پارٹی سے جب تین ماہ بعد ادائیگی وصول کرے گا تو وہ اس ادائیگی کے وقت کا ریٹ لگائے گا، اور اس میں زیادہ گمان ڈالر کے ریٹ بڑھنے کا ہوتا ہے، اس طرح ایل.سی کھول کر کام سود کے زُمرے میں تو نہیں آتا؟

مزید وضاحت اس سلسلے میں یہ ہے کہ جب خریدار DA90 دونوں کی ایل.سی کھولتا ہے تو بینک ہمیں ڈسکاؤنٹ نرخ کے اُوپر فوراً ادا کردیتا ہے، بشرطیکہ ہماری ساکھ اچھی ہو، اس کا طریقہ یہ ہے کہ بینک ہمیں ڈالر ڈسکاؤنٹ ریٹ کے اُوپر ادا کرتا ہے، اگر حاضر میں 19.75 ڈالر کا نرخ ہے تو بینک ہم سے ڈسکاؤنٹ خرید لیتی ہے، اور اس نے ہم کو 19.25 روپے کے حساب سے ادا کیا، جب مقررہ

(۱و۲) تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' ص:۱۱۹ تا ۱۲۲ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

وقت پر بینک کو ادائیگی وصول ہوتی ہے تو اس وقت کے حالات کے مطابق جو بھی بینک ریٹ ہوتا ہے وہ ملتا ہے، چاہے وہ 20.50 روپے ہوجائے، اس سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے بارے میں آگاہ فرمائیں۔

جواب:- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، آپ نے جو صورتِ حال لکھی ہے وہ ایک طرح جائز ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ خریدار کے ذمے آپ کی جو قیمت واجب ہوئی خریدار اس کا حوالہ بینک کو ڈالروں کی شکل میں دے، اور بینک اس حوالے کو قبول کرے، پھر اگر بینک آپ کو قانونی مجبوری کی وجہ سے ڈالر دینے کے بجائے ڈالر کی اس روز کی قیمت کے لحاظ سے پاکستانی روپیہ دے اور بعد میں اصل خریدار سے ڈالر وصول کرے یا ڈالر کی اس روز کی قیمت کی کوئی اور کرنسی وصول کرے تو جائز ہے، لیکن واضح رہے کہ حوالے کے معاملے میں ڈالر کی ادائیگی کا طے ہونا معاملے کی صحت کے لئے انتہائی ضروری ہے۔[۱]

مزید یہ واضح رہے کہ جتنے ڈالر کا حوالہ کیا گیا، بینک کو اتنے ہی ڈالر آپ کو دینے ضروری ہوں گے، ان میں کمی بیشی جائز نہیں ہوگی، لہٰذا بلوں کو ڈسکاؤنٹ کرنے کا جو طریقہ رائج ہے،[۲] وہ سود ہے۔[۳] نیز آپ کو جو پاکستانی روپیہ ادا کیا جارہا ہے وہ ڈالر کے مارکیٹ ریٹ پر یا بینک ریٹ پر ہونا ضروری ہے (لقوله عليه السلام لا بأس أن تأخذها بسعر يومها، رواه أبو داؤد)،[۴] مارکیٹ اور بینک ریٹ سے اتنی کمی بیشی جس میں بینک اپنے سود کی مقدار پوری کرلے جائز نہیں۔ ہاں! ڈالر کی بازاری قیمت میں تین ماہ کے اندر جو فرق آئے گا وہ فرق بینک کا منافع ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۰۹/۹/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۵۷/۴۰ د)

پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والے نفع کا حکم

سوال:- ایک ملازم کی تنخواہ سے ماہوار ایک خاص رقم بطور ''جی. پی فنڈ'' کاٹ دی جاتی ہے اور جس وقت ملازم کی میعادِ ملازمت ختم ہوجاتی ہے تو ریٹائر ہونے کے بعد جتنی رقم اس ملازم کی جمع ہوئی ہے اس کی دُگنی رقم اِمداد کی شکل میں مل جاتی ہے، کیا اس رقم کا لینا جائز ہوگا؟

---

(۱) فی الهداية كتاب الحوالة ج:۳ ص:۱۳۶ (طبع رحمانيه) وتصح الحوالة برضاء المحيل والمحتال والمحتال عليه.

(۲و۳) تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی کتاب بحوث في قضايا فقهية معاصرة ج:۲ ص:۹۸ تا ص:۱۲۶ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) ج:۲ ص:۱۲۰ (طبع مکتبه امدادیه ملتان).

جواب:- جبری پراویڈنٹ فنڈ پر جو زیادتی محکمہ دیتا ہے وہ بحکمِ سود نہیں ہے، اس لئے اس کا لینا جائز ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۳۳۱/۱۹ الف)

بینک کے سود کا حکم، بینک میں کونسا اکاؤنٹ کھلوانا دُرست ہے؟

سوال ۱:- بینک کے سود کا کیا حکم ہے؟ وہ لینا چاہئے یا نہیں؟ اگر لے لیا تو کیا حکم ہے؟

۲:- دارالعلوم یا دیگر رفاہی ادارے جو بینک میں پیسے رکھتے ہیں وہ کونسے اکاؤنٹ میں رکھواتے ہیں؟ اور سودی رقم کا کیا مصرف لیتے ہیں؟

جواب ۱:- بینک کا سود لینا نہ چاہئے،[۲] غلطی سے لے لیا تو بغیر نیتِ ثواب صدقہ کردے،[۳] اور ملازموں وغیرہ کو بھی دیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اُجرت میں نہ لگائیں۔

۲:- روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھواتے ہیں، جس پر سود نہیں لگتا، اور ایسا ہی سب کو کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۵ھ

پراویڈنٹ فنڈ پر سود کے نام سے ملنے والی رقم کا حکم

سوال:- میں ایک کمپنی میں ملازم ہوں، جہاں ہر ماہ میری تنخواہ سے کچھ پیسے کٹتے ہیں، ان پیسوں کے برابر کمپنی اپنی طرف سے اتنا ہی پیسہ ہمارے نام جمع کرتی ہے، اس کے علاوہ ان پیسوں پر سود بھی دیا جاتا ہے، کیا یہ سود شمار ہوگا یا نہیں؟

جواب:- یہ صورت پراویڈنٹ فنڈ کی ہے، اس کا لینا جائز ہے، اور سود کے نام سے اس میں جو رقم دی جاتی ہے، شرعاً وہ سود نہیں ہے، اس کو وصول کرنا اور استعمال میں لانا دُرست ہے، اس مسئلے کی مفصل تحقیق مع دلائل مطلوب ہو تو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا رسالہ پراویڈنٹ فنڈ ملاحظہ فرمائیں۔[۴]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۴/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۳۷۶/۲۸ ب)

---

(۱) تفصیل کے لئے رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ'' ملاحظہ ہو۔

(۲ و ۳) فی الشامیة ج:۵ ص:۹۹ (طبع سعید) لا یحل اذا علم عین الغاصب مثلًا وان لم یعلم مالکه لما فی البزازیة اخذ مورث رشوة أو ظلمًا، ان علم ذٰلک بعینه لا یحل لهٗ اخذه والّا فله أخذهٗ حکمًا اما فی الدیانة فیتصدق به بنیة ارضاء الخصماء. اھ نیز دیکھئے ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت اور مزید تفصیل اور حوالہ جات کے لئے ص:۱۲۰ و۱۲۱ کے حواشی اور ص:۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمایئے۔

(۴) مزید دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۵۲ (مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

ہاؤسنگ سوسائٹی سے مکان خریدنے کا حکم

سوال:- ایک شخص کے پاس مکان بنوانے کے لئے رقم نہیں ہے، کرایہ کے مکان میں رہتا ہے، کیا وہ شخص ہاؤسنگ سوسائٹی سے قرض لے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- سود پر قرض لینا تو حرام ہے،(۱) البتہ جو سوسائٹی مکان فروخت کر رہی ہے اُس سے جس قیمت پر بھی معاملہ ہوجائے وہ کیا جاسکتا ہے، بالاقساط رقم ادا کرنے کی صورت میں اگر وہ مکان کی قیمت، نقد قیمت کے مقابلے میں بڑھا کر وصول کرے تو اس طرح خریدنے کی بھی گنجائش ہے۔(۲)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۱/۱۰/۱۳۹۷ھ

''این.آئی.ٹی'' یونٹ کی جدید صورتِ حال اور اس کا شرعی جائزہ

سوال:- N.I.T یونٹ جس کا شمار سرکاری تمسکات میں ہوتا ہے، اس کا شرعی حکم جاننا چاہتا ہوں، مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد کساد بازاری پیدا ہوئی تو حکومتِ پاکستان نے مذکورہ یونٹ کی تجارتی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لئے قیمت اور نفع مقرّر کردیا ہے، ایسی صورت میں نفع سود کی تعریف میں آئے گا یا نہیں؟ اور اس کو رشتہ داروں، حاجت مندوں پر خرچ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- اس نئی صورتِ حال کی بناء پر ''این.آئی.ٹی'' یونٹ کا مسئلہ مشتبہ اور قابلِ غور ہوگیا ہے، اس کے لئے ہمیں ''این.آئی.ٹی'' یونٹ کی پوری اسکیم کے مطالعے کی ضرورت ہے، لہٰذا اسمبلی کے جس ایکٹ یا حکومت کے جس گزٹ کے ذریعے یہ اسکیم جاری ہوئی ہے، براہِ کرم اس کی ایک کاپی کہیں سے فراہم کرکے ہمیں بھجوادیجئے، کیونکہ اس پر غور کرکے ہی کوئی جواب دیا جاسکتا ہے، واضح رہے کہ ''این.آئی.ٹی'' یونٹ کے پراسپکٹس جو مطبوعہ ملتے ہیں وہ ہمارے پاس موجود ہیں، مگر ان سے بات واضح نہیں ہوتی، لہٰذا اصل اسکیم جس ایکٹ یا گزٹ کی بنیاد پر جاری ہوئی، وہ کہیں سے فراہم کرکے بھیج دیجئے۔

واللہ اعلم
۲۸/۱۱/۱۳۹۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۷۳۰ و)

---

(۱) دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔
(۲) حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص:۱۱۵ اور ص:۳۱۰ کا حاشیہ۔

''این.آئی.ٹی'' کے کاروبار اور اس کے یونٹ خریدنے کا تفصیلی حکم

سوال:- آپ کا خط مؤرخہ ۱۷/۳/۱۳۹۸ء آج موصول ہوا، آپ کا خط پڑھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، غالباً پچھلے خط میں اپنا مافی الضمیر میں آپ کو واضح طور پر بتلا نہیں سکا۔

آپ کی مایہ ناز تصنیف میں مجھے یہ بات محلِ نظر معلوم ہوئی کہ آپ نے N.I.T کاروبار کو جائز کہا ہے، اس ضمن میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بھی گورنمنٹ کنٹرول میں ایک اِدارہ ہے، جس کا کاروبار یہ ہے کہ سرمایہ کمپنیوں کے حصص کی خریداری میں لگاتے ہیں اور گورنمنٹ کے سودی کاروبار میں اس طرح جو منافع اور سود حاصل ہوتا ہے اس کو ایک خاص طریقے سے تقسیم کردیتے ہیں، اصل سرمایہ محفوظ اور سرمایہ پر منافع کی گارنٹی ہوتی ہے۔

آپ کی طرف سے وضاحت یہ ہوتی کہ بہرحال یہ سود نہیں ہے اور جائز ہے، تو میں مان لیتا یا آپ یہ کہتے کہ یہ ناجائز ہے۔

آپ نے جو خط لکھا اس سے جو صورتِ حال بنتی ہے وہ یہ ہے:-

بقول آپ کے اُس وقت N.I.T میں نفع کی کوئی ضمانت نہ تھی، بلکہ یہ اصول تھا کہ یونٹ لینے والا کاروبار کے نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوگا، اُس وقت یہ کاروبار بلاشبہ جائز تھا۔ نفع و نقصان میں شرکت محض بہکانے کے لئے تھی، اُس وقت بھی ۱-حکومت کا اس میں حصہ تھا، ۲-اس رقم سے جو اس اِدارے میں جمع ہوتی تھی سود وغیرہ کا غیرشرعی کاروبار کیا جاتا تھا۔

ان دونوں شقوں کے ہوتے ہوئے اَب اس کاروبار کو ''بلاشبہ جائز'' قرار دے رہے ہیں، دوبارہ غور فرمالیں۔

جب گورنمنٹ پبلک کو یہ اطمینان دِلانے کے لئے کہ ان کو ڈھائی فیصد سود کم سے کم ضرور ملے گا تاکہ لوگ اس میں روپیہ لگائیں، آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ یونٹ خریدنے پر اِنکم ٹیکس میں چھوٹ مل جاتی ہے۔

اُس وقت کا ذکر کرکے آپ لکھتے ہیں:-

''اس کے شرعی جواز میں تردّد پیدا ہوگیا، لیکن بعد میں علماء کی ایک مجلس میں یہ مسئلہ زیرِ غور آیا تو اس اِدارے کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم کیا گیا، معلوم ہوا کہ یہ اِدارہ خالص نجی شعبے سے تعلق رکھتا ہے، حکومت نے اس کے کچھ حصے ضرور لئے ہیں مگر ان کا تناسب مجموعے کے مقابلے میں بہت کم ہے، اس لئے علماء اور اہلِ فتویٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ کاروبار چند شرائط کے ساتھ جائز ہوسکتا ہے: ۱-حکومت

کا اس میں حصہ نہ ہو، ۲-اس رقم سے جو اِدارے میں جمع ہوتی ہے سود وغیرہ کا کوئی غیر شرعی کاروبار نہ کیا جائے، بلکہ تجارت کی جائے۔ ان دو شرطوں کی موجودگی میں اگر حکومت فریقِ ثالث کی حیثیت سے ڈھائی فیصد منافع کی ضمانت دیدے تو یہ سود نہیں ہوگا۔''

آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ کیا حکومت نے یہ دو شرائط مان لی ہیں، اور یہ کاروبار شرعی ہوگیا یا حکومت نے یہ شرائط نہیں مانیں اور یہ کاروبار غیر شرعی ہے۔ ظاہر ہے کہ نہیں مانیں تو پھر اس کو غیر شرعی ماننے میں آپ کو کیا تکلف ہے؟

یہ بھی عجوبہ ہے کہ ایک طرف تو آپ حکومت کو اس میں حصہ نہ لینے کو کہتے ہیں اور دُوسری طرف اس کو فریقِ ثالث بناتے ہیں۔

اس کو بجائے "Private Sector" کے گورنمنٹ کنٹرول میں کہنے کی کیا آپ کوئی مثال دے سکیں گے "Private Sector" میں کاروبار کرنے والے اِدارے کا سربراہ گورنمنٹ مقرّر کرتی ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ چند سال پیشتر اس کے سربراہ قرنی C.SP آفیسر تھے۔

زید اور عمر کے مشترکہ کاروبار کی جو مثال آپ نے دی وہ N.I.T پر منطبق نہیں ہوتی، کیونکہ اس میں شراکت کا سوال ہی نہیں ہے، N.I.T اپنے یونٹ بیچتی ہے، اس کی قیمتِ خرید اور فروخت مقرّر کرتی ہے، اس میں شراکت کا کوئی مفہوم ہے ہی نہیں، قرض لیتا اور سود اَدا کرتا ہے۔

آپ عالم ہیں، میں آپ کی بات مانے لیتا ہوں، کہ ایک آدمی دُوسرے کا روپیہ لے کر اپنی تجارت میں لگائے اور اس کو یقین دِلائے کہ تمہارا سرمایہ محفوظ رہے گا، نقصان میں تم شریک نہیں ہو، منافع میں البتہ شریک ہو۔ میں نے سود کے متعلق جو پڑھا ہے وہ تو یہی ہے کہ اگر نفع و نقصان میں شریک ہے تو یہ جائز ہے، اور اگر صرف نفع میں شریک ہے، اس کی شکل کچھ بھی ہو تو سود ہے۔

اگر زحمت نہ ہو تو میرے سوال کا جواب دیں، جو یہ ہے کہ کیا N.I.T کاروبار میں روپیہ لگانا جائز ہے؟ میرے خیال میں یہ سود ہے اور ناجائز ہے۔

جواب:-

این.آئی.ٹی یونٹ میں جب تک حکومت نے ڈھائی فیصد نفع کی ضمانت نہیں دی تھی، اس وقت تک تو اس کاروبار کی اصل نوعیت شریعت کے مطابق تھی، لیکن جب سے حکومت نے ڈھائی فیصد نفع کی ضمانت دی ہے، اُس وقت سے یہ شبہ پیدا ہوگیا ہے کہ اوّل تو شرکت و مضاربت میں ہونے والا نفع حاصل نہ ہوجائے وہ کوئی حقِ واجب نہیں ہوتا، اور ضمانت یا کفالت کی صحت کے لئے شرط یہ ہے کہ حقِ مضمون حقِ واجب ہو، لما فی العالمگیریة: ''ولا تجوز الکفالة بالأمانات کالودائع وأموال

المضاربات والشركات لأن هٰذه الأشياء غير مضمونة لا عينها ولا تسليمها." (ہندیہ ج:۳ ص:۲۵۴)۔[1]

وفي الفتاوىٰ الانقروية: "وفيما كان أمانة فان كان غير واجب التسليم كالوديعة ومال المضاربة والشركة لا تجوز الكفالة بتسليمه" (الفتاویٰ الانقرویۃ ج:۱ ص:۳۱۸)۔[2]

وفي فتح القدير: "وضمان الخسران باطل، لأن الضمان لا يكون إلّا بمضمون، والخسران غير مضمون علىٰ أحد، حتّى لو قال: بايع في السوق علىٰ أنّ كل خسران يلحقك فعلَيّ، أو قال لمشترى العبد ان أبق عبدك هٰذا فعلَيّ، لا يصح" (فتح القدیر ج:۵ ص:۴۲۴)۔[3]

وهٰذا الأصل مسلّم عند الفقهاء الأربعة راجع المجموع شرح المهذب[4] ج:۱۳ ص:۴۵۹، والمقنع لابن قدامة ج:۲ ص:۱۱۵،[5] والشرح الصغير علىٰ أقرب المسالك ج:۳ ص:۴۳۲۔[6]

لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی کفالت اگر فریقِ ثالث کی طرف سے ہو تو اُس کے صحیح نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ قضاءً نافذ نہیں ہوگی، لیکن اگر دو آدمی عقد کر رہے ہوں اور تیسرا شخص ان میں سے کسی سے یہ وعدہ کرلے کہ اگر تمہیں کوئی نقصان ہوا یا نفع نہ ہوا تو میں اس کی تلافی کروں گا، تو ایک وعدے کی حیثیت سے اس میں کوئی حرج نہیں، اور اَخلاقاً و دیانۃً اس پر اس وعدے کا ایفاء لازم ہوگا، اِلَّا یہ کہ کوئی عذرِ شرعی پیش آجائے، چنانچہ جب وہ اپنے اس وعدے کا ایفاء کرے تو لینے والے کے لئے اس کا لینا جائز ہوگا۔

لہٰذا حکومت اگر فریقِ ثالث کی حیثیت میں ڈھائی فیصد نفع کی ضمانت دے رہی ہے تو یہ قانونِ ضمانت کے طور پر تو دُرست نہیں ہے، لیکن وعدے کے طور پر دُرست ہے، جس کے ایفاء پر

---

(۱) (طبع رشیدیہ کوئٹہ)، وفي فتح القدير ج:۶ ص:۳۱۲ (طبع رشيديه) .... ولا بما كان أمانة كالوديعة والمستعار والمستأجر ومال المضاربة والشركة ...الخ.

وفيه تحته: الكفالة بأمانة غير واجب التسليم كالوديعة ومال المضاربة والشركة لا تصحّ أصلًا .... الخ.

(۲) طبع قديم.

(۳) فتح القدير كتاب الكفالة ج:۶ ص:۳۲۳ (طبع رشيديه كوئٹه).

(۴) وفي كتاب المجموع شرح المهذب للشيرازي كتاب الضّمان ج:۱۳ ص:۱۲۲ (طبع دار احياء التراث العربي، بيروت، لبنان) ويشترط في المال المكفول به أن يكون دينًا فلا تصحّ الكفالة في الأمانات كالعين المستعارة والعين المودعة وكذا مال المضاربة والشركة فاذا استعار أحد سلعة من آخر واتى له بضامن يضمنه في ردّ تلك السلعة فانّهٗ لا تصحّ، وكذا اذا أودع عند آخر وديعة أو مالا يعمل به مضاربة ....الخ.

وفيه أيضًا ج:۱۳ ص:۱۲۲ (طبع مذكور) القسم الرّابع يرجع الى المضمون به سواء كان دينًا أو عينًا أو نفسًا فيشترط في الدّين أن يكون لازمًا في الحال أو المال ومثال الدّين اللّازم في الحال القرض، وثمن السلعة المبيعة ونحو ذلك ....الخ.

(۵) طبع المطبعة السلفية.

(۶) طبع دار المعارف مصر.

حکومت کو قضاءً مجبور تو نہ کیا جاسکے گا لیکن اگر وہ ایفاء کرے تو یونٹ ہولڈر کو اس کا لینا جائز ہونا چاہئے۔

البتہ اس پر یہ اِشکال ہوسکتا ہے کہ صورتِ مسئولہ میں حکومت فریقِ ثالث نہیں ہوتی بلکہ کاروبار میں شریک ہے، کیونکہ این.آئی.ٹی کے کاروبار میں حکومت کا بھی حصہ ہے، لہٰذا وہ مضمون لہم سے خود ہی عقدِ مضاربت کر رہی ہے اور خود ہی نفع کی ضمانت دے رہی ہے، تو یہ عقد رِبا ہوجائے گا۔

لیکن غور کرنے سے اس شبہ کا بھی جواب مل جاتا ہے، اور وہ یہ کہ این.آئی.ٹی کا پورا اِدارہ یونٹ ہولڈروں کے لئے مضارب ہوتا ہے اور اس اِدارے میں بہت سے ارکان شریک ہیں، جن میں سے ایک رُکن حکومت بھی ہے، لہٰذا مضارب کوئی ایک رُکن نہیں بلکہ ارکانِ اِدارہ کی پوری جماعت ہے، اور ضمانت دینے والی صرف حکومت ہے جو اس اِدارے کی محض ایک رُکن ہے، لہٰذا اس کو یوں نہیں کہا جاسکتا کہ مضارب نے نفع کی ضمانت دی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مضاربین کی جماعت میں سے صرف ایک رُکن نے اپنی شخصی حیثیت میں ضمانت دی ہے، اس کا حکم فریقِ ثالث ہی کی ضمانت کا ہوگا۔

اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ مضاربین کی اس جماعت کے تمام ارکان اس کاروبار میں ایک دُوسرے کے لئے شریک کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر شریک دُوسرے کا وکیل ہوتا ہے، اس لئے ایک شریک کا فعل تمام شرکاء کی طرف منسوب ہوگا، اس کا جواب یہ ہے کہ شریک کا وہ فعل تمام شرکاء کی طرف منسوب ہوتا ہے جو وہ بحیثیت شریک کرے، اور یہاں حکومت بحیثیتِ شریک ضمانت نہیں دے رہی ہے بلکہ وہ اپنی شخصی حیثیت میں یہ ضمانت دے رہی ہے، اس لئے اس کا یہ فعل تمام شرکاء کی طرف منسوب نہ ہوگا، اور اس کو یہ نہ کہیں گے کہ یہ ضمانت مضارب نے دی ہے، کیونکہ مضارب تنہا حکومت نہیں، بلکہ ارکانِ اِدارہ کی جماعت من حیث المجموع ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حکومت نے ڈھائی فیصد کی ضمانت دی ہے، وہ شرعاً کفالت کی شرائط پر پوری نہیں اُترتی، لہٰذا قضاءً اس کا ایفاء حکومت پر لازم نہیں، البتہ یہ ایک وعدہ ہے، اور اگر حکومت اس کا ایفاء کرے تو یونٹ ہولڈروں کے لئے اس کا لینا جائز ہوگا۔

البتہ چونکہ مذکورہ مسئلے کی کوئی صراحت فقہاء کے کلام میں نہیں ہے، بلکہ مذکورہ بالا حکم قواعد کی بنیاد پر لکھا گیا ہے، اور اس میں صورۃً سود کی مشابہت پائی جاتی ہے، اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ جب این.آئی.ٹی کے کاروبار میں نفع نہ ہوا ہو اور حکومت نے اپنے پاس سے اس کی تلافی کی ہو تو یہ تلافی کی رقم یا تو وصول نہ کی جائے یا اُس کا صدقہ کردیا جائے، کیونکہ اگر بالفرض حکومت کی یہ ضمانت بحیثیتِ وعدہ بھی فاسد ہو اور اس کا لینا حلال نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ یہ ضمانت ہی فاسد ہوگی، اس سے

این.آئی.ٹی کے ساتھ کیا ہوا اصل عقد باطل نہ ہوگا۔ لما فی البدائع: "وکذٰلک لو شرط علیہ أن الوضیعة علیّ وعلیک فھٰذہ مضاربة والربح بینھما والوضیعة علی ربّ المال لأن شرط الوضیعة علی المضارب شرط فاسد، فیبطل الشرط وتبقی المضاربة." (بدائع الصنائع ج:۶ ص:۸۰)۔[۱]

البتہ یہ تمام تفصیل اس صورت میں ہے جبکہ این.آئی.ٹی کا اِدارہ رقمیں وصول کرکے انہیں کسی جائز کاروبار میں لگاتا ہو، لیکن معلوم ہوا ہے کہ اس اِدارے کی بعض رُقوم سودی قرض دینے پر بھی لگائی جاتی ہیں، اور سودی کاروبار کا تناسب مجموعی کاروبار میں مختلف سالوں میں گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، لہٰذا مذکورہ جواز اس صورت میں ہوگا جبکہ اِدارے کا اکثر سرمایہ جائز کاروبار میں لگایا جاتا ہو، اور اگر کسی سال یہ معلوم ہوجائے کہ اکثر سرمایہ سودی قرضوں یا کسی اور حرام کاروبار میں لگا ہوا تھا تو اس صورت میں یونٹ کا نفع حاصل کرنا جائز نہ ہوگا، اور جس صورت میں اکثر سرمایہ جائز کاروبار میں لگا ہو اور کچھ حصہ ناجائز کاروبار میں لگا ہو تو اس وقت بھی یونٹ ہولڈر کو چاہئے کہ یونٹ خریدتے وقت اِدارے کو یہ لکھ دے کہ اس کی رقم سودی کاروبار میں نہ لگائی جائے، پھر اگر اِدارہ لگائے گا تو اس لگانے کا وہ خود ذمہ دار ہوگا، یونٹ خریدنے والے پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ امداد الفتاویٰ میں کمپنیوں کے شیئرز کے بارے میں یہی طریقہ لکھا ہے (امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۴۹۱)۔

خلاصہ:- یہ کہ یونٹ خریدنا اس شرط سے جائز ہے کہ کاروبار کی رقم کا اکثر حصہ حرام کاروبار میں نہ لگا ہوا ہو، اس شرط کی موجودگی میں اگر کاروبار میں واقعۃً ڈھائی فیصد سے زیادہ نفع ہوا ہو تو وہ نفع وصول کرنا بلاشبہ جائز ہے، البتہ جس صورت میں کاروبار کو ڈھائی فیصد سے کم نفع ہوا ہو، اور حکومت نے تلافی کے طور پر اپنے پاس سے رقم ادا کرکے ڈھائی فیصد نفع پورا کیا ہو، تو جتنی رقم حکومت نے ادا کی ہے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ وصول نہ کی جائے، تاہم اس صورت میں بھی پورا نفع لینے کی گنجائش ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
محمد تقی عثمانی
۱۳۹۸/۴/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۵۳۹ ب)

ولی حسن	عبدالرزّاق اسکندر	رشید احمد عفا اللہ عنہ
دارالافتاء مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی	۱۳۹۸/۴/۱۲ھ	۱۳۹۸/۴/۱۲ھ

---

(۱) (طبع سعید).

''این.آئی.ٹی'' کا جدید حکم (تفصیلی فتویٰ)

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے ''این.آئی.ٹی'' یونٹ خرید کر کسی دِینی ادارے کو دیئے ہیں اور اس کا منافع بھی اسی دِینی ادارے کو دیتا ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا یہ منافع جائز ہے یا ناجائز؟ براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جواز یا عدمِ جواز ثابت کر کے وضاحت فرمائیں۔

جواب:- **الحمد لله و کفٰی وسلام علٰی عباده الذین اصطفٰی، أمّا بعد!**

نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ (این.آئی.ٹی) کے نام سے سرمایہ کاری کا ایک ادارہ عرصۂ دراز سے ملک میں قائم ہے، ابتداء میں اس کا طریقِ کار سودی قسم کا تھا، لیکن ۱۹۷۹ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش کے مطابق حکومت کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ اس ادارے سے سود کا عنصر ختم کر کے اُسے اسلامی اَحکام کے مطابق چلایا جائے، اسلامی نظریاتی کونسل نے اس کے لئے متبادل طریقِ کار بھی تجویز کردیا تھا۔

چنانچہ ۱۹۷۹ء کے بعد اس ادارے کے طریقِ کار میں تبدیلی لائی گئی، حکومت نے اس میں سے اپنے حصے واپس لے لئے، اور اس ادارے نے جن غیرشرعی کمپنیوں کے حصص خرید رکھے تھے، رفتہ رفتہ وہاں سے رقمیں نکال کر ایسی کمپنیوں کے حصص خریدے جن کا کاروبار بنیادی طور پر جائز ہے، یہاں تک کہ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ ادارے کے ذمہ دار حضرات سے ممکنہ تحقیق کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ اس ادارے کا بنیادی کام ایسی کمپنیوں کے حصص خریدنا اور ان سے منافع حاصل کرنا ہے، جن کا کاروبار بنیادی طور پر جائز ہے۔ چنانچہ اس تحقیق کے بعد ہم نے یہ فتویٰ دیا کہ اس ادارے کے یونٹ خریدنا بھی جائز ہے، اور ان یونٹوں پر ملنے والا نفع بھی حلال ہے، البتہ ساتھ ہی مستفتی حضرات سے یہ بھی کہہ دیا جاتا تھا کہ وہ ہر سال کی بیلنس شیٹ کے ذریعے اس بات کا اطمینان بھی کرلیا کریں کہ کسی غیرشرعی کاروبار کے حصص تو اس میں شامل نہیں ہوئے۔

لیکن کچھ عرصہ پہلے احقر کو معلوم ہوا کہ ''این.آئی.ٹی'' نے کمپنیوں کے حصص خریدنے کے علاوہ ''مارک اَپ''، ''پی ٹی سی'' اور ''ٹی ایف سی'' کی بنیاد پر براہِ راست بھی کاروباری افراد کو سرمایہ فراہم کرنا شروع کردیا ہے، چونکہ ''مارک اَپ''، ''پی ٹی سی'' اور ''ٹی ایف سی'' کے تحت سرمائے کی

فراہمی کا شرعی حکم ان کا تفصیلی طریقِ کار معلوم ہونے پر موقوف تھا، اور ہمارے ملک میں ان ناموں سے سراسر غیر شرعی کاروبار بھی ہوتا رہا ہے، اس لئے احقر نے اس اطلاع کے بعد ''این آئی ٹی'' کے بارے میں آئے ہوئے تمام سوالات روک لئے، اور مستفتی حضرات کو لکھ دیا گیا کہ اب اس ادارے کے طریقِ کار میں بعض تبدیلیوں کا علم ہوا ہے، جن کی تحقیق کی جارہی ہے، لہٰذا تحقیق ہونے تک ہم جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتے، تحقیق کے بعد جو صورتِ حال واضح ہوگی، اس کے بعد ان شاء اللہ جواب دیا جائے گا۔

اس دوران احقر نے ''این آئی ٹی'' کے سربراہ سے مل کر مذکورہ طریقہ ہائے تمویل کی پوری حقیقت اور تفصیل معلوم کرنے کی کوشش کی، لیکن کئی بار وقت طے ہونے کے باوجود کبھی احقر کے کسی سفر یا مصروفیت کی بناء پر اور کبھی ان کے کسی عذر کی بناء پر یہ ملاقات نہ ہوسکی۔

اب کچھ عرصہ پہلے احقر کو ''این آئی ٹی'' کے دفتر میں جاکر ان کا طریقِ کار دیکھنے اور ان کے معاملات کی حقیقت جاننے کا موقع ملا، اس تحقیق کے نتیجے میں یہ بات واضح ہوئی کہ ''مارک اَپ''، ''پی ٹی سی'' اور ''ٹی ایف سی'' کے ناموں سے جو سرمایہ فراہم کیا جارہا ہے، وہ شرعی اعتبار سے یقینی طور پر ناجائز ہے اور اس کو کسی تأویل سے بھی حلال نہیں کہا جاسکتا۔ ''مارک اَپ'' کا اصل تصوّر یہ تھا (اور اسٹیٹ بینک کے ہدایت نامے میں بھی اسی کا ذکر ہے) کہ ادارہ کوئی سامان خرید کر اُسے نفع پر فروخت کرے گا، لیکن عملاً دُوسرے بینکوں کی طرح ''این آئی ٹی'' بھی کوئی سامان خرید کر بیچنے کے بجائے براہِ راست کاروباری افراد کو رقمیں مہیا کرتا ہے، اور وہ اس رقم سے جو چیزیں چاہیں خریدتے ہیں، اور محض کاغذی طور پر یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ وہ چیزیں ''این آئی ٹی'' نے ان کو نفع پر فروخت کی ہیں، حالانکہ ''این آئی ٹی'' کو ان خرید کردہ اشیاء کی مقدار وغیرہ کا علم تک نہیں ہوتا، چہ جائیکہ وہ اشیاء ان کی ملک یا قبضے میں آئیں۔ لہٰذا یہ طریقِ کار شرعاً بلاشبہ سود ہے، اور سود کا نام ''مارک اَپ'' رکھ لینے یا اس کاغذی کارروائی سے معاملے کی حقیقت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، تقریباً یہی صورت ''ٹی ایف سی'' میں ہے۔

جہاں تک ''پی ٹی سی'' (پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ) کا تعلق ہے، اصلاً یہ معاملہ شرکت یا مضاربت کی بنیاد پر ہونا چاہئے تھا، اور اس کا اصل تصوّر یہی تھا، لیکن موجودہ طریقِ کار کے تحت ان میں بہت سی شرائط خلافِ شریعت ہیں، جن کی وجہ سے یہ معاملہ بھی شریعت کے مطابق نہیں رہا، اور اب ادارے نے رفتہ رفتہ ''پی ٹی سی'' کو بھی ''ٹی ایف سی'' میں تبدیل کرنا شروع کردیا ہے۔ لہٰذا خلاصہ یہ

ہے کہ ''مارک اَپ''، ''پی ٹی سی'' اور ''ٹی ایف سی'' کے نام سے جو کاروبار یہ ادارہ کر رہا ہے وہ شریعت کے بالکل خلاف ہے اور اس سے حاصل ہونے والا نفع حرام ہے۔

اس کے بعد ادارے کی بیلنس شیٹ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادارے کی سرمایہ کاری کا بہت بڑا حصہ انہی تین مدات میں صَرف کیا جارہا ہے، جس کی تفصیل جون ۱۹۸۶ء کی پوزیشن کے مطابق یہ ہے:-

مارک اَپ:-	۱۶ء۲۲
پی ٹی سی:-	۲ء۵۴ فیصد
ٹی ایف سی:-	ء۹۵

اس کے علاوہ بینکوں اور سودی مالیاتی اداروں کے حصص میں بھی ادارے کی ۶۷ء۱ فی صد رقم جمع ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''این.آئی.ٹی'' اپنی رقموں کا ۳۸ء۲۱ فیصد حصہ ان ناجائز کاموں میں لگا رہا ہے۔ مزید ۲۸ء۲ فیصد سرمایہ کاری ''آئی سی پی'' کے میوچول فنڈ میں ہو رہی ہے، جس کی بیلنس شیٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں بینکوں کے حصص میں بھی سرمایہ کاری کی گئی ہے، اس طرح سرمایہ کاری کی ۶ء۲۴ فیصد مدات ناجائز یا مشکوک ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جون ۱۹۸۷ء تک ''مارک اَپ'' پر دیئے گئے سرمائے کی شرح اور بھی بڑھ کر تقریباً اڑتیس فیصد ہوگئی۔ اور اس طرح جون ۱۹۸۷ء پر ختم ہونے والے سال میں ناجائز مدات میں لگے ہوئے سرمائے کا تناسب تقریباً ۴۶ فیصد تک پہنچ گیا۔

لہٰذا یہ معلوم ہونے کے بعد شرعی حکم یہ ہے کہ ''این.آئی.ٹی'' کے یونٹ خریدنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جن لوگوں نے سابق فتوے یا ادارے کے اعلانات کے مطابق ''این.آئی.ٹی'' یونٹ جائز سمجھ کر خرید رکھے ہیں، اور ان پر انہیں سالانہ منافع (Divident) بھی تقسیم کیا گیا ہے، ان کے لئے اس منافع کا کیا حکم ہے؟

سو اس کا جواب یہ ہے کہ احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ ادارے سے یہ بات معلوم کرلی جائے کہ اس کے سالانہ کل منافع میں سے کتنے فیصد منافع ان تین مدات میں سے حاصل ہوا ہے، پھر اپنے منافع (Divident) کا اُتنا ہی فیصد حصہ کسی مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کردیا جائے۔

واضح رہے کہ یہ رقم باپ، بیٹے، یا شوہر یا بیوی کو دی جاسکتی ہے، بشرطیکہ یہ سب مستحقِ زکوٰۃ ہوں۔ مثلاً ادارے سے یہ معلوم ہوا کہ کل منافع کا ۳۰ فیصد حصہ ان ناجائز مدات سے حاصل ہوا تھا، اب یونٹ ہولڈر اپنے منافع میں سے ۳۰ فیصد رقم صدقہ کردے۔ جون ۱۹۸۷ء میں ختم ہونے والے مالی سال میں احقر کا محتاط اندازہ یہ ہے کہ ادارے کے منافع کا ۳۰ فیصد حصہ شرعی اعتبار سے ناجائز ذرائع سے حاصل ہوا ہے، لہٰذا ہر یونٹ ہولڈر اپنے منافع کا ۳۰ فیصد حصہ صدقہ کردے۔

لیکن چونکہ ابھی تک ''این آئی ٹی'' کے منافع کا اکثر حصہ جائز حصص کے ذریعے حاصل ہورہا ہے اور جائز منافع کی مقدار ناجائز منافع کے مقابلے میں زیادہ ہے، اس لئے جن لوگوں نے ''این آئی ٹی'' کے اعلانات پر اعتماد کرتے ہوئے ''این آئی ٹی'' کو جائز کاروبار سمجھ کر اس میں روپیہ لگادیا تھا، ان کی طرف سے ادارے کو ناجائز کاروبار میں سرمایہ کاری کی اجازت نہیں تھی، ان کے لئے اب تک جو منافع ملا ہے وہ پورا اپنے استعمال میں لانے کی بھی گنجائش ہے، کیونکہ مذکورہ صورت میں ناجائز کاروبار کے ذمہ دار ''این آئی ٹی'' کے منتظمین ہیں، البتہ آئندہ ان کو چاہئے کہ وہ اپنی لگائی ہوئی رقمیں واپس لے لیں۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

اذا دفع المسلم الی النصرانی مالًا مضاربة بالنصف فهو جائز (أی فی القضاء کما صرّح به فی امداد الفتاویٰ عن المبسوط ج:۳ ص:۴۲۱). الّا انه مکروه فان اتّجر فی الخمر والخنزیر فربح جاز علی المضاربة فی قول أبی حنیفةؒ وینبغی للمسلم أن یتصدق بحصته من الربح وعندهما ..... لا یجوز علی المضاربة ..... وان أربیٰ فاشتری درهمین بدرهم کان البیع فاسدًا. ولٰکن لا یصیر ضامنًا لمال المضاربة والربح بینهما علی الشرط. (عالمگیریة ج:۴ ص:۳۳۳ کتاب المضاربة باب:۲۲)[1]

حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اس عبارت کے تحت فرماتے ہیں:-

قلنا: قوله ینبغی للمسلم أن یتصدق بحصته محمول علی الورع کما هو الظاهر وان حمل علی الوجوب فهو اذا کان قد اتّجر فی الخمر والخنزیر ولم یتّجر فی غیرهما والّا فحمله ما سیجیٔ فی المخلوط.

---

(۱) (طبع رشیدیة).

اس کے بعد حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے مالِ مخلوط کے اَحکام فتاویٰ قاضی خان سے نقل کئے ہیں، جس میں یہ جزئیہ بھی ہے کہ:-

لو أن فقيرًا يأخذ جائزة السلطان مع علمه ان السلطان يأخذها غصبًا أيحل له ذٰلک؟ قال: ان کان السلطان خلط الدراهم بعضها ببعض فانه لا بأس به، وان وضع عين الغصب من غير خلط لم يجز أخذه، قال الفقيه ابو الليث: هذا الجواب يستقيم علىٰ قول أبي حنيفةؒ لأن عنده اذا غصب الدراهم من قوم وخلط بعضها ببعض يملكها الغاصب امّا علىٰ أبي يوسف ومحمد رحمهما الله انه لا يملكها الغاصب ويكون علىٰ ملک صاحبها.

(قاضي خان ج:۴ ص:۳۶۳ و ۳۶۴)[1]

اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:-

فاذا خلط الوكيل دراهم الربا ببعض الدراهم الّتي أخذها من حلال يجوز أخذ الربح منهما لكون الخلط مستهلكًا عند الامام لا سيّما اذا كان الوكيل كافرًا، لا سيّما والتقسيم مطهر عندنا كما اذا بال البقر في الحنطة وقت الدّياسة فاقتسمها الملاک حلّ لكل واحد أكلها مع التيقن بكون الحنطة مختلطة بالطاهر والنجس، ولكن القسمة أورثت احتمالًا في حصة كل واحد من الشركاء فحكمنا بطهارة نصيب كل واحد منهم فكذا ههنا اذا أربى الوكيل بالتّجارة وخلط الدراهم بعضها ببعض ثم قسمها على الشركاء يحكم بحل نصيب كل واحد منهم والله تعالىٰ أعلم.

(امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۴۲۳، رساله "القصص السنّی")[2]

ان عبارات سے مذکورہ بالا حکم واضح ہوجاتا ہے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ یہ حکم ''این.آئی.ٹی'' کے موجودہ طریقِ کار پر مبنی ہے، ''این.آئی.ٹی'' کے ذمہ دار حضرات کے ساتھ مل کر یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ادارے سے ناجائز سرمایہ کاری کا حصہ بالکل ختم کردیا جائے، اگر یہ کوشش کامیاب ہوئی اور حالات تبدیل ہوگئے تو حکم بھی بدل سکتا ہے، ایسی

---

(۱) المطبع العالي الواقع في لكنو.

(۲) ج:۳ ص:۴۸۶ (طبع جديد جمادى الاولىٰ ۱۴۲۴ھ طبع مكتبه دارالعلوم كراچى).

صورت میں اِن شاء اللہ پھر اعلان کر دیا جائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم بالصواب
وإلیه المرجع والمآب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۰۸/۶/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۲۶/۲۹ د)

الجواب صحیح
سحبان محمود

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح
رشید احمد، دار الافتاء والارشاد، ناظم آباد کراچی

الجواب صحیح
بندہ عبدالرؤف سکھروی

الجواب صحیح
بندہ محمد عبداللہ عفی عنہ

''این. آئی. ٹی'' کی نئی صورتِ حال

(وضاحت از مرتب)

حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کے مذکورہ فتویٰ میں این آئی ٹی میں سرمایہ کاری کے عدمِ جواز کے ساتھ ساتھ ان کے ذمہ داروں سے بات چیت کرنے کا بھی ذکر کیا گیا تھا، چنانچہ مذکورہ فتویٰ کے بعد اکابر علماء کی طرف سے مسلسل بات چیت جاری رہنے کے بعد صورتِ حال میں تبدیلی واقع ہوئی تو حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ نے پھر نئی صورتِ حال کے مطابق حکم تحریر فرمایا جو''البلاغ'' کے اداریہ میں شائع ہوا، این آئی ٹی میں چونکہ مسلسل تبدیلیاں آتی رہیں اس لئے ترتیبِ زمانی کے اعتبار سے اس کے اَحکام اور پورے تسلسل کو سمجھنے کے لئے ذیل میں ''البلاغ'' کا وہ اداریہ پیش کیا جارہا ہے جو حضرتِ والا دامت برکاتہم نے مذکورہ فتویٰ کے بعد تحریر فرمایا اور ''البلاغ'' کے شمارہ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ میں شائع ہوا۔

''البلاغ'' کے رجب المرجب ۱۴۰۸ھ - مارچ ۱۹۸۸ء کے شمارے میں نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ (این آئی ٹی) کے کاروبار کے سلسلے میں ایک تحریر شائع ہوئی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس اِدارے میں سرمائے کا ایک بڑا حصہ ایسی مدات میں لگا ہوا ہے جن کی آمدنی شرعی اِعتبار سے دُرست نہیں ہے، لہٰذا اس کا شرعی حکم یہ بتایا گیا تھا کہ بحالاتِ موجودہ این آئی ٹی یونٹ خریدنا جائز نہیں ہے۔ اور جن لوگوں نے پہلے یونٹ خرید رکھے تھے، ان کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ ان پر حاصل ہونے والے منافع کا تیس فی صد بغیر نیتِ ثواب کے صدقہ کردیں۔

اس فتوے کی اِشاعت کے ساتھ ساتھ آخر میں یہ بھی عرض کردیا گیا تھا کہ این آئی ٹی کے ذمہ دار حضرات سے گفت وشنید کرکے کاروبار کی اِصلاح کی کوشش جاری ہے، اور اگر صورتِ حال میں کوئی تبدیلی ہوئی تو اِن شاء اللہ دوبارہ اِعلان کردیا جائے گا۔

چنانچہ اس کے بعد این آئی ٹی کے ذمہ دار حضرات سے گفتگو اور باہمی مشورے کا سلسلہ جاری

رہا، بفضلہٖ تعالیٰ ان حضرات نے اِدارے کو غیرشرعی سرمایہ کاری سے پاک کرنے کے لئے ہماری تجاویز کا نہ صرف خیرمقدم کیا، بلکہ اس سلسلے میں عملی تعاون کا ثبوت دیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً دس ماہ کی کوشش کے بعد بحمداللہ اِدارے کے طریقِ کار میں مناسب تبدیلیاں کی گئی ہیں، اِدارے کی طرف سے کئے جانے والے تمام معاہدات پر نظرِ ثانی کر کے علماء کے مشورے سے ان کو شریعت کے مطابق بنایا گیا ہے، اور اس طرح ایک مرتبہ پھر این آئی ٹی کی نئی صورتِ حال کا شرعی حکم بیان کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اپنی سابقہ تحریر میں عرض کیا تھا، این آئی ٹی کی سرمایہ کاری جن ناجائز مدات میں ہو رہی تھی، ان کا بیشتر حصہ مارک اَپ، پی ٹی سی (Participation Term Certificate) اور ٹی ایف سی (Term Finance Certificate) پر مشتمل تھا۔

ان تین مدات میں سے اب این آئی ٹی نے پی ٹی سی کا طریقِ کار تو بالکل ختم ہی کر دیا ہے اور مارک اَپ اور ٹی ایف سی کے طریقِ کار کو ختم کر کے ان دونوں کو ''مرابحۂ مؤجلہ'' میں تبدیل کر دیا ہے۔

سابق طریقِ کار اور نئے طریقِ کار میں فرق یہ ہے کہ پہلے جس کسی شخص یا اِدارے کو پیداواری قرض دیا جاتا تھا، اس کو این آئی ٹی کی طرف سے مارک اَپ پر روپیہ فراہم کیا جاتا تھا، لیکن صرف تعبیر کی حد تک یہ کہا جاتا تھا کہ این آئی ٹی کی طرف سے وہ سامان نفع پر فروخت کیا جارہا ہے جو قرض لینے والے کو اس رقم سے خریدنا ہے۔ حالانکہ وہ سامان نہ این آئی ٹی کی ملکیت میں آتا تھا، نہ قبضے میں، لہٰذا یہ محض ایک فرضی کارروائی تھی، اور حقیقت یہی تھی کہ روپیہ دے کر اس پر نفع وصول کیا جاتا تھا جو درحقیقت سود ہے۔ یہ وہی طریقِ کار ہے جو اس وقت ملک کے بیشتر رواجی بینکوں میں جاری ہے۔

لیکن اب ''مارک اَپ'' کی جگہ ''مرابحۂ مؤجلہ'' کا عقد کیا جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کو کوئی مال خریدنے کے لئے قرض درکار ہوتا ہے، این آئی ٹی اس کو روپیہ دینے کے بجائے وہ مال خرید کر اسے نفع پر فروخت کر دیتا ہے، اور قیمت بعد میں وصول کرتا ہے۔ اِس نئی صورت کے مطابق وہ مال پہلے این آئی ٹی کی ملکیت اور ضمان میں اس طرح داخل ہوجاتا ہے کہ اگر اسی حالت میں وہ مال ہلاک ہو تو اس کا نقصان این آئی ٹی پر ہوگا۔ اس کے بعد وہ اس کو اپنے گاہک کے ہاتھ نفع پر فروخت کرتا ہے۔ اس میں اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ وہ مال کی خریداری کے لئے گاہک ہی کو اپنا وکیل بنادے، لیکن جس وقت تک گاہک بحیثیتِ وکیل کام کرتا ہے، اس وقت تک سامان کی تمام تر ذمہ داری این آئی ٹی پر ہی ہوتی ہے، وکیل کی حیثیت سے خریداری مکمل کرنے کے بعد پھر وہ این آئی ٹی سے اس مال کی خریداری کا مستقل عقد کرتا ہے۔

''مارک اَپ'' اور ''ٹی ایف سی'' کے جملہ معاہدات کو مذکورہ بالا طریقِ کار کے مطابق تبدیل کر دیا گیا ہے، اور اس طرح یہ معاملات جوازِ شرعی کی حدود میں آگئے ہیں۔

''مرابحۂ مؤجلہ'' کے علاوہ این آئی ٹی نے ''اِجارہ'' کے معاملات بھی شروع کئے ہیں، یعنی وہ مشینری وغیرہ خرید کر اپنے گاہکوں کو طے شدہ کرایہ پر فراہم کرتا ہے، اور اس کا کرایہ وصول کرتا ہے۔ ''عقدِ اِجارہ'' کے لئے بھی مستقل معاہدات شرعی شرائط کے مطابق تیار کر لئے گئے ہیں، اور گاہکوں سے اسی کے مطابق معاہدات کئے جارہے ہیں۔

اس طرح اب این آئی ٹی کا بیشتر سرمایہ جائز تجارتی کمپنیوں کے حصص خریدنے، مرابحۂ مؤجلہ اور عقدِ اِجارہ میں لگا ہوا ہے، اور چونکہ یہ تینوں صورتیں فقہی طور پر جواز کی حدود میں آتی ہیں، اس لئے اب بیشتر سرمایہ کاری جائز طریقے سے ہونے لگی ہے۔

البتہ ایک مد ایسی ہے جسے تبدیل کرنے پر اِدارہ قادر نہیں ہوا، اور وہ یہ کہ وہ بعض اوقات اپنی رقمیں عام تجارتی بینکوں کے پی ایل ایس اکاؤنٹ میں رکھواتا ہے، اور یہ بات ''البلاغ'' کے صفحات میں بار بار لکھی جاچکی ہے کہ پی ایل ایس (یا نفع ونقصان کی شراکت) کے نام سے جو کاروبار مروّجہ بینکوں میں ہو رہا ہے، وہ شرعاً دُرست نہیں ہے، لہٰذا اس کی آمدنی شرعاً حلال نہیں ہے، این آئی ٹی اس مد سے رقمیں نکالنے پر قادر نہیں ہوسکا، لہٰذا یہ مد ابھی تک شرعاً دُرست نہیں ہے، اور اس مد سے حاصل ہونے والا منافع بھی حلال نہیں۔

لیکن اب این آئی ٹی نے اپنے یونٹ ہولڈروں کے لئے جو نئے فارم طبع کرائے ہیں اس میں ایک خانے کا اِضافہ کردیا گیا ہے جس میں یونٹ ہولڈر کو یہ کہنے کا اِختیار دیا گیا ہے کہ میں این آئی ٹی کی سرمایہ کاری کی مدات میں سے فلاں فلاں مد کی آمدنی وصول نہیں کرنا چاہتا۔ اس خانے میں اگر یہ لکھ دیا جائے کہ میں پی ایل ایس کی آمدنی وصول نہیں کرنا چاہتا تو اس صورت میں یونٹ ہولڈر کو پی ایل ایس کی آمدنی نفع میں نہیں دی جائے گی، اور صرف مذکورہ بالا تین مدات سے حاصل ہونے والی آمدنی میں سے نفع دیا جائے گا۔

این آئی ٹی کے ذمہ دار حضرات نے اس بات کا اِہتمام کرنے کا وعدہ کیا ہے کہ اگرچہ ہر شخص کی رقم کو علیحدہ رکھ کر اس کی الگ سرمایہ کاری عملاً ممکن نہیں ہے، لیکن جتنے لوگ فارم میں پی ایل ایس کی آمدنی نہ لینے کا اِعلان کریں گے ان کی مجموعی رُقوم کے برابر رقم ضرور دُوسرے مدات ہی میں لگائی جائے گی، لیکن کسی بھی وقت ایسا نہیں کیا جائے گا کہ جائز مدات میں لگی ہوئی رُقوم اس مجموعی رقم کی مقدار سے کم رہ جائیں جس کے یونٹ ہولڈروں نے پی ایل ایس کی آمدنی نہ لینے کا اِظہار واقرار کیا ہو۔

چونکہ پی ایل ایس سے حاصل ہونے والی آمدنی کا تناسب اِدارے کی مجموعی آمدنی کے مقابلے میں بہت کم ہے، اور مذکورہ فارم کے ذریعے اس آمدنی سے بچنے کا ایک راستہ بھی اِدارے کی

طرف سے فراہم کر دیا گیا ہے، اس لئے اب این آئی ٹی یونٹ کی خریداری کا شرعی حکم یہ ہے کہ:-

این آئی ٹی یونٹ میں رقم لگانا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اِدارے کی طرف سے شائع شدہ فارم میں یہ لکھ دیا جائے کہ میں پی ایل ایس سے حاصل ہونے والی آمدنی لینا نہیں چاہتا۔ اس تحریر کے بعد جو منافع اِدارے کی طرف سے ملے، اُس کو ذاتی اِستعمال میں لانا بھی جائز ہے۔

لیکن یہ وضاحت ایک مرتبہ پھر کی جاتی ہے کہ یہ حکم این آئی ٹی کے موجودہ طریقِ کار کا ہے، چونکہ اس اِدارے کا طریقِ سرمایہ کاری مختلف اوقات میں بدلتا رہا ہے، اور اِنتظامیہ اور اس کی پالیسی میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے، اس لئے آئندہ پھر طریقِ کار میں تبدیلی کا اِمکان موجود ہے۔ لہٰذا یونٹ ہولڈروں کو چاہئے کہ وہ ہر سال اِدارے کی سرمایہ کاری کی مدات کا یا تو خود جائزہ لیں، یا پھر اِدارے کی سالانہ بیلنس شیٹ بھیج کر ہر سال تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں اِستفتاء کرلیا کریں۔

احقر

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۰۹/۸/۴ھ

''این.آئی.ٹی'' کے کاروبار اور اس کے یونٹ خریدنے کا حکم

سوال:- ایسے اِدارے میں سرمایہ لگانا جو نفع کا یقین تو نہ کرتے ہوں، مگر ایک Minimum کی گارنٹی دیتے ہیں، بیشک مفروضہ یہ ہے کہ اِدارے کا کاروبار جائز ہے اور Financing اور کاروبار سود کی لعنت سے بھی بچا ہوا ہے۔ میرے ذہن میں این.آئی.ٹی کا اِدارہ ہے، گو کہ اب تو آپ کے فتوے کے مطابق این.آئی.ٹی کے کاروبار کا کچھ حصہ سودی لین دین پر مشتمل ہے، بہرحال اگر یہ صورت نہ ہوتی تو کیا N.I.T یونٹس خریدنا جائز ہوتا؟

جواب:- جو اِدارے خود کم سے کم نفع کی گارنٹی دیتے ہوں ان میں سرمایہ لگانا جائز نہیں، لیکن اگر کوئی اِدارہ ایسا ہو جس میں حکومت شریک نہ ہو، اور پھر حکومت نقصان کی تلافی یا کم سے کم شرحِ منافع اپنے پاس سے بطورِ اِمداد دینے کا وعدہ کرلے تو اس کی گنجائش ہے۔ این.آئی.ٹی میں یہی صورت ہے، اور اس کو جو سابق فتویٰ میں ناجائز کہا گیا تھا اس کی وجہ اس کے سودی کاروبار میں ملوّث ہونا تھا، لیکن اب پھر اس نے اپنے طریقِ کار میں علماء کے مشورے سے ترمیمات کی ہیں، جس کے بعد حکم بھی بدل گیا ہے، جس کی تفصیل ماہنامہ ''البلاغ'' (رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ- مئی ۱۹۸۹ء) میں شائع ہوچکی ہے، اس کو ملاحظہ فرمالیا جائے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۷۵/۴۰ و)

’’این.آئی.ٹی‘‘ میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- محترم جناب تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم۔ N.I.T کے سرٹیفکیٹ میں Investment جائز ہے یا نہیں؟ میں نے سنا ہے کہ N.I.T، Mudarba کمپنی ہے، جو صرف Equity میں Investment کرتی ہے، اور Debt میں نہیں کرتی۔ اس کے علاوہ اور کون کون سی صورتیں ہیں کہ جس میں Investment شرعاً جائز ہے؟

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

’’این.آئی.ٹی‘‘ نے بہت سے شیئرز بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کے لے رکھے ہیں، اس لئے اس میں سرمایہ کاری دُرست نہیں ہے۔[۱] والسلام

۱۴۲۱/۱۱/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۴۲/۴۶۰)

بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ اور اِنعامی بانڈز کا حکم

سوال:- میری زمین ہے جسے فروخت کر کے میں روپیہ بینک میں جمع کروانا چاہتی ہوں، چونکہ مجھے کچھ عرصے کے لئے باہر جانا ہے، واپسی تک اُس رقم پر یقیناً سود ملے گا، کیا وہ سود کی رقم کسی یتیم خانے کو دے سکتی ہوں؟ کیونکہ میں سود لینا نہیں چاہتی بلکہ گناہ سمجھتی ہوں۔ یا پھر میں نے مکان کے لئے لون لیا ہے، اُس کا سود ادا کر رہی ہوں، تو وہ سود جو میری اپنی رقم پر بینک مجھے دے گا، لے کر اُدھر لون والا سود ادا کر سکتی ہوں؟ ایسا کرنے سے مجھے سود لینے کا گناہ تو نہیں ہوگا؟ اِنعامی بانڈز خریدنا اور اِنعام لینا کیسا ہے؟

جواب:- آپ اپنا روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائیں، اس پر سود نہیں لگے گا، اور اگر غلطی سے کسی دُوسرے اکاؤنٹ میں رکھوادیا اور اُس پر سود لگ گیا تو وہ کسی مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کردیں۔[۲] اور بینک سے سودی قرض لینا جائز نہیں ہے،[۳] ایسے قرض سے جلد از جلد سبکدوش ہونے کی فکر کریں۔ اور

---

(۱) این آئی ٹی کی صورتِ حال بدلتی رہی ہے، اس لئے مختلف زمانوں میں اس کے بارے میں مختلف فتوے جاری ہوئے ہیں جن میں سے بعض پیچھے گزر چکے ہیں، آخری فتویٰ یہی ہے کہ چونکہ اس میں ناجائز سرمایہ کاری کا تناسب بہت زیادہ ہوچکا ہے، اس لئے اب اس میں سرمایہ کاری جائز نہیں ہے۔ کبھی صورتِ حال بدلے تو حکم بھی بدل سکتا ہے۔ (تقی)

(۲) دیکھئے ص:۱۲۰ و۱۲۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے دیکھئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

(۳) دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

اِنعامی بانڈز پر جو رقم بطور اِنعام ملتی ہے وہ سود اور قمار پر مشتمل ہونے کی بناء پر ناجائز ہے اور اس کا وصول کرنا حرام ہے، اگر بانڈ خرید لیا ہو تو صرف اپنی دی ہوئی اصل رقم وصول کر سکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸۹۵/ ۲۸ ج)

جبری پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والی اصل رقم پر زیادتی ''سود'' نہیں

سوال:- پراویڈنٹ فنڈ کی رقم جو کہ ملازمین کی ہر ماہ تنخواہ میں سے کاٹ کر بینک میں جمع کی جاتی ہے، اس رقم پر بینک والے سود بھی باقاعدہ لگاتے ہیں، اب بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ پراویڈنٹ فنڈ تو بہرحال جمع کروانا ہے، اور اگر بینک والے سود لگاتے ہیں تو یہ ہمارے لئے مجبوری کا باعث ہے، بینک والے سود لگاتے رہیں، ہم جب کل رقم بمع سود واپس لیں گے تو اس رقم میں سے اپنی اصلی رقم اپنے پاس رکھ لیں گے اور باقی سود کی رقم کسی کنگال اور بھوکے شخص کو دے دیں گے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب:- جبری پراویڈنٹ فنڈ کی اصل رقم پر جو زیادتی محکموں کی طرف سے دی جاتی ہے، وہ شرعاً سود نہیں ہے، اس لئے اس کا وصول کرنا جائز ہے۔[1]

واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۳۶/ ۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۹ھ

جبری اور اختیاری پراویڈنٹ فنڈ پر اصل رقم پر زیادتی کا حکم

سوال:- سرکاری ملازمین کی تنخواہ کا کچھ حصہ ماہانہ کاٹا جاتا ہے، جس کو جی پی فنڈ (جنرل پراویڈنٹ فنڈ) کہا جاتا ہے، اس رقم پر حکومت اپنے ملازم کو منافع بھی دیتی ہے، کیا یہ منافع بھی سود کہلائے گا؟ اس کی دو صورتیں ہیں، حکومت ہر ملازم سے تنخواہ کا کچھ حصہ جبراً کاٹتی ہے، دُوسری صورت یہ ہے کہ ملازم اپنی مرضی سے حکومت کی مقرّر کردہ رقم سے زیادہ کٹواتا ہے، ان دونوں کا حکم تحریر فرمائیں۔

---

(۱) تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ'' ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- پراویڈنٹ فنڈ پر جو زیادہ رقم محکمے کی طرف سے دی جاتی ہے وہ شرعاً سود نہیں ہے،[۱] لہٰذا اس کا لینا اور استعمال میں لانا جائز ہے۔ جبری اور اختیاری فنڈ دونوں کا حکم یہی ہے۔ البتہ جو رقم اپنے اختیار سے کٹوائی گئی ہو اس پر ملنے والی زیادتی کو احتیاطاً صدقہ کردیں تو بہتر ہے۔[۲]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰/ ۲۸ الف)

پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لینے کے بعد واپسی کے وقت اصل رقم سے زیادہ واپس کرنے کا حکم

سوال:- اگر کوئی ملازم دفتر میں نوکری کرتا ہے تو اس کی تنخواہ سے کچھ حصہ پراویڈنٹ فنڈ کے طور پر کاٹ لیا جاتا ہے، جس کو جمع کر کے ریٹائرمنٹ یا اس سے قبل نوکری چھوڑتے ہوئے دُگنا ملازم کو دیا جاتا ہے، کیا یہ ساری زیادتی شرعاً سود نہیں ہے؟ لیکن جب یہ ملازم اس سے قرض لے کر قسطوں میں ادا کرتا ہے تو اس سے سود لیا جاتا ہے، تو کیا یہ سود نہیں ہے؟ اور یہ مسئلہ حضرت مفتی صاحب کے رسالے میں یا کہیں ہے؟

جواب:- پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سے قرض لینے پر واپسی کے وقت جو زائد رقم سود کے نام سے فنڈ میں دی جاتی ہے شرعاً وہ سود نہیں۔ یہ مسئلہ بھی حضرت مفتیٔ اعظم قدس سرہٗ کے رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ'' ہی میں موجود ہے۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم

۲۴/۱۱/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۴۹۷/ ۳۲ ج)

مغربی ممالک میں سودی قرضوں کے ذریعے گھر خریدنے کا طریقہ اور اُس کا حکم

سوال:- آئرلینڈ وغیرہ ملکوں میں گھر خریدنا مشکل نہیں، محض 5% قیمت کا حصہ دے کر باقی قرضہ حاصل کیا جاسکتا ہے، جس کو اگر انٹرسٹ کے ساتھ ماہانہ ادا کیا جائے تو وہ عموماً اس گھر کے کرایہ وغیرہ سے کم ہوتا ہے، اور جب پانچ چھ سال بعد لوگ یہاں سے جاتے ہیں تو گھر بیچ دیتے ہیں، اس

(۱ و ۲) تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ پر زکوۃ اور سود کا مسئلہ'' ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) مزید تفصیل کے لئے دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۵۲ (مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

طرح جو ماہانہ کرایہ ضائع ہوتا تھا وہ اُن کی اپنی پراپرٹی بنانے کے کام آتا ہے اور جو قیمت میں اضافہ ہوا وہ الگ فائدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کی طرف بکثرت مائل ہوتے جارہے ہیں، مگر سب سے اہم مسئلہ سود کا ہے، اس سلسلے میں مجھے درج ذیل سوالات کے جوابات عنایت فرمائیں۔

کیا اُوپر تحریر کیا گیا لین دین جائز ہے؟

کیا یہ لین دین کچھ خاص حالات میں جائز ہے مثلاً ایسا ملک جہاں خرید وفروخت ہوتی ہی اس طرح ہو؟

آپ کی کتاب پڑھنے کے بعد اور دیگر معلومات کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے موجودہ عمل میں کچھ ترامیم کے بعد اس کو جائز بنایا جاسکتا ہے، مثلاً گھر کی اصل قیمتِ خرید ایک لاکھ مگر پچیس سال میں Interest کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ ادا کرنے ہوں تو Deal اس طرح کی جائے کہ گھر کی اصل قیمت ڈیڑھ لاکھ تصوّر کی جائے اور اس کو پچیس سال میں برابر قسطوں میں تقسیم کرلیا جائے۔ کیا اس طرح سے Deal کرنا صحیح ہے؟ میری ناقص معلومات کے مطابق اس طرح کی Deal شکوک سے خالی ہے اور یہاں پر چند سوالات جنم لیتے ہیں جن کا اب تک کوئی حل سامنے نہیں آیا، اس لئے آپ کی جانب سے ان کے جوابات کا خاص کر انتظار رہے گا۔ اس طرح کی پچیس سال کی Deal کے بعد اگر گھر پانچ سال کے بعد بیچنا ہو تو کیا ہمیں بینک یا قرض دینے والے ادارے کو پورے ڈیڑھ لاکھ ہی ادا کرنے ہوں گے گو کہ حقیقتاً ہم نے قرض ایک لاکھ کا لیا تھا؟ فرض کیجئے آپ سوال نمبر۴ کے جواب میں لکھتے ہیں کہ ڈیڑھ لاکھ ادا کرنے ضروری ہیں، چاہے گھر کتنے ہی عرصے کے بعد فروخت کیا جائے تو پھر آخری سوال یہ ہے کہ اگر بینک اپنی خوشی سے Deal کرے تو صحیح ہے، مثلاً گھر کی اصل قیمت ایک لاکھ، پچیس سال کی Deal کے مطابق ڈیڑھ لاکھ، یعنی ہر بیس ہزار کے عوض تیس ہزار، اس حساب سے ہر پانچ سال پر ادا کرنے ہیں تیس ہزار۔ اب اس موقع پر گھر بیچنے کی صورت میں اگر بینک اپنی خوشی سے یہ کہے کہ میں اپنی خوشی سے اس گھر کی قیمت مثال کے طور پر ڈیڑھ سے کم کرکے ایک لاکھ دس ہزار کرتا ہوں، جو کہ حقیقتاً اس نے Interest کرکے کیا ہے، مگر جب تک آپ نے اس چھوٹ کی Deal نہ کر رکھی ہو تو کیا یہ خرید وفروخت صحیح ہوگی؟

جواب:- محترمی ومکرمی جناب عدیل صدیقی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، مغربی ملکوں میں سودی قرض کے ذریعے گھر خریدنے کا جو طریقہ رائج ہے، وہ

سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام ہے، البتہ اگر گھر کے مالک سے معاملہ اس طرح طے ہوجائے کہ گھر کی پوری قیمت بازاری قیمت سے زیادہ مقرّر کرلی جائے، اور پھر اس کی ادائیگی قسطوں میں ہو تو یہ صورت جائز ہے۔[1] اگر یہ معاملہ کسی بینک یا مالیاتی ادارے کے ذریعے ہو تو یہ ضروری ہے کہ وہ بینک یا مالیاتی ادارہ پہلے وہ گھر خود اپنے لئے خرید لے، اور بنا ہوا گھر ہو تو اس پر قبضہ بھی کرلے،[2] پھر آپ کو اُدھار فروخت کرے، اس اُدھار قیمت کا تعین کرتے وقت وہ بازاری قیمت سے جتنا اضافہ مناسب سمجھے، اتنا اضافہ کرکے قیمت مقرّر کرے،[3] لیکن معاملے کے وقت یہ طے ہونا ضروری ہے کہ کُل قیمت کیا ہوگی؟ اور یہ بھی کہ کتنی قسطوں میں ادائیگی کی جائے گی، جب قیمت اس طرح متعین ہوگئی تو اَب کوئی ایک فریق دُوسرے کو اس قیمت میں کمی بیشی کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا، لہٰذا اگر خریدار آخری ادائیگی کی تاریخ آنے سے پہلے گھر کسی اور کو فروخت کرنا چاہے اور رقم کی پیشگی ادائیگی کرنے پر قادر ہوجائے

(۱ تا ۳) مذکورہ معاملے سے متعلق حوالہ جات وعبارات درج ذیل ہیں:

وفی اعلاء السنن ج:۱۴ ص:۱۷۳ (طبع ادارة القرآن کراچی) عن أبی هریرة رضی الله عنه قال: نهی النبی صلی الله علیه وسلم عن بیعتین فی بیعة.

وفیه أیضًا ج:۴ ص:۱۷۵ و۱۷۶ (طبع مذکور) عن عبدالله بن عمرو رضی الله عنهما قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لا یحلّ سلف وبیع ولا شرطان فی بیع اهـ.

وفی الشرح الکبیر لابن قدامة ج:۴ ص:۵۳ قال ابن مسعود رضی الله عنه: صفقتان فی صفقة ربًا وهٰذا قول أبی حنیفة والشافعیّ وجمهور العلماء .... الخ.

وفی المبسوط ج:۱۳ ص:۸ ومن اشتریٰ شیئًا فلا یجوز له أن یبیعه قبل أن یقبضه .... لما روی أن النبی صلی الله علیه وسلم نهیٰ عن بیع الطّعام قبل أن یقبض وکذٰلک ما سوی الطّعام من المنقولات لا یجوز بیعه قبل القبض.

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۴۷ صحّ بیع عقار ..... فلا یصح ..... بیع منقول قبل قبضه ولو من بائعه .... الخ.

وفی الهدایة ج:۳ ص:۷۸ (طبع مکتبه رحمانیه) ومن اشتریٰ شیئًا ممّا ینقل ویحوّل لم یجز له بیعه حتّی یقبضه لأنه علیه السلام نهیٰ عن بیع مالم یقبض ولأنّ فیه غرر انفساخ العقد علی اعتبار الهلاک .... الخ.

وکذا فی تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۳۵۰ والمجلّة للأتاسیّ ج:۲ ص:۱۷۳ وفتح القدیر ج:۵ ص:۲۶۶.

وفی المبسوط للسرخسیّ ج:۱۳ ص:۷ و ۸ واذا عقد العقد علیٰ أنه الیٰ أجل کذا بکذا وبالنقد بکذا .... فهو فاسدٌ .... وهٰذا اذا افترقا علیٰ هٰذا، فان کان یتراضیان بینهما ولم یتفرّقا حتّی قاطعه علیٰ ثمن معلوم وأتما العقد علیه فهو جائزٌ.

وفی الهدایة ج:۳ ص:۲۱ (طبع رحمانیه) ویجوز البیع بثمن حال ومؤجّل اذا کان الأجل معلومًا لاطلاق قوله تعالیٰ: "وَأَحَلَّ اللهُ الْبَیْعَ" الآیة.

وفی الشامیة ویزاد فی الثمن لأجله اذا ذکر الأجل بمقابلة زیادة الثمن قصدًا. (طبع بیروت ج:۷ ص:۳۶۲).

وفی البحوث ص:۱۴ الجزم بأحد الثمنین شرط للجواز .... الخ.

وکذا فی البزّازیة ج:۴ ص:۴۳۱ والهندیة ج:۳ ص:۱۳۶ والشامیة ج:۵ ص:۱۴۲ والهدایة ج:۳ ص:۷۴.

وفی المجلّة رقم المادّة:۲۴۵ البیع مع تأجیل الثمن وتقسیطه صحیح ..... الخ.

وفی الهدایة ج:۳ ص:۷۸ (طبع مکتبه رحمانیه) .... لأنّ للأجل شبهًا بالمبیع، الا یریٰ أنه یزاد فی الثمن لأجل الأجل اهـ وکذا فی الشامیة ج:۵ ص:۱۴۲ و ۳۲۶.

وفی بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة ص:۷ امّا الأئمّة الأربعة وجمهور الفقهاء والمحدثین فقد أجازوا البیع المؤجّل بأکثر من سعر النعقد بشرط أن یبتّ العاقدان بأنه بیع مؤجّل بأجل معلوم بثمن متفق علیه عند العقد .... الخ.

تب بھی وہ اپنے بیچنے والے ادارے سے یہ مطالبہ نہیں کرسکتا کہ وہ قیمت میں کمی کردے، ہاں اگر وہ ادارہ اپنی خوشی سے قیمت میں کمی کردے جبکہ اس پر کوئی جبر نہ ہو، نہ ایسا کوئی پیشگی معاہدہ ہو تو اپنی خوشی سے کمی کرسکتا ہے۔

والسلام

(حضرت مولانا) محمد تقی عثمانی (مدظلہم)

بقلم محمد عبداللہ میمن

۱۴۲۰/۱۲/۲۸ھ

بینک یا ہاؤس بلڈنگ فائنانس کے ذریعے گھر خریدنے کا حکم

سوال:- اِمارات میں یا پاکستان میں یا دُنیا کے کسی بھی ملک میں میرا کوئی گھر نہیں ہے، میں ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا ہوں، جہاں پر میرے والدین کا بنایا ہوا ڈھائی کمروں کا مکان ہے، اور یہ بھی میرے چھوٹی بھائی اور میری بہن کی ملکیت ہے۔ میرے اپنے چار بچے ہیں، جن کی عمریں تین سال سے نو سال تک ہیں، ہر شخص کی طرح ایک گھر کا ہونا میری بھی بنیادی ضرورت ہے، آج اگر میری نوکری یہاں سے اچانک ختم ہوجائے تو مجھے لازماً واپس پاکستان ہی آنا پڑے گا، اور وہاں اپنی ضرورتوں کی وجہ سے گاؤں میں بس نہیں سکتا، لازماً کسی شہر ہی میں ڈیرا لگانا پڑے گا، کسی بھی مناسب جگہ پر اپنا گھر کا ہونا ایک ہی بہت بڑا سہارا ہوتا ہے، موجودہ حالات میں میں اپنی تنخواہ سے اتنے پیسے جمع نہیں کرسکتا کہ مکان بنوانے کا سوچوں، اس کام کے لئے مجھے کہیں نہ کہیں سے قرض ہی لینا پڑے گا، چاہے وہ کوئی فرد ہو (جو کہ ناممکن ہے) یا کوئی ادارہ جیسے بینک یا ہاؤس بلڈنگ فائنانس کارپوریشن۔ اگر میں اِن اداروں سے قرض لے لوں اور گھر بنوالوں تو میں یہ قرضہ آہستہ آہستہ دُوسرے لوگوں کی طرح اُتار سکتا ہوں، جیسے جیسے دیر ہو رہی ہے زمین اور مکان بنوانے کی قیمتیں بہت تیزی سے بڑھ رہی ہیں اور میں دن بدن اور زیادہ مصیبت میں گھرتا جارہا ہوں، کیا میں اپنے حالات کے مدِنظر بینک یا ایسے ہی کسی ادارے سے قرض لے کر گھر بنواسکتا ہوں؟ جیسا کہ آپ کو علم ہوگا کہ ایسے قرضوں پر واپسی کے وقت مجھے کچھ رقم بطور سود دینی ہی پڑے گی۔ اگر شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی تو برائے مہربانی میرے اس مسئلے کا حل ضرور لکھئے گا تاکہ میں گھر بنواسکوں۔

جواب:- پاکستان میں ہاؤس بلڈنگ فائنانس کارپوریشن نے جو طریقۂ کار پچھلے چند سالوں سے اختیار کیا ہوا ہے، اس میں اگرچہ صراحۃً سود کا نام تو نہیں رہا، لیکن اب بھی اس کا طریقِ کار متعدّد غیرشرعی اُمور پر مشتمل ہے۔ اس لئے مکان بنوانے کے لئے اس سے رقم لینے کا مشورہ نہیں دیا جاسکتا۔[1]

---

(۱) تفصیل کے لئے ص:۲۶۳ کا فتویٰ اور اُس کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

کوئی شخص ایسا بے گھر ہو کہ اگر اس سے معاملہ نہ کرے اسے سر چھپانے کی جگہ میسر نہ آئے تو اس کے لئے گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن جس شخص کے پاس رہنے کی کوئی جگہ -خواہ کرایہ کی ہو- یا اسے لینے کی استطاعت ہو، اس کے لئے اس طریقِ کار کے تحت رقم لینا دُرست نہیں۔ البتہ اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ اس کا طریقِ کار دُرست ہوجائے، بعض دُوسرے ادارے بھی ایسی اسکیمیں نکالنا چاہتے ہیں لیکن اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی، فی الحال ایسا کوئی ادارہ موجود نہیں جس سے اس سلسلے میں رجوع کیا جاسکے۔

والسلام

(حضرت مولانا مفتی) محمد تقی عثمانی (صاحب مدظلہم)

بقلم محمد عبداللہ میمن

۱۴۱۴/۱۱/۲۲ھ

''بینک آف خیبر'' کی طرف سے فوڈ ڈپارٹمنٹ سے مرابحہ کی منسوخی کی صورت میں بینک کو گفٹ کے طور پر ملنے والی رقم کا حکم

سوال:- جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

السلام علیکم! اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے!

درج ذیل مسئلے میں آپ سے رہنمائی کی درخواست ہے:-

بینک آف خیبر نے دسمبر ۲۰۰۶ء میں فوڈ ڈپارٹمنٹ صوبہ سرحد کے ساتھ گندم کی خریداری کے سلسلے میں مرابحہ کیا تھا، جس کے تحت بینک آف خیبر نے ان کے لئے گندم پاسکو سے خریدنی تھی، اس سلسلے میں بینک نے ان کو گندم کی خریداری کے لئے اپنا ایجنٹ مقرّر کرکے رقم ان کو دے دی تھی، لیکن بعد میں یہ بات ظاہر ہوئی کہ فوڈ ڈپارٹمنٹ، پاسکو سے اس معاملے میں پہلے بات چیت کرکے معاملہ طے کرچکا تھا، (اس سلسلے میں ہونے والے معاہدے لف ہیں)۔

اس وجہ سے شریعہ ایڈوائزر نے اس معاملے میں مرابحہ ناممکن قرار دیا، اس لئے بینک آف خیبر نے خط کے ذریعے فوڈ ڈپارٹمنٹ سے اصل رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا (خط کی کاپی منسلک ہے)۔

فوڈ ڈپارٹمنٹ نے وہ رقم تین ماہ بعد واپس کردی، اور اَب مزید کچھ رقم بھی دے دی ہے، جو بینک نے اپنے ریزرو میں رکھی ہوئی ہے اور ابھی تک اس کو اِستعمال نہیں کیا۔ فوڈ ڈپارٹمنٹ کے افسران سے بات ہوئی ہے، انہوں نے عندیہ دیا ہے کہ وہ یہ رقم بطور گفٹ ہمیں دے رہے ہیں، اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سلسلے میں مل کر ایک ایسے خط کا مضمون لکھا جائے جو بینک کے لئے قابلِ قبول ہو۔

اس معاملے میں External Auditor نے بھی اعتراض کیا ہے کہ ہم نے دسمبر میں انکم Accure کی ہے، جبکہ مرابحہ نہیں ہوا تھا، (اعتراض منسلک ہے) اگرچہ اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں ہے کیونکہ FAS.1 Murabaha میں اس بات کی گنجائش ہے اور وعدۂ مرابحہ کی بنیاد پر انکم ریکارڈ کی گئی، لیکن اس کو ڈپازٹرز میں بالکل تقسیم نہیں کیا گیا ہے، اور وہ Reserve میں رکھا ہوا ہے۔

اس سلسلے میں درج ذیل تجاویز پیشِ خدمت ہیں:-

الف:- بینک یہ رقم ڈپارٹمنٹ کو چیف منسٹر کے ذریعے واپس کردے۔

ب:- بینک اس رقم کو گفٹ کے طور پر فوڈ ڈپارٹمنٹ کی رضامندی سے قبول کرکے اپنے منافع میں شامل کرے اور ڈپازٹرز کو دیدے۔

اُمید ہے کہ آپ درج بالا مسئلے کے بارے میں رہنمائی فرماکر مشکور فرمائیں گے۔ نیز اس سلسلے میں بھی رہنمائی فرمائیں کہ مستقبل میں یہ کام کیسے سرانجام دے سکتے ہیں؟ (محمد اسد)

جواب:- مکرمی جناب محمد اسد صاحب ہیڈ اسلامک بینکنگ ڈویژن، بینک آف خیبر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فوڈ ڈپارٹمنٹ سے منسوخ شدہ مرابحہ کے بعد جو ۵ملین کی رقم بطور گفٹ موصول ہوئی ہے، اس کے بارے میں آپ کا سوال موصول ہوا۔ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اگر بینک کی طرف سے اس زائد رقم کا کوئی صراحۃً، اشارۃً یا کنایۃً مطالبہ ہوا تھا، خواہ گفٹ کے نام سے ہو، تب تو اس رقم کا رکھنا بالکل جائز نہیں، یہ سود کے حکم میں ہے، اور اس کو واپس کرنا ضروری ہے۔

اور اگر بینک کی طرف سے کوئی مطالبہ نہیں تھا، تب بھی اگر یہ گفٹ کسی فرد کی طرف سے ہوتا تو بات اور تھی، لیکن فوڈ ڈپارٹمنٹ ایک سرکاری محکمہ ہے جسے عام طور سے یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کسی فرد یا اِدارے کو ۵ ملین روپے گفٹ کے طور پر دیدے، لہٰذا ظاہر یہی ہے کہ وہ 200 ملین قرض سے نفع اُٹھانے کی بنا پر دی گئی ہے، اور غالباً فوڈ ڈپارٹمنٹ کے حسابات میں اسی طرح درج کی جائے گی۔ اس لئے بھی اس کو بینک کی آمدنی میں شامل کرنا دُرست نہیں ہوگا۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۸/۴/۲۵ھ

***

﴿فصل فی القمار والتّأمین﴾

(جوا اور انشورنس کا بیان)

زندگی، گھر اور مال وغیرہ کے انشورنس کا حکم

سوال:- کیا انشورنس جائز ہے؟ مثلاً زندگی، گھر، مال وغیرہ کا۔

جواب:- انشورنس سود اور قمار پر مشتمل ہونے کی بناء پر بالکل حرام ہے، البتہ جو انشورنس حکومت کی طرف سے لازمی ہو، مثلاً موٹر وغیرہ کا بیمہ، اس کو مجبوراً کرا سکتے ہیں، مگر جب رقم ملے تو صرف اتنی رقم خود استعمال کر سکتے ہیں جتنی خود داخل کی تھی، اس سے زائد نہیں۔ واللہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰۷/۲۹ ب)

مروّجہ انشورنس کا متبادل ''تکافل''

(وضاحت از مرتب)

۱۴۲۳ھ میں مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کا ایک اہم اجلاس جامعہ دارالعلوم کراچی میں مروجہ انشورنس کے متبادل پر غور وفکر کے لئے منعقد ہوا تھا، جس میں پاکستان کے اکابر مفتیان کرام کے علاوہ بنگلہ دیش اور شام کے علماء بھی شریک ہوئے تھے۔ اجلاس سے قبل حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ''شرکات التکافل پر چند اِشکالات'' کے عنوان سے ایک تحریر شرکاءِ اجلاس کو اِرسال فرمائی تھی، بعد میں دو دِن تک جاری رہنے والے اس اِجلاس میں تبرّع یا وقف کی بنیاد پر اِنشورنس کے متبادل پر طویل غور وفکر کیا گیا اور تبرّع کے بجائے مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کے ابتدائی اکابر مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب، حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ کے پہلے سے تجویز کئے گئے متبادل پر تفصیلی غور وفکر کیا گیا جو وقف اور مضاربت کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، چنانچہ انہی اکابر رحمہم اللہ کے اس متبادل کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک متفقہ قرارداد منظور کی گئی۔ ذیل میں پہلے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کے اِشکالات پر مشتمل وہ تحریر اور اس کے بعد مجلس کی طرف سے ان اشکالات کے جوابات کے ساتھ اکابر علماء کی قرارداد پیش کی جارہی ہے۔ (محمد زبیر)

شرکات التکافل پر چند اِشکالات

(از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سیدنا ومولانا محمد النبی

الأمين، وعلى آله وأصحابه أجمعين، وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد:

آج کل مختلف اشیاء کے بیمے کا کاروبار دُنیا کے ہر خطے میں انشورنس کمپنیاں انجام دے رہی ہیں، معاصر علمائے اسلام کی اکثریت نے اس کاروبار کو ''غرر'' یا ''قمار'' پر مشتمل ہونے کی بناء پر ناجائز قرار دیا ہے، اس لئے شرقِ اَوسط کے مسلمانوں نے اپنے علاقے کے علمائے کرام کے مشورے سے ایسی کمپنیاں ''شـركـات التكـافل'' کے نام سے قائم کی ہیں، جو بیمہ کے مقاصد شرعی اُصولوں کے ماتحت حاصل کرنے کی مدعی ہیں۔

دونوں قسم کی کمپنیوں کے طریقۂ کار میں فرق یہ ہے کہ وہ انشورنس کمپنیاں جو شرعی قواعد کی پابند نہیں (جنہیں آئندہ مروّجہ انشورنس کمپنیاں کہا جائے گا) لوگوں سے باقاعدہ تجارتی معاہدہ کرتی ہیں جس کی بنیاد پر وہ بیمہ دار سے ماہانہ یا سالانہ ایک رقم ''پریمیم'' کے نام سے وصول کرتی ہیں اور اس کے مقابلے میں یہ اِلتزام کرتی ہیں کہ جس چیز کا بیمہ کرایا گیا ہے اگر وہ ہلاک ہوجائے یا اس کو نقصان پہنچ جائے تو انشورنس کمپنی اس نقصان کی تلافی کرے گی۔ یہ کمپنیاں پریمیم کا تعین ایک خاص حساب کے ذریعے کرتی ہیں، جس کے لئے ایک مستقل فن ''ایکچوری'' کے نام سے مشہور ہے، اس حساب کے ذریعے وہ یہ اندازہ لگاتی ہیں کہ انہیں سال بھر میں اوسطاً کتنے لوگوں کے نقصانات کی تلافی کرنی پڑے گی، اور اس پر کتنا خرچ آنے کی توقع ہے جتنا خرچ آنے کی توقع ہوتی ہے اس پر وہ اپنے منافع کی ایک مقدار کا اِضافہ کرکے مختلف اشیاء کے پریمیم کا تعین کرتی ہے، اگر سال بھر میں ان کے اِخراجات توقع کے مطابق ہوں تو باقی ماندہ رقم ان کے منافع کا حصہ ہوتی ہے، لیکن اگر اِخراجات توقع سے زیادہ بڑھ گئے تو چونکہ انہیں نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے وہ کسی اور انشورنس کمپنی سے معاملہ کرتی ہیں کہ ایسے نقصان کی صورت میں وہ کمپنیاں ان کے نقصان کی تلافی کریں، اس عمل کو انگریزی میں ری انشورنس "Re-insurance" اور عربی میں ''اعـادة التـأمين'' کہا جاتا ہے۔ مروّجہ انشورنس کمپنیاں ''اعادة التأمين'' کے لئے ''ری انشورنس'' کمپنیوں کو پریمیم ادا کرتی ہیں۔

دُوسری طرف ''شـركـات التكـافل'' جو شرقِ اَوسط میں قائم کی گئی ہیں، وہ کسی تجارتی معاہدے کے بجائے ''تبرّع'' کے اُصول پر قائم ہوتی ہیں، ان کمپنیوں میں مختلف افراد جو رقمیں دیتے ہیں، ان کے بارے میں یہ طے ہوتا ہے کہ یہ دینے والوں کی طرف سے ''تبرّع'' ہے، اس طرح رقمیں دینے والوں کو ''حـملة الوثائق'' کہا جاتا ہے، اور ان رقموں کو کاروبار میں بھی لگایا جاتا ہے اور اس طرح جو رقمیں جمع ہوتی ہیں وہ تمام چندہ دہندگان کے نقصانات کی تلافی میں خرچ کی جاتی ہیں، اگر سال میں

جن نقصانات کی تلافی کی گئی، اس کے بعد کچھ رقم بچ رہی تو وہ کمپنی کا منافع نہیں ہوتا بلکہ انہیں ان حملة الوثائق میں تقسیم کردیا جاتا ہے جنہوں نے اِبتداء میں تلافی نقصانات کے لئے رقمیں دی تھیں۔

شرکات التکافل کا بنیادی تصوّر تو یہی ہے جو اُوپر ذِکر کیا گیا لیکن عملاً اس تصوّر میں مندرجہ ذیل مسائل پیدا ہوتے ہیں:

۱- چونکہ تکافل کی کارروائی دُنیا کے کسی بھی ملک کے قانون میں ایک کمپنی کے قائم کئے بغیر ممکن نہیں، اس لئے کچھ لوگوں کو اپنا اِبتدائی سرمایہ لگا کر ایک کمپنی قائم کرنی پڑتی ہے، ان لوگوں کو ''شیئر ہولڈرز'' یا ''حاملِ حصص'' کہا جاتا ہے، چونکہ مروّجہ انشورنس کمپنیوں کی طرح یہ لوگ نقصانات کی تلافی سے بچی ہوئی رقم کے حق دار نہیں ہوتے، اس لئے ان کی آمدنی صرف ان کے لگائے ہوئے سرمایہ پر تجارتی نفع کی حد تک محدود ہے، اور تکافل فنڈ سے انہیں کچھ نہیں ملتا، البتہ بعض ''شرکات التکافل'' ان کو تکافل فنڈ سے فنڈ کے اِنتظام و انصرام کی اُجرت ادا کرتی ہیں، اور ملیشیا کی تکافل کمپنیاں ان کو تکافل فنڈ کی بچی ہوئی رقم سے رقم کا ایک مخصوص فیصد حصہ ادا کرتی ہیں، غور طلب سوال یہ ہے کہ آیا کمپنی کے مؤسسین کو یہ ادائیگی جائز ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس بنیاد پر؟

۲- اگرچہ تکافل فنڈ تبرّع کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے، لیکن اس فنڈ سے خود متبرّع بھی نقصان کی صورت میں مستفید ہوتا ہے، بلکہ تکافل فنڈ میں لوگوں کے نقصانات کی تلافی ان کے دیئے ہوئے ''تبرّع'' کی مقدار کی بنیاد پر ہوتی ہے، یعنی جس کا جتنا زیادہ تبرّع ہوگا، وہ اتنے ہی بڑے نقصان کی تلافی اس فنڈ سے کراسکے گا، دُوسرے الفاظ میں تبرّع کی رقم کا تعین اس چیز کی قیمت کے لحاظ سے ہوتا ہے جس کے نقصان کی وہ تلافی چاہتا ہو۔

چنانچہ اگر کوئی شخص سوزوکی کار کے نقصان کی تلافی کا خواہش مند ہو تو اسے کم تبرّع کرنا پڑے گا، اور اگر مرسڈیز کار کے نقصان کی تلافی کا خواہش مند ہو تو اسے زیادہ تبرّع کرنا پڑے گا، سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت میں جبکہ متبرّع اس نقطۂ نظر سے اور اس بنیاد پر رقم کی مقدار کا تعین کر رہا ہے کہ اس کو کس نقصان کی تلافی مقصود ہے تو کیا واقعۃً تبرّع رہے گا؟ یا یہ بھی عقدِ معاوضہ میں داخل ہوجائے گا؟ شرقِ اَوسط کے جن حضرات نے اس کو تبرّع قرار دے کر اس کی اجازت دی ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ جو کچھ رقمیں جو کوئی شخص دیتا ہے وہ تکافل فنڈ کا حصہ بن جاتی ہیں، اس تکافل فنڈ کے قواعد وضوابط خود اس فنڈ کے قائم کرنے والوں نے جن میں ہر متبرّع داخل ہے، یہ مقرّر کئے ہیں کہ جس شخص نے جتنا چندہ دیا ہوگا، اسی حساب سے وہ اس فنڈ سے اپنے نقصانات کی تلافی کراسکے گا، اور جو فنڈ باہمی تعاون اور تبرّع کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہو اس کے قواعد وضوابط فنڈ کے تمام شرکاء باہمی رضامندی سے مقرّر کرسکتے

ہیں، لہٰذا اگر یہ قاعدہ مقرّر کرلیا گیا ہے کہ لوگوں کے نقصانات کی تلافی ان کے تبرّعات کی مقدار کے حساب سے کی جائے گی تو اس سے فنڈ کے تبرّع پر مبنی ہونے پر کوئی فرق واقع نہیں ہوگا، سوال یہ ہے کہ کیا شرعاً یہ نقطۂ نظر دُرست ہے؟

۳- جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا مروّجہ انشورنس کمپنیاں نقصان کے خطرے کے پیشِ نظر ''ری انشورنس'' کمپنیوں سے ''اعادة التأمین'' کراتی ہیں، ''شرکات التکافل'' کو بھی یہ خطرہ درپیش رہتا ہے کہ تکافل فنڈ کی رقم نقصانات کی تلافی کے لئے ناکافی ہوجائے۔

اگرچہ ایک دو مقامات پر مسلمانوں نے ''اعادة التکافل'' کی کمپنیاں بھی قائم کی ہیں، مگر ان کی صلاحیت بہت محدود ہے، اس لئے عرب کے علماء نے ان کو اس بات کی اِجازت دی ہے کہ جب تک شرعی بنیادوں پر ''اعادة التکافل'' کا نظام مستحکم نہ ہو، اس وقت تک وہ بدرجہ مجبوری مروّجہ ''ری انشورنس'' کمپنیوں سے ''اعادة التأمین'' کراسکتی ہیں، ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ تأمین کی حرمت رِبا اور قمار کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ ''عقدِ غرر'' ہے چونکہ انشورنس کمپنی نقصان کی صورت میں نقصانات کی تلافی محض پیسے دینے کی شکل میں نہیں کرتی جس سے ''مبادلة النقود بالنقود'' لازم آئے بلکہ وہ نقصان کی تلافی کی ذمہ داری لیتی ہے، مثلاً کار تباہ ہوئی تو اس کی جگہ دُوسری کار فراہم کرنا، مکان تباہ ہوا تو اس کی جگہ دُوسرا مکان تیار کرنا وغیرہ، لہٰذا یہ عقد رِبا یا قمار نہیں بلکہ عقدِ غرر ہے، اور ''غرر'' کو حاجتِ عامہ کی بنا پر گوارا کیا جاسکتا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا یہ موقف دُرست ہے؟ اور اگر نہیں تو اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے کوئی دُوسرا طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟

مجلس کی طرف سے مذکورہ اِشکالات کا جواب اور ''تکافل'' سے متعلق اکابر علمائے کرام کی قرارداد

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ

اَمَّا بَعْدُ!

جامعہ دارالعلوم کراچی کے شعبۂ مرکز الاقتصاد الاسلامی کی دعوت پر پاکستان، بنگلہ دیش اور شام کے اہلِ علم اور اہلِ فتویٰ حضرات کا اہم اِجتماع بتاریخ ۲۱-۲۲ر شوال ۱۴۲۳ھ بروز جمعرات، جمعہ مطابق ۲۶-۲۷ر دسمبر ۲۰۰۲ء جامعہ دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء کے ہال میں بیمہ کے متبادل نظام ''تکافل'' پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا۔

مجلس کے علمائے کرام نے مروّجہ انشورنس کے متبادل نظام ''شرکۃ التکافل'' پر غور کیا، جس کی عملی صورت بنگلہ دیش، شرقِ اَوسط اور ملائشیا کی بعض کمپنیوں نے اختیار کی ہے۔ اس متبادل طریقۂ کار پر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے ''شرکات التکافل پر چند اِشکالات'' کے نام سے جو تحریر اہلِ علم کے مطالعے کے لئے اِرسال کی تھی، اسے مجلس میں پڑھا گیا اور ان اِشکالات کا جائزہ لیا گیا۔

مجلس کے آغاز میں مہمان عرب عالمِ دِین اور متعدّد مالیاتی اِداروں کے شرعی اُمور کے نگران جناب شیخ عبدالستار ابوغدہ نے مغربی بیمہ کمپنیوں کی تاریخ کا اِجمالی جائزہ پیش کیا اور اَب اِسلامی ممالک میں جو تکافل کمپنیاں کام کر رہی ہیں ان کے طریقِ کار پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ بعد میں شرکاءِ مجلس کے بعض سوالات وشبہات کے جوابات دیئے۔

اس کے بعد متعدّد اہلِ مجلس نے اپنی آراء بیان فرمائیں اور طویل بحث کے بعد مجلس نے یہ طے کیا کہ اس وقت اسلامی ممالک میں جو تکافل کمپنیاں اسلامی اُصولوں کے مطابق کام کر رہی ہیں یا کام کرنا چاہتی ہیں ان سب کی بنیاد ''حملة الوثائق'' (پالیسی ہولڈرز یا بالفاظِ دیگر پریمیم قسط ادا کنندگان) کی طرف سے ''تبرّع'' پر رکھی گئی ہے، اور اس تبرّع کی بنیاد پر وہ اپنے متوقع مالی خطرات کا اِزالہ کرتے ہیں، مجلس نے محسوس کیا کہ وقف کے بغیر تبرّع کی بنیاد پر تکافل کمپنیوں کے قیام میں متعدّد اِشکالات ہیں۔ شیخ عبدالستار ابوغدہ اور دُوسرے عرب علماء نے اگرچہ ان اِشکالات کے اپنے اپنے طور پر جوابات دیئے ہیں لیکن مجلس کو خیال ہوا کہ اس مسئلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہوگی، اگر فی الحال ترجیحاً ان کمپنیوں کی بنیاد تبرّع کے بجائے وقف پر رکھی جائے تو اس قسم کے اِشکالات سے حفاظت ہوسکتی ہے۔

اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ۱۳۸۴ھ میں مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری، حضرت مولانا ولی حسن رحمہم اللہ اور دیگر اکابر کی سرپرستی میں بیمۂ زندگی کے متبادل کے طور پر جو نظام تجویز کیا تھا، اس کی بنیاد بھی وقف اور مضاربت پر رکھی تھی (دیکھئے ''بیمۂ زندگی'' مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ ص:۲۵)۔

ان جلیل القدر اکابر کی تجویز کردہ بنیاد ''وقف'' پر اگر تکافل کمپنی قائم کی جائے تو نسبۃً اِشکالات کم پیش آئیں گے، لہٰذا مجلس نے تبرّع کے مقابلے میں وقف کی بنیادوں پر قائم شرکۃ التکافل کے قیام کی صورت کو ترجیح دی جس میں اوّلاً مساہمین (شیئر ہولڈرز یعنی تکافل کمپنی حصہ داران) اپنے طور پر اُصولِ ثابتہ (اموال غیر منقولہ) یا نقود یا دونوں کو شرعی اُصول وضوابط کے مطابق وقف کریں گے جنہیں محفوظ رکھا جائے گا اور ان کے لئے آخری جہت ''قربت'' یعنی فقراء اور مساکین پر تصدق ہوگی، پھر حملۃ الوثائق (پالیسی ہولڈرز) اس وقف میں جو رُقوم دیں گے یا وقف کے جتنے منافع یا زوائد ہوں

گے وہ سب وقف کے مملوک ہوں گے اور وقف کو وقف کے طے شدہ اُصول وضوابط کے مطابق ان مملوکات ومنافع میں تصرف کا مکمل اِختیار ہوگا۔

اس اُصول کے طے ہونے کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے تین اِشکالات پر غور کیا گیا۔ نمبروار اِشکالات کے جوابات یہ طے کئے گئے:

(۱)

(الف) مساہمین تکافل فنڈ سے فنڈ کے اِنتظام واِنصرام کی اُجرت درج ذیل شرائط کے ساتھ وصول کرسکتے ہیں:

۱- یہ اُجرت فنڈ سے ادا کی جائے کیونکہ یہ لوگ فنڈ کے اَجیر ہیں نہ کہ حملۃ الوثائق کے۔

۲- اس اُجرت کا متعین ہونا ضروری ہے خواہ وہ تعیین رقم کی صورت میں ہو یا حصۂ متناسبہ کی صورت میں۔

۳- یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اُجرت اعمالِ مضاربت سے خارج کسی اور عمل پر ہو۔

(ب) اگر وقف کے متولّیین (یعنی شرکۃ التکافل) شرعی حدود میں وقف کے لئے مضاربت کی خدمات انجام دیں تو وہ مضاربت کے طور پر ہونے والے نفع کے متناسب متعین حصے کے بھی حق دار ہوسکتے ہیں، مگر اس کے لئے دو شرائط ہیں:

۱- مضاربت اور اِجارہ کی حدود علیحدہ علیحدہ واضح طور پر متعین ہوں تاکہ اِجارہ کے طور پر وہ صرف متعین اُجرت کے حق دار ہوں، اور مضاربت کے طور پر ہونے والے نفع میں سے حصہ متناسبہ کا حق رکھیں۔

۲- ھیئۃ الرقابۃ الشرعیۃ سے مضاربت کی باقاعدہ اِجازت لے لی جائے۔

(۲)

حملۃ الوثائق جو کچھ تبرّع کی بنیاد پر وقف کو دیں اس میں کمی یا زیادتی کی بنیاد پر کم یا زیادہ نقصان کی تلافی کا اگر حملۃ الوثائق کو قانونی حق نہ ہو، بلکہ وقف کی طرف سے محض وعدہ کی حیثیت ہو تو اس میں بظاہر شبہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر تبرّع کی کمی اور زیادتی کی بنیاد پر تلافیٔ نقصان کی کمی اور زیادتی حملۃ الوثائق کا قانونی حق ہو تو اس میں مجلس کے بعض شرکاء کی رائے یہ تھی کہ یہ صورت جائز نہیں کیونکہ یہ صورت عقدِ معاوضہ میں داخل ہوگی اور یہ بعینہٖ وہی صورت ہے جو بیمہ کمپنیوں میں فی الحال رائج ہے، لیکن مجلس کے اکثر شرکاء کی رائے یہ تھی کہ حملۃ الوثائق کے قانونی حق بننے کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ حاملِ وثیقہ اس بنیاد پر اپنے قانونی حق کا دعویٰ کرے کہ اس نے فلاں

وقت میں وقف فنڈ کو اتنی رقم دے کر اس سے نقصان کی تلافی کا معاہدہ کیا تھا، لہٰذا اب اس کے اتنے نقصان کی تلافی کرنا وقف کے ذمہ لازم ہے، یہ صورت تو یقیناً ناجائز ہے کیونکہ یہ بات اسے عقودِ معاوضہ میں داخل کر کے اس میں رِبا اور غرر کی خرابیاں پیدا کردے گی۔

دُوسری صورت یہ ہے کہ حاملِ وثیقہ اپنے سابقہ تبرّع کی بنیاد پر اپنے نقصان کی تلافی کا دعویٰ نہ کرے بلکہ وقف کے اپنے طے شدہ قواعد وضوابط کو بنیاد بنا کر اس بات کا دعویٰ کرے کہ میں ان قواعد وضوابط کی بنیاد پر وقف کی طرف سے تلافیٔ نقصان کا حق دار ہوں۔ مجلس کے اکثر شرکاء کی رائے یہ ہے کہ حاملِ وثیقہ شرعاً اپنا یہ حق اِستعمال کرسکتا ہے اور اس کا یہ قانونی حق اس صورت کو عقدِ معاوضہ میں داخل نہیں کرتا۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کی کتاب ''اسلام کا نظامِ اراضی'' (ص:۱۴۶، ۱۴۷) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عطاءِ مستقل کے لئے سابقہ ضرر کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

اس پر بعض حضرات کو ایک اِشکال ہے، یہ اِشکال اور اس کا جواب جو حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے تحریر فرمایا ہے، آگے آرہا ہے۔

(۳)

رائج الوقت اعادۃ التأمین میں جہاں پورے پریمیم کے ڈُوبنے کا خطرہ ہو، وہاں غرر کے علاوہ قمار کی خرابی بھی پائی جاتی ہے، اور جہاں پریمیم ڈُوبنے کا ڈر نہ ہو وہاں غرر ہونا تو بہرحال طے ہے، اور غرر بھی فاحش ہے، لہٰذا محض اعادۃ التأمین کی خاطر اس کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ درج ذیل متبادل صورتوں کو اِختیار کیا جاسکتا ہے:

۱- اعادۃ التکافل کی کمپنیاں بھی شرعی بنیادوں پر قائم ہوں۔

۲- تبرّع کرنے والوں سے مزید تبرّع کی درخواست کی جائے۔

۳- تبرّع کرنے والوں سے قرض لے کر فی الحال اس سے ادائیگیاں کی جائیں یا ان سے بطور مضاربت رقم لے کر سرمایہ کاری کی جائے، اور حاصل ہونے والے نفع سے نقصانات کی تلافی کی جائے۔

۴- اِحتیاطیات میں رقم زیادہ رکھی جائے۔

۵- وقف پر تلافیٔ نقصان کی ذمہ داری نسبۃً کم رکھی جائے۔

۶- اسلامی تکافل کمپنیاں آپس میں اِعادۃ التکافل کی خدمات انجام دیں۔

ملحوظہ:

۱- مجلس میں شریک علمائے کرام نے یہ بھی طے کیا کہ ہر تکافل کمپنی کے اندر مستند علمائے کرام اور اہلِ فتویٰ حضرات پر مشتمل ایک ھیئۃ الرقابۃ الشرعیۃ (شریعہ بورڈ) لازمی ہے جو کمپنی کے تمام

معاہدات اور جملہ قابلِ ذکر اُمور کے شریعت کے مطابق ہونے کی نگرانی کرے گا۔

۲- مجلس نے یہ سفارش پیش کی کہ چونکہ مجلس کا طے شدہ تکافل کا نظام ''تبرّع'' کے بجائے ''وقف'' پر قائم ہوا ہے، اس لئے بیمہ کمپنیوں کی قدیم اِصطلاحات میں تبدیلی کر کے انہیں بھی فقہِ اسلامی کے مطابق کرنا مناسب ہے۔

ایک اِشکال اور اس کا جواب

جب کوئی شخص پریمیم جمع کراتا ہے تو اس نیت سے کراتا ہے کہ بوقتِ نقصان زیادہ ملے گا۔ اور اس زیادت کے لئے وہ کمپنی کو مجبور بھی کرسکتا ہے۔ اس کی توجیہ حضرت نے یہ فرمائی کہ دینا محض تبرّع ہے اور لینا صندوق کے قوانین کے تحت ہے۔

حضرت کی توجیہ سے یہ عقد صریح قمار سے تو نکل گیا لیکن اس میں شبہ رہا ہے۔ وہ اس طرح کہ دیتے وقت نیت یہ ہے کہ زیادہ ملے چاہے کسی قانون سے ہو، اور اِرشاد ہے کہ: ''وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِر وقال ابن عباس لا تعط عطية تلتمس بها أفضل منها''[1] اسی وجہ سے نیوتہ کو ناجائز کہا گیا ہے، حالانکہ اس میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ دینا ایک مستقل عطیہ ہے اور دُوسرا جب دیتا ہے تو وہ ایک مستقل عطیہ ہے، لیکن چونکہ نیت لینے کی ہے اس لئے علامہ ابنِ عابدینؒ نے اس کو قرض میں داخل فرمایا ہے۔

> في التتارخانية: وفي الفتاوى الخيرية سئل فيما يرسله الشخص الى غيره في الأعراس ونحوها هل يكون حكمه حكم القرض فيلزمه الوفاء به أم لا؟ أجاب: ان كان العرف بأنهم يدفعونه على وجه البدل يلزم الوفاء به مثليا فبمثله وان قيميا فبقيمته وان كان العرف خلاف ذلك بأن كانوا يدفعونه على وجه الهبة ولا ينظرون في ذلك الى اعطاء البدل فحكمه حكم الهبة .... والأصل فيه ان المعروف عرفا كالمشروط شرطا. اهـ
>
> قلت: والعرف في بلادنا مشترك نعم في بعض القرىٰ يعدونه قرضًا حتّٰى انهم في كل وليمة يحضرون الخطيب يكتب لهم ما يهدى فاذا جعل المهدى وليمة يراجع المهدى الدفتر فيهدى الأول الى الثاني مثل ما أهدى اليه. (ج:۵ ص:۶۹۶)[2]

لہٰذا یہاں بھی جب دینا اس غرض سے ہے کہ واپس ملے گا اور وہ بھی زیادہ ملے گا، تو ایک تو

---

(۱) تفسیر قرطبی ج:۱۹ ص:۶۷ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) و ج:۱۹ ص:۶۳ (طبع مکتبہ حقانیہ پشاور)

(۲) ردّ المحتار ج:۵ ص:۶۹۶ (طبع سعید).

یہ اس آیت کی وعید میں داخل ہے اور کم از کم مکروہ ضرور ہوگا۔ اور دُوسرا علامہ ابنِ عابدینؒ کی توجیہ کے مطابق قرض میں داخل ہوجائے گا۔ اور زیادت سود سے مشابہ ہوگی۔ اور سود کے بارے میں یہ حکم ہے: "فدعوا الربا والريبة" تو یہ کہیں ریبہ میں تو داخل نہیں؟

عن الحسين قال: سمعت أبا معاذ يقول: أخبرنا عبيد قال: سمعت الضحاك يقول في قوله: وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَ فِيْٓ اَمْوٰلِ النَّاسِ فهو ما يتعاطى الناس بينهم ويتهادون يعطي الرجل العطية ليصيب منه أفضل منها وهٰذا للناس عامة وأما قوله: وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ فهٰذا للنبي خاصة لم يكن له أن يعطي الّا لله ولم يكن يعطي ليعطى أكثر منه. (قرطبی ج:۲۱ ص:۴۶)[۱]

لیکن حاضرین کی اکثریت نے اس اِشکال کا جواب یہ دیا کہ اس بات پر تمام فقہائے کرام کا اِتفاق ہے کہ واقف کوئی چیز وقف کرتے وقت اس سے خود نفع اُٹھانے کی نیت کرے بلکہ وقف نامے میں اپنے اِنتفاع کی باقاعدہ شرط لگائے، تو اس کی اِجازت ہے، جس کی دلیل حدیثِ معروف ہے: "يكون دلوه فيها كدلاءِ المسلمين"۔[۲]

اس سے معلوم ہوا کہ وقف کے اَحکام اِنفرادی ہدایا سے مختلف ہیں، اور اس کی وجہ واضح ہے کہ وقف کا موضوع لہٗ ہی موقوف علیہم کو فائدہ پہنچانا ہے، لہٰذا اگر واقف وقف سے فائدہ اُٹھاتا ہے تو وہ وقف کے موضوع لہٗ میں داخل ہونے کی بناء پر اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ چنانچہ وقف کی صورت میں چندہ دینے والا اگر وقف سے فائدہ اُٹھائے تو وقف کے قواعد وضوابط کے مطابق فائدہ اُٹھائے گا۔ اگر وقف کے قواعد وضوابط کے مطابق وہ مستحق قرار نہ پائے تو وہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

نیوتہ میں کوئی وقف نہیں ہوتا اس میں "مہدی لہٗ" کا موضوع لہٗ بھی یہ نہیں ہے کہ وہ دُوسروں کو ہدیہ دے، وہ دو اَفراد کا باہمی معاملہ ہے جس میں ہدیہ کا لوٹانا مشروط یا معروف ہو تو اس میں عقدِ معاوضہ ہونے کے سوا کوئی دُوسرا اِحتمال نہیں ہے۔ جبکہ دُوسری طرف وقف کو چندہ دینا ایک مستقل معاملہ ہے اور وقف کے قواعد کے مطابق چندہ دینے والے کا اِستحقاقِ انتفاع بالکل دُوسرا معاملہ۔ اس لئے وقف کے معاملے کو نیوتہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

---

(۱) تفسير طبرى باب:۳۷ ج:۲۰ ص:۱۰۵ (طبع مجمع الملك فهد).

(۲) صحيح البخاري، كتاب المساقات، باب في الشرب ج:۱ ص:۳۱۶ (طبع قديمى كتب خانه).
أيضًا فيه كتاب الوصايا، باب اذا وقف أرضًا أو بئرًا واشترط لنفسه مثل دلاء المسلمين.
وفي جامع الترمذي، أبواب المناقب، باب مناقب عثمان بن عفان "فيجعل دلوه مع دلاء المسلمين".
كذا في النسائي، كتاب الاحباس، باب وقف المساجد.
وفي مسند أحمد بن حنبل (ج:۱ ص:۷۵) فيكون دلوه فيها كدلىء المسلمين.

شرکاءِ مجلس کے اسماء اور مذکورہ قرارداد پر ان کے دستخط

۱- حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۲- الشیخ عبدالستار ابو غدہ حفظہ اللہ	شام	
۳- حضرت مولانا مفتی عبیدالحق صاحب مدظلہم	بنگلہ دیش	دستخط
۴- حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۵- حضرت مولانا مفتی اظہار الاسلام صاحب مدظلہم	بنگلہ دیش	دستخط
۶- حضرت مولانا مفتی عبدالرحمٰن صاحب مدظلہم	بنگلہ دیش	دستخط
۷- حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی صاحب مدظلہم	علامہ بنوری ٹاؤن کراچی	دستخط
۸- حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب مدظلہم	جامعہ خیرالمدارس ملتان بندہ اس اجتماع میں شریک ہوا	دستخط
۹- حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۱۰- حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۱۱- حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب مدظلہم	دارالافتاء والارشاد کراچی	
۱۲- حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۱۳- حضرت مولانا مفتی ابولبابہ صاحب مدظلہم	ضرب مؤمن کراچی	دستخط
۱۴- حضرت مولانا مفتی اصغر علی ربانی صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۱۵- حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس ترمذی صاحب مدظلہم	جامعہ حقانیہ ساہیوال (سرگودھا)	دستخط
۱۶- حضرت مولانا مفتی عبدالحمید صاحب مدظلہم	جامعہ اشرف المدارس کراچی	دستخط
۱۷- حضرت مولانا مفتی عبدالباری صاحب مدظلہم	جامعہ فاروقیہ کراچی	دستخط
۱۸- حضرت مولانا مفتی رضوان احمد صاحب مدظلہم	ادارہ غفران اسلام آباد	
۱۹- حضرت مولانا مفتی عبدالمنان صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۲۰- حضرت مولانا مفتی محمد صاحب مدظلہم	دارالافتاء والارشاد کراچی	

سودی بیمہ کے شرعی متبادل کے لئے یہ تحریر ابتدائی خاکہ کا درجہ رکھتی ہے دیگر شرائط وتفاصیل اور عملی نفاذ میں ممکنہ فقہی مشکلات پر کام ہونا باقی ہے۔ دستخط

۲۱- حضرت مولانا مفتی مخلص الرحمٰن صاحب مدظلہم	بنگلہ دیش	دستخط
۲۲- حضرت مولانا مفتی میزان الرحمٰن صاحب مدظلہم	بنگلہ دیش	دستخط
۲۳- حضرت مولانا مفتی کمال الدین ظفری صاحب مدظلہم	بنگلہ دیش	دستخط
۲۴- حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۲۵- حضرت مولانا مفتی زبیر اشرف عثمانی صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۲۶- حضرت مولانا ڈاکٹر عمران اشرف عثمانی صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط

مروّجہ انشورنس کے متبادل ''تکافل'' کے طریقۂ کار کا جائزہ اور اس کی بعض شقوں کی وضاحت

سوال:- گرامی قدر حضرت جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج بخیر! جنابِ عالی!

یہاں ساؤتھ افریقہ میں مروّجہ انشورنس کے مقابلے میں تکافل کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا ہے، اس کا مقصد جائز طریقے سے انشورنس کے مقصد کو حاصل کرنا ہے، بندے نے اس کی ماہیت و وضع سے متعلق پوری تفصیل لکھی ہے جو کہ مرسل ہے۔ آنجناب سے گزارش ہے کہ اس کا مطالعہ فرماکر اپنی عالی رائے سے سرفراز فرمائیں اور غلطی کی اصلاح فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

''تکافل ساؤتھ افریقہ''

دُنیا میں رائج انشورنس کے مقابلے میں یہاں ساؤتھ افریقہ میں چند مسلمانوں نے ایک ایسا ادارہ قائم کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ شرعی و جائز طریقے سے رائج انشورنس کے فوائد و مقاصد حاصل کئے جائیں، اس ادارے کو ''تکافل'' کا نام دیا ہے، یہ لفظ بمعنی ضمانت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد تعاون و تناصر ہے، دُنیا کے مختلف ممالک میں بھی اسی غرض سے اس نام سے ادارے قائم ہیں۔ تکافل ساؤتھ افریقہ کا ڈھانچہ و ماڈل اس طرح ہے کہ:-

۱- چند محدود افراد نے اس نیت سے محدود رقم وقف کر کے ایک فنڈ قائم کیا ہے کہ جو لوگ اس وقف فنڈ کے ممبر ہوں گے، ان پر اگر کوئی حادثہ یا نقصان عارض ہوا تو طے شدہ قواعد و شرائط کے تحت اس ممبر کی اس وقف فنڈ کے منافع سے مدد کی جائے گی، اور اس میں سے محدود نسبت کے ساتھ کچھ رقم فقراء میں بھی تقسیم کی جائے گی۔

۲- اس وقف فنڈ کو جائز اسلامی سرمایہ کاری کے ذریعے بڑھایا جائے گا، نیز جو اس وقف فنڈ کا ممبر بنے گا اس سے اس فنڈ کے لئے چندہ وصول کیا جائے گا، یہ چندہ وقف فنڈ کے منافع کے حکم میں ہوگا، یہ چندہ وقف کے حکم میں نہیں ہوگا، جیسا کہ مسجد کی عمارت وقف ہوتی ہے اور اس کے لئے جو چندہ حاصل ہوتا ہے وہ اس کے منافع ہوتے ہیں اور یہ منافع مسجد کے مصالح پر خرچ کئے جاتے ہیں (والتفصیل فی امداد الأحکام ج:۳ ص:۲۲۰)۔

۳- جو شخص وقف فنڈ کو چندہ دے گا تو وہ وقف فنڈ کے مقاصد کو پورا کرنے کی نیت سے

چندہ دے گا، اور وہ اس چندے کا مالک نہیں رہے گا، بلکہ یہ چندہ وقف فنڈ کی ملکیت ہوجائے گا۔

۴- اس وقف فنڈ کا ممبر حادثہ پیش آنے کی صورت میں اس بنیاد پر تلافی کا دعویٰ کرے گا کہ وہ اس وقف فنڈ کے مقاصد کے مطابق مستحق ہے، اگر وقف فنڈ کے متولی اس کے نقصان کی تلافی کرنے سے انکار کریں تو وہ عدالت سے اس بنیاد پر رُجوع کرسکتا ہے کہ وقف فنڈ کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے متولی اس وقف فنڈ کو اس کے مقاصد کے مطابق چلانے کے ذمہ دار ہیں، لیکن وہ اس میں کوتاہی کر رہے ہیں، لہٰذا عدالت ان سے باز پُرس کرے۔ گویا یہ حقوق اللہ میں سے ہوگیا، جیسا کہ مالِ غنیمت تقسیم سے پہلے کسی ایک مجاہد کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا اور ہر مجاہد کی ذمہ داری ہے کہ جو کچھ بھی مال کافروں سے حاصل ہو وہ لاکر اِمام کے پاس جمع کرے، نہ خود چھپائے اور نہ ہی کسی دُوسرے کو چھپانے دے، اگر کسی مجاہد نے دُوسرے کے غلول کو چھپایا تو وہ بھی گناہگار ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ”ومن یکتم غالًا فانه مثله“ رواہ أبو داؤد (مشکوۃ ص: ۳۵۱)۔

نیز جس طرح جہاد میں ہر مجاہد کی نیت ابتداء میں مال حاصل کرنے کی نہیں ہوتی، حتیٰ کہ بعض دفعہ امیر یہ بھی اعلان کردیتا ہے کہ: ”من قتل قتیلًا فله سلبه“ تاکہ قتال پر اُبھارا جائے اور سستی پیدا نہ ہو، اس کے بعد جب مالِ غنیمت تقسیم ہوتا ہے تو ہر مجاہد اپنے حصے کی غنیمت و اِنعامِ خصوصی کا جس کا اعلان کیا گیا ہو دعویٰ کرسکتا ہے، غزوۂ حنین میں فتح ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ: ”من قتل قتیلًا له علیه بینة فله سلبه“ (مشکوۃ ص: ۳۴۸) تو ایک صحابی حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور فرمایا: ”من یشهد لی“ لیکن کوئی گواہی دینے کے لئے کھڑا نہیں ہوا تو آپ بیٹھ گئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ پھر اعلان کیا، یہ صحابی دوبارہ کھڑے ہوئے لیکن انہیں کوئی گواہ نہیں ملا تو بیٹھ گئے، تیسری دفعہ بھی اسی طرح ہوا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوقتادہؓ سے پوچھا کہ: کیا بات ہے؟ انہوں نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں نے ایک کافر کو قتل کیا ہے، اس کے بعد ایک دُوسرے صحابی نے (جن کے پاس اس مقتول کا سامان تھا) حضرت ابو قتادہؓ کی تصدیق کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اُس مقتول کا سامان مجھے دے دیا جائے اور ابوقتادہ کو راضی کردیا جائے، لیکن حضرت ابوقتادہؓ اس پر راضی نہیں ہوئے لہٰذا انہیں مقتول کا سامان دیا گیا، متفق علیہ۔

اس حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ تبرّع کی نیت سے کچھ کرنے کے بعد (جہاد میں جانا اور اپنی جان و مال خرچ کرنا بھی تبرّع ہے)، اگر کسی چیز کا استحقاق ثابت ہوجائے تو اس کے لئے دعویٰ کرنا جائز ہے، نیز یہ موقوف علیہ بھی ہے، لہٰذا مستحق ہونے کی وجہ سے دعویٰ کرسکتا ہے (درمختار ج:۳ ص:۴۴۰ و ۴۴۱)۔

۵- یہ بھی طے ہوا ہے (متولیوں کی طرف سے) کہ اس وقف فنڈ کو شریعت کے مطابق چلانے اور اس کی نگرانی کرنے کے لئے ایک شریعہ بورڈ قائم ہوگا اور ان کی ہدایات کی روشنی میں اس فنڈ کو چلایا جائے گا، اگر یہ ثابت ہوجائے کہ اس فنڈ کو جاری رکھنا شریعت کے مطابق نہیں ہے اور ائمہ اَربعہ میں سے کسی کے بھی نزدیک صحیح نہیں ہے یا یہ فنڈ اپنے مقاصد کے مطابق چل نہ سکے تو اس فنڈ کی جتنی بھی رقم و جائیداد وغیرہ ہوگی وہ سب فقراء وغیرہ میں تقسیم کر کے اس فنڈ کو ختم کردیا جائے گا۔

۶- وقف فنڈ کے منافع کا سالانہ حساب کیا جائے گا اور اصل وقف رقم سے زائد جو رقم ہوگی وہ ممبران میں تقسیم کی جائے گی۔

۷- جو رقم وقف کی گئی ہے اس میں کمی نہیں کی جائے گی، تقسیم منافع وقف کی ہوگی اگر کسی وقت دعوے زیادہ ہوں اور منافع وقف سے اس کی تکمیل نہ ہوسکے تو وقف فنڈ کو بلاسودی قرض دیا جائے گا اور بعد میں اس کے منافع سے اس قرض کی ادائیگی کی جائے گی۔

۸- چونکہ تکافل ساؤتھ افریقہ ایک نئی کمپنی یا ادارہ ہے اور ان کے پاس کافی رقم نہیں ہے جبکہ حکومتی قانون کے مطابق ایسی کمپنی کو جاری کرنے کے لئے لائسنس کی ضرورت ہے اور تکافل کمپنی کے پاس اس لائسنس کو حاصل کرنے کے لئے رقم نہیں ہے، نیز اس میدان کی انہیں تکنیکی اور پیشہ ورانہ مہارت بھی حاصل نہیں ہے، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تکافل ساؤتھ افریقہ نے ایک مروّجہ انشورنس کمپنی سے معاہدہ کیا کہ تکافل کمپنی ان کے لائسنس کو اِستعمال کرے گی اور ان سے پیشہ ورانہ مدد حاصل کرے گی، اس کے عوض تکافل کمپنی اس انشورنس کمپنی کو طے شدہ اُجرت ادا کرے گی۔

۹- جن حضرات نے اس فنڈ کے لئے رقم وقف کی ہے، وہ اس کے متولّی ہیں، وہ اس فنڈ کو چلانے اور اس کا انتظام کرنے کے لئے بحیثیت وکیل کام کریں گے اور اس کے لئے انہیں متعین اُجرت دی جائے گی، اس اُجرت میں تمام ملازمین کی تنخواہ اور انتظامی اِخراجات شامل ہوں گے۔

۱۰- تکافل ساؤتھ افریقہ نے ری انشورنس کا معاملہ نہیں کیا۔

تکافل ساؤتھ افریقہ کے ماڈل کے لئے مندرجہ بالا بنیادی اُمور ہیں، ان اُمور کی بنیاد پر اس تکافل کو چلایا جائے گا، اس سلسلے میں اگر کوئی مزید سوال ہو تو بلاجھجک پوچھ سکتے ہیں۔ برائے کرام اس کی شرعی حیثیت سے آگاہ فرمائیں۔

فقط والسلام

محمد اشرف اسپرنگز ساؤتھ افریقہ
۲۵ رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
۱۴ رجولائی ۲۰۰۴ء

جواب:- گرامی قدر مکرم مولانا محمد اشرف خان صاحب، زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ اور تکافل کے بارے میں آپ کی تحریر ملی، اس میں نمبرا سے نمبر۷ تک کی تجاویز تقریباً وہی ہیں جو دارالعلوم میں منعقدہ علماء کے اجتماع میں طے کی گئی تھیں، لہٰذا وہ شریعت کے مطابق ہیں۔ صرف نمبر۶ کے بارے میں عرض یہ ہے کہ زائد رقم کا ممبران پر تقسیم ہونا ضروری نہیں، چونکہ یہ رقم وقف کی ملکیت ہوچکی ہے اس لئے وقف کے قواعد کے تحت اس کو وقف ہی میں محفوظ بھی رکھا جاسکتا ہے تاکہ سالِ آئندہ لوگوں کے نقصانات کی تلافی میں کام آئے، اور یہ صورت بندے کو زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔

البتہ نمبر۸ میں جو تجویز دی گئی ہے کہ: ''تکافل کمپنی کسی مروّجہ انشورنس کمپنی کا لائسنس استعمال کرے گی اور ان سے پیشہ ورانہ مدد حاصل کرے گی'' اس کے بارے میں اس وقت کچھ کہنا مشکل ہے، جب تک مروّج انشورنس کمپنی کے ساتھ تکافل کمپنی کا معاہدہ سامنے نہ ہو۔

والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی

۸/۲/ ۱۴۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۶/۷۵۵)

مروّجہ انشورنس کی مختلف اقسام کا حکم اور انشورنس کے جواز کے قائل علماء کی آراء کی شرعی حیثیت

سوال:- میرا مسئلہ Life Insurance کے متعلق ہے۔ Pakistan State Life کے منیجر میرے دوست ہیں، وہ مجھے پچھلے کئی سالوں سے Insurance کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں، لیکن آج دن تک میں نے اس ڈر سے Insurance نہیں کروائی کہ یہ غیر اسلامی ہے۔ میرے دوست نے پورا ایک بنڈل پڑھنے کے لئے دیا جس میں دُنیا کے مختلف علماء کی Insurance کے بارے میں رائے تھی، اور ان کے مطابق Insurance غیر اسلامی نہیں ہے۔ ان علماء میں مصر، ابوظہبی اور سعودی عرب کے علماء تھے۔ اور تقریباً تین ہفتے پہلے ابوظہبی کے صدر کے مذہبی مشیر نے بیان دیا ہے کہ جو یہاں کے اخباروں میں شائع ہوا ہے، انہوں نے بھی موجودہ Life Insurance کو اسلام کے منافی قرار نہیں دیا، کیا میں ان کے فیصلے کو معتبر سمجھتے ہوئے اپنی Insurance کرواسکتا ہوں یا نہیں؟ آپ سے ایک درخواست ضرور ہے کہ جواب تفصیل سے دیجئے گا۔

جواب:- انشورنس کے جو طریقے اس وقت تک مروّج ہیں وہ سب سود اور قمار پر مشتمل ہیں، اور حرام ہیں۔ مختلف انشورنس کمپنیاں جن علماء کے بیانات شائع کرتی رہتی ہیں، ان میں دو قسم کے بیانات ہوتے ہیں، بعض مرتبہ ان کمپنیوں نے بعض علماء کی طرف غلط بیانات منسوب کئے ہیں، اور بعض مرتبہ علماء کی طرف بیانات کی نسبت غلط نہیں ہوتی، لیکن جن علماء نے موجودہ انشورنس کو جائز کہا ہے، ان کی بات بحیثیتِ مجموعی عالمِ اسلام کے علماء نے قبول نہیں کی، لہٰذا وہ شاذ اقوال کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان کے دلائل بھی نہایت کمزور ہیں۔ "مُجمَع الفقه الاسلامی جدة" میں ساری دُنیائے اسلام کے علماء نے جمع ہوکر اس مسئلے پر مفصل بحث کی، اور بالآخر انشورنس کے مروّجہ طریقوں کی حرمت کا فتویٰ دیا، اور بعض علماء کے شاذ اقوال کو باطل قرار دیا۔ اس اجتماع میں ۴۵ اسلامی ملکوں کے تقریباً ۱۵۰ علماء شریک تھے، یہ تنظیم سارے اسلامی ملکوں کے علماء کی تنظیم ہے۔ خاص طور پر بیمہ زندگی کی حرمت کے دلائل میرے والد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالے ''بیمہ زندگی'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

والسلام
۲۲/۱۱/۱۴۱۴ھ

۱:- انشورنس اور اس کی تمام اقسام کا حکم
۲:- بغیر سود والے انشورنس کے ناجائز ہونے کی وجہ
۳:- انشورنس کی حرمت کے دلائل اور اس کے جواز سے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور بعض دیگر علماء کی رائے کی حقیقت

سوال ۱:- انشورنس جائز ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- انشورنس کی جتنی صورتیں فی زماننا رائج ہیں، سب ناجائز ہیں، کیونکہ وہ سب سود اور قمار پر مشتمل ہیں۔ (۱)

سوال ۲:- بغیر سود کے انشورنس کا فتویٰ کیا ہے؟

جواب ۲:- بغیر سود کا انشورنس بھی قمار کی وجہ سے ناجائز ہے۔ (۲)

سوال ۳:- اپنے فتویٰ میں قرآنی آیات یا احادیث جس سے استنباط کیا گیا ہو؟

(۱ و ۲) تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۶۰، امداد المفتین ص:۸۵۲ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ''بیمہ زندگی'' اور حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' ص:۱۵۹ تا ۱۶۳ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب ۳: - ربا اور قمار کی حرمت کی تمام آیات و احادیث، انشورنس کے حرام ہونے کی دلیل ہیں۔[1]

سوال ۴: - مولانا ابوالکلام آزاد یا دُوسرے علمائے کرام نے جو اس کے حق میں فیصلہ دیا ہے، اس کے بارے میں اظہارِ خیال؟

جواب ۴: - مستند علماء میں سے کسی نے انشورنس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا، بعض علماء کی طرف فتاویٰ غلط منسوب کئے گئے ہیں۔ مولانا آزاد کے بارے میں تحقیق نہیں ہے کہ اُنہوں نے کیا فتویٰ دیا تھا، اور وہ اہلِ فتویٰ علماء میں بھی نہیں ہیں۔　　واللہ اعلم

الجواب صحیح　　احقر محمد تقی عثمانی

بندہ محمد شفیع　　۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۵۹۶/۱۹ الف)

شدید مجبوری میں انشورنس کی رقم بطورِ قرض استعمال کرنے کا حکم

سوال: - محترم مرشدی حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اُمید ہے بخیر و عافیت ہوں گے۔

بعد گزارش! انشورنس کی رقم کے بارے میں مسئلہ معلوم ہوا۔ مزید ایک بات دریافت کرنی ہے، وہ یہ کہ مجھے انشورنس کمپنی سے ساٹھ ہزار یا ستر ہزار کی رقم بمع پرافٹ وغیرہ کے مل جاتی ہے، اگرچہ میں اپنی اصل رقم ہی کا مالک ہوں، اب میری ضرورت مجبوری ہے، آیا میں وقتی طور پر بطور قرض کے یہ تمام رقم اپنے استعمال میں لاسکتا ہوں؟ جب میرے پاس اپنی رقم ہوجائے گی تو اپنی اصل رقم اپنے پاس رکھ کر بقایا رقم آپ کی ہدایات کی روشنی میں تقسیم کردی جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آیا میں ایسا کرسکتا ہوں؟ اُمید ہے جواب سے نوازیں گے۔　　آپ کی دُعاؤں کا محتاج

طلعت محمود راولپنڈی

جواب: - محترمی و مکرمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انشورنس کمپنی سے جو اصل رقم مل رہی ہے اس کو تو استعمال میں لانا جائز ہے، البتہ اس پر سود کی جو رقم مل رہی ہے، اس کا صدقہ کرنا ضروری ہے، البتہ شدید اور انتہائی مجبوری میں اس کو اس نیت سے ذاتی استعمال میں لاسکتے ہیں کہ بعد میں اتنی ہی رقم صدقہ کریں گے، لیکن اس صورت میں اپنے پاس اس

---

(۱) ربا کی حرمت سے متعلق ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر۱، اور قمار کی حرمت سے متعلق تفصیلی دلائل کے لئے "جواهر الفقه" ج:۲ ص:۳۳۹ میں رسالہ "احکام القمار" ملاحظہ فرمائیں۔

کا حساب رکھیں، جب ضرورت رفع ہوجائے اس وقت اس رقم کو صدقہ کردیں۔ الاختیار میں ہے:

والملک الخبیث سبیله التصدق به، ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز، ثم ان کان غنیا تصدق بمثله، وان کان فقیرًا لا یتصدق.

(الاختیار لتعلیل المختار ج:۳ ص:۶۱ أوائل کتاب الغصب)

والسلام
محمد عبداللہ میمن
بحکم حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ
۱۹۹۹/۱۱/۱۲ء

''بیمۂ زندگی'' کا حکم

سوال:- بیمہ بونس جو کہ ہر سال مختلف ہوتا ہے، کیا اسے سود کہا جاتا ہے؟ اور زندگی ختم ہونے پر جو مقرّر رقم ملتی ہے کیا وہ ناجائز ہے؟ کیا درمیان میں یعنی پالیسی کی میعاد ختم ہونے سے قبل اموات کی حالت میں جو رقم ورثاء کو کمپنی ادا کرتی ہے ناجائز ہے؟ اس سلسلے میں دلائل بھی تفصیل سے بیان فرمادیں۔

جواب:- بیمۂ زندگی کی جو صورت آج کل رائج ہے اس میں اصل رقم سے زائد جتنی بھی رقم ملتی ہے، اس سب کو لینا حرام ہے، اگر ناواقفیت کی بناء پر پالیسی خرید لی گئی ہو تو اصل رقم واپس لے لی جائے، اور زائد رقم وصول نہ کی جائے، دلائل کی تفصیل یہاں درج نہیں کی جاسکتی[1]، مختصر یہ کہ بیمے کی موجودہ صورت سود اور قمار سے مرکب ہے اور یہ دونوں چیزیں قطعی طور پر حرام ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۲۴ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۶۲/ ۱۸ الف)

مروّجہ بیمے کی تمام اقسام کا حکم اور ''اِمدادِ باہمی'' کے اُصول پر جائز بیمے کا تصوّر

سوال:- ایک پارٹی کو انشورنس کی پالیسی بیچتے وقت اسے عرض کیا کہ یہ رقم گورنمنٹ منصوبہ

(۱) دلائل کی تفصیل اور تحقیق کے لئے دیکھئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ''بیمۂ زندگی''۔

جات جیسے کھاد فیکٹری، بجلی کے کارخانے، بند و دیگر بڑے بڑے منصوبہ جات پر استعمال ہوکر قوم کے کام آتی ہے، اور اِنسان کی رقم بھی جو کہ جمع ہوکر مثلاً اس کی بیٹی کا جہیز بنتی ہے، بچے کی تعلیم بن کر سامنے آتی ہے، چونکہ اس دور میں یک مشت رقم گھر سے نکالنا بہت مشکل ہے، یہ اِمدادِ باہمی بھی ہے، گورنمنٹ جو قرضہ جات لیتی ہے اسی بناء پر کہ اُسے کسی منصوبے کے لئے رقم درکار ہے، انسان بھی اسی بناء پر اُدھار تک پہنچتا ہے اگر لائف انشورنس خودکشی کے لئے کی جائے تو بُرا ہے، لیکن مندرجہ بالا کو مدِنظر رکھ کر تو شاید بُرا نہیں۔ لیکن یہ فرماتے ہیں کہ کسی عالم دِین سے اجازت لازمی ہے تو کیا انشورنس پالیسی خریدنا جائز ہے؟

جواب:- بہ حالتِ موجودہ جتنی انشورنس کمپنیاں قائم ہیں وہ سب سود اور قمار کے اُصولوں پر مبنی ہیں، لہٰذا ان کے ذریعہ زندگی وغیرہ کا بیمہ کرانا شرعاً ناجائز ہے۔[1] ہاں اگر کوئی کمپنی علماء کی ہدایات کے مطابق صرف اِمدادِ باہمی کے اُصول پر چلائی جائے اور اس کو سود اور قمار سے پاک رکھا جائے تو دُرست ہے، لیکن ابھی تک ایسی کوئی کمپنی قائم نہیں ہے، لہٰذا اس وقت کسی بھی کمپنی کی پالیسی لینا جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۵/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۲/۲۲ ب)

''بیمۂ زندگی'' کی مختلف صورتوں کا حکم

سوال:- بیمہ یا انشورنس کرانا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ کمپنی والے یہ کہتے ہیں کہ ہم سال بھر کے منافع بیمہ کرنے والے کے حصص کے اعتبار سے انہیں بطورِ منافع دیتے ہیں۔

جواب:- زندگی کے بیمے کی جتنی صورتیں اس وقت رائج ہیں، وہ سب ناجائز ہیں۔[2]

فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۸/۱۹ الف)

(۱و۲) تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ''بیمہ زندگی'' ملاحظہ فرمائیں۔

تجارتی مال بردار جہاز کے ڈوبنے کی صورت میں انشورنس کمپنی سے نقصان کی تلافی کرانے کا حکم

سوال۱:- قانون کے بموجب جب ہم مال باہر سے منگواتے ہیں تو لازمی طور پر ہم کو انشورنس کرانا پڑتا ہے، ہم قانون کو پورا کرنے کے لئے سب سے آخری درجے کی انشورنس کراتے ہیں، اس انشورنس کے تحت یہ بات ہوتی ہے کہ اگر سارا کا سارا مال ختم اور ضائع ہوگیا تو انشورنس والے ذمہ دار ہیں، ورنہ نہیں، اس صورت میں (یعنی پورے کے پورے نقصان کی صورت میں) انشورنس واپسی مال کی پوری کی پوری رقم ادا کرتی ہے، بلکہ اصل سے بھی کچھ زیادہ۔ لہٰذا انشورنس والوں نے ہم کو پورے کے پورے مال کا پیسہ ادا کردیا ہے، اس رقم کو ہم کیا کریں؟ آیا یہ رقم لینا جائز ہے یا ناجائز؟

سوال۲:- بھائی حمید صاحب جو اس کام میں آدھا شریک تھے، جب ان سے آدھے نقصان کا مطالبہ کیا گیا تو وہ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں، اور اُن کا فرمانا یہ ہے کہ آپ کو انشورنس کمپنی سے پورے نقصان کی رقم مل گئی ہے۔ اگر حمید صاحب اپنے حصے کا آدھا نقصان ادا نہ کریں تو ہم ان کے حصے کی آدھی رقم انشورنس کے پیسے میں سے (جو ہم کو وصول ہوچکا ہے) لے سکتے ہیں؟

سوال۳:- حمید صاحب کا مطالبہ ہے کہ انشورنس والوں سے رقم اصل سے بھی زیادہ وصول ہوگئی ہے، لہٰذا آدھے حصے سے جو زیادہ ہے اُس میں سے حصہ دو، کیا یہ ادا کردیں؟

جواب۱:- انشورنس کے مروجہ طریقے میں سود بھی ہے اور قمار بھی، لہٰذا انشورنس کمپنی سے صرف اُتنی رقم وصول کرنا جائز ہے جتنی رقم آپ نے اقساط کے طور پر اب تک جمع کی تھی، اس سے زائد لینا جائز نہیں تھا، اب جو رقم زائد ہے اُسے صدقہ کردینا ضروری ہے، اور اس کا صدقہ قریبی غیر صاحب نصاب رشتہ داروں کو بھی کیا جاسکتا ہے۔

جواب۲:- جواب نمبر۱ کے مطابق انشورنس سے لی ہوئی زائد رقم سے نقصان کی تلافی نہیں ہوئی، لہٰذا آپ کے شریک پر اپنے حصے کا نقصان برداشت کرنا واجب ہے، اگر وہ نہ دیں تو گنہگار ہوں گے، انشورنس کی زائد رقم پھر بھی آپ کے لئے جائز نہیں۔

جواب۳:- جب انشورنس کی اکثر رقم ہی ناجائز ٹھہری تو جو نقصان سے زائد رقم ہے وہ تو بطریقِ اَولیٰ ناجائز ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۲۸/۲۷ ھ)

مشترک مالِ تجارت کا جہاز ڈوبنے کی صورت میں انشورنس کمپنی یا شریک سے نقصان کی تلافی کرانے کا حکم

سوال:- ہم نے ایک مال چائنا سے منگوایا، اس مال میں ایک دوست الف سے ہماری شراکت تھی (لکھت نہیں زبانی، زبانی) کہ نفع نقصان آدھا آدھا۔ مال منگوانے میں پورا پورا پیسہ ہم نے لگایا کیونکہ ہمارا اور اُن کا اس طرح کی شراکت کا مال آتا رہتا تھا، کبھی ہم نے منگوایا اور کبھی انہوں نے منگوایا، کبھی پیسہ بعد میں ہم نے دے دیا اور کبھی پیسہ بعد میں اُنہوں نے دے دیا، ہمارے دس بارہ سال سے بھائیوں جیسے تعلقات ہیں، ایک دُوسرے کو ہر ایک پر پورا بھروسہ ہے۔ قانون کے بموجب ہم مال باہر سے منگواتے ہیں تو لازمی طور پر انشورنس کرانا پڑتا ہے، انشورنس میں یہ ہوتا ہے کہ اگر سارا مال ختم یا ضائع ہوجائے تو انشورنس والے اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں، ورنہ نہیں۔ پورے نقصان کی صورت میں انشورنس والے مال کی پوری پوری رقم بلکہ اُس سے بھی کچھ زائد ادا کرتے ہیں۔ یہ مال جس جہاز پر آرہا تھا خداوند کریم کی مرضی سے پورا کا پورا ڈُوب گیا، انشورنس والوں نے ہم کو رقم ادا کردی، جو اصل لاگت سے زیادہ ہے، اب سوال یہ ہے کہ:-

۱- انشورنس والوں سے جو پیسہ ملا ہے وہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

۲- اگر جائز نہیں تو کیا اصل لاگت سے جو زیادہ پیسے وصول ہوئے وہ بھی جائز ہیں یا نہیں؟

۳- اگر ساری کی ساری رقم یا زیادہ رقم ناجائز ہے تو ہم اس رقم کو کیا کریں؟ صدقہ کردیں؟

۴- اگر ساری رقم معہ زیادہ اگر ناجائز ہے تو کیا اپنی لاگت کی رقم جو پوری کی پوری ہم نے لگائی ہے اُس کا نصف اپنے دوست سے لے سکتے ہیں یا نہیں؟

- اگر ہم یہ رقم (یعنی اپنی لاگت کا آدھا حصہ) اگر اپنے دوست الف سے لے سکتے ہیں تو کیا ہم ایسا کرلیں؟ کہ جو رقم انشورنس والوں کے پاس سے آئی ہے اُس کا آدھا حصہ تو اپنے دوست (الف) کو روانہ کردیں کہ وہ اپنے ہاتھ سے صدقہ کردیں اور باقی آدھا حصہ ہم اپنے پاس رکھ لیں اور اپنے ہاتھ سے صدقہ کردیں (آپ نے فرمایا کہ انشورنس کی رقم ناجائز ہے)۔ اور جو مال کی اصل لاگت تھی تو اُس کا آدھا حصہ اُن سے منگائیں۔

جواب ۱:- انشورنس کے مروّجہ طریقے میں شرعاً سود بھی ہے اور قمار بھی، لہٰذا انشورنس کمپنی سے صرف اتنی رقم وصول کرنا جائز ہے جتنی رقم آپ نے کمپنی کے پاس اقساط کے طور پر جمع کی تھی، اس

سے زائد لینا جائز نہیں، اور جب یہ رقم ہی جائز نہیں تو جو رقم لاگت سے زیادہ ملی ہے وہ تو بطریقِ اَولیٰ ناجائز ہے۔

۲:- اصل حکم تو یہ ہے کہ انشورنس کی یہ زائد رقم وصول ہی نہ کی جائے، لیکن اگر غلطی سے وصول کرلی ہے تو اس کو ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کردینا واجب ہے۔

۳:- اگر دوست سے یہ معاہدہ زبانی یا تحریری ہوچکا تھا کہ جو مال آپ اب منگوار ہے ہیں وہ مشترک طور پر منگوایا جائے گا، رقم بھی دونوں لگائیں گے اور نفع ونقصان بھی دونوں پر آدھا آدھا ہوگا، تو آپ اپنے دوست سے لاگت کی آدھی رقم وصول کرسکتے ہیں، اور اُن پر اس کی ادائیگی واجب ہے۔

كما يفهم من ردّ المحتار فى قوله: "دفع الى رجل ألفًا وقال اشتر بها بينى وبينك نصفين والربح لنا والوضيعة علينا، فهلك المال قبل الشراء ويضمن وبعده ضمن المشترى النصف بحر عن الذخيرة، قلت: ووجهه أنّهٗ لما أمرهٗ بالشراء نصفين صار مشتريا للنصف وكالةً عن الآمر وللنصف اصالة عن نفسه وقد اوفى الثمن من مال الآمر فيضمن حصة نفسه.[1] (ردّ المحتار ج:۳ ص:۳۴۰).

قلت:- والصورة المسئولة عكسه ولا فرق فى العلّة.

لیکن یہ اس صورت میں ہے جبکہ یہ معاہدہ زبانی یا تحریری ہوچکا ہو، اور اگر آپ کے دوست کو اس مال کے منگوانے کا علم نہیں تھا یا انہوں نے اس مال کے بارے میں آپ کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی اور آپ نے محض ماضی کے تعلقات کے اعتماد پر منگوایا تھا تو پھر پورے نقصان کے ذمہ دار آپ ہیں، دوست پر نقصان کی ذمہ داری نہیں۔

۴:- جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا اصل حکم تو یہ ہے کہ یہ رقم لی ہی نہ جائے، لیکن اگر غلطی سے لے لی تو اسے صدقہ کرنا واجب ہے، خواہ پوری رقم آپ صدقہ کریں، اور خواہ آدھی خود صدقہ کریں اور آدھی دوست صدقہ کرے۔

۵:- اس کا مفصل جواب نمبر۳ میں آچکا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴؍۱؍۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲/ ۲۸ الف)

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الشركة ج:۴ ص:۳۱۱ (طبع سعيد كراچى).

غیر ملکی سفر کے لئے ''بیمۂ زندگی'' کی قانونی پابندی اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی صورت

سوال:- جن لوگوں کا سعودی عرب، متحدہ عرب امارات یا کویت میں کام کرنے کا ویزا لگ جاتا ہے اور وہ پہلی مرتبہ جاتے ہیں تو حکومتِ پاکستان اُس کا بیمہ کراتی ہے، جو ایک لاکھ کا ہوتا ہے، یہ بینکوں میں ۶۵۰۰ روپے جمع کرتا ہے، اگر یہ ایک سال کے اندر وہاں مرجائے تو بیمہ والے اس کو ایک لاکھ روپے یا کم زیادہ دے دیتے ہیں۔ بعض ایسے جانے والے جو غریب ہوتے ہیں یا ایسے ہی نہیں دیتے تو ٹریول ایجنسی والے ایئرپورٹ میں بات کر کے اُس سے روپے لے لیتے ہیں اور اپنے لئے بھی اس میں روپے رکھ لیتے ہیں، کیا ایسی کمائی ٹریول ایجنسی کے لئے شریعت کی رُو سے حلال ہے یا حرام ہے؟

جواب:- بیمہ شرعاً جائز نہیں، اگر کسی کو سفر میں جانا ضروری ہو اور قانوناً سفر میں اس کے بغیر نہ جاسکتا ہو تو مجبوراً بیمہ کراسکتا ہے، مگر ہلاک ہونے کی صورت میں صرف اتنی رقم بیمہ کمپنی سے وصول کرسکتا ہے جتنی پریمیم میں جمع کرائی تھی، لہٰذا اگر کسی سرکاری افسر سے بات کر کے کسی کو بغیر بیمہ کے روانہ کیا جاتا ہے تو اس کی گنجائش ہے بشرطیکہ اس کے لئے رِشوت نہ دینی پڑے، اس کی اُجرت لینے کی بھی گنجائش ہے۔

واللہ اعلم
۱۴۲۱/۱/۲ھ

گروپ انشورنس اور پراویڈنٹ فنڈ کا شرعی حکم

سوال ۱:- تمام سرکاری دفاتر میں ایک اسکیم Provident Fund and Group Insurance Scheme (گروپ انشورنس) کے نام سے گورنمنٹ نے لازمی طور پر شروع کی ہے، جس کے تحت گورنمنٹ ہر ملازم کے لازمی طور پر (اس کی مرضی کے مطابق یا خلاف) ایک فیصد یعنی سو روپے میں سے ایک روپیہ ماہانہ کے حساب سے اصل تنخواہ میں سے کاٹ لیتی ہے، اس کے بعد اگر ایک ملازم دورانِ نوکری میں بھی مرجائے تو اگر اس مرنے والے ملازم کی اصل تنخواہ ایک سو پچاس روپے ماہوار تک تھی تو اس کے نامزد کردہ وارث کو گورنمنٹ دو ہزار روپیہ دے گی، اس طریقے سے اگر تنخواہ پانچ سو تھی تو پانچ ہزار اور اگر سات سو تھی تو دس ہزار دے گی۔ اگر ملازم نوکری کے دوران نہیں مرا بلکہ ریٹائر ہونے سے پہلے مرا یعنی ساٹھ سال تک نہیں پہنچا تو اس کے لئے مندرجہ ذیل شرح سے اس کے (مرنے والے ملازم کے) نامزد کردہ وارث کو ماہوار رقم ملے گی، اگر اس مرنے والے کی اصل تنخواہ ماہوار ایک سو تھی تو اس کے نامزد وارث کو گورنمنٹ ۵۰ روپیہ ماہوار ادا کرے گی، اگر دو سو ہو تو پچھتر،

تین سو ہو تو ایک سو، چار سو ہو تو ایک سو پچھتر۔ بصورتِ دیگر یعنی اگر وہ ملازم نہ نوکری کے دوران مرا ہے اور نہ ہی ساٹھ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے مرتا ہے اس کو گورنمنٹ کچھ نہیں دیتی اور نہ ہی اس کی ماہوار ایک فیصد کے حساب سے لازمی طور پر کاٹی ہوئی رقم جو اس کی پوری نوکری کے دوران ہر ماہ کٹتی رہی (لازمی طور پر) واپس کی جاتی ہے، یعنی اس کی اپنی کاٹی ہوئی رقم بھی واپس نہیں کی جاتی، کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

سوال۲:- گورنمنٹ ہر ملازم سے جی پی فنڈ کے نام سے کم از کم ۱۰ روپے ماہوار یا مزید جس قدر ملازم کٹوانا چاہے لازمی طور پر کاٹتی ہے، اور نوکری کے ختم پر اس ملازم کو تمام نوکری کے دوران کاٹی ہوئی رقم بمع سوا چھ فیصد سالانہ کے حساب سے سود دیتی ہے۔ اب یہ سود ہوگا یا نفع یا انعام؟ اور جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب۱:- گروپ انشورنس کی جو صورت آپ نے تحریر کی ہے، نیز اس کے جو قواعد وضوابط معلوم ہو سکے ہیں ان کی رُو سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:-

۱:- ہر ملازم کی تنخواہ سے کچھ رقم جبری طور پر کاٹی جاتی ہے۔

۲:- اس طرح ملازموں کی تنخواہوں سے کٹوتی کر کے حکومت نے ایک فنڈ قائم کیا ہے جس کی رقوم نفع بخش کاموں میں صَرف کی جائیں گی۔

۳:- ملازم کی وفات کے بعد ہر ملازم کے مقرّر کردہ وصی کو ایک معین رقم دی جائے گی جو کٹوتی کی مقدار سے زیادہ ہوگی۔ اس معاملے پر غور کرنے سے اس کی صورت شرعاً جبری پراویڈنٹ فنڈ سے مختلف معلوم نہیں ہوتی ہے اور پراویڈنٹ فنڈ کے بارے میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس پر جو زیادہ رقم حکومت کی طرف سے دی جاتی ہے وہ سود نہیں ہے، اس کا لینا ملازم کے لئے جائز ہے، اسی طرح گروپ انشورنس کے لئے جو جبری کٹوتی کی جائے گی وہ دَینِ ضعیف ہونے کے سبب ملازم کی مملوکِ تام نہیں ہے، لہٰذا حکومت یا محکمے نے جو تصرف کر کے اس کو بڑھایا تو یہ تصرف ملازم کی ملکیت میں نہیں ہوا، اور نہ ملازم کے ساتھ اس کا کوئی معاملہ ہوا، اب اگر حکومت ان حاصل شدہ منافع کا کچھ حصہ اپنے ملازم کو دیتی ہے تو وہ شرعاً ایک اِنعام اور تبرّع ہے، سود کی تعریف میں داخل نہیں ہے، اور ملازم کے لئے اس کا لینا جائز ہے۔ البتہ چونکہ یہ حاصل شدہ منافع بعض ایسے معاملات کے ذریعے بھی ہوتے ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ تنخواہ میں سے جتنی رقم کاٹی گئی ہے وہ تو ملازم خود رکھ لے، اور باقی رقم غریبوں کو صدقہ کر دے، اور یہ ایسا صدقہ ہے کہ اپنے غریب رشتہ داروں اور بیوی بچوں پر بھی صَرف کیا جا سکتا ہے، یہ جواب شرعی قواعد کی رُو سے لکھا گیا ہے۔ لیکن چونکہ کتب

فقہ میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے، اس لئے بہتر ہے کہ اس معاملے میں دُوسرے علماء سے بھی اِستصواب کرلیا جائے۔

جواب۲:- پراویڈنٹ فنڈ کا حکم سوال نمبرا کے جواب میں آگیا ہے کہ اس پر جو زیادتی حکومت دیتی ہے وہ سود نہیں ہے، اسے لینا جائز ہے، اور کوئی شخص احتیاط کرے تو بہتر ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۹۱/۵/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۶۸۶ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

''گروپ انشورنس'' کا حکم

سوال:- سرکاری ملازمین کی جو ''گروپ انشورنس'' (اجتماعی بیمہ) ہوتی ہے اس کے لئے رقم کا ادا کرنا اور اس پر بصورتِ حادثہ رقم کا حاصل کرنا کیسا ہے؟ مثلاً زید نے ساڑھے سترہ سو روپے مالی سال کے شروع میں ادا کئے، اگر اس کو اس سال میں حادثہ پیش آگیا تو اس کے وارثین کو سات ہزار روپیہ مل جائے گا، اگر حادثہ پیش نہ آیا تو مالی سال کے اختتام پر یہ ساڑھے سترہ سو روپے کی رقم ختم ہوجاتی ہے اور اگلے سال سے نیا معاہدہ کرنا ہوگا۔

جواب:- ''گروپ انشورنس'' کے قواعد وضوابط دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس اسکیم میں ہر ملازم کی تنخواہ سے جبری طور پر کٹوتی وصول کی جاتی ہے، اگرچہ محکمہ والوں کے لئے ایسا کرنا دُرست نہیں، لیکن جن ملازمین کی تنخواہ سے جبراً یہ رقم وصول کی گئی اگر انہیں یہ رقم واپس نہ ملی تو یہ محکمہ والوں کی طرف سے شرعاً ''غصب'' ہوگا، اور اگر کسی حادثے کی صورت میں کوئی بڑی رقم اصل رقم سے زائد دی گئی تو یہ پراویڈنٹ فنڈ کی زیادتی کی طرح سود شمار نہ ہوگی،[1] کیونکہ دَینِ ضعیف پر زیادتی ہے، مرحوم کے وارثان کے لئے اسے وصول کرنے کی گنجائش ہے، لیکن احتیاط اس میں ہے کہ جو رقم اصل کٹوتی سے زائد وصول ہوئی ہے اسے صرف غریبوں پر خرچ کیا جائے خواہ رشتہ دار ہوں یا غیر رشتہ دار۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۷/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۸۵۴ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ'' ملاحظہ فرمائیں۔

گروپ انشورنس کی تحقیق اور اس کا شرعی حکم

سوال:- گروپ انشورنس کے بارے میں آپ کا فتویٰ مؤرخہ ۱۳۹۱/۵/۲۱ھ قاری سعیدالرحمٰن صاحب جامعہ اسلامیہ راولپنڈی کی مہربانی سے مجھے بھی دیکھنے کا فخر حاصل ہوا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ سوال پوچھنے والے نے اس بارے میں صحیح حالات آپ کو نہیں بتائے، چونکہ مسئلہ بہت اہم ہے اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس اسکیم کے متعلق کچھ مزید حالات آپ کی خدمت میں پیش کروں، ممکن ہے کہ اس کے بعد اس اسکیم کے جواز کے متعلق آپ اپنی قیمتی رائے یا فتویٰ دینا چاہیں۔

حکومت نے ایک انشورنس کمپنی کا بندوبست کیا ہے کہ فوجیوں کی زندگی کا ایک خاص طریقے سے بیمہ کیا جائے، اس کو ''گروپ انشورنس'' کہا جاتا ہے، اس کے مطابق فوجیوں سے ان کے عہدے کے مطابق ایک مقررہ رقم سال میں ایک دفعہ وصول کر کے بیمہ کمپنی کو دے دی جاتی ہے، اس سال کے دوران اگر ان فوجیوں میں کوئی آدمی فوت ہوجائے تو بیمہ کمپنی مرحوم کے وصی کو ایک مقرر شدہ رقم ادا کرتی ہے۔ جو اصل وصول شدہ رقم سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اکثر فوجی جو اس سال کے دوران زندہ رہتے ہیں ان کو اور ان کے وصی کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ اگر بیمہ کمپنی کو اس کاروبار میں کافی نفع ہو تو بعض حالات میں بیمہ کمپنی اس نفع میں سے کچھ رقم حکومت کے فنڈ میں بھی دے دیتی ہے، لیکن جن فوجیوں سے رقم وصول کی گئی تھی ان کو بالواسطہ کچھ نہیں دیا جاتا۔ اس اسکیم کے چند اہم نکات یہ ہیں:-

۱- اس اسکیم کے ماتحت ملازم کی تنخواہ میں سے رقم کاٹی نہیں جاتی بلکہ وقتِ مقررہ پر طلب کی جاتی ہے، اور فوجی تنخواہ وصول کر لینے کے بعد اس میں سے یا اپنی جیب سے مقررہ رقم حکومت کے ایک نمائندے کو ادا کر دیتا ہے۔ اسی طرح مختلف افراد سے جمع کی ہوئی رقم انشورنس کمپنی کو پہنچادی جاتی ہے۔

۲- اس کو جبری کٹوتی کہنا ٹھیک نہیں، بعض فوجی یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ وہ مذہبی عقیدے کی بناء پر اس اسکیم میں شامل نہیں ہونا چاہتے، تو ان کو ادائیگی پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ میں خود اس اسکیم میں شامل نہیں ہوں، اور نہ مجھ سے کوئی کٹوتی ہوتی ہے، اور نہ میں کسی اور طریقے سے رقم ادا کرتا ہوں۔

۳- فوجیوں سے جمع کی ہوئی رقم حکومت کے پاس نہیں رہتی اور نہ ہی حکومت اس کے صَرف سے کچھ تعلق رکھتی ہے، بلکہ حکومت کے نمائندے رقم جمع کر کے انشورنس کمپنی کو دے دیتے ہیں، اور وہ کمپنی ہی اس کا صَرف کرتی ہے۔

۴- بظاہر یہ صورت پراویڈنٹ فنڈ سے بہت مختلف ہے، بلکہ چند قسم کے بیموں کی طرح ہے۔ مثلاً ہوائی سفر کا بیمہ۔ بعض مسافر بیمہ کمپنی سے بندوبست کرتے ہیں اور کچھ رقم ادا کر کے یہ فیصلہ ہوتا

ہے کہ اگر مسافر ہوائی حادثے میں فوت ہوجائے تو کمپنی اس کے وصی کو ایک مقرّرہ رقم ادا کرے گی جو اصل رقم سے کئی گنا زیادہ ہوگی، اور اگر جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کہ حادثہ کوئی نہ ہو تو مسافر کو یا اس کے وصی کو کوئی رقم نہیں ملتی، کیا یہ شرعاً جائز ہے؟

جواب:- گروپ انشورنس کے بارے میں چونکہ سوالات مختلف اَطراف سے آرہے تھے اس لئے ہم نے اس کے وہ مطبوعہ قواعد منگا کر دیکھے جو حکومت کی طرف سے طے کئے گئے تھے، ان سے ہمیں مندرجہ ذیل اُمور ثابت ہوئے:-

ا:- یہ کٹوتی جبری ہے، اگر کوئی شخص اپنا وصی نامزد نہ کرے تب بھی رقم کٹے گی اور اس کی موت کے بعد کسی مناسب رشتہ دار کو دی جائے گی۔

۲:- یہ رقم تنخواہ میں سے تنخواہ کی ادائیگی سے قبل کاٹی جائے گی، تنخواہ دینے کے بعد ملازم ازخود نہیں دے گا۔

۳:- کاٹی ہوئی رقمیں کسی بیمہ کمپنی کو دینے کے بجائے ان سے ایک فنڈ قائم کیا جائے گا، جس سے تجارت کی جائے گی، اور اس سے حاصل ہونے والا منافع متوفی ملازمین کے رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے گا۔

گروپ انشورنس کے بارے میں ہمارا پہلا جواب انہی تین بنیادوں پر مبنی تھا، لیکن آپ نے جو صورت لکھی ہے اس میں یہ تینوں باتیں مفقود ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سِول ملازمین اور فوجی ملازمین کے قواعد میں حکومت نے کوئی فرق رکھا ہو۔ بہرحال جو صورت آپ نے لکھی ہے اگر واقعہ ایسا ہی ہے تو اس اسکیم میں حصہ دار بننا بلاشک و شبہ ناجائز ہے۔ اور اگر کوئی شخص غلطی سے حصہ دار بن گیا ہو تو وہ یا اس کا وصی صرف اپنی اصل رقم وصول کرسکے گا، جو زیادتی دی جائے گی، اس کا لینا ناجائز ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں اور بیمہ زندگی میں شرعی اَحکام کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں اور اس میں سود و قمار پایا جاتا ہے۔

رہی یہ بات کہ اس اسکیم کے فوائد کو جائز طور پر کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے؟ سو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تمام ملازمین اپنی مرضی سے بلاجبر و اِکراہ ایک رضاکارانہ اِمدادِ باہمی فنڈ قائم کریں، اور اس میں اپنی خوشی سے تنخواہ کا کوئی حصہ ہر ماہ دیا کریں، جو شخص اس میں شریک نہ ہونا چاہے اسے مجبور نہ کیا جائے۔ پھر فنڈ کی جمع شدہ رقم کو کسی جائز تجارت میں لگائیں، اس طرح فنڈ کی رقم میں اضافہ ہوتا رہے، اس کے بعد اس فنڈ سے مرنے والے ملازمین کے پسماندگان کی اِمداد کی جائے۔ اس میں یہ شرط

رکھی جاسکتی ہے کہ یہ امداد صرف اُن لوگوں کے ورثاء کو دی جائے گی جو فنڈ کے ممبر ہوں گے۔[1] اگر مسلمان ملازمین کوشش کر کے اسکیم کو بدلوا کر شریعت کے مطابق بنائیں تو اَجرِ عظیم ہوگا۔ لیکن بہتر یہ ہوگا کہ اسکیم بناتے وقت مستند مفتیوں سے رُوبرو مشورہ کرلیا جائے تا کہ پھر کوئی شرعی قباحت پیدا نہ ہو۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۹۱/۸/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۳/۲۲ ب)

انشورنس کی رقم وصول کرنے کا مشورہ دینا اور اسے استعمال کرنے کا حکم

سوال:- آپ کا جواب ملا، عرض یہ تھی کہ فریقِ ثانی (یعنی جس سے ہماری شراکت تھی) کچھ اس قسم کے آدمی ہیں کہ انشورنس کے کام کو غلط نہیں سمجھتے، لہٰذا اس بات کا امکان ہے کہ اگر ان سے فتویٰ کی بات کی جائے تو شاید وہ مذاق اُڑائیں، لہٰذا ہم ایسا کرلیں کہ جو رقم انشورنس والوں کے پاس سے آئے اس کا آدھا حصہ تو ان کو روانہ کردیں اور بقیہ آدھا حصہ صدقہ کردیں؟

۲:- جو مال کی اصل لاگت تھی اس کا آدھا حصہ اُن سے منگالیں؟

جواب:- انشورنس کی رقم لینے کا کسی بھی مسلمان کو مشورہ نہیں دیا جاسکتا، آپ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ انشورنس کی آدھی رقم ان کو بھیج کر انہیں اپنی طرف سے اس بات پر مامور کریں کہ وہ یہ رقم صدقہ کردیں، کیونکہ اس کا رکھنا جائز نہیں ہے، اس کے ساتھ ہی آپ کو اُن سے اپنی رقم کا مطالبہ کرنا بھی جائز ہے، اب وہ آپ کی رقم آپ کو جہاں سے چاہیں دیں، اپنے فعل کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے اور انہیں انشورنس کا مسئلہ ضرور بتلادینا چاہئے، وہ اس پر عمل کریں یا نہ کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۴۷/۲۷ و)

---

(۱) تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' ص:۱۶۰ تا ۱۶۳ ملاحظہ فرمائیں۔ نیز تجارتی بیمہ کا متبادل ''تکافل'' کے نام سے بھی منظر پر آچکا ہے جس کی قدرے تفصیل کے لئے ص:۳۱۴ تا ۳۲۷ ملاحظہ فرمائیں۔

۱:- مختلف معموں کے ذریعے حاصل کئے گئے اِنعام کا حکم
۲:- لائف انشورنس کی مختلف مروّجہ صورتوں کا حکم

سوال:- کیا معموں کے ذریعے اِنعام حاصل کیا ہوا روپیہ حرام ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟

جواب:- معمے کے حل بھیجنے کے لئے اگر کوئی فیس مقرّر کی گئی ہو تو وہ قمار میں داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔[1]

سوال:- اپنے آپ کو انشورڈ کرانا جائز ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟

جواب:- زندگی کے انشورنس کی جو صورتیں رائج ہیں وہ بھی اسی مذکورہ بالا وجہ سے ناجائز ہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۶ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۹۳/۱۹ الف)

انشورنس کی مروّجہ صورتوں اور مسجد کا انشورنس کرانے کا حکم

سوال:- حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آکلینڈ (نیوزی لینڈ) سے خلیل احمد کا سلام عرضِ خدمت ہے

ایک سوال عرضِ خدمت ہے، لیکن اس سے پہلے یہاں کے حالات عرض کرنا چاہتا ہوں۔

یہاں نیوزی لینڈ میں تقریباً بیس ہزار مسلمان آباد ہیں جو مختلف ممالک سے آئے ہوئے ہیں اور زیادہ تر مسلمان پچھلے دس سالوں میں آئے ہیں جو اکثر دُکان اور فیکٹری وغیرہ میں کام کرتے ہیں، اور کچھ رفیوجی آئے ہوئے ہیں جو صومالیہ اور عرب ممالک کے ہیں جو مالی اعتبار سے غرباء ہیں۔ یہاں پورے ملک میں پانچ مساجد اور آٹھ عبادت گاہ ہیں، جو ملک کے مختلف شہر میں پائے جاتے ہیں، اور فی الحال آکلینڈ شہر میں دو مسجد اور ایک مسلم اسکول کا کام چل رہا ہے، اور زیادہ تر چندہ مقامی مسلمانوں نے جمع کیا ہے، یہاں کی کرنسی ڈالر ہے، ایک ڈالر کے پاکستانی بائیس روپے ملتے ہیں، اور یہاں کی حکومت کے قوانین برطانیہ کے قوانین جیسے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہاں دو ایک مسجد والوں نے مسجد کا انشورنس کروایا ہے، اور ایک مسجد جو آٹھ ماہ پہلے بن کر تیار ہوئی ہے اس میں کسی نے جمعرات ۶/اگست ۱۹۹۸ء کو صبح چار بجے آگ لگادی اور آگ لگانے سے پہلے قیمتی سامان کی چوری کی، ابھی تک کوئی مجرم نہیں پکڑا گیا ہے، اب ایسے حالات میں کیا کرنا چاہئے؟ کیا مسجد کا انشورنس لے سکتے ہیں یا

(۱) تفصیل کے لئے اگلا فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

نہیں؟ اگر انشورنس دُرست نہ ہوتو ان صورتوں کا کیا حکم ہے؟ برائے کرم جواب مرحمت فرما کر مشکور فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

فقط والسلام محتاجِ دُعا
بندہ خلیل احمد آکلینڈ، نیوزی لینڈ
بروز پیر ۱۰/اگست ۱۹۹۸ء

جواب: - مکرمی ومحترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا فیکس ملا، انشورنس کی مروّجہ تمام صورتیں سود یا قمار پر مشتمل ہونے کی بناء پر ناجائز ہیں، لہٰذا مسجدوں کا انشورنس نہیں کرانا چاہئے تھا، لیکن اب جبکہ کرالیا تو حادثے کی صورت میں کمپنی سے رقم وصول کرلیں، پھر جتنی رقم اب تک مسجد کی طرف سے پریمیم کے طور پر ادا کی گئی ہے، اتنی رقم تو مسجد ہی کی مرمت وغیرہ میں براہِ راست استعمال کرسکتے ہیں، باقی رقم کسی مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کردی جائے، پھر اگر وہ شخص اپنی خوشی سے وہ رقم یا اس کا کچھ حصہ مسجد کو بطورِ چندہ دیدے تو اس کو بھی مسجد میں استعمال کرسکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۹/۴/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۴/۸۷)

تقسیمِ انعامات کے لئے قرعہ اندازی کرنے کا حکم

سوال: - عالمگیر ویلفیئر ٹرسٹ نے کھالیں جمع کرنے والے بچوں کو ان کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامات تقسیم کئے، ہمارے پاس کچھ انعام اضافی ہوگئے تھے، ہم نے یہ اعلان کیا کہ قرعہ اندازی کے ذریعے یہ انعام انہی بچوں میں تقسیم کردیئے جائیں گے، لیکن ایک صاحب نے توجہ دِلائی کہ یہ عمل ناجائز ہے اور جوئے کے زُمرے میں آتا ہے، ہماری رہنمائی فرمائیں۔

جواب: - اگر بچوں سے انعام یا قرعہ اندازی میں شرکت کے لئے کوئی فیس وصول نہیں کی گئی تو یہ قمار نہیں ہے،[1] اور قرعہ اندازی تقسیمِ انعامات کے لئے جائز ہے۔[2]　　واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

۱۴۱۸/۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۳/۲۲)

(۱ و ۲) وفی ردّ المحتار کتاب الحظر والاباحة ج:۶ ص:۴۰۳ لأنّ القمار من القمر الّذی یزداد تارة وینقص أخریٰ وسمّی القمار قمارًا لأنّ کل واحد من المقامرین ممن یجوز أن یذھب مالہ الیٰ صاحبہ ویجوز ان یستفید مال صاحبہ وھو حرام بالنّص .... الخ.

وفی المبسوط للامام السرخسیؒ ج:۱۵ ص:۷ استعمال القرعة فی مثل ھذا الموضع جائز عند العلماء أجمع رحمھم اللہ بھذا الحدیث قلنا اذا تزوج أربع نسوة فلہ أن یقرع بینھن لابدائہ بالقسم لأن لہ أن یبدأ بھن من شاء منھن فیقرع بینھن تطیبًا لقلوبھن اھ. ھکذا فی فتح القدیر ج:۴ ص:۳۸۵ معارف القرآن ج:۷ ص:۴۷۸.

نیز تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کا فیصلہ "لاٹری حرام ہے" "البلاغ" ماہ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ میں ملاحظہ فرمائیں۔

﴿فصل فی أحکام البنوک﴾

(مختلف بینکوں کے اَحکام)

حبیب بینک اور دُوسرے بینکوں کے نفع، نقصان کے کھاتہ میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- حبیب بینک نے P.L.S کھاتہ میں سود سے پاک نفع ونقصان کی بنیاد پر شراکت شروع کی تھی، اس میں میرے والد صاحب نے اکاؤنٹ کھولا ہے، آپ کی معلومات کے مطابق کیا بینک کی یہ شراکت شرعی اُصولوں کے موافق ہے؟

جواب:- حبیب بینک یا دُوسرے پاکستانی بینکوں کے ''نفع ونقصان کے کھاتے'' میں سرمایہ کاری اس لئے دُرست نہیں کہ یہ سارے بینک آگے اس روپے کو جو استعمال کرتے ہیں وہ سودی کاموں میں استعمال کرتے ہیں، اگرچہ نام بدلا ہوا ہے، لہٰذا اس کھاتے میں رقم رکھوانا اور اس کے نفع کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے،[1] جواب تک نفع ہوا ہے، اسے بغیر نیتِ ثواب کے صدقہ کردیا جائے۔

والسلام
۱۴۱۹/۱۱/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۳۵۲/۷)

''فیصل اسلامک بینک'' کا طریقۂ کار اور اس کی مختلف شاخوں کا حکم

سوال۱:- عرض یہ ہے کہ حضرتِ والا سے معلوم ہوا کہ ''فیصل اسلامک بینک آف بحرین'' کا P.L.S اکاؤنٹ جواز کے درجے میں ہے، جبکہ عام بنکوں کے P.L.S اکاؤنٹ میں رقم رکھ کر منافع حاصل کرنا جائز نہیں۔ براہِ کرم مطلع فرمائیں کہ فیصل اسلامک بینک کے اکاؤنٹ P.L.S میں رقم رکھ کر منافع حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

---

(۱) وفی المشکوۃ ج:۱ ص:۲۴۴ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن جابر رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکل الربا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھُم سواء. (رواہ مسلم). نیز دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

۲:- ہمارے دفتر میں ملازمین نے ایک نجی ادارہ رضا کارانہ طور پر قائم کیا ہے، جس کا نام KEBF ہے، یہ ادارہ شرعی وقف ہے، اس کا مقصد ملازمین میں سے (جو کہ ادارے کے ممبر ہوں) کسی کے انتقال پر ان کے لواحقین کو فوری مالی امداد پہنچانا ہے، جب کوئی انتقال کرتا ہے تو اس کی مالی حالت کا لحاظ کئے بغیر اس کے لواحقین کو ایک مقررہ رقم پہنچادی جاتی ہے، اس فنڈ کی کثیر رقم این آئی ٹی میں رکھی تھی، مگر اب چونکہ این آئی ٹی جائز نہ ہونے کا فتویٰ شائع ہو چکا ہے اس لئے وہاں سے رقم نکالی جارہی ہے، دریافت طلب بات یہ ہے کہ پچھلے دو سال میں ہم جو این آئی ٹی کا منافع لے چکے ہیں، اس کا تمیں فیصد تقریباً ۱۵ ہزار روپے بنتا ہے، جبکہ فنڈ کے پاس کل جمع شدہ رقم دو لاکھ ہے، مندرجہ بالا تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے (فنڈ کا وقف ہونا فنڈ کا استعمال ناجائز منافع ۱۵ ہزار جبکہ کل رقم دو لاکھ ہے) کیا ہم پر لازم ہے کہ پچھلے دو سال کے منافع کا ۳۰ فیصد صدقہ کردیں، یا اس خاص صورت میں (جبکہ منافع لیتے وقت اس کے ناجائز ہونے کا علم بھی نہ تھا) یہ رقم فنڈ میں ہی رہنے دی جاسکتی ہے؟

جواب ۱:- فیصل اسلامک بینک کی جو شاخ کراچی میں قائم ہوئی ہے، اُس کے طریقِ کار اور معاملات کی جس قدر تحقیق احقر کرسکا ہے اس کی رُو سے اس کے معاملات جوازِ شرعی کی حدود میں ہیں، لیکن دو وضاحتیں ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ یہ حکم صرف کراچی شاخ کا ہے، بحرین اور سعودی عرب میں یہ بینک جس طریقِ کار کے تحت کام کر رہا ہے اس میں بعض اُمور خلافِ شرع بھی ہیں، جن کی اصلاح کی کوشش کی جارہی ہے۔ دُوسری بات یہ ہے کہ یہ حکم بینک کے موجودہ طریقِ کار کا ہے، اگر بینک اپنے اس طریقِ کار میں کوئی تبدیلی کرلے تو اس تبدیلی کے مطابق حکم ہوگا،[1] لہٰذا وقتاً فوقتاً اس کے بارے میں مستند معلومات حاصل کرتے رہنا چاہئے۔

۲:- این آئی ٹی کے منافع میں سے جو ۳۰ فیصد منافع ناجائز ذرائع سے حاصل ہوا اس کا اصل حکم تو یہ ہے کہ وہ ان لوگوں یا اداروں کو لوٹایا جائے جہاں سے حاصل ہوا تھا، لیکن اگر ان کا معلوم ہونا مشکل ہو جیسا کہ ظاہر یہی ہے، تو پھر یہ رقم صدقہ کرنی ضروری ہے، اس کو فنڈ کا حصہ بنانا تو دُرست نہیں ہوگا، البتہ اس رقم کو علیحدہ کرکے اُسے صرف ایسے افراد پر صَرف کیا جاسکتا ہے جو مستحق زکوٰۃ ہوں، خواہ وہ اس ادارے کے ملازمین یا فنڈ کے ممبران ہی کیوں نہ ہوں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۸/۱۰/۱۴۰۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۱۳۷/۳۹ ز)

---

(۱) چنانچہ بعد میں اس بینک کے حالات تبدیل ہوگئے، اور اس کے ساتھ معاملہ کرنا جائز نہ رہا۔ (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ)

اِمارتِ اسلامی کے قیام کے بعد افغانستان کے اسلامی بینکوں کے لئے لوگوں سے پچھلے قرضوں پر سود وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال:- ماذا رأی علماء الأمّة فی المسئلة التالیة؟ وهی أن البنوک الاسلامیة الأفغانیة بعد قیام الامارة الاسلامیة فی أفغانستان واجهت مشکلة کبیرة، وهی أن البنوک الأفغانیة قبل الامارة الاسلامیة فی النظام الربوی لها دیون علی الآخرین وکذا علیها دیون للآخرین، ولکن قروض البنوک الأفغانیة علی الآخرین کثیرة ووفیرة جدًا یمکن بها تجهیز المملکة بأسرها التی سقط اقتصادها کل السقوط، فهل یمکن حصول تلک القروض الربویة لاستحکام الامارة الاسلامیة فی ضوء القرآن والسّنّة أم لا؟ وهل یجوز إعطاء تلک الدیون الربویة علی البنوک للدّائنین أم لا؟

جواب:- لا یجوز للبنوک الأفغانیة أخذ الفوائد علیٰ قروضها، ولها الحق فی استرداد أصل القرض، وکذٰلک یجوز لها أن تصالح مدیونیها علیٰ أساس المضاربة الشرعیّة فتشارکهم فی أرباحهم الّتی حصلوا علیها من استخدام مبالغ هٰذه القروض، وذٰلک اقتداء بفعل سیّدنا عمر بن الخطّاب رضی الله عنه، حیث جعل قرض ابنه الذی اقترضه من بیت المال قراضًا، کما رواه مالک فی المؤطا،[1] أمّا قروضها الّتی اقترضتها من غیرها، فلا یجوز دفع الفائدة علیها، الّا اذا اضطرّت الیه لسبب من الأسباب.

والله سبحانه وتعالیٰ أعلم وعلمه أتم وأحکم

محمد تقی العثمانی عفا الله عنه

۲۸/شعبان ۱۴۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۹۴)

---

(۱) وفی المؤطّا للامام مالک رحمه الله کتابُ القِراض ص:۶۹۱ (طبع نشر جمعیة احیاء التراث الأسدی) وفی طبع مکتبه قدیمی کتب خانه ص:۶۱۶ و۶۱۷.

عن زید بن أسلم عن أبیه أنّه قال: خرج عبدالله وعبیدالله ابنا عمر بن الخطّاب فی جیشٍ الی العراق، فلمّا قفلا مرّا علیٰ أبی موسی الأشعری وهو أمیر البصرة فرحّب بهما وسهّل ثم قال: لو أقدر لکما علی أمر انفعُکما به لفعلتُ، ثم قال: بلیٰ هٰهنا مالٌ من مال الله أرید أن أبعث به الیٰ أمیر المؤمنین فأسلفکما فتبتاعان به متاعًا من متاع العراق ثم تبیعانه بالمدینة فتؤدّیان رأس المال الی أمیر المؤمنین فیکون لکما الرّبح، فقالا: وَدِدْنا ففعل وکتب الیٰ عمر بن الخطّاب أن یأخذ منهما المال، فلمّا قدما باعا فاربحا فلمّا دفعا ذٰلک الیٰ عمر بن الخطّاب قال: أکلّ الجیش أسلفه مثل ما أسلفکما قال: لا، فقال عمر بن الخطّاب: ابنا أمیر المؤمنین فأسلفکما أدّیا المال وربحه فأمّا عبدالله فسکت وأمّا عبیدالله فقال: ما ینبغی لک یا أمیر المؤمنین هٰذا لو نقص المال أو هلک لضمنّاه. فقال: أدّیاه فسکت عبدالله وراجعه عبیدالله، فقال رجلٌ من جلساء عمر: یا أمیر المؤمنین! لو جعلته قراضًا، فقال عمر: جعلته قراضًا، فأخذ عمر رأس المال ونصف ربحه وأخذ عبدالله وعبیدالله نصف ربحِ المال.

"البنک الأهلی التجاری" میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- سعودی عرب کے ایک بینک "البنک الأهلی التجاری" میں والد صاحب نے اکاؤنٹ کھولا ہے، جس میں شیئرز کا کاروبار ڈالروں کی شکل میں ہے، اس کی پراسپکٹس ہمراہ ہے، جس میں اُصول وقواعد درج ہیں، والد صاحب نے بھی اس کے شیئرز خریدے ہیں، کیا اس بینک کا شیئرز کا کاروبار جائز ہے؟

جواب:- "البنک الأهلی التجاری" کے فنڈ کے پراسپکٹس میں جو طریقہ بیان کیا گیا ہے، وہ مرابحہ پر مبنی ہے، اور شرعی اعتبار سے اُصولاً جائز اور دُرست ہے، لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ بہت سے بینک اس معاملے کی شرعاً (ساری) شرائط پوری نہیں کرتے، اور بعض اس کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے معاملات کی براہِ راست چیکنگ کرنی پڑتی ہے، چونکہ ان کا دعویٰ شرعی اُصولوں کے مطابق بیع وشراء کا ہے، اس لئے ایک عام آدمی کے لئے اس میں سرمایہ کاری کی گنجائش تو ہے کیونکہ پراسپکٹس میں صحیح اُصولوں کا اعلان کرنے کے بعد اگر ادارے کے منتظمین کوئی غلطی کریں تو یہ ان کی ذمہ داری ہے، لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک کوئی عالم ان کے بیع وشراء کے ایگریمنٹس کا تنقیدی جائزہ لے کر انہیں دُرست قرار نہ دے، اس وقت تک احتراز کیا جائے۔　　واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۹/۱۱/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۳۵۲/۷)

سعودی عرب کے دو مالیاتی اداروں "دار المال الإسلامی" اور "الشرکة الإسلامیة للإستثمار الخلیجی" کا حکم

سوال:- آپ کا مضمون غیر سودی کاؤنٹر، ماہنامہ "بینات" کے جمادی الاولیٰ ۱۴۰۱ھ کے شمارے میں پڑھا، میں آپ کو "دار المال الاسلامی" اور "الشرکة الاسلامیة للاستثمار الخلیجی" کے داعیانہ کاغذات بھیج رہا ہوں، ان دونوں کے حلال یا مشکوک ہونے کے بارے میں آپ اپنی مخلص رائے ارسال فرمائیں، میں آپ کے جواب کا شدید منتظر ہوں۔

جواب:- احقر نے آپ کے بھیجے ہوئے کتابچوں[1] کا مطالعہ کیا، ان میں دو باتیں واضح نہیں ہیں، ایک یہ کہ اگر کاروبار میں نقصان ہوا تو وہ کس پر کس تناسب سے پڑے گا؟ دُوسرے یہ کہ مضارب

(۱) یہ کتابچے ریکارڈ میں موجود نہیں ہیں۔

کمپنی اس رقم کو کس قسم کے کاروبار میں لگائے گی اور اس کو سود سے پاک رکھنے کا کیا انتظام کرے گی؟ جب تک ان دو بنیادی سوالات کا جواب معلوم نہ ہو، اس مسئلے کا جواب ممکن نہیں، لہٰذا آپ معلومات کر کے ان سوالوں کا جواب ارسال فرمائیں، اس کے بعد اس مسئلے کا جواب دیا جا سکے گا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲/۲/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۹۱/۳۲ ج)

''دبئ اسلامی بینک'' اور ''فیصل اسلامک بینک'' میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- محترم مفتی صاحب، السلام علیکم۔ میں یہ خط ابوظہبی میں مقیم مولانا خلیل احمد صاحب کی وساطت سے لکھ رہا ہوں، مجھے چند ایسے مسائل کا سامنا ہے جن کا تعلق موجودہ دور کی Economics سے ہے، بدقسمتی سے مجھے یہاں کوئی ایسا عالم دِین نہیں مل سکا جسے Modern Economics Affairs پر دسترس ہو۔ مولانا خلیل صاحب میرے دوست ہیں اور جب ان سے ان چیزوں کے بارے میں بات کی تو انہوں نے مجھے آپ سے رابطہ کرنے کو کہا۔ میں یہاں پر پچھلے پندرہ سال سے حکومت کے ایک ادارے میں کام کرتا ہوں، میرا ذریعہ آمدنی صرف اور صرف میری تنخواہ ہے، اس کے علاوہ نہ اِمارات میں اور نہ ہی پاکستان میں کوئی اور ذریعہ آمدنی ہے، یہ میں اس لئے لکھ رہا ہوں تا کہ آپ میرے مسائل کا حل میرے حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے دے سکیں۔

U.A.E میں ایک بینک ہے جو کہ ''دبئ اسلامی بینک'' کے نام سے مشہور ہے، مولانا خلیل صاحب کے مطابق U.A.E کی شرعی عدالت کی نظر میں اس بینک میں سرمایہ رکھنا یا تجارت میں لگانا جائز ہے۔ حال ہی میں پاکستان سے ایک ممتاز عالمِ دِین تشریف لائے، میری اُن سے اس معاملے پر بات ہوئی تو انہوں نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا کہ دبئ اسلامی بینک یا فیصل اسلامی بینک یا پاکستان میں قائم شدہ اسلامی بینک (جس کا میں نام بھول گیا) سب غلط ہیں اور ان کا منافع مکمل طور پر سود ہے۔ آپ سے یہ درخواست ہے کہ اگر آپ ان بینکوں کی کارکردگی سے واقف ہیں تو مجھے ان کی اصلیت سے ضرور آگاہ کریں۔

دُوسری بات یہ ہے کہ اگر یہاں کی عدالتِ شرعیہ نے اس بینک میں سرمایہ کاری کو جائز قرار دیا ہے، تو کیا ان کے فیصلے کا احترام کافی ہے اور غلط ہونے کی صورت میں بھی کیا میں بری الذمہ ہوں یا

مجھے اس سلسلے میں دُوسرے علماء سے بھی پوچھنا ضروری ہے؟ اگر دو عالم دِین یا مفتی ایک ہی مسئلے پر مختلف رائے دیں تو کس کی بات زیادہ معتبر سمجھی جائے؟

میں نے کچھ پیسے دبئی اسلامک بینک میں رکھے ہوئے ہیں بلکہ اس بینک میں Invest کئے ہوئے ہیں، کیا اس کا منافع میرے لئے استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- محترمی ومکرمی جناب ڈاکٹر ظہور احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے سوالات کے جواب درج ذیل ہیں:-

احقر کو ''دبئی اسلامک بینک'' کے مفصل طریقِ کار کا علم نہیں ہے، اس لئے احقر اس کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا، اس بینک میں ایک شرعی مشاورتی بورڈ ہے، آپ اس بورڈ کے رُکن علماء سے رُجوع کریں، بشرطیکہ وہ علماء آپ کے خیال میں قابلِ اعتماد ہوں، پھر اگر وہ اس بینک کے نفع بخش کھاتوں میں رقم رکھوانے کو جائز قرار دیں تو آپ کے لئے بظاہر گنجائش ہوگی، اور جو شخص بینک کے تفصیلی طریقۂ کار سے باخبر نہ ہو، اس کے جائز کہنے یا ناجائز کہنے پر مدار نہ رکھنا چاہئے۔

جہاں تک ''فیصل اسلامک بینک'' کا تعلق ہے، میں اس کے شریعہ بورڈ کا رُکن ہوں، اس کے معاملات ملے جلے قسم کے ہیں، اور کیونکہ ابھی تک اس کو غیرشرعی معاملات سے بالکلیہ پاک نہیں کیا جاسکا، اس لئے میں دوستوں کو اس کے نفع بخش کھاتوں میں رقم رکھوانے اور نفع وصول کرنے کا مشورہ نہیں دیتا۔

رہا یہ سوال کہ ایک مسئلے پر دو مفتی مختلف رائے دیں تو کس کی رائے معتبر سمجھی جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس مفتی کے علم اور تقویٰ پر آپ کو زیادہ اعتماد ہو، اس پر عمل کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۴/۱۱/۲۲ھ

ٹیکس اتھارٹیز کا تعامل اسلامی بینک کی تمویل سے ٹیکس کے اِستثناء کے لئے کافی ہے

سوال:- بخدمت جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اُمید ہے کہ آپ اور تمام متعلقین مع خیر و عافیت ہوں گے۔ آپ کی شدید مصروفیت کا علم

ہونے کے باوجود آپ کو زحمت دے رہا ہوں، جس کے لئے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

ایک مسئلہ جو تقریباً چھ سال سے راقم الحروف اور اکثر اسلامی بینکوں کے اربابِ حل وعقد، خصوصاً میزان بینک کے سرکردہ اصحاب کے درمیان وجہِ نزاع بنا ہوا ہے، وہ مرابحہ کے معاملے پر محصولات کے لاگو ہونے، ان کی ادائیگی یا حکومت کی اجازت سے ان کے عدمِ اطلاق کا ہے۔

''اصلاحی خطبات'' جلد نمبر ۱۱ میں آپ نے ان تمام حکومتی قوانین، جو شریعت کے کسی قانون سے متصادم نہ ہوں، کی پاسداری کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے، ان کی روشنی میں راقم الحروف کی سوچ یہ ہے کہ خرید وفروخت کے معاملات پر واجب الادا تمام محصولات کا اطلاق بجنسہٖ مرابحہ کے ان معاملات پر بھی ہوتا ہے جو اسلامی بینکوں میں رائج ہیں تاوقتیکہ حکومت یا اس کا مجاز ادارہ، بورڈ، اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ کو ان سے مستثنیٰ قرار دے دیں، میری یہ رائے اس بنیاد پر ہے کہ:-

۱- مرابحہ فی الواقع خرید وفروخت کا معاملہ ہے اور قیمت کی ادائیگی کو مؤخر کر کے بینکوں نے اسے تاجر حضرات کو اُدھار مہیا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔

۲- خرید وفروخت کے تمام معاملات، چاہے وہ بینکوں ہی کی طرف سے روبعمل لائے جائیں، محصولات کے ان قوانین کے مطابق ہونا چاہئیں جو حکومتِ پاکستان نے بنائے ہیں اور جو شریعت سے متصادم بھی نہیں ہیں۔

۳- ان قوانین میں سے بعض کو ۱۹۷۹ء اور بعض کو ۱۹۹۰ء میں رائج کیا گیا جب پاکستان میں کوئی بھی بینک (ماسوائے فیصل بینک جو مرابحہ کا Documentation تو اِستعمال کر رہا تھا، لیکن اس کے شرعی تقاضوں کو نہیں پورا کر رہا تھا) اسلامی بینکاری نہیں کر رہا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں بنائے گئے انکم ٹیکس قانون کو ۲۰۰۱ء میں نئی شکل دی گئی اور اب ۲۰۰۱ء کا آرڈیننس مع تبدیلیوں کے مروّجہ قانون ہے۔ ۲۰۰۱ء میں بھی شریعت میں مطلوب معیار کی کوئی پاکستانی بینک پاسداری نہیں کر رہا تھا۔

۴- ان قوانین کے زمانۂ اطلاق کے پیشِ نظر اور ان کے الفاظ اور غایت کی روشنی میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ ان میں سے کسی بھی قانون کا مقصد اسلامی بینکوں کے لئے کوئی مشکلات یا پیچیدگیاں پیدا کرنا نہیں ہے، یا دیدہ و دانستہ یہ قوانین اسلامی بینکاری کو رائج ہونے سے روکنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔

۵- ۲۰۰۰ء کے آخر سے اب تک بعض افراد، بینک دولت پاکستان اور Institute ICAP)

of Chartered Accountants Pakistan) نے جو کوششیں کی ہیں، ان کے باعث اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ کے معاملات کو بعض محصولات سے چھوٹ دے دی گئی ہے، اگر تمام اسلامی بینک، خصوصاً وہ بینک جو اس وقت اس شعبے میں زیادہ مشہور اور آگے ہیں، مل کر کوشش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ بقیہ قوانین میں بھی تبدیلیوں کی ضرورت حکومت سے منوائی نہ جاسکے، جبکہ اس کے سبب حکومت کو کوئی مالی نقصان بھی نہیں ہے۔

۶- ICAP نے جو Accounting Standard (معروف بہ IFAS-1) وضع کیا ہے اس کی رُو سے مرابحہ کرنے والے بینکوں کے لئے لازمی ہے کہ سامان کی خرید اور فروخت کا اندراج کتابوں میں کریں اور Invoice وصول اور جاری کریں تاکہ بعد میں آڈٹ کرنے والوں کو یہ اطمینان ہوسکے کہ مرابحہ کا ہر معاملہ سامان کی واقعی (تیسرے فریق سے) خرید اور پھر بینک کی جانب سے فروخت پر مبنی ہے۔ اگر IFAS-1 پر کماحقہٗ عمل کرلیا جائے تو اِن شاء اللہ مرابحہ کے معاملات میں تمام خرابیوں کا سدِ باب ہوسکتا ہے، خصوصاً Rollover کو جڑ دبنیاد سے اُکھاڑ پھینکا جاسکتا ہے۔

۷- بحیثیت بینکر کے احقر کو خوب اندازہ ہے کہ ٹیکس قوانین میں تبدیلیوں کے بغیر IFAS-1 پر عمل کرنا نہ صرف دُشوار ہے بلکہ محصولات کی ادائیگی کے سبب یا تو اِسلامی بینکوں کی شرحِ منافع ناقابلِ برداشت حد تک متأثر ہوگی یا پھر Customers کو سودی بینکوں کے مقابلے میں زیادہ اِخراجات دینا ہوں گے جو مسابقت کے موجودہ ماحول میں بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔

۸- اگر آپ کی رائے میں مرابحہ کے معاملے پر ٹیکس قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا، چونکہ سودی بینکوں کے بیع عینہ (Buy-Back) کے معاملے بھی یوں ہی ہو رہے ہیں، یا حکومتِ پاکستان کے ٹیکس قوانین کی خلاف ورزی خلافِ شرع نہیں ہے تو براہِ کرم اپنی تحریری رائے سے مطلع فرمائیں تاکہ ہم لوگوں کو یہ اِطمینان ہوجائے کہ ان قوانین کی بظاہر خلاف ورزی کے باوجود ہم کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کر رہے ہیں اور عند اللہ مأخوذ نہ ہوں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ
طالب دُعائے خیر
انوار احمد مینائی

جواب:- مکرّم بندہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
کسی ٹیکس سے اِستثناء صریح عبارت سے بھی ہوسکتا ہے، اور متواتر عمل سے بھی۔ حکومت اور

ٹیکس اتھارٹیز سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ مرابحہ ایک بیع ہے، ساتھ ہی وہ جانتے ہیں کہ یہ بیع ایک آلۂ تمویل کے طور پر اِستعمال ہو رہی ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ سودی تمویل پر ٹیکس نہ ہو، اور شرعی تمویل پر ٹیکس عائد کیا جائے، اس لئے ان کا متواتر تعامل یہ ہے کہ کسی اسلامی بینک سے سیلز ٹیکس کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ لہٰذا اسے ٹیکس سے مستثنیٰ سمجھنے میں کم از کم بندہ کو کوئی دُشواری نہیں ہے۔

والسلام
بندہ محمد تقی عثمانی
۱۸/۱۲/۱۴۲۷ھ

﴿فصل فی البطاقات و أحکامها﴾

(کریڈٹ کارڈ اوراس کی مختلف قسموں کے اَحکام)

کریڈٹ کارڈ کا حکم

(بنوری ٹاؤن، ''جنگ'' اخبار اور حضرتِ والا دامت برکاتہم کا فتویٰ)

سوال:- کریڈٹ کارڈ (Credit Card) کے بارے میں معلوم کرنا تھا، اس کو استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں؟ میری معلومات یہ ہیں کہ Credit Card کی سالانہ فیس دو ہزار روپے ہے، کریڈٹ کارڈ کو ملک کے اندر یا بیرون ملک استعمال کریں تو ایک ماہ کے اندر وہ رقم واپس کردیں تو کوئی سود نہیں دینا پڑتا، اور ایک ماہ بعد اگر رقم دیں تو اس پر سود دینا پڑتا ہے، یہ بیرون ملک کام آتا ہے، رقم لے کر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

نوٹ:- اس کے ساتھ دو جوابوں کی فوٹو کاپی آپ کو روانہ کر رہا ہوں، دونوں کے جواب مختلف ہیں جناب مفتی جمیل صاحب (''جنگ'' اقرأ والے) نے آپ کا حوالہ دیا ہے، مہربانی فرماکر تفصیل کے ساتھ جواب تحریر فرماکر شکریہ کا موقع دیں۔

''جنگ'' اخبار کا جواب

جواب:- ایک مہینے کے اندر اگر رقم ادا کردی گئی تو جائز ہے، بعد میں ادا کرنے پر سود دینا پڑتا ہے، یہ جائز نہیں۔

جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن کا جواب

صورتِ مسئولہ میں دو ہزار روپے سے جو کریڈٹ کارڈ خریدا جاتا ہے، وہ ایک رسید کی حیثیت رکھتا ہے، فی نفسہٖ اس کی کوئی قیمت نہیں بلکہ قرضہ حاصل کرنے کے اجازت نامے کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی رُو سے قرضہ لینے والا ایک ماہ تک بغیر مزید سود ادا کئے قرضے کی رقم سے استفادہ کرسکتا ہے، اور یہ سہولت صرف ایک سال تک رہتی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ مذکورہ کریڈٹ کارڈ حاصل کرنے والا ایک ماہ کی مدّت پر سال بھر جو قرضہ اس ادارے سے حاصل کرے گا اس کا پیشگی سود مبلغ دو ہزار روپے ادارے نے کریڈٹ کارڈ کی فیس کی شکل میں وصول کرلیا، یہ سودی قرضے کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے،

جس طرح لوگ نت نئی چیزیں ایجاد کرتے ہیں، اسی طرح یہ شکل سود کی جدید شکل ہے، اس لئے اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے، لوگوں کو دھوکے میں نہیں آنا چاہئے۔

واللہ اعلم

کتبہ

محمد عبدالقادر

۱۴۱۷/۵/۵ھ

الجواب صحیح

محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح

سعید احمد جلال پوری

(دارالافتاء) ختم نبوت کراچی

حضرتِ والا دامت برکاتہم کا جواب

جواب:- احقر کی نظر میں ''جنگ'' والا جواب دُرست ہے، سالانہ فیس کا قرض سے کوئی تعلق نہیں، دراصل کارڈ جاری کرنے والا اور بھی بہت سی خدمات فراہم کرتا ہے، جن میں کارڈ کا اجراء، اس کے حامل کو مختلف سفری سہولیات فراہم کرنا، دُنیا کے ہر خطے میں کارڈ کی گمشدگی کی صورت میں متبادل کارڈ کی فراہمی، کارڈ کے حامل کا پورا حساب رکھنا وغیرہ۔ ان تمام خدمات کی اُجرت سالانہ فیس کے ذریعے وصول کی جاتی ہے، چاہے کوئی شخص اس کارڈ کے ذریعے خریداری کرے یا نہ کرے، یعنی قرض وجود میں آئے یا نہ آئے، لہٰذا اس فیس کی وجہ سے کارڈ کا ممبر بننا ناجائز نہیں، البتہ جب کارڈ کو اِستعمال کیا جائے تو مقرّرہ مدّت کے اندر اندر بل کی ادائیگی کا اہتمام ضروری ہے، تاکہ سود نہ لگے،[1] اور اس کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ Direct Debit کا طریقہ اختیار کیا جائے، یعنی کارڈ والے براہِ راست آپ کے بینک سے بل کی رقم وصول کرلیں، تاکہ غیرارادی طور پر بھی تأخیر کی وجہ سے سود عائد نہ ہو۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۸/۳/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۳/۲)

(۱ و ۲) دراصل آج کل رائج کارڈوں کی تین قسمیں ہیں، ڈیبٹ کارڈ، چارج کارڈ اور کریڈٹ کارڈ، ان میں سے ڈیبٹ کارڈ اور چارج کارڈ کا مذکورہ بالا حکم بیان کیا گیا ہے، اور ان دونوں کارڈوں پر بھی ''کریڈٹ کارڈ'' کا اطلاق کردیا جاتا ہے، تاہم جہاں تک اصلاً ''کریڈٹ کارڈ'' کا تعلق ہے تو اس کا استعمال ان دونوں کارڈوں کے میسر نہ ہونے کی صورت میں اُنہی کی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے جائز ہے، ورنہ نہیں۔ ان تینوں کارڈوں کا تعارف اور ان کا تفصیلی حکم حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی ہدایت اور نگرانی میں لکھے گئے اُن کے مصدقہ درج ذیل فتویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

سوال:- محترم جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(جاری ہے)

جناب سے گزارش یہ ہے کہ کریڈٹ کارڈ کے بارے میں تفصیل سے حکم بیان فرمادیں کہ آیا اس کو استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز کریڈٹ کارڈ کی اور اقسام جو رائج ہیں ان کا حکم بھی بیان فرمادیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

جواب:- آج کل رائج کارڈ کی تین اقسام پائی جاتی ہیں:-

۱-	ڈیبٹ کارڈ	Debit Card
۲-	چارج کارڈ	Charge Card
۳-	کریڈٹ کارڈ	Credit Card

۱- ڈیبٹ کارڈ

اس کارڈ کے حامل کا پہلے سے اکاؤنٹ اس ادارے میں موجود ہوتا ہے جس ادارے کا اس نے کارڈ حاصل کیا ہے، حاملِ بطاقہ یعنی کارڈ ہولڈر اس کارڈ کو جب بھی استعمال کرتا ہے، ادارہ اس کے اکاؤنٹ میں موجود رقم سے اس کی ادائیگی کردیتا ہے۔ اس میں حاملِ بطاقہ کو اُدھار کی سہولت حاصل نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ صرف اس وقت تک کارڈ کو استعمال کرسکتا ہے جب تک اس کے اکاؤنٹ میں رقم موجود ہے۔

ادارہ اس کارڈ کو جاری کرنے کی فیس وصول کرتا ہے۔

اس کارڈ کو استعمال کرنا بلاشبہ جائز ہے اور اس کے ذریعے خرید و فروخت کرنا دُرست ہے، کیونکہ اس میں نہ قرض کی صورت ہے، نہ سود کی۔ البتہ حاملِ بطاقہ کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کارڈ کو غیر شرعی اُمور میں استعمال نہ کرے۔

۲- چارج کارڈ

اس کارڈ کے حامل کا ادارے میں پہلے سے اکاؤنٹ نہیں ہوتا بلکہ ادارہ حاملِ بطاقہ کو اُدھار کی سہولت فراہم کرتا ہے، حاملِ بطاقہ کو ایک متعین ایام کی اُدھار کی سہولت میسر ہوتی ہے، جس میں اس کو ادارے کو ادائیگی کرنا ضروری ہوتا ہے، اگر اس مدّت میں ادائیگی ہوجائے تو سود نہیں لگتا، البتہ اگر حاملِ بطاقہ نے وقت پر ادائیگی نہ کی تو پھر اس کو سود کے ساتھ ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔

ادارہ اس کارڈ کو جاری کرنے کی فیس وصول کرتا ہے۔

اس کارڈ کو مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ استعمال کرنا جائز ہے:-

۱- حاملِ بطاقہ اس بات کا پورا انتظام کرے کہ وہ معین وقت سے پہلے پہلے ادائیگی کردے اور کسی بھی وقت سود عائد ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

۲- حاملِ بطاقہ کی یہ ذمہ داری ہو کہ وہ اس کارڈ کو غیر شرعی اُمور میں استعمال نہ کرے۔

۳- اگر ضرورت ڈیبٹ کارڈ سے پوری ہو رہی ہو تو بہتر ہے کہ اس کارڈ کو استعمال نہ کرے۔

۳- کریڈٹ کارڈ

اس کارڈ کے حامل کا بھی کوئی اکاؤنٹ ادارے میں نہیں ہوتا بلکہ وہ معاہدہ ہی اُدھار پر سود کا کرتا ہے، اس معاہدے میں اگرچہ ادارہ ایک متعین مدّت فراہم کرتا ہے کہ جس میں اگر حاملِ بطاقہ ادائیگی کردے تو اس کو سود ادا نہیں کرنا پڑتا، لیکن اصلاً معاہدہ سود کی بنیاد پر ہوتا ہے اور اس کی ادائیگی کا وعدہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں تجدید مدّت (Rescheduling) کی سہولت بھی موجود ہوتی ہے، جس سے ادائیگی کی مدّت بڑھ جاتی ہے، البتہ اس کے ساتھ ساتھ شرحِ سود میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور بعض صورتوں میں اضافی رقم لی جاتی ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ اس کارڈ کا استعمال جائز نہیں ہے، اِلّا یہ کہ ڈیبٹ کارڈ یا چارج کارڈ الگ سے مہیا نہ ہو اور اس کو ڈیبٹ کارڈ یا چارج کارڈ کی طرح مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

(جاری ہے)

ان تمام کارڈ کو ''کریڈٹ کارڈ'' کہا جاتا ہے، لیکن جو اصلاً کریڈٹ کارڈ ہے اس کا استعمال جائز نہیں، البتہ کریڈٹ کارڈ کا اطلاق مذکورہ بالا پہلی دو قسموں پر کیا جائے تو ان کا استعمال جائز ہے۔

ان کے علاوہ کارڈ کی ایک قسم ہے جس کو ATM (Automated Transfer Machine) کارڈ کہتے ہیں، یہ رقم نکالنے کا کارڈ ہوتا ہے، بعض دفعہ اس کا وجود اُوپر ذکر کردہ کارڈ کے ضمن میں بھی ہوتا ہے، مثلاً یہ ممکن ہے کہ ڈیبٹ کارڈ میں رقم نکالنے کی سہولت بھی موجود ہو۔

اس کارڈ کا حکم یہ ہے کہ اس کو استعمال کرنے پر اگر متعین رقم مشین کے استعمال کی اُجرت کے طور پر ادارہ وصول کرے جو مقدار رقم سے قطع نظر ہو تو جائز ہے، لیکن اگر ادارہ رقم کو بنیاد بنا کر اس پر کچھ وصول کرے تو یہ جائز نہیں بلکہ سود ہوگا، البتہ ادارہ کارڈ جاری کرنے کی فیس وصول کرسکتا ہے۔

فی المعاییر الشرعیة:

خصائص بطاقة الحسم الفوری

۱ – تصدر هذه البطاقة من المؤسسة لمن له رصید فی حسابه.

۲ – تخول هذه البطاقة لحاملها السحب، أو تسدید اثمان السلع والخدمات بقدر رصید المتاح، ویتم الحسم منه فورًا، ولا تخوله الحصول علی ائتمان.

۳ – لا یتحمل العمیل رسومًا مقابل استخدامه هذه البطاقة غالبًا الّا فی حال سحب العمیل نقدًا، أو شرائه عملةً أخریٰ عن طریق مؤسسة أخریٰ غیر المؤسسة المصدرة للبطاقة.

۴ – تصدر هذه البطاقة برسم أو بدونه.

خصائص بطاقة الائتمان والحسم الآجل

۱ – هذه بطاقة أداة ائتمان فی حدود سقف معین لفترة محددة، وهی أداةُ وفاء أیضًا.

۲ – تستعمل هذه البطاقة فی تسدید أثمان السلع الخدمات، وفی الحصول علی النقد.

۳ – لا یتیح نظام هذه البطاقة تسهیلات ائتمانیة متجددة لحاملها، حیث یتعین علیه المادرة بسداد ثمن مشتریاته خلال الفترة المحددة عند تسلمه الکشوف المرسلة الیه من المؤسسة.

۴ – اذا تأخر حامل البطاقة فی تسدید ما علیه بعد الفترة المسموح بها یترتب علیه فوائد ربویة، أما المؤسسات فلا ترتب فوائد ربویة.

خصائص بطاقة الائتمان المتجدد

۱ – هذه البطاقة أداةُ ائتمان فی حدود سقف متجدد علیٰ فترات یحددها مصدر البطاقة، وهی أداةُ وفاء أیضًا.

۲ – یستطیع حاملها تسدید أثمان السلع والخدمات، والسحب نقدًا، فی حدود سقف الائتمان الممنوح.

۳ – فی حالة الشراء للسلع أو الحصول علی الخدمات یمنح حاملها فترة سماح یسدد خلالها المستحق علیه بدون فوائد کما تسمح له بتأجیل السداد خلال فترة محددة مع ترتب فوائد علیه. أما فی حالة السحب النقدی فلا یمنح حاملها فترة سماح.

الحکم الشرعی لأنواع البطاقات

بطاقة الحسم الفوری

یجوز للمؤسسات اصدار بطاقة الحسم الفوری ما دام حاملها یسحب من رصیده ولا یترتب علی التعامل بها فائدة ربویة.

بطاقة الائتمان والحسب الآجل

یجوز اصدار بطاقة الائتمان والحسم الآجل بالشروط الآتیة:–

۱ – الا یشترط علی حامل البطاقة فوائد ربویة فی حال تأخیره عن سداد المبالغ المستحقة علیه.

۲ – ان تشترط المؤسسة علی حامل البطاقة عدم التعامل بها فیما حرمه الشریعة وانه یحق للمؤسسة سحب البطاقة فی تلک الحالة.

(جاری ہے)

کریڈٹ کارڈ اور اس کی مختلف قسموں کا حکم

سوال:- الیٰ حضرة الشیخ العلّامة مولانا محمد تقی العثمانی، حفظه الله تعالیٰ

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته.

أسئل الله أن تصلكم رسالتي هٰذه وأنتم في خير حال وعافية، الحمد لله أن وفقّني لقراءة بعض كتبك بالعربية (قضايا فقهية معاصرة) ثم أطلعت علیٰ بعض كتبك مترجمة بالانجليزية فأردت التنبيه الیٰ أن الترجمة فيها شيء من الضعف فهي أقرب للغة العوام منها الی اللغة الاكاديمية.

ومما قرأته كذٰلك ان صح فهمي هو فتواك بجواز التعامل ببطاقات الائتمان (Credit Card) اذا كان المشتری بها يثق أنه سيسدد الدين قبل حلول موعد اضافة الفائدة للدين، والسؤال هل يجوز الاقدام علیٰ عقد يتضمن شرطًا محرمًا كالربا هنا ولو كان المتعاقد يعلم أنه لن يقع تحت طائلة الشرط؟ ومعلوم أن عقد الحصول علیٰ Credit Card يتضمن شرطًا ربويًا، وليس الحكم علیٰ عقد بأنه حرام وباطل مانعًا من الاقدام عليه الا لضرورة أو لحاجة تنزل منزلتها ولو ترک باب العقود المحرمة مفتوحًا اعتمادًا علیٰ ثقة المتعاملين فيها بعدم الوقوع في الشرط أو البند المحرم أو الباطل لا نفتح باب شر وفتنة على الناس، والله هو المحافظ. ولي سؤال هل تمت ترجمة كتابكم قضايا فقهية معاصرة الى الانجليزية أو بحث بيع الحقوق المجردة، فاني أحتاج اليه فهل لكم أن تدلوني علیٰ ذٰلک.

وختامًا أرجو المسامحة في التطويل عليكم واسئل الله دوام العافية وتمام النعمة وثبوت البركة والأجر والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

محبكم وتلميذكم

محمد علی احداش

طالب علم علی الفقه المالكي، لندن

۹ربیع الاوّل ۱٤۲٤ھ

۱۰مایو ۲۰۰۳م

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

بطاقة الائتمان المتجدد

لا يجوز للمؤسسات اصدار بطاقات الائتمان ذات الدين المتجدد الذی يسدده حامل البطاقة علی أقساط آجلة بفوائد ربوية.

والله اعلم وعلمه أتم

عبداللہ صدیقی غفر اللہ لہ

۱۴۲۲/۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵۱/۸۷۱)

الجواب صحیح
محمد تقی عثمانی

الجواب صحیح
بندہ محمود اشرف غفر اللہ لہ

الجواب صحیح
بندہ عبدالرؤف سکھروی

الجواب صحیح
محمد عبداللہ عفی عنہ

الجواب صحیح
محمد عبدالمنان عفی عنہ

جواب:- الیٰ سیادة الأخ الکریم محمد علی احداش، حفظه الله تعالیٰ

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته، وبعد:

فشکرًا لک علیٰ رسالتک والتنبیه علیٰ أن بعض کتبی المترجمة بالانجلیزیة یوجد فیها بعض الضّعف، ولعلّ تفصیل مواضع الضّعف یصعب علیک، ولٰکن لو أخبرتنی ما هی الکتب التی وجدت فیها ذٰلک، فانّی أخبر به نشرة هٰذا الکتب، فان کثیرًا منهم تناولوا ترجمة ما شاءوا من مؤلفاتی وفوّضوا ذٰلک الیٰ مترجمین مختلفین، ثم لم تقع منی مراجعة ذٰلک لازدحام أشغالی.

أمّا بالنسبة لما ذکرت من جواز استخدام بطاقة الائتمان، فالذی أفتی به أن الطریق الأفضل أن تستخدم هٰذه البطاقة علیٰ أساس التسدید المباشر (Direct Debit) بأن تستخدم البطاقة فی حدود الغطاء الموجود عند البنک مصدر البطاقة، حتّٰی لا یکون هناک احتمال وجوب دفع الفائدة، أما اذا لم یتیسر ذٰلک، فیجوز استخدام بطاقة الائتمان، ان کان حاملها علیٰ یقین أنه سیسدد الفاتورة قبل أن توضع علیها فائدة.(۱)

أما کون العقد مشتملًا علی شرط لزوم الفائدة عند التأخیر فی السّداد، فان مثل هٰذه الشّروط موجودة الیوم فی کثیر من التعاقدات، مثل عقود استخدام الکهرباء والتلیفون، والجوّال والضرائب الحکومیة وما الیٰ ذٰلک فلا یمکن الیوم استخدام الکهرباء الّا بالتوقیع علی العقد الذی یشترط فوائد التأخیر، ولکن بما أن هٰذه شروط غیر معتبرة فی الشرع، فما دام الانسان مُطمئنًا بأنها لا تطبّق عملیًا، وذٰلک بالتزام السّداد فی حینه، فانه یمکن أن یتسامح فیها لعموم البلویٰ، وقد یستأنس فی ذٰلک (ولا أقول: یستدل) بحدیث شراء عائشة اُمّ المؤمنین لبریرة رضی الله عنهما بعقد فیه شرط لأن یکون الولاء للبائع، وأجاز رسول الله صلی الله علیه وسلم اشتراط ذٰلک،(۲) مع کونه شرطًا ممنوعًا فی الشّرع، لکونه علیٰ یقین بأنه لا یطبّق، والله سبحانه تعالیٰ أعلم.

وأرجو أن لا تنسونی فی أدعیتکم الصالحة.

والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

أخوکم

محمد تقی العثمانی

کراتشی، ۲۹/۳/۱۴۲۴هـ

***

---

(۱) تفصیلی حکم کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) جامع الترمذی ابوابُ الولاء والهبة ج:۲ ص:۳۳ (طبع سعید).

﴿کتاب الإجارة﴾

(کرایہ داری سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی نفس الإجارة﴾
(اِجارہ ''کرایہ داری'' سے متعلق مسائل کا بیان)

پٹواری کے پیشہ اور نظام کی شرعی حیثیت

سوال:- ہمارے علاقے میں قوم بُزدار بلوچ کئی ہزار کی تعداد میں رہتے ہیں، جہاں برطانیہ کے دورِ حکومت سے اب تک کوئی پٹواری کا کوئی انتظام نہیں، اور بارانی علاقہ ہے آمدنی زیادہ نہیں ہوتی، اور ہتھیاروں کی ہر قسم کی آزادی ہے، اور زمینوں کی حدود کے اندر تنازعات واقع ہونے کی وجہ سے لوگوں کے درمیان کشت وخون بھی ہوتا رہتا ہے، اس لئے اب حکومتِ پاکستان نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہاں پٹواریوں کا انتظام کیا جائے، لیکن اس کے مقابلے میں قوم نے اجتماعی مشورے کے بعد یہ طے کیا ہے اور بعض جگہ درمیان میں قرآن مجید رکھ کر یہ طے کیا ہے کہ اس فیصلے کو نافذ ہونے نہیں دیں گے، اور بعض علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ یہ مدافعت جہاد ہے اور مقتول شہید ہے، اس قوم کے بعض مطالبے اور بھی ہیں، اور حکومت کے ذمہ دار مثلاً کمشنر صاحب یقین دِلاتے ہیں کہ ہم تمہارے مطالبے حکومت سے منظور کرائیں گے، لیکن قوم باور نہیں کرتی، ازیں بنا پر قوم مسلح ہوکر جنگ اور مقابلے کے لئے تیار ہے، اور بعض دفعہ انہوں نے گولیاں بھی ماری اور حکومت بھی اپنی طاقت استعمال کرنے کے لئے تیار ہے، اب قابلِ دریافت سوالات درج ذیل ہیں: ۱-پٹواری نظام دِین میں جائز ہے یا ناجائز؟ ۲-اس تصادم میں جو لوگ مارے جائیں گے ان دونوں فریقین میں سے کون سے فریق کے لوگ شہید ہوں گے اور کون سا فریق ناحق؟ ۳-قرآن مجید کے ذریعے جو عہد کیا ہے اس کی کیا حیثیت ہے؟ باقی رکھنا چاہئے یا توڑنا جائز ہے؟ ۴-عوام کا یہ خدشہ کہ پٹواری رشوت وغیرہ ناجائز کارروائیاں جاری کریں گے لہٰذا ہم ان کو آنے نہ دیں گے کیا حیثیت رکھتا ہے؟ ۵-حکومت اس قوم کو باغی سمجھ کر قتل کرسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- پٹواری کا کام فی نفسہٖ جائز ہے، البتہ رشوت وغیرہ کے ناجائز ذرائع استعمال کرنا حرام ہے،[1] لہٰذا اس علاقے میں پٹواری کا نظام نافذ کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور جب حکومت اسے نافذ کرنا چاہتی ہے تو اس جائز اقدام میں اس کی اطاعت ضروری ہے،[2] اور اس کے خلاف جنگ کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، جو لوگ حکومت کی مخالفت کرتے ہوئے مریں گے وہ شہید نہیں ہوں گے، لہٰذا ضروری ہے کہ لوگوں نے اس نظام کے خلاف جو معاہدہ کیا ہے اس کی پابندی نہ کریں، پھر اگر انہوں نے مخالفت کرنے پر اللہ کی قسم بھی کھائی ہو تو اس قسم کا کفارہ ادا کریں،[3] اور اس فعل سے باز آجائیں۔ اگر پٹواری کو قتل کر دیا تو قتلِ نفس کا گناہِ کبیرہ ہوگا، جس کی سزا حسبِ تصریح قرآن مجید دخولِ جہنم ہے۔[4]

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۶۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

کیا سودی معاملات کرنے کی بناء پر حکومت کی ہر ملازمت ناجائز ہے؟

سوال:- میرا ایک دوست کہتا ہے کہ آج کل کی حکومت غیر شرعی ہے، حکومت خود سودی کاروبار کرتی ہے اور سود کی رقم سے ہم کو تنخواہ ملتی ہے، لہٰذا ہماری تنخواہ بھی حرام ہوئی، شرعاً کیا یہ خیال دُرست ہے؟

جواب:- آپ کے دوست کا خیال علی الاطلاق دُرست نہیں، حکومت کی ہر ملازمت ناجائز

---

(۱) وفی سنن الترمذی ج:۳ ص:۶۲۳ (طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت وفی طبع مکتبہ رحمانیہ ج:۱ ص:۳۸۰) لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم الرّاشی والمرتشی. و أبی داؤد ج:۳ ص:۳۰۰ (طبع دار الفکر وفی طبع مکتبہ رحمانیہ ج:۲ ص:۲۰) وسنن ابن ماجة ج:۲ ص:۷۷۵ (طبع دار الفکر، بیروت وفی طبع مکتبہ قدیمی ج:۱ ص:۱۶۷) وفی مجمع الزّوائد ج:۴ ص:۱۹۹ (طبع دار الرّیان للتراث قاهرة، دار الکتاب العربی، بیروت وفی طبع مکتبہ دارالفکر ص:۳۵۹) الراشی والمرتشی فی النّار.

(۲) وفی الدّر المختار ج:۲ ص:۱۷۲ تجب طاعة الامام فیما لیس بمعصیة.
وراجع للدّلائل والتفصیل الیٰ الدّر المختار مطلب فی وجوب طاعة الامام ج:۴ ص:۲۶۴ (طبع سعید).
نیز دیکھئے: امداد الفتاوی سوال نمبر ۳۹۳ ج:۳ ص:۴۰۲ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

(۳) وفی تنویر الأبصار ج:۳ ص:۷۲۸ (طبع سعید) ومن حلف علیٰ معصیة کعدم الکلام مع أبویه أو قتل فلان الیوم وجب الحنث والتکفیر .... الخ.
وفی سنن النسائی باب من حلف علیٰ یمین فرأی غیرها خیرًا ج:۲ ص:۱۴۳ (طبع مکتبة الحسن) عن أبی موسیٰ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: ما علی الأرض یمین أحلف علیها فأری غیرها خیرًا منه الّا آتیه.
وفی کتاب الأصل (المبسوط للشیبانیؒ) کتاب الأیمان ج:۳ ص:۱۹۰ قد بلغنا عن النبی صلی الله علیه وسلم أنّه قال: من حلف علیٰ یمین فرأی غیرها خیرًا منه فلیأت الّذی هو خیر ولیکفر عنه یمینه.

(۴) "وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِیْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا" (سورة النساء آیت:۹۳).

نہیں ہے، اور نہ ہر ملازمت کی تنخواہ حرام ہے، جس ملازمت میں کوئی غیر شرعی کام نہ کرنا پڑتا ہو یا براہِ راست حرام آمدنی سے تنخواہ نہ دی جاتی ہو، وہ جائز ہے اور اس کی تنخواہ حلال ہے۔ واللہ اعلم

۶/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸/۲۸ الف)

آغا خانیوں کے عقائد اور ان کی سرگرمیوں کے پیشِ نظر آغا خان فاؤنڈیشن کو دُکان کرایہ پر دینے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین ومفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل مسئلے میں: ایک شخص نے (جو کہ علمِ دِین کی طرف منسوب بھی ہے) گلگت میں ایک عمارت برائے کرایہ تعمیر کرائی ہے، جو کہ ہوٹل کے قابل بھی ہے (یعنی کوئی ہوٹل بنانے کے لئے کرایہ پر لینا چاہے تو لے سکتا ہے)۔ آغا خان فاؤنڈیشن کا ادارہ اس عمارت کو اپنے دفاتر بنانے کے لئے کرایہ پر لینا چاہتا ہے، اس ادارے کو کرایہ پر دینا شرعی لحاظ سے جائز ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

نوٹ:- آغا خان فاؤنڈیشن والا ادارہ (ARSP) تقریباً بارہ پندرہ سال سے قائم ہے، یہ ادارہ رفاہی کاموں کا ادارہ ہے، اس کے تحت اسکول، اسپتال اور گاڑیاں، ہیلی کوپٹر کام کرتے ہیں، پہاڑی علاقوں میں سنگین مریضوں کو عندالضرورۃ ہیلی کوپٹر کے ذریعے گلگت اسپتال لایا جاتا ہے، ورنہ عام مریضوں کو لانے کے لئے گاڑیوں کا انتظام ہے۔

اس کے علاوہ دُوسرے رفاہی کام بھی یہ ادارہ اپنے خرچے پر کراتا ہے، مثلاً کہیں راستے کی ضرورت ہے یا نہر کی یا ٹینکی کی، تو یہ ادارہ اپنے اُصول وشرائط کے مطابق وہ کام کراتا ہے، اس ادارے میں ملازمین کا تعلق کسی خاص مذہب سے نہیں بلکہ قابلیت کی بناء پر وہ ملازمتیں دیتے ہیں، نیز اس ادارے کے تحت ادارے کے فائدے کے لئے اقتصادی پروگرام بھی ہوتے ہیں، مثلاً شہد (عسل) کا اِنتاج، گلگت کے فروٹ کو جدید ترین انداز میں پیکنگ کر کے برآمد کرنا یا پاکستان کے بڑے شہروں میں فروخت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ادارے کا کہنا یہ ہے کہ یہ ایک عالمی فنڈ ہے جو کہ غریب علاقوں کے لئے ہے، اس میں اسلامی ممالک کا بھی چندہ ہے، آغا خان کی حیثیت چیئرمین کی ہے، باوثوق ذرائع بلکہ متواتر طریقے سے ثابت ہے کہ نواز شریف نے اپنی سابقہ وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں گلگت کے علاقے کے لئے پانچ کروڑ کی امداد دی تھی جو کہ اس ادارے کے ذریعے وہ گلگت کے ترقیاتی کاموں

میں خرچ کی گئی ہے، وہ یہ رقم گلگت کے حکومت (یعنی کمشنر) کے ذریعے خرچ کرسکتا تھا، مگر ان کو اس ادارے پر اعتماد کی وجہ سے اس ادارے کے ذریعے اپنی اس امداد کو گلگت میں استعمال کرایا۔

مزید معلومات کے لئے عرض ہے کہ داریل (داریل خالص سنیوں کا علاقہ ہے، اس میں شیعہ اور آغاخانیوں کا نام ونشان نہیں ہے) کے علماء اس ادارے کے مخالفت میں شروع میں سختی کرتے تھے جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ عالمی فنڈ ہے، آغاخان اپنی جیب سے نہیں دیتا ہے، اور داریل والے اپنے علاقے کے لئے مخصوص کی ہوئی رقم نہیں لیتے ہیں تو یہ رقم آغاخانیوں کے علاقے میں خرچ ہوتی ہے، جب سے ان کو یہ معلوم ہوا ہے اس وقت سے انہوں نے ایک کمیٹی مقرر کی ہے، جو کہ سال کے شروع ہی میں داریل کے ترقیاتی کاموں کی رقم (جو کہ فاؤنڈیشن کی طرف سے مخصوص ہے) پیسہ پیسہ کرکے وصول کرکے اپنی زیرِ نگرانی اپنے علاقے میں خرچ کرتے ہیں، اور پھر آغاخان فاؤنڈیشن کے ادارے کو حساب دیتے ہیں کہ ہم نے جو رقم لی تھی اس کو مندرجہ ذیل طریقے سے خرچ کیا۔

دس پندرہ سالوں میں ادارے نے جو عمارتیں کرایہ پر لی ہیں، انتہائی صاف ستھری رکھی ہیں، اس خوبی کی بناء پر اکثر لوگ ان کو کرایہ پر دینے کی تمنا کرتے ہیں، مذکورہ عمارت کا مالک اسی ادارے کو دینے کی تمنا میں تو نہیں، البتہ اس کے بعض رشتہ دار کافی حد تک مصر ہیں، اور وہاں کے بعض علماء سے جواز کا اشارہ ملنے پر مصر ہیں، اس وجہ سے مالک عمارت شرعی لحاظ سے جواز یا عدمِ جواز کے فتویٰ کا منتظر ہے، تاکہ دینے نہ دینے کے بارے میں فیصلہ کیا جاسکے۔

وصلّی اللہ وسلّم علیٰ سیّدنا محمد وآلہ وصحبہ وسلّم

از طرف عبدالقیوم حال مکہ مکرمہ

جواب:- اگرچہ کسی غیر مسلم کو کوئی عمارت کسی جائز مقصد کے لئے کرایہ پر دینا فی نفسہ جائز ہے،[1] بالخصوص جبکہ وہ رفاہی کاموں کے لئے ہو، لیکن مندرجہ ذیل باتیں ذہن میں رکھنی ضروری ہیں:-

---

(۱) وفی الهندية كتاب الاجارة ج:۴ ص:۴۵۰ (طبع ماجدية) واذا استاجر الذمی من المسلم دارًا يسكنها فلا بأس بذلك، وان شرب فيها الخمر أو عبد فيها الصنم، أو أدخل فيها الخنازير ولم يلحق المسلم فی ذلک بأس لأن المسلم لا يؤاجرها لذلک انما آجرها للسكنیٰ، كذا فی المحيط.

قال العلّامة سراج الدين رحمه الله: آجر بيتًا ليتخذ فيه بيت نار أو بِيعة أو كنيسة أو يباع فيه الخمر لا بأس به عند أبی حنيفة خلافًا لهما (فتاویٰ سراجية علیٰ هامش قاضی خان، كتاب الاجارة ج:۴ ص:۲۴۱).

ومثله فی خلاصة الفتاویٰ كتاب الاجارات ج:۳ ص:۱۴۹.

وفی الهندية ج:۴ ص:۴۴۹ (طبع ماجدية) اذا استاجر الذّمی من المسلم بيتًا ليبيع فيه الخمر جاز عند أبی حنيفة خلافًا لهما.

وفيها أيضًا ج:۴ ص:۴۵۰ لو استاجر الذّمی مسلمًا ليبنی له بِيعة أو كنسية جاز.

۱:- وہ غیرمسلم جو اپنے غیرمسلم ہونے کا اعتراف کئے بغیر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرے، اُس کا معاملہ دُوسرے غیرمسلموں سے زیادہ شدید ہے، اس کے ساتھ مستقل نوعیت کے تعلقات قائم کرنا دُرست نہیں۔

۲:- اگر غیرمسلم عمارت کو رفاہی کام کے لئے استعمال کرے، لیکن اس رفاہی کام کے پیچھے اپنے عقائد کی نشر و اشاعت مقصود ہو، تاکہ ضرورت مند مسلمان اپنی ضروریات پوری ہوتے دیکھ کر اس غیرمسلم کے مذہب کی طرف مائل ہوں، تو ایسے غیرمسلم کو کرایہ پر دینا جائز نہیں۔ بالخصوص جبکہ وہ اپنے کو مسلمان ظاہر کرکے یہ کام کر رہا ہو تو اس کا خطرہ اور زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ اس کے عقائد کو ناواقف مسلمان اسلام کا حصہ سمجھنے لگیں گے۔

۳:- آغاخانی فرقہ باتفاقِ مسلمین دائرۂ اسلام سے خارج ہے[1]، مگر وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہے، لہٰذا اس کا معاملہ اُن غیرمسلموں سے زیادہ سخت ہے جو کھلے طور پر اپنے آپ کو غیرمسلم ظاہر کرتے ہیں۔

ان تین اُمور کو مدِنظر رکھتے ہوئے ''آغاخان فاؤنڈیشن'' اگر آغاخانیوں کی قائم کی ہوئی ہے، اور وہی اس کو چلا رہے ہیں، خواہ ملازم کے طور پر مسلمان بھی کام کرتے ہوں، اور وہ اس فاؤنڈیشن کے ذریعے مسلمانوں میں گمراہی پھیلانے کا ذریعہ بھی بن رہے ہیں، جیسا کہ وہاں کے متعدد علماء سے معلوم ہوا ہے، تو ان کو عمارت کرایہ پر دینا جائز نہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	الجواب صحیح	محمد تقی عثمانی
محمد رفیع عثمانی عفی عنہ	سحبان محمود	۱۴۱۸/۱/۲۴ھ
۱۴۱۸/۱/۲۵ھ		(فتویٰ نمبر ۴۶/۲۶۵)

محکمۂ پولیس اور شراب کی کمپنی میں ملازمت کا حکم

سوال:- ایک شخص جو کہ پہلے پولیس میں ملازم تھا، اور اَب ایک شراب کی کمپنی میں ملازم ہے، کیا اُس کی روزی حلال ہے؟ اور اس کے اہل و عیال پر کیا واجب ہوتا ہے؟

جواب:- اگر رِشوت اور دُوسرے ناجائز ذرائع آمدنی سے اجتناب کیا جائے تو پولیس کی

---

(۱) تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج:۶ ص:۱۰۴ تا ۱۰۶ ملاحظہ فرمائیں۔

ملازمت تو جائز ہے، البتہ شراب تیار کرنے، یا بیچنے والی فرم کی ملازمت حرام ہے،[1] اور آمدنی بھی حرام ہے،[2] ایسے شخص کے اہل وعیال کو چاہئے کہ وہ اُسے جائز آمدنی کے ذرائع اختیار کرنے پر مجبور کریں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲۵/۲۸ ب)

۱:- مدرّسین ایامِ تعطیلات کی تنخواہ کے حق دار ہیں یا نہیں؟
۲:- مدرّسین کو خارجی اوقات میں کسی دُوسرے کام سے روکنا
۳:- پیشگی اطلاع نہ دینے کی صورت میں مدرّس سے ایک ماہ کی تنخواہ کاٹنے کا حکم

(وضاحت از مرتب)

مذکورہ تین مسائل سے متعلق حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب رحمہ اللہ نے ایک اِستفتاء اپنی رائے کے ساتھ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی رائے معلوم کرنے کے لئے ارسال فرمایا، جن کے جواب میں اوّلاً حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہم نے مفصل فتویٰ تحریر فرمایا، اور دار الافتاء دارالعلوم کراچی کے حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھری صاحب مدظلہم اور حضرت مولانا مفتی عبدالمنان صاحب مدظلہم نے اپنی رائے تحریر فرمائی۔ جس کے بعد یہ تمام تحریرات اُستاذِ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کی گئیں، جس پر آخر میں حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اپنا فتویٰ تحریر فرمایا۔ یہ تمام تحریرات اور آخر میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کا فتویٰ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

اِستفتاء ورائے گرامی از
حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی رحمہ اللہ

سوال:- عزیز محترم مولانا محمد تقی عثمانی سلّمہم وعافاہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

---

(۱) قال العلّامة طاهر بن عبدالرشيد البخاريّ: ولا يجوز الاستيجار على شيء من الغناء والنوح والمزامير. (خلاصة الفتاوىٰ ج:۳ ص:۱۱۶ كتاب الاجارات).

قال العلّامة المرغينانيّ: ولا يجوز الاستيجار على الغناء والنوح وكذا سائر الملاهي لأنه استيجار على المعصية، والمعصية لا تستحق بالعقد. (الهداية ج:۳ ص:۳۰۶ (طبع مكتبه رحمانيه) باب الاجارة الفاسدة). ومثله في ردّ المحتار (ج:۶ ص:۵۵ باب الاجارة الفاسدة).

وفي الهندية ج:۴ ص:۴۱۱ ومنها أى من شرائط صحة الاجارة أن يكون مقدور الاستيفاء حقيقة أو شرعًا فلا يجوز استئجار الآبق ولا الاستئجار على المعاصي لأنه استئجار على منفعة غير مقدور الاستيفاء شرعًا.

وفيها أيضًا ج:۴ ص:۴۴۹ لا تجوز الاجارة على شيء من الغناء والنّوح والمزامير والطبل .... الخ. وكذا في البدائع ج:۴ ص:۱۸۹.

اُمید ہے کہ آپ مع متعلقین بخیریت ہوں گے۔

جامعہ خیر المدارس کے جلسہ شوریٰ میں ماہِ رمضان المبارک کی تنخواہ کے مدرّس کے لئے اِستحقاق کا ذکر آیا تھا، فتاویٰ خلیلیہ میں کئی اکابر کے جوابات اس سلسلے میں موجود ہیں، ان سب پر حضرتِ اقدس مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کا محاکمہ بھی درج ہے کہ:-

''میری رائے یہ ہے کہ مدرّسین کا معاملہ مدرسے کے ساتھ عقدِ اِجارہ ہے، اور مدرّسین اَجیرِ خاص ہیں، کیونکہ وقت کے پابند ہیں، تعطیل کا زمانہ ملازمت کا زمانہ ہے کہ اس میں عقدِ اجارہ باقی ہے، عقد قطع نہیں ہوا، مگر تنخواہ کے متعلق ایک شرط لگی ہوئی ہے کہ رمضان المبارک کی تنخواہ کا اِستحقاق اس وقت ہوگا جبکہ ابتدائے شوال میں حاضر ہوں، شرعاً شرط کے خلاف مقتضائے عقدِ اجارہ کے لئے مفسد ہوتی ہے، لہٰذا عقدِ اجارہ فاسد ہوا، اور فسادِ عقد کی صورت میں اجیر مستحق اجرِ مسمّی نہیں ہوتا بلکہ اجرِ مثل کا مستحق ہوتا ہے، لہٰذا صورتِ موجودہ میں وہ مدرّس تنخواہ کا مستحق نہ ہوگا، بلکہ اجرِ مثل کا مستحق ہوگا، اور اگر اس کو شرط فی العقد نہ قرار دیا جائے بلکہ خارج عقد کہا جائے یا شرطِ معروف قرار دی جائے تو ان سب صورتوں میں مدرّس واقعہ متنازع فیہ میں پوری تنخواہ کا مستحق ہوگا۔ اور احتمالات اور اختلاف حکم صرف رمضان المبارک (میں) ہے اور ایامِ شوال میں جب مدرّس اپنے کارِ منصبی پر مأمور ہے تو اپنی تنخواہ کا ضرور مستحق ہوگا، فقط خلیل احمد عفی عنہ ۱۰رج ۱، ۱۳۳۸ھ'' (فتاویٰ خلیلیہ ج:۱ ص:۲۴۸)۔

اس پر آپ غور کرلیں پھر جو رائے قائم ہو، مطلع کریں۔

فہمِ ناقص میں تو یہ آتا ہے کہ ابتدائے شوال میں آنے کی شرط کو ہی حذف کردیا جائے اور بہرصورت مدرّس کو رمضان المبارک کی تنخواہ کا مستحق قرار دیا جائے، کیونکہ عقدِ اجارہ قائم ہے، یہ شرط لگا کر عقدِ اجارہ کو کیوں فاسد کیا جائے؟

۲:-''مدرّسین اَجیرِ خاص ہیں، کیونکہ وقت کے پابند ہیں'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وقتِ اِجارہ کے بعد وہ اجیر نہیں ہے، اس کو دُوسرے کسی کام سے نہیں روکا جاسکتا، اجیرِ خاص کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ چوبیس گھنٹے کا ملازم ہے اور کارِ منصبی کے علاوہ تمام اُمور سے ممنوع ہے۔

اس لئے کسی مدرّس کو دُوسرے کام کرنے سے روکنا عقدِ اِجارہ کے خلاف ہوگا۔ رہا یہ کہ دُوسری جگہ کام کرنے سے کارِ منصبی میں فرق آتا ہے، تو اس کا تدارک نہ ہوسکے عقدِ اِجارہ کو فسخ کرنے کا اختیار مہتمم مدرسہ کو حاصل ہے، فقط واللہ اعلم۔

آپ کو وقت نہیں ملتا اس لئے محاکمہ کی مختصر نقل کرکے بھیج رہا ہوں، ورنہ یہ ساری بحث قابلِ ملاحظہ ہے۔

باقی دُعاؤں کا محتاج ہوں، امراضِ قلب کی وجہ سے کام نہیں ہوتا، آپ کے لئے اور سب اہلِ خانہ کے لئے دُعاگو ہوں، والسلام۔　　سیّد عبدالشکور ترمذی عفی عنہ

اضافہ:- ایک ماہ پہلے اطلاع نہ دینے کی صورت میں مدرّس سے ایک ماہ کی تنخواہ واپس لینے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی، جب مدرّس نے کام کیا ہے اُجرت کا مستحق ہوگیا، اب اس کی واپسی اس کے ذمے کیوں ہو؟ اسی طرح مدرسے والے ایک ماہ کی مزید تنخواہ دینے کے کیوں مکلّف ہیں؟ جب اس نے اس ماہ میں کام ہی نہیں کیا تو اُجرت کس چیز کی؟ اِجارہ کے اصول پر غور مطلوب ہے۔

سیّد عبدالشکور ترمذی عفی عنہ
۱۹۹۷/۵/۵ء

(جواب از حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب مدظلہم العالی)

بعد الحمد والصلوٰۃ

احقر نے حضرت مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب مدظلہم و دام مجدہم کی تحریر پڑھی، اکابر کے سامنے نااہل اصاغر کی رائے کیا وقعت رکھتی ہے، مگر امتثالاً للامر عرض ہے کہ احقر ناچیز کی رائے میں ابتدائے شوال میں آنے کی شرط پر ماہِ رمضان (ایامِ بطالت و استراحت) کی تنخواہ کو مشروط کرنا اب مفسدِ عقد نہیں، کیونکہ اب یہ شرط معروف ہوچکی ہے، اور خود شیخ المحدثین حضرت سہارن پوری قدس سرہٗ نے ''فتاویٰ خلیلیہ'' میں اپنے محاکمے میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ:

> شرطِ معروف قرار دی جائے تو ان سب صورتوں میں مدرّس واقعہ متنازعہ فیہ میں پوری تنخواہ کا مستحق ہوگا۔　　(فتاویٰ خلیلیہ ج:۱ ص:۲۴۸)[1]

اس شرط کا معروف ہونا کئی وجوہات سے واضح ہے، جو درج ذیل ہیں:-

الف:- مدارسِ دینیہ میں اس شرط کا معروف ہوجانا محتاجِ بیان نہیں کہ تقریباً سب مدارس اس پر عمل پیرا ہیں۔

ب:- یہ شرط معروف عند الفقہاء بھی ہے کیونکہ ایامِ بطالت کی تنخواہ کا اِستحقاق اسی لئے ہے کہ استراحت کے بعد دوبارہ زیادہ نشاط کے ساتھ کام کرسکے، اگر اَیامِ بطالت کے بعد کام کرنے کا ارادہ ہی نہیں تو ایامِ بطالت کی تنخواہ کا استحقاق کیسے ہوگا؟

ج:- یہ شرط مالِ وقف کی حفاظت اور اسے صحیح تر مصرف پر خرچ کرنے کے بھی عین مطابق ہے، اس لئے کہ مدارس میں زکوٰۃ وعطیات کی رقم معطین یا طلباء کی امانت ہے، اس امانت میں احتیاط کا

(۱) طبع مکتبة الشیخ کراچی.

تقاضا یہ ہے کہ یہ رقم کسی کو بلاعمل یا بلاعوض نہ دی جائے، لہٰذا یا عمل موجود ہونا چاہئے (جیسا کہ ایامِ عمل میں) یا مظنون ہونا چاہئے (جیسا کہ ایامِ استراحت میں جبکہ آئندہ کام کرنے کا ارادہ ہو) ورنہ اُجرت کا جواز محلِ نظر ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ایامِ بطالت کی تنخواہ ماضی کے عمل کی وجہ سے ہے تو اس پر یہ شبہ ہے کہ ماضی کی خدمت کی بنیاد پر ایامِ بطالت کی اُجرت جبکہ مستقبل میں کام کرنے کا بھی ارادہ نہ ہو، عطیہ اور ہبہ سے زیادہ اشبہ ہے، اور مہتمم یا صدر کو اس طرح کے عطیہ کی اجازت محلِ شبہ ضرور ہے۔

د:- یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر شوال میں آنے کی شرط کو مفسدِ عقد قرار دے کر مہتمم کے لئے یہ شرط لگانا ناجائز قرار دیا جائے تو کیا مدرّس کے لئے ایامِ بطالت میں عدمِ عمل کی شرط لگانا مفسد نہ ہوگا؟ جبکہ اُجرت کے استحقاق کے لئے اجیرِ خاص میں عمل ورنہ تسلیمِ نفس ضرور ہے، ادھر مدارس میں یہ عرف ہے کہ مدرّس ایامِ بطالت میں نہ عمل کرتا ہے اور نہ تسلیمِ نفس پر راضی ہوتا ہے، بلکہ بعض مدارس میں اگر اسے مجبور کر کے ایامِ بطالت میں کام پر مامور کیا جائے تو اضافی تنخواہ دی جاتی ہے ورنہ اِنعام کے نام سے اس کی دِلجوئی کی جاتی ہے۔ گویا معاہدۂ ملازمت میں اب یہ بات -تحریراً ورنہ عرفاً وعملاً- مشروط ہے کہ ملازم ایامِ بطالت میں (جو دو ماہ طویل ہوتی ہیں) نہ عمل کرے گا اور نہ تسلیمِ نفس کرے گا، اور اس کے باوجود عقد فاسد قرار نہیں دیا جاتا۔

لہٰذا اگر مدرّسین کی طرف سے ایامِ بطالت میں عدمِ عمل اور عدمِ تسلیمِ نفس کی شرط مفسدِ عقد نہیں (حالانکہ اُجرتِ بطالت کی وصولی مالِ وقف سے ہوگی) کیونکہ اب یہ شرط معروف ہوچکی ہے تو مہتمم کی طرف سے آئندہ سال کام کرنے کی بنیاد پر رمضان کی تنخواہ کے استحقاق کی شرط بھی مفسدِ عقد نہیں ہونی چاہئے، واللہ سبحانہ اعلم۔

۲:- اس سلسلے میں احقر (عفا اللہ عنہ وعافاہ) کی بھی رائے یہ ہے کہ مدرّس کو اوقاتِ کار (اوقاتِ اِجارہ) کے بعد اپنا پابند بنانا شرطِ فاسد ہے، اسی طرح اوقاتِ کار چھ یا آٹھ گھنٹوں کے بجائے چوبیس گھنٹے متعین کر کے ملازم کو مسلسل دن رات کا پابند بنانا شرطِ فاسد ہے، اور اس میں کئی طرح کی قباحتیں ہیں۔

الف:- ملازم اور غلام میں کام اور وقت کے متعین ہونے اور نہ ہونے ہی کا فرق ہے، اور پابندی کی یہ شرط اشبہ بالاِجارہ نہیں، البتہ اگر یہ اِجارہ نہ ہوتا بلکہ نفقہ ہوتا تو شاید اس کی گنجائش ہوتی کیونکہ زوجہ کسی وقت اطاعتِ بعل سے انکار نہیں کرسکتی (اِلّا لعذر شرعی) اور امیر المؤمنین بھی کسی

وقت مصالح المؤمنین سے اغماض نہیں کرسکتا، مگر فی الوقت مدارس میں اِجارہ بلکہ اِجارۂ محضہ کی صورت رائج ہے۔

ب:- یہ وہ شرط ہے جس پر عمل کرنا مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے، لہٰذا اس شرط کو تسلیم کرنا اور کرانا گناہ میں مبتلا ہونا اور گناہ میں مبتلا کرنا ہے۔

ج:- یہ سلف صالحینؒ کے تعامل کے خلاف ہے، دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارن پور اور تھانہ بھون میں اس کے خلاف ہی تعامل رہا ہے، اور مدرّسین فارغ اوقات کو اپنے جملہ مشاغل حتیٰ کہ کاروباری مصروفیات میں صَرف کرتے رہے ہیں، اکابرؒ کے واقعات اس پر شاہد ہیں، بلکہ یہ مصروفیات اسلامی معاشرے میں علماء کی شمولیت اور برکت کی حامل رہی ہیں۔

د:- یہ شرط بظاہر مفسدِ اِجارہ بھی ہے کیونکہ مقتضائے عقدِ اِجارہ کے خلاف بھی ہے اور غیر معروف بھی بلکہ غیر معمول بھی، البتہ چونکہ اس شرط پر عمل کرنا چونکہ ناممکن ورنہ مشکل ضرور ہے اس لئے اگر اس شرط کو فاسد قرار دے کر اِجارہ کو صحیح قرار دیا جائے تو بھی کچھ بعید نہیں۔

ہ:- علامہ شامیؒ کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدرّس اِجارہ کو اوقاتِ کار کے بعد طلبِ معاش کی اجازت ہونی چاہئے کیونکہ انہوں نے ساکنینِ مدرسہ کو جن کا وظیفہ اور نفقہ وقف کی طرف سے متعین ہو طلبِ معاش کے لئے سفر کی اجازت دی ہے، اور اسے عذرِ شرعی قرار دیا ہے، اور اس سفر کی بناء پر اس کا وظیفۂ متعینہ ساقط نہ ہونے کا حکم ذکر کیا ہے، علامہ شامیؒ کی عبارت درج ذیل ہے:-

(قوله ونظم ابن شحنه الغيبة) أقول حاصل ما في شرحه تبعًا للبزازية انه اذا غاب عن المدرسة فاما أن يخرج من المصر أو لا فان خرج مسيرة سفر ثم رجع ليس له طلب ما مضى من معلومه بل يسقط وكذا لو سافر لحج ونحوه وان لم يخرج لسفر بأن خرج الى الرستاق فان أقام خمسة عشر يومًا فأكثر فان بلا عذر كالخروج للتنزه فكذٰلك وان لعذر كطلب المعاش فهو عفو الّا أن تزيد غيبته علىٰ ثلاثة أشهر فلغيره أخذ حجرته ووظيفته أى معلومه، وان لم يخرج من المصر فان اشتغل بكتابة علم شرعي فهو عفو والّا جاز عزله أيضًا واختلف فيما اذا خرج للّرستاق وأقام دون خمسة عشر يومًا لغير عذر فقيل يسقط وقيل لا، هٰذا حاصل ما ذكره ابن الشحنه في شرحه.

وملخصه أنه لا يسقط معلومه الماضى ولا يعزل فى الآتى: اذا كان فى

المصر مشتغلًا بعلم شرعی أو خرج لغیر سفر وأقام دون خمسة عشر یومًا بلا عذر علیٰ أحد القولین، أو خمسة عشر فأکثر لکن لعذر شرعی کطلب المعاش ولم یزد علیٰ ثلاثة أشهر. (ردّ المحتار ج:۴ ص:۴۱۸)[۱]

شامی کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ سال میں تین ماہ یعنی رُبع سے کم کم طلبِ معاش کی اجازت ہے، اگرچہ اس کا وظیفہ بحیثیت ساکن مدرسہ طے شدہ اور جاری ہو، اور اس طلبِ معاش کی وجہ سے نہ اس کا وظیفہ ساقط ہوگا اور نہ وہ مستحقِ عزل ہوگا۔

اگرچہ علامہ شامیؒ کی بیان کردہ یہ تفصیل ایک خاص صورت کے بارے میں ہے جس کی وضاحت خود علامہ شامیؒ نے درج ذیل عبارت سے کی ہے:-

وھٰذا التفصیل المذکور فی الغیبة انما ھو فیما اذا قال وقفت ھٰذا علیٰ ساکنی مدرستی وأطلق، أما لو شرط شرطًا تبع کحضور الدرس أیاما معلومة فی کل جمعة فلا یستحق المعلوم الّا من باشر خصوصًا اذا قال: من غاب عن الدرس قطع معلومه فیجب اتباعه.[۲] (ج:۴ ص:۴۱۹)[۳]

لیکن علامہ شامیؒ کی عبارت سے یہ امر ضرور واضح ہے کہ طلبِ معاش ایک عذرِ شرعی ہے اور مالِ وقف میں اس کی رعایت کا حکم ہے، تو مدارس میں اس عذرِ شرعی کی رعایت بطریقِ اَوْلیٰ ہونی چاہئے۔ البتہ یہ امر بہرحال لازم ہے کہ مدرّس اِجارہ کے لئے طلبِ معاش کا یہ عمل محض ضمنی ہو، مقصودی نہ ہو، اور اس کی وجہ سے مدرّس کے اوقاتِ اِجارہ اور عملِ اِجارہ میں کسی قسم کی اختیاری کوتاہی واقع نہ ہو۔

۳:- الف:- ایک ماہ پہلے اطلاع نہ دینے کی صورت میں مدرّس سے ایک ماہ کی تنخواہ واپس لینے کی شرط کسی قاعدۂ شرعیہ پر منطبق نظر نہیں آتی، کیونکہ مدرّس اپنے عمل یا تسلیم نفس کی بناء پر اس اُجرت کا مستحق ہو چکا تھا، اب اس اُجرت کا استرداد ایک قسم کی تعزیرِ مالی ہے، اور معاہدۂ اِجارہ میں اس تعزیرِ مالی کو لازم قرار دینا مفسدِ عقد ہونا چاہئے، اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ''فتاویٰ رشیدیہ'' میں اس کے مفسد ہونے کی تصریح فرمائی ہے:-

سوال:- یہ شرط اگر چند روز پہلے نوکری کے اطلاع نہ دو گے تو اس قدر جرمانہ دینا

---

(۱) کتاب الوقف (طبع سعید) (ھامش ردّ المحتار علی الدّر المختار کتاب الوقف ج:۴ ص:۴۱۸).

(۲) قلت یجب اتباع ھٰذا الشرط لأن شرط الواقف کنصّ الشارع. ۱۲ (حاشیہ از حضرت مولانا محمود اشرف صاحب مدظلہم)۔

(۳) کتاب الوقف (طبع سعید).

ہوگا، متممات عقد سے ہے اور لازم؟

جواب:- اِجارہ شرطِ فاسد سے فاسد ہوجاتا ہے، اور یہ شرط خلاف مقتضائے عقد کی ہے، لہٰذا عقد کو فاسد کردیوے گی، اس کا ذکر نہ کرنا چاہئے، تفسد الاجارۃ بالشروط المخالفة لمقتضى العقد، درمختار۔ اور یہ شرط ظاہر ہے کہ اَجیر کو مفید اور مستأجر کو نافع اور عقد کے خلاف ہے۔ (تالیفاتِ رشیدیہ ص:۴۲۲)[1]

البتہ مدرّس پر یہ شرط رکھی جاسکتی ہے کہ ملازمت ترک کرنے سے ایک ماہ پہلے اطلاع دینی ہوگی، ورنہ اطلاع کے بعد ایک ماہ تک اصالۃً یا نیابۃً کام کرنا لازم ہوگا۔

ب:- جہاں تک مدرسے کی طرف سے فی الفور اِخراج پر ایک ماہ کی تنخواہ کی ادائیگی لازم ہونے کی شرط ہے، تو یہ شرط بھی بظاہر مفسدِ عقد ہے، البتہ مدرسے کی طرف سے تبرّع کی تأویل ہوسکتی ہے، لیکن یہ تبرّع بھی اسی وقت جائز ہوگا جبکہ معطین اور طلباء کی طرف سے اِذن صراحۃً پایا جاتا ہو۔

البتہ اس مسئلے میں یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ جس طرح مکان ودُکان کے اِجارہ غیر متعینہ میں یکم تاریخ کو اطلاع نہ دینے کی صورت میں آئندہ پورے ماہ کا اِجارہ لازم ہوجاتا ہے، اسی طرح کیا یہاں بھی یکم تاریخ کو اطلاع نہ دینے کی صورت میں پورے ماہ کا اِجارہ لازم نہ ہوجائے گا؟

فلیتأمل الأکابر والیهم المفاهیم ومنهم الأوامر

احقر محمود اشرف عثمانی غفر اللہ لہٗ

۱۴۱۸/۳/۲۵ھ

(رائے مولانا مفتی عبدالمنان صاحب مدظلہم)

احقر نے حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب مدظلہم کی تحریر پر غور کیا، اس میں جو موقف اختیار کیا گیا ہے اُصولی طور پر وہ دُرست ہے، اور اس سلسلے میں ''اَحسن الفتاویٰ'' ج:۷ ص:۲۸۷ تا ۲۹۴[2] میں جو موقف اختیار کیا گیا ہے، وہ بھی قابلِ غور ہے، حضراتِ اکابر کو اس پر بھی غور کرنا چاہئے۔

اور احقر کی ایک تجویز یہ بھی ہے کہ مدارس کا عقدِ اِجارہ عرف و رواج کے مطابق اگرچہ اِجارہ مسانہہ ہے، تاہم اِجارہ کے قواعد و ضوابط کے مطابق زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ عقدِ اِجارہ کے وقت باضابطہ اس کی مدّت طے کی جائے ایک سال کے لئے، اور پھر ہر سال اس کی تجدید کی جائے، اور مدرّس کو پورے سال کی تنخواہ دی جائے، یعنی ایامِ تعطیل کی تنخواہ بھی دی جائے۔ اس صورت میں اگر یہ

---

(۱) طبع ادارۂ اسلامیات۔

(۲) طبع ایچ ایم سعید۔

اِشکال ہو کہ ایامِ تعطیل میں مدرّس اپنے آپ کو تسلیم نہیں کرتا اور تدریس کے لئے حاضر نہیں ہوتا تو پھر تنخواہ کا استحقاق کیسے؟ تو اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ جیسے دورانِ تدریس جمعہ کے روز مدرّس تدریس کے لئے حاضر نہیں ہوتا لیکن اس کا معاہدہ قائم ہونے کی وجہ سے یا راحت لینے اور تازہ دم ہونے کی وجہ سے اس کو تنخواہ دی جاتی ہے، اسی طرح ایامِ تعطیل یعنی اَواخرِ شعبان اور رمضان کی تنخواہ اس کو ملنی چاہئے۔ البتہ اگر کسی مدرّس کو رمضان کے بعد دوبارہ تدریس کے لئے حاضر ہونے کا ارادہ نہ ہو، اور اَواخرِ شعبان ہی میں اس نے اس کا فیصلہ کرلیا ہو تو ایسی صورت میں دیانۃً اس کو اَواخرِ شعبان اور رمضان کی تنخواہ نہیں لینی چاہئے کیونکہ یہاں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اب راحت و آرام لینے کا فائدہ اس مدرسے کو نہیں پہنچے گا۔ واللہ اعلم

محمد عبدالمنان عفی عنہ
۱۴۱۸/۴/۲۲ھ

(رائے مفتی عبدالرؤف صاحب سکھروی مدظلہم)

احقر کو مذکورہ دونوں حضرات کی رائے دُرست معلوم ہوتی ہے، اور اس پر مزید اِضافے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ بندہ عبدالرؤف سکھروی
۱۴۱۸/۶/۱۲ھ

(حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب رحمہ اللہ کے مذکورہ اِستفتاء پر دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کے حضرات مفتیانِ کرام نے اپنی مذکورہ آراء تحریر فرمائیں اور آخر میں اپنی آراء کے ساتھ حتمی فیصلے اور فتویٰ کے لئے یہ تحریر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی خدمت میں بھیجی، جس پر حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ نے فتویٰ تحریر فرمایا جو درج ذیل ہے)

(فتویٰ از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم)

مخدوم مکرّم حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

افسوس ہے کہ گرامی نامے کا جواب جلد نہیں دے سکا، مختلف اَسفار و اَشغال کے اژدحام نے اس قابل نہیں چھوڑا کہ اپنے اختیار اور انتخاب کے مطابق کسی مسئلے کی تحقیق کرسکوں۔ احقر نے یہ تحریر اپنے دارالافتاء میں بھجوادی تھی، وہاں کے حضرات کی آراء منسلک ہیں، احقر کسی محاکے کا اہل نہیں، لیکن تعمیلِ حکم میں جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ شوال میں کام کرنے کو رمضان کی تعطیل کی تنخواہ کے لئے موقوف علیہ قرار دینا اور نہ قرار دینا دونوں امر جائز ہیں، موقوف علیہ قرار نہ دینے کا جواز واضح ہے، کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ عقدِ اِجارہ میں ایک ماہ کی تنخواہ بلاعمل جو مقرّر کی گئی، وہ گویا سارے سال کے

مجموعی عمل پر ایک اُجرتِ اضافیہ ہے، جو معلوم ہے، اور فریقین کے اتفاق سے جائز ہے۔ اور موقوف علیہ قرار دینے کے جواز کی ایک وجہ تو وہی ہوسکتی ہے جس کی طرف حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کے جواب میں اشارہ موجود ہے کہ: ''یا شرطِ معروف قرار دی جائے ... الخ'' اور جس پر مولانا محمود اشرف صاحب نے اپنی تحریر کی بنیاد رکھی ہے۔ اور دُوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ایامِ بطالت کی تنخواہ تجدیدِ عقدِ اِجارہ کے لئے شرط قرار دی گئی ہے، یعنی اگر شوال میں آئندہ سال کے لئے عقد کی تجدید کی گئی تو ایامِ بطالت کی تنخواہ بھی دی جائے گی، ورنہ نہیں۔ گویا اس صورت میں عقدِ اِجارہ شعبان پر ختم ہوگیا، شوال میں تجدیدِ عقد کے وقت ایامِ بطالت کی تنخواہ اضافی طور پر شوال کے ساتھ دی گئی۔

بہرصورت! دونوں تخریجات کے مطابق یہ شرط دُرست ہے، اور حکیم الاُمت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا جواب بھی دو مرتبہ اسی کے مطابق فتاویٰ خلیلیہ (ج:۱ ص:۲۴۵ و ۲۴۷) میں موجود ہے۔[1]

البتہ ملازم پر یہ شرط عائد کرنا کہ وہ خارج اوقات میں کوئی معاشی کام نہ کرے، شرطِ فاسد ہے، ہاں مؤجر کو یہ حق ہے کہ وہ خارجی کام کی صورت میں ملازم کی تنخواہ کم مقرّر کرے۔

نوٹس نہ دینے کی صورت میں ایک ماہ کی تنخواہ کا مطالبہ شاید اس بنیاد پر دُرست ہو کہ عقدِ اِجارہ کی جو مدّت طے ہوئی تھی اس کی پابندی فریقین پر لازم تھی، بلاعذر اسے توڑنے سے فریقِ ثانی کا جو نقصان ہوا، اگر اس کی تلافی کے لئے جانبین ایک ماہ کی تنخواہ کا مطالبہ طے کرلیں تو شاید ''لا ضرر ولا ضرار''[2] کے مطابق ہو، مگر یہ محض ایک احتمال کے درجے میں ہے جس پر مزید غور و تحقیق کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۱۸/۱۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰/۳۰۱)

کرایہ دار نے کرایہ کی دُکان پر کمرہ اور غسل خانہ وغیرہ بنوایا ہو تو اس کا خرچ کس پر ہے؟

سوال:- زید نے بکر سے ایک دُکان مبلغ سات سو روپے ماہوار پانچ سال کے لئے کرایہ پر لی، اور پانچ سال کا کرایہ پیشگی ادا کردیا، کچھ عرصہ بعد بکر کو تین ہزار روپے کی ضرورت پڑی، زید سے تین ہزار روپے قرضِ حسنہ لیا اور وعدہ کیا کہ ایک ماہ میں ادا کروں گا، مگر وعدے پر تین ہزار روپے نہیں

(۱) طبع مکتبۃ الشیخ کراچی۔
(۲) لا ضرر ولا اضرار۔ (سنن ابن ماجۃ، باب من بنی فی حقہ ما یضرّ بجارہٖ ص:۲۹۶ طبع مکتبہ فاروقی)۔

دیئے اور کہا یہ روپے بھی کرایہ میں مجرہ کرلینا۔ دُکان کی چھت تقریباً دو سال بعد دو تین جگہ سے ٹپکنے لگی، زید اپنے طور پر مرمت کراتا رہا، مگر جب زیادہ خراب ہوگئی تو بکر سے چھت بنوانے کے لئے کہا، بڑی مشکل سے بکر نے زید سے کہا کہ چھت بنوالو جو خرچہ ہوگا وہ تم اپنے پاس سے کرو، کرایہ میں مجرہ کرو۔ دُکان پر ایک کمرہ بنا ہوا تھا جب چھت دوبارہ بنوائی تو اس کا توڑنا لازمی تھا، کمرہ توڑ دیا گیا، بکر کہنے لگا کہ: اگر کمرہ دُکان کے اگلے حصے پر بنوالیں تو دُکان کی شو ہوجائے گی، زید نے کہا کہ: مجھ کو اعتراض نہیں، جس حصے پر چاہو بنوادوں۔ کئی روز تک مختلف تجاویز ہوتی رہیں، آخر جواب بکر نے یہ دیا کہ: ہمیں کمرے کی ضرورت نہیں، تم اپنے خرچے سے بناؤ، میں خرچہ نہیں دُوں گا۔ زید کو چونکہ بیوپاریوں کے لئے جگہ کی ضرورت تھی لہٰذا اس نے اپنے خرچے سے کمرہ اور پائخانہ اور غسل خانہ بنوالیا، اب جبکہ پانچ سال کرایہ کے اور کچھ مزید مدّت خرچے کی پوری ہوگئی تو کیا زید کو یہ حق ہے کہ کمرہ اور غسل خانے اور پائخانے پر جو خرچ کیا ہے بکر سے وصول کرے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں چونکہ زید نے کمرہ، غسل خانہ اور پائخانہ خود اپنی مرضی سے بنوایا ہے اور بکر نے اس سے صراحۃً یہ کہہ دیا تھا کہ: ''میں اس خرچ کا نہ خود ذمہ دار ہوں گا اور نہ اس خرچ کو کرایہ میں مجرا کیا جاسکے گا'' تو بکر کے ذمے اس کے اِخراجات ادا کرنا نہیں ہے،[۱] ہاں اگر بکر ادا کردے تو اس کے لئے اچھا اور باعثِ اجر ہوگا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۵/۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۶۱۷ ب)

معاہدے کی مدّت ختم ہونے پر مکان خالی کرنا لازم ہے

سوال:- اُردو اخبار ''جنگ'' جمعہ ایڈیشن مؤرخہ یکم مئی میں ''غصب کردہ مکان میں نماز'' کے عنوان سے ایک فتویٰ شائع ہوا ہے، جس کی ایک فوٹو کاپی مرسل ہے،[۲] جناب کے دارالافتاء سے

---

(۱) وفي الدّر المختار ج:۶ ص:۷۹ (طبع سعید) وعمارة الدّار المستاجرة وتطيينها واصلاح الميزاب وما كان من البناء علىٰ ربّ الدّار وكذا كل ما يخلّ بالسكنىٰ .... واصلاح بئر الماء والبالوعة والمخرج علىٰ صاحب الدّار لكن بلا جبر عليه لأنّه لا يجبر علىٰ اصلاح ملكه فان فعله المستاجر فهو متبرّع.

وفي الشامية تحته: (قوله فهو متبرّع) أى ولا يحسب له من الأجرة.

وفي شرح المجلّة للأتاسيّ رقم المادّة: ۵۲۹ وان عمل هذه الأشياء المستاجر يكون متبرعًا فليس له أن يطالب الأجر بشيءٍ ممّا أنفق على التّعمير والتّرميم قال في ردّ المحتار: وليس له أن يحسبه من الأجرة.

(۲) ریکارڈ میں یہ فوٹو کاپی موجود نہیں ہے، تاہم حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اس جواب سے اس تراشے میں موجود مسئلے کی وضاحت ہوجاتی ہے۔

ایک فتویٰ حاصل ہوجائے تو ارادہ ہے کہ اسے قانون سازی کے ذمہ دار حکومتی اداروں کو بھیجا جائے کہ وہ شرع کی روشنی میں قانونِ کرایہ داری میں ترمیم کرکے بہت سے جھگڑوں کو ختم کریں، اگر ضروری ہوا تو اس کی ایک نقل صدرِ محترم کو بھی بھیج دی جائے گی۔

جواب:- منسلکہ تراشے[۱] میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ دُرست ہے، کرایہ دار کو صرف اُسی وقت تک قبضہ رکھنے کا حق ہے جب تک معاہدے کی مدّت باقی ہو، اور مدّت ختم ہونے پر جب مالک خالی کرنے کو کہے اس وقت خالی کرنا واجب ہے،[۲] اِلَّا یہ کہ وہ معاہدے کی تجدید پر راضی ہوجائے۔[۳]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲۰/۱۱/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۷۶/۳۲ ج)

(۱) ریکارڈ میں یہ فوٹو کاپی موجود نہیں ہے، تاہم حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اس جواب سے اس تراشے میں موجود مسئلے کی وضاحت ہوجاتی ہے۔

(۲) وفی الدّر المختار کتاب الاجارۃ ج:۶ ص:۴۵ (طبع سعید) آجر دارہ کل شھر بکذا فلکل الفسخ عند تمام الشھر۔

وفی تبیین الحقائق باب الاجارۃ الفاسدۃ ج:۶ ص:۱۱۲ (طبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت) ثم اذا تمّ الشھر کان لکل واحد منھا نقض الاجارۃ لانتھاء العقد الصحیح .... الخ۔

وکذا فی المبسوط للسرخسی ج:۱۵ ص:۱۴۶ (طبع مکتبہ غفاریہ کوئٹہ)۔

وفی الھندیۃ ج:۴ ص:۴۲۸ کان الرّد علی المستأجر بعد انقضاء المدّۃ ویضمن لو ھلک قبل الرّد لأنّہ غاصب اھ۔

وفی المجلّۃ لسلیم رستم باز رقم المادّۃ: ۵۹۶ ص:۳۱۸ لو استعمل واحد ما لا بدون اذن صاحبہ کان غاصبًا .... فانّما یلزمہ ضمان المنفعۃ أی أجر المثل اذا لم یکن استعمالہ بتأویل ملک أو عقد .... الخ۔ وکذا فی شرح المجلّۃ للأتاسیؒ ص:۶۹۷ (طبع مکتبہ حبیبیہ)۔

وفی البحوث فی قضایا فقھیۃ معاصرۃ ص:۱۱۴ اذا کانت الاجارۃ لمدّۃ معلومۃ استحق المستأجر البقاء علیھا الیٰ تلک المدّۃ ..... الخ۔

(۳) وفی الھندیۃ ج:۴ ص:۴۱۱ وأمّا شرائط الصّحۃ (أی شرائط صحّۃ الاجارۃ) فمنھا رضاء المتعاقدین ..... الخ۔

﴿فصل فی إجارۃ الأرض والأشجار والحیوان﴾

(زمین، حیوان اور درختوں کے اِجارہ سے متعلق مسائل)

''اِحکار'' یعنی ہمیشہ کے لئے زمین کرایہ پر لینے کا حکم اور تفصیلی شرائط

سوال:- ہمارے علاقے میں ایک قسم کا عقد مروّج ہے کہ ایک شخص دُوسرے شخص کو زمین مکان بنانے کے لئے دیتا ہے، عقد ہی میں کرایۂ مکان متعین کیا جاتا ہے، کرایہ غلے یا نقد کی صورت میں ہوتا ہے، اور سال کے ختم ہونے پر لیا جاتا ہے۔ لیکن عقد کے وقت مدّتِ سکونت کا ذکر نہیں کیا جاتا ہے بلکہ یہ عرفاً قدیم زمانے سے متوارث چلی آرہی ہے کہ صاحبِ مکان ہمیشہ کے لئے اپنے گھر میں رہے گا، اس کی وفات کے بعد اس کے ورثاء پشت در پشت، الغرض مالکِ زمین اپنی حیات میں نہ تو مالکِ مکان کو گھر سے نکال سکتا ہے اور نہ ان کے ورثاء۔ اس طرح مالکِ زمین کی وفات کے بعد اس کے ورثاء بھی نہ تو مالکِ مکان کو نکال سکتے ہیں، اور نہ اس کے ورثاء۔ بس مالکِ زمین یا اس کے ورثاء صرف کرایہ لے سکتے ہیں، اور یہ عدم تعیینِ مدّت مفضی الی النزاع بھی نہیں ہے، کیونکہ عرف ایسا ہی ہے۔ پشتو میں اس عقد کو ''غولہ'' یعنی حریم کہا جاتا ہے، البتہ اگر خود مالکِ مکان، مکان کو چھوڑ دے تو اور بات ہے۔ ہمارے علماء حضرات اس عقد کو احکار میں داخل تصوّر کرتے ہیں اور اِجارۂ مؤبدہ کا نام بھی دیتے ہیں۔ اب امرِ مطلوب یہ ہے کہ ۱:- یہ عقد جائز ہے کہ نہیں؟ ۲- یہ احکار ہے کہ نہیں؟ ۳- صاحبِ زمین صاحبِ مکان کو یا اس کے ورثاء کو بلاوجہ مکان سے نکال سکتے ہیں کہ نہیں؟ ۴- صاحبِ زمین کے ورثاء ایسا کرسکتے ہیں کہ نہیں؟ ۵- اِجارۂ مؤبدہ کا نام کتبِ فقہ میں کہاں ذکر ہے؟

جواب:- اگر کرایہ داری کا عقد کرتے وقت مدّت کا کوئی ذکر نہ کیا جائے تو اصل حکم یہ ہے

کہ اجارہ صحیح نہیں ہوتا،[۱] یا اگر کوئی مجہول مدت مقرر کرلی جائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔[۲] لیکن اگر عقد ہی میں یہ بات طے کرلی جائے کہ کرایہ دار اس زمین پر ہمیشہ اپنا قبضہ برقرار رکھے گا اور مالکِ زمین کو کرایہ ادا کرتا رہے گا اور جب تک وہ زمین کی اُجرتِ مثل ادا کرتا رہے اس وقت تک مالک کو زمین خالی کرانے کا حق نہیں ہوگا، تو اس کو بھی بعض فقہائے کرامؒ نے جائز قرار دیا ہے، اور اسی کو اصطلاح میں ''اِحکار'' (نہ کہ اِحتکار) کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ۱- مالک، عقد ہی کے وقت کرایہ دار کو پٹہ دوامی لکھ دے کہ یہ زمین ہمیشہ کے لئے کرایہ پر دی جارہی ہے۔ ۲- کرایہ دار اس زمین میں کوئی تعمیر وغیرہ کرلے۔ ۳- معاہدے میں یہ بات بھی طے ہو کہ جب اُس جیسی زمینوں کا کرایہ بڑھے گا تو اِس زمین کا بھی کرایہ اسی حساب سے بڑھ جائے گا۔ ۴- کرایہ دار پابندی سے کرایہ دیتا رہے گا۔ ۵- کرایہ دار تین سال تک زمین کو معطل نہ چھوڑے۔ یہ شرائط علامہ شامیؒ نے ردّ المحتار میں ''مطلب مرصد ومشدّ مسكة'' کے عنوان کے تحت (ج:۵ ص:۲۱ و۲۲)[۳] نیز اپنے رسالے ''تحرير العبارة فيمن هو أحق بالاجارة'' میں بیان فرمائی ہیں (رسائل ابنِ عابدین ج:۲ ص:۱۵۴)۔ اور حضرت مفتیٔ اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ''جواهر الفقه'' (ج:۲ ص:۳۰۳) میں اس مسئلے پر مفصل بحث فرمائی ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اصل بات یہ ہے کہ یہ شرائط پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ ہم چونکہ آپ کے علاقے کے عرف سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، اس لئے کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے، لہٰذا آپ مقامی اہلِ افتاء علماء سے رُجوع کرکے ان سے فیصلہ کرائیں کہ جو شرائط ''جواهر الفقه'' میں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں وہ یہاں موجود ہیں یا نہیں؟ اگر موجود ہوں تو یہ عقد جائز ہوگا، ورنہ نہیں۔

واللہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۰/۵۹)

(۱ و ۲) وفي الدّر المختار باب الاجارة الفاسدة ج:۶ ص:۴۶ و ۴۷ تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد فكل ما افسد البيع ممّا مرّ يفسدها كجهالة ماجور او أجرة او مدّة أو عمل ..... الخ.

وفي خلاصة الفتاوىٰ كتاب الاجارات ج:۳ ص:۱۰۳ (طبع رشيديه كوئٹه) عقد الاجارة لا يجوز الّا أن يبيّن البدل من الجانبين جميعًا أمّا بيان المنفعة فباحدىٰ معان ثلاثة بيان الوقت وهو الأجل .... الخ.

وفي الفتاوىٰ الكاملية كتاب الاجارات مطلب تفسد الاجارة بجهالة الأجر ويفسد بها العقد سواء كانت الجهالة في الأجرة أو المدّة أو العمل .... الخ. وكذا في البحر الرّائق ج:۸ ص:۱۷.

وفي الهندية كتاب الاجارة ج:۴ ص:۴۱۱ (طبع رشيديه كوئٹه) وأمّا شرائط الصّحة (صحّة الاجارة) .... ومنها بيان المدّة في الدّور والمنازل والحوانيت .... الخ. وفيها أيضًا ج:۴ ص:۴۳۹ الفساد قد يكون لجهالة قدر العمل .... وقد يكون لجهالةقدر المنفعة بأن لا يبيّن المدّة .... الخ.

وكذا في البزازية على الهندية ج:۵ ص:۱۱ كتاب الاجارات.

(۳) ردّ المحتار مطلب في المرصد والقيمة ومشد المسكة ج:۶ ص:۲۶ و ۲۷ (طبع سعيد).

''اِجارۂ اَشجار'' درختوں کے اِجارہ کی شرعی حیثیت اور جواز کا حیلہ

سوال:- کیا درختوں کا اِجارہ یعنی درختوں کو کرایہ پر دینا جائز ہے؟ سنا ہے کہ فتاویٰ رشیدیہ میں اسے جائز قرار دیا گیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ نیز اگر ناجائز ہے تو متبادل طریقۂ کار سے بھی آگاہ فرمائیں۔

جواب:- درختوں کے اِجارہ کو تمام فقہاءؒ نے ناجائز لکھا ہے، چنانچہ علامہ خیرالدین رملیؒ فرماتے ہیں: ''استأجر بقرۃ لیشرب لبنھا لا ینعقد، وکذٰلک لو استأجر بستانًا لیأکل ثمرہ.'' (فتاویٰ خیریہ ج:۲ ص:۱۲۸)۔[1] والمسئلۃ مصرّح بھا فی منح الغفّار وکثیر من الکتب وفی الإجارۃ المذکورۃ أُمور أُخر توجِب فسادھا خصوصًا عندنا کالشّیوع وطول المدّۃ فی الوقف۔

اس کے علاوہ اور بہت سی کتبِ فقہ میں یہ مسئلہ بتصریح موجود ہے، حتیٰ کہ ''فتاویٰ رشیدیہ'' جس کا حوالہ دے کر اِستفتاء میں یہ کہا گیا ہے کہ اِجارۂ اَشجار جائز ہے، خود اس میں بھی پوری تصریح کے ساتھ جواز کے بجائے عدمِ جواز کا فتویٰ موجود ہے، مولانا رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

> درخت کا اِجارہ دُرست نہیں کیونکہ اِجارہ منافع کا ہوتا ہے اعیان و زوائد کی بیع ہوتی ہے .....الخ۔ (فتاویٰ رشیدیہ، کامل مبوّب ص:۴۴۷)[2]
>
> اور اسی پر حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے فتویٰ دیا ہے (امداد ج:۳ ص:۱۲۸)[3]۔

لیکن اس سلسلے میں فقہاء نے جواز کا ایک حیلہ بھی بیان فرمایا ہے کہ پہلے مالک درختوں کو مساقاۃ (بٹائی) پر اس شرح سے دیدے کہ ایک ہزار میں سے ایک حصہ مالک کا، اور باقی تمام حصے مساقی کے، اور اس کے بعد اسی شخص کو وہ زمین کرایہ پر دیدے، اور اس کی شرح میں مثلی اُجرت پر اتنا اضافہ کردے کہ جتنا عقدِ مساقاۃ میں کم کیا تھا۔ شرط یہ ہے کہ زمین قابلِ زراعت ہو، نیز یہ حیلہ اس وقت صحیح ہوسکتا ہے جبکہ یہ زمین اور درخت مالِ وقف یا مالِ یتیم میں سے نہ ہوں، چنانچہ اگر کسی نے مالِ وقف یا مالِ یتیم میں یہ حیلہ جاری کردیا تو دونوں عقد باطل ہوجائیں گے، مساقاۃ تو اس لئے کہ اس میں یتیم و وقف کا ضرر ہے، اور اِجارہ اس لئے کہ وہ مساقاۃ کے بطلان کے بعد کیا گیا تو گویا اَرضِ مشغول پر اِجارہ منعقد ہوا، اور وہ باطل ہوتا ہے، اور اسی لئے حیلے میں عقدِ مساقاۃ کو مقدم کرنے کی شرط لگائی گئی

---

(۱) الفتاوی الخیریۃ علٰی تنقیح الفتاوی الحامدیۃ ج:۲ ص:۲۰۴ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ).

(۲) ص:۵۱۵ (طبع سعید).

(۳) ج:۳ ص:۳۸۷.

ہے کہ اگر معاملہ بالعکس کردیا تو اجارۂ زمین باطل ہوجائے گا، لکونها فی الأرض المشغولة۔

ان تمام باتوں کے دلائل کتبِ فقہیہ سے حسب ذیل ہیں:-

۱ – قال فی الدر المختار وأفاد فساد ما یقع کثیرًا من أخذ کرم الوقف أو الیتیم مساقاةً فیستأجر أرضه الخالیة من الأشجار بمبلغ کثیر ویساقی علیٰ أشجارها بسهم من ألف سهم فالحظ ظاهر فی الإجارة لا فی المساقاة.

۲ – وقال الشامیؒ تحته: اعلم أنّه حیث فسدت المساقاة بقیت الأرض مشغولة فیلزم فساد الإجارة أیضًا کما قدّمناه وان کان الحظّ والمصلحة فیها ظاهرین فتنبّه لهٰذه الدّقیقة.

۳ –وفی فتاویٰ الحانوتی التنصیص فی الإجارة علیٰ بیاض الأرض لا یفید الصحة حیث تقدّم عقد الإجارة علیٰ عقد المساقاة اما اذا تقدم عقد المساقاة بشروطه کانت الإجارة صحیحة کما صرّح به فی البزّازیّة.

(شامی ج:۵ ص:۶ و ۷)[1]

۴ – وفیه بعد أسطر: وهٰذا بالنّسبة إلی الوقف وأمّا مساقاة المالک فلا ینظر فیها إلی المصلحة (ای عدم الجواز) کما لو آجر بدون أجر المثل اهـ.

(ردّ المحتار ج:۵ ص:۷)[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۰/۵/۸ھ[3]

زمین کی مال گزاری مؤجر پر ہے یا مستأجر پر؟

سوال:- یہاں بعض علاقوں میں رواج ہے کہ زمین اِجارہ میں مال گزاری یعنی فی بوگہ ۸ روپیہ مؤجر ادا کرتا ہے، اور بعض جگہ میں مستأجر ادا کرتا ہے، اور میری کچھ کچھ زمین دونوں علاقوں میں ہے جہاں مؤجر مال گزاری ادا کرتا ہے وہاں تو مجھ سے طلب کیا جاتا ہے اور جہاں مستأجر دیتا ہے کیا اس پر مؤاخذہ عنداللہ ہوگا؟

جواب:- اگر زمین روپیہ کے عوض کرایہ پر دی گئی ہے تو مال گزاری کی ادائیگی کی شرط مستأجر پر لگائی جاسکتی ہے بشرطیکہ اس کی مقدار معلوم ہو اور حکماً یہ کرایہ کا جزء ہوگا، لیکن اگر بٹائی (مزراعت) پر دی گئی ہے تو اس میں یہ شرط مزارع پر عائد نہیں کی جاسکتی اور اگر یہ شرط لگادی گئی ہے تو مزارعت فاسد ہوجائے گی۔

(۱ و ۲) الدّر المختار مع ردّ المحتار کتاب الاجارة ج:۶ ص:۸ (طبع سعید).

(۳) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی ''تمرینِ افتاء'' کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

لما فی الدر المختار: فتبطل ان شرط لأحدهما قفزان مسماة أو ما یخرج من موضع معین أو رفع ربّ البذر بذرهٗ أو رفع الخراج الموظف (شامی ج:۵ ص:۱۲۴۱، استنبول)۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۱۲/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۶۳۳/۱۹ الف)

گائے یا بھینس پرورِش کے لئے نصف حصے پر دینے کا حکم اور جواز کی صورت

سوال:- زید اپنی بھینس بکر کو نصف حصے پر دیتا ہے پرورِش کے لئے، گائے یا بھینس کی بچیاں چھوٹی چھوٹی تقریباً ڈیڑھ سال کی ہوتی ہیں، زید بکر کو کہتا ہے کہ: یہ کٹی لے جاؤ اور اس کی پرورِش کرو۔ ہر قسم کا چارہ وغیرہ یا مکمل انتظام اس کی پرورِش کا بکر ہی کرتا ہے، زید کے متعلق کوئی خرچہ نہیں، بکر کی پرورِش کرتے کرتے کٹی بچہ دیتی ہے، پہلی دفعہ جب وہ نوزائیدہ بچہ ہوتا ہے اُس کو ہمارے علاقے کے عرف میں ''وہ تمام سوا'' یعنی جب تک وہ دُودھ دیتی رہتی ہے وہ سارا سوا بکر خود کھاتا پیتا رہتا ہے، جبکہ پہلی دفعہ زید کی طرف سے بھی اس کی اجازت ہوتی ہے، دُوسری مرتبہ جب وہ بھینس بیاتی ہے یا بچہ جنتی ہے تو اب فریقین اس بھینس کا حصہ ختم کرنا چاہتے ہیں، یعنی زید بکر کو کہتا ہے کہ یہ بھینس جو میں نے تمہیں پرورِش کے لئے دی ہوئی ہے اس کی قیمت لگا کر یا نصف قیمت لگا کر مجھے دیدے اور بھینس تو لے لے یا نصف قیمت تو لے کر مجھے دیدے، چنانچہ اس طرح کر لیتے ہیں۔ اب قابلِ دریافت اُمور یہ ہیں: ۱-بھینس کا بکر کو نصف حصے پر پرورِش کے لئے دینا جائز ہے یا نہیں؟ ۲-بھینس کی نصف ملکیت بکر کی پرورِش کی وجہ سے ہوجاتی ہے یا تمام بھینس کا مالک صرف زید ہی رہتا ہے؟ ۳-اس طرح قیمت لگا کر لینا دینا جائز ہے یا نہیں؟ ۴-عرفاً یا شرعاً اس طرح بھینس کو پرورِش کے لئے دینا جائز ہے یا نہیں؟ ۵-پرورِش کرنے والا بھینس کا حصہ تقسیم یا ختم کرنے کے وقت لگاتا ہے مالک بھینس کی قیمت نہیں لگاتا؟ بعدہ بھینس دینے والا مختار ہوتا ہے چاہے نصف قیمت پرورِش کرنے والے

---

(۱) الدّر المختار کتاب المزارعة ج:۶ ص:۲۷۶ (طبع سعید).

وفی البحر الرّائق کتاب المزارعة ج:۸ ص:۱۶۱ (طبع سعید) أو اشترطا لأحدهما قفزانا مسماة أو ما علی الماذیانات والسواقی أو ان یرفع ربّ البذر بذره أو برفع من الخارج الخراج والباقی بینهما فسدت ...... وفیه بعد أسطر .... أو یرفع ربّ البذر بذره أو بدفع الخراج فلأنّه یؤدّی الیٰ قطع الشرکة فی البعض أو الکل وشرط صحتها أن یکون الخارج مشترکًا بینهما والمراد بالخراج الخراج المؤظّف نصفًا أو ثلثًا او نحو ذٰلک .... الخ.

وکذا فی الهندیة، کتاب المزارعة ج:۵ ص:۲۳۵ (طبع رشیدیه) والهدایة، کتاب المزارعة ج:۴ ص:۴۲۶ (طبع شرکت علمیه وفی طبع مکتبه رحمانیه ج:۴ ص:۴۲۴) و بدائع الصنائع، کتاب المزارعة ج:۶ ص:۱۸۰ (طبع سعید).

کو دے کر بھینس لے لے یا نصف قیمت اُس سے لے کر بھینس پرورش کرنے والے کو دیدے۔ شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- گائے یا بھینس کو پرورش کے لئے نصف حصے پر دینا شرعاً جائز نہیں، اس سے اِجارہ فاسد ہوجاتا ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بھینس بدستور زید کی ملکیت ہے اور بکر نے اسے جتنا چارہ اپنی ملکیت میں سے کھلایا اس کی قیمت زید بکر کو ادا کرے، نیز بکر نے اس کی جتنے دن خدمت کی اس کی اُجرت بھی زید پر واجب ہے،[1] اور اُجرت اتنی ہوگی جتنی عام طور سے اس مقصد کے لئے کسی شخص کو مزدوری پر رکھ کر دی جاتی۔[2] دُوسری طرف بکر نے اُس بھینس کا جتنا دُودھ یا سوا استعمال کیا اُتنا ہی دُودھ اور سوا اُس پر واجب ہے کہ زید کو ادا کرے، بھینس بہرصورت پوری کی پوری زید کی ملکیت ہے، لہٰذا پہلے تو باہم معاملہ اس طرح دُرست کرلیں، اس کے بعد اگر زید بکر کو پوری بھینس یا اس کا نصف حصہ فروخت کرنا چاہے تو دونوں باہمی رضامندی سے ایسا کرسکتے ہیں، اور پرورش کا مذکورہ معاملہ تو ناجائز ہے۔ لہٰذا جواز کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ زید بکر کو بھینس کا نصف حصہ فروخت کردے، اس کے بعد اس کی قیمت معاف کردے، اور بکر سے کہے کہ تم اس کی پرورش کرو اور دُودھ آدھا آدھا ہوگا، اور بکر اس پر راضی ہوجائے، تاہم اس صورت میں بکر کسی وقت چارے کا نصف خرچ وصول کرنا چاہے تو کرسکے گا۔ **لما في العالمگيرية دفع بقرة الىٰ رجل علىٰ أن يعلفها وما يكون من اللبن والسمن بينهما أنصافًا فالإجارة فاسدة، وعلىٰ صاحب البقرة للرجل أجر قيامه وقيمة علفه إن علفها من علف هو ملكه لا ما سرحها في المرعىٰ، ويردّ كل اللبن إن كان قائمًا و إن أتلف فالمثل إلىٰ صاحبها .... والحيلة في جوازه أن يبيع نصف البقرة منه بثمن ويبرئه عنه ثم يأمر باتخاذ اللبن والمصل فيكون بينهما. (عالمگيرية ج:۴ ص:۴۴۵، ۴۴۶ الفصل الثالث في قفيز الطحان وما معناه من الاجارة)۔**[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۴/۲۸ الف)

(۱ و ۲) وفي الهداية ج:۳ ص:۳۰۳ (طبع مكتبه رحمانيه) والواجب في الاجارة الفاسدة أجر المثل لا يجاوز به المسمّٰى .... الخ.

(۳) طبع مكتبة رشيدية. وفي خلاصة الفتاوىٰ كتاب الاجارات وما يتصل بهذا ج:۳ ص:۱۱۴ (طبع مكتبه رشيديه). وفي فتاوىٰ النسفي رجل دفع بقرة الىٰ رجل بالعلف مناصفة وهي الّتي بالفارسية كاونيم سود بأن دفع علىٰ أن ما يحصل من اللّبن والسمن بينهما نصفان فهٰذا فاسد والحادث كلّه لصاحب البقرة والاجارة فاسدة.

وكذا في الفتاوىٰ البزازية على الهندية كتاب الاجارة النّوع الثّالث في الدّواب ج:۵ ص:۳۷ (طبع رشيديه).

نیز دیکھئے: امداد الفتاوىٰ ج:۳ ص:۳۴۲ و ۳۴۳ (طبع دار العلوم کراچی)۔

وكذا في الهداية ج:۳ ص:۳۰۵ كتاب الاجارات والدّر المختار ج:۶ ص:۵۶ باب الاجارة الفاسدة والبحر الرّائق ج:۸ ص:۲۳ كتاب الاجارة (طبع سعيد).

جانور کو نصف پر دینے کا حکم

سوال:- ایک آدمی بغرضِ پرورِش اپنی گائے دُوسرے آدمی کو بالنصف دیتا ہے، یعنی جو اولاد پیدا ہوگی، نصف نصف ہوگی، اس صورت میں اگر گائے مالک کے پاس آجائے یا لینے والے کے حصے میں آجائے اور اس سے کوئی تیسرا شخص خریدے یا دونوں سے متفقہ طور پر خریدے تو کیا اس گائے کی قربانی دُرست ہوگی؟

جواب:- مذکورہ صورت میں معاملہ ناجائز ہے،[1] لہٰذا پہلے یہ لکھئے کہ مالک یا پالنے والے کے پاس گائے کس طرح آئی آیا پورا جانور بیع سے آیا یا اس کے آدھے حصے کو فروخت کیا۔

واللہ اعلم
۱۳۸۷/۲/۱۴ھ

(۱) تفصیل کے لئے پچھلا فتویٰ ملاحظہ ہو۔

﴿فصل فی نفس الأجرة﴾

(”تنخواہ، اُجرت“ اور مختلف الاؤنسز سے متعلق مسائل)

شرعاً ملازم کی تنخواہ مقرّر کرنے کا معیار کیا ہے؟ ملازم کی ضرورت یا اس کی قابلیت؟

سوال:- بخدمت جناب مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جنابِ عالی! میں نے ابھی حال میں ایک صاحب کو دُوسرے صاحب سے مسئلہ دریافت کرتے ہوئے سنا، جواب سے تسکین نہیں ہوئی، چنانچہ اس لئے سوال اور اس کا جواب ذیل میں درج کر رہا ہوں، اس مسئلے میں آپ ہماری رہنمائی فرمائیں کہ صحیح جواب کیا ہے؟

”سوال- مسئلہ یہ ہے کہ ایک ملازم ایک انجینئر ہے اور اس کے دو بچے اور ایک بیوی ہے، اس کی تنخواہ پانچ ہزار روپے ماہوار ہے، دُوسرا ملازم ایک مزدور ہے اور اس کے چھ بچے اور ایک بیوی ہے، اس کی تنخواہ صرف ایک ہزار روپے ہے، اسلام کے قوانین اور نظام کے مطابق تعین ملازم کی قابلیت پر ہوتا ہے یا ملازم کی ضروریات کی بنیاد پر۔

جواب- اسلامی نظام میں تنخواہ کا تعین قابلیت پر نہیں، مزدور کی ضروریات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔“

برائے مہربانی جواب ارسال کرتے وقت مندرجہ ذیل اُمور پر بھی روشنی ضرور ڈالیں جو مذکورہ سوال سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں:

۱- ایک ملازم کی ضروریات کا تعین کیسے کیا جائے گا؟

۲- ایک ملازم اکیلا ہوگا، دُوسرے کے کئی بچے ہوں گے، اور اگر دونوں ایک ہی قابلیت رکھتے ہوں گے تو تنخواہ کا فیصلہ کیسے ہوگا؟

۳- حکومت کے ملازم اور نجی فرم کے ملازم کی تنخواہیں ایک طریقے سے مقرّر ہوں گی یا طریقہ جدا جدا ہوگا؟ اور گھریلو ملازمین کی تنخواہ مقرّر کرتے وقت طریقۂ کار میں کوئی فرق ہوگا یا نہیں؟

۴- امریکا اور دُوسرے ترقی یافتہ ممالک میں مزدوروں کی کم از کم تنخواہ مقرّر ہے، جو حکومت

وہاں کی مہنگائی کو سامنے رکھ کر مقرّر کرتی ہے، اور کچھ عرصہ بعد اس کم از کم تنخواہ کو مہنگائی کے مطابق بڑھاتی رہتی ہے، البتہ کم از کم تنخواہ کے بعد وہاں تنخواہیں قابلیت اور پیسے کی مانگ کی بنیاد پر مقرّر ہوتی ہیں، یہ طریقۂ کار کس حد تک اسلامی طریقے سے قریب ہے؟

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا، دراصل ملازمت شرعی نقطۂ نظر سے ''عقدِ اِجارہ'' ہے، جس میں جانبین کی باہمی رضامندی سے جو اُجرت بھی طے کرلی جائے وہ جائز ہے، بشرطیکہ اس میں ایک فریق نے دُوسرے فریق کی منظوری زبردستی حاصل نہ کی ہو، اس طرح جو اُجرت بھی طے ہوجائے، شرعاً وہ دُرست ہے، خواہ وہ اہلیت کی بنیاد پر ہوئی ہو، یا کام کی بنیاد پر، یا ضرورت کی بنیاد پر۔

البتہ اسلامی حکومت اگر یہ دیکھے کہ محنت کرنے والوں کی اُجرتیں مناسب مقرّر نہیں کی جارہی ہیں، تو وہ اُجرتوں کا کوئی معیار بھی مقرّر کرسکتی ہے،(۱) جس کی پابندی فریقین پر لازم ہوگی۔(۲) اس معیار کے تعین کے وقت حکومت کو اہلیت، کام اور ضرورت تینوں باتوں کو مدِنظر رکھنا ہوگا، کسی ایک بنیاد پر مقرّر کرنا دُرست نہیں ہوگا۔

اس تشریح سے واضح ہوگیا ہوگا کہ یہ کہنا دُرست نہیں ہے کہ: ''اسلامی نظام میں تنخواہ کا تعین قابلیت کی بنیاد پر نہیں، مزدور کی ضروریات کی بنیاد پر ہوتا ہے'' اس سے آپ کے تمام سوالات کا جواب ہوگیا ہوگا۔

واللہ اعلم

۱۴۰۸/۴/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۱/۷/ج)

مزدور کی اُجرت کی تعیین کا شرعی معیار کیا ہے؟

سوال ۱:- معاوضے کی ادائیگی کا معیار کیا ہے؟ پیداوار، محنت یا کارکن کی ضرورت؟

۲:- پیداوار ہے جس کی کھپت کے منافع سے فیکٹری کے تمام شعبہ جات کی اُجرتوں کی ادائیگی ہوتی ہے، اور دیگر اِخراجات پورے کئے جاتے ہیں، اس طرح بند سیزن میں رکھے گئے کارکنوں

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۶ ص:۳۹۹ (طبع سعید) (الحظر والاباحة) ولا یسعّر حاکم لقوله علیه الصلوٰة السلام: لا تسعّروا فانّ الله هو المسعّر القابض الباسط الرّازق. الّا اذا تعدّی الأرباب عن القیمة تعدیا فاحشًا فیسعر بمشورة أهل الرأی.

ونظیره کما فی البحر الرّائق کتاب القسمة ج:۸ ص:۱۴۸ (طبع سعید) ..... والّا نصب قاسمًا یُقسم بأجرة بعدد الرّؤس یعنی ان لم ینصب قاسمًا رزقه فی بیت المال نصیبه وجعل رزقه علی المتقاسمین لأنّ النفع لهم علی الخصوص ..... ویقدر له القاضی أجرة مثله کی لا یطمع فی أموالهم ویتحکّم بالزیادة.

وفی الأشباه والنظائر ص:۱۵۷ (طبع ادارة القرآن کراچی) تصرّف الامام علی الرّعیة منوط بالمصلحة.

(۲) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۱۷۲ تجب طاعة الامام فیما لیس بمعصیة.

وراجع للدّلائل والتّفصیل الی الدّر المختار مطلب فی وجوب طاعة الامام ج:۴ ص:۲۶۴ (طبع سعید). نیز دیکھئے ص:۹۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

کو تنخواہیں اور دیگر مراعات بھی اس منافع سے دی جاتی ہیں، جبکہ بیکار ہونے والے افراد کی تنخواہ اور دیگر مراعات یکسر بند کردی جاتی ہیں، اور جن کارکنوں کو بارہ ماہ مستقل کام کرنے کے لئے رکھا جاتا ہے وہ بارہ ماہ تو کام نہیں کرتے چونکہ پیداوار ہی چند ماہ ہوتی ہے، مگر اس پیداوار کی کھپت کے منافع سے جس میں سیزنل کارکن بھرپور حصہ لیتے ہیں مذکورہ مستقل کارکن کو تنخواہیں اور دیگر مراعات تمام سال فراہم کی جاتی ہیں، جبکہ سیزنل کارکنوں کو صرف دورانِ سیزن، کیا یہ جائز ہے؟

۳:- نئی لیبر پالیسی میں مزدوروں کی اُجرت کا تعین "وَیَسْـئَلُوْنَکَ مَـاذَا یُنْـفِقُوْنَ، قُلِ الْعَفْوَ" (سورۂ بقرہ آیت:۲۱۸) کی بنیاد پر کیا جانا جائز ہے؟

جواب ا:- شرعاً اُجرت کے تعین کا معیار باہمی معاہدہ ہے، یعنی باہمی رضامندی سے جو اُجرت مقرّر کردی جائے وہ شرعاً جائز ہے،[1] البتہ ہر فریق پر دیانۃً یہ واجب ہے کہ وہ دُوسرے فریق کی مجبوری سے فائدہ اُٹھاکر کوئی ایسی اُجرت مقرّر نہ کرے جو اتنی کارکردگی کے لحاظ سے عرفاً ناکافی یا بہت زائد ہو،[2] چنانچہ یہ آجر کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اُجرت کے تعین کے وقت اس بات کا پورا لحاظ رکھے کہ اَجیر کو اس کی کارکردگی کے مطابق مناسب اور کافی اُجرت ملے۔[3] دُوسرے الفاظ میں قانونی طور پر اُجرت کے تعین کا معیار اگرچہ باہمی معاہدہ ہے، لیکن اخلاقی طور پر اور دیانۃً اس کا معیار کارکردگی کی نوعیت ہے، اور اگر کسی جگہ آجر اپنی اس اخلاقی ذمہ داری کو پورا کرنے کی بجائے مزدوروں کی مجبوری سے فائدہ اُٹھاکر کم اُجرت مقرّر کرتے ہوں تو ایسی صورت میں حکومت کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ کم سے کم اُجرت متعین کردے، اس صورت میں آجروں پر اس کی پابندی قانوناً بھی لازمی ہوگی۔[4]

۲:- اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہر کام کرنے والا اتنی مدّت کی اُجرت کا مستحق ہوتا ہے جتنی مدّت اس نے کام کیا، لیکن اگر کوئی آجر کسی اَجیر کو اس بات کا پابند کردے کہ وہ سارے سال اس کا ملازم رہے گا خواہ اس کو کام کرنا پڑے یا نہ پڑے، چونکہ اس کو سارے سال کے لئے پابند کرلیا گیا ہے اس لئے آجر پر اس کے سارے سال کی تنخواہ واجب ہوگی، خواہ وہ اس سے کام لے یا نہ لے۔[5] اس کے برخلاف اگر کسی کو سارے سال کے لئے پابند نہیں کیا گیا تو اس کی صرف اتنی مدّت کی تنخواہ آجر پر

(۱ تا ۳) وفی سنن الترمذی، باب ما جاء فی التسعیر رقم الحدیث:۱۲۳۵ "عن أنس رضی الله عنه قال: غلا السعر علیٰ عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فقالوا: یا رسول الله! سعِّر لنا. فقال: انّ الله هو المسعّر القابض الباسط الرّزاق وانّی لأرجوا أن ألقیٰ ربّی ولیس أحدٌ منکم یطلبنی بمظلمة فی دم ولا مالٍ" قال أبو عیسیٰ: هذا حدیث حسنٌ صحیحٌ.
وفی حاشیة السندی علیٰ ابن ماجة ج:۴ ص:۲۲۲ .... وفیه اشارة الیٰ أن التسعیر تصرّف فی أموال الناس بغیر اذن أهلها فیکون ظلمًا فلیس الامام أن یسعّر لٰکن یأمرهم بالانصاف والشفقة علی الخلق والنّصیحة.

(۴) دیکھئے پچھلے صفحے کے حواشی اور ص:۹۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

(۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۸۸ کا حاشیہ۔

واجب ہوگی جتنی مدّت کا اسے پابند کیا گیا ہے، باقی مدّت میں چونکہ وہ دُوسرا کام کرنے کے لئے آزاد ہے اس لئے اس کی اُجرت بھی آجر پر واجب نہیں۔

ہاں! اگر کام سے آزاد رہنے کی مدّت ایسی ہو کہ اس میں مزدور کو کسی دُوسری جگہ کام ملنے کی توقع نہ ہو تو وہ آجر سے یہ معاہدہ کرسکتا ہے کہ اس کی مدّتِ کارکردگی کی اُجرت اتنی زیادہ مقرّر کی جائے جو اس کی بے کاری کے اَیام کی بھی کفالت کرسکے۔

۳:- "یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ، قُلِ الْعَفْوَ"[1] کا اُجرت کے تعین کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان اپنی زائد از ضرورت رقم کو ضرورت مند اَفراد میں خرچ کیا کریں،[2] یعنی ان کو کسی اُجرت کے طور پر نہیں، بلکہ ہدیہ یا صدقہ کے طور پر دیا کریں، جہاں تک اُجرت کا تعلق ہے اس کے تعین کا مسئلہ سوال نمبر۱ کے جواب میں گزر چکا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۵۳/۳۲ ج)

مدرّس کے لئے اَیامِ غیرحاضری کی تنخواہ کا حکم

سوال:- واعظ مدرّس کو صاحبِ مجلس کی طرف سے عطیہ یا وعظ کی اُجرت لے لینے کے بعد مدرسے سے غیرحاضری کے اَیام کی تنخواہ لینا کیسا ہوگا؟

جواب:- اگر مدرسے سے باضابطہ رُخصت لی ہے، اور وعظ پر اُجرت نہ لینے کا کوئی معاہدہ منتظمینِ مدرسہ سے نہیں ہوا تو جائز ہے۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۱/۱۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۱ھ

اِمامت میں ناغہ کرنے کی بناء پر تنخواہ کاٹنے کا حکم

سوال:- باتنخواہ اِمام اگر نمازوں میں ناغہ کرے اس کو پوری تنخواہ لینی جائز ہے یا نہیں؟ اگر

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت: ۲۱۹۔

(۲) دیکھئے تفسیر "معارف القرآن" ج:۱ ص:۵۳۸۔

(۳) فی الشامیۃ ج:۴ ص:۴۱۹ (طبع سعید) اما لو شرط شرطًا تبع کحضور الدرس أیامًا معلومۃ فی کل جمعۃ فلا یستحق المعلوم الا من باشر خصوصًا اذا قال من غاب عن الدّرس قطع معلومہ فیجب اتباعہ. وتمامہ فی البحر.

ناجائز ہے تو لینے پر اِصرار کی صورت میں اَکلِ حرام کا مرتکب ہوگا یا نہیں؟ ایسی صورت میں اس کی اقتداء دُرست ہوگی یا نہیں؟

جواب:- تنخواہ دار پیش اِمام کے لئے معاہدے کے خلاف ناغہ کرنا جائز نہیں، اور اگر معاہدے میں یہ بات طے ہوچکی ہے کہ جائز چھٹیوں کے علاوہ ناغہ کرنے پر تنخواہ کاٹی جائے گی تو انہیں پوری تنخواہ نہ لینی چاہئے،[1] اگر انہوں نے غفلت یا بے توجہی سے پوری تنخواہ لے لی ہے تو انہیں متنبہ کردینا چاہئے، اور اگر اس پر بھی وہ تنخواہ کا واجب الرّد حصہ واپس نہ کریں اور اس کو عادت بنالیں تو جب تک توبہ نہ کریں ان کے پیچھے نماز مکروہ ہوگی، لیکن فاسد نہیں۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵/ ۱۱ الف)

سودی معاملات کرنے کی وجہ سے حکومت کے ہر ملازم کی تنخواہ کو ناجائز قرار دینے کا حکم

سوال:- ہمارے ایک دوست ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ آج کل کی تنخواہ جو بھی ملازم لیتا ہے

---

(۱) کیونکہ اِمام اَجیرِ خاص ہے جو تسلیم نفس اور وقت دینے پر ہی اُجرت کا مستحق ہوتا ہے، اگر ناغہ کرے تو اُجرت کا مستحق نہیں۔

وفی الدّر المختار ج:۶ ص:۶۹ والثانی وهو الأجیر الخاص ویسمّی أجیر وحد وهو من یعمل لواحد عملًا مؤقتًا بالتّخصیص ویستحق الأجر بتسلیم نفسه فی المدّة وان لم یعمل کمن استوجر شهرًا للخدمة أو شهرًا لرعی الغنم المسمّٰی باجر مسمّٰی.

وفی الهندیة ج:۴ ص:۵۰۰ والأجیر الخاص من یستحق الأجر بتسلیم نفسه وبمضی المدّة ولا یشترط فی العمل فی حقه لاستحقاق الأجر.

اور ناغہ کرنے پر تنخواہ کے کٹنے کی صراحت مبسوط کے اس جزئیہ میں ہے:-

ولو کان یبطل من الشهر یومًا أو یومین لا یرعاها حوسب بذلک من اجره سواء کان من مرض او بطالة لأنّه یستحق الأجر بتسلیم منافعه وذلک ینعدم فی مدّة البطالة سواء کان بعذر او بغیر عذرٍ.

المبسوط للسرخسی ج:۱۵ ص:۱۶۲.

وفی الشامیة ج:۶ ص:۴۵ (طبع سعید) ووجه الفساد أنّ مقتضی العقد ان لا تلزم الأجرة مدّة العطلة قلت أو کثرت.

نیز دیکھئے: امداد المفتین ص:۸۶۲۔ واضح رہے تنخواہ کے کٹنے کا مذکورہ حکم کبھی کبھار کی جائز چھٹیوں کے علاوہ ناغے کرنے سے متعلق ہے، جیسا کہ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ''جائز چھٹیوں کے علاوہ'' کی صراحت فرمادی ہے، کیونکہ ضرورت وراحت کی غرض سے عرف و رواج کے مطابق کبھی کبھار چھٹی کی گنجائش ہے، چنانچہ شامی کتاب الوقف ج:۴ ص:۴۱۹ (طبع سعید) میں ہے:-

امام یترک الامامة لزیارة أقربائه فی الرساتیق اسبوعًا أو نحوه أو لمصیبة أو لاستراحة لا بأس به ومثله عفو فی العادة والشرع.

تفصیل کے لئے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند عزیز الفتاویٰ ص:۶۶۵ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

حرام ہے، کیونکہ حکومت کا تمام کاروبار سودی ہے، اور سودی رقم سے ہمیں تنخواہ ملتی ہے، اس کے متعلق کیا رائے ہے؟

جواب:- آپ کے دوست کا خیال دُرست نہیں، حکومت کی ساری آمدنی سودی نہیں ہے بلکہ بہت سے ذرائع آمدنی جائز ہیں، اور ایسی صورت میں اس سے تنخواہ وصول کرنا شرعاً جائز اور دُرست ہے۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۵۱/۲۷ و)

غلط بیانی کر کے سواری کا الاؤنس وصول کرنے کا حکم

سوال:- ہم اسکول کے ملازم ہیں، ہم کو سواری الاؤنس ملتا ہے، اس طرح کہ دفتر یا اسکول سے گھر کا فاصلہ ساڑھے تین میل سے زائد ہو تو مبلغ پچیس روپیہ ماہوار، اور ساڑھے سات میل ہو تو تیس روپیہ ماہوار بطور کرایہ حکومت دیتی ہے، اب اگر کوئی شخص اسکول کے ایک فرلانگ پر رہتا ہے، غلط بیانی کر کے کہتا ہے کہ میں آٹھ میل کے فاصلے پر رہتا ہوں، اور مطلوبہ رقم تیس روپے وصول کر لیتا ہے تو یہ جائز ہے؟

جواب:- غلط بیانی کر کے حکومت کے قانون کے خلاف یہ الاؤنس وصول کرنا بھی ناجائز ہے اور جو افسر جانتے بوجھتے اس کی اجازت دیتا ہے وہ بھی گناہگار ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸/ ۲۸ الف)

قربانی کی کھال اور فطرے سے اِمام کو تنخواہ دینے کا حکم

سوال:- کیا پیش اِمام کو فطرانہ یا قربانی کی کھال وغیرہ دینا دُرست ہے؟ جبکہ اِمام بالکل غریب آدمی ہے اور دس بارہ کھانے والے ہیں، تنخواہ بھی بہت کم ہے، یہ چیزیں اُجرت میں نہیں دی جاتیں بلکہ صرف لِلّٰہ دی جاتی ہے، کیا یہ دینا دُرست ہے؟

جواب:- اگر پیش اِمام صاحبِ نصاب نہیں ہے تو اسے فطرہ اور قربانی کی کھال وصول کرنا

(۱) کیونکہ غالب حلال ہونے کی صورت میں اس سے تنخواہ لینا جائز ہے۔ حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۹۵ کا حاشیہ نمبر۳۔

جائز ہے،[1] اور اگر وہ کسی بھی طرح صاحبِ نصاب ہو تو وصول کرنا جائز نہیں۔[2] واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۵۴/۱۸ الف)

اور یہ کہ اُجرت میں دیتے ہیں یا بطور خدمت؟ اس کا فیصلہ اِمام اور مقتدی خدا کو حاضر و ناظر جان کر کرلیں، اگر کوئی شخص قربانی کی کھال اور فطرے کی رقم دُوسرے کو دیدے اور اِمام یا اِمام کا ہمدرد ناراض ہو تو یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ خدمت ہے اُجرت نہیں، اگر اِمام کو نہ دیں تو اِمام شکایت کرتا پھرے یہ نشانی اُجرت کی ہے، اللہ سے ڈر کر غور کریں۔[3]

کتبہ العبد الحقیر

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

بغیر سواری کے آنے والے سرکاری ملازم کے لئے کرایۂ سواری لینے کا حکم

سوال:- فیڈرل گورنمنٹ اپنے ملازمین کو سواری کا کرایہ دیتی ہے، اس کی حد بھی مقرّر ہے کہ ساڑھے تین میل تک پچیس روپے اور ساڑھے سات میل سے اُوپر کے لئے تیس روپے، ایک آدمی اسی شہر میں رہتا ہے جہاں وہ ڈیوٹی دیتا ہے یعنی اسکول میں ملازم ہے، اور اسکول سے چار سو گز کے فاصلے پر قیام پذیر ہے، بس یا کسی اور ذریعے سے اسکول نہیں آتا لیکن بل میں ہر ماہ تیس روپے درج کردیتا ہے اور یہ عذر کرتا ہے کہ میرا گھر بھی دو سو، چار سو میل دُور ہے، ماہ میں ایک مرتبہ جانا پڑتا ہے۔ اس طرح سے یہ کرایہ اور الاؤنس لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- یہ کرایۂ سواری اگر تنخواہ کا جزء ہوتا تب تو ہر حال میں اس کا لینا جائز تھا، لیکن حکومت نے تفصیل رکھی ہے کہ اتنے میل پر جس کی رہائش ہو اُسے اتنا کرایہ دیا جائے گا، یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یہ رقم تنخواہ کا جزء نہیں بلکہ کرایۂ آمد و رفت ہے، لہٰذا اس نام سے اتنی ہی رقم وصول کرنا شرعاً جائز ہے جتنی رقم واقعۃً کرایہ میں لگتی ہو، چنانچہ آپ کے لئے اپنی رہائش کا فاصلہ زیادہ لکھوا کر

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع سعید) مصرف الزّکوٰۃ هو فقیر (وهو من له أدنی شیء) أی دون نصاب أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة.

وفی الهندیة کتاب الزکوٰۃ ج:۱ ص:۱۸۹ ولا یجوز دفع الزکوٰۃ الیٰ من یملک نصابًا .... الخ.

(۲) ولا یجوز دفع الزّکوٰۃ الیٰ من یملک نصابًا ..... الخ.

(۳) وفی الدّر المختار ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید) ویشترط أن یکون الصّرف تملیکًا لا اباحة ..... الخ.

وفی الهندیة کتاب الزکوٰۃ باب المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) ولو نوی الزّکوٰۃ بما یدفع المعلّم الی الخلیفة ولم یستأجره ان کان الخلیفة بحال لو لم یدفعه یعلم الصّبیان أیضًا أجزأه والّا فلا .... الخ.

کرایۂ سواری وصول کرنا جائز نہیں ہے۔ اور یہ تأویل بھی دُرست نہیں کہ اصلی گھر دو سو یا چار سو میل دُور ہے، کیونکہ حکومت نے اصلی گھر تک پہنچانے اور وہاں سے واپس لانے کے کرائے کی ذمہ داری نہیں لی ہے، اور جب اس طرح حاصل کی ہوئی رقم ناجائز ہوئی تو اسے حکومت ہی کو واپس کرنا ضروری ہے، اس سے صدقہ کرنا بھی دُرست نہیں، اِلَّا یہ کہ حکومت کو واپس کرنے کی کوئی صورت نہ ہو، تو اس صورت میں بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کردی جائے۔(۱)　　واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۵۱/۲۷ و)

اُوور ٹائم لگائے بغیر اس کی تنخواہ وصول کرنے کا حکم

سوال:- میں بحیثیت اسٹونو ٹائپسٹ کے ملازمت کرتا ہوں، میرے محکمے کا سب سے بڑا سربراہ چیف انجینئر ہوتا ہے، میرے محکمے میں ہر ملازم کو تقریباً تیس گھنٹے کا اُوور ٹائم ملتا ہے، روز کے تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے حساب سے، آفس کے اوقات کے بعد عموماً کبھی کبھی گھنٹہ دو گھنٹہ اُوور ٹائم کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ہم لوگ دو بجے کے بعد اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں کیونکہ کام ہی اتنا ہوتا ہے۔ اب دریافت یہ ہے کہ کیا بغیر اُوور ٹائم کئے ہوئے اُوور ٹائم کی رقم لی جاسکتی ہے یا نہیں؟ چیف انجینئر صاحب کو بھی اس کا پتہ ہے کہ کبھی کبھی اُوور ٹائم کے لئے رُکتا ہے، اکثر نہیں رُکتا، اس کے باوجود وہ تیس گھنٹے کا اُوور ٹائم لگادیتے ہیں، جبکہ آفس کے کام کے بعد اُوور ٹائم کا کام نہیں ہوتا۔

جواب:- اُوور ٹائم کے نام سے کوئی رقم وصول کرنا اُسی وقت جائز ہوگا جبکہ واقعۃً ملازم نے وقتِ مقرّرہ سے زائد کام کیا ہو، جس روز وقتِ مقرّرہ سے زائد کام نہیں کیا اُس روز کا اُوور ٹائم لینا دُرست نہیں۔ اگر چیف انجینئر صاحب واقعۃً ملازمین کی خیرخواہی کرنا چاہتے ہیں تو تنخواہ میں اضافہ کرادیں، لیکن اُوور ٹائم کے نام سے غلط بیانی کی شرعاً اجازت نہیں ہوسکتی۔　　واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۱۴/۲۷ ھ)

غلط بیانی کرکے تنخواہ میں اضافہ کرانے کا حکم

سوال:- غلط بیان دے کر اپنی تنخواہ بڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی دلیل یہ ہو کہ چونکہ حکومت تنخواہ نہیں بڑھاتی اُوپر سے گرانی بھی ہوتی چلی جارہی ہے، اور وہ آدمی اگر پرائیویٹ پڑھاتا تو اتنی ہی (یعنی زیادہ) تنخواہ مل جاتی۔ اب اس کو مدِنظر رکھ کر غلط بیان دے کر اپنی تنخواہ بڑھاسکتا ہے یا نہیں؟

---

(۱) وفی الشامیۃ ج:۵ ص:۹۹ والحاصل أنہ ان علم أرباب الأموال وجب ردّہ علیہم والّا فان علم عین الحرام لا یحلّ لہ ویتصدّق بہ بنیّۃ صاحبہ .... الخ.

جواب:- صورتِ مسئولہ میں چونکہ وہ شخص غلط بیان دیتا ہے، اس لئے یہ عمل جائز نہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۳۲/۱۸ الف)

زکوٰۃ وصدقات کی رُقوم سے مہتمم اور مدرّسین و ملازمین کی تنخواہیں ادا کرنے کا حکم

سوال:- زید ایک مسجد کا خطیب ہے، اس مسجد میں ایک چھوٹا سا دِینی مدرسہ بھی قائم ہے، جس کا مہتمم زید ہی ہے، یہ مدرسہ اقامتی ہے، طلباء، اساتذہ، باورچی وغیرہ کے لئے تین ٹائم کھانے کا انتظام بھی مدرسے کے ذمے ہے، زید کے اعتماد، تعلق اور کوشش سے حاصل شدہ چندہ وغیرہ کی آمدنی سے مدرسے کا کام چل رہا ہے، مالی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے کوئی اکاؤنٹینٹ نہیں ہے، زید آمد وخرچ کا حساب کرتا ہے، کیا زید از رُوئے شرع مدرسہ ھٰذا کے فنڈ سے مشاہرہ لینے کا حق رکھتا ہے؟ جبکہ مدرسے کی کوئی کمیٹی نہیں خود اپنی تنخواہ مقرّر کرسکتا ہے؟

جواب:- پہلی ضروری بات تو یہ ہے کہ مدرّسین، مہتمم یا دُوسرے ملازمین کی تنخواہیں زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کی رُقوم سے شرعاً نہیں دی جاسکتیں،[1] لہٰذا اگر مذکورہ رقمیں زکوٰۃ کی ہیں تو اُن سے نہ مدرّسین کی تنخواہ دی جاسکتی ہے، نہ آپ تنخواہ لے سکتے ہیں۔[2] ہاں جو رُقوم زکوٰۃ کے علاوہ عام چندے کی ہوں اُن سے مدرّسین و ملازمین کو تنخواہ دی جاسکتی ہے اور مہتمم بھی اُن سے تنخواہ وصول کرسکتا ہے، البتہ تنخواہ کا تعین کرنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ چندہ دہندگان کی رائے معلوم کی جائے اور تنخواہ مقرّر کرنے میں اس بات کی رعایت رکھی جائے کہ وہ بالمعروف ہو، یعنی اُس جیسے مدرسے میں اُس جیسے کام کرنے والے مہتمم کی عموماً کیا تنخواہ مقرّر ہوتی ہے؟ اُس سے زائد مقرّر نہ کی جائے، اور موضعِ تہمت سے بچنے، نیز احتیاط کے پیشِ نظر چندہ دہندگان یا دُوسرے مدرّسین و ملازمین سے مشورہ کرلینا چاہئے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۳۵/۲۷ ج)

(۱و۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۹۰ کے حواشی۔

﴿فصل فی الإجارة علی المعاصی﴾

(مختلف ناجائز اور معصیت کی ملازمتوں کے اَحکام)

سودی کاروبار کرنے والے مالیاتی ادارے کی ملازمت اور آمدنی کا حکم

سوال:- میں ایک مالیاتی ادارے میں کام کر رہا ہوں، جہاں سودی کاروبار ہے، یعنی بعض کمپنیوں کو سود پر اور بعض کو نفع و نقصان پر قرضے دیتی ہے، اور نفع بھی اس طرح ہے کہ فیصد فکسڈ ہے، یعنی پندرہ فیصد سال میں، اور اگر نقصان ہوجائے تو بھی پانچ فیصد، بلکہ نقصان کی صورت میں بھی اس کو منافع ہوتا ہے، کیونکہ پندرہ فیصد جو منافع کا حصہ ہے اس کے برابر کمپنی کے سرٹیفکیٹس یعنی حصص لے لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ سودی کاغذات بھی لکھنے پڑتے ہیں کہ آپ کے ذمے اتنا سود ہے، اسے ادا کرو۔ اور سود کی جانچ پڑتال کرنی پڑتی ہے، بعض اوقات جسے قرضے دیتے ہیں اس کے لئے کمپنی کا معائنہ بھی کیا جاتا ہے۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ شرع کی رُو سے جواب دیں کہ اس میں نوکری جائز ہے؟ یا بالکل ناجائز؟ یا اور کوئی صورتِ حال ہے؟ اور اس میں میرا شمار سودی کاتبین میں ہوگا یا نہیں؟ اور یہ میرے اُوپر کتنا گناہ ہے؟ اور یہ جو سود کرتے ہیں یہ جو اسلام نے بیان کیا ہے وہ ہے یا نہیں؟

جواب:- ادارے کی جو تفصیلات آپ نے لکھی ہیں، اگر وہ دُرست ہیں اور ادارے کی اکثر آمدنی سود یا دُوسرے ناجائز ذرائع پر مشتمل ہے، یا اس ادارے میں آپ کو سود کے معاملات کا حساب و کتاب وغیرہ کرنا پڑتا ہے، تو اس میں ملازمت شرعاً جائز نہیں۔(۱) ایسی صورت میں آپ کو چاہئے کہ

(۱) وفی صحیح البخاری کتابُ الطّلاق رقم الحدیث: ۵۵۰۵ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکل الرّبٰوا وموکلہ. وکذا فی الصحیح لمسلمؒ رقم الحدیث: ۲۹۹۴ و ۲۹۹۵.

ادارے کی اکثر آمدنی سود یا دُوسرے ناجائز اُمور پر مشتمل ہو تو اُس حرام آمدنی سے اُجرت حاصل کرنا جائز نہیں، جیسا کہ درج ذیل فقہی عبارات سے واضح ہے:-

فی الدّر المختار ج:۶ ص:۳۸۵ (طبع سعید) وفی الأشباہ الحرمۃ تنتقل. وفی الشامیۃ تحتہ، قال الشیخ عبدالوھّاب الشعرانی فی کتاب المنن وما نقل عن بعض الحنفیۃ من أنّ الحرام لا یتعدی الیٰ ذمتین سألت عنہ الشّھاب ابن الشلبی فقال: ھو محمول علیٰ ما اذا لم یعلم بذلک امّا من رای المکاس یأخذ من احد شیئًا من المکس ثم یعطیہ آخر ثم یأخذہ من ذلک الآخر فھو حرام.

(باقی اگلے صفحے پر)

دُوسرے حلال روزگار کو تلاش کریں، اور اس کے ملنے پر یہاں سے علیحدہ ہوجائیں۔ جب تک دُوسرا روزگار مہیا نہ ہو اس وقت تک موجودہ ملازمت کو ناجائز سمجھتے ہوئے اس پر اِستغفار کرتے رہیں، اور جلد از جلد حلال روزگار حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں۔ واللہ اعلم

بینک کی ملازمت کا تفصیلی حکم

سوال:- بینک کی ملازمت کے بارے میں آپ سے پوچھنا تھا کہ بعض علماء سے سنا ہے کہ فتویٰ یہ ہے کہ بینک کی بعض ملازمتیں جائز ہیں، کیا یہ دُرست ہے؟ جبکہ میرے خیال میں بینک کی ہر ملازمت ناجائز ہے کیونکہ بینک کی جو بھی ملازمت ہو اُس میں چونکہ ناجائز کام میں اعانت اور تعاون کرنا پڑتا ہے لہٰذا وہ ناجائز ہونی چاہئے۔ اور تنخواہ بھی ظاہر ہے کہ بینک کی حرام آمدنی سے ہی دی جائے گی لہٰذا اس وجہ سے وہ بھی ناجائز ہونی چاہئے۔ کیا یہ بات دُرست ہے یا نہیں؟ اگر بینک کی کوئی ملازمت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)..... وفی الهندية ج:۵ ص:۳۴۲ (طبع رشيديه كوئته) لو أنّ فقيرًا يأخذ جائزة السلطان مع علمه أنّ السلطان يأخذها غصبًا أيحلّ له قال: ان خلط ذلک بدراهم أخرىٰ فانّه لا بأس به وان دفع عين المغصوب من غير خلط لم يجز ..... وقالا: لا يملک تلک الدّراهم وهي علىٰ ملک صاحبها فلا يحلّ له الأخذ .. الخ.

وفيها أيضًا ج:۵ ص:۳۴۲ ولا يجوز قبول هدية أمراء الجور لأنّ الغالب في مالهم الحرمة الّا اذا علم انّ أكثر ماله حلال بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به لأنّ أموال النّاس لا تخلوا عن قليل حرام فالمعتبر الغالب وكذا أكل طعامهم ..... الخ.

وفيها أيضًا ج:۵ ص:۳۴۳ آكل الرّبٰوا وكاسب الحرام أهدىٰ اليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل ولا يأكل ما لم يخبره أنّ ذلک المال أصله حلال ورثه أو استقرضه وان كان غالب ماله حلالًا لا بأس بقبول هديته والأكل منها.

اور ادارے کی اکثر آمدنی تو جائز ہو مگر اُس ادارے میں ناجائز کام کی ملازمت ہو، مثلاً سود کا حساب و کتاب کرنا پڑے تو ایسی ملازمت معصیت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، جیسا کہ درج ذیل عبارات سے واضح ہے:-

وفي الهداية باب الاجارة الفاسدة ج:۳ ص:۳۰۶ (طبع مكتبه رحمانيه) ولا يجوز الاستيجار على الغناء والنّوح وكذا سائر الملاهي لأنّه استيجار على المعصية والمعصية لا تستحق بالعقد.

وكذا في خلاصة الفتاوى كتاب الاجارات جنس آخر في المتفرقات ج:۳ ص:۱۱۶.

وفي الهندية ج:۴ ص:۴۴۹ (طبع رشيديه) ولا تجوز الاجارة علىٰ شيءٍ من الغناء والنّوح والمزامير والطّبل وشيء من اللّهو وعلى هذا الحداء وقرأة الشعر وغيره ولا أجر في ذلک وهٰذا كله قول أبي حنيفة وأبي يوسف ومحمد رحمهم الله تعالىٰ كذا في غاية البيان لو استأجر لتعليم الغناء أو استأجر الذّمي رجلًا ليخصي عبدًا لا يجوز .... الخ.

وفي الدّر المختار كتاب الاجارة مطلب في الاستئجار على المعاصي ج:۶ ص:۵۵ (طبع سعيد) ولا تصحّ الاجارة لعسب التيس وهو نزوه على الأناث ولا لأجل المعاصي مثل الغناء والنوح والملاهي ولو أخذ بلا شرط يباح.

وفي الشامية تحته وفي المنتقىٰ امرأة نائحة أو صاحبة طبل أو زمر اكتسبت مالًا ردّته على أربابه ان علموا والّا تتصدّق به وان من غير شرط فهو لها. قال الامام الأستاذ: لا يطيب، والمعروف كالمشروط .... الخ.

وفي الهندية ج:۴ ص:۴۱۱ ومنها (أي من شرائط صحّة الاجارة) أن يكون مقدور الاستيفاء حقيقة أو شرعًا فلا يجوز استئجار الآبق ولا الاستئجار على المعاصي لأنّه استئجار علىٰ منفعة غير مقدور الاستيفاء شرعاً.

وفي بدائع الصنائع ج:۴ ص:۱۸۹ .... وكذا كل اجارة وقعت لمظلمة لأنّه استئجار لفعل المعصية فلا يكون المعقود عليه مقدورة الاستيفاء شرعًا. نیز دیکھئے ص:۴۱۰ کا حاشیہ نمبر۱۔ (محمد زبیر حق نواز)

جائز ہے تو کس قسم کی ملازمت اور کس وجہ سے جبکہ تنخواہ تو ظاہر ہے بینک سے ہی دی جائے گی؟

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا دُوسرا سوال جو انگریزی میں تھا، اس کا جواب بھی اُردو میں اس لئے دے رہا ہوں کہ آپ اُردو جانتے ہیں۔

دراصل بینک کی ملازمت ناجائز ہونے کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں، ایک وجہ یہ ہے کہ ملازمت میں سود وغیرہ کے ناجائز معاملات میں اِعانت ہے، دُوسرے یہ کہ تنخواہ حرام مال سے ملنے کا احتمال ہے، ان میں سے پہلی وجہ یعنی حرام کاموں میں مدد کا جہاں تک تعلق ہے، شریعت میں مدد کے مختلف درجے ہیں، ہر درجہ حرام نہیں،[1] بلکہ صرف وہ مدد ناجائز ہے جو براہِ راست حرام کام میں ہو، مثلاً سودی معاملہ کرنا، سود کا معاہدہ لکھنا، سود کی رقم وصول کرنا وغیرہ۔[2] لیکن اگر براہِ راست سودی معاملے میں انسان کو ملوّث نہ ہونا پڑے، بلکہ اس کے کام کی نوعیت ایسی ہو جیسے ڈرائیور، چپراسی، یا جائز ریسرچ وغیرہ تو اس میں چونکہ براہِ راست مدد نہیں ہے، اس لئے اس کی گنجائش ہے۔

جہاں تک حرام مال سے تنخواہ ملنے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں شریعت کا اُصول یہ ہے کہ اگر ایک مال حرام اور حلال سے مخلوط ہو اور حرام مال زیادہ ہو تو اس سے تنخواہ یا ہدیہ لینا جائز نہیں، لیکن اگر حرام مال کم ہو تو جائز ہے۔[3] بینک کی صورتِ حال یہ ہے کہ اس کا مجموعی مال کئی چیزوں سے مرکب ہوتا ہے، ۱-اصل سرمایہ، ۲-ڈپازیٹرز کے پیسے، ۳-سود اور حرام کاموں کی آمدنی، ۴-جائز خدمات کی آمدنی، اس سارے مجموعے میں صرف نمبر۳ حرام ہے، باقی کو حرام نہیں کہا جاسکتا، اور چونکہ ہر بینک میں نمبر۱ و نمبر۲ کی اکثریت ہوتی ہے، اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ مجموعے میں حرام غالب ہے، لہٰذا کسی جائز کام کی تنخواہ اس سے وصول کی جاسکتی ہے۔

یہ بنیاد ہے جس کی بناء پر علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ بینک کی ایسی ملازمت جس میں خود

---

(۱) مدد اور اعانت کے مختلف درجات اور ان کے تفصیلی حکم کے لئے ''جواہر الفقہ'' ج:۲ ص:۴۵۷ تا ۴۵۹ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی مشکوۃ المصابیح باب الرّبٰوا الفصل الأوّل ج:۱ ص:۲۴۴ (طبع قدیمی کتب خانہ) لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٰکل الربٰوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء، رواہ مسلم. نیز تفصیلی عبارات اور حوالہ جات کے لئے سابقہ ص:۳۹۳ و ص:۳۹۴ کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) وفی الھندیۃ ج:۵ ص:۳۴۲ ولا یجوز قبول ھدیۃ امراء الجور لأنّ الغالب فی مالھم الحرمۃ الّا اذا علم انّ أکثر مالہ حلال بأن کان صاحب تجارۃ أو زرع فلا بأس بہ لأنّ اموال النّاس لا تخلو عن قلیل حرام فالمعتبر الغالب وکذا أکل طعامھم. وفیھا ایضًا ج:۵ ص:۳۴۳ اٰکل الرّبٰوا وکاسب الحرام أھدیٰ الیہ أو أضافہ وغالب مالہ حرام لا یقبل ولا یأکل ما لم یخبرہ انّ ذٰلک المال أصلہ حلال ورثہ أو استقرضہ وان کان غالب مالہ حلالًا لا بأس بقبول ھدیتہ والأکل منھا .... الخ.

کوئی حرام کام کرنا نہ پڑتا ہو، جائز ہے، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ اس سے بھی اجتناب کیا جائے۔

والسلام
۱۴۲۳/۴/۳ھ [1]

بینک میں کلرک کی ملازمت

سوال:- محترم مفتی صاحب، السلام علیکم، سلام کے بعد آپ کی خیریت کا طالب ہوں۔ عرض یہ ہے کہ میں صوبہ سرحد پشاور شہر میں اکاؤنٹینٹ جنرل کے دفتر میں سینئر کلرک کے عہدے پر کام کر رہا ہوں، جس کی تنخواہ آج کل نئے الاؤنسوں اور مہنگائی الاؤنس کے ساتھ ۶۶۰ روپے بنتی ہے۔ لیکن میں نے حبیب بینک میں نوکری کے لئے درخواست دی تھی، جس کے ٹیسٹ اور انٹرویو وغیرہ میں میں پاس ہو چکا ہوں، اور اب کراچی سے میرے پیچھے ٹریننگ کے لئے بلانے کا خط آ رہا ہے، یعنی میں منتخب ہو چکا ہوں۔ یہ عہدہ پروفیشنل آفیسر کا عہدہ ہے، اور اس کی تنخواہ آج کل تقریباً ۱۰۰۰ روپے کے لگ بھگ ہے، جس کے سودی کاروبار وغیرہ سے آپ خوب واقف ہیں، لہٰذا آپ صاحبان اگر مجھے فتویٰ بھیجنے کی تکلیف گوارا کریں تو میں از حد مشکور ہوں گا، فتویٰ میں یہ وضاحت ہونی چاہئے کہ میں یہ موجودہ نوکری چھوڑ کر بینک کی نوکری کروں یا نہیں؟

جواب:- بینک کی ملازمت شرعاً حرام اور ناجائز ہے، [2] اور حرام آمدنی خواہ زیادہ ہو، مگر ایک مسلمان کے لئے بے کار ہے، کم تنخواہ پر قناعت کرنا اور حلال کمانے کی خاطر زیادہ آمدنی کو چھوڑ دینا اِن شاء اللہ دُنیوی و اُخروی برکات کا موجب ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۸۸/۳۰ ج)

بینک کی ملازمت کا حکم

سوال ۱:- بینک کی ملازمت کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟
۲:- اگر ملازمت اختیار کر چکا ہے تو قائم رکھے یا نہیں؟

جواب:- بینک کا بیشتر کاروبار چونکہ سود پر مبنی ہے، اس لئے اس کی ملازمت جائز نہیں۔ [3]

---

(۱) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم نے جوابی خط کی صورت میں تحریر فرمایا۔
(۲) بینک ملازمت کی دو قسموں کے تفصیلی حکم اور حوالہ کے لئے پچھلے ص:۳۹۵ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔
(۳) یہ بینک کی اُس ملازمت کا حکم ہے جس میں سودی معاملات کرنے پڑتے ہوں۔ تفصیل کے لئے سابقہ دونوں فتاویٰ اور اُن کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔ وفی تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۶۱۹ قوله: وکاتبه، لأنّ کتابة الرّبا أعانة علیه ومن هنا ظهر أن التوظف فی البنوک الربویة لا یجوز فان کان عمل الموظف فی البنک ما یعین علی الرّبا کالکتابة أو الحساب فذلک حرام لوجهین، الأوّل اعانة علی المعصیة، والثانی أخذ الأجرة من مال الحرام ..... الخ.

۲:- دُوسری جائز ملازمت حاصل کرنے کے لئے پوری کوشش کرے اور جب تک نہ ملے دُعا وتوبہ و اِستغفار کرتا رہے، اور ملتے ہی یہ ملازمت چھوڑ دے، پھر جب اللہ توفیق دے بینک سے کمائی ہوئی رقم رفتہ رفتہ صدقہ کردے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر)

حلال روزگار ملنے تک بینک کی ملازمت جاری رکھنے کے مشورے کی شرعی حیثیت

سوال:- محترم ومکرم جناب مفتی صاحب أطال اللہ بقائہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امابعد:

آپ کی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں، وہ ہے بینک کی ملازمت کا۔ ہمارا معاشرہ ایک سودی معاشرہ ہے، رِبا، قمار کی نت نئی شکلیں آئے دن سامنے آتی ہیں، اور انہیں ترقیاتی اسکیموں کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ بینک کی ملازمت اَشد حرام ہے، اس بناء پر بعض لوگ اس حرام سے چھٹکارے کی نیت سے اہلِ علم حضرات کا رُخ کرتے ہیں، اور بڑی معصومیت سے اپنی خستہ حالی کی سرگزشت سناتے ہیں، ''اگر میں یہ ملازمت چھوڑ دُوں گا، تو میری مسکین بیوی، چھوٹے چھوٹے ننھے منے پھول، کلیوں جیسے بچوں اور معمر ضعیف، معذور، مریض والدین اور جواں سال بے سہارا بے جاری بہنوں کے گزر کا سامان ہی کیا ہوگا، سوائے اس حرام تنخواہ کے۔'' اہلِ علم حضرات رحم دِل وغم خوار تو ہوتے ہی ہیں، اُن کی طرف سے غالباً متفقہ طور پر ایک ہی نوعیت کا جواب ملتا ہے، اور وہ آپ حضرات کو بخوبی معلوم ہے، جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ ''بینک کی ملازمت حرام ہے، اور اس کی تنخواہ حرام ہے، لیکن دُوسری ملازمت کی تلاش جاری رکھو اور جب تک کوئی متبادل صورت نہ بنے بینک کی یہ حرام ملازمت کرتے رہو، اور اس کی حرام تنخواہ سے اپنے بیوی بچوں والدین اور بہنوں کے حقوق ادا کرتے رہو۔'' ایمانی تنزل اور اس سرتوڑ مہنگائی، بڑھتے ہوئے اِخراجات اور ہویٰ پرستی کے دور میں ایک بینک منیجر کے لئے اس قدر ہمدردی کافی تھی، جواز کا یہ پروانہ اُسے خدا اور رسول سے ڈَٹ کر مقابلے پر آمادہ کرتا ہے، بندے سے بھی بارہا اس طرح اِستفتاء کیا گیا، دِل کسی بھی صورت میں جواز کا فتویٰ دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ آپ ہمارے بڑے ہیں، ایک خالی ہاتھ فقیر کی طرح آپ اہلِ علم حضرات کا دروازہ کھٹکھٹا کر بھیک مانگتا ہوں، ''فَسْئَلُوْآ اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ'' قرآن وحدیث واقوالِ

فقہائے کرامؒ یا قواعدِ فقہیہ میں سے جن دلائل کا سہارا لے کر جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے مفصل و مدلل بیان فرمادیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ جزاکم اللہ خیراً۔

جواب:- مکرّم بندہ زید مجدکم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ جو بات کہی جاتی ہے اس کا مطلب جواز کا فتویٰ دینا نہیں ہوتا، فتویٰ حرمت ہی کا ہے،(۱) آگے اسے مشورۃً یہ کہا جاتا ہے کہ اگر موجودہ ملازمت ترک کرنے سے ناقابلِ برداشت تنگی کا اندیشہ ہو تو اس ملازمت کو حرام سمجھتے ہوئے دُوسری ملازمت اس طرح تلاش کرو جیسے ایک بے روزگار آدمی تلاش کرتا ہے، خواہ تنخواہ کچھ کم ہی کیوں نہ ہو، جب وہ مل جائے تو ترک کردو۔ میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ سے سنا ہے کہ اس مشورے کا حاصل أھون البلیتین پرعمل کرنا ہے، کیونکہ بعض اوقات ترکِ ملازمت کے بعد فقر و فاقے میں مبتلا ہوکر لوگوں کے دِین و ایمان ہی سے برگشتہ ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور ایسا یاد پڑتا ہے کہ حضرت والد صاحبؒ نے یہ بات حضرت حکیم الأمت قدس سرہٗ سے بھی نقل فرمائی تھی، مگر احقر کو یہ بات جزم کے ساتھ یاد نہیں۔

والسلام

۱۴۲۱/۳/۳ھ (۲)

غیر مذبوح جانور کا گوشت فروخت کرنے والی کمپنی میں اکاؤنٹینٹ کی ملازمت کا حکم

سوال:- محترم مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک صاحب جو کینیڈا میں حال ہی میں معاش کے لئے گئے ہیں، اُن کی طرف سے سوال کیا ہے کہ کیا فرماتی ہے شریعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بارے میں کہ اُن کو ایک ایسی کمپنی میں

---

(۱) وفی الصّحیح للامام مسلمؒ رقم الحدیث: ۳۹۴۲ لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٰکل الرّبٰوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء. مشکوٰۃ المصابیح ج:۱ ص:۲۴۴ (طبع قدیمی کتب خانہ).

وفی تکملۃ فتح الملھم ج:۱ ص:۶۱۹ (قولہ وکاتبہ) لأنّ کتابۃ الرّبا اعانۃ علیہ ومن ھنا ظھر أن التوظّف فی البنوک الرّبویۃ لا یجوز فان کان عمل الموظّف فی البنک ما یعین علی الرّبا کالکتابۃ والحساب فذلک حرام لوجھین الأوّل اعانۃ علی المعصیۃ، والثانی اخذ الأجرۃ من المال الحرام، فان معظم دخل البنوک حرام مستجلب بالرّبا وأمّا اذا کان العمل لا علاقۃ لہ بالرّبا فانہ حرام للوجہ الثانی فحسب فاذا وجد بنک معظم دخلہ حلال جاز فیہ التوظّف للنّوع الثانی من الأعمال واللہ أعلم.

نیز تفصیلی عبارات کے لئے دیکھئے ص:۳۹۳ تا ص:۳۹۶ کے فتاویٰ اور اُن کے حواشی۔

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے سائل کے مذکورہ خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔

ملازمت کی پیشکش ہوئی ہے جو گوشت پیک کر کے سپلائی کرتی ہے، ظاہر ہے کہ کینیڈا میں یہ گوشت عام طور پر حلال نہیں ہوتا، اور اس کی تمام چیزیں جو وہ کمپنی بناتی ہے وہ حلال نہیں ہیں۔ اس کمپنی کا جس میں اِن صاحب کو ملازمت کی پیشکش کی گئی ہے سوائے گوشت اور گوشت کی دیگر خوردنی مصنوعات کو بنانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔ اِن صاحب کو اس کمپنی کے اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کی پیشکش ہے، اُن کا پوچھنا یہ ہے کیا ایسی کمپنی میں ملازمت اُن کے لئے لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ ابھی اُنہوں نے ہجرت کی ہے اور وہ معاش کی تلاش میں کچھ دنوں سے پھر رہے ہیں اور اُنہیں کوئی خاطر خواہ ملازمت نہیں مل رہی، جواب اِرشاد فرما کر مشکور فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مذکورہ کمپنی کے اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، وجہ یہ ہے کہ غیر مذبوح گوشت اگرچہ ہمارے نزدیک حلال نہیں اور اس کی خرید وفروخت بھی جائز نہیں، لیکن غیر مسلموں کے نزدیک چونکہ جائز ہے، اس لئے فقہائے کرامؒ نے ان کے درمیان ہونے والی ایسی بیع کو نافذ قرار دِیا ہے، اور اس کی مالیت کا اِعتبار کیا ہے، لہٰذا اس خرید وفروخت سے انہیں جو رقم حاصل ہوئی ہے، وہ عقدِ باطل کے ذریعے نہیں ہوئی۔ البتہ کسی مسلمان کو بذاتِ خود اس خرید وفروخت میں ملوّث ہونا جائز نہیں۔ لیکن اکاؤنٹ کی ملازمت میں اگر مسلمان کو خود یہ گوشت بیچنا نہ پڑے بلکہ صرف کمپنی کے حسابات رکھنے پڑیں تو یہ اعانت علی المعصیۃ میں داخل ہوکر حرام نہ ہوگا، کیونکہ یہ اعانتِ بعیدہ ہے، لہٰذا حاجت کے وقت اس ملازمت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ تاہم پرہیز کرنے میں اِحتیاط ہے۔ اور اس معاملے میں دُوسرے اہلِ فتویٰ علماء سے بھی استصواب کرلینا چاہئے، اگر ان کا جواب اس سے مختلف ہو تو ہمیں بھی مطلع کردیا جائے۔ متعلقہ فقہی عبارات منسلک ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۲۲/۶/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۴۹۶/۷۵)

(متعلقہ فقہی عبارات درج ذیل ہیں)

فی البحر (ج:۶ ص:۰۷ طبع سعید) قال تحت قوله (لم یجز بیع المیتة والدم) لانعدام المالیة التی هی رکن البیع فانهما لا یعدان ما لا عند أحد وهو من قسم الباطل ..... وفی القاموس المیتة ما لم تلحقه ذکاة وبالکسر للنوع اهـ فان ارید بعدم الجواز عدمهٗ فی حق المسلمین بقیت المیتة علیٰ اطلاقها وان ارید الأعم للمسلم والکافر فیراد بها ما مات حتف انفهٖ، اما المنخنقة والموقوذة فغیر داخلة لما فی التجنیس، اهل الکفر اذا باعوا

الـميتة فيـمـا بينهم لا يجوز لانها ليست بمال عندهم، ولو باعوا ذبيحتهم وذبـحهم ان يخنقوا الشاة ويضربوها حتّى تموت جاز لأنها عندهم بمنزلة الـذبيـحة عـنـدنـا، وفي جامع الكرخي يجوز البيع عندهم عند أبي يوسف خـلافًا لمحمد لأبي يوسف انهم يتمولونها كالخمر ولمحمد ان احكامهم كـأحـكمانا الا في الخمر، وفي الذخيرة اراد بالميتة ما مات حتف انفه اما التي مـاتت بالسبب كالخنق والجرح في غير موضع الذبح فالبيع فاسد لا بـاطـل، وكـذٰلک ذبـائح المجوس مال متقوم عندهم بمنزلة الخمر، كذا فـي الـمـعـراج، وحاصله ان فيما لم يمت حتف انفه بل بسبب غير الذكاة روايتيـن بـالـنسبة الـى الـكافر وفي رواية الجواز، وفي رواية الفساد، واما البطلان فلا، واما في حقنا فالكل سواء.

في البناية (ج:۷ ص:۱۸۸ طبع رشيديه) تحت قوله (فالبيع فاسد كالبيع بـالميتة) والميتة في اللغة هو الذى مات حتف انفه وانما قيد باللغة لتخرج الـمخنوقة وأمثالها فان ذٰلک عند من ليس له دين سماوى بمنزلة الذبيحة عـنـدنـا، ولهٰذا باعوا ذٰلک فيما بينهم جاز، وكره المصنف في التجنيس وان كـان ميتة عندنا بخلاف الميتة حتف انفها فان بيعهٗ فيما بينهم لا يجوز ولانها ليست بمال عندهم.

فـي تبيين الحقائق (ج:۴ ص:۳۶۲ طبع سعيد) قال بعد قوله لم يجز بيع الـميتة .... لـعـدم ركـن البيـع وهـو مبـادلة الـمال بالمال، وبيع هٰذه الأشياء باطل لما ذكرنا.

وفيـه أيـضًـا بـعد أسطر: والأصل فيه ان بيع ما ليس بمال عند أحد كالحر والـدم والـميتة التي ماتت حتف انفها والمدبر وام الولد والمكاتب باطل، وان كـان مـالا عـنـد البعض كالخمر والخنزير والميتة التي لم تمت حتف انفها، مثل الموقوذة فان هٰذه الأشياء مال عند أهل الذمة.

فـي شـرح الـوقـاية (ج:۳ ص:۳۹ طبـع رحـمـانية) اعـلم ان المال عين يـجـرى فيـه التنافس والابتذال فيخرج التراب ونحوه، والدم والميتة التي مـاتـت حتف انفه اما التي خنقت أو جرحت في غير موضع الذبح كما هو عـادة بعض الكفـار وذبـائح المجـوس فمـال الا انهـا غير متقومة كالخمر والخنزير.

فـي الدر المختار (ج:۵ ص:۵۵، ۵۶ طبع سعيد) قوله (كخمر وخنزير

ومیتة لم تمت حتف انفها) بل بالخنق ونحوه فانها مال عند الذمی کخمر وخنزير.

وقال الشامی تحت قوله (ومیتة لم تمت حتف انفها) هذا فی حق المسلم، اما الذمی ففی رواية بيعها صحيح، وفی أُخریٰ فاسد كما قدمناه عن البحر.

فی فتح المعين (ج:۲ ص:۲۶ طبع سعید) تحت قوله (فبيع الميتة) يعنی التی ماتت حتف انفها اما غيرها مثل الموقوذة فمال عند أهل الذمة كالخمر زيلعی.

وفيه أيضًا بعد أسطر: ثم لا فرق فی حق المسلم بين التی ماتت حتف انفها أو كانت منخنقة أو موقوذة أو ماتت بالجرح فی غير الذبح اما فی حق الذمی فيراد بها الأول وأما الثانی فاختلف فيه ففی التجنيس جعله من قسم الصحيح لأنهم يدينونه ولم يحك خلافا وفی الايضاح هو قول ابی يوسف وعند محمد لا يجوز وجزم فی الذخيرة بفساده والموقوذة هی التی قتلت بالخشب.

فی الطحطاوی علی الدر (ج:۳ ص:۶۳ طبع بولاق مصر) تحت قوله (الميتة) بفتح الميم وسكون الياء هی التی ماتت حتف انفها لا بسبب والميتة بفتح الميم وتشديد الياء المكسورة هی التی لم تمت حتف انفها بل ماتت بسبب غير الذكاة كالمنخنقة والموقوذة، والقسم الأول ليس بمال عند المسلمين وأهل الذمة اتفاقا والقسم الثانی ليس بمال فی حق المسلمين اتفاقا وفی حق أهل الذمة روايتان وقال الشيخ كمال الدين انها فی حق الميتة شرعا وانما نحكم بجوازه اذا وقعت بينهم لأنها مال عندهم كالخمر كذا ذكره المصنف فی التجنيس من غير ذكر خلاف وفی جامع الكرخی يجوز بينهم عند ابی يوسف خلافا لمحمد انتهی ملخصًا من حاشية المرحوم نوح وحاصله كما فی البحر.

فی مجمع الأنهر (ج:۳ ص:۷۷ طبع دار الكتب العلمية بيروت) تحت قوله (بيع ما ليس بمال الی قوله والميتة) التی ماتت حتف انفها لانه المنخنقة وامثالها مال عند أهل الذمة.

فی الدر المنتقی فی شرح الملتقیٰ (ج:۳ ص:۷۸ طبع علمية) تحت قوله (بيع مال غير متقوم كالخمر والخنزير) وقال عبدالواحد وغيره البيع

فیھما فاسد لا باطل کما فی النظم وکذا بیع ما مات بخنق وجرح کما فی الکشف لٰکن فی المحیط بیع منخنق المجوسی باطل خلافا لمحمد وھٰکذا فی القھستانی (ج:۳ ص:۴۵٦).

فی شرح المجلۃ (ج:۲ ص:۱۰۳ طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ) وقول المجلۃ باع جیفۃ ای میتۃ ماتت حتف انفھا، اما لو ماتت بسبب غیر الذکاۃ کالمنخنقۃ والموقوذۃ والمتردیۃ، ففی حق المسلم لا فرق بینھا وبین المیتۃ حتف انفھا من حیث بطلان البیع الٰی قولہ واما فی غیر المسلم ففی التجنیس جعلہ قسما من الصحیح لأنھم یدینونہ ولم یحک فیہ خلافًا وجزم فی الذّخیرۃ بفسادہٖ وجعلہ فی البحر من اختلاف الرّوایتین وفی البزازیۃ علٰی ھامش الھندیۃ ج:۴ ص:۳۷۲ (طبع رشیدیہ) وبیع المجوسی ذبیحۃ أو ما ھو ذبح عندہ کالخنق من کافر جاز عند الثانی.

سودی بینک کو مکان کرایہ پر دینے اور اس کے لئے بروکری کا حکم

سوال ۱:- سودی بینک کے لئے مکان کرایہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟ ملنے والا کرایہ حلال ہے یا حرام؟

سوال ۲:- مذکورہ صورت میں بروکری جائز ہے یا نہیں؟ بروکری کی صورت میں ملنے والا کمیشن حلال ہے یا حرام؟ محمد عامر، جامعۃ الرشید کراچی

جواب ۱:- "جواھر الفقہ" میں اعانۃ علی المعصیۃ کے بارے میں مفصل تحقیق اسی بارے میں ہے، وہ دیکھ لیں، خلاصہ یہ کہ اگر وہ مکان خاص بینک کے مقاصد کو مدِنظر رکھ کر بنایا گیا ہے تو ناجائز ہے، ورنہ مکروہ۔[1]

جواب ۲:- جہاں جواز ہے وہاں دلالی بھی جائز،[2] جہاں ناجائز ہے وہاں دلالی بھی ناجائز۔

واللہ اعلم

۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

---

(۱) "جواھر الفقہ" میں ہے: "اگر یہ دیکھا جائے کہ بنانے والے نے بینک کی مناسبت سے کمرے بنوائے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کراہتِ تحریم ہے، اور اگر یہ سمجھا جائے کہ ایسے کمرے صرف بینک ہی کے لئے نہیں دوسرے کاموں اور دفاتر کے لئے بھی بنتے ہیں، تو کراہتِ تنزیہ کہا جاسکتا ہے۔" تفصیلی دلائل اور حوالہ جات کے لئے "جواھر الفقہ" ج:۲ ص:۴۳۹ تا ۴۶۲ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی الشامیۃ ج:٦ ص:٦۳ (طبع سعید) مطلب فی اجرۃ الدّلال قال فی التاتر خانیۃ وفی الدّلال والسمسار یجب اجر المثل وما تواضعوا علیہ أن فی کل عشرۃ کذا فذاک حرام علیھم. وفی الحاوی سئل محمد بن سلمۃ عن اجرۃ السمسار فقال: ارجوا أنّہ لا بأس بہ وان کان فی الأصل فاسدًا لکثرۃ التّعامل وکثیر من ھذا غیر جائز فجوزوہ لحاجۃ الناس.

وکذا فی البحوث فی قضایا فقھیۃ معاصرۃ ص:۲۰۷ و ۲۰۸.

﴿فصل فی الإجارۃ الجدیدۃ والمتفرّقۃ﴾

(اِجارہ کے جدید اور متفرّق مسائل کا بیان)

اِنٹرنیٹ سروس مہیا کرنا اور اس پر فیس وصول کرنا

سوال:- حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے بعد عرض ہے کہ میں ح.س. بٹ میرا تعلق مکہ مکرّمہ سے ہے اور حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی (دامت برکاتہم) میرے ماموں ہیں، اور میں نے ان سے سوال کیا کہ میں ایک کام کرنا چاہ رہا ہوں اور اس میں سوال یہ ہے کہ آیا اس کام میں شریعت کی مخالفت تو نہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ آپ سے عرض کر کے جواب مفصل حاصل کروں۔ لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ اپنی رائے سے مستفید فرمائیں۔ میں ایک انٹرنیٹ کیفے (جہاں پر لوگ انٹرنیٹ استعمال کرنے کے لئے آتے ہیں) کھولنا چاہ رہا ہوں، تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں سعودی عرب میں انٹرنیٹ مکمل طور پر صاف ہے (یعنی جو بھی غیر اخلاقی مواد ہے وہ حکومت کی طرف سے بند کیا گیا ہے)۔ اور انٹرنیٹ کو لوگ اپنے اپنے طریقے سے استعمال کرتے ہیں، مثال کے طور پر کچھ لوگ اسے ٹیلیفون کے لئے استعمال کرتے ہیں (اس میں ٹیلیفون کافی سستا ہوتا ہے)، کچھ لوگ اسے تعلیمی مصالح کے لئے استعمال کرتے ہیں، کچھ لوگ اس سے تجارتی استفادہ کرتے ہیں، اور بھی بہت کچھ۔ مگر احتیاط کے طور پر یہ سوال کر رہا ہوں کہ آیا اس کام میں شریعت کی مخالفت تو نہیں؟ اُمید ہے کہ آپ متوجہ ہو کر مستفید فرمائیں گے، اور اگر لکھنے میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔

آپ سے دُعاؤں کا اُمیدوار اور جواب کا منتظر

ح.س. بٹ، مکہ مکرّمہ سعودی عرب

جواب:- اگر حکومت کی طرف سے غیر اخلاقی مواد بند کردیا گیا ہے تو اس قسم کی اِنٹرنیٹ سروس مہیا کرنا اور اس پر فیس وصول کرنا جائز ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۰/۱۲/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۸۱/۴۰۳)

کمپنی کی گاڑی خراب ہونے کی صورت میں گاڑی کی دُرستگی ومرمت اور متبادل انتظام فراہم کرنے کا ایک جدید عقد اور اس کی شرعی حیثیت (عربی فتویٰ)

سوال:- وما يقول الشيخ أدام الله عزه في عقد خدمات يدفع فيه صاحب السيارة مبلغًا محددًا لشركة تقوم باصلاح السيارة أو نقله من طرق المدينة أو الطريق السريع الىٰ أى مكان يختاره اذا تعطلت سيارته، والخطورة هي في الطريق السريع لأنها بين المدن وليست آمنة تماما، واذا تعطلت السيارة في ذٰلك الطريق ألزمت الشرطة صاحب السيارة بنقلها على الفور الأمر الذي يكلفه ضعف ذٰلك المبلغ المحدد، فهل يجوز التعاقد علىٰ ذٰلك حيث لا يعرف هل تتعطل السيارة أم لا.

سائلًا المولىٰ عزّ وجلّ لكم التّوفيق والسداد ودوام العافية، وأرجوا منكم الدعاء فنحن في بلد غير مسلم والله المستعان، والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

راجي رحمة ربّه
محمد علي محمد احداش

جواب:- وسؤالك الثاني: يتعلق بعقد صيانة السيارة ونقلها، و إن مثل هٰذه العقود قد انتشرت في عصرنا، مثل عقود صيانة السيارات، والحاسب الآلي والمعدّات الكهربائية وغيرها، والواقع أن هٰذا العقد لا ينطبق تمامًا علىٰ أحد من العقود المعروفة في الفقه الاسلامي، فإن اعتبرناه عقد الإجارة فانه لا يصح علىٰ كونه متضمنًا للغرر[1]. فانه لا يعرف هل تحتاج السيارة إلىٰ صيانة أو نقل أم لا؟ وقد كيّفه بعض المعاصرين علىٰ أساس الجعالة، ولٰكنني غير مقتنع تمامًا علىٰ هٰذا التكييف، فإنّ عقود الجعالة تعتمد علىٰ عمل نشأ سببه عند العقد، إلّا أن نقول: إن وجود السيارة يلزمه أن تحتاج الىٰ صيانة في وقت أو آخر.

وبالجملة، فلم ينشرح صدري حتّى الآن علىٰ تكييف مقبول لهٰذا العقد، ويبدو أنه أشبه بالتأمين منه بالجعالة أو الإجارة، وقد طرح الموضوع علىٰ مجمع الفقه الاسلامي، ولم يتمكن من إصدار قرار فيه حتّى الآن، ولٰكن الحاجة داعية الىٰ مثل هٰذه العقود في عصرنا، فينبغي أن ينظر فيه الفقهاء ويلتمسوا له تكييفا مقبولا أو بديلا مناسبا، والله سبحانه أعلم

والسلام عليكم ورحمة الله
أخوكم: محمد تقي العثماني
۲۰۰۴/۲/۲۹ء

---

(۱) في كتاب المبسوط: في كتاب الشرب: قال أبو يوسف سألت أبا حنيفةؒ عن الرجل استأجر النهر يصيد فيه السمك أو استأجر جهة يصيد فيها السمك، قال: لا يجوز...... وذٰلك كله من باب الغرر.

پگڑی کی شرعی حیثیت

سوال:- پگڑی پر مکان لے کر کسی دُوسرے کو وہی مکان کرایہ پر دینا اور اس طرح کاروبار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کرایہ کی صورت میں جو آمدنی ہوگی وہ میرے لئے جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب:- پگڑی کا لین دین شرعاً جائز نہیں،[1] البتہ کرایہ جتنا زیادہ مقرّر کرنا چاہے مالک مقرّر کرسکتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے مہینے کا کرایہ زیادہ مقرّر کردے اور بعد کے مہینوں کا کم۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۲۰/ ۲۸ ج)

''پگڑی'' کا حکم

سوال:- ایک دُکان مثلاً ۲۵ ہزار پگڑی لے کر کرایہ پر دے دی جائے تو جائز ہے یا نہیں؟ یہ دُکان مالک کے قبضے میں ہے اور مالک کرایہ پر دے رہا ہے۔

جواب:- مروّجہ پگڑی کا لین دین شرعاً جائز نہیں ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۸/ ۲۸ الف)

پگڑی کی مخصوص صورت

(ایک شریک کی طرف سے شرکت ختم کرنے کی صورت میں دُوسرے شریک سے کرایہ کی دُکان کی مد میں کچھ رقم لینے کا حکم)

سوال:- زید اور عمر بہت عرصے سے مال میں شریک تھے، دونوں نے شراکت کے زمانے میں ایک دُکان کرایہ پر لی تھی، دُکان کے اُوپر ایک کمرہ ہے جس کا اُوپر کوئی دروازہ نہیں ہے، البتہ نیچے دُکان کے اندر سے ایک آدمی کا آنے جانے کا راستہ ہے، وہ راستہ بھی عارضی ہے، وہ اس طریقے سے

(۱ و ۲) فی البحوث فی قضایا فقهية معاصرة ص:۱۱۴ تحقيق ممّا ذكرنا أنّ البدل الخلو المتعارف الّذی يأخذه المؤجر من مستأجره لا يجوز ولا يتطبق هذا المبلغ المأخوذ علىٰ قاعدة من القواعد الشرعيّة وليس ذٰلک الا رشوة حراما.

کہ دُکان کے اندر عارضی سیڑھی لگا کر آدمی اُوپر کمرے کو چلا جاتا ہے، پھر آدمی کو اُترتے وقت پھر سیڑھی لگا کر اُترنا پڑتا ہے، یہ بات واضح رہے کہ دُکان کے اُوپر جو کمرہ ہے اس کا اُوپر کوئی دروازہ نہیں ہے، مذکورہ دُکان کو یعنی اس کرائے کی دُکان کو دو حصے کرکے ایک حصے کو کرایہ پر دے دیا اور ایک حصے میں اپنی شرکت کا کاروبار کر رہے ہیں، اب زید وعمر شراکت کو ختم کرکے زید عمر سے کہتا ہے کہ کرایہ کی دُکان کو تو لے لینا مجھ کو اس کی قیمت دے دینا، عمر اس پر راضی ہوا، عمر نے اس کرایہ کی دُکان کی قیمت قسطوں میں کچھ عرصے میں ادا کی، زید نے ایک سال کے عرصے کے بعد عمر پر دعویٰ کیا کہ تو نے جو قیمت دی ہے وہ نیچے دُکان کی دی ہے، دُکان کے اُوپر کمرے کا حصہ لے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں عمر کے ذمے دُکان کے مال کے آدھے حصے کی قیمت ادا کرنا واجب تھا، جو وہ ادا کر چکا ہے، جہاں تک دُکان کا تعلق ہے چونکہ وہ ان شریکوں کی ملکیت نہیں تھی بلکہ دونوں نے کسی سے کرائے پر لی ہوئی تھی، اور عمر آئندہ بھی اس دُکان میں کاروبار کرے گا تو اس کا کرایہ مالک دُکان کو ادا کرتا رہے گا، لہٰذا دُکان کے سلسلے میں عمر کے ذمے کوئی رقم زید کی نہیں تھی، جتنی رقم اُس نے دی وہ بھی زیادہ دی، اس اُوپر کے حصے میں زید کا مطالبہ شرعاً بالکل ناجائز ہے، عمر کے ذمے کچھ واجب نہیں ہے، شریعت کی رُو سے پگڑی کا لین دین بھی جائز نہیں ہے۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

۲۶/۱۰/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۱۵/۳۲ ج)

پگڑی کی صورت

سوال:- یہاں پر کمرے وغیرہ عمدہ عمدہ قیمت میں نیلام ہوتے ہیں، اور ماہانہ کرائے کی ایک خاص مقدار مقرّر ہے، اس کے باوجود مالکانِ مالک بڑی بڑی رقوم طلب کرتے ہیں، مسجد کا وقف شدہ مکان وکمرہ نیلام کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- یہ پگڑی کی صورت ہے اور حقِ اِستیجار کی بیع ہے، جو حقِ مجرّد ہے، اور حقوقِ مجرّدہ کی بیع شرعاً ناجائز ہے، اس لئے ایسا نیلام کرنا دُرست نہیں۔[2] واللہ اعلم

۲۹/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۲/۲۸ الف)

(۱،۲) دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ۔

۱:- ویزا لگانے کی اُجرت کا حکم

۲:- کسی کو مختلف غیر قانونی طریقوں سے باہر ملک بھجوانے کی اُجرت کا حکم

۳:- صرف ٹکٹیں بیچنے کے لائسنس پر ٹکٹوں کے علاوہ ویزے لگوانے کا کام کرنا

سوال:- محترم مفتی صاحب! مندرجہ ذیل چند مسئلے قرآن کی روشنی میں تحقیق کر کے بتائیں کہ شریعت میں اِس کی کیا حیثیت ہے؟

۱:- ایک عام آدمی بیرونِ ملک مثلاً امریکا، یورپ یا رُوس وغیرہ کا ویزا یا کسی اور اسلامی ملک کا ویزا لگانا چاہتا ہے، ہم سے وہ رُجوع کرتا ہے، ہم اُس ملک کی ایمبیسی کے کونسلر سے مل کر اُسے پیسے دیتے ہیں تاکہ وہ اس آدمی کو ویزا ضرور دے دیں، اس میں اگر ہم اپنے لئے اُس آدمی سے زیادہ روپے لے لیں تو وہ ہمارے لئے حلال ہیں یا حرام؟

۲:- ایک آدمی ہمارے پاس آتا ہے کہ مجھے باہر کے کسی ملک میں پہنچادو، ہم ٹریول ایجنسی والے اُس کے ساتھ خاص ریٹ پر متفق ہوتے ہیں، اُس کے بعد اُس کی تصویر ایسے دُوسرے شخص کے پاسپورٹ پر لگادیتے ہیں جس کا ویزا لگا ہوتا ہے، اور وہ نہیں جانا چاہتا یا اُس کے پاس دو پاسپورٹ ہیں جس میں دونوں پر ویزا ہے، تو اس کی تصویر تبدیل کر کے اور ایئرپورٹ میں روپے دے دیتے ہیں تاکہ اُس کو نہ روکیں، اس طریقے سے کمائی حلال ہے یا حرام؟

۳- بہت سے افغانیوں نے پاکستانی پاسپورٹ بنائے ہیں اور سعودی عرب یا اِمارات وغیرہ کے ویزے لگائے ہوئے ہیں، لہٰذا جب وہ جاتے ہیں تو اُن کے پکڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے وہ ٹریول ایجنسی سے رابطہ کرتے ہیں، ٹریول ایجنسی والے ایئرپورٹ میں F.I.A والوں سے بات کر کے پیسے دیتے ہیں تاکہ اس کو جانے دیا جائے، اس میں ٹریول ایجنسی والے بھی اپنے لئے روپے رکھ لیتے ہیں، اس صورت میں ٹریول ایجنسی کی کمائی حلال ہے یا حرام ہے؟

۴:- ٹریول ایجنسی کا حکومتی لائسنس دو طرح کا ہوتا ہے، ایک میں صرف ٹکٹیں بیچنے کی اجازت ہوتی ہے، اور دُوسرے لائسنس میں صرف ویزے لگانے کی اجازت ہوتی ہے، لیکن دونوں طرح کی ایجنسیاں دونوں کام کرتی ہیں، یعنی ٹکٹیں بیچنا اور ویزے لگانا، حکومت یہ جانتے ہوئے خاموش

ہے، کیا اس طرح اجازت کے بغیر دونوں کاموں سے کمانا جائز ہے یا ناجائز ہے؟ برائے مہربانی تحقیق کر کے قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ لکھ کر عنایت فرمائیں۔

۵:- ایک آدمی نے ہم کو کسی کام کے لئے روپے دے دیئے یا کوئی چیز ضمانت کے طور پر رکھ دی اور اُس کا کام ابھی ہوا نہیں ہے کہ وہ پشیمان ہوگیا اور اُس کے کام پر ہمارے روپے خرچ نہیں ہوئے یا کم خرچ ہوئے ہیں، اور چونکہ معاہدہ توڑا ہے تو ہم اُس سے زیادہ لیں تو کیا یہ زیادہ رقم لینا حلال ہے یا حرام؟

جناب مفتی صاحب! مندرجہ بالا مسئلوں کو قرآن وحدیث کی روشنی میں حل کر کے لکھیں اور برائے مہربانی مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کریں، مجھے شدید انتظار رہے گا۔ ارشد احمد

ایئر انٹرنیشنل ٹریولز، پشاور

(مذکورہ بالا استفتاء کے ساتھ سائل نے حضرتِ والا دامت برکاتہم کے نام درج ذیل خط بھی لکھا)

(خط از سائل)

بخدمت جناب حضرتِ اقدس حضرتِ والا دامت برکاتہم

بعد از سلام عرض ہے کہ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت اللہ ربّ العزّت سے نیک مطلوب ہوں۔

میں ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں، ایک دفعہ ایک لائبریری میں آپ کا کتابی سفرنامہ ''جہانِ دیدہ'' ہاتھ لگا، اُس کو جب پڑھا تو میں نے سمجھا کہ مجھے اسلامی تاریخ کا ایک خزانہ مل گیا، اس کے بعد پشاور میں میں نے شیخ الحدیث مولانا حسن جان صاحب سے آپ کے متعلق پوچھا تو اُنہوں نے اس طریقے سے آپ کی تعریف کی کہ میری آپ سے دِلی محبت اور بڑھ گئی، اور اب میرے پاس آپ کی بہت سی تصانیف کا ایک چھوٹا سا مجموعہ موجود ہے، اور مزید یہ کہ جس طرح آپ کی تصانیف پڑھتے پڑھتے اور پڑھنے کا شوق بڑھ رہا ہے، اُسی طرح آپ کے ساتھ ملاقات کا بھی شوق بڑھ رہا ہے، لیکن مالی حالات اور مصروفیات کی وجہ سے کراچی آنے اور زیارت کا شرف حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ بہرحال اگر یہ خط آپ کو ملے تو آپ اپنے قیمتی اوقات میں سے وقت فارغ کر کے مجھے چند لفظ اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجیں تو مجھے تسلی سی ہوجائے گی کہ آپ کی زیارت ہوگئی۔ باقی خط زیادہ لمبا کر کے آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا، لیکن آپ سے دُعاؤں کی درخواست ہے کہ اپنی دُعاؤں میں اس ناچیز کو بھی مت بھولیے۔ ارشد احمد

جواب :- مکرمی ومحترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، آپ نے جو اظہارِ محبت فرمایا ہے، اس کے لئے شکرگزار ہوں، اور دُعا کی درخواست کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رضائے کاملہ عطا فرمادیں، آمین۔ آپ کے لئے بھی دُعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تمام مقاصدِ حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں، آمین۔ آپ کے سوالات کا جواب نمبروار درج ذیل ہے:-

۱:- ویزا حاصل کرنے کی جائز محنت پر آپ اُجرت وصول کرسکتے ہیں،[1] لیکن اس کے لئے کسی کو رِشوت دینا جائز نہیں،[2] اور اس رِشوت کی وجہ سے اُجرت بڑھانا بھی جائز نہیں، ہاں ویزے کی جو فیس قانونی ہوتی ہے، وہ آپ اپنی اُجرت کے علاوہ وصول کرسکتے ہیں۔

۲:- یہ کام بالکل حرام ہے، دھوکا دہی ہے، اس کی اُجرت بھی حرام ہے۔[3]

۳:- یہ کام بھی بالکل حرام ہے، اور اس کی آمدنی بھی حرام۔[4]

۴:- اگر حکومت کی طرف سے قانوناً یا عملاً اس کی اجازت مل جائے تو جائز ہے۔

آپ کا آخری سوال واضح نہیں، اس لئے جواب سے معذور ہوں۔ والسلام

۲؍۱؍۱۴۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۴۷/۴۰۸)

انشورنس کمپنی میں ملازمت کا حکم

سوال:- انشورنس کے محکمے میں ایجنٹ بننے یا اس محکمے کے دُوسرے اہل کاروں کی ملازمت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

---

(۱) لأنّه عمل مباح يجوز أخذ الأجرة عليه، ويستأنس في هذه المسئلة من العبارات الآتية:-
في الهندية الباب الثاني والثلاثون في المتفرّقات ج:۴ ص:۵۲۶ (طبع رشيديه كوئته) في الكبرىٰ أهل بلدة ثقلت عليهم مؤنات العمال فاستأجروا رجلًا بأجرة معلومة ليذهب ويرفع أمرهم الى السلطان الأعظم ليخفف عنهم بعض الحيف وأخذ الأجرة من عامتهم غنيهم وفقيرهم ذكر ههنا انّه ان كان بحال لو ذهب الى بلد السلطان تهيا له اصلاح الأمر يومًا أو يومين جازت الاجارة وان كان بحال لا يحصل ذٰلك الّا بمدة فان وقّتوا للإجارة وقتًا معلومًا فالاجارة جائزة والأجر كلّه له وان لم يوقتوا فهي فاسدة وله أجر مثله.
وفي فتاوى قاضي خان باب الاجارة الفاسدة ج:۳ ص:۱۸ أهل بلدة ثقلت عليهم المؤنات فاستأجروا رجالًا بأجر معلوم ليذهب الى السلطان ويرفع القصّة ليخفف عنهم السلطان نوع تخفيف وأخذ الأجر من عامّة أهل البلدة من الأغنياء والفقراء قالوا: ان كان بحال لو ذهب الى بلدة السلطان يتهيّأ له اصلاح الأمر في يوم أو يومين جازت الاجارة وان كان بحال لا يحصل المقصود في يوم أو يومين وانّما يحصل في مدّة فان وقّتوا الاجارة وقتًا جازت الاجارة وله كل المسمّٰى وان لم يوقّتوا فسدت الاجارة وكان له أجر المثل علىٰ أهل البلدة علىٰ قدر مؤنتهم ومنافعهم .... الخ.
(۲) وفي المشكوة، كتاب الامارة والقضاء ج:۱ ص:۳۲۷ (طبع رحمانيه) عن عبدالله بن عمرو قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي.
(۳و۴) کیونکہ یہ ''اجارہ علی المعاصی'' ہے، جو ناجائز ہے، تفصیلی حوالہ جات کے لئے ص:۳۹۴ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- اس محکمے میں ملازمت کرنا جائز نہیں۔[۱]

والله اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۵۹۶/۱۹ الف)

وکالت کے پیشے اور اس کے ذریعے حاصل کی گئی رقم کا حکم

سوال:- کیا وکیل کا وکالت کے ذریعے کمایا ہوا روپیہ حلال ہے؟ جبکہ وکیل کو سچے مقدمے کی پیروی کرنے میں بھی کبھی حقائق کو ردّ و بدل کے ساتھ پیش کرنا پڑتا ہے۔

جواب:- وکالت میں اگر جھوٹ بولنا یا ناحق کو حق ثابت کرنا نہ پڑے تو جائز ہے،[۲] لیکن جس مقدمے میں یہ کام کرنے پڑیں اس میں وکالت جائز نہیں اور ایسی وکالت کی آمدنی بھی حرام ہے۔

والله اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۶ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۵۳/۱۹ الف)

۱:- ملازمت سے برطرفی کے زمانے کی تنخواہ کا حکم

۲:- رشوت دے کر ملازمت پر بحال ہونے والے ملازم کے لئے برطرفی کے زمانے کی تنخواہ کا حکم

سوال:- محترم ومکرم جناب مفتی صاحب دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

---

(۱) وفی الهداية باب الاجارة الفاسدة ج:۳ ص:۳۰۶ (طبع مکتبہ رحمانیہ) ولا يجوز الاستيجار على الغناء والنّوح وكذا سائر الملاهی لأنّه استيجار على المعصية والمعصية لا تستحق بالعقد.

وفی بدائع الصنائع ج:۴ ص:۱۸۹ (طبع سعيد) وكذا كل اجارة وقعت لمظلمة لأنّه استئجار لفعل المعصية فلا يكون المعقود عليه مقدورة الاستيفاء شرعاً.

وكذا فی الهندية ج:۴ ص:۴۱۱.

وفی تكملة فتح الملهم ج:۱ ص:۶۱۹ فان كان عمل الموظّف فی البنک ما يعين على الرّبا كالكتابة أو الحساب فذلک حرام بوجهين، الأوّل اعانة على المعصية، والثانی أخذ الأجرة من المال الحرام .... الخ. نیز دیکھئے ص:۳۸۰ کا حاشیہ۔

(۲) وفی نور الأنوار ص:۱۰۷ ان وکّل احد رجلًا أن يخاصم المدعی عند القاضی يحمل على مطلق الجواب لأنّ الخصومة هو الانكار فقط محقًا كان المدعی او مبطلًا وهو حرام شرعًا لقوله تعالىٰ: "ولا تنازعوا" فلا بدّ أن يصرف الى الجواب مطلقًا بالرّد والاقرار مجازًا من قبيل اطلاق الخاص الى العام فلو أقرّ الوكيل علىٰ مؤكله جاز عنده .... الخ.

وفی الهداية كتاب الوكالة ج:۳ ص:۱۷۶ ويجوز الوكالة بالخصومة فی سائر الحقوق لما قدّمنا من الحاجة اذ ليس كل أحد يهتدی الىٰ وجوه الخصومات وقد صحّ أنّ عليًا وكّل فيها عقيلاً وبعد ما أسن وكّل عبدالله بن جعفر.

نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۳۲۰ وامداد الاحکام ج:۳ ص:۵۸۰ و۵۸۱ وعزیز الفتاویٰ ص:۶۶۷ (طبع دار الاشاعت)۔

عرض ہے کہ درج ذیل مسئلے کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں مطلوب ہے۔

زید پاکستان ایئرفورس کی ایک شاخ (جو بین الاقوامی جہازوں پر کام کرتی ہے) کے شعبہ ''الجریرتگ'' کے ایک اہم عہدے پر مستقل ملازم تھا، ادارے نے اس کو چار سال قبل ملازمت سے برطرف کردیا کہ تمہاری وجہ سے دو جہازوں پر کام پندرہ بیس منٹ تاخیر سے ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس غلطی کے ذمہ دار کچھ اور لوگ تھے، زید اس ادارہ کا ایک مستند، دیانت دار اور محنتی و مستقل ملازم تھا۔ خیر! مقدمہ عدالتوں میں چلا، اور تین سال بعد ایک عدالت کے پُرانے جج نے فیصلہ دیا کہ اس کو کیوں نکالا گیا یہ ایک الگ بات ہے، (یہ زیرِ غور نہیں، نہ اس کی ضرورت محسوس کی گئی) اس کو نکالنے کا جو قانونی طریقہ تھا وہ اختیار نہیں کیا گیا، اس لئے اس کو فوراً ملازمت پر بحال کیا جائے اور اس کے پچھلے تمام واجبات ادا کئے جائیں۔ لیکن عدالت کے اس حکم کو نہ مانتے ہوئے ادارے نے 'مقدمہ'' عدالتِ عالیہ میں داخل کردیا، اور درخواست کی اگر اس میں کوئی قانونی سقم ہو تو فیصلہ کیا جائے۔ عدالتِ عالیہ کے سب سے بڑے جج نے حکم دیا کہ تمام واجبات ادا کرو، اور تنخواہ جاری کرو، جب فیصلہ ہوگا اُس وقت اگر زید ہار گیا تو سب رقم واپس کردے گا، اور اگر مقدمہ جیت گیا تو ملازمت بحال، اور سب رقم اس کی۔

اب زید کے رقم وصول کرنے کا وقت ہے، یعنی ماہانہ تنخواہ اور پچھلے واجبات، لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے چار سال تک تو نہ ان کا کام کیا اور نہ انہوں نے مجھے کچھ کہا، اور ہر ماہ کی بغیر کام کئے جو تنخواہ ملے گی آیا اس رقم کا وصول کرنا میرے لئے جائز ہے یا حرام؟ اور مقدمہ جیتنے کی صورت میں وہاں دوبارہ ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

ادارہ حکومت ہے، ہر شخص اس کا ملازم ہے، یہ شاخ ایئرفورس کے چھوٹے، بڑے ملازمین کے پیسوں سے قائم ہوئی تھی، اس کا فائدہ خود انہیں اور ایئرفورس کو جاتا ہے، زید اس کا صرف ملازم تھا، یہ ادارہ کسی کا ذاتی نہیں، یہاں ملازم رکھنے اور نکالنے کا طریقہ شرعی نہیں، جو قوانین موجودہ ہمارے ملک کے اداروں، عدالتوں وغیرہ میں چل رہے ہیں، اسی کے مطابق یہ کارروائی ہوئی ہے اور ہوگی۔

زید کا کہنا ہے کہ اگر میرے لئے یہ رقم اور ملازمت پر دوبارہ جانا جائز نہیں بلکہ حرام ہے تو میں اس کو حاصل نہیں کروں گا۔

سوال۲:- بالکل اسی طرح کا ایک اور مقدمہ ہے کہ اس شخص نے عدالت کے ایک اہم اہلکار کو قلیل سی رقم دے کر یعنی بطور رِشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کروالیا، اور اب تنخواہ بغیر کام کئے کے لے رہا ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ شخص بھی حق پر تھا، اور اپنا جائز کام کرانے کے لئے رِشوت دی تھی، بصورتِ دیگر اس کے خلاف بھی فیصلہ ہوسکتا تھا، اب اس کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب ا:- حکومت کے جس قانون کے تحت سرکاری ملازمین (فوجی ہوں یا سِول) کا تقرر، تنزل، یا معزولی وغیرہ عمل میں آتے ہیں، اس قانون کے نافذ ہوجانے کے بعد وہ قانون فریقین کے معاہدۂ ملازمت کا حصہ بن جاتا ہے، اور اس پر وہی اَحکام جاری ہوتے ہیں جو معاہدۂ اجارہ کی شرائط پر ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ اس قانون کی خلاف ورزی شرائطِ معاہدہ کی خلاف ورزی سمجھی جائے گی۔ اب اگر کسی سرکاری ادارے نے ان شرائط یا قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی ملازم کو معزول کیا، جبکہ قانون میں یہ بھی ہو کہ ایسی معزولی قانوناً معتبر نہ ہوگی، تو یہ معزولی شرائطِ معاہدہ کے خلاف ہونے کی بناء پر شرعاً بھی دُرست نہ ہوئی اور زید بدستور ملازمت پر برقرار رہا۔ اور اس کا اس فیصلے کو عدالت میں چیلنج کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی خدمات ادارے کو پیش کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ و تیار تھا، اس لئے اس کا کام نہ کرنا اس کی غلطی کی وجہ سے نہیں، بلکہ ادارے کی غلطی کی وجہ سے ہوا، جس نے اس سے کام نہیں لیا۔ لہٰذا اگر عدالت اُسے اس زمانے کی تنخواہ بھی محکمے سے دِلواتی ہے تو مندرجہ بالا وجہ کی بناء پر اس کے لئے اس کا لینا جائز ہے۔ تاہم اگر وہ احتیاط پر عمل کرتے ہوئے اس زمانے کی تنخواہ نہ لے تو یہ تقویٰ کی بات ہے جو اِن شاء اللہ موجبِ اجر ہوگی۔

جواب۲:- اس ملازم کو رِشوت دینا ہرگز جائز نہیں تھا،[1] اس نے رِشوت دے کر سخت حرام کا ارتکاب کیا، اور اگر رِشوت کے ذریعے ناحق فیصلہ کرایا تو گناہ بھی دُگنا ہے، اور یہ رقم لینا بھی حلال نہیں، لیکن اگر فیصلہ جواب نمبر۱ کی تفصیل کے مطابق شرعاً دُرست ہو تو رِشوت کے گناہ کے باوجود کام نہ کرنے کے زمانے کی تنخواہ لینے اور اسے استعمال میں لانے کی گنجائش ہے، جس کی وجہ جواب نمبر۱ میں لکھی جاچکی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۰/۱۱/۱۴۰۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۳۱/۴۰ و)

حکومت کی طرف سے ”قابض“ کو الاٹمنٹ کا حق دینے کی صورت میں پلاٹ کا مالک مؤجر ہوگا یا کرایہ دار؟

سوال:- ہمارے پاس ایک اَن اتھرائز جگہ جو بغیر الاٹ شدہ ہے، جس پر تھوڑی تھوڑی دیوار اور چھت بنی ہوئی تھی ہمارے پاس کرایہ پر ہے، اور محمد اسلم سے کرایہ پر لیا ہے، اس جگہ کا کرایہ ۴۲۵ روپے مہینہ ہے، یہ جگہ جیکب لائن میں ہے، محمد اسلم سے ہمارا 2-4-1979 کو ایک ایگریمنٹ ہوا

(۱) وفي سنن الترمذي ج:۱ ص:۲۴۸ (طبع قديمي كتب خانه) عن أبي هريرةؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي في الحكم. نیز دیکھئے ص:۴۰۹ کا حاشیہ نمبر۲۔

جو پانچ سال کے لئے تھا، اگریمنٹ پر جو ایڈوانس چار ہزار روپے دیئے تھے اور جو جگہ ہم نے تعمیر کرائی، بجلی ہم نے لگوائی اور بجلی کا بل بھی ہمارے نام ہے، ان تمام اخراجات کی ہمارے پاس تحریر اور رسیدیں موجود ہیں، اب گورنمنٹ اس جگہ کو الاٹ کر رہی ہے، گورنمنٹ کا قانون ہے کہ جو جگہ پر قابض ہوگا وہ سروے کراسکتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنے نام کے سروے کرایا ہے، اور ابھی ہمارے پانچ سال بھی نہیں ہوئے، ہم نے اس جگہ کو دو حصے میں کردیا تھا جس ایک حصے کو ہم نے ڈیڑھ سو روپیہ کرایہ پر دے دیا تھا، یہ ساری تعمیر ایڈوانس کے علاوہ ہمارا خرچ ہے، ہماری کرایہ پر دی ہوئی جگہ کا بھی اُس کرایہ دار نے گورنمنٹ سے سروے کرلیا، جگہ کے مالک نے ہم دونوں کو دھونس دے کر سروے سلپ لے لی، پھر ہم سے کہا کہ جو جگہ کرایہ پر دی ہے اس کو خالی کرادو، تو ایک سروے سلپ تم کو دے دُوں گا۔ لہٰذا ہم نے چار سو روپے دے کر وہ جگہ خالی کرالی اس دوران ہم نے اس سے کہا کہ ہم آپ کی جگہ خالی کرتے ہیں لہٰذا ہم کو ایڈوانس اور ہمارا جو خرچہ ہوا ہے وہ دے دو، اس نے کہا کہ: ہم ایک سروے سلپ دیں گے، اب وہ سروے سلپ دینے کو تیار نہیں بلکہ خرچہ دینے کو تیار ہے، حالانکہ سروے سلپ ہمارے نام ہے اور گورنمنٹ کا قانون ہے کہ جگہ الاٹمنٹ اسی کے نام ہوگا جس کے نام سروے سلپ ہے، اور وہ شخص بھی کسی طرح اس جگہ کو نہیں لے سکتا جب تک ہم اس کو لکھ کر نہ دیں۔ اسلم سے جو اگریمنٹ ہم نے کیا تھا اس کی انگریزی کاپی منسلک ہے اور گورنمنٹ کا قانون ہے کہ جو کرایہ دار ہے جگہ اسی کے نام الاٹ ہوگی۔ نیز بجلی کے مصارف اور دیوار، چھت وغیرہ میں جو کچھ خرچ ہوا ہے اس کے کاغذات موجود ہیں۔

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں اس جگہ کا اصل قابض محمد اسلم ہے، کیونکہ اس نے اس پر عمارت تعمیر کر رکھی ہے اور شرعاً یہ کرایہ عمارت کا ہوا، لہٰذا بشیر احمد کی حیثیت عمارت کے کرایہ دار کی ہے، جس نے کرایہ کے معاہدے میں یہ صراحت کی ہے کہ وہ پانچ سال کے بعد اس عمارت کو خالی کردے گا، لہٰذا اگر حکومت نے الاٹمنٹ کا حق صرف قابض کو دیا تھا تو اس کا اصل حق دار محمد اسلم ہے۔

واللہ اعلم

۲۳/۷/۱۴۰۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۳/۱۱۸۲ ج)

لیز پر گاڑی خریدنے کا حکم

سوال:۔ شیخ الحدیث و مفتی صاحب دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

لیز پر جو بینک سے گاڑی ملتی ہے اُس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- محترمی! سلام مسنون

لیز پر جو معاہدات ہوتے ہیں وہ جائز وناجائز ہر طرح کے ہوتے ہیں، آج کل اکثر لیز کے معاملات ناجائز ہیں، البتہ میزان بینک کا طریقہ بہتر ہے، اس سے فائدہ اُٹھانے کی گنجائش ہے۔

والسلام

۱۴۲۵/۳/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۶۹۲)

سودی قرضہ لے کر خریدے گئے مکان کے کرائے کا حکم

سوال:- حضرت علامہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدفیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون آکلینڈ (نیوزی لینڈ) سے خلیل احمد کا سلام قبول ہو، اور دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وعافیت سے رکھے اور ہم کو آپ سے مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمائے، آمین۔

دیگر عرض ہے کہ آپ سے فون پر جو بات ہوئی تھی، اسی حوالے سے سوال عرض ہے کہ یہاں ایک کمیٹی ہے جس کے ماتحت ایک اور کمیٹی ہے جو کاروبار کرتی ہے اور جو منافع ہوتا ہے وہ مختلف مساجد کو دیتے ہیں گویا یہ کمیٹی نیوزی لینڈ کے تمام مسلمانوں کی ہے۔

انہوں نے چند مہینوں پہلے ایک مکان خریدا کرایہ کے لئے، جس کی قیمت ۸ لاکھ ۶۰ ہزار ڈالر ہے، جس میں ۴ لاکھ ۵۰ ہزار بینک سے قرضہ لے کر ادا کیا، باقی قرضِ حسنہ کے طور پر جمع کر کے ادا کیا گیا۔ اس عمارت کو اُجرت پر دیا گیا ہے سالانہ ۷۰ ہزار ڈالر آمدنی ہے، جو مساجد اور کارِ خیر میں استعمال کیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں سودی قرضہ لگایا گیا ہے، لہٰذا گناہ ہے اور اس معاملے کو ختم کر دیا جائے، اور اس مکان کو بیچ کر بینک کا قرضہ ختم کر دیا جائے۔ لیکن ایک دُوسری رائے ہے کہ اس کو باقی رکھ کر اس سے فائدہ اُٹھایا جائے اور سودی قرضہ جلد از جلد ادا کر دیا جائے، کیونکہ اس مکان کو بیچ کر جو قرضہ ادا کیا جائے گا تو تقریباً ایک لاکھ ڈالر کا نقصان ہونے کا اندیشہ ہے، تو اس صورت میں کیا کیا جائے؟ اور شریعتِ اسلامیہ ہمیں کیا رہنمائی فرماتی ہے؟ برائے کرام دلائل کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرمائیں اور جلد از جلد جواب ارسال فرمائیں۔

احقر خلیل احمد نادات

۲۰۰۲/۸/۱۳ء

جواب:- مکرمی ومحترمی جناب مولانا خلیل احمد صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا فیکس ملا، سوال کا جواب یہ ہے کہ بینک سے سود پر قرض لینا بہت سخت گناہ ہے،[1] اور اگر غلطی سے ایسا سودی قرض لے لیا گیا ہو تو اُس سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کی جو بھی صورت ہو، اختیار کرنا شرعاً واجب ہے۔[2] لیکن اس قرض کی رقم سے جو مکان خریدا گیا اُس سے فائدہ اُٹھانا حرام نہیں۔[3] اور اگر اسے کرایہ پر دیا گیا ہے تو وہ کرایہ بھی حرام نہیں۔[4] لہٰذا اگر مکان کو فروخت کئے بغیر اس سودی قرض سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی صورت ممکن ہو تو مکان فروخت کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے کرائے سے فائدہ اُٹھانا جائز ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے (دیکھئے امداد الفتاویٰ ص:۱۶۹ و ۱۷۰ ج:۳ سوال نمبر ۲۲۴)۔ لیکن یہ اسی صورت میں جائز ہے جب سودی قرض سے جلد از جلد چھٹکارا پانا ممکن ہو۔ اگر مکان کو فروخت کئے بغیر سودی قرض سے چھٹکارا پانا ممکن نہ ہو، یا اس میں بہت دیر لگنے کا اندیشہ ہو جس سے سود کی رقم میں اضافہ ہوتا رہے، اور مسلسل سود کی ادائیگی کا گناہ جاری رہے تو پھر مکان کو فروخت کر کے سودی قرض سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہوگا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۸؍جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۷۷/۵۶۲)

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۲۵ کا حاشیہ نمبر۳ اور ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر۱ اور ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔
(۲) دیکھئے ص:۱۲۰ و ص:۱۲۱ کے حواشی، اور مزید تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔
(۳ و ۴) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۲۸ اور ص:۲۰۱ کا حاشیہ نمبر۱۔

﴿کتاب الرّھن﴾

(رہن یعنی گروی رکھنے اور اُس سے متعلق مختلف مسائل کا بیان)

ڈپازٹ کے طور پر رکھوائی جانے والی رقم رہن ہے یا قرض؟
(چند فقہی عبارات کی وضاحت)

سوال:- بخدمت شیخی ومرشدی واُستاذی مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ نے ذوالحجہ ۱۴۲۲ھ میں ایک علمی خط لکھا تھا، جس میں بطورِ ڈپازٹ رقم رکھوانے کے جواز کی فقہی تخریج پر ایک شبہ عرض کیا تھا، حضرتِ والا نے جواب میں تحریر فرمایا کہ: ''اس فتویٰ کی کاپی دارالعلوم سے منگوالی جائے، اس میں جہاں تک یاد ہے، مفصل تخریج بیان کی گئی ہے۔'' بندہ نے اس کے بعد فتویٰ کی فوٹو کاپی حاصل کی، فتویٰ حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی مدظلہ کا لکھا ہوا تھا، اور اس پر حضرت مولانا سحبان محمود صاحب قدس سرہٗ کے دستخط تھے، لیکن اس فتویٰ کو دیکھ کر بھی بندہ کا شبہ دُور نہ ہوا، تو بندہ نے دوبارہ حضرتِ والا کی خدمت میں اپنے شبہ کا اعادہ کیا، تو حضرتِ والا نے فرمایا کہ ایک طالب علم کے ذمہ اس کی تحقیق لگائی ہوئی ہے، جب وہ تیار ہوجائے تو لے لیں۔'' چنانچہ اس کے بعد بندہ نے متعدّد مرتبہ دارالافتاء سے رُجوع کیا لیکن اس بارے میں کچھ معلومات نہیں ہو پارہی تھیں، بالآخر کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ فتویٰ تیار ہوگیا ہے، بندہ نے وہ فتویٰ مولانا افتخار بیگ کے توسط سے حاصل کیا، اِس فتویٰ پر حضرتِ والا کی تصدیق ہے۔

پہلے تو بندہ کا خیال یہ تھا کہ شاید حضرتِ والا کے ذہن میں فقہی تخریج کوئی اور ہوگی یا اِس فتویٰ میں بندہ کے شبہ سے تعرض کرکے اس کا جواب دیا گیا ہوگا، لیکن اِس فتویٰ کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں، اس فتویٰ میں وہی تخریج ہے جو مفتی عبدالرؤف صاحب نے لکھی ہے، اور اِس فتویٰ کے بارے میں بندہ کو وہی شبہ ہے جو سابق فتویٰ میں تھا۔

اس لئے بندہ دوبارہ اپنے شبہ کا اعادہ کرنے کی جرأت کر رہا ہے، اُمید ہے کہ اِس مرتبہ حضرتِ والا شفقت فرماتے ہوئے اس شبہ کا اِزالہ فرمائیں گے۔

بطور ڈپازٹ رقم رکھوانے کی فقہی تخریج کا حاصل یہ ہے کہ یہ معاملہ اِجارہ بشرط القرض ہے، اور چونکہ اِس شرط کا عرف عام ہے اس لئے جائز ہے۔

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جس غرض اور مقصد کے تحت یہ رقم دی جاتی ہے اس کے پیشِ نظر اس رقم پر رہن کی تعریف صادق آتی ہے، رہن کی تعریف تنویر الابصار میں ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

"حبس شیء مالی بحق یمکن استیفاؤہ منہ" (ردّ المحتار ج:۶ ص:۴۷۷) اور عقود میں اعتبار معانی کا ہوتا ہے، نیز عرفِ عام میں بھی بندہ کے علم میں کوئی بھی اس رقم کو قرض نہیں سمجھتا ہے بلکہ رہن ہی سمجھا جاتا ہے۔

اور دُوسری طرف رہن کے بارے میں راجح قول یہ ہے کہ رہن سے اِنتفاع جائز نہیں ہے (ردّ المحتار ج:۶ ص:۴۸۲) اور ڈپازٹ کی رقم سے اِنتفاع کیا جاتا ہے۔

دُوسرا شبہ یہ ہے کہ ردّ المحتار ج:۶ ص:۵۰۸ میں اس کی تصریح ہے کہ ثمن کو ابتداءً رہن بنانا صحیح نہیں ہے، حیث قال: "والثمن وان کان دینا لا یصح رھنہ ابتداء لٰکنہ یصح رھنہ بقاء" اس کا تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ بطور ڈپازٹ رقم رکھوانا سرے سے جائز ہی نہ ہو۔

اس لئے حضرتِ والا سے دوبارہ عرض ہے کہ شفقت فرماتے ہوئے اِن شبہات کا اِزالہ فرمادیں۔

حضرتِ والا سے علم و عمل میں ترقی کی دُعاؤں کی درخواست ہے۔ بندہ محمد عامر

خادم جامعۃ الرشید، احسن آباد

۲۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ

جواب:- عزیز مکرّم سلمہٗ اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رہن اگرچہ دراہم و دنانیر کا ہوسکتا ہے (اور ثمن کے دَین کے بارے میں آپ نے جو عبارت لکھی ہے، اس میں غالبًا "وان کان" کی واوٴ غلط ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جب ثمن دَین ہو تو وہ ابتداءً رہن نہیں کی جاسکتی) جیسا کہ تمام متون میں تصریح ہے، مثلاً ہدایہ میں "ویجوز رھن الدراھم والدنانیر" (ج:۴ ص:۵۳۱)۔[1] لیکن ڈپازٹ کی رقم کو رہن اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ رہن بالدرک صحیح نہیں ہوتا، کما فی الھدایۃ وغیرھا والرھن بالدرک باطل، والکفالۃ بالدرک جائزۃ، والفرق ان الرھن للاستیفاء ولا استیفاء قبل الوجوب، واضافۃ التملیک الی زمان فی المستقبل لا تجوز. (ایضاً ج:۴ ص:۵۲۷)۔[2] ڈپازٹ کی رقم اس غرض کے لئے ہوتی ہے کہ جب کرایہ دار مکان خالی

(۱) ج:۴ ص:۵۲۹ (طبع مکتبہ رحمانیہ).

(۲) ج:۴ ص:۵۲۵ (طبع مذکور).

وفی الدّر المختار، کتاب الرّھن، باب ما یجوز ارتھانہ ومالا یجوز ج:۶ ص:۴۹۲ (طبع سعید) ثم لما ذکر ما لا یجوز رھنہ ذکر ما لا یجوز الرّھن بہ فقال ولا بالأمانات کودیعۃ وأمانۃ ولا بالدّرک خوف استحقاق المبیع فالرّھن بہ باطل بخلاف الکفالۃ کما مرّ.

وفی الشامیۃ تحتہ (قولہٗ بخلاف الکفالۃ) ای بالدّرک فانّھا جائزۃ والفرق أنّ الرّھن للاستیفاء ولا استیفاء قبل الوجوب لأنّ ضمان الدّرک ھو الضّمان عند استحقاق المبیع فلا یصحّ مضافًا الیٰ حال وجوب الدَّین لأنّ الاستیفاء معاوضۃ واضافۃ التّملیک الی المستقبل لا تجوز أمّا الکفالۃ فھی للالتزام المطالبۃ لا للالتزام اصل الدّین ولذا لو کفل بما یذوب لہٗ علیٰ فلان یجوز ولو رھن بہ لا یجوز کفایۃ ملخّصًا ....الخ. وکذا فی البحر الرّائق ج:۸ ص:۲۴۴ (طبع سعید). (محمد زبیر حق نواز)

کرے تو اگر اس نے مکان میں کوئی نقصان کر دیا ہو تو اس کا ضمان اس سے لیا جا سکے، یہ ضمان فی الحال واجب نہیں ہوتا محض محتمل ہوتا ہے، لہٰذا اس ڈپازٹ کو رہن نہیں کہہ سکتے، یہ قرض ہی ہے، اور مشروط بحکم العرف ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۲۵/۵/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۳۶/۲۱۸)

رہن کے طور پر حاصل کی ہوئی دُکان کو کرایہ پر دینے کا حکم

سوال:- زید نے اپنی دُکان بکر کے پاس گیارہ سو روپے میں رہن بالقبض رکھ دی، اور یہ طے پایا کہ دُکانِ مذکور کو مرتہن جس کرایہ پر اُٹھادے، تین سال کے اندر راہن خود یہ روپے ادا کرے تو مرتہن دُکان چھوڑ دے گا، مرتہن نے پچاس روپے ماہانہ پر دُکان کرایہ پر اُٹھادی، یہ کرایہ جو تین سال میں اَٹھارہ سو روپے ہے مرتہن کے لئے جائز ہے یا نہیں؟ یا سود ہے؟ یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ اگر راہن نے تین سال کے اندر روپیہ ادا نہ کیا تو رہن بالقبض کی رجسٹری مرتہن کو کرادے گا۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں دُکان کو کرایہ پر اُٹھانے سے رہن باطل ہوگیا، اور کرایہ کی جتنی رقم بکر نے وصول کی ہے وہ ساری کی ساری زید کا حق ہے، بکر کے لئے اس رقم کا اپنے پاس رکھنا سودخوری کے گناہِ عظیم میں مبتلا ہونا ہے۔ ہاں! وہ یہ کرسکتا ہے کہ اپنے قرض کی رقم جو گیارہ سو روپے ہے اپنے پاس رکھ لے اور باقی سات سو روپے مع دُکان کے زید کو واپس کردے۔

فی ردّ المحتار: وأما الإجارة فالمستأجر إن كان هو الراهن فهي باطلة وكانت بمنزلة ما اذا أعار منه أو أودعهُ وان كان هو المرتهن وجدّد القبض للاجارة أو اجنبيًا بمباشرة أحدهما العقد باذن الآخر بطل الرهن والأجرة للراهن وولاية القبض للعاقد ولا يعود رهنا الّا بالاستئناف اهـ (شامی ج:۵ ص:۴۵۲)[1]۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۸۴/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۶ھ

---

(۱) ردّ المحتار، كتاب الرّهن، باب التصرّف في الرّهن والجناية عليه وجنايته ...الخ ج:۶ ص:۵۱۱ (طبع سعيد وفي طبع دار الفكر بيروت ج:۶ ص:۵۱۱).
وفي الهندية، كتاب الرّهن، الباب الثامن في تصرّف الرّاهن أو المرتهن في المرهون ج:۵ ص:۴۶۴ (طبع بلوچستان بک ڈپو) وان آجر المرتهن من اجنبي بأمر الرّاهن يخرج من الرّهن وتكون الأجرة للرّاهن .... الخ.
وكذا في فتح القدير ج:۹ ص:۱۱۷، كتاب الرّهن، وبدائع الصنائع، كتاب الرهن ج:۶ ص:۱۴۶ (طبع سعيد)، والبحر الرّائق، كتاب الرّهن ج:۸ ص:۲۲۲ (طبع سعيد) والعناية شرح الهداية ج:۹ ص:۱۱۷.

مرہون زمین پر کاشتکاری اور اس کی آمدنی سے اپنا قرض وصول کرنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی نے اپنی زمین کسی کے ہاں رہن رکھ دی، مرتہن اس سے نفع حاصل کرتا رہا، اب ایک نیا ایکٹ جو حکومت نے جاری کیا ہے کہ جس آدمی کے ہاں رہن زمین بیس سال تک رہے اس کے بعد بغیر کسی عوض کے زمین راہن کو واپس کردی جاتی ہے، کیا یہ معاملہ دُرست ہے؟

جواب:- مرتہن کے لئے رہن زمین سے نفع اُٹھانا جائز نہیں تھا[1]، اس نے کاشت کے لئے دے کر جتنی آمدنی کمائی وہ راہن کی امانت ہے، اب اگر یہ آمدنی قرض کو پورا کردیتی ہے تو اَب راہن کے ذمے قرض باقی نہیں رہا، اور اگر پورا نہیں کرتی تو جتنا قرض زائد ہے اتنی کا واپس کرنا مرتہن کے ذمے لازم ہے۔[2]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴/۱۲/۱۳۸۷ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۵۵/۱۸ الف)

رہن سے نفع اُٹھانے اور بیس سال بعد زمین واپس راہن کو ملنے کے حکومتی قانون کا حکم

سوال:- (خلاصۂ سوال) یہاں رواج ہے کہ لوگ زمین رہن پر فروخت کردیتے ہیں اور مرتہن مالِ مرہون سے فائدہ بھی اُٹھاتا ہے، اس وقت تک کہ راہن پوری رقم لے کر واپس نہ کردے،

---

(۱) وفی الدّر المختار، کتاب الرّھن ج:۶ ص:۴۸۲ (طبع سعید) لا انتفاع بہ مطلقًا لا باستخدام ولا سکنٰی ولا لبس ولا اجارۃ ولا اعارۃ سواء کان من مرتھن أو راھن (اِلّا باذن) کل للآخر وقیل لا یحلّ للمرتھن لأنّہ ربا.

وفی الشامیۃ تحتہ ..... لا یحلّ لہٗ أن ینتفع بشیء منہ بوجہٍ من الوجوہ وان اذن لہ الرّاھن لأنّہ اذن لہٗ فی الرّبا لأنّہ یستوفی دینہ کاملًا فتبقی لہ المنفعۃ فضلًا فیکون ربا ..... الخ.

وکذا فی حاشیۃ الطحاوی ج:۴ ص:۲۳۴ کتاب الرھن، والبحر الرّائق ج:۸ ص:۲۳۸ کتاب الرّھن، والھدایۃ ج:۴ ص:۵۲۲ کتاب الرّھن (طبع شرکۃ علمیۃ).

کفایت المفتی ج:۸ ص:۱۴۴ (طبع جدید دار الاشاعت) میں ہے: زمین پر مرتہن کو صرف قبضہ کرنا جائز ہے، اس کو کاشت کرنا یا کاشت کے لئے کسی کو دینا جائز نہیں، اور اگر خود کاشت کرے تو اس کا پورا کرایہ راہن کو ادا کرے، یا اس کی رقم میں سے وضع کرے، اور اگر کسی دوسرے کو کاشت کے لئے دی ہے تو اس کا پورا معاوضہ راہن کو دے یا رقم رہن میں سے وضع کرے۔

اب حکومت نے قانون نافذ کیا ہے کہ ایسی رہن زمین اگر بیس سال مرتہن کے پاس رہے تو اس کے بعد رہن زمین بلامعاوضہ راہن کو واپس مل جاتی ہے۔

جواب:- رہن زمین سے نفع اُٹھانا بالکل ناجائز، حرام اور بحکمِ سود ہے، جس کے پاس رہن رکھا گیا ہے اس کے لئے اس رواج کو جس حد تک ممکن ہو روکنا واجب ہے، **لا یحلّ ان ینتفع بشیء منه بوجه من الوجوه وان اذن له الراهن لأنه اذن لهٗ فی الربا لانه یستوفی دینه کاملًا فتبقی له المنفعة فضلًا فیکون ربًا وهٰذا امر عظیم، (شامی جلد خامس)**۔[1]

پھر اگر حکومت کے قانون کی رُو سے بیس سال بعد قرض دار کو بلامعاوضہ زمین واپس مل جائے اور اس عرصے میں زمین کے منافع قرض خواہ اس قدر اُٹھاچکا ہو جو اس کے قرضے کے برابر یا زیادہ ہو تو قرض دار کے لئے اپنی زمین سے فائدہ اُٹھانا بلاشبہ حلال ہے۔ اور مرتہن پر واجب ہے کہ قرض سے زائد انتفاع کا کرایہ راہن کو دے۔[2]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۴/۱۸ الف)

گروی موٹر سائیکل استعمال کر کے اس کا کرایہ قرض میں محسوب کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے ہمارے پاس مبلغ بیس ہزار روپے کے عوض ایک اسکوٹر گروی رکھوائی ہے، اور ہمیں اجازت دی ہے کہ جب تک وہ میری رقم ادا نہ کرے ہم اس کی اسکوٹر اِستعمال کر سکتے ہیں، کیا یہ ہمارے لئے جائز ہے؟

جواب:- جو موٹر سائیکل گروی رکھی گئی ہے، قرض خواہ کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں ہے،[3] البتہ اگر اِستعمال کا کرایہ بازاری نرخ کے مطابق مقرّر کر کے اسے قرض میں محسوب کیا جائے تو جائز ہے۔[4]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۸/۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۰/۲۶۳)

---

(۱) شامیة، کتاب الرّهن ج:۶ ص:۴۸۲ (طبع سعید) نیز دیکھئے ص:۴۲۲ کا حاشیہ۔

(۲) دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

(۳ و ۴) حوالہ جات کے لئے دیکھئے سابقہ ص:۴۲۲ کا حاشیہ۔

۱-قرض کے عوض دُکانیں رہن پر رکھوانے کی مخصوص صورت کا حکم
۲-مرتہن کی اجازت کے بغیر راہن کا گروی دُکانیں فروخت کرنے کا حکم
۳-گروی دُکانوں میں سامان رکھنے سے رہن کا معاملہ ختم نہیں ہوگا

سوال ۱:- گزارش یہ ہے کہ ایک مسئلے کے متعلق فتویٰ تحریر فرمائیں، وہ مسئلہ اس طرح ہے کہ ایک شخص محمد اسلم خان ولد محمد عباس خان نے شبیر احمد ولد عبدالمجید کے مبلغ ۱۱۰۲۰۸۹ روپے دینے ہیں، جس کی تصدیق وہ اپنی تحریر میں کرتا ہے، محمد اسلم خان ولد عباس خان اپنی ملکیتی جائیداد میں سے تین دُکانوں کا قبضہ شبیر احمد ولد عبدالمجید کو دے دیتا ہے، اور بطور ثبوتِ قبضہ کرایہ کی تین رسیدیں اپنی طرف سے دے دیتا ہے، (یہ واضح رہے کہ کرائے کی ادائیگی نہیں کی گئی) اور کہتا ہے کہ میں فلاں تاریخ تک تمہیں رقم ادا کر کے اپنی دُکانیں واپس لے لوں گا۔ اور اگر میں اس تاریخ تک رقم ادا نہ کروں تو آپ دُکانیں فروخت کر کے اپنی رقم وصول کرلیں۔ براہِ کرم فتویٰ تحریر فرمائیں کہ اس معاملے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور شبیر احمد ولد عبدالمجید کو شرعی طور پر کیا حق حاصل ہے؟ عین نوازش ہوگی۔

جزاکم اللہ فی الدارین۔

سوال ۲:- مندرجہ معاملے کے بعد محمد اسلم خان ولد محمد عباس خان فرار ہوگئے، ایک حافظ عبدالرشید سورتی (بقول ان کے اس نے بھی محمد اسلم خان ولد محمد عباس خان سے پانچ لاکھ روپے لینے تھے) نے محمد اسلم خان ولد محمد عباس خان کی ملکیتی جائیداد (مارکیٹ) کے کاغذات حاصل کر کے اپنے ایک دوست کے نام مارکیٹ کی ملکیت منتقل کرادی۔

اسی مارکیٹ میں ایک دُکان کسی دُوسرے شخص کے قبضے میں ۱۴۰،۰۰۰ روپے کے عوض میں تھی، حافظ عبدالرشید سورتی نے یہ رقم ادا کر کے دُکان آزاد کرواکر دُکان اپنے قبضے میں کرلی، اس دُکان کے علاوہ اسی مارکیٹ کی مزید چار دُکانیں حافظ عبدالرشید سورتی کے قبضے میں ہیں، مارکیٹ کی ملکیت منتقل کرانے سے قبل حافظ عبدالرشید سورتی کے علم میں یہ بات تھی کہ تین دُکانیں اسی مارکیٹ میں شبیر احمد ولد عبدالمجید کے پاس بطور رہن ہیں، مارکیٹ کی ان دُکانوں میں شبیر احمد ولد عبدالمجید نے کچھ سامان رکھ دیا تاکہ دُکانیں خالی نہ رہیں اور قبضے کا ثبوت رہے، کسی قسم کا کاروباری معاملہ ہرگز نہیں کیا گیا، اور نہ تجارتی طور پر ان دُکانوں کو استعمال کیا گیا، لیکن حافظ عبدالرشید سورتی نے صرف سامان رکھنے کی وجہ سے ان دُکانوں کے رہن ہونے کا انکار کردیا، بعد ازاں حافظ عبدالرشید سورتی، شبیر احمد ولد عبدالمجید کو مقدمہ بازی کی دھمکی دیتے ہوئے ایک معاہدہ کرالیتا ہے جس میں وہ اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ

دُکانوں کا کرایہ ادا کرے (اور کرایہ وصول کر رہا ہے) اور جس وقت دُکانیں فروخت کی جائیں تو شبیر احمد ولد عبدالمجید، حافظ عبدالرشید سورتی کو دو لاکھ روپے بطور رسید بدلوائی کے ادا کرے، جبکہ یہ دُکانیں شرعی نقطۂ نگاہ سے شبیر احمد ولد عبدالمجید کے پاس رہن ہیں، اس میں چند مندرجہ ذیل باتوں کا شرعی نقطۂ نظر سے فتویٰ تحریر فرمائیں:-

۱- حافظ عبدالرشید کا یہ فعل شرعی نقطۂ نگاہ سے کیسا ہے؟

۲- حافظ عبدالرشید سورتی کے معاہدے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۳- حافظ عبدالرشید سورتی پر شرعاً کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

۴- اس معاملے میں شبیر احمد ولد عبدالمجید کو شرعاً کیا حق حاصل ہے؟ بینوا توجروا۔

جواب:- مندرجہ بالا دونوں سوالوں میں جو واقعات تحریر کئے گئے ہیں، اگر وہ بالکل دُرست ہیں تو دونوں سوالوں کا مشترک جواب یہ ہے کہ محمد اسلم خان نے تقریباً گیارہ لاکھ روپے کے مدیون ہونے کی حیثیت سے شبیر احمد کو اپنی تین دُکانوں کا قبضہ جو یہ کہہ کر دیا کہ اگر میں اس تاریخ تک رقم ادا نہ کروں تو آپ دُکانیں فروخت کر کے اپنی رقم وصول کرلیں، شرعاً اس سے یہ دُکان شبیر احمد کے پاس رہن ہوگئیں (للعبارة الأولىٰ) اور بطور ثبوتِ قبضہ کرائے کی جو تین رسیدیں دی گئیں ان سے اس معاملے کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اور یہ رہن ہی شمار ہوگا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ شبیر احمد کی طرف سے نہ کرایہ ادا کیا گیا، نہ محمد اسلم خان کی طرف سے اس کا مطالبہ ہوا، اور نہ کرائے کو اَصل قرض میں محسوب کرنے کا کوئی معاہدہ طے پایا۔ اب جبکہ یہ دُکان رہن ہوگئیں تو مرتہن یعنی شبیر احمد کی اجازت کے بغیر ان دُکانوں کا بیچنا محمد اسلم خان کے لئے جائز نہیں تھا، اب اس نے حافظ عبدالرشید سورتی کو اپنی مارکیٹ کی جو بیع کی وہ ان دُکانوں کی حد تک مرتہن یعنی شبیر احمد کی اجازت پر موقوف رہی، (للعبارة الثانية)۔

اگر شبیر احمد نے اس بیع کی اجازت دے دی ہوتی، خواہ صریحاً یا ضمناً تو یہ بیع دُرست ہوجاتی، لیکن سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ شبیر احمد نے اس بیع کی اجازت نہیں دی، اس کے بعد شبیر احمد نے حافظ عبدالرشید سورتی کے ساتھ کرایہ داری کا جو معاہدہ کیا، اگر وہ کسی زور زبردستی کے بغیر اور مکمل رضامندی کے ساتھ ہوتا تب بھی اس معاہدے کو بیع کی ضمنی اجازت قرار دیا جاسکتا تھا، اور اس کی وجہ سے یہ دُکانیں رہن سے نکل جاتیں، اور ان میں کرایہ داری کا معاملہ دُرست ہوجاتا (للعبارة الثالثة)۔

لیکن سوال میں جو صورتِ حال بیان کی گئی ہے اور جس کی وضاحت سائل نے زبانی بھی کی وہ یہ ہے کہ کرایہ داری کا یہ معاہدہ برضا و رغبت نہیں ہوا، بلکہ شبیر احمد کی طرف سے یہ معاہدہ اس دباؤ

کے تحت کیا گیا کہ اگر یہ معاہدہ نہ کیا جاتا تو دُکانیں جو اس کے پاس رہن تھیں اس کے قبضے سے نکل جاتیں اور قانونی طور پر اس کے لئے اپنا قبضہ برقرار رکھنا ممکن نہ تھا، کیونکہ اس کو مقدمہ بازی کی بھی دھمکی دی گئی تھی۔ لہٰذا اگر صورتِ حال یہی ہے جو سوال میں بیان کی گئی ہے، تو یہ کرایہ داری کا معاہدہ بھی شرعاً دُرست نہیں ہوا (للعبارة الرابعة)۔ اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ شبیر احمد نے قبضے کے ثبوت کے طور پر دُکانوں میں کچھ سامان رکھ دیا، سو اس سے اس کے رہن ہونے کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اوّل تو یہ سامان سائل کی تصریح کے مطابق صرف قبضے کے ثبوت کے لئے رکھا گیا، دُکانوں کے باقاعدہ استعمال کے لئے نہیں۔

دُوسرے اگر مرتہن شیٔ مرہون سے کوئی فائدہ بھی اُٹھائے تو یہ فائدہ اُٹھانا اس کے لئے شرعاً ناجائز ضرور ہے لیکن شیٔ مرہون کے رہن ہونے کی حیثیت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اور اس سے رہن باطل نہیں ہوتا۔ لہٰذا بصورتِ صحتِ واقعاتِ مندرجہ سوال یہ تینوں دُکانیں اب بھی شبیر احمد کے پاس بطورِ رہن ہیں، اور اس کے ذمے حافظ عبدالرشید سورتی کو کرایہ دینا شرعاً واجب نہیں۔ ان اَحکام کی دلیل کے لئے عباراتِ فقہیہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- العبارة الأولیٰ:- وأمّا رکن عقد الرّهن فهو الایجاب والقبول وهو أن یقول الراهن رهنتک هٰذا الشیء بمالک علیّ من الدَّین أو یقول هذا الشیء رهن بدَینک وما یجری هذا المجریٰ ویقول المرتهن: ارتهنت أو قبلت أو رضیت وما یجری مجراهُ فامّا لفظة الرهن فلیست بشرطٍ حتّی لو اشتریٰ شیئًا بدراهم فدفع الی البائع ثوبًا وقال له: أمسک هٰذا الثوب حتّی أعطیک الثمن، فالثوب رهن لأنه أتی بمعنی العقد والعبرة فی باب العقود للمعانی کذا فی البدائع. (عالمگیریة ج:۵ ص:۴۳۲)[۱]۔

۲- العبارة الثانیة:- توقف بیع الراهن رهنه علیٰ اجازة مرتهنه أو قضاء دینهٖ فان وجد أحدهما نفذ وصار ثمنه رهنًا فی صورة الاجازة ...الخ. (الدر المختار ج:۶ ص:۵۰۶)[۲]

۳- العبارة الثالثة:- وکذٰلک لو استأجره المرتهن صحّت الاجارة وبطل الرّهن اذا جدّد القبض للاجارة. (شرح المجلّة ج:۳ ص:۱۹۱)[۳]۔

۴- وفی الدر:- أو حبس أو قیدٍ مدیدین بخلاف حبس یوم أو قیدهٖ أو ضربٍ غیر

---

(۱) عالمگیریة، کتاب الرّهن ج:۵ ص:۴۳۱ (طبع رشیدیه کوئٹه)۔
(۲) الدّر المختار ج:۶ ص:۵۰۸ (طبع سعید)
وفی شرح المجلّة للأتاسیّ رقم المادّة:۷۴۷ ص:۱۸۹ (طبع مکتبه حبیبیه) لو باع الراهن الرهن بدون رضی المرتهن لا ینفذ البیع ...الخ.
وکذا فی الهندیة ج:۵ ص:۴۶۲ الباب الثامن، وکذا فی الهدایة ج:۴ ص:۵۳۷ (طبع مکتبه رحمانیه) کتاب الرّهن (طبع شرکة علمیه)۔
(۳) طبع مکتبة حبیبیه کوئٹه۔

شدید الا لذی جاه (درر) حتی باع أو اشتری أو أقرّ أو آجر فسخ ما عقد ولا یبطل حق الفسخ بموت أحدهما (الیٰ) أو أمضیٰ لأن الاکراه والملجئ وغیر الملجئ یعدمان الرضاء والرضاء شرط لصحّة هذه العقود وکذا لصحّة الاقرار فلذا صار له حق الفسخ والامضاء. (ج:٦ ص:١٣٠).(1)

وفی الدر:- وهل الاکراه بأخذ المال معتبر شرعًا ظاهر القنیة نعم وفی الوهبانیة إن یقل المدیون انی مرافع، لتبری فالاکراه معنی مصور (قولهٗ ظاهر القنیة نعم) وعبارتها ف ع متغلب قال لرجلٍ: امّا ان تبیعنی هٰذه الدار أو أدفعها الیٰ خصمک، فباعها منه، فهو بیع مکره، ان غلب علیٰ ظنّه تحقیق ما أوعده. قال رضی الله عنه: فهٰذه اشارة الیٰ أن الاکراه بأخذ المال اکراه شرعًا (شامی) قوله (انی مرافع) أی مرافعک للحاکم أی وکان ظالمًا یؤذی بمجرّد الشکایة کما فی القنیة. (شامی ج:٦ ص:١٣٢، مطبوعه ایچ ایم سعید).

واللہ سبحانہ اعلم
۱/۱۱/۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۴۷۴/۴۱ و)

(وضاحت)

مذکورہ فتویٰ کے بعد تنازعہ کے ایک فریق کی طرف سے دوبارہ ایک سوال مرتب کیا گیا جس کا حضرتِ والا دامت برکاتہم نے جواب تحریر فرمایا، وہ سوال اور جواب درج ذیل ہیں۔ (محمد زبیر)

حقِ کرایہ داری اور پگڑی کو رہن کے طور پر رکھنے کی ایک مخصوص صورت اور اس کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے میں کہ محمد اسلم خان نے پانچ لاکھ روپے قرض لے کر اس کے بدلے میں چیک دیا اور یہ کہا کہ اگر یہ چیک کیش نہ ہوگا تو میں اپنی بیوی کو طلاق پر حلف اُٹھاتا ہوں، اور وقتِ مقررہ پر چیک کو بینک میں نہیں ڈالنے دیا کہ میرا گھر برباد ہوجائے گا، اس طرح چار ماہ گزر گئے، آخر میں پتہ چلا کہ وہ بہت مقروض ہے اور کراچی چھوڑ کر جاچکا ہے، اس کے والد صاحب اور بھائیوں کی خوشامد کر کے ان کو واپس بلوالیا، محمد اسلم کے آنے پر پتہ چلا کہ ان کے ذمے ۹۰ لاکھ کا قرضہ ہے، ہم نے پیسے کا مطالبہ کیا تو اس نے کہا کہ میرے پاس ایک مارکیٹ ہے، اس میں متعدّد دُکانیں ہیں، اس میں سے چار عدد دُکانیں میں اپنے قرض خواہوں کو ان کے روپے کے بدلے میں دے چکا ہوں حقوقِ کرایہ داری کے ساتھ، اب میرے پاس پوری مارکیٹ کی ملکیت اور پانچ دُکانیں خالی ہیں، وہ آپ مجھ سے لے لیں، اور مجھ کو مزید تین لاکھ دے دیں تاکہ میں

(۱) طبع سعید.

ایک دُکان خالی کراسکوں، جس پر ایک قرض خواہ قابض ہے، اور چار دُکانیں میں نے مروّجہ طور پر یعنی پگڑی پر قرض خواہوں کو دے دی ہیں، اور کرایہ داری کی رسید بھی بنادی ہے، مارکیٹ کے حقوقِ ملکیت آپ کی طرف منتقل کرنے میں یہ شرط ہوگی کہ آپ ان کے حقوقِ کرایہ داری تسلیم کریں، تاکہ میری عزّت خراب نہ ہو، اور بعد میں باقاعدہ اس کی رسید جاری کریں، اس پر ان کے سالے فیروز صاحب نے یہ شرط رکھی۔ ہم نے ان کی یہ شرط منظور کرلی اور مزید پیسہ دے کر پوری مارکیٹ کے حقوقِ ملکیت اور پانچ خالی دُکانیں اپنے نام پر منتقل کرالیں، اور باقاعدہ رجسٹری بھی کرالی، مارکیٹ کی ملکیت اسلم صاحب کی بیوی کے نام تھی، اسلم صاحب کی بیوی نے اپنے بھائی اور سسر صاحب کے ساتھ کورٹ میں جاکر ہمارے نام منتقل کردی اور ہمیں قبضہ دیا، اور ہم نے اپنے ایک ساتھی کے نام کروالی۔

کچھ عرصے کے بعد مولوی منیر صاحب تین دُکانوں کی رسید اور ایک پرچہ اسلم صاحب کا لے کر آئے کہ یہ تین دُکانیں ہمارے پاس رہن ہیں، ہم نے کہا کہ مارکیٹ رجسٹری کرانے سے پہلے اسلم صاحب نے ہم سے کہا تھا کہ یہ تین دُکانیں منیر صاحب کو دے دی ہیں، تم ان کے نام تین پکی رسید جاری کردینا، اور رسید جاری کرنے کے لئے مزید پیسے کا مطالبہ نہ کرنا، ورنہ میری عزّت خراب ہوگی، تاہم اس کو تسلیم کرتے ہوئے مولوی منیر صاحب نے کہا کہ ہم آپ کی کرایہ کی رسید بنانے کے لئے تیار ہیں، ہم اس کو رہن تسلیم نہیں کرتے، اس لئے کہ اسلم صاحب نے آپ کی کرایہ داری تسلیم کرکے رسید بنانے کے لئے کہا ہے، ورنہ ہمارے نام محمد اسلم خان پوری مارکیٹ رجسٹری نہ کرتا، منیر صاحب نے جو پرچہ اسلم خان کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیا ہے اسی طرز کا اسلم خان کے ہاتھ کا ایک اور پرچہ بنام محمد اقبال صاحب جس میں یہی مضمون ہے کہ اگر میں نے اس کے پیسے ادا نہ کئے تو یوسف مارکیٹ کی دو دُکانیں نمبر ۶ اور نمبر ۷ کو فروخت کرکے اپنے پیسے وصول کرلیں، جبکہ وہ مارکیٹ اسلم خان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ مروّجہ پگڑی کا مالک تھا، اور اسلم خان کے نام کرایہ کی رسید تھی جو کہ بعد میں ان کی بیوی اور سالے نے افضل صاحب کے نام پر رسیدیں منتقل کروادیں۔

منیر صاحب سے ہم نے کہا کہ پرچہ دِکھانے کی ضرورت نہیں، ہماری اطلاع میں پہلے ہی یہ بات ہے کہ اسلم خان نے یہ تین دُکانیں آپ کو دی ہیں، اور ہم سے بھی یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم آپ کے قبضے کو تسلیم کریں اور رسیدیں بنادیں، ہم رسید بنانے کو تیار ہیں، جس پر ان کا اصرار تھا کہ جب تک ہم کسی اور کو فروخت نہ کریں ہم سے کرایہ نہ لیا جائے، ہم نے کہا کہ یہ نہیں ہوسکتا، کرایہ تو دینا پڑے گا، آئندہ آپ کسی کو بیچیں گے تو ہم رسید کٹوائی لیں گے، جس پر یہ ناراض ہوئے کہ چلو کسی مفتی کے پاس، ہمارے ساتھی نے کہا کہ ہم کو کسی مفتی کے پاس جانے کی جلدی نہیں، انہوں نے کہا: اس طرح ہم ڈیفالٹر ہوجائیں گے، تو ہم نے کہا کہ آپ کورٹ میں پیسہ جمع کرادیں، اس طرح ڈیفالٹر نہ ہوں گے۔

ہم نے ان کو کوئی دھمکی نہیں دی، جس پر یہ بعد میں مفتی اکمل صاحب کے پاس ہمیں لے گئے اور ان کے سامنے مروّجہ طور پر ایک فیصلہ طے پایا جو بعد میں لکھ لیا گیا۔

جہاں تک اِستفتاء میں یہ بات کہی گئی ہے کہ کرایہ کی رسید لی تھی اور محمد اسلم خان کو کرایہ نہیں دیا تھا، تو انہوں نے ہم سے بھی کرایہ کی رسید کے وقت یہ بات کہی تھی کہ ہم کرایہ نہیں دیں گے، جس کے ہاتھ پر ہم بیچیں گے آپ اس سے کرایہ لیجئے گا، تو ہم نے ان کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا تھا اور کہا تھا کہ کرایہ دینا پڑے گا۔

اور ہم اس بات پر حلف اُٹھا سکتے ہیں کہ کرایہ داری کی رسید کے لئے ہم نے ان پر کوئی زور زبردستی نہیں کی، بلکہ جب انہوں نے کہا کہ ہم ڈیفالٹر ہوجائیں گے، تو ہم نے کہا تھا کہ اس سے بچنے کے لئے آپ عدالت میں کرایہ جمع کرادیں تا کہ آپ کا حقِ قبضہ باقی رہے۔ فقط عبدالرشید عفا اللہ عنہ

تنقیحات

مندرجہ ذیل سوالات کا جواب اسی کاغذ کے ساتھ لکھ کر بھیجیں، اِن شاء اللہ اس کے بعد جواب دیا جائے گا:-

۱:- سوال کے پہلے صفحے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مارکیٹ اور اس کی تمام دُکانیں محمد اسلم کی ملکیت تھیں، جن میں سے پوری مارکیٹ کی حقیقی ملکیت اس نے آپ کے نام منتقل کی، اور پانچ خالی دُکانیں قبضہ سمیت دیں۔ لیکن دُوسرے صفحے پر لکھا ہے کہ ''وہ مارکیٹ اسلم خان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ مروّجہ پگڑی کا مالک تھا'' ان دونوں باتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، صحیح صورت کیا ہے؟ محمد اسلم مارکیٹ کا مالک تھا یا نہیں؟ اور اس نے آپ کو مارکیٹ مالکانہ طور پر فروخت کی؟ یا اس مارکیٹ میں صرف پگڑی لینے کا حق فروخت کیا؟ دُوسری صورت میں اس کا اصل مالک کوئی اور ہے یا نہیں؟

۲:- جب آپ نے محمد اسلم سے مارکیٹ خریدی تو کیا آپ کو معلوم تھا کہ تین دُکانیں مولوی محمد منیر صاحب کے پاس رہن ہیں؟

۳:- مفتی محمد اکمل صاحب کی موجودگی میں جو فیصلہ طے پایا تھا، اس کی نقل ارسال فرمائیں۔

۴:- یہ فیصلہ جو ''مفتی محمد اکمل صاحب'' کی موجودگی میں ہوا، اس میں مولوی محمد منیر نے کیا اپنے آپ کو بحیثیت کرایہ دار واقعۃً تسلیم کیا تھا؟ یا یہ بات واضح تھی کہ وہ اپنے آپ کو کرایہ دار تسلیم نہیں کرتے، بلکہ بحیثیت مرتہن دُکانوں پر قبضہ برقرار رکھنے کے لئے قانونی مجبوری کے تحت کرایہ داری لکھ رہے ہیں؟

۵:- کیا جب سے آپ نے محمد اسلم سے مارکیٹ خریدی اس وقت کے بعد کسی وقت مولوی محمد منیر صاحب نے اس بیع کی اجازت دی؟ یا آپ کو پوری مارکیٹ کا مالک تسلیم کیا؟ یا کوئی ایسا کام کیا

جس سے آپ کے مالک ہونے کا اعتراف لازم آتا ہو؟

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۱۱/۶/۱۱ھ

جوابِ تنقیحات

۱:- یہ دو مختلف مارکیٹیں ہیں، جن میں سے پہلی مارکیٹ کی مالک محمد اسلم کی اہلیہ تھی اور اسی مارکیٹ کا معاملہ ہمارے ساتھ ہے، اور دُوسری مارکیٹ یوسف مارکیٹ ہے جس میں دو دُکانیں مرّوجہ پگڑی پر محمد اسلم نے خریدی ہوئی تھیں اور محمد اسلم نے ان دو دُکانوں کے بارے میں بھی تقریباً وہی مضمون محمد اقبال کو لکھ کر دیا ہوا ہے، جو پہلی مارکیٹ میں مولوی منیر صاحب کو لکھ کر دیا تھا، یعنی اگر فلاں وقت تک رقم ادا نہ ہو تو دُکانیں فروخت کر کے رقم وصول کرلیں۔ محمد اقبال اور محمد اسلم کے پاس معاہدے کی فوٹو کاپی ساتھ میں منسلک ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں کو حقِ قبضہ (مرّوجہ پگڑی) اور کرایہ داری دیا جارہا ہے، اسی لئے اس نے کرایہ داری کی رسید مولوی منیر صاحب کو جاری کی تاکہ کوئی ان کے کرایہ داری کے حق کو سلب نہ کرسکے اور قبضہ واپس نہ لے سکے۔

۲:- جب مارکیٹ ہمارے نام منتقل ہوئی اس وقت محمد اسلم نے ہم سے کہا تھا کہ تین دُکانیں مولوی منیر صاحب کو دے کر کرایہ کی رسید جاری کردی جائے، جب وہ کسی کو بیچیں تو کرایہ کی رسید بدل دینا، اس کا ذکر ہم اِستفتاء میں کرچکے ہیں۔

۳:- مفتی اکمل صاحب کی موجودگی میں جو فیصلہ ہوا اس کی نقل حاضرِ خدمت ہے۔

۴:- مولوی منیر صاحب نے ہمارے پاس آکر سب سے پہلے تین باتیں کی، اوّل یہ ہے کہ آپ کے علم میں ہے کہ تین دُکانیں اسلم صاحب نے ہمیں کرایہ کی رسیدیں دے کر قبضہ دیا ہوا ہے، تاکہ ہم اس کو بیچیں اور اپنی رقم وصول کرلیں۔ (دُوسری بات) اب آپ رسیدیں دیں اور کرایہ نہ لیں جس کو ہم بیچیں کرایہ آپ اسی سے لیں، اور ہم نے اسلم صاحب سے بھی رسیدیں لے کر کرایہ نہیں دیا تھا۔ (تیسری بات) جب ہم فروخت کریں تو رسید بدلوائی بھی نہیں دیں گے، وہ لینے والا آئندہ آپ اس سے رسید بدلوائی لے سکتے ہیں۔

ہم نے اس کو قبول نہیں کیا، اور تینوں دُکانوں کے کرایہ کا مطالبہ کیا اور رسید بدلوائی کے ۵ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا کہ جب آپ بیچیں گے تو ہم آپ سے پانچ لاکھ روپیہ لیں گے، اس پر وہ اور ہم جناب مفتی اکمل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں ان کی موجودگی میں جو طے ہوا اس کی نقل موجود ہے کہ تینوں دُکانوں کا کرایہ گیارہ سو روپے ماہانہ اور فروخت کرکے دو لاکھ روپیہ ہم کو دیں گے، یہ بات طے ہوئی اس فیصلے کی نقل منسلک ہے۔

۵:- مندرجہ بالا باتیں جو ہم سے مولوی منیر صاحب نے کی تھیں وہ ہم کو مالک تسلیم کر کے ہی کی تھیں، اور ہم نے سارے کاغذات ان کو دکھا دیئے تھے، اور یہ ہم کو کرایہ دیتے رہے مسلسل چھ ماہ تک اس درمیان ہم سے کوئی بات نہیں ہوئی، چھ ماہ بعد نیا استفتاء مرتب کر کے فتویٰ لیا اور نئی چیز کھڑی کر دی اس دوران ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ فقط عبدالرشید عفا اللہ عنہ ۱۹۹۰-۱۲-۳۰

مزید تفصیل جواب نمبرا: محمد اسلم نے جو تحریر مولوی منیر صاحب کو دی ہے اس تحریر کی بنیاد پر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ یکم اکتوبر تک ادائیگی کہی تھی، ورنہ فروخت کا اختیار دیا تھا اور کرایہ داری کی رسید دے کر یہ بات ثابت کی کہ حقِ کرایہ داری فروخت کرسکتا ہے، گویا کہ حقِ کرایہ داری (مروّجہ پگڑی) کو رہن رکھوایا، اگر ملکیت رہن رکھی ہوئی ہوتی تو قاعدے کے حساب سے جائیداد کے کاغذات رکھوائے جاتے ہیں اور بیچنے کا اختیار دیا جاتا ہے، یہاں کرایہ داری کی رسید جاری کی یعنی وہ پگڑی پر بیچ سکتا ہے، اس لئے کہ مولوی منیر اور محمد اقبال دونوں کو جو تحریر دی ہے وہ ایک جیسی ہے، اور دونوں کو فروخت کی اجازت دی ہے اور حقِ کرایہ داری۔ فقط عبدالرشید عفا اللہ عنہ

جواب:- اس قضیہ سے متعلق ہمارے پاس اس سے پہلے شبیر احمد صاحب کی طرف سے ایک اِستفتاء آچکا ہے، کیونکہ اس قسم کے معاملات میں فریقین کے بیانات عموماً متضاد ہوتے ہیں جن سے مسئلے کے شرعی حکم پر فرق پڑ جاتا ہے، اس لئے اُن کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے فریقِ مخالف یعنی حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے ساتھ مل کر ایک متفقہ اِستفتاء مرتب کریں تاکہ صورتِ مسئلہ دونوں کے اتفاق سے سامنے آنے کے بعد جواب دونوں کے لئے واجب التسلیم ہو، لیکن انہوں نے متفقہ سوال کے مرتب ہونے کے اِمکان کی نفی کرتے ہوئے اپنے سوال کا جواب طلب کیا۔ مفتی کا کام چونکہ واقعات کی تحقیق نہیں ہے، بلکہ وہ سوال کی صورت کے مطابق جواب دینے کا پابند ہے، چنانچہ سوال کی جو نوعیت اُس وقت تحریری طور پر بیان کی گئی اُس وقت اُس کے مطابق جواب دے دیا گیا، جو مؤرخہ ۲۸/۱۰/۱۴۱۰ھ کو ہمارے دارالافتاء سے جاری ہوا۔ اُس کے تقریباً آٹھ مہینے کے بعد حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کی طرف سے یہ اِستفتاء موصول ہوا، اُن کو بھی یہی مشورہ دیا گیا کہ صورتِ سوال متفقہ طور پر فریقین کی طرف سے بطورِ اِستفتاء پیش کی جائے تو قضیہ کے حل میں سہولت ہوگی۔ لیکن انہوں نے بھی اس سے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے اپنے سوال کا جواب طلب کیا۔ اور اس اِستفتاء کو جوابِ تنقیحات کے ساتھ غور سے پڑھنے کے بعد یہ بات واضح ہوئی کہ اس سوال میں صورتِ مسئلہ اُس صورتِ مسئلہ سے مختلف ہے جو شبیر احمد صاحب کے اِستفتاء میں بیان کی گئی تھی، دُوسرے متعدّد اختلافات کے علاوہ دونوں سوالات میں دو بنیادی فرق موجود ہیں، جن کی وجہ سے مسئلے کے شرعی حکم پر

بہت فرق پڑتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ شبیر احمد صاحب کے استفتاء میں یہ بات ظاہر تھی کہ محمد اسلم نے مولوی منیر احمد صاحب کو دُکانیں رہن کے طور پر دی تھیں، صرف اُن کا حقِ کرایہ داری رہن نہیں رکھا تھا، جبکہ حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے حالیہ اِستفتاء میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ محمد اسلم نے دُکانیں نہیں بلکہ اُن کا صرف حقِ کرایہ داری مولوی منیر احمد صاحب کے پاس رہن رکھا تھا۔

اور دُوسرا فرق یہ ہے کہ شبیر احمد صاحب کے اِستفتاء کے مطابق مفتی محمد اَکمل صاحب کی موجودگی میں حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے لئے کرایہ داری کی جو تحریر لکھی گئی تھی وہ محض قانونی مجبوری اور دباؤ کے تحت لکھی گئی، برضا و رغبت نہیں، جبکہ حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے حالیہ استفتاء میں زور زبردستی یا کسی قسم کے دباؤ کی نفی کی گئی ہے۔

اب حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے حالیہ استفتاء میں یہ کہا گیا ہے کہ محمد اسلم نے مولوی منیر احمد صاحب کو دُکانیں رہن نہیں رکھی تھیں بلکہ صرف اُن کا حقِ کرایہ داری رہن رکھا تھا، اور جب اُس نے یہ کہا تھا کہ اگر وہ یکم اکتوبر تک ادائیگی نہ کرے تو مولوی منیر احمد صاحب کو یہ دُکانیں فروخت کرنے کا اختیار ہوگا، تو اس سے مراد دُکانوں کی حقِ ملکیت کی فروختگی نہیں بلکہ حقِ کرایہ داری کی فروختگی مراد تھی (جس کو عرفِ عام میں پگڑی کہتے ہیں) اگرچہ جو الفاظ محمد اسلم کی تحریر میں موجود ہیں اُن سے اس صورتِ حال پر دلالت نہیں ہوتی (اور محض یہ بات کہ یہی الفاظ محمد اقبال کے لئے لکھی گئی تحریر میں بھی موجود ہیں، جن کا مقصد پگڑی کا رہن ہے، اس بات کے لئے کافی نہیں کہ مولوی منیر احمد صاحب کی تحریر میں بھی اُن کے وہی معنی لئے جائیں، کیونکہ اوّل الذکر دُکانوں میں محمد اسلم صرف حقِ کرایہ داری کا مالک تھا، اور ثانی الذکر میں حقِ ملکیت اُس کا تھا) لیکن کاروباری عرف کے لحاظ سے اُن الفاظ میں پگڑی کے تصوّر کا احتمال ضرور موجود ہے، اور اگر مولوی منیر احمد صاحب اور محمد اسلم کے درمیان یہ بات باہم طے شدہ تھی کہ مولوی منیر احمد صاحب کو صرف حقِ کرایہ داری دیا جارہا ہے، اور مولوی منیر احمد صاحب نے یہی سمجھ کر اُن دُکانوں کا قبضہ لیا تھا تو بے شک یہی سمجھا جائے گا کہ محمد اسلم نے صرف حقِ کرایہ داری ان کی طرف منتقل کیا تھا، اور سوال سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات مولوی منیر احمد صاحب پر اچھی طرح واضح تھی، جس کی دلیل یہ ہے کہ جوابِ تنقیح نمبر۴ کے مطابق مولوی منیر صاحب نے حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے پاس آکر جو تین باتیں کہیں ان میں سے دُوسری بات یہ تھی کہ: ''جس کو ہم بیچیں، کرایہ آپ اُسی سے لیں'' ان الفاظ سے واضح ہے کہ خود اُن کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ جو کچھ فروخت کریں گے وہ حقِ کرایہ داری ہوگا، کیونکہ حقِ ملکیت بکنے کی صورت میں

حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے خریدار سے کرایہ لینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

لہٰذا اگر یہ بات دُرست ہے کہ محمد اسلم نے مولوی منیر صاحب کو محض حقِ کرایہ داری کا قبضہ دیا تھا اور یہ بات مولوی منیر صاحب پر بھی واضح تھی اور انہوں نے حافظ عبدالرشید سورتی صاحب سے وہ بات کہی تھی کہ: ''ہم جس کو بیچیں، کرایہ آپ اُسی سے لیں'' تو شرعی حکم یہ ہے کہ یہ رہن دُرست نہیں ہوا، کیونکہ محض حقِ کرایہ داری یا پگڑی کا حق شرعاً نہ قابلِ فروخت ہے، نہ اس کو رہن رکھا جاسکتا ہے، اور پگڑی یا محض رسید بدلوانے کے اُوپر کسی رقم کا لین دین بھی شرعاً جائز نہیں ہے، اور جب یہ رہن صحیح نہیں ہوا تو مولوی منیر صاحب کا دَین بدستور محمد اسلم کے ذمے واجب ہے، اور دُکانوں کی ملکیت چونکہ عقدِ بیع کے ذریعہ حافظ عبدالرشید صاحب سورتی کی طرف منتقل ہوچکی ہے، لہٰذا وہ دُکانیں اُن کی ملکیت ہیں اور مولوی منیر صاحب کے ذمہ دُکانوں کا کرایہ واجب ہوگا۔

اور مذکورہ بالا تفصیل کے بعد دُوسری بات (یعنی کرایہ داری کی تحریر کے جبری یا رضامندی کے ساتھ ہونے کے مسئلے) پر بحث کی ضرورت نہیں رہتی، کیونکہ اس مسئلے کا تعلق اس صورت سے ہے جب دُکانوں کا حقِ کرایہ داری نہیں بلکہ دُکانیں رہن رکھی گئی ہوتیں، اور اس اِستفتاء کی بنیاد چونکہ پہلی صورت پر ہے اس لئے اب اس بحث میں پڑنا غیرضروری ہے۔

اور یہ بات ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مروّجہ پگڑی اور رسید بدلوانے پر رقم وصول کرنا شرعاً ہرگز جائز نہیں ہے، اور فریقین کو اس قسم کے معاملات سے مکمل پرہیز کرنا ضروری ہے۔

في الهندية (ج:۵ ص:۴۳۵)[1]: **ما يجوز بيعه يجوز رهنه وما لا يجوز بيعه لا يجوز رهنه.**

وفي الدرّ عن الأشباه: لا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجرّدة .... الخ. (جلد:۴ ص:۵۱۸)[2].

وفي الشامية ناقلًا عن البدائع: الحقوق المفردة لا تحتمل التّمليك ولا يجوز الصّلح عنها. اهـ.

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۱۱/۷/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۴۸/۲)

---

(۱) (طبع رشيديه كوئٹه) وفي الدّر المختار، كتاب الرّهن ج:۶ ص:۴۹۰ (طبع سعيد) وفي الأشباه ما قبل البيع قبل الرّهن، وفي الشامية تحته قوله ما قبل البيع قبل الرّهن أي كل ما يصحّ بيعه صحّ رهنه.
وكذا في شرح مجلّة الأحكام المادّة:۲ ج:۱ ص:۱۲۱، وراجع أيضًا: "فقهي مقالات" ج:۱ ص:۱۵۹ بيع حقوق المجرّدة.

(۲) (طبع ايچ ايم سعيد).

مرابحہ، اِجارہ یا مشارکہ کی تمویل میں رہن طلب کرنے کا حکم

سوال:- محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ مع الخیر ہیں، اُمید کہ آنجناب کے مزاج بخیر ہوں گے۔

یہاں چینائی میں چند مخیّر حضرات نے مل کر اپنے ایک دیرینہ خواب ''بلاسودی مالیات'' (Interest Free Financing) پر چند مہینوں سے کوشش شروع کی تھیں، ان شاء اللہ بہت جلد وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والا ہے۔ اسی سلسلے میں مندرجہ ذیل ایک مسئلے پر علماء کی رائے مطلوب ہے۔

کیا کسی بزنس یا پروجیکٹ کے لئے مالیات کی فراہمی کے لئے کسی بھی قسم کا رہن کا طلب کرنا ممنوع ہے؟ اس سلسلے میں یہ بات یہاں واضح ہو کہ اسلامی بینک قائم کرنے کی کئی کوششیں ہندوستان میں کی گئیں، مگر اکثر ناکام رہیں، جس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ رقم لینے کے بعد کسی قسم کی پابندی/ ذمہ داری کی غیرحاضری پر رقم لینے والے کو رقم لوٹانے کی فکر نہیں رہتی یا پروا نہیں رہتی۔

اگر یہ ممنوع ہے تو دی گئی پونجی کی حفاظت کی اور کیا صورت ہوسکتی ہے؟ اس معاملے پر تفصیلی روشنی ڈالیں تو بڑی نوازش ہوگی۔

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رہن طلب کرنے کا جائز یا ناجائز ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ مالیات کی فراہمی کس بنیاد پر کی جارہی ہے؟ اگر مرابحہ کی بنیاد پر ہے تو چونکہ وہ ایک بیع ہے جس کی قیمت مستقبل میں واجب الاداء ہونے کی وجہ سے خریدار کے ذمے دَین بن چکی ہے،[1] اس لئے گاہک سے رہن طلب کرنا بالکل جائز ہے۔[2] اسی طرح اگر تمویل اِجارہ کی بنیاد پر ہے تب بھی اُجرت کی توثیق کے لئے رہن طلب کرنا جائز ہے۔ لما فی البحر: "ولا یلزم علینا صحۃ الإبراء عن الأجرۃ والکفالۃ والرھن بھا لأنا

(۱ و ۲) وفی الدر المختار، کتاب الرھن ج:۶ ص:۴۷۷، ۴۷۸ (طبع سعید) ھو حبس شیء مالیء بحقٍ یمکن استیفاءہ ای أخذہٗ منہٗ کلًا أو بعضًا کان قیمۃ المرھون أقل من الدَّین (کالدَّین) کاف الاستقصاء لأنّ العین لا یمکن استیفاؤھا من الرّھن الّا اذا صار دینا حکمًا کما سیجیء حقیقۃ وھو دین واجب ظاھرًا وباطنًا أو ظاھرًا فقط کثمن عبد .... او حکمًا کالأعیان المضمونۃ بالمثل أو القیمۃ ...الخ.

وفی الھدایۃ، کتابُ الرّھن ج:۴ ص:۵۱۸ (طبع مکتبہ رحمانیہ) ولا یصح الرّھن الّا بدین مضمون لأن حکمہ ثبوت ید الاستیفاء والاستیفاء یتلو الوجوب.

وفی الدر المختار ج:۶ ص:۴۹۷ (طبع سعید) باع عبدًا علٰی أن یرھن المشتری بالثمن شیئًا بعینہ أو یعطی کفیلًا کذٰلک بعینہٖ صحّ ولا یجبر المشتری علی الوفاء لما مرّ انہٗ غیر لازم وللبائع فسخہٗ لفوات الوصف المرغوب الّا أن یدفع المشتری الثمن حالًا أو یدفع قیمۃ الرّھن المشروط رھنا لحصول المقصود.

وفی الشامیۃ تحت (قولہ لفوات الوصف المرغوب) لأن الثمن الّذی بہ رھن أوثق ممّا لا رھن بہٖ فصار الرّھن صفۃ للثمن وھو وصف مرغوب فلہ الخیار بفواتہ.

نقول: ذاک بناء علیٰ وجود السبب فصار کالعفو عن القصاص بعد وجود الجرح" (البحر الرائق ج:۷ ص:۵۱۱)۔[1] لیکن یاد رہے کہ رہن کا مقصد صرف ادائیگی کی توثیق (Security) ہے۔ لہٰذا مرتہن (یعنی صورتِ مسئولہ میں مالیات فراہم کرنے والے) کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس رہن سے کسی بھی صورت میں فائدہ اُٹھائے۔[۲] البتہ اگر مدیون ادائیگی نہ کرے تو اسے بیچ کر اپنا حق وصول کرنا جائز ہے۔

اور اگر تمویل مشارکہ کی بنیاد پر ہے تو اس صورت میں رہن طلب کرنا جائز نہیں،[۳] کیونکہ شریک مدیون نہیں ہوتا۔[۴] البتہ وہ اگر خیانت کرے یا اپنے فرائض صحیح طریقے سے بجا نہ لائے تو اس وقت وہ ذمہ دار ہوتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۷/۶/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸۹۶/۱۱)
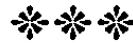
(۱) البحر الرائق، کتاب الاجارۃ ج:۷ ص:۳۰۰ (طبع سعید) نیز گزشتہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) دیکھئے ص:۴۲۲ تا ۴۲۳ کے فتاویٰ اور اُن کے حواشی۔

(۳ و ۴) وفی الهداية ج:۴ ص:۵۲۴ و ۵۲۵ (طبع رحمانیه) ولا يصح الرّهن بالأمانات كالودائع والعوارى والمضاربات ومال الشركة لأنّ القبض فى باب الرّهن قبض مضمون فلا بد من ضمان ثابت ليقع القبض مضمونًا ويتحقق استيفاء الدّين منه.

وفى حاشيته قوله قبض مضمون اى قبض يصير به المقبوض مضمونًا على القابض بقدر الدّين فلا بد من ضمان على الرّاهن حتى يصير المرهون مضمونًا على المرتهن بقدر ذلك الضمان وليس فى الأمانات ضمان فان حق صاحب الأمانة مقصود على العين.

وفى الدر المختار ج:٦ ص:۴۹۲ (طبع سعيد) ولا بالأمانات كوديعة وأمانة.

وفى الشامية (قوله كوديعة وأمانة) الأصوب وعارية وكذا مال مضاربة وشركة كما فى الهداية ...الخ.

﴿کتاب الهبة﴾

(ہبہ کے مسائل کا بیان)

۱:- مرض الوفات سے قبل ہبہ کیا جاسکتا ہے اور بیوی کو کتنا مال ہبہ کرنا چاہئے؟

۲:- ہبہ زبانی بھی ہوسکتا ہے مگر قبضہ ضروری ہے

سوال۱:- کیا انسان اپنا مال اور مملوکہ جائیداد اپنے کسی وارث کو اپنی زندگی میں دے سکتا ہے یا نہیں؟ میں عمر کے آخری حصے میں ہوں، میں چاہتا ہوں کہ بیوی کو اور دُوسرے وارثوں کو جائیداد وغیرہ دے دُوں، بیوی کو کتنا دینا چاہئے؟ کیا میں ایسا کرسکتا ہوں؟ اور اپنا مال کسی کو دینا چاہوں تو دے سکتا ہوں؟

سوال۲:- کیا میں زبانی طور پر کسی کو ہبہ کرسکتا ہوں؟ اور زبانی ہبہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس سے دُوسرا مالک بن جائے گا یا نہیں؟ ہبہ کا بہتر طریقہ کیا ہے اور ہبہ اپنی کیسی حالت تک کرسکتا ہوں؟

جواب۱:- مرضِ وفات (یعنی وہ مرض جس میں انسان کی موت واقع ہو) سے پہلے پہلے انسان اپنی مملوکہ جائیداد میں ہر طرح کا جائز تصرف کرسکتا ہے،[۱] جس میں ہبہ بھی داخل ہے،[۲] لیکن کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا مناسب نہیں ہے جس سے ایک وارث کے سوا تمام دُوسرے ورثاء اس کی جائیداد سے محروم ہوجائیں،[۳] لہٰذا بہتر صورت آپ کے لئے یہ ہے کہ بیوی کے مہر معاف کردینے کے باوجود

(۱ و ۲) وفي شرح المجلّة للاتاسيّ ج:۴ ص:۱۳۲ رقم المادّة: ۱۱۹۲ (طبع مكتبه حقانيه پشاور) كل يتصرّف في ملكه كيف شاء لأنّ كون الشيء ملكًا لرجل يقتضي أن يكون مطلقًا في التّصرف فيه كيفما شاء.

وفي شرح المجلّة لسليم رستم باز ج:۱ ص:۶۵۴ رقم المادّة:۱۱۹۲ (طبع حنفيه كوئته) كل يتصرّف في ملكه كيف شاء.

(۳) وفي صحيح البخاري ج:۱ ص:۳۵۲ (طبع قديمي) عن حُميد بن عبدالرحمٰن ومحمّد بن النعمان بن بشير أنّهما حدثاه عن النّعمان بن بشير رضي الله عنه أنّ أباه أتى به الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: انّي نحلت ابني هذا غلامًا، فقال: أكلّ ولدك نحلت مثله؟ قال: لا! قال: فارجعه.“

وفي فتح الباري ج:۵ ص:۲۸۰ (طبع مكتبة الرشد) وذهب الجمهور الى أنّ التسوية مستحبة فان فضل بعضًا صحّ وكره، واستحبت المبادرة الى التسوية أو الرّجوع فحملوا الأمر على النّدب والنّهي على التّنزيه.

وكذا في عمدة القاري ج:۱۳ ص:۲۱۴ إلىٰ ص:۲۱۶ (طبع دار احياء التراث العربي بيروت) وكذا في اعلاء السنن ج:۱۶ ص:۹۶، ۹۷ (طبع ادارة القرآن كراچي)

وفي شرح الطيبي على المشكوٰة ج:۶ ص:۱۸۱ ولو وهب جميع ماله من ابنه جاز وهو آثم، نص عليه محمد .....الخ.

وفي الدّر المختار مع ردّ المحتار، كتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۶ (طبع سعيد) لا بأس بتفضيل بعض الأولاد .... وكذا في العطايا ان لم يقصد به الاضرار وان قصده يسوّي بينهم ..... ولو وهب في صحته كل المال للولد جاز وأثم.

وفي الهندية ج:۴ ص:۳۹۱ (طبع رشيديه) ولو وهب شيئًا لأولاده في الصّحة وأراد تفضيل البعض على البعض عن أبي حنيفة لا بأس به، اذا كان التفضيل لزيادة فضل في الدّين وان كانا سواء يكره. وروى المعلى عن أبي يوسف أنّه لا بأس به اذا لم يقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوّى بينهم وهو المختار ....الخ.

وكذا في البحر الرّائق، كتاب الهبة ج:۷ ص:۲۸۸ والبزازية على هامش الهندية ج:۶ ص:۲۳۷ وفتاوى قاضي خان ج:۳ ص:۲۷۹.

آپ اُسے مہر کی رقم یا اس قیمت کی جائیداد دے دیں، یا اگر اس کو ناکافی سمجھیں تو جائیداد کا اتنا حصہ مزید بیوی کو ہبہ کردیں جس کی آمدنی سے اس کی گزراوقات بہ آسانی ہوسکے، اور باقی جائیداد اپنی ملکیت میں رکھیں جو آپ کے بعد آپ کے تمام شرعی ورثاء میں تقسیم ہوسکے۔

جواب۲:- ہبہ زبانی بھی ہوسکتا ہے،[1] لیکن ہبہ کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک موہوب لہٗ (یعنی وہ شخص جس کو ہبہ کیا جارہا ہے) اس پر قبضہ نہ کرلے۔[2] اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہبہ تحریری طور پر کیا جائے اور اس پر دو گواہ بھی بنالئے جائیں تاکہ آئندہ کوئی تنازعہ نہ ہوسکے۔ واضح رہے کہ بیوی کے لئے کسی بھی قسم کا ہبہ صرف اس وقت شرعاً نافذ ہوگا جبکہ وہ مرض الموت سے پہلے پہلے کرلیا جائے، اگر بیماری کی حالت میں ہبہ کیا اور اسی بیماری میں انتقال ہوگیا تو یہ ہبہ کالعدم ہوگا۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۶ھ

---

(۱) وفی الهداية ج:۳ ص:۲۸۵ (طبع مكتبه رحمانيه، و ج:۳ ص:۲۸۳ فی طبع مكتبه شركت علميه) وتصحّ بالايجاب والقبول .... الخ.

وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار ج:۵ ص:۶۸۸ (طبع سعيد) وركنها هو الايجاب والقبول .... الخ.

وفی الدّر المنتقى على مجمع الأنهر ج:۳ ص:۴۹۰ (طبع غفاريه كوئته) وتصحّ بايجاب وقبول ولو بالفعل فی حق الموهوب لهٗ.

وفی شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۳ ص:۳۴۴ (طبع مكتبه حبيبيه) تنعقد الهبة بالايجاب والقبول .... الخ.

(۲) وفی الدّر المختار، كتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ (طبع سعيد) وشرائط صحتها فی الموهوب أن يكون مقبوضًا.

وفيه أيضًا ج:۵ ص:۶۹۰ وتتم الهبة بالقبض الكامل.

وفی مجمع الأنهر ج:۳ ص:۴۹۱ (طبع غفاريه كوئته) وتتم بالقبض الكامل لقوله عليه الصلوٰة والسلام لا تجوز الهبة الّا مقبوضة.

وفی الهداية ج:۳ ص:۲۸۵ و۲۸۶ (طبع مكتبه رحمانيه) وتصحّ بالايجاب والقبول والقبض .... قوله عليه السلام لا يجوز الهبة الّا مقبوضة.

وفی ملتقى الأبحر ج:۳ ص:۴۸۹ وتتم (الهبة) بالقبض الكامل.

وفی شرح المجلّة لسليم رستم باز ص:۴۶۲ وتتم بالقبض الكامل لأنها من التبرّعات والتبرع لا يتمّ الّا بالقبض ...... الخ. وفيها أيضًا ج:۱ ص:۴۷۳ رقم المادة: ۸۶۱ يملك الموهوب لهٗ الموهوب بالقبض شرط لثبوت الملك. وكذا فی شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۳ ص:۳۴۴ رقم المادة:۸۳۷ وج:۳ ص:۳۸۱ رقم المادة: ۸۶۱ (طبع مكتبه حبيبيه كوئته).

(۳) وفی الهندية، كتاب الهبة، الباب العاشر فی هبة المريض ج:۴ ص:۴۰۰ (طبع رشيديه) لا تجوز هبة المريض ولا صدقته الّا مقبوضة فاذا قبضت فجازت من الثلث. واذا مات الواهب قبل التّسليم بطلت.

وكذا فی البزازية على الهندية ج:۶ ص:۲۳۹ (طبع رشيديه).

وفی ردّ المحتار ج:۵ ص:۷۰۰ (طبع سعيد) وهب فی مرضه ولم يسلم حتّى مات بطلت الهبة .... الخ.

وفی شرح المجلّة للاتاسی رقم المادّة: ۸۷۹ ج:۳ ص:۴۰۳ (طبع مكتبه حبيبيه كوئته) واذا وهب أحد فی مرض موته شيئا لأحد ورثته وبعد وفاته لم تجز الورثة الباقون لا تصحّ تلك الهبة. وكذا فی الهداية، كتاب الوصايا ج:۴ ص:۶۵۷ (طبع شركت علميه ملتان).

وكذا فی شرح المجلّة لسليم رستم باز رقم المادّة: ۸۷۹ ج:۱ ص:۴۸۳ (طبع حنفيه كوئته)

ہبہ کی گئی زمین موہوب لہٗ کی ملکیت ہے اور واہب کی موت کے بعد اُس میں میراث جاری نہیں ہوگی

سوال:- بکر نامی شخص کی دو لڑکیاں تھی، ان میں سے ایک کا نام فاطمہ اور دُوسری کا نام زینت تھا، اور دو لڑکے تھے، ان میں سے ایک کا نام غلام رسول تھا اور دُوسرے کا نام غلام نبی تھا، اور ایک بھانجا تھا جس کا نام خالد تھا۔

اور بکر کی دُوسری لڑکی فاطمہ کے بطن سے ایک لڑکی اور ایک لڑکا پیدا ہوا، لڑکے کا نام محمد شریف خان تھا، اور لڑکی کا نام کلثوم تھا، اور کلثوم کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے، ان میں سے ایک کا نام غازی خان ہے اور دُوسرے کا نام نبی خان ہے

اب بکر نے مرض الموت سے پہلے اپنی زمین کے کل تین حصے کرکے ایک حصہ اپنے بھانجے خالد کو دے دیا، اور دو حصے اپنے دونوں بیٹے غلام رسول اور غلام نبی کو دے دیا، اور اپنی دونوں لڑکیاں یعنی فاطمہ اور کلثوم کو کچھ نہیں دیا، گویا کہ اپنی زمین کے حصے سے ان دونوں کو محروم کردیا۔

اب فاطمہ جو بکر کی لڑکی ہے، اس کی لڑکی جو کلثوم ہے اُس کا بیٹا غازی خان یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ مجھے میری نانی یعنی فاطمہ کی میراث ملنی چاہئے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ میری والدہ یعنی کلثوم مجھے فوت ہونے کے وقت یہ کہہ گئی ہے کہ آپ اپنی نانی فاطمہ کی میراث طلب کریں، اور اس دعوے پر غازی کے پاس کوئی گواہ بھی نہیں ہے، اور غازی خان کے دُوسرے بھائی نبی خان نہ اپنی نانی کی میراث کا دعویٰ کر رہا ہے اور نہ اپنی والدہ کلثوم کی وصیت کا ذکر کرتا ہے، آیا اس صورتِ مذکورہ میں غازی خان کا یہ دعویٰ دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ بکر نے اپنی زندگی میں مرض الموت سے پہلے ہی[1] اپنی زمین اپنے بھانجے اور دو بیٹوں کو مالک و قابض بناکر ہبہ کردی تھی، اور اُنہوں نے اُس پر قبضہ بھی کرلیا تھا، تو اَب وہ زمین بکر کی ملکیت سے نکل کر بھانجے اور بیٹوں کی ملکیت میں آگئی،[2] اور اس سے بکر کے ورثاء کا کوئی تعلق نہیں رہا، چنانچہ یہ زمین بکر کے ترکے میں شامل نہیں ہوگی، اور دُوسرے ورثاء کو اس پر دعوے کا حق نہیں پہنچتا۔ ہاں اگر بکر نے اس زمین کے علاوہ بھی کچھ مال یا جائیداد چھوڑی ہو تو وہ اس کے

---

(۱) دیکھئے حوالہ ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

(۲) وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۶۹۲ (طبع سعید) وتتم الھبۃ بالقبض الکامل .... الخ. وفیہ أیضًا ج:۵ ص:۶۸۸ وحکمھا ثبوت الملک للموھوب لہٗ غیر لازم .... الخ. وفیہ أیضًا ج:۵ ص:۶۸۸ وشرط صحتھا فی الموھوب أن یکون مقبوضًا .... الخ. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگی، لہٰذا اُس زمین پر غازی خان کا دعویٰ شرعاً قابلِ قبول نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۰/۳/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۳۱۵/۲۸ ب)

ہبہ دُرست ہونے کے لئے قبضہ ضروری ہے، محض کاغذات میں نام کرنے سے ہبہ نہیں ہوتا

سوال:- اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں کوئی جائیداد اپنی اولاد کے نام خریدتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ جائیداد میں نے اولاد کو ہبہ کردی، تو کیا اُس کے انتقال کے بعد ہبہ کی ہوئی جائیداد اُس کی وراثت میں شامل کرنی ہوگی؟

۲:- کیا شریعت میں صرف زبان سے کہہ دینے سے ہبہ ہوجاتا ہے یا اُس کے لئے لکھت ہونا ضروری ہے؟ کیا زبان سے کہہ دینے کے لئے کسی گواہ کا ہونا ضروری ہے؟

مثلاً زید نے اپنے بیٹے بکر کے نام ایک جائیداد خریدی، تمام کاغذات بکر کے نام ہیں، زید نے بکر سے اپنی زندگی میں کہہ دیا کہ یہ جائیداد تمہیں ہبہ کرتا ہوں، اس ہبہ کے گواہ موجود ہیں جو کہ بکر کی والدہ، دادی اور چاچا ہیں، کیا زید کے انتقال کے بعد اس ہبہ کی ہوئی جائیداد کو وراثت میں شامل کیا جائے گا یا نہیں؟

جواب ۱،۲:- شرعاً ہبہ کے لئے تحریری ہبہ نامہ مرتب کرنا ضروری نہیں، یعنی زبانی بھی ہوسکتا ہے،(۱) البتہ یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو ہبہ کیا گیا ہے وہ ہبہ شدہ چیز پر قبضہ کرلے،(۲) لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر بکر نے اس جائیداد پر زید مرحوم کی زندگی ہی میں قبضہ بھی کرلیا تھا تو یہ جائیداد بکر کی ملکیت ہوگئی،(۳) زید کے دُوسرے ورثاء کا اس جائیداد سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور اس کو زید کے ترکے میں شامل نہیں سمجھا جائے گا۔

واضح رہے کہ محض کاغذات کسی کے نام بنوادینے سے ہبہ نہیں ہوتا، بلکہ زبانی یا تحریری طور پر ہبہ کی تصریح اور موہوب لہٗ کا اس پر قبضہ کرنا ضروری ہے،(۴) یہاں چونکہ زبانی تصریح موجود ہے اس لئے قبضے کی شرط کے ساتھ ہبہ دُرست ہوگیا۔(۵)

واللہ سبحانہ اعلم
۶/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۰۸/۲۸ ج)

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۱۔
(۲ تا ۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(اس فتویٰ کی مزید وضاحت کے لئے سائل نے دوبارہ سوال بھیجا جو درج ذیل ہے)

''مکرّر اِستفتاء''

ہبہ کئے گئے مکان کا کرایہ وغیرہ وصول کرنے کے معاملات انجام دینا شرعاً اس پر ''قبضہ'' شمار ہوگا

سوال:- قبضہ موہوب لہٗ سے کیا مراد ہے؟ جبکہ خریداری زمین اور تمام سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں موہوب لہٗ کا نام درج ہے، یہ اس لئے وضاحت طلب کی جارہی ہے کہ اگر ہبہ شدہ عمارت میں ایک یا زیادہ کرایہ دار آباد ہوں تو قبضہ تو اُن کے پاس ہے، البتہ رسیدات وغیرہ دینے والا موہوب لہٗ ہے، اور وہی ٹیکس وغیرہ اپنے نام سے اَدا کرتا ہے، لہٰذا قبضہ مالکانہ مراد ہے یا آباد ہونا شرط ہے؟

۲:- موہوب لہٗ (بکر) نے واہب زید کی زندگی میں ہی مالکانہ قبضہ حاصل کرلیا تھا، البتہ جس بلڈنگ میں کرایہ دار آباد ہیں وہ اُسی طرح سے آباد بطور کرایہ دار چلے آرہے ہیں، تو کیا اس صورت میں موہوب لہٗ کا قبضۂ شرعی دُرست مانا جائے گا؟

جواب:- قبضے کے لئے موہوبہ مکان میں بذاتِ خود آباد ہونا ضروری نہیں، بلکہ صورتِ مسئولہ میں بہتر یہ ہے کہ واہب کرایہ داری کا معاملہ فسخ کردے، اور موہوب لہٗ کرایہ داروں سے نیا کرایہ داری کا عقد کرلے اس طرح جب کرایہ داروں سے کرایہ وصول کرنے وغیرہ کے معاملات واہب کے بجائے موہوب لہٗ نے انجام دینے شروع کردیئے تو قبضہ ہوگیا، اور ہبہ مکمل ہوگیا۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۹۲۷/۲۸ ج)

بغیر قبضے کے دو بھائیوں کو مشترکہ طور پر جائیداد ہبہ کرنے کا حکم

سوال:- میرے تایا نے اپنی جائیداد اپنے دو بھائیوں یعنی میرے والد اور چچا کے نام کردی ہے، میرے تایا کی کوئی اولاد، بیوی، بہن وغیرہ نہیں ہے، میرے والد کی مذکورہ جائیداد جو اُنہوں نے اپنے دو بھائیوں کے نام کی ہے، وہ جائیداد ابھی میرے تایا کے زیرِ استعمال ہی ہے، میرے تایا عمر کے

---

(۱) وفی الشامیة کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ یوخذ ویستأنس ذلک من العبارات الآتیة
قلت فقد ان أفاد انّ التلفظ بالایجاب والقبول لا یشترط بل تکفی القرائن الدالّة علی التملیک کمن دفع لفقیر شیئا وقبضه ولم یتلفظ واحد منهما بشیء .... الخ.
وفی بدائع الصنائع کتاب الهبة ج:۶ ص:۱۲۴ والاذن نوعان صریح ودلالة .... وامّا الدلالة فهی أن یقبض الموهوب لهٗ العین فی المجلس ولا ینهاه الواهب فیجوز قبضه استحسانًا ..... الخ. وکذا فی شرح المجلّة کتاب الهبة رقم المادّة: ۸۴۲ ص:۳۵۳ (طبع مکتبه حبیبیه کوئٹه). نیز دیکھئے: امداد الفتاوی ج:۳ ص:۴۲۶.

آخری حصے اور نہایت کمزوری اور ضعف میں ہیں، اس جائیداد کے بارے میں اب شرعی حکم کیا ہے؟ اور ان کی یہ جائیداد کس کی ہے؟ اور اس کا انتظام و دیکھ بھال کے بارے میں بھی آگاہ فرمائیں۔ ''جنگ'' اخبار میں آپ کے کالم نہایت ہی مفید اور پسند ہیں۔ کیا اسلام آباد اور راولپنڈی میں آپ کے والد صاحب کے کوئی خلیفہ ہیں؟

طلعت محمود راولپنڈی

جواب:- برادرِ عزیز ومکرّم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے تایا نے اگر اپنی ساری جائیداد اپنے دونوں بھائیوں کو دی ہے تو شرعاً یہ ہبہ اس لئے دُرست نہیں ہوا کہ دونوں بھائیوں کو الگ الگ کر کے دینا ضروری تھا،(۱) اور قبضہ بھی نہیں ہوا،(۲) لیکن چونکہ آپ کے تایا کی کوئی اولاد نہیں ہے، اور بیوی بھی نہیں ہے، اور بہن بھی نہیں ہے، تو آپ کے تایا کے شرعی وارث آپ کے والد اور چچا ہی ہیں، لیکن جب تک آپ کے تایا زندہ ہوں، اس وقت تک ان کی جائیداد کو انہی پر خرچ کرنا ضروری ہے، البتہ ان کی جائیداد کے انتظام کے معاوضے کے طور پر کچھ مناسب رقم دونوں بھائی لینا چاہیں تو اس کی گنجائش ہے۔

''جنگ'' کے کالم کی پسندیدگی کا شکریہ! دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اسے مفید بنائے۔ راولپنڈی اسلام آباد میں حضرت والد صاحبؒ کے کوئی خلیفہ تو نہیں ہیں، لیکن نواب قیصر صاحب اسلام آباد میں مقیم ہیں، جو حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ کے خلیفہ ہیں، ان کی ہفتہ وار مجلس بھی ہوتی ہے، مولانا عبداللہ صاحب جامعہ فریدیہ سے ان کا پتہ معلوم ہوسکتا ہے۔

والسلام

۲۸رشعبان ۱۴۱۴ھ(۳)

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۶۸۸ (طبع سعید) وشرائط صحتها فی الموهوب أن یکون مقبوضًا غیر مشاع ممیّزا غیر مشغول ....الخ. وفی هامش مجمع الأنهر ج:۳ ص:۴۹۰ (طبع غفاریه) وفی الموهوب أن یکون مقبوضًا غیر مشاع ممیّزًا غیر مشغول وتتم بالقبض الکامل ....الخ.

وفی ردّ المحتار، کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۲ (طبع سعید) وذکر قبله هبة المشاع فیما یقسم لا تفید الملک عند أبی حنیفةؒ وفی القهستانی لا تفید الملک وهو المختار کما فی المضمرات.

وفی خلاصة الفتاوی، کتاب الهبة، الفصل الثالث فیما یکون خطبا وفیما لا یکون ....الخ، ج:۴ ص:۳۹۰ (طبع مکتبه رشیدیه) ومن شرائط الهبة الافراز حتّی لا یجوز هبة المشاع فیما یحتمل القسمة کالبیت والدّار والأرض ونحوها وان کان لا یحتمل القسمة یجوز کالبئر والحمام والرحی .....الخ.

وفی البحر الرّائق، کتاب الهبة ج:۷ ص:۲۸۶ (طبع رشیدیه) .... فأفاد انّه لو قبضه مشاعًا لا یملکه فلا ینفذ تصرّفه فیه لأنّها هبة فاسدة مآلاً وهی مضمونة بالقبض ولا تفید الملک للموهوب لهٗ وهو المختار.

وکذا فی مجمع الأنهر، کتاب الهبة ج:۳ ص:۴۹۴ (طبع غفاریه کوئٹه) وشرح المجلّة للاتاسیؒ ج:۳ ص:۳۷۸ (طبع حقانیه پشاور).

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۳) یہ جواب حضرتِ والا دامت برکاتہم نے سائل موصوف کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔ (محمد زبیر حق نواز)

گھر کے استعمال کے لئے دی گئی رقم سے بچا کر زیور بنایا گیا ہو تو کس کی ملکیت ہے؟

سوال:- شوہر اگر اپنی بیوی کو گھر کا انتظام چلانے کے لئے روپے دیتا ہے اور بیوی ان پیسوں میں سے بچا کر زیور یا نقدی جمع کر لیتی ہے، بیوی کے انتقال کے بعد ایسا مال شوہر کا ہے یا نہیں؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- شوہر اپنی بیوی کو گھر کے انتظام کے لئے جو رقم دیتا ہے اگر وہ اس نیت کے ساتھ دی تھی کہ بیوی سے حساب نہیں لوں گا، بلکہ جو کچھ بچ جائے وہ بیوی کی ملکیت ہے، تب تو بچی ہوئی رقم سے خریدا ہوا زیور بیوی کی ملکیت تھا، اور اس کے انتقال کے بعد اس کے ترکے میں شامل ہو کر اس کے تمام شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ اور اگر شوہر نے بیوی کو اس بات کا پابند کیا تھا کہ وہ حساب رکھے اور جو رقم بچے وہ واپس کرے تو پھر یہ زیور شوہر کی ملکیت تھا، اور اگر اس نے بیوی کو ہبہ نہیں کیا تو وہ اس کے انتقال کے بعد واپس لے سکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۳/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۴۴/۲۸ ب)

محض کاغذی طور پر جائیداد کسی کے نام کرنے یا کسی کے نام سے خریدنے کی شرعی حیثیت

سوال:- ایک صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، اُنہوں نے کچھ جائیداد اپنے لڑکوں کے نام سے لی تھی، جبکہ لڑکے چھوٹے تھے، اب لڑکے یہ کہتے ہیں کہ جب سے والد صاحب نے یہ چیزیں ہمارے نام خریدی تھیں اب ہم اُن کے مالک ہیں، والد صاحب کی کوئی تحریر ان کے نام سے نہیں ہے، اب یہ جائیدادیں کس طرح تقسیم ہو سکتی ہیں؟

جواب:- محض کاغذی طور پر کوئی جائیداد کسی کے نام لکھ دینے یا کسی کے نام خریدنے سے تو ہبہ ثابت نہیں ہوتا،[1] البتہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ والد مرحوم نے اپنی زندگی میں یہ جائیداد زبانی طور پر کسی خاص اولاد کو ہبہ کر دی تھی اور اس اولاد نے اس پر قبضہ بھی کر لیا تھا، تو اس جائیداد کو اُسی مخصوص اولاد کی ملکیت سمجھا جائے گا،[2] وہ والد مرحوم کے ترکے میں شامل نہیں ہوگی،[3] تحریری ہبہ نامہ ہونا بھی

(۱ تا ۳) وفی الدر المختار، کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ (طبع سعید) وشرط صحتها فی الموهوب أن یکون مقبوضًا. وفیه أیضًا ج:۵ ص:۶۹۲ وتتم الهبة بالقبض الکامل. وفیه أیضًا ج:۵ ص:۶۸۸ وحکمها ثبوت الملک للموهوب له غیر لازم. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

ضروری نہیں، زبانی ہبہ[1] کا ثبوت گواہوں سے ہوجائے تو وہ بھی کافی ہے،[2] لیکن اگر زبانی ہبہ[3] کا بھی ثبوت نہ ہو تو پھر یہ جائیداد والد مرحوم کے ترکے میں شامل ہوکر تمام ورثاء میں بحصۂ رسدی تقسیم ہوگی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۱۰/ ۲۸ ج)

خصوصی خدمت اور تیمارداری کی بناء پر دیگر ورثاء کی رضامندی سے اپنا مکان صرف خدمت گزار بیٹے کو ہبہ کرنے کا حکم

سوال:- اب سے تقریباً چار سال قبل میں فالج میں مبتلا ہوا تھا، اس بے بسی اور بیماری کی حالت میں میرے ایک بیٹے حفیظ الرحمٰن خان نے سعادت مندی کا ثبوت دیا، پیشاب، پائخانہ خود صاف کرتا تھا، (میری بیوی انتقال کرچکی تھی) اور اپنے روپے سے سینکڑوں روپے کا علاج کرایا، اس عمل سے خوش ہوکر میں نے اپنا رہائشی مکان جو میں نے دسمبر ۱۹۴۹ء میں پانچ ہزار روپے میں خریدا تھا، اُس کو اِنعام کے طور پر دے دیا، ایسا کرنے سے پہلے میں نے اپنی دیگر اولاد سے جو میری مزاج پُرسی کے لئے آیا کرتے تھے رائے لی تھی، انہوں نے رضامندی ظاہر کردی، اور کہا کہ اس کا یہی لڑکا مستحق ہے، یہ فروری ۱۹۷۴ء میں ہوا، اور مزید یہ بھی کیا کہ روزانہ اخبار میں اعلانِ عام کرادیا کہ میں اپنا ذاتی مکان اپنے لڑکے حفیظ الرحمٰن خان کو اِنعام کے طور پر دے رہا ہوں، اگر کسی کو کوئی عذر ہو تو ۱۵ دن کے اندر عذر پیش کرے، ورنہ اس کے بعد کوئی عذر قابلِ قبول نہ ہوگا۔ کوئی اعتراض کسی کا وصول نہیں ہوا، لہٰذا قانونِ مروّجہ کے مطابق اُس کی پختہ کارروائی کرالی اور مکان کا قبضہ بھی دے دیا، جس پر اوتھ کمشنر اور گواہوں وغیرہ کے دستخط گواہی ثبت ہوگئی۔ یہ فروری ۱۹۷۴ء میں مکمل ہوگیا، اور مکان کا لیز بھی اُسی کے نام اب ہوگیا ہے، میں اب بھی اُسی مکان میں رہتا ہوں اور اسی لڑکے کی زیرِ کفالت ہوں، ہر قسم کا ٹیکس وہی ادا کرتا ہے اور مکان کی بقدرِ ضرورت مرمت اُسی نے کرائی ہے۔

میرے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں، سب کی شادیاں ہوچکی ہیں سوائے ایک لڑکے کے، جس کی شادی بوجہ کمزوریٔ دِماغ اور بوجہ آمدنی نہ ہونے کے انکار کردیا ہے، سب لڑکیوں کو رسم و رواج کے مطابق ہزاروں کا زیور و دیگر سامان اور کپڑے اپنے روپے سے کئے ہیں، میرے پاس اب سوائے

(۱و۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۲) فی الدّر المختار، کتاب الدعوىٰ ج:۵ ص:۵۵۳ (طبع سعید) وعدها فی الأشباه سبعًا بینة واقرار ویمین ونکول عنه ..... وکذا ادعىٰ دینًا أو عینًا علی وارث اذا علم القاضی کونه میراثًا أو اقر به المدعی أو برهن الخصم علیه فیحلف علی العلم ولو ادعی هما ای الدین والعین الوارث علی غیره یحلف المدعی علیه علی البتات کموهوب وشراء درر ....الخ.

کفن دفن کے اخراجات کے کچھ نہیں بچا، اب سوال یہ ہے کہ میرے انتقال کے وقت اس مکان پر کسی کا حق باقی رہتا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جبکہ آپ نے دیگر ورثاء کی رضامندی بھی حاصل کرلی ہے تو آپ کے لئے اس مکان کا اپنے خدمت گزار بیٹے کو ہبہ کردینا جائز بھی ہے،[1] اور جب بیٹے کو اس کا مالک وقابض بنادیا گیا تو یہ ہبہ شرعاً نافذ بھی ہوگیا۔[2] اب حفیظ الرحمٰن خان ہی اس مکان کا مالک ہے،[3] اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے دُوسرے ورثاء کا اس میں حق نہیں ہوگا، اور نہ یہ مکان آپ کے ترکے میں شامل ہوسکے گا، لما فی الدر المختار: "لا بأس بتفضيل بعض الأولاد فی المحبة لأنها عمل القلب وكذا فی العطايا ان لم يقصد به الاضرار ..... ولو وهب فی صحته كل المال للولد جاز وأثم. (قلت: يعنی اذا لم يرض به ورثته الآخرون). (شامی ج:۴ ص:۵۱۳ كتاب الهبة)۔[4]

وفيه أيضًا: "وهبة مقعد ومفلوج وأشل ومسلول من كل ماله ان طالت مدته" وقال الشامی تحته: "لأنّه اذا تقادم العهد صار طبعًا من طباعه كالعمی والعرج، وهذا لأنّ المانع من التصرّف مرض الموت وهو ما يكون سببًا للموت غالبًا، وانّما يكون كذٰلک اذا كان بحيث يزداد حالًا فحالًا الٰی أن يكون آخره الموت، وأما اذا استحكم وصار بحيث لا يزداد ولا يخاف منه الموت لا يكون سببًا للموت كالعمی ونحوه. (شامی كتاب الوصايا ج:۵ ص:۴۲۳)۔[5]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۰/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۴۲۶/۲۸ ب)

(۱ و ۴) الدّر المختار كتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۶ (طبع سعيد)، وفی شرح معانی الآثار للطحاوی كتاب الهبة ج:۲ ص:۲۷۱ (طبع سعيد) وقد فضل بعض أصحاب رسول الله صلی الله عليه وسلم ورضی عنهم بعض أولادهم فی العطايا ....الخ. وراجع أيضًا أوجز المسالک كتاب الهبة، باب مالا يجوز من النّحل ص:۲۲۰ (طبع مكتبه مظاهر علوم) واعلاء السُنن ج:۱۶ ص:۹۶ و۹۷ (طبع ادارة القرآن كراچی)

وفی الهندية كتاب الهبة ج:۴ ص:۳۹۱ (طبع رشيديه) ولو وهب رجل شيئًا لأولاده فی الصّحة وأراد تفضيل البعض علی البعض عن أبی حنيفة أنه لا بأس به اذا كان التّفضيل لزيادة فضل له فی الدّين وعن أبی يوسفؒ أنه لا بأس به اذا لم يقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوّی بينهم وان كان فی ولده فاسق لا ينبغی أن يعطيه أكثر من قوته كيلا يصير معينًا لهٗ فی المعصية.

وفی البزازية علیٰ هامش الهندية الجنس الثالث فی هبة الصّغير ج:۲ ص:۲۳۷ ولو وهب جميع ماله من ابنه جاز وهو آثم نصّ عليه محمّد ولو خصّ بعض اولاده لزيادة رشده لا بأس به ....الخ.

وفی فتاوی القاضی خان علیٰ هامش الهندية فصل فی هبة الوالد لولده ج:۳ ص:۲۷۹ وروی المعلّی عن أبی يوسفؒ انّه لا بأس به اذا لم يقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوّی بينهم. وكذا فی البحر الرّائق كتاب الهبة ج:۷ ص.۲۸۸.

(۲ و ۳) وفی الدّر المختار كتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۲ وتتم الهبة بالقبض الكامل.

وفی بدائع الصنائع فصل وأمّا حكم الهبة ...الخ ج:۶ ص:۱۲۷ (طبع سعيد) وأمّا أصل الحكم فهو ثبوت الملک للموهوب له فی الموهوب من غير عوض ....الخ. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۵) الدّر المختار كتاب الوصايا ج:۶ ص:۶۲۰ (طبع سعيد). (محمد زبیر حق نواز)

۱:- اولاد میں کسی کو زیادہ کسی کو کم دینے کا حکم اور مشترکہ کاروبار سے حاصل شدہ رقم سے کاروبار کے غیر شریک بیٹے کو محروم کرنے کا حکم
۲:- زندگی میں علیحدہ ہوجانے والے بیٹے کو بھی میراث سے حصہ ملے گا

سوال ۱:- ایک باپ جس کے تین بیٹے ہیں، وہ سب شادی شدہ ہیں، بڑا لڑکا سرکاری ملازم ہے، باقی دو لڑکے اور والد صاحب نے مل کر ایک دُکان کی، سب اکٹھے ہیں، والد صاحب کی کوئی غیر منقولہ جائیداد نہیں ہے، صرف رقم کی صورت میں موجود ہے، اب والد صاحب نے ناراضگی کے بغیر بڑے لڑکے کو علیحدہ کردیا، مگر علیحدگی کے وقت جمع شدہ رقم میں سے کچھ نہیں دیا، اور ساری رقم ان کے لئے مخصوص کردی جو ان کے ساتھ کام کرتے ہیں، کیا یہ بات والد صاحب کے لئے جائز ہے کہ ایک بھائی کو بلاوجہ محروم کردیں اور دو بھائیوں کو سب کچھ دے دیں؟

سوال ۲:- والد صاحب کے فوت ہونے کے بعد کیا صورت ہوگی جبکہ لڑکا بہت پہلے علیحدہ ہوچکا ہے، اور پھر اس کے بعد دونوں لڑکے اور والد اکٹھے کام کرتے رہے ہوں، کیا سب کو برابر تقسیم ہوگا یا دونوں بھائیوں کی ذاتی محنت شمار ہوگی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مناسب تو یہ تھا کہ باپ کاروبار کے اپنے حصے سے کچھ رقم تیسرے بیٹے کو بھی دیتا، لیکن باپ نے اگر اپنے بڑے لڑکے کو جمع شدہ رقم میں سے کچھ نہیں دیا تو اس میں اُس پر کوئی گناہ نہیں، کیونکہ یہ رقم دُوسرے لڑکوں کے ساتھ کئے ہوئے کاروبار سے حاصل شدہ تھی، اور زندگی میں اگر کسی اولاد کو کم، کسی کو زیادہ دیا جائے تو جب تک وہ بدنیتی سے نقصان پہنچانے کا مقصد نہ ہو تو گنجائش ہے، وفی الخانیۃ: "لا بأس بتفضیل بعض الأولاد فی المحبۃ لأنھا عمل القلب، وکذا فی العطایا ان لم یقصد بہ الاضرار وان قصدہ یسوّی بینھم." (شامی ج:۴ ص:۵۱۳ کتاب الھبۃ)۔[1]

جواب ۲:- والد صاحب کی وفات کے وقت جو رقم یا جائیداد ان کی ذاتی ملکیت ہوگی، وہ تمام ورثاء میں شرعی حصوں کے مطابق تقسیم ہوگی، اس میں بڑے لڑکے کو بھی حصہ ملے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۶۴/۲۹ ج)

---

(۱) الدر المختار مع ردّ المحتار کتاب الھبۃ ج:۵ ص:۶۹۶ (طبع سعید) نیز دیکھئے ص:۴۴۷ کا حاشیہ نمبر۱و۴۔

مرض الوفات سے قبل ہبہ کی گئی رقم موہوب لہٗ کی ملکیت ہے

سوال:- (خلاصۂ سوال) کمنا مرحوم نے اپنے مرتے وقت کوئی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد نہیں چھوڑی۔ نور محمد، کریم الدین دونوں بھائیوں نے بھی کل زندگی میں کوئی بھی جائیداد نہیں بنائی ہے، دونوں بھائی ہر وقت اور ہمیشہ لڑتے رہے، اور ایک دُوسرے سے جدا رہے، کمائی بھی ہر ایک کی الگ ہے۔ اکتوبر ۷ ۱۹۶ء کو کریم الدین انتقال کرگیا، کریم الدین کی ایک لڑکی ہے، جس کو وہ بہت محبوب رکھتا تھا، زندگی بھر اس لڑکی کے ہاں رہا اور پوری زندگی میں یہی کہتا رہا کہ میرا تمام مال میری اس لڑکی کا ہے، مرحوم کے دو ہزار روپے نقد اس لڑکی کے پاس تھے، انتقال کے بعد کریم الدین کا بھائی لڑکی کے پاس آیا، تو لڑکی نے وہ دو ہزار روپے لاکر اس کو کہا کہ یہ روپے آپ لے لیں، اس پر نور محمد بھائی کریم نے کہا کہ: یہ تمہارا مال ہے، مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ: اب تک تمہاری خدمت والد کر رہے تھے اور اَب میں کروں گا۔ اس تمام ماجرا کے دس بارہ آدمی گھر کے شاہد ہیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر کریم الدین نے اپنی زندگی میں واقعۃً یہ دو ہزار روپے کا اپنی لڑکی کو ہبہ کر دیا تھا اور لڑکی نے اس پر قبضہ بھی کرلیا تھا، تو وہ شرعاً اس کی ملکیت ہوگیا،(۱) دُوسرے وارثوں کا اس میں حق نہیں، بشرطیکہ یہ روپے کریم الدین نے مرضِ وفات سے پہلے ہبہ کئے ہوں۔(۲)

واللہ اعلم بالصواب

۱۳۸۷/۱۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۱۹/ ۱۸ الف)

مرحوم کے انتقال کے بعد ملنے والے ''ہبہ نامہ'' کی حیثیت اور چند ورثاء میں تقسیمِ میراث کا طریقہ

سوال:- زید کی زندگی میں زید کی بیوی اور والدین کا انتقال ہوگیا تھا، زید نے دُوسری شادی کی، اس سے کوئی اور اولاد نہیں ہوئی، کچھ عرصہ بعد زید کا انتقال ہوگیا، مرحوم نے ورثاء میں ایک

---

(۱) وفي الدّر المختار كتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ وشرط صحتها في الموهوب أن يكون مقبوضًا ....الخ.

وفيه أيضًا ج:۵ ص:۶۹۲ وتتمّ الهبة بالقبض الكامل ....الخ.

وفيه أيضًا ج:۵ ص:۶۸۸ وحكمها ثبوت الملك للموهوب لهٗ غير لازم.

وفي بدائع الصنائع فصل وامّا حكم الهبة ...الخ ج:۶ ص:۱۲۷ (طبع سعيد) وأمّا أصل الحكم فهو ثبوت الملك للموهوب لهٗ في الموهوب من غير عوض. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) وفي ردّ المحتار ج:۵ ص:۷۰۰ وهب في مرضه ولم يسلم حتّى مات بطلت الهبة. وفي شرح المجلّة للأتاسي واذا وهب واحد في مرض موته شيئًا لأحد ورثته وبعد وفاته لم يجز سائر الورثة لا تصح تلك الهبة. وكذا في الهداية، كتاب الوصايا ج:۴ ص:۶۵۷. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

لاولد بیوہ، پہلی بیوی سے ایک لڑکی شادی شدہ، ایک بھائی اور دو بہنیں چھوڑی ہیں، مرحوم کے انتقال کے بعد یہ ''ہبہ نامہ'' ملا جو کہ اِستفتاء ھٰذا کے ساتھ منسلک کیا جارہا ہے، یہ ''ہبہ نامہ'' رجسٹری نہیں ہوا، جن گواہوں کے دستخط ہیں ان کا بیان ہے کہ ہمارے سامنے مرحوم نے کسی چیز کا بھی قبضہ نہیں دیا تھا اور جن کے نام ہبہ کیا تھا ان لوگوں نے بھی یہی بتایا ہے کہ اُن کو قبضہ نہیں دیا گیا تھا، ہبہ نامہ کے علاوہ بھی نقدی اور زیورات ہیں، مرحوم کی جائیداد کس طرح تقسیم کی جائے؟

جواب:- اگر مذکورہ جائیدادیں مرحوم نے اپنی بیٹی اور بیوی کو الگ الگ[1] کرکے قبضے میں نہیں دی تھیں، تو یہ ہبہ تام نہیں ہوا،[2] اور یہ تمام جائیدادیں بدستور مرحوم کی ملکیت میں رہنے کی بنا پر ان کے ترکے میں شامل اور دُوسرے مال کی طرح تمام ورثاء میں شرعی حصوں کے مطابق تقسیم ہوں گی۔

لما فی الدر المختار: وتتم الهبة بالقبض الكامل. وفی ردّ المحتار تحته: فیشترط القبض قبل الموت ولو كانت فی مرض الموت للأجنبی كما سبق فی كتاب الوقف. (شامی ج:۴ ص:۵۱۰)۔[3]

اورصورتِ مسئولہ میں پہلے مرحوم کے ترکے سے ان کی تجہیز وتکفین کے درمیانہ درجے کے اخراجات نکالے جائیں، پھر اگر ان کے ذمے کوئی قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے، اور بیوی کا مہر بھی اگر ابھی تک ادا نہ کیا ہو اور بیوی نے معاف بھی نہ کیا ہو تو وہ بھی قرض ہے، اسے ادا کیا جائے، اس کے بعد اگر مرحوم نے کوئی جائز وصیت کی ہو تو ⅓ کی حد تک اس پر عمل کیا جائے، پھر جو مال بچے اس کا آٹھواں حصہ مرحوم کی بیوہ کو، اور آدھا حصہ لڑکی کو دیا جائے، اور اس کے بعد جو مال باقی بچے اُس کے چار حصے کرکے دو حصے بھائی کو اور ایک ایک حصہ دونوں بہنوں کو دے دیا جائے، سہولت کے لئے کل ترکے کے بتیس حصے کرلیں، جس میں سے بیوہ کو چار حصے، لڑکی کو سولہ حصے، بھائی کو چھ حصے اور ہر بہن کو تین تین حصے دے دیئے جائیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱۲/۲۸ ج)

کسی شریک کا قابلِ تقسیم مشترکہ زمین کسی کو ہبہ کرنے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین اس مسئلے میں کہ مسمیان جمعہ وعبدالرحیم پسران عبدالرحمٰن دو حقیقی بھائی ہیں، مسمّٰی عبدالرحیم نے اپنی زمین جو ابھی تک تقسیم نہ ہوئی تھی، بلکہ مشترک تھی،

---

(۱) دیکھئے ص:۴۴۴ کا حاشیہ نمبر۱۔　(۲) دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۳) شامی كتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۰ (طبع سعید).

مسمّٰی محبوب ولد عبداللہ چچازاد بھائی کو خفیہ ہبہ کر دیا، لیکن رقبہ موہوبہ کا قبضہ موہوب لہٗ کو نہیں دیا، ہبہ کے بعد واہب تین سال تک زندہ رہا لیکن اس عرصے میں واہب نے موہوب لہٗ کو قبضہ نہیں دیا، بلکہ زمین حقیقی بھائی جمعہ کے قبضے میں رہی۔ مذکور کے فوت ہونے کے بعد بھی مسمّٰی جمعہ نے محبوب موہوب لہٗ کو تقریباً تیرہ سال تک قبضہ نہیں دیا، اس سال موہوب لہٗ نے مسمّٰی جمعہ برادر عبدالرحیم واہب جو اکیلا واہب کا وراث ہے، اس سے اس کے ضعیف العمر غریب اور بے کس ہونے کی وجہ سے جبراً قبضہ لے لیا، کیا یہ ہبہ شرعاً دُرست ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہبہ ایسی مشترک زمین کا ہوا ہے جو قابلِ تقسیم ہے، لیکن ہوئی نہیں، اور واہب نے قبضہ بھی نہیں دیا۔ مفصل و مدلل جواب عنایت فرماویں اس سال موہوب لہٗ نے مسمّٰی جمعہ سے اس کا ذاتی رقبہ بھی چھین لیا جبکہ ہبہ کا صرف ایک ہی گواہ زندہ ہے، بینوا بالصواب توجروا بالثواب۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ہبہ شرعاً دُرست نہیں ہوا[1]، زمین میں مسمّٰی عبدالرحیم مرحوم کا جو حصہ تھا، وہ مرتے وقت تک اس کی ملکیت میں رہا، اور مرنے کے بعد اس کے شرعی ورثاء کی ملکیت ہوگیا، موہوب لہٗ مسمّٰی محبوب نے عبدالرحیم کی وفات کے بعد زمین پر جو زبردستی قبضہ کیا، وہ شرعاً بالکل ناجائز اور حرام ہے، اس پر شرعاً واجب ہے کہ یہ زمین عبدالرحیم کے ورثاء کو واپس کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۵۶/۱۴۰)

اصل مالک کی طرف سے کوارٹر پر قبضہ دِلائے بغیر محض الاٹمنٹ سے ملکیت نہیں آتی

سوال:- والد صاحب مرحوم نے بیرونِ ملک دو چلتی ہوئی کاروباری دُکانیں چھوڑی ہیں، اس کاروبار کو والدہ صاحبہ کی سرپرستی حاصل ہے، کراچی میں دو دُکانیں کرایہ کی چھوڑی ہیں، جو خالی پڑی ہیں، دو عدد کوارٹرز بھی چھوڑے ہیں جو گورنمنٹ سے الاٹ شدہ ہیں، ایک والدہ کے نام پر الاٹ ہوا ہے، دُوسرا بھائی کے نام پر الاٹ ہوا ہے، ان مذکورہ بالا دونوں کوارٹروں میں ایک دُوسرا بھائی (جس کے نام الاٹ نہیں ہے) مع اپنی بیوی بچوں کے رہ رہا ہے، ان رہائش پذیر کوارٹروں میں مقیم بھائی نے تعمیر پر کچھ رقم لگائی ہے، لہٰذا ترکے کا کیا حکم ہے؟ اور یہ دو کوارٹر جن کے نام پر الاٹ ہوئے ہیں وہ ان کے مالک ہیں یا والد مرحوم کی ملکیت تھے؟ شرعاً کیا حکم ہے؟

(۱) حوالہ کے لئے ص:۴۴۴ کا حاشیہ نمبر۱ اور ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- مرحوم کی یہ تمام دُکانیں اور دونوں کوارٹر مرحوم کے ترکے میں شامل ہوں گے، کوارٹروں کی قیمت مرحوم کے ذمے دَین ہے، وہ ترکے میں سے پہلے نکال کر گورنمنٹ کو دی جائے گی، اور محض کوارٹروں کے کسی کے نام الاٹ ہونے سے وہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک وہ ہے جس نے ان کوارٹروں کی خریداری کا معاملہ کیا، ہاں اگر مرحوم نے مذکورہ کوارٹروں پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی تندرستی میں زبانی یا تحریری ہبہ کسی کے نام کردیا ہو اور اُس نے اُس کوارٹر پر قبضہ بھی کرلیا ہو تو وہ مالک ہوجائے گا۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۹۵۰/۲۸ ج)

۱:- بیوی کے نام سے خریدی گئی زمین اور اُس پر تعمیر کی جانے والی کوٹھی بیوی کی ملکیت ہے

۲:- تحریری اسٹامپ کے ساتھ دی گئی رقم کا ہبہ دُرست ہے

۳:- کسی کے نام سے بینک میں رقم جمع کرائی یا جائیداد خریدنے سے ہبہ دُرست ہوجاتا ہے

۴:- کسی کے نام سے جمع کرائی گئی رقم کی چیک بک پر قبضے سے ''ہبہ'' مکمل ہوگیا

۵:- بیوی اور لڑکیوں کی دستبرداری کے بعد کل جائیداد بیٹوں کو ہبہ کرنے کا حکم

سوال ۱:- متوفی شوہر نے ایک قطعہ زمین اپنی بیوی کے نام سے کراچی میں خریدا، اس کے بعد اس کو فروخت کردیا، تو بیوی نے اعتراض کیا کہ آپ نے کیوں بیچ دیا؟ تو مرحوم شوہر نے فرمایا کہ: ''میں تمہارے لئے ایک پلاٹ حیدرآباد میں خرید دیتا ہوں'' اور مرحوم شوہر نے ایک پلاٹ زمین ''لطیف آباد'' (حیدرآباد) بیوی کے نام سے ہی خریدا اور بیوی کے نام ہی رجسٹری کرائی، اس کے بعد مرحوم شوہر نے مذکورہ پلاٹ پر کوٹھی تعمیر کرائی، دورانِ تعمیر بیوی سے کہا کہ: ''میں نے تمہارے لئے کوٹھی

---

(۱) تفصیلی حوالہ جات کے لئے ص:۴۴۰ کے تمام حواشی اور ص:۴۴۴ کا حاشیہ نمبر۱ اور ص:۴۴۹ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

بنوادی ہے، تم عمر بھر اس میں رہنا'' جب کوٹھی بالکل مکمل ہونے والی تھی تو شوہر کا انتقال ہوگیا، تو ایسی صورت میں کیا پلاٹ اور کوٹھی دونوں بیوی کی ملکیت ہوں گے یا صرف پلاٹِ زمین؟ یا اگر دونوں بیوی کی ملکیت نہیں ہوئیں تو کیا دُوسرے وارثوں میں تقسیم کردی جائے۔ (نوٹ: ابھی اس کوٹھی میں کوئی نہیں گیا تھا)۔

سوال۲:- بڑے لڑکے کو ۵۵ ہزار مروّجہ قانون کے تحت گفٹ کیا، جس میں ایک اسٹامپ تحریر کرنا پڑتا ہے کہ میرا لڑکا میری بہت خدمت کرتا ہے اس کو میں خوش ہوکر اپنے سرمائے میں سے اتنی رقم دے رہا ہوں، اور یہ رقم متوفی نے مندرجہ بالا طریق پر دے دی تھی، کیا یہ ہبہ ہوگئی؟

سوال۳:- چھوٹے لڑکے کو متوفی نے اس طرح رقم دی کہ اس کے نام سے بینک میں جمع کرادیئے، اور اس کے نام سے ایک تجارتی جائیداد خرید دی تھی، یہ رقم اور جائیداد ہبہ ہوئی کہ نہیں؟ اگر ہبہ نہیں ہوئی تو شاملِ ترکہ کر کے تقسیم کردیں؟

سوال۴:- بیوی کے نام بھی انہوں نے یعنی مرحوم نے بیوی کے نام سے بینک میں رقم جمع کرادی تھی، یہ رقم ہبہ ہوئی کہ نہیں؟ اگر نہیں ہوئی تو شاملِ ترکہ کر کے تقسیم کردیں؟

سوال۵:- بہنوں نے اور والدہ نے زبانی یہ کہا کہ ہم اپنا حصہ اپنے دونوں بھائیوں اور والدہ اپنے دونوں لڑکوں کو ہبہ کرتی ہیں، تو کیا وہ ترکہ جو کہ اُن کو ملنے والا تھا، ہبہ ہوگیا؟ حساب کر کے لڑکیوں اور بیوی کو بتلادیا گیا تھا کہ تمہارا اتنا حصہ نکل رہا ہے، اگر ہبہ نہیں ہوا تو براہِ مہربانی ہبہ کا صحیح طریقہ تحریر کریں۔

جواب۱:- صورتِ مسئولہ میں زمین اور جس قدر کوٹھی متوفی کی وفات سے قبل تعمیر ہوئی تھی، بیوی کی ملکیت ہوگئی، بشرطیکہ زمین کا ہبہ مرضِ وفات سے پہلے ہوا ہو[1]، فقہی اِصطلاح میں اس مسئلے کی صورت یہ ہے کہ شوہر نے زمین بیوی کو ہبہ کی تھی، اس پر بیوی کی اجازت سے کوٹھی کی تعمیر بیوی کی طرف سے قبضہ ہے، جس سے ہبہ تام ہوگیا[2]، اور زمین بیوی کی ملکیت ہوگئی[3]۔ اب بیوی کی طرف سے تعمیر کے تصرف کی اجازت اس شرط پر ہے کہ کوٹھی اس کی ہو، لہٰذا تعمیر کے لئے جتنا سامان خریدا گیا وہ بیوی کو نقد ہبہ کیا گیا اور اس کا زمین پر تعمیر میں لگنا بیوی کی طرف سے قبضہ ہوا، لہٰذا جس قدر کوٹھی تعمیر ہوئی اس پر قبضہ مکمل ہوکر بیوی کی ملکیت ہوگیا۔ اب قبضے کے لئے کوٹھی میں جاکر رہنا ضروری نہیں، شرط یہی ہے کہ کوٹھی بھی مرضِ وفات سے پہلے بنائی گئی ہو[4]۔ واللہ اعلم

جواب۲:- صورتِ مسئولہ میں ہبہ منعقد ہوگیا، بشرطیکہ ہبہ مرضِ وفات میں نہ ہوا ہو[5]۔

(حواشی اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

جواب۳:- اگر چھوٹے لڑکے نے جائیداد پر اور بینک کی چیک بک پر قبضہ کرلیا ہو تو ہبہ صحیح ہوگیا،[٦] بشرطیکہ مرضِ وفات میں نہ ہو۔[٧]

جواب۴:- اگر بیوی نے چیک بک پر قبضہ کرلیا ہو، تو ہبہ منعقد ہوگیا، بشرطِ مذکور۔

جواب۵:- اس ہبہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو وارث اپنا حصہ چھوڑنا چاہتے ہیں، وہ ترکے میں سے کوئی چیز مثلاً کپڑے لے کر اپنا باقی حصہ دُوسرے ورثاء کے لئے چھوڑ دیں، جسے تخارج کہتے ہیں۔[٨]

نوٹ:- اولاد کو ہبہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سب کا حصہ برابر ہو، خواہ مذکر ہوں یا مؤنث، لہٰذا بعض کو دینا اور بعض کو نہ دینا جس سے انہیں ضرر پہنچے، شرعاً ناجائز ہے،[٩] لیکن اگر ایسا کرکے ہبہ کرنے والا فوت ہوچکا ہے تو ہبہ نافذ ہوگیا،[١٠] بشرطیکہ ہبہ مرض الوفات میں نہ ہوا ہو۔ واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۴۱۷/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

سوتیلے بیٹے کی طرف سے والد کو قرض یا ہبہ کے طور پر بھیجی گئی رقم کا حکم

سوال:- ایک شخص نے پہلی شادی کی تھی، اس سے تین لڑکیاں ہیں، اور بیوی فوت ہوگئی، اُس کے بعد دُوسری شادی کی جس سے ایک لڑکی ہوئی اور بیوی فوت ہوگئی، تیسری شادی ایک بچے کی ماں سے کی، یعنی اُس عورت کا شوہر سے ایک لڑکا تھا، وہ ساتھ لے کر آئی تھی، بعد میں وہ بچہ چلا گیا۔

اس لڑکے نے پندرہ بیس سال بعد رقم بھیجی تھی اور تحریر کیا تھا کہ مکان خریدو اور خرچ کرو اور اچھی زندگی بسر کرو، حج کو جاؤ، اپنی خواہش کے مطابق استعمال کرو۔ اب اس رقم سے سونا خرید لیا گیا، اس میں منافع ہوا، اور ایک رہائش کے لئے مکان خریدا گیا، اُس میں بھی منافع ملتا ہے، مکان میں مرحوم نے اپنی رقم بھی لگائی تھی، تیسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، اور وہ فوت ہوگئی، بیوی کے مرنے کے بعد شوہر بھی فوت ہوگیا، اب سوال یہ ہے کہ سوتیلے لڑکے نے جو رقم بھیجی تھی اُس کا کیا کیا جائے؟

(۱، ۴، ۵ و ۷) حوالے کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۳ اور ص:۴۴۹ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۲، ۳ و ۶) دیکھئے حوالہ ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۸) حوالہ کے لئے دیکھئے السراجی فی المیراث ص:۶۲ (طبع مکتبہ سیّد احمد شہیدؒ لاہور)۔
(۹) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۴۷ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۴۔
(۱۰) وفی الهندية كتاب الهبة الباب السادس ج:۴ ص:۳۹۱ (طبع رشیدیه) رجل وهب فی صحته كل المال للولد جاز فی القضاء ويكون آثمًا فيما صنع ....الخ. نیز دیکھئے حوالہ سابقہ۔

سوتیلے لڑکے نے جو رقم بھیجی تھی اُس کی کوئی تحریر بھی نہیں ہے کہ یہ رقم امانت ہے۔ دونوں شخصوں کے مرنے کے بعد لڑکا تحریر کرتا ہے کہ امانت ہے، اب تقسیم کے وقت دو بیویوں کی چار لڑکیاں ہیں اور ایک یہی سوتیلا لڑکا ہے، لہٰذا جو رقم آئی تھی اُس کا کیا جائے؟ اور مکان میں جو نفع ہوتا ہے اُس کا کیا کیا جائے؟ اور سونے میں جو منافع ہوتا ہے اُس کا کیا کیا جائے؟ اب لڑکیاں کہتی ہیں کہ یہ سب ہمارا ہے اور لڑکا کہتا ہے کہ یہ سب میرا ہے۔

تنقیح

نمبر۵ کے ضمن میں لکھا ہے کہ: ''لڑکے نے پندرہ بیس سال بعد رقم بھیجی تھی اور تحریر کیا تھا کہ مکان خریدو اور خرچ کرو'' اس بات کی وضاحت کریں کہ یہ رقم کس کو بھیجی تھی؟ اپنی ماں کو یا سوتیلے باپ کو؟ اور بھیجنے کا کیا مطلب ہے؟ جس کو بھیجی تھی اس کو اس کا مالک و قابض بنادیا تھا یا محض مکان خریدنے کے لئے بھیجی تھی اور مالک خود ہے؟

نمبر۶ میں یہ رقم جس سے سونا خریدا گیا کس کو بھیجی تھی؟ اور مالک و قابض بنایا تھا یا نہیں؟

نمبر۸ مرحومہ کے انتقال کے وقت اس کے والدین زندہ تھے یا نہیں؟ اور ان کے علاوہ کون کون سے رشتہ دار زندہ تھے؟ اور کیا اس کی میراث تقسیم ہوچکی ہے یا نہیں؟

جوابِ تنقیح

نمبر۵ رقم تو باپ کے نام آئی تھی، مگر ماں باپ دونوں کے خرچے کی تھی، اور لکھا تھا کہ آپ مکان خرید کر اُس میں آرام سے دونوں آباد ہوجائیں، اس کی ملکیت سے لڑکے کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

نمبر۶ سونا خریدنے کی علیحدہ رقم کوئی نہ تھی، مکان خریدنے کے لئے جو رقم تھی وہ ہی بڑی تھی، اُس سے سونا خرید لیا تاکہ منافع ہوکر رقم بڑھ جائے اور اچھا مکان لے لیں۔

نمبر۸ والدین مرحومہ کی زندگی میں وفات پاگئے تھے، مرحومہ نے لاولد وفات پائی، البتہ پہلے خاوند سے وہ لڑکا موجود ہے جو برما میں آباد ہے، اور جس نے اپنی حقیقی ماں اور سوتیلے باپ کے آرام کی خاطر رقم بھجوائی تھی، مگر اس سے مکان خریدا نہیں گیا، جبکہ وہ خرید مکان کی غرض سے تھی، مگر اس سے سونا خرید کر نفع کمایا جو بڑی رقم میں تبدیل ہوگئی۔ اب لڑکے کو جب سگی ماں اور سوتیلے باپ کی وفات کی خبر ملی اور پتہ چلا کہ میں نے جو رقم خرید مکان کے لئے بھجوائی تھی اُس کو سونا خرید کر منافع حاصل کیا ہے تو وہ اپنی رقم کا دیگر وارثان سے یہ کہہ کر مطالبہ کرتا ہے کہ یہ تو میں نے امانت کے طور پر جمع رکھنے کے لئے بھجوائی تھی، اب جھگڑا صرف یہ ہے کہ یہ رقم اُسے واپس کی جائے یا ترکے میں تقسیم کی جائے جس میں یہ بھی بقدرِ حصہ خود حق دار ہوگا۔

اس لڑکے کی حقیقی ماں پہلے فوت ہوئی اور سوتیلا باپ بعد میں فوت ہوا ہے، نیز واضح ہو کہ اب یہ رقم جس سے سونا خرید کر نفع کمایا تھا، ایک مکان کی خریداری میں لگ گئی ہے، جس میں سوتیلے باپ نے بھی کچھ رقم اپنی ڈال کر مکان خریدلیا تھا، جسے اپنی بیوی کے نام خریدا تھا وہ اس لڑکے کی حقیقی ماں ہے، اسی میں اُن کی سکونت تھی، اس لڑکے نے رقم بھجواتے وقت امانت کا لفظ نہیں لکھا تھا، اب امانت بتاتا ہے۔

تفصیل وارثان:- مرحومہ کی وفات کے وقت دُوسرا خاوند زندہ تھا، ایک پہلے خاوند کا لڑکا تھا (جس کی رقم کا جھگڑا ہے)، اور دُوسرے خاوند کی پہلی اور دُوسری بیویوں کی چار لڑکیاں تھیں، بعد میں خاوند کا انتقال جب ہوا تو اُس کی پہلی دو بیویوں سے چار لڑکیاں خاوند کے صلب سے موجود تھیں، اور تیسری بیوی کا پہلے خاوند سے ایک لڑکا تھا جو برما میں تھا۔ اس لئے ترکے میں ایک مکان جو تیسری بیوی کے نام سے خریدا تھا چھوڑا اور کچھ نقد رقم چھوڑی ہے، سوال جواب طلب یہ ہے کہ اس کے ترکے کی تقسیم کیسے ہوگی؟ بیوی کے نام خریدا ہوا مکان مرحومہ بیوی کا لڑکا مانگتا ہے جسے مرحوم کی لڑکیاں دینے پر رضامند نہیں ہیں، وہ کہتی ہیں کہ یہ تو ہمارے باپ کا ہے، جبکہ وہ بیوی کے نام سے خریدا تھا اور اس میں بڑی رقم بیوی کے لڑکے کی ہے، تھوڑی رقم مرحوم کی لگی ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر رقم بھیجنے والا لڑکا قسم کھا کر یہ کہے کہ میں نے جو رقم بھیجی تھی وہ قرض کے طور پر بھیجی تھی، ہبہ کے طور پر نہیں، تو اس کا قول معتبر ہوگا، اور یہ رقم اس لڑکے کو واپس کی جائے گی، مرحوم یا مرحومہ کے ترکے میں شامل نہیں ہوگی، لما فی ردّ المحتار: "ولو دفع دراهم وقال: أنفقها عليک، يکون قرضًا" (ج:۴ ص:۵۰۹)۔[1] وفيه أيضًا: "دفع دراهم الىٰ رجل وقال: أنفقها، ففعل فهو قرض....." (وفيه أيضًا): رجل اشترى حليا ودفعه الى امرأته واستعملته ثم ماتت ثم اختلف الزوج وورثتها أنها هبة أو عارية فالقول قولُ الزوج مع اليمين أنّه دفع ذٰلک اليها عارية لأنّه منكر للهبة" (ج:۴ ص:۵۲۲)۔[2]

البتہ یہ حکم صرف اتنی رقم کا ہے جو لڑکے نے بھیجی تھی، اس رقم کو تجارت میں لگا کر جو نفع حاصل ہوا وہ لڑکے کا نہیں ہے، بلکہ جس کو اس نے قرض دیا تھا اُس کا ہے،[3] اس سے معلوم کیا جائے کہ

---

(۱) ردّ المحتار، کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۹ (طبع سعيد) وفى الهندية ج:۴ ص:۳۷۵ (طبع رشيديه) رجل عنده دراهم لغيره فقال لهٗ صاحب الدراهم: اصرفها فی حوائجک، کان قرضًا .....الخ.

(۲) ردّ المحتار ج:۵ ص:۷۰۱ (طبع سعيد).

(۳) کیونکہ قرض لینے کے بعد مستقرض قرض کا مالک ہوجاتا ہے، اور قرض کی رقم اور اُس کا نفع اُسی کی ملکیت ہوتا ہے، حوالے کے لئے دیکھئے ص:۲۰۱ کا حاشیہ نمبرا۔

اس نے یہ قرض اپنی حقیقی ماں کو دیا تھا یا سوتیلے باپ کو؟ یا دونوں کو نصف نصف؟ پہلی صورت میں یہ نفع ماں کے ترکے میں شامل ہوگا، دُوسری صورت میں باپ کے ترکے میں، اور تیسری صورت میں نصف ماں کے ترکے میں اور نصف باپ کے ترکے میں شامل ہوگا، اسی طرح مکان میں جو رقم باپ نے خود لگائی تھی وہ بھی اس کے ترکے میں شامل ہوگی۔

جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب ماں کے انتقال کے وقت اگر اس کا کوئی اور رشتہ دار زندہ نہ تھا، تو اس کی کل متروکہ جائیداد و ساز و سامان میں سے پہلے اس کی تجہیز و تکفین کے اخراجات نکالے جائیں، پھر اگر اس کے ذمے کوئی قرضہ ہو تو اسے ادا کیا جائے، پھر کوئی جائز وصیت کی ہو تو اُسے $\frac{1}{3}$ کی حد تک نافذ کیا جائے، اس کے بعد اُس کے کل ترکے کو چار مساوی حصوں پر تقسیم کرلیں، ان میں سے ایک حصہ مرحومہ کے شوہر کا ہے، اور باقی تین حصے اُس کے حقیقی لڑکے کے ہیں جو برما میں مقیم ہے، اور اس کی سوتیلی بیٹیاں اس کی وارث نہیں ہیں۔

اور باپ کے انتقال کے وقت اگر اس کا کوئی اور رشتہ دار زندہ نہیں تھا تو تجہیز و تکفین، قرضوں کی ادائیگی، اور وصیت کے نفاذ کے بعد جتنا بھی مال ہو (اور اس میں اپنی مرحومہ بیوی کے ترکے سے ملنے والا $\frac{1}{4}$ حصہ بھی شامل ہے) اُسے مرحوم کی تمام لڑکیوں میں برابر تقسیم کردیا جائے، مرحوم کا سوتیلا بیٹا جو برما میں ہے، مرحوم کا شرعی واث نہیں ہے۔ یہ تفصیل اس وقت ہے جب مرحوم کا کوئی بھی رشتہ دار بیٹیوں کے سوا زندہ نہ ہو، اور اگر کوئی دُوسرا رشتہ دار مثلاً چچا، بھتیجا، ماموں، بھانجا، پھوپھی وغیرہ موجود ہو تو یہ مسئلہ دوبارہ معلوم کرلیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۹۲۰/۲۸ ج)

۱:- ورثاء کے امیر یا غریب ہونے کی صورت میں کل جائیداد کسی کو ہبہ یا وقف کرنا

۲:- متبنّیٰ (لے پالک) شرعاً وارث نہیں ہے

سوال:- میں لاولد ہوں اور میری کوئی اولاد نہیں ہے، میری زوجہ کا انتقال ۱۹۶۵ء میں میری زندگی میں ہوگیا، میرے کوئی بھائی یا بہن نہیں ہے اور نہ کبھی تھا، ایک مختصر شجرہ قلم بند کرتا ہوں:-

میری بیوی کے رشتے کی بہن (ماموں زاد بہن) کا لڑکا سید افسر علی ہے، جسے اُنہوں نے اور میں نے متبنّیٰ کیا جو معہ اپنے اہل و عیال کے میرے ساتھ رہتا ہے، میری ضعیف العمری میں میری ہر طرح خدمت کرتا ہے۔ میری جائیداد میری وفات کے بعد ان کو کس حصے میں پہنچتی ہے؟ دُوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنی جائیداد کا کچھ حصہ کلی طور پر اپنی زندگی میں دینا چاہتا ہوں، اگر کل جائیداد کسی کو دُوں یا وقف کروں تو اس میں کوئی اِشکال ہے؟
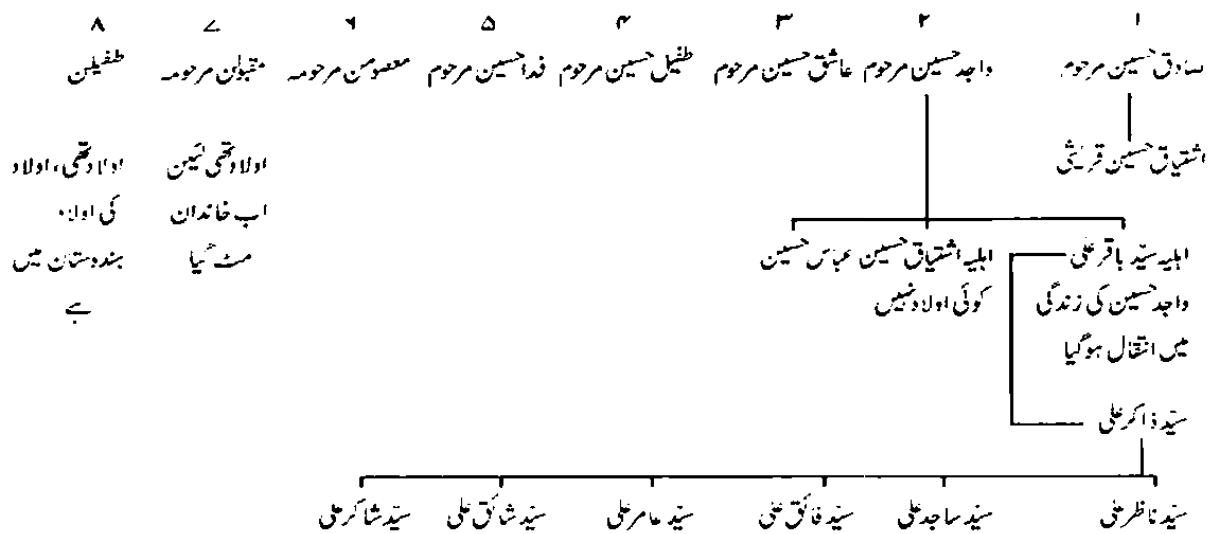
جواب:- اس سوال کا جواب یہ معلوم ہونے پر موقوف ہے کہ معصومن، مقبولن اور طفیلن مرحومات کی اولاد کی اولاد کی تفصیل کیا ہے؟ ان کے ہندوستان میں ہونے سے فرق نہیں پڑتا، اگر آپ کی کوئی خالہ، ماموں یا ان کی اولاد موجود ہو تو ان کی صراحت بھی ضروری ہے، آپ کی پھوپھیوں کی اولاد کی اولاد؟

بہرصورت اگر آپ کے ورثاء مالی اعتبار سے مستحکم ہوں تو آپ کے لئے جائز ہے کہ اپنی زندگی میں مرضِ وفات سے پہلے پہلے اپنی پوری جائیداد کسی کو ہبہ کردیں، یا وقف فرمادیں، لیکن اگر وہ مالی اعتبار سے کمزور اور نادار ہوں تو پوری جائیداد کسی کو دینا دُرست نہیں، کم از کم دو تہائی حصہ ورثاء کے لئے چھوڑ کر ایک تہائی حصہ وقف یا ہبہ کردیں، یا یہ وصیت کرجائیں کہ میری وفات کے بعد فلاں شخص کو دے دیا جائے۔

ویؤخذ ذٰلک من ردّ المحتار حیث قال: ان کانت الورثۃ فقراء ولا یستغنون بما یرثون فالترک أولیٰ ..... وان کانوا أغنیاء أو یستغنون بنصیبھم فالوصیۃ أولی .....

فالتفصيل انما هو في الكبار اما الصغار فترك المال لهم أفضل ولو كانوا أغنياء. (شامی ج:۵ ص:۳۷۳)[1]۔

اور جن صاحب کو آپ نے متبنیٰ بنایا وہ آپ کے وارث نہیں، البتہ آپ زندگی میں اُن کو اُن کی خدمت کی مکافات میں جو رقم یا جائیداد مناسب سمجھیں دے سکتے ہیں، اور ایک تہائی مال کی حد تک ان کے حق میں وصیت بھی کر سکتے ہیں۔　　واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲۲/۵/۱۳۹۸ھ
(فتویٰ نمبر ۵۲۴/۲۹ ب)

قبضے کے ساتھ جائیداد کسی کو دینے سے ہبہ دُرست ہوگیا اگرچہ کاغذات میں واہب کا نام ہو

سوال:- شیر محمد کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، شیر محمد نے اپنی مملوکہ و مقبوضہ زمین و مکانات اپنے تینوں بیٹوں میں تقسیم کر دیئے اپنی وفات سے تقریباً بارہ سال قبل، تقسیم کر کے اُن کو مالک و قابض بنادیا، سرکاری کاغذات میں زمین والد ہی کے نام تھی صرف موقع پر تقسیم کر کے قبضہ دے کر مالک بنادیا تھا، اس جائیداد میں بہنیں حصہ لے سکتی ہیں یا نہیں؟

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ شیر محمد مرحوم نے اپنی زندگی میں بحالتِ تندرستی اپنی جائیداد اپنے بیٹوں میں تقسیم کر کے ان کو مالک و قابض بنادیا تھا تو یہ ہبہ صحیح ہوگیا،[2] مذکورہ بیٹے اس جائیداد کے مالک ہوگئے،[3] اور شیر محمد کی وفات کے بعد اس کے دیگر ورثاء کا اس جائیداد سے کوئی تعلق نہیں، محض کاغذی طور پر جائیداد کے شیر محمد کے نام ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔　　واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۷/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱۹/۲۸ ج)

محرم کو ہبہ کرنے کے بعد رُجوع نہیں ہوسکتا

سوال:- والد نے اپنی زندگی میں اپنی املاک بطور ہبہ اپنی اولاد لڑکے اور لڑکیوں میں تقسیم کردی، اب یہ اولاد اس ملکیت پر فرداً فرداً قابض و متصرف ہیں، اس اولاد میں اسی ملکیت کے انتظامیہ کاروبار میں کچھ بالاشتراک کاروبار بھی ہیں، ان اشتراکی معاملات میں بعض صرف اپنے ذاتی مفاد کا خیال رکھتے ہیں، خواہ دُوسروں کا اس میں نقصان ہی ہو، ان معاملات میں ان کے والد نے بطور تحفظ حقوقِ

---

(۱) ردّ المحتار على الدر المختار، كتاب الوصايا ج:٦ ص:٦٥١، ٦٥٢.
(۲،۳) دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲ و۳۔

مساوات تجویزیں پیش کیں کچھ نے قبول کیں، کچھ نے انکار کردیا، یہاں تک کہ اولاد کے خلاف عملی کوشش بھی کی گئی، ایسی حالت میں والد صاحب کو اپنی موہوب ملکیت واپس لینے کا اختیار ہے یا نہیں؟

جواب:- جب والد نے اپنی املاک اپنی اولاد کو ہبہ کردی اور اُنہوں نے اُس پر قبضہ بھی کرلیا تو ہبہ تام ہوگیا،[1] اب باپ کوشیٔ موہوب کے واپس لینے کا اختیار نہیں، فلو وهب لذی رحم محرم منه لا يرجع، كذا في التنوير مع الشامی ج:۴ ص:۵۱۸۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۱/۲۸ ب)

ہبہ سے رُجوع دُرست نہیں

سوال:- میں یعنی حقیقی والد نے اپنا ایک ہی مکان اپنے پسر کے نام ہبہ کیا ہو، اور اپنی بزنس اور دُکان بلا معاوضہ پسرِ مذکور کے نام کردیا ہو تحریری، اور عرصہ آٹھ سال سے اُس کی انکم سے محروم رہا ہوں، میری سیکنڈ وائف سے چار بچے ہیں، اِن حالات کے پیشِ نظر اپنی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد واپس لینا چاہتا ہوں، کیا شرعاً اُس کا واپس لینا میرے لئے جائز ہے؟

جواب:- جب آپ نے اپنا مکان، دُکان اور کاروبار باقاعدہ اپنے بیٹے کو ہبہ کردیا، اور بیٹے نے اس پر قبضہ بھی کرلیا ہے تو اَب آپ کو واپس لینے کا اختیار نہیں رہا، فلو وهب لذی رحم محرم منه نسبًا ولو ذمّيا أو مستأمنًا لا يرجع. (شامی ج:۴ ص:۵۱۸)۔[3] البتہ آپ کے بیٹے کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ آپ کی ضروریات کا خیال رکھے، اور آپ سے صلۂ رحمی کرے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۳/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۳۲/۲۸ ب)

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) الدّر المختار مع ردّ المحتار، كتاب الهبة، باب الرّجوع في الهبة ج:۵ ص:۷۰۴ (طبع سعيد).
وفي صحيح البخاري، كتاب الهبة، باب الهبة للمشركين ج:۱ ص:۳۵۷ (طبع قديمي) عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ليس لنا مثل السوء الّذي يعود في هبته كالكلب يرجع في قيئه.
وفي الهداية، كتابُ الهبة، باب ما يصحّ رجوعه وما لا يصحّ ج:۳ ص:۲۹۲ (طبع مكتبه رحمانيه، وفي طبع مكتبه شركت علميه ج:۳ ص:۲۹۰) وان وهب هبة لذي رحم محرم منهُ لم يرجع فيها لقوله عليه السلام: "اذا كانت الهبة لذي رحم محرم لم يرجع فيها" (رواه البيهقي) وكذا في مجمع الأنهر، باب الرجوع ج:۳ ص:۵۰۳ (طبع غفاريه كوئته).
وفي الهندية ج:۴ ص:۳۸۶ (طبع رشيديه) والبحر الرّائق، كتاب الهبة ج:۷ ص:۲۹۴ (طبع سعيد) والبدائع ج:۶ ص:۱۳۲ (طبع سعيد) وفي شرح المجلّة لسليم رستم باز رقم المادّة:۸۶۶ كتاب الهبة، باب ثالث ج:۱ ص:۴۷۶ (طبع حنفيه كوئته) من وهب لاصوله وفروعه أو لأخيه أو اخته أو لأولادهما أو لعمه أو لعمته أو لخاله أو لخالته شيئًا فليس له الرجوع.

(۳) الدّر المختار مع رَد المحتار، كتاب الهبة ج:۵ ص:۷۰۴ (طبع سعيد).
نیز دیکھئے سابقہ حاشیہ۔

شرم و مروّت میں کئی دن تک کھانا کھلایا پھر اس کے بدلے رقم طلب کی تو کیا حکم ہے؟

سوال:- زید نے بکر کو کچھ رقم قرض کے طور پر دی، زید کے پاس بکر کے بچے بھی زیرِ تعلیم تھے، بکر زید کو کھانا دیتا رہا، کچھ عرصہ بعد بکر نہایت مفلس بن گیا اور ساتھ ہی ساتھ بیمار بھی ہوگیا، بکر پر ایسے حالات آئے کہ محلے کے ہر جاننے والے شخص سے قرض لیا حتیٰ کہ سود پر بھی قرض لیا، اسی دوران بکر نے زید کو بار بار کہا کہ وہ اپنا انتظام کرلے کیونکہ وہ کھانا دینے کی پوزیشن میں نہیں رہا، مگر زید آنکھیں بند کرکے بکر کے گھر کھانا کھاتا رہا، اگر کسی دن کھانا نہیں پہنچتا تھا تو بکر کے گھر جاکر مطالبہ کرتا تھا۔

بکر کا کہنا ہے کہ میرے بار بار کہنے کے باوجود جب زید میرے گھر کھانا کھاتا تھا تو میں صرف اہلِ محلّہ اور اقارب میں شرمندگی کی وجہ سے گھر سے کھانا بھیجتا رہا، کچھ دنوں کے بعد زید نے اپنے قرض کا مطالبہ کیا، مطالبے پر بکر نے کچھ رقم دے دی اور کچھ رقم بعد میں دینے کا وعدہ کیا، مگر زید نے پوری رقم یا آدھی رقم کا دوبارہ مطالبہ کیا، اور بات شرمندہ کرنے تک پہنچ گئی، اس پر بکر نے یہ کہا کہ جب سے میں نے تمہیں کھانا کھانے کا اپنا انتظام کرنے کا نوٹس دیا تھا اس کے بعد کے دنوں کے کھانے کی رقم میرے حوالہ کردو، کیونکہ اس میں مجھے نہ تو ثواب کی نیت تھی اور نہ میں نے اپنی خوشی سے کھلایا، صرف عزّت بچانے کی خاطر دیتا رہا۔

کیا بکر کا یہ مطالبہ شرعاً دُرست ہے کہ نوٹس کے بعد کے دنوں کے کھانے کی رقم دو؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر بکر زید کے گھر اس لئے کھانا کھاتا تھا کہ زید اس کا مقروض تھا، اور قرض کی وجہ سے زید اسے کھانا کھلاتا تھا تب تو یہ کھانا سود کے حکم میں ہوکر حرام ہوا،[1] اور اس کی قیمت قرض سے منہا کرنی ضروری ہے، لیکن اگر کھانا قرض کی وجہ سے نہیں، بلکہ پہلے سے باہمی تعلق کی بنا پر کھلاتا تھا تو جب بکر نے زید کو اپنے گھر کھانے سے منع کردیا تھا تو زید کے لئے جائز نہیں تھا کہ اُس کے گھر کھانا کھاتا، لقولہ علیہ السلام: "لا یحلّ مال امریء مسلم اِلّا بطیب نفس منہ"۔[2] اور بکر کی مرضی کے خلاف اس کے گھر کھانا کھاکر زید نے گناہ کا ارتکاب کیا، اس گناہ کی تلافی کے لئے دیانۃً زید پر واجب ہے کہ جتنے دن بکر کی مرضی کے خلاف اُس کا کھانا کھایا ہے اُتنے دن کے کھانے کی قیمت اس کو اَدا کرے، لیکن چونکہ بکر نے اس کو کھانا اپنے اختیار سے دیا ہے، خواہ لوگوں کی شرم کی بناء پر دیا ہو، اور اس پر کوئی اِکراہ نہیں تھا اور اس نے کھانا دیتے وقت زید کو یہ بھی نہیں کہا کہ میں

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

(۲) مشکوۃ المصابیح، باب الغصب والعاریۃ ص:۲۵۵ (طبع قدیمی کتب خانہ).

اس کی قیمت لوں گا، اس لئے اس کی طرف سے یہ ہبہ ہوگیا۔[1] اور اَب اس کے لئے اس کی قیمت کا مطالبہ کرنا دُرست نہیں، بالخصوص زید سے لئے ہوئے قرضے کو اس بناء پر روک لینا اس کے لئے جائز نہیں، بکر کو چاہئے کہ زید کی قرضے کی رقم واپس کردے اور زید پر دیانۃً لازم ہے کہ وہ کھانے کی قیمت بکر کو اَدا کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۳۸/۳۲ ج)

ایک بیوی کے نام سے خریدے گئے مکان میں واہب کی موت کے بعد دُوسری بیوی کے ورثاء کا دعویٰ میراث کرنا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین اس مسئلے میں، زید نے اپنے انتقال کے وقت چھ لڑکے اور ایک لڑکی اور ایک زوجہ چھوڑی۔ زید نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دُوسرا نکاح کیا تھا، پہلی بیوی سے دو لڑکے چھوڑے ہیں اور دُوسری بیوی سے چار لڑکے ایک لڑکی اور زوجہ چھوڑی۔ زید نے ایک زمین خریدی اپنی دُوسری بیوی کے نام سے جس کی رجسٹری بھی قانونی طریقے پر دُوسری بیوی کے نام سے کرائی، سرمایہ بھی قانونی طریقے پر اپنے کاروبار سے نکالا، اس پر مکان بھی تعمیر کروایا دُوسری بیوی کی اولاد کی زیرِ نگرانی مکان تعمیر ہونے کے بعد کتبہ بھی دُوسری بیوی کے نام کا لگوایا یعنی دُوسری بیوی کے نام پر اس مکان کا نام رکھا۔ سرمایہ، زمین اور مکان کی تعمیر یہ سب زید نے دیا، زید کے انتقال کے نو ماہ بعد دُوسری بیوی کا بھی انتقال ہوگیا، اب زید کی دُوسری بیوی کے لڑکے اور لڑکی کہتے ہیں کہ یہ مکان ہماری والدہ کا ہے اس لئے اس کے وارث ہم ہیں، کیونکہ یہ مکان زید نے اپنی زندگی میں ہماری والدہ کے نام سے تیار کرا کے قانونی طریقے سے ہبہ کردیا تھا، اب پہلی بیوی کے دونوں لڑکے بھی اس میں وراثت کا دعویٰ کرتے ہیں، یہ فرمائیں کہ شرعی اعتبار سے پہلی بیوی کے دونوں لڑکوں کو اس مکان میں ورثہ ملنا چاہئے یا نہیں؟

تنقیح

کیا زید مرحوم نے کبھی زبانی اس بات کا اظہار کیا تھا کہ انہوں نے یہ مکان اپنی دُوسری بیوی کی ملکیت کر کے خریدا ہے یا ان کو ہبہ کردیا ہے؟ نیز کیا کبھی ایسا ہوا کہ زید مرحوم نے اس مکان کا قبضہ

---

(۱) وفی بدائع الصنائع، کتاب الهبة ج:۲ ص:۱۲۴ والاذن نوعان صريح ودلالة ..... وامّا الدّلالة فهی أن يقبض الموهوب له العين فی المجلس ولا ينهاه الواهب فيجوز قبضه استحسانًا ....الخ.

وفی الشامية، کتابُ الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ قد أفاد أنّ التّلفظ بالايجاب والقبول لا يشترط بل تكفی القرائن الدّالة علی التّمليک كمن دفع لفقير شيئًا وقبضهٗ ولم يتلفّظ واحد منهما بشیء ....الخ.

اپنی دُوسری بیوی کو بلاشرکتِ غیر دے دیا ہو اور خود کسی اور مکان میں مقیم رہتے ہوں؟ ان سوالات کا جواب اسی کاغذ کی پشت پر لکھ کر دے دیں تو اِن شاء اللہ اصل مسئلے کا جواب دے دیا جائے گا۔

جوابِ تنقیح

زمین جب خریدی گئی اسی ارادے سے خریدی گئی کہ اس کی ملکیت موجودہ بیوی کی رہے گی، علاوہ اس کے زبانی بھی انتقال سے کچھ روز قبل انہوں نے موجودہ بیوی سے کہا کسی طرح کی بیوی کی بات پر کہ تیرے لئے تو میں اپنی ملکیت کا مکان چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ نیز مرحوم کی زندگی میں پیشگی ٹیکس فکس نہیں ہو رہا تھا، زید کے انتقال کے بعد یہ مسئلہ طے ہوا تب جملہ ٹیکس موجودہ بیوی کی اولاد دیتی رہی، کبھی ایسا ہوا نہیں کہ وہ خود کسی اور مکان میں رہے ہوں، بیوی موجودہ حال میں چونکہ ایک جھگڑے کی بات پر ہوتا دیگر کوئی دُوسرا خیال بھی اس شہر میں زید کا تھا بھی نہیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جبکہ زید اور اس کی بیوی دونوں کا انتقال ہو چکا ہے، معاملے کی صحیح نوعیت خود اَصحابِ معاملہ سے تو معلوم نہیں ہو سکتی، البتہ ظاہر حال کا تقاضا یہ ہے کہ یہ مکان بیوی ہی کی ملکیت ہے، بیوی کے نام رجسٹری اور بیوی اور اس کی اولاد کا اس مکان پر قبضہ بیوی کے نام کا کتبہ اور مرحوم کی زبانی گفتگو سب ظاہری طور پر اس بات کے قرائن ہیں کہ مرحوم نے یہ مکان اپنی زندگی ہی میں بیوی کی ملکیت کر دیا تھا،[1] اس صورت میں اگر پہلی بیوی کی اولاد قابلِ اعتماد گواہوں کے ذریعے یہ ثابت کر دے کہ اس مکان کو بیوی کے نام رجسٹری کرانا محض ایک بینامی کارروائی تھی اور حقیقت میں زید مرحوم نے یہ مکان بیوی کی ملکیت نہیں کیا تھا، تب تو یہ مکان ان کے ترکے میں شامل ہو کر ان کے تمام وُرثاء میں تقسیم ہوگا، لیکن اگر پہلی بیوی کی اولاد قابلِ اعتماد گواہوں کے ذریعے یہ ثابت نہ کر سکے تو اس مکان کو زید مرحوم کی دُوسری بیوی کی ملکیت سمجھا جائے گا،[2] اور اس میں پہلی بیوی کی اولاد کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۷/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱/۸۵۹ ج)

بیوی بچوں کی نافرمانی کی بناء پر اپنی ساری رقم صدقہ کرنے یا تبلیغ میں خرچ کرنے کا حکم

سوال:- میری بیوی اور بچوں کے درمیان کشیدگی روز بروز بڑھتی جارہی ہے، جس کی وجہ یہ

(۱ و ۲) وفی الشامية، كتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ قلت فقد افاد أن التلفظ بالايجاب والقبول لا يشترط بل تكفی القرائن الدّالة على التمليک كمن دفع لفقير شيئًا وقبضه ولم يتلفظ واحد منهما بشیء ....الخ.

نیز دیکھئے: امداد الفتاوی كتاب الهبة ج:۳ ص:۴۶۶۔

ہے کہ میں اپنے بڑے لڑکے کو غلط لڑکوں کی صحبت سے روکتا ہوں، نماز پڑھنے پر زور دیتا ہوں، لوگوں نے کہا کہ یہ بالغ ہے اپنی نماز روزے کا خود ذمہ دار ہے، لہٰذا اس سے کہنا اور بولنا چھوڑ دیا۔ میں نے بیوی کو کہا کہ وہ ٹی وی لانے کو کہتا ہے، منع کردو، میں اس کے خلاف ہوں۔ لیکن بیوی نے کوئی اثر نہیں لیا، اور وہ ٹی وی لے آیا، اس قدر زور سے بجاتا ہے کہ پریشان ہوجاتا ہوں۔ ماں لڑکے کی حمایت کرتی ہے، تھوڑی دیر گھر میں رہنا بھی محال ہوگیا ہے، صاحبزادے مجھے گھر سے نکل جانے کو کہتے ہیں، ہر اتوار زور زور سے بجا کر بہت پریشان کیا جاتا ہے، ان حالات میں میرا تبلیغی جماعت میں نکل جانے کا ارادہ ہے، لڑکا روزانہ پچاس ساٹھ روپے کماتا ہے، مکان پر دعویٰ کرتا ہے کہ مکان میرا ہے، گھر سے چلے جاؤ۔ دس بارہ ہزار روپیہ میرے پاس ہے، جس میں سے مسجد میں نصف صدقۂ جاریہ کے طور پر لگانا چاہتا ہوں، اور نصف اپنی ضرورت کے لئے رکھنا چاہتا ہوں، میرے لئے شرع کا کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کو اپنی زندگی میں اپنے روپے کے بارے میں اختیار ہے کہ اُسے جس جائز کام میں چاہیں صَرف کریں۔[1] البتہ آپ کی بیوی کا نفقہ آپ پر ہر حال میں واجب ہے،[2] لہٰذا اپنا، اپنی بیوی کا (اور اگر کوئی نابالغ اولاد ہو تو اس کا بھی)[3] نفقہ نکال کر باقی تمام مال میں آپ تصرف کرسکتے ہیں،[4] اُسے صدقۂ جاریہ میں بھی لگا سکتے ہیں اور تبلیغ کے کام میں بھی صَرف کرسکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۳/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۳۱۳/۲۸ ب)

ساری جائیداد بیٹی کو قبضے کے ساتھ ہبہ کردی تو ہبہ دُرست ہوگیا

سوال:- میرے منجھلے تائے مرحوم منشی حسام الدین صاحب جو میرے خسر بھی تھے، اولاد میں صرف ایک اکلوتی لڑکی (میری بیوی حسن بانو عرف حسنہ) تھی، میرے والد صاحب مرحوم منشی جمیل

(۱ و ۴) وفی شرح المجلّة للأتاسیّ ج:۴ ص:۱۳۲ رقم المادّة:۱۱۹۲ (طبع مکتبہ حقانیہ پشاور) کل یتصرّف فی ملکه کیف شاء لأنّ کون الشیء ملکًا لرجل یقتضی أن یکون مطلقًا فی التّصرف فیه کیفما شاء.

(۲) وفی شرح المجلّة لسلیم رستم باز ج:۱ ص:۶۵۴ رقم المادّة:۱۱۹۲ (طبع حنفیه کوئٹه) کل یتصرّف فی ملکه کیف شاء ....الخ.

وفی الدّر المختار، کتاب الطّلاق، باب النفقة ج:۳ ص:۵۷۲ (طبع سعید) ونفقة الغیر تجب علی الغیر بأسباب ثلاثة زوجیة وقرابة وملک فتجب للزوجة بنکاح صحیح علیٰ زوجها.

(۳) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۶۱۲ (طبع سعید) وتجب النفقة بأنواعها علی الحر (لطفله) یعمّ الأنثیٰ والجمع الفقیر. وفی الشامیة تحته (قوله بأنواعها) من الطّعام والکسوة والسکنیٰ ....الخ.

وفی البحر الرّائق باب النفقة ج:۴ ص:۲۰۱ (طبع سعید) قوله ولطفله الفقیر أی تجب النفقة والسکنیٰ والکسوة لولده الصغیر الفقیر ....الخ.

وفی الهندیة ج:۱ ص:۵۶۰ (طبع رشیدیه) نفقة الأولاد الصّغار علی الأب لا یشارکهُ فیها أحد کذا فی الجوهرة النیرة ....الخ.

الدین صاحب، اولاد میں بڑی بہن جن کا انتقال والد صاحب کی ہی زندگی میں ہوگیا تھا، ہم چار بھائی فریدالدین صاحب، بلیغ الدین و وحیدالدین صاحبان پاکستان ۱۹۴۷ء میں آگئے تھے، چوتھے محمد احمد صاحب مرحوم جو انڈیا ہی میں رہے، اوّل الذکر تین بھائیوں نے متروکہ جائیداد کے عوض جو ہند میں چھوڑ آئے تھے کلیم کر کے زمین حاصل کرلی، جبکہ محمد احمد صاحب انڈیا ہی میں رہ کر وفات پاگئے۔

والد صاحب قبلہ کے انتقال کو ۳۶ سال گزر گئے، میرے خسر منشی حسام الدین صاحب کے انتقال کو تقریباً ۴۶ سال گزر رے، گویا والد صاحب کی زندگی ہی میں میرے خسر کا انتقال ہوگیا تھا۔

ہند میں مشترکہ جائیداد کا انتظام بڑے تایا منشی محمد مہدی صاحب کیا کرتے تھے، جائیداد مشترکہ مقروض ہوگئی، اور حالانکہ میرے خسر کی اولاد میں صرف لڑکی تھی، ان پر بھی برابر کا قرضہ پڑا، حالانکہ لڑکی اکثر اپنے والد مرحوم کے ساتھ ان کی ملازمت پر رہی تھی، ضرورت محسوس ہوئی کہ بعد ادائیگی قرضہ جو زمین صحرائی اور سکنیٰ جائیداد رہ گئی تھی وہ حصہ برابر میں تقسیم کردی جائے، جس کی تکمیل بڑے تائے کی ہی زندگی میں ہوکر ہر ایک کے نام داخل خارج ہوگیا تھا۔

میرے خسر کو والد صاحب مرحوم اور دُوسرے اعزّہ نے مشورہ دیا کہ کل جائیداد زرعی و سکنیٰ اپنی لڑکی کے نام ہبہ کردیں، چنانچہ تمام جائیداد ہبہ کردی۔ خود والد صاحب نے ہبہ نامہ کی تکمیل کرائی اور بطورِ گواہ دستخط کئے، اور دستخط رجسٹرار کے سامنے خود میرے خسر نے باہوش وحواس کیا۔ ہبہ نامہ مکمل ہوگیا، سب جائیداد متعلقہ جو بلاشرکتِ غیرے میرے خسر کے نام چلی آرہی تھی، میری مرحومہ حسن بانو کے قبضے اور ملکیت میں چلی گئی، میرے خسر کے انتقال کے بعد دس سال میرے والد زندہ رہے لیکن کبھی انہوں نے اپنا شرعی حق میری بیوی سے طلب نہیں کیا، اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد اب میرے حقیقی بھائی وحیدالدین کو وسوسہ پیدا ہوا ہے کہ مسماۃ حسن بانو کی پاکستان میں حاصل کردہ جائیداد پر شرعی حق جتا کر اپنا حصہ طلب کروں۔ میرے حقیقی بھائی اور اُن کی اولاد، مرحومہ حسن بانو کے حقیقت میں شرعی وارث ہیں یا نہیں اور یہ حق دار ہیں یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کے خسر منشی حسام الدین صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں اپنی ساری جائیداد اپنی بیٹی حسن بانو کو ہبہ کردی تھی، اور حسن بانو نے اس پر قبضہ بھی کرلیا تھا، تو اب یہ ساری جائیداد حسن بانو کی ملکیت ہوگئی،[1] یہ آپ کے خسر کے ترکے میں شامل ہوکر اُن کے دُوسرے ورثاء کو نہیں مل سکتی، اور نہ اس میں کسی اور کا حصہ ہوسکتا ہے۔ البتہ یہ حکم اس صورت کا ہے جبکہ مذکورہ ہبہ منشی حسام الدین صاحب نے اپنے مرضِ وفات سے پہلے ہی تکمیل کردیا ہو،[2] اور اگر مرضِ وفات میں

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) دیکھئے حوالہ ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۳ وص:۴۴۹ کا حاشیہ نمبر۲۔

ہبہ کیا ہوتو اس کا حکم دوبارہ لکھ کر معلوم کرلیا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۲/ ۲۸ الف)

صرف کاغذات میں نام کرانے سے شرعاً ملکیت نہیں آئی

سوال:- میں بمعہ والد، والدہ اور تینوں بہنوں کے ہندوستان سے پاکستان پہنچے تھے، یہاں آکر میں (نورالحسن) اور میرے چھوٹے بھائی محمد سلیم دونوں نے دفتر میں نوکری کرنی شروع کردی، والد صاحب ضعیف العمر تھے، دونوں بڑی بہن حسن آرا بیگم، فردوس جہاں اپنے اپنے گھر رہنے لگیں، کیونکہ ہندوستان میں شادی ہوگئی تھی، تیسری بہن چھوٹی تھی وہ ساتھ رہتی تھی، پیسے جوڑ کر ناظم آباد میں ایک پلاٹ لیا، تھوڑا سا بنوا کر گورنمنٹ ہاؤس بلڈنگ فائنانس سے قرضہ لیا اور جوں جوں روپیہ ملتا گیا مکمل کرتا گیا۔

عرض یہ ہے کہ یہ پلاٹ ہم دونوں بھائیوں نے والدہ (بسم اللہ بیگم) کے نام سے لیا تھا، محض اس لئے کہ ہندوستان سے رنجیدہ حالات میں آئی ہیں، اس کا کچھ حصہ کرایہ پر بھی دیا ہوا تھا، کرایہ گھر میں خرچ ہوگیا تھا، اب والدہ کا انتقال ہوگیا ہے، اس سے قبل چھوٹی بہن کی بھی شادی ہوگئی تھی، والدہ اور ہم دونوں بھائی اور کرایہ دار اس مکان میں رہتے ہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس مکان میں بہنوں کا بھی حق ہے یا نہیں؟ جبکہ صرف والدہ کے نام تھا محض ان کی بزرگی کی وجہ سے، اس کا علم بہنوں کو بھی ہے۔

جواب:- اگر یہ دُرست ہے کہ یہ مکان آپ نے اپنی والدہ کو باقاعدہ ہبہ نہیں کیا تھا بلکہ محض کاغذات میں ان کے نام کر رکھا تھا، مالک آپ دونوں ہی تھے، تو یہ مکان آپ دونوں کی ملکیت ہے، اور یہ والدہ کے ترکے میں شمار نہ ہوگا، لہٰذا بہنوں کا اس مکان میں کوئی حق نہیں ہے۔ (۱)

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۲ھ

---

(۱) فی الدر المختار ج:۵ ص:۶۹۰ (طبع سعید کراچی) وتتم الهبة بالقبض الكامل.
وفيه أيضًا ج:۵ ص:۶۹۶ اتخذ لولده أو لتلميذه ثيابًا ثم أراد دفعها لغيره ليس له ذلك ما لم يبين وقت الاتخاذ انها عارية.
وفی الشامية قوله: لولده، أی الصغير وأمّا الكبير فلا بد من التسليم. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

زندگی میں تقسیمِ جائیداد کا حکم اور طریقۂ کار

سوال۱:- ایک شخص کی دو بیویاں ہیں، پہلی کو طلاق دے کر اُس کی اولاد کو اگر جائیداد میں سے کچھ نہ دے تو جواب دہ ہوگا یا نہیں؟

سوال۲:- اگر اُس کے پاس ورثے میں جائیداد آئی ہے اُس میں سے اس کو حصہ نہ دے تو گناہگار ہوگا یا نہیں؟

جواب۱:- زندگی میں کوئی شخص اپنی اولاد کو کچھ دینا چاہتا ہے تو ساری اولاد کو برابر دینا چاہئے،[۱] خواہ وہ اولاد موجودہ بیوی سے ہو یا مطلقہ بیوی سے، بعض کو دینا اور بعض کو نہ دینا دُرست نہیں۔[۲]

جواب۲:- اگر اُس شخص کو کسی اور شخص کی میراث سے کچھ حصہ ملا ہے تو اپنی زندگی میں اس میں سے کوئی حصہ کسی اور کو دینا واجب نہیں، وہ سارا حصہ خود رکھ سکتا ہے، لیکن اگر اولاد کو اس میں سے کچھ دینے کا ارادہ ہو تو برابر دے۔[۳]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۷۶۱)

مرض الموت میں ہبہ ''وصیت'' کے حکم میں ہوتا ہے

سوال:- ایک شخص مرض الموت کے بستر پر پڑا ہوا ہے، جس کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے، اس کا ایک بھائی اور ایک بہن ہے، اور کچھ بھتیجے ہیں، اس کے بعض بھتیجے جاکر وکیل کو اس کے گھر پر بلا لیتے ہیں اور اس شخص کے بھائی اور بہن کو معلوم ہوئے بغیر اسے بہلا کر اس کا ترکہ اپنے نام ہبہ لکھواتے ہیں، اور اس کے دستخط کراتے ہیں، اور اس سے پہلے اس کے مال پر اس کی موت سے پہلے بھتیجوں کا کسی قسم کا قبضہ نہ ہو تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟ کیا یہ ہبہ صحیح ہوگیا جبکہ اس ہبۂ مرحوم پر بھائی اور بہن ناراض ہیں۔

(۱ تا ۳) فی الھندیة ج:۴ ص:۳۹۱ الباب السادس فی الھبة للصغیر ولو وھب رجل شیئًا لأولادہ فی الصحة وأراد تفضیل البعض علی البعض ..... روی عن أبی حنیفة رحمہ اللہ تعالیٰ أنہ لا بأس بہ اذا کان التفضیل لزیادة فضل لہ فی الدِّین وان کانا سواء یکرہ، وروی المعلی عن أبی یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ انہ لا بأس بہ اذا لم یقصد بہ الاضرار وان قصد بہ الاضرار سوّی بینھم یعطی الابنة مثل ما یعطی الابن وعلیہ الفتویٰ.

فی البحر ج:۷ ص:۹۰ (طبع بیروت وفی طبع سعید ج:۷ ص:۲۸۸) المختار التسویة بین الذکر والانثیٰ فی الھبة. نیز دیکھئے ص:۴۶۷ کا حاشیہ نمبر ا و ۴۔

جواب:- چونکہ اس شخص نے بھتیجوں کو قبضہ نہیں دیا، اس لئے یہ ہبہ باطل ہوگیا، اور اگرچہ مرضِ موت میں ہبہ بحکم وصیت ہوتا ہے[1] لیکن اسی وقت جبکہ موہوب لہٗ کو قبضہ دے دیا گیا ہو،[2] قبضے کے بعد ثلثِ مال سے وہ ہبہ نافذ ہوتا ہے،[3] لیکن جب قبضہ ہی نہ دیا تو پھر ہبہ باطل ہوگیا، اور کل جائیداد اس کا ترکہ سمجھی جائے گی۔ لما فی الهندية: قال فی الأصل: ولا تجوز هبة المريض ولا صدقته الّا مقبوضة فاذا قبضت جازت من الثلث واذا مات الواهب قبل التسليم بطلت. (عالمگيرية، كتاب الهبة، باب ١٠ فی هبة المريض ج:۴ ص:۴۰۰)۔[4]

واللہ اعلم
۱۳۹۱/۴/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۳۴۲ الف)

والد کا کئی بیٹوں کو مکان ہبہ کرنا دُرست نہیں

سوال:- عبدالجبار نے ایک مکان تعمیر کرایا، اور اپنی دو لڑکیوں اور چار لڑکوں کے ساتھ اس میں آباد ہوگیا، عبدالجبار نے حالتِ صحت میں اس مکان کو اپنے چاروں بیٹوں کو زبانی ہبہ کردیا اور چاروں سے کہا کہ تم اس کے برابر کے مالک ہو اور اس مکان پر تمہارا قبضہ ہے، عبدالجبار نے کہا کہ میرا اس مکان کی ملکیت سے کوئی تعلق نہیں سوائے اس کے کہ میں اس مکان میں تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔ اس ہبہ کے گواہ موجود ہیں۔

انتقال کے وقت عبدالجبار اپنی اولاد کے ساتھ اس مکان میں رہائش اختیار کئے ہوئے تھا، کیا

(۱، ۲ و ۳) وفی ردّ المحتار، باب الرّجوع فی الهبة ج:۵ ص:۷۰۰ (طبع سعید) وهب فی مرضه ولم يسلم حتّی مات بطلت الهبة لأنّهٗ وان كان وصية حتّی اعتبر فيه الثلث فهو هبة حقيقة فيحتاج الی القبض ....الخ.

وفی تكملة حاشيه ردّ المحتار ج:۲ ص:۳۰۲ لأنّ الوصية تمليک بعد الموت ..... كذا الهبة فی مرضه لأنّ الهبة فی مرض الموت وصية.

وفی المحيط البُرهانی، كتاب الدعویٰ، الفصل الرابع والعشرون فی دعوی الوصية....الخ ج:۱۲ ص:۳۴۴ (طبع ادارة القرآن كراچی) ..... ان كانت الهبة فی حالة المرض فالجواب فيها كالجواب فی الوصية لأنّ الهبة فی مرض الموت وصية ....الخ

وفی شرح المجلّة لسليم رستم باز رقم المادّة: ۸۷۹ كتاب الهبة الفصل الثانی (طبع حنفيه كوئنه) اذا وهب واحد فی مرض موته شيئًا لأحد ورثته وبعد وفاته لم يجز سائر الورثة لا تصحّ تلک الهبة أصلًا لأنّ الهبة فی مرض الموت وصية .....الخ. وفی شرح المجلّة للأتاسیؒ كتاب الهبة الفصل الثانی فی هبة المريض رقم المادّة: ۸۷۹ ج:۳ ص:۴۰۳ (طبع مكتبه حبيبيه كوئنه) لأن هبته (أی المريض) وان كان هبة حقيقة لكن لها حكم الوصية.

وكذا فی الهندية ج:۴ ص:۴۰۰ كتاب الهبة، الباب العاشر فی هبة المريض (طبع رشيديه) والبزازية علیٰ هامش الهندية، كتاب الهبة، نوع فی هبة المريض ج:۶ ص:۲۳۹ (طبع رشيديه).

(۴) طبع رشيديه كوئنه.

ایسی صورت میں جبکہ وہ یعنی عبدالجبار مکان کے قبضے سے دستبردار ہو چکا تھا اور گواہوں کی موجودگی میں ہبہ کر چکا تھا، یہ مکان عبدالجبار کے ترکے میں شامل ہوگا؟ کیا عبدالجبار پر لازم تھا کہ وہ قبضہ دینے کے لئے وہ مکان خالی کر دیتا؟ قبضے سے مراد آباد ہونا ہے یا مالکانہ حقوق؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں عبدالجبار نے اپنے بیٹوں کو مکان کا جو ہبہ کیا وہ شرعاً دُرست نہیں ہوا، اور اب عبدالجبار کے تمام ورثاء اس مکان میں حق دار ہیں کیونکہ یہ ہبۃ المشاع ہے اور جب تک مکان کے الگ الگ حصے کر کے باقاعدہ تقسیم شدہ شکل میں ہبہ نہ کیا جائے ہبہ دُرست نہیں ہوتا، لما فی الکنز وسائر المتون: ولو وھب اثنان دار الواحد صح ..... لا عکسه وھو أن یھب واحد من اثنین کبیرین ولم یبین نصیب کل واحد عند أبی حنیفة لأنه ھبة النصف من کل واحد منھما ..... الخ. (البحر الرائق ج:۷ ص:۳۱۵)[1]. وقال فی الدر المختار: ولو سلمه شائعًا لا یملکه فلا ینفذ تصرفه فیه وقال الشامیؒ تحته: وکما یکون للواھب الرجوع فیھا یکون لوارثه بعد موته لکونھا مستحقة الرّد .... ومضمون بالھلاک .... فحیث علمت أنه ظاھر الروایة، وأنه نص علیه محمد ورووه عن أبی حنیفة ظھر أنه الذی علیه العمل وان صرّح بأن المفتی به خلافه ولا سیما انه یکون ملکا خبیثًا." (شامی ج:۴ ص:۵۱۱)[2]۔

لیکن ہبہ دُرست نہ ہونے کی یہ وجہ اس وقت ہے جبکہ عبدالجبار نے مکان کے باقاعدہ حصے بنا کر اور تقسیم کر کے ہبہ نہ کیا ہو، اگر باقاعدہ حصے بنا کر تقسیم کر دیئے تھے تو اس صورت میں مسئلہ دوبارہ پوچھ لیں، لیکن یہ تصریح کریں کہ عبدالجبار کونسے بیٹے کے حصے میں رہتا تھا؟　　　　واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۲/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۵۱/۲۸ ج)

خدمت گار بیٹے کو چند اشیاء ہبہ کرنے کا حکم

سوال:- میں نے والدہ کی بہت زیادہ خدمت کی، والدہ کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے، انہوں نے انتقال سے کافی پہلے اپنی تندرستی کے زمانے میں ایک ڈولی، ایک بڑی پیٹی، ایک چھوٹی پیٹی اور کچھ زیور مجھے دے کر کہا: "سب کو دے چکی ہوں، تم نے میری بہت خدمت کی ہے، یہ چیزیں میں تمہیں دیتی ہوں" کیا یہ سامان تمام بھائیوں میں تقسیم ہوگا یا یہ صرف میری ذاتی ملکیت ہے؟

(فیاض اعوان)

---

(۱) البحر الرائق ج:۷ ص:۲۸۹ کتاب الھبة (طبع سعید).

(۲) الدر المختار ج:۵ ص:۶۹۲ کتاب الھبة (// //).

جواب:- آپ کی والدہ صاحبہ نے اپنی صحت کی حالت میں (یعنی مرضِ وفات سے پہلے پہلے)[1] جو کچھ آپ کو دے دیا اور آپ نے اس پر قبضہ بھی کرلیا ہے،[2] وہ آپ کی ملکیت ہے، اس میں ان کے دُوسرے ورثاء کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۲۸/۱۲/۲۷ھ

(۱و۲) دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲و۳۔

﴿کتاب الودیعۃ والعاریۃ﴾
(امانت اور عاریت کے مسائل کا بیان)

عاریت پر دیئے ہوئے زیورات کی بعینہٖ واپسی یا پوری قیمت کا مطالبہ کرنا جائز ہے

سوال:- آج سے بیس پچیس سال پہلے اپنی بڑی بہن کو مالی مشکلات میں مبتلا دیکھ کر بطور ہمدردی کے سترہ تولے کے زیورات اُن کو اس شرط پر دیئے تھے کہ فی الحال ان کو بینک میں رہن رکھ کر اپنی مشکلات دُور کریں، اور جب اُن کے پاس روپیہ ہو تو زیور چُھڑا کر مجھے واپس کردیں۔ اس کا وعدہ بھی مجھ سے اُنہوں نے کیا تھا کہ ایسا ہی کیا جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا، جائیداد کا سولہ سترہ ہزار روپے بھی انہیں ملا جو مجھ سے پوشیدہ رکھا گیا، مگر کسی نہ کسی طرح مجھے اس کا علم ہوگیا، میں نے زیور کا مطالبہ کیا تو معلوم ہوا کہ روپے اُن کے لڑکے نے وصول کئے ہیں، اور اُس سے اُنہوں نے زیور کے چُھڑانے کے لئے کہا بھی کیونکہ زیور اُسی کے نام سے رکھا گیا تھا اور روپیہ بھی اُس کے پاس ہی تھا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا، اور زیور نیلام ہوگیا اور نہ چھڑا کر دیا اور نہ اُس وقت اُس کی قیمت ادا کی، اب کہتا ہے کہ جس زمانے میں زیور نیلام ہوا ہے اُس وقت کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں، میں نے کہا میں نے تو صرف رہن کی اجازت دی تھی، نیلام کروانے کو تو نہیں کہا تھا، اُس کو نیلام نہ ہونے دینے کی ذمہ داری مجھ پر نہ تھی، میں نے سونا دیا تھا اُتنا سونا لوں گی، یہ مطالبہ میرا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کی بہن پر واجب ہے کہ جیسا زیور آپ نے ان کو دیا تھا یا تو ویسا ہی بنوا کر آپ کو واپس کریں، یا اُس کی جو قیمت واپسی کے دن ہو وہ قیمت ادا کریں، اور آپ کا مطالبہ شرعاً جائز ہے، لما فی الدر المختار: فان آجر المستعیر أو رهن فهلكت ضمنه المعير.[1] (شامی ج:۴ ص:۵۰۳)۔ وفیه: إلّا اذا استعارها ليرهنها فتكون كالإجارة وقال الشامی تحته:

---

(۱) الدّر المختار کتاب العارية ج:۵ ص:۶۷۹ (طبع سعيد).
وفی درر الحكام شرح غرر الأحكام كتاب العارية ج:۷ ص:۱۳۴ فان آجر أو رهن المستعير فهلكت العارية ضمّنه المعير أی ضمن المعير المستعير.
وكذا فی الهندية الباب الخامس فی تضييع العارية وما يضمنه المستعير وما لا يضمن ج:۴ ص:۳۶۷ (طبع رشيديه كوئٹه).

لأن هٰذه اعارة فيها منفعة لصاحبها فانها تصير مضمونة في يد المرتهن وللمعير أن يرجع على المستعير بقيمته. (شامی ج:۴ ص:۵۰۵)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۵۴۴/۲۸ ب)

گھڑی ساز کے پاس عرصہ دراز سے رکھی ہوئی گھڑیوں کا حکم

سوال:- زید گھڑی سازی کی دُکان کرتا ہے، بعض صاحب گھڑیاں مرمت کے لئے دے کر واپس لینے نہیں آتے، اور نہ اُمید ہے کہ وہ کبھی واپس آکر لے جائیں گے، اور پڑے ہوئے تقریباً دو تین سال تک ہوچکے ہیں، باوجود حفاظت سے ہونے کے زنگ آلود ہوکر خراب ہونے کا اندیشہ ہے، ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟ کیا زید ان کے بدلے میں رقم خیرات کرکے اپنی ملک بنا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مذکورہ میں زید کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ گھڑیوں کی قیمت خیرات کرکے اپنی ملک بنالے، بلکہ تمام عمر ممکن حد تک ان کی حفاظت کرنی چاہئے، تاوقتیکہ اصل مالک اُسے لے جائے یا اس کی طرف سے کوئی ہدایت موصول ہو، یا اس کی موت کا علم ہوجائے، تو اس کے ورثہ کے سپرد کردیا جائے، کیونکہ یہ گھڑیاں زید کے پاس بطورِ اَمانت ہیں، اور اَمانت کو لقطہ کی طرح صدقہ نہیں کیا جاسکتا۔

دليل الصغرىٰ في قول الهندية وحكم الأجير المشترك أن ما هلك في يده من غير صنعه فلا ضمان عليه في قول أبي حنيفة. (عالمگیریة ج:۴ ص:۵۱۸)۔[2] ودليل الكبرىٰ في قوله غاب المودِع ولا يدري حياته ولا مماته يحفظها أبدًا حتّٰى يعلم بموته وورثته كذا في الوجيز للكردري ولا يتصدق بها بخلاف اللقطة كذا في الفتاوىٰ العتابية. (عالمگیریة ج:۴ ص:۳۵۶)۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۵/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع
۱۳۸۸/۲/۲۵ھ

---

(۱) الدّر المختار مع ردّ المحتار كتاب العارية ج:۵ ص:۶۸۲ (طبع سعيد).

(۲) الهندية ج:۴ ص:۵۰۰ باب:۲۸ (طبع مكتبه رشيديه) وفي المحيط البُرهاني كتاب الاجارة الفصل الثامن والعشرون في بيان حكم الأجير الخاص والمشترك ج:۱۲ ص:۳۹ (طبع ادارة القرآن كراچی) ومن حكم الأجير المشترک ان ما هلک في يده من غير صنعة فلا ضمان عليه في قول أبي حنيفة وهو قول زفر والحسن رحمهما الله، وانّه قياسٌ... الخ.

(۳) الهندية باب:۷ ج:۴ ص:۳۵۴ (طبع مكتبه رشيديه) وفي الشامية كتاب الايداع ج:۵ ص:۶۷۲ (قبيل كتاب العارية) (طبع سعيد) غاب ربّ الوديعة ولا يدري أهو حيّ أم ميّت يمسكها حتّى يعلم موته ولا يتصدق بها بخلاف اللّقطة ....الخ.

وفي المحيط البرهاني كتاب الوديعة الفصل العاشر في المتفرّقات ج:۸ ص:۳۱۷.

(۱۰۳۴) في فتاوى أبي اللّيث رجل استودع رجلًا ألف درهم ثم غاب ربّ الوديعة لا يدري أحيّ هو أم ميّت فعليه أن يمسكها حتّى يعلم موته ولا يتصدق بها بخلاف اللّقطة.

﴿کتاب اللّقطة﴾

(گری پڑی ہوئی چیزوں کا بیان)

سیلاب میں ملنے والی مختلف اشیاء کا حکم

سوال:- میں شٹرنگ کا کام کرتا ہوں، یعنی چھتوں کی ڈھلائی کے وقت تختے بچھا کر اس کو دُرست کر دیتا ہوں تاکہ ڈھلائی کرنے والے اُس پر ڈھلائی کر سکیں۔ تختہ میرا ذاتی ہوتا ہے، میں اس کی اُجرت وصول کرتا ہوں، اس سیلاب میں ہمارے یہ تختے بہہ گئے، بہت سے دُوسرے لوگوں نے بھی اُٹھالئے، اور کچھ تختے کسی جگہ پر پڑے ہوئے ہیں، لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ تختے میرے ہیں یا نہیں؟ کیا ایسی حالت میں یہ تختے میں اُٹھا سکتا ہوں؟

جواب:- اگر علامات وقرائن سے گمان غالب اس بات کا ہوجائے کہ یہ تختے آپ ہی کے ہیں، تو آپ ان کو اُٹھا کر لے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ کوئی دُوسرا ان کا دعوے دار نہ ہو، اور اگر گمان غالب نہیں ہے یعنی دونوں احتمال برابر ہیں تو پھر اس پر لقطہ کا حکم جاری ہوگا۔ یعنی پہلے تو ان کے مالک کو تلاش کریں،[1] اگر مالک کے ملنے سے مایوس ہوجائے،[2] تو اگر خود مستحقِ زکوٰۃ ہوں تو اپنے استعمال میں لے آئیں، ورنہ کسی مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کردیں،[3] وغالب الظنّ عندهم ملحق باليقين وهو الذى

(۱، ۲، ۳) وفى الهندية كتاب اللّقطة ج:۲ ص:۲۸۹ و ص:۲۹۰ (طبع رشيديه) اذا رفع اللّقطة يعرفها ..... وفى هذا الوجه لهٗ أن يأخذها ويحفظها ويعرفها حتّى يوصلها الى صاحبها.

وفيها أيضًا ج:۲ ص:۲۸۹ ويعرف الملتقط اللّقطة فى الأسواق والشوارع مدّة يغلب علىٰ ظنّه ان صاحبها لا يطلبها بعد ذلك هو الصحيح ..... ثم بعد تعريف المدّة المذكورة الملتقط مخيّر بين أن يحفظها حسبة وبين أن يتصدق بها .....الخ.

وفى الدّر المختار كتاب اللقطة ج:۴ ص:۲۷۸ (طبع سعيد) وعرّف أى نادى عليها حيث وجدها وفى المجامع الى أن علم أن صاحبها لا يطلبها.

وفى الشامية تحته (قوله الىٰ ان علم ان صاحبها لا يطلبها) لم يجعل للتّعريف مدّة اتباعًا للسرخسى فانه بنى الحكم على غالب الرّأى فيعرّف القليل والكثير الىٰ أن يغلب على رايه ان صاحبهٗ لا يطلبه وصحّحه فى الهداية وفى المضمرات والجوهرة وعليه الفتوىٰ .....الخ.

وفى الفتاوى التاتارخانية كتاب اللقطة ج:۵ ص:۵۸۵ (طبع ادارة القرآن) .....وفى هذا الوجه لهٗ أن يأخذها ويحفظها ويعرّفها حتّى يوصلها الى صاحبها.

وفى بدائع الصنائع، كتاب اللّقطة، فصل فى بيان ما يصنع باللّقطة ج:۸ ص:۳۳۳ ثم اذا عرّفها ولم يحضر صاحبها مدّة التّعريف فهو بالخيار ان شاء أمسكها الى أن يحضر صاحبها وان شاء تصدّق بها على الفقراء.

وفى الشامية، كتاب اللّقطة ج:۴ ص:۲۷۹ (طبع سعيد) أى فينتفع الرّافع بها لو فقيرًا والّا تصدق أى من رفعها من الأرض.

وفى بدائع الصنائع، كتاب اللّقطة، فصل فى بيان ما يصنع باللّقطة ج:۹ ص:۳۳۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وان كان فقيرًا فان شاء تصدق بها على الفقراء وان شاء أنفقها على نفسه.

وفى البحر الرّائق، كتاب اللقطة ج:۵ ص:۱۵۷ (طبع سعيد) قوله وينتفع بها لو فقيرًا والّا تصدق على أجنبى ولأبويه وزوجته وولده لو فقيرًا أى ينتفع الملتقط.

وكذا فى الهداية كتاب اللّقطة ج:۲ ص:۶۱۸ (طبع شركت علميه ملتان)

يبتنی عليه الأحكام، يعرف ذلک من تصفيح كلامهم في الأبواب، صرحوا فی نواقض الوضوء بأن الغالب كالمتحقق. (الاشباہ والنظائر ج:۱ ص:۹۴، قاعدہ:۳)[۱]۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۲۹/۸/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۸۸۷/۲۸ ج)

مسافر سامان رکھ کر چلا گیا ہو تو اُس کے سامان کا حکم

سوال:- ایک آدمی ہمارے ساتھ سفر میں تھا، راستے میں وہ کہیں اُتر گیا اور اُس کا سامان ہمارے پاس رہ گیا، اور اس شخص کو ہم جانتے بھی نہیں ہیں، تقریباً سات سال ہونے والے ہیں، اب اس سامان کو کیا کیا جائے؟

جواب:- اگر وہ شخص زندہ ہو اور اس کا پتہ معلوم ہو تو اس کو سامان پہنچائے،[۲] اور اگر وہ زندہ نہ ہو تو اس کے ورثاء کو پہنچا دے،[۳] اگر اس کا پتہ معلوم نہ ہو تو اُسے اس وقت تک تلاش کیجئے جب تک یہ خیال ہو کہ وہ شخص سامان کی تلاش میں ہوگا، اور جب ملنے سے مایوسی ہو جائے تو اُسے صدقہ کر دیجئے۔[۴]

واللہ سبحانہ اعلم
۲/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۰۴/۲۸ ج)

---

(۱) الاشباہ والنظائر ج:۱ ص:۳۷ فائدۃ:۲ قاعدۃ:۳ (طبع سعید).
(۲و۴) حوالہ جات اور تفصیلی عبارات کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔
(۳) کیونکہ زندہ نہ ہونے اور اُس کے ورثاء کا بھی پتہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں ایک مخصوص مقدار کی حد تک یہ مال لقطہ شمار ہوگا۔
وفی الدّر المختار، كتاب اللّقطة ج:۴ ص:۲۸۴ (طبع سعید) وفی الحاوی: غريب مات في بيت انسان ولم يعرف وارثهٗ فتركتهٗ كلقطة ما لم يكن كثيرًا فلبيت المال بعد الفحص عن ورثته سنين فان لم يجدهم فله لو مصرفًا.
وفی المحيط البُرهانی، كتاب اللّقطة، الفصل الثانی فی تعريف اللّقطة وما يصنع بها بعد التعريف ج:۸ ص:۱۷۳ (طبع ادارة القرآن كراتشی) ۹۸۷۹ فی وديعة أهل سمرقند غريب مات فی دار رجل وليس له وارث معروف وخلف من المال ما يساوی خمسة دراهم وصاحب الدّار فقير فأراد أن ينفقها علىٰ نفسه فله ذلک لأنّه فی معنی اللّقطة.
وفی البحر الرّائق، كتاب اللّقطة ج:۵ ص:۱۵۸ قبيل كتاب الاباق (طبع سعید) وفی الولوالجية هی لو مات غريبٌ فی دار رجل ومعه قدر خمسة دراهم فأراد صاحب البيت أن يتصدّق علىٰ نفسه ان كان فقيرًا فله ذلک كاللّقطة ولم يصرّحا بما زاد على الخمسة وفی الحاوی القدسی واذا مات الغريب فی بيت انسان وليس لهٗ وارث معروف كان حكم تركته كحكم اللّقطة إلّا اذا كان مالًا كثيرًا يكون لبيت المال بعد البحث والفحص عن ورثته سنين. وفی الخانية رجل غريب مات فی دار رجل وليس لهٗ وارث معروف وخلف ما يساوی خمسة دراهم وصاحب الدّار فقير ليس لهٗ أن يتصدّق بهٰذا المال علىٰ نفسه لأنّه ليس بمنزلة اللّقطة وهو مخالف لما ذكرنا والأوّل أثبت وصرّح به فی المحيط.
وفی مجمع الأنهر فی شرح ملتقى الأبحر الانتفاع باللّقطة.
وفی الاختيار رجلٌ غريب مات فی دار رجل ليس لهٗ وارث معروف وخلّف مالًا وصاحب المنزل فقيرٌ فله الانتفاع به بمنزلة اللّقطة وفی الخانية خلافهٗ.
نیز دیکھئے: امداد الأحكام، كتاب الوديعة والعارية ج:۳ ص:۶۰۷ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

﴿کتاب الغصب والضمان﴾
(غصب اور ضمان کے مسائل کا بیان)

مسجد کی دُکان پر ناجائز قبضہ کرنے اور کرایہ ادا نہ کرنے کا حکم

سوال:- ایک تعمیر شدہ مسجد سے ملحقہ قطعہ زمین پر مسجدِ مذکور کے مجوّزہ توسیعی نقشے کے مطابق ایک دِینی مدرسہ، وضوء خانہ، اور مسجد و مدرسہ کے مستقل اِخراجات کو پورا کرنے کے لئے پختہ دُکانیں تعمیر کی گئیں، تعمیر سے قبل اس قطعہ زمین واقع شمالی کنارے پر تین کیبن رکھے ہوئے تھے، جن میں سے دو کیبن والے پابندی سے مسجد کو کرایہ ادا کر رہے تھے، مگر درمیان کے کیبن والا اپنے اثر و رُسوخ کی بناء پر جبراً قابض تھا، اور کرایہ نہیں دیتا تھا۔ اس کے بعد اپنی علالت کے باعث اُس نے وہ کیبن کرایہ پر دیا، اور کرایہ دار سے کرایہ وہ خود وصول کرتا رہا، اس درمیان میں وہ شخص فوت ہوا اور اس کے بعد اس کی بیوی اس پر قابض تھی، جب وہاں پر پختہ دُکانیں بننی شروع ہوئیں تو ان کو یہ نوٹس دیا گیا کہ تم اپنا کیبن اُٹھالو، جب دُکانیں پختہ تعمیر ہوگئیں تو متوفی کی بیوی نے پختہ دُکان کا مطالبہ کیا، مسجد کمیٹی کے ایک ممبر نے جو متوفی کی بیوی کا رشتہ دار ہے، اس کو دِلوانے کی کوشش کی اور اپنی ضمانت پر دُکان دینے کی درخواست کی، ہرچند کہ متوفی نے مسجد کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا، بیوہ جان کر دُکان کو ان کے قبضے میں اسی شرط پر دیا گیا کہ کرایہ سے دس روپیہ ماہوار مسجد میں داخل کرتی رہے، مگر اب وہ دُکان کا پچاس روپے کرایہ وصول کرتی ہے مگر مسجد کا وہ دس روپیہ نہیں دیتی، اب صورتِ مذکورہ میں متوفی کا قبضہ تسلیم کیا جائے گا اور کیا اَز رُوئے شریعت بیوہ کے مالکانہ حقوق تسلیم کئے جائیں گے؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات دُرست ہیں تو متوفی کی بیوہ کا کوئی مالکانہ حق دُکان پر نہیں ہے، ان پر واجب ہے کہ وہ مسجد کی دُکان کا مقررہ کرایہ ادا کریں، اور اگر اَدا نہیں کرتیں تو مسجد کی دُکان خالی کردیں، یوں تو کسی بھی مسلمان کے حق پر ناجائز قبضہ کرنا سخت حرام ہے،[1] اور ناجائز

(۱) وفی المشکوٰۃ، باب الغصب والعاریۃ ص:۲۵۵ (طبع قدیمی کتب خانہ) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یحلّ مال امرئ مسلم الّا بطیب نفسٍ منہ. نیز دیکھئے ص:۴۸۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

ہے، لیکن خاص طور سے مسجد کے کسی حق کو دبالینا اور زیادہ وبال کا موجب ہے۔ واللہ اعلم

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۸۳/۱۹ الف)

مال برآمد کرنے کی صورت میں اگر مال راستے میں ہلاک ہوجائے تو جہاز کمپنی یا انشورنس کمپنی سے ضمان لینے کا حکم

سوال:- جہاز میں جو مال آتا ہے وہ راستے میں نقصان کا شکار یا ضائع ہوجاتا ہے، اس نقصان کا بدلہ انشورنس والے اداء کرتے ہیں، شاید یہ جائز نہیں، دُوسری صورت میں یہ جہاز راں کمپنی والے اس نقصان کی رقم ادا کرتے ہیں جو نقصان کے مال کے برابر یا اس سے کچھ کم ہوتا ہے، کیا جہاز راں کمپنی سے اس نقصان کا بدلہ لینا جائز ہے؟

تنقیح

پہلے چند اُمور کی وضاحت کریں، وضاحت پر کچھ بتایا جاسکے گا۔

۱:- کیا جہاز راں کمپنی کو کرایہ کے علاوہ کچھ رقم پیشگی دینی پڑتی ہے یا نہیں؟

۲:- اگر صرف انشورنس کرادیا جائے تو کیا تب بھی جہاز راں کمپنی سے نقصان وصول کیا جاسکتا ہے؟ اگر وصول کیا جاسکتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

۳:- اگر دونوں سے علیحدہ علیحدہ معاملہ کیا جائے تو کیا جب بھی کسی ایک ہی سے وصول کرنا ہوگا یا دونوں سے؟ اگر نہیں تو کیا وجہ؟

۴:- اگر انشورنس نہ کرایا جائے اور جہاز راں کمپنی کو بھی پیشگی کچھ رقم نہ دی جائے تو کیا اس کے باوجود جہاز راں کمپنی نقصان دیتی ہے؟

جوابِ تنقیح

۱:-نہیں، جہاز راں کمپنی صرف کرایہ وصول کرتی ہے، اور اس سے زیادہ مزید کچھ نہیں لیتی۔

۲:- جی ہاں، وصول کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ اصل بنیادی ذمہ داری جہاز کمپنی کی ہے کہ مال معاہدے کے مطابق پورا پورا جگہ پر پہنچائے، اس کی مزید وضاحت کردُوں کہ اس کی مثال تقریباً

ایسی ہے کہ زید کے ذمہ آپ کوئی کام کرتے ہیں اور اس کا ضامن بکر بن جاتا ہے کہ اگر زید نے یہ کام پورا نہ کیا تو میں ذمہ دار ہوں، لہٰذا دراصل اصلی ذمہ داری تو زید کی ہے جو مثل جہاز کمپنی کے ہے، اور بکر مثل انشورنس کمپنی کے۔

دراصل لوگ عام طور پر اپنے نقصان ایسی صورت میں انشورنس کمپنی سے لیتے ہیں، کیونکہ اکثر لوگ انشورنس پالیسی اصل لاگت سے کچھ بڑھ کر کرواتے ہیں، اس کے برعکس جہاز راں کمپنی سے وصول یابی میں دو چار ماہ لگ جاتے ہیں اور صرف نقصان وہی ملتا ہے جو مال کی اصل لاگت ہوتی ہے، اور کچھ زیادہ نہیں ملتا۔

بہرحال اس سلسلے میں ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ نقصان کی رقم صرف ایک ذریعے ہی سے وصول ہوسکتی ہے، یعنی یا تو جہاز کمپنی سے یا انشورنس کمپنی سے، اس کی مزید وضاحت کردوں۔

الف:- انشورنس ہو یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں جہاز کمپنی ذمہ دار ہے کہ نقصان کی اصل لاگت اداء کرے، کیونکہ جیسا اُوپر عرض کیا کہ اصل ذمہ داری تو جہاز کمپنی کی ہے کہ وہ مال پورے کا پورا صحیح طور پر مقام پر جس سے کرایہ وصول کیا ہے اس کو پہنچائے، جہاز راں کمپنیاں پوری دُنیا میں ہیں، اور سب کا قانون یکساں ہے، دُنیا میں ایسے ملک بھی ہیں جہاں انشورنس کا نظام نہیں ہے، اگر ہے بھی تو حکومت کی طرف سے انشورنس کرانا لازمی نہیں ہے۔

ب:- اگر انشورنس ہے تو نقصان وصول کرنے کے لئے دو راستے ہیں، (اے) جہاز کمپنی، (بی) انشورنس کمپنی۔ اور دونوں راستوں کی وضاحت یہ ہے:-

الف:- جہاز کمپنی سے اس صورت میں کئی ماہ لگ جاتے ہیں، اور کئی قانونی پیچیدگیاں دُور کرنی پڑتی ہیں، اور رقم صرف اتنی ملتی ہے جتنی مال کی اصل لاگت ہے، اور بعض اوقات بعض جہاز کمپنی باہر ملکوں کی ہوتی ہیں لہٰذا ان کے پاس پیسہ باہر ملکوں سے آتا ہے جس کی وجہ سے مزید وقت لگتا ہے، بہرحال رقم وصول ہونے کے بعد جہاز راں کمپنی کو ایک رسید دینی پڑتی ہے کہ پیسہ پورے کا پورا وصول پایا، اب ہمارا کوئی مزید دعویٰ نہیں۔

ب:- انشورنس کمپنی:- اس صورت میں نقصان کی ادائیگی جلد ہوجاتی ہے، بعض اوقات اصل رقم سے کچھ زیادہ وصول ہوتا ہے، انشورنس کمپنی جب رقم ادا کرتی ہے اُس وقت آپ کو ایک خط انشورنس کمپنی کو دینا پڑتا ہے کہ فلاں فلاں جہاز سے جو ہمارا نقصان فلاں فلاں ہوا ہے اس کی رقم ہم نے ان سے وصول کرلی، انشورنس والے اگرچہ رقم ہم کو دے دیتے ہیں پھر یہ جہاز کمپنی سے وصول کرتے ہیں،

ان کو کب ملتا ہے یہ پتہ نہیں، بہرحال دیر ہو یا سویر انشورنس والوں کو جہاز کمپنی ادا ضرور کردیتی ہے، انشورنس والوں کو نقصان یہ ہوتا ہے کہ اوّل ادائیگی کرنا پڑتی ہے جبکہ ان کو دیر سے ملتا ہے، دُوسری بات یہ ہے کہ جہاز کمپنی بھی انشورنس والوں کو کم ہی ادا کرتی ہے جبکہ انشورنس والے زیادہ ادا کرتے ہیں، یہ ان لوگوں کا معمول ہے اور وہ اس کے عادی ہوتے ہیں۔

۳:- آپ کے اس سوال کا جواب شاید اُوپر آگیا ہے، بہرحال رقم کی وصولی کا معاملہ جہاز راں کمپنی اور انشورنس کمپنی کسی سے بھی کیا جاسکتا ہے، وصول یابی ظاہر ہے جس سے معاملہ کیا جائے گا اس سے ہی ہوگی، ہاں انشورنس کمپنی سے وصول یابی کی صورت میں انشورنس کمپنی خود جہاز راں کمپنی سے مال کی قیمت وصول کرے گی، کیونکہ جیسا کہ اُوپر عرض کیا جاسکتا ہے کہ مال برداری کی اصل ذمہ داری جہاز راں کمپنی پر ہے۔

۴:- جی ہاں، وہ ایسا کرنے کے پابند ہیں، اس کا تفصیلی جواب اُوپر گزر چکا ہے، بہرحال آپ نے ایک لفظ لکھا ہے کہ ''پیشگی کچھ رقم'' اس سے شاید آپ کی مراد کرایہ ہے جو جہاز کمپنی مال برداری کے لئے لیتی ہے، تو کرایہ کی صورت یہ ہے کہ عموماً تو جہاز والے کرایہ پیشگی لیتے ہیں اور ہمارے معاملے میں ایسا ہی ہے، مگر بعض صورتوں میں اگر مال فروخت کرنے والا یا خریدنے والا چاہے تو کرایہ بعد میں بھی ادا کرسکتے ہیں، مثال کے طور پر ہم نے مال جدہ شریف روانہ کیا تو ہم یہ جہاز والوں کو کہہ سکتے ہیں کہ یہ کرایہ آپ کو جدہ میں خریدار ادا کرے گا۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مال کا نقصان کسی ایسی آفت کی وجہ سے ہوا ہو جس سے بچنا ممکن نہ تھا، مثلاً پورے جہاز میں آگ لگ گئی یا قزاقوں نے حملہ کردیا، تب تو نقصان کی رقم وصول کرنا آپ کے لئے جہاز کمپنی سے بھی جائز نہیں، لیکن اگر اس قسم کی کوئی عمومی آفت نہیں تھی تو جہاز کمپنی سے نقصان وصول کرنے کی گنجائش ہے، **وفی البدائع: لا یضمن (ای الأجیر المشترک) عنده ما هلک بغیر صنعه قبل العمل أو بعده لأنه أمانة فی یده وهو القیاس، وقالا یضمن إلّا من حرق غالب أو لصوص مکابرین وهو استحسان اهـ. قال فی الخیریة ..... قول أبی حنیفة قول عطاء وطاؤس وهما من کبار التابعین وقولهما قول عمر وعلیّ، وبه یفتیٰ احتشامًا لعمر وعلیّ وصیانة لأموال الناس، والله اعلم اهـ. لأنه اذا علم أنه لا یضمن ربما یدعی أنه سرق أو ضاع من یده وفی الخانیة والمحیط والتتمة الفتویٰ علیٰ قوله، فقد اختلف الافتاء وقد سمعت**

ما فی الخیریة. (شامی ج:۵ ص:۴۰ و ۴۱)۔[1]

قلت: وحیث اختلف الافتاء ورجحان الشامی الیٰ قولهما ظاهر فالأولی فی عصرنا الافتاء بقولهما صیانة لأموال الناس وتحرزا عن الوقوع فی فتنة التأمین الذی هو مرکب من الربا والقمار۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۷/۲۸ ب)

واقعے کی صحیح صورتِ حال چھپانے کی وجہ سے کسی کا حق ضائع ہونے اور اس کے ضمان کا حکم

سوال:- میرے زندہ بھائی وحیدالدین نے مجھے خود تقریباً پانچ سال ہوئے ذکر کیا کہ بھائی صاحب! پٹواری اللہ بخش نے ایک بات مجھ سے کہی تھی کہ: ''بلیغ الدین کے یونٹوں (جس پر کہ زمین الاٹ اور قبضہ ملتا ہے) کا یہ سرٹیفکیٹ آگیا ہے، (جو پٹواری مذکورہ کے ہاتھ میں تھا اور میرے بھائی نے خود وہ سرٹیفکیٹ دیکھا ہے) تو اس پر جو زمین مل سکتی ہے نصف آپ یعنی وحیدالدین لے لیں اور آدھی میں (پٹواری) لے لوں۔'' تو میں نے (وحیدالدین نے) پٹواری سے کہا کہ: ''یہ تو معاملہ میرے بھائی کا ہے، ایسا تو میں نہیں کرسکتا، مگر ایسا کرو کہ اس سرٹیفکیٹ کو لاہور واپس بھیج دو۔'' اب پٹواری کو موقع مل گیا، سننے میں وثوق سے آیا ہے کہ پٹواری نے اُس سرٹیفکیٹ سے بالائی بالائی طریقے پر زرعی زمین حاصل کرکے فروخت کردی جس کی مجھ کو خبر ایک زمین دار نے دی، جو خود عینی شاہد ہے، مگر مدد کرنے سے قاصر ہے، اور یہ خبر زمین دار نے سوا سال بعد دی، اور اسی مدّت کے بعد میرے بھائی وحیدالدین نے یہ خبر مجھ کو سنائی، چونکہ محکمۂ بحالیات ختم ہوگیا تو میں لاہور بھی تحقیقات نہیں کرسکا، اس میرے حقیقی بھائی کے اخفا کرنے سے مجھ کو دس ایکڑ زمین کا نقصان ہوا، اُن کو فوراً مجھے خبر کرنا چاہئے تھا تاکہ پٹواری

---

(۱) ردّ المحتار، کتاب الاجارة، باب ضمان الأجیر ج:۶ ص:۶۵ (طبع سعید).

وفی مجمع الضمانات ج:۱ ص:۲۶۲ ان الأجیر المشترک ضامنٌ عنده ما هلک بغیر صُنعه فاذا کان الثوب فی ضمانه کان الضّمان علیه ما لم یعلم أنّه تخرّق من دقّ صاحب الثوب وروی بشر عن أبی یوسفؒ انّ القصّار یضمن نصف النقصان ویعتبر فیه الأحوال وامّا علیٰ قول أبی حنیفة ینبغی أن لا یجب الضّمان فی فعل القصّار لأنّ عنده الثّوب أمانة عند القصّار ولیس بمضمون.

وفی الهندیة، کتاب الاجارة، الباب الثامن والعشرون فی بیان حکم الأجیر الخاص والمشترک ...الخ ج:۴ ص:۵۰۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) وحکم الأجیر المشترک ان ما هلک فی یده من غیر صنعه فلا ضمان علیه فی قول أبی حنیفة وهو قول زفر والحسن وانّه قیاس ....الخ.

سے سرٹیفکیٹ لے لیتا، یا خود لاہور جا کر اس کی نقل نکالتا، اس پر بھائی نے کہا کہ ''میں نے غلطی کی آپ سے اس واقعے کا ذکر کیا'' اس پر میں نے جواب میں کہا کہ: ''یہ تمہاری اور حماقت ہے'' میں نے کلیم لاہور میں یونٹ بننے کے لئے کردیا تھا، کچھ تو بن کر آگئے تھے، کچھ غلطی سے رہ گئے تھے، تو بعد میں بقایا یونٹ آئے تو پٹواری کے ہاتھ لگ گئے اور اس کا تذکرہ بھائی وحیدالدین نے اُس سے کیا تھا کہ مل بانٹ کر یہ زمین حاصل کرلیں گے، اب میں نے بھائی وحیدالدین کو لکھا ہے کہ اس کی پوری ذمہ داری تم پر ہوتی ہے لہٰذا آپ اپنی ملکیت والی زمین سے اتنا واپس دیں یا قیامت میں اللہ پاک کی عدالت میں یہ معاملہ پیش ہوگا، میرے حقیقی بھائی وحیدالدین صاحب کہاں تک شرعاً ذمہ دار ہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کے بھائی وحیدالدین صاحب نے آپ کی بدخواہی کرکے گناہ کیا،[۱] جس پر انہیں توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے،[۲] اور آپ سے معافی مانگنی چاہئے، لیکن ان پر اس زمین کا کوئی تاوان واجب نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے پٹواری کو محض مشورہ دیا تھا، زمین کے ضائع کرنے میں اُن کا براہِ راست دخل نہیں۔[۳]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۳/۲۸ الف)

سرکاری گاڑی بغیر اِجازت دُوسرے کاموں میں استعمال کرنے کا حکم

سوال:- بعض سرکاری ملازم کو گاڑی، ویگن وغیرہ سرکاری کام کے لئے ملی ہوئی ہوتی ہے، وہ ملازم بعض مواقع پر اپنے رشتہ دار اور واقف کار سواریوں کو بھی بٹھا لیتا ہے، رشتہ داروں کا سامان رکھ کر اِدھر اُدھر پہنچا دیتا ہے، بغیر اِجازت ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب:- آپ نے صحیح سمجھا، بغیر اِجازت اس گاڑی کو ذاتی کاموں میں خود اِستعمال کرنا یا کسی اور سے کروانا جائز نہیں۔[۴]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ

(۱و۲) وفی مسند احمد رقم الحدیث:۱۹۰۵۳ ج:۱۴ ص:۳۹۷ و ۳۹۸ (طبع دار الحدیث القاهرة) عن جریر رضی اللہ عنه قال: أتیت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فقلت: ابایعک علی الإسلام! فقال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم واشترط علیّ النصح لکل مسلم فبایعتهٗ علیٰ هٰذا ورب هٰذا المسجد انّی لکم لناصح جمیعًا ثم استغفر ونزل.

(۳) فتح القدیر، کتاب الغصب ج:۸ ص:۲۴۳ و ۲۴۴ (طبع رشیدیه) الغصب فی اللغة: أخذ الشیء من الغیر علیٰ سبیل التغلب للاستعمال فیه. وفی الشریعة: أخذ مال متقوم محترم بغیر اذن المالک علی وجهٍ یزیل یده.

(۴) فی الدرّ ج:۶ ص:۲۰۰ لا یجوز التصرف فی مال غیره بلا اذنه ولا ولایته...اهـ.

کتاب الجہاد

(جہاد اور قتال کے مسائل کا بیان)

مسلم علاقے پر قبضہ کرنے والے کافر حکمران سے مسلمانوں کو طاقت ہونے کی صورت میں جہاد کرنا چاہئے، نیز ایسے حکمران کے ماتحت ملازمت اور حقوق حاصل کرنے کا حکم (فارسی فتویٰ)

سوال ۱:- حکمران کافر چند قریٰ و امصار را بتغلب واستیلا از دست مسلمانان سلب کرد و رعایائے مسلمانان کہ مغلوب قوانین او ہستند دران ادیاری باشند وہماں حکمران بعد از سلب دیار با ایشاں حیلے ترحم دارد، وبخششہا می کند، مگر اینکہ ہمیشہ درپئے آنست کہ قوانین اسلامی را از بین ببرد وکفر و زندقہ جاری گرداند مگر بسیاست وتلطف، نہ بزور وزجر مثلاً تعلیم جدید خود وآزادی زنان وافشائے زنا وشراب وسینما وغیرہا ترویج می دہد، وبمدارس دینی وپردہ راضی نیست، آیا با این حکمران ودستگاہان او چون محاربین در ترکِ موالات وغیرہ زندگی باید کرد یا کہ نہ؟

سوال ۲:- واز ادارہائے اوقافیہ شان مزدور شدہ وحقوق گرفتن ودر ساز مانہائے جدید دادہ حقوق گرفتن بغرض آنکہ اصلاح بچگان مسلمان بکنند ودیگر ماموروں مزدوری نزد شان کردن جائز است یا کہ نہ؟ ودرین پول حقوق کدام قسم حرمت یا کراہت یا شبہ می آید یا نہ؟ وبالخصوص علماء ومقتدیاں یاں را این افعال چگونہ اند۔

سوال ۳:- واگر اینہا بہ مسلمانی پول بدھند کہ برائے من حج کن آیا احرام باینہا یا بہمان پول او احرام بخود بفریب بستن روا است یا نہ؟

سوال ۴:- تعلقات با کفار قائم کردن وتعظیم شعائر کفر روا است؟

سوال ۵:- واعانت این حکمران را در مدرسۂ اسلامیہ گرفتہ استعمال کردہ روا است یا نہ؟

سوال ۶:- واگر مرتکب اُمور مذکورہ کدام اہل علمی یا شیخی باشد، بہ او چہ اعتقاد باید کرد وایا ملامت او غیبت او وتردید ایں عمل را چہ حکم دارد۔ بینوا توجروا۔

جواب ۱:- اگر مسلماناں را چندے قوت و استطاعت ہست کہ با او محاربہ کردہ حکومتش را زائل نمایند و حکومتِ اسلامی قائم کنند، بر مسلماناں حکومت اسلامی قائم کردن واجب است،[۱] واگر آنہا چنیں استطاعت و قوت نہ دارند، پس آنہا را صبر باید کرد،[۲] تا آنکہ قوت حاصل شود،[۳] واندریں زمانۂ مغلوبیت انتظاماتِ مناسب برائے حفاظتِ دین واجب ہستند، چوں تعمیر مساجد و اقامتِ مدارس دینی و وعظ و تبلیغ، تا کہ مسلماناں بر ایمان سلامت باشند، واگر آں حکمران بر ترکِ احکام دینی جبر و تشدد نماید، و استطاعت مقاومت او نہ باشد پس اندراں وقت ہجرت بر مسلمین واجب شود۔[۴]

(۱ تا ۳) وفی بدائع الصنائع، کتاب السیر ج:۷ ص:۹۸ وامّا بیان من یفترض علیه فنقول انّه لا یفترض الّا علی القادر علیه فمن لا قدرة لهٗ لا جهاد علیه، لأنّ الجهاد بذل الجهد وهو الوسع والطّاقة بالقتال أو المبالغة فی عمل القتال ومن لا وسع لهٗ کیف یبذل الوسع.

وفی الهندیة، کتاب السیر، الباب الأوّل فی تفسیره ج:۲ ص:۱۸۸ (طبع رشیدیه) وأمّا شرائط اباحته فشیأن احدهما امتناع العدوّ عن قبول ما دعی الیه من الدین الحق وعدم الامان والعهد بیننا وبینهم والثّانی ان یرجوا الشوکة والقوّة لأهل الاسلام باجتهاده .... لما فیه من القاء نفسه فی التّهلکة وکذا فی البحر الرّائق، کتاب السیر ج:۵ ص:۷۲ (طبع سعید).

وفی الدّر المختار، کتاب الجهاد ج:۴ ص:۱۲۷ (طبع سعید) ولا بدّ لفرضیته من قیدٍ آخر هو الاستطاعة .... وشرط لوجوبه القدرة علی السلاح لا أمن الطّریق فان علم انّه اذا حارب قتل وان لم یحارب أُسر لم یلزمه القتال ....الخ.

وفی بدائع الصنائع ج:۷ ص:۹۸ فامّا اذا عمّ النّفیر بان هجم العدوّ علیٰ بلدٍ فهو فرض عین یفترض علیٰ کل واحدٍ من آحاد المسلمین ممّن هو قادرٌ علیه ..... الخ.

(۴) وفی تفسیر المدارک ج:۱ ص:۳۳۲ (طبع قدیمی) والآیة (اَلَمْ تَکُنْ أَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا) تدلّ علیٰ أن من لّم یتمکن من اقامة دینه فی بلدٍ کما یجب وعلم أنّه یتمکن من اقامته فی غیره حقّت علیه المهاجرة.

وفی التفسیرات الأحمدیة ص:۳۰۵ (طبع کریمی کتب خانه بمبئی) وفی هذا الزّمان ان لم یتمکّن من اقامة دینه بسببِ أیدی الظلمة أو الکفرة یفرض علیه الهجرة وهو الحق.

وفی أحکام القرآن للقرطبیؒ ج:۵ ص:۳۳۲ (طبع دار الکتاب العربی) الهجرة وهی الخروج من دار الحرب الی دار الاسلام وکانت فرضًا فی أیام النبی صلی الله علیه وسلم وهذه الهجرة باقیة مفروضة الیٰ یوم القیامة.

وکذا فی التفسیر المظهری ج:۲ ص:۲۰۷ (طبع حافظ کتب خانه کوئٹه).

وفی تکملة فتح الملهم، کتاب الامارة ج:۳ ص:۳۷۳ (طبع مکتبه دارالعلوم کراچی) .... الأوّل قادر علی الهجرة منها لا یمکنه اظهار دینه ولا أداء واجباته فالهجرة منه واجبة .....الخ.

وفی عمدة القاری شرح صحیح البخاری، باب المداراة مع الناس ج:۲۲ ص:۲۶۲ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) المداهنة محرمة والفرق بینهما أنّ المداهنة هی أن یلقی الفاسق المعلن بفسقه فیؤالفهٗ ولا ینکر علیه ولو بقلبه.

وفیها أیضًا باب ما قیل فی ذی الوجهین ج:۲۲ ص:۲۰۱ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) المداهنة المحرمة وسمی ذو الوجهین مداهنًا لأنه یظهر لأهل المنکر .... فیخلطه لکلتا الطّائفتین واظهاره الرّضی بفعلهم استحق اسم المداهنة واستحق الوعید الشدید أیضًا.

وفی فتح الباری، باب المداراة مع الناس ج:۱۷ ص:۳۱۷ المداهنة محرّمة والفرق أن المداهنة من الدّهان وهو الّذی یظهر علی الشیء ویُستتر باطنه وفسرها العلماء بأنّه معاشرة الفاسق واظهار الرّضاء بما هو فیه من غیر انکار علیه.

(باقی اگلے صفحے پر)

جواب۲:- زیرِ حکومتِ آن حکمرانِ کافر ملازمت کردن و پول حقوق گرفتن جائز است بشرطیکه آن خدمت فی نفسہا حرام و ناجائز نہ باشد و دران اعانتِ معصیت لازم نیاید اندریں پول ہیچ کراہت نیست۔

جواب۳:- سوال واضح نیست حکمرانِ کافر چرا گوید کہ "برائے من حج کن"۔

جواب۴:- در صورتِ عدم استطاعت محاربہ تعلقات باکفار قائم کردن روا ست البتہ مداہنت وتشبہ بالکفار وتعظیم شعائرِ کفر بدونِ حالتِ اِضطرار جائز نیست۔

جواب۵:- روا ست۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)..... وفی شرح ابن بطّال، الباب رقم:۸ ج:۱۵ ص:۲۷۰ قال المؤلّف لا ینبغی لمؤمن أن یثنی علیٰ سلطان أو غیره فی وجهه وهو عنده مستحق للذّم ولا یقول بحضرته بخلاف ما یقول اذا خرج من عنده لأنّ ذٰلک نفاق کما قال ابن عمر وقال فیه صلی الله علیه وسلم: "شر الناس ذو الوجهین" وقال: انه لا یکون عند الله وجیهًا لأنّه یظهر لأهل الباطل الرّضا عنهم ویظهر لأهل الحق مثل ذٰلک لیرضیٰ کل فریق منهم ویریه أنّه منهم وهذه المداهنة محرمة علی المؤمنین.

وفی مرقاة المفاتیح شرح المشکوة، باب الأمر بالمعروف ج:۹ ص:۳۳۱ (طبع مکتبه امدادیه ملتان) المداهنة فی الشریعة أن یریٰ منکرًا ویقدر علیٰ دفعه ولم یدفعه حفظًا لجانب مرتکبه أو جانب غیره لخوف أو طمع أو لاستحیاء منه أو قلة مبالاة فی الدین ...الخ.

وفی بدائع الصنائع، فصل فی بیان ما یعترض من ....الخ ج:۱۵ ص:۳۳۹ انّ ذٰلک مباحٌ فکان اظهار شعائر الکفر فی مکان معدٍ لاظهار شعائر الاسلام وهو أمصار المسلمین فیمنعون من ذٰلک وکذا یمنعون من ادخالها فی أمصار المسلمین ظاهرًا ..... ولا یمکنون من اظهار صلیبهم فی عیدهم لأنّه اظهار شعائر الکفر فلا یمکنون من ذٰلک فی أمصار المسلمین ..... والخنزیر والصلیب وضرب الناقوس فی قریة أو موضع لیس من أمصار المسلمین ولو کان فیه عدد کثیر من أهل الاسلام وانّما یکره ذٰلک فی أمصار المسلمین وهی الّتی یقام فیها الجمع والأعیاد والحدود لأنّ المنع من اظهار هذه الأشیاء لکونه اظهار شعائر الکفر فی مکان اظهار شعائر الاسلام فیختص المنع بالمکان المعد لاظهار شعائر ....الخ. وفیه بعد صفحة ..... الممنوع اظهار شعائر الکفر فی مکان اظهار شعائر الاسلام وهو أمصار المسلمین.

وفی البحر الرّائق، بیع العصیر من خمار ج:۸ ص:۲۰۲ و۲۰۳ (طبع سعید) لا یمکنون من ذٰلک فی الأمصار ولا یمکنون من اظهار بیع الخمر والخنزیر فی الأمصار لظهور شعائر الاسلام فلا یعارض بظهور شعائر الکفر قالوا فی هذا سواد الکوفة لأنّ غالب أهلها أهل ذمّة.

وفی تبیین الحقائق شرح الکنز ج:۴ ص:۱۶۴ (طبع سعید) باب العشر والخراج والجزیة: الأمصار هی الّتی تقام فیها شعائر الاسلام فلا یعارض باظهار ما یخالفها ولهذا یمنعون من بیع الخمر والخنازیر وضرب الناقوس خارج الکنیسة فی الأمصار لما قُلنا ولا یمنعون من ذٰلک فی قریة لا تقام فیها الجمع والحدود وان کان فیها عددٌ کثیر لأنّ شعائر الاسلام فیها غیر ظاهرة وقیل یُمنعون فی کل موضع لم تشع فیه شعائرهم لأنّ فی القریٰ بعض الشعائر فلا تعارض باظهار ما یخالفها من شعائر الکفر ....الخ.

وفی الفتاویٰ الکبریٰ (من یفعل من المسلمین مثل طعام ....الخ) ..... قد ذهب طائفة من العلماء الیٰ کفر من یفعل هذه الأمور لما فیها من تعظیم شعائر الکفر .....الخ.

جواب:۶- جواب ایں سوال از اَجوبۂ سابقہ واضح ہست۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۵۴/۲۷ د)

(ترجمہ) سوال:- کسی کافر حکمران نے زبردستی مسلمانوں سے چند بستیاں اور شہر چھین لئے، اور مسلمان رعایا جو اُس کے قوانین کے ماتحت ہیں وہ انہی شہروں میں رہتے ہیں اور وہ حکمران علاقے چھین لینے کے بعد ان کے ساتھ بہت نرمی برتتا ہے اور بہت بخشش (یعنی عطایا، حسنِ سلوک) کرتا ہے۔

لیکن وہ ہمیشہ اس کے درپے رہتا ہے کہ اسلامی قوانین کو ختم کردے، اور کفر و زندیقیت کو رواج دے، مگر یہ سب کچھ وہ سیاست اور نرمی سے کرے نہ کہ اپنی طاقت اور سختی کے بل بوتے پر، مثلاً اپنی بنائی ہوئی جدید تعلیم، عورتوں کی آزادی، کھلے عام زنا، شراب کا استعمال اور سینما وغیرہ کو ترویج دے اور دینی مدارس اور پردے پر راضی نہ ہو۔ تو کیا اس حکمران اور اس کے حواریوں کے ساتھ محاربین کی طرح زندگی گزار سکتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً ترکِ موالات کیا جائے یا نہیں؟

۲:- ان کے محکمہ اوقاف کے اداروں میں مزدوری کرنا اور حقوق حاصل کرنا اور دیگر حقوق لینا اس غرض سے کہ مسلمان بچوں کی اصلاح کریں، دیگر معاملات اور نوکری کرنا ان کے ہاں جائز ہے یا نہیں؟ اور اس تنخواہ کے پیسوں میں کسی قسم کی حرمت، کراہت یا شبہ آتا ہے یا نہیں؟ بالخصوص علماء اور مقتدیوں کی شان میں یہ افعال کیسے ہیں؟

۳:- اگر ان میں سے کوئی کسی مسلمان کو پیسے دیں اور کہے کہ میری طرف سے حج کرو تو کیا ان کے حج کے احرام کو جو انہی کے پیسوں سے ہیں اپنے لئے دھوکے کے ساتھ احرام باندھ سکتے ہیں یا نہیں؟

۴:- کفار کے ساتھ تعلقات قائم رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور شعائرِ کفر کی تعظیم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۵:- اس حکمران کے مالی تعاون کو لے کر اسلامی مدارس پر خرچ کیا جائے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

۶:- اگر ان مذکورہ اُمور کا مرتکب کوئی اہلِ علم ہو یا کوئی شیخ ہو تو اس کے بارے میں کیا اعتقاد رکھنا چاہئے؟ اسی طرح اس کو ملامت کرنا، اس کی غیبت کرنا اور اس کے اس عمل کی تردید کا کیا حکم ہے؟ بینوا وتوجروا۔

(ترجمہ) جواب:- اگر مسلمانوں میں اتنی قوت و طاقت ہو کہ اس کے ساتھ جہاد کر کے اس کی حکومت کو ختم کردیں اور اسلامی حکومت نافذ کریں، تو مسلمانوں پر اسلامی حکومت کا قیام واجب ہے۔

لیکن اگر اُن میں اتنی قوت و طاقت نہ ہو کہ اُس کی حکومت کو ختم کرسکیں تو ان کو صبر کرنا چاہئے، یہاں تک کہ ان کو اس کی قوت حاصل ہوجائے، اور اس مغلوبیت کے دور میں بھی اُن پر حفاظتِ دین کے لئے مناسب اقدامات کرنا واجب ہے، مثلاً مساجد کی تعمیر، دینی مدارس کا قیام اور وعظ و تبلیغ وغیرہ تاکہ مسلمان ایمان سالم پر ہی رہیں۔

اور اگر وہ کافر حکمران اَحکامِ دینیہ کے ترک پر جبر و تشدد کرے اور مسلمانوں میں اُس کے مقابلے کی سکت نہ ہو تو اُس وقت اُن پر ہجرت کرنا واجب ہوجائے گا۔

۲:- اُس کافر حکمران کی ماتحتی میں ملازمت کرنا، اور اپنے حق کی تنخواہ لینا جائز ہے، بشرطیکہ وہ خدمت و ملازمت بنفسہٖ حرام اور ناجائز نہ ہو، اور اُس ملازمت میں معصیت کی اعانت بھی لازم نہ آئے، اور اس پیسے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

۳:- یہ سوال واضح نہیں، یعنی وہ بادشاہ (کافر حکمران) یہ کیوں کہہ رہا ہے کہ میرے لئے حج کرو۔

۴:- اگر کفار کے ساتھ جہاد کرنے کی طاقت نہیں، تو اس صورت میں اُن کے ساتھ تعلقات قائم کرنا جائز ہے، البتہ یہ بات ہے کہ تشبہ بالکفار، مداہنت اور شعائرِ کفر کی تعظیم کرنا حالتِ اضطرار کے بغیر جائز نہیں ہے۔

۵:- جائز ہے۔

۶:- اس سوال کا جواب سابقہ اَجوبہ سے معلوم ہوچکا۔

عراق میں امریکی افواج کے تعاون کے لئے پاکستانی افواج بھیجنے کا حکم

سوال:- حکومتِ پاکستان، امریکا کی درخواست پر پاکستانی افواج عراق بھیجنے کا ارادہ کر رہی ہے، کیا حکومتِ پاکستان کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی افواج عراق بھیج کر امریکا کے ساتھ تعاون کرے؟

جواب:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ.

موجودہ حالات میں جبکہ عراق پر امریکا نے سراسر ظالمانہ قبضہ کیا ہوا ہے، حکومتِ پاکستان یا کسی بھی مسلمان حکومت کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے کہ ان کے تعاون کے لئے وہاں اپنی فوجیں بھیجے، جس کی مندرجہ ذیل وجوہ بالکل واضح ہیں:-

۱:- امریکا نے عراق پر حملہ کر کے جس طرح ظلم و بربریت کا مظاہرہ کیا ہے، اور نہ صرف اسلام بلکہ دُنیا بھر کے مُسلَّم قانونی اور اَخلاقی ضابطوں کو پامال کرنے کی متکبرانہ جسارت کی ہے، اس کے کہنے پر وہاں فوجیں بھیجنا، اس کے اس سراسر ظالمانہ حملے کی تائید ہے، جس کے حرام ہونے پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

۲:- امریکا عراق پر اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد وہاں اپنے قبضے کو مستحکم کرنے اور اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے مختلف ملکوں سے اپنی فوجیں بھیجنے کی درخواست کر رہا ہے، شرعی نقطۂ نظر سے صورتِ حال یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان ملک پر کوئی غیر مسلم قوم حملہ کرے، تو ضرورت کے وقت تمام مسلمانوں پر اس کا دِفاع واجب ہے، اور اگر کوئی غیر مسلم قوم مسلمان ملک پر قبضہ کر لے، تو تمام مسلمان حکومتوں پر واجب ہے کہ اس قبضے کو جلد از جلد ختم کرانے کے لئے تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لائیں، ظاہر ہے ایسے حالات میں قبضہ ختم کرانے کے بجائے اس ظالمانہ قبضے کو مزید مستحکم کرانے کی کوشش سراسر حرام اور ناجائز ہے۔

۳:- امریکا کے عراق پر فوجی طاقت مسلط کرنے کے باوجود عراق کے مسلمان امریکی قبضے کی مسلسل مزاحمت اور مقاومت کر رہے ہیں، جس کا انہیں پورا حق حاصل ہے، ایسے حالات میں عالمِ اسلام کا فرض ہے کہ وہ ان عراقی مسلمانوں کی مدد اور حمایت کرے۔ اس صورتِ حال میں اپنی فوجوں کو امریکا کے زیرِ کمان دینے کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ مسلمان فوجوں کو ان عراقی مسلمانوں کے مدِ مقابل لا کھڑا

کیا جائے۔ یہ دعویٰ کہ افواجِ پاکستان کو عراق میں قیامِ امن کے لئے دعوت دی جارہی ہے، خود اس بات کا اعتراف ہے کہ انہیں عراق کے ان مسلمانوں سے ٹکرایا جائے گا، جو امریکی قبضے کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم غاصبوں کی اِمداد قرآن و سنت کی صریح نصوص کے بالکل خلاف ہے، جس کے حرام ہونے میں کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہوسکتا، قرآنِ کریم کا واضح ارشاد ہے:-

يٰٓـاَيُّهَـا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّىْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ. (الممتحنۃ:۱)

ترجمہ:- اے ایمان والو! میرے دُشمن اور اپنے دُشمن کو اپنا ولی نہ بناؤ کہ ان سے دوستی کے ڈول ڈالنے لگو جبکہ انہوں نے اس حق کا انکار کیا ہے جو تمہارے پاس آیا ہے۔

یہ آیت جس واقعے کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے، اس میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے صرف اتنا کیا تھا کہ ان کے جو اعزّہ اقرباء مکہ مکرّمہ میں مقیم تھے ان کی مصلحت کے پیشِ نظر کفارِ مکہ کو یہ خبر بھیجنی چاہی تھی کہ ان پر حملے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ (صحیح بخاری)[1]

اگرچہ اس واقعے سے مسلمانوں کو کوئی قابلِ ذکر نقصان نہیں پہنچا، لیکن قرآنِ کریم کی مذکورہ بالا آیات نے اس اِقدام پر شدید گرفت فرمائی (تفسیر ابنِ کثیر ج:۴ ص:۳۴۵)[2] اور آئندہ کے لئے یہ مستقل قانون بنادیا کہ غیر مسلم طاقتوں سے بے گناہ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف تعاون اور دوستی کسی صورت جائز نہیں۔ اسی سورت میں آگے اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کی مزید وضاحت اس طرح فرمائی ہے:-

لَا يَنْهٰـكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَـرُّوْهُـمْ وَتُـقْسِـطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّـذِيْنَ قٰـتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيٰرِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. (الممتحنۃ:۸،۹)

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ جن (کافر) لوگوں نے تم سے دِین کے معاملے میں جنگ نہیں کی، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، ان کے ساتھ تم حسنِ سلوک اور اِنصاف کا معاملہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ اِنصاف

---

(۱) الصحيح للبخارى باب غزوة الفتح وما بعث حاطب بن أبى بلتعة الى أهل مكة يخبرهم بغزو النبى صلى الله عليه وسلم رقم الحديث:۴۲۷۴ ج:۲ ص:۶۱۲ (طبع قديمى كتب خانه)

(۲) (طبع قديمى كتب خانه).

کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے روکتا ہے کہ جن لوگوں نے تم سے دِین کے معاملے میں لڑائیاں کیں اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالے جانے کے لئے ایک دُوسرے کی مدد کی، ایسے لوگوں کے تم معاون بنو، اور جو ان کی معاونت کرے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

ان آیات میں پوری صراحت کے ساتھ ایسے غیر مسلموں کی ہم نوائی اور اِعانت کو حرام قرار دیا گیا ہے جو مسلمانوں سے جنگ کریں اور انہیں خانماں برباد کریں، یا اس کام میں ان کے ساتھ تعاون کریں۔ امریکا نے خود بھی ہزارہا مسلمانوں کو وحشیانہ طریقے پر بربریت کا نشانہ بنایا ہے اور ہزارہا مسلمانوں کو خود بھی بے گھر کیا ہے، اور اسرائیل کی بھرپور مدد بھی کی ہے جو سالہا سال سے ان جرائم کا مرتکب ہے، لہٰذا وہ اس آیت کے مفہوم میں بلاشک وشبہ داخل ہے، اور اس کی اِعانت پر یہ آیت مکمل طور سے صادق آتی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف کافروں سے دوستانہ تعاون کی حرمت متعدّد آیات میں مختلف عنوانات سے بیان فرمائی گئی ہے، خاص طور پر مندرجہ ذیل آیاتِ کریمہ مسلمانوں کے لئے سرمۂ بصیرت ہیں:-

اَلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا. (النساء:۱۳۹)

ترجمہ:- یہ وہ لوگ ہیں جو مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست ہم نوا بناتے ہیں، کیا یہ ان کے پاس عزّت تلاش کرتے ہیں؟ تو (یہ سمجھ لیں کہ) عزّت تمام تر اللہ کے قبضے میں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا. (النساء:۱۴۴)

ترجمہ:- اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے خلاف ایک کھلی حجت دے دو؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ، بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ، وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ. (المائدۃ:۵۱)

ترجمہ:- اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دُوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو کوئی انہیں دوست بنائے گا تو وہ انہیں میں شمار ہوگا، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ.

(المائدۃ:۵۷)

ترجمہ:- اے ایمان والو! تم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی، ان میں سے جنھوں نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنایا ان کو اور کافروں کو دوست نہ بناؤ، اور اللہ سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو۔

۴:- مذکورہ بالا آیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات کی روشنی میں فقہائے اُمت نے یہ اُصول بیان فرمایا ہے کہ کسی مشترک دُشمن کے خلاف بھی غیرمسلموں سے مدد لینا یا ان کی مدد کرنا صرف اس صورت میں جائز ہے جب وہ غیرمسلم مسلمانوں کے پرچم تلے جنگ کریں، اور جنگ کے نتیجے میں مسلمانوں کا حکم غالب ہو۔ اِمام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت کے تحت فرماتے ہیں:-

وهٰذا یدل علی انه غیر جائز للمؤمنین الاستنصار بالکفار علیٰ غیرهم من الکفار اذ کانوا متی غلبوا کان حکم الکفر هو الغالب.

(أحکام القرآن ج:۲ ص:۳۵۲)[۱]

ترجمہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کفار کے مقابلے میں دُوسرے کفار سے ایسی حالت میں مدد لیں جب فتح کی صورت میں کفر کا حکم غالب ہو۔

نیز اِمام محمد رحمہ اللہ ''السیر الکبیر'' میں فرماتے ہیں:-

لا بأس بأن یستعین المسلمون بأهل الشرک علیٰ أهل الشرک اذا کان حکم الاسلام هو الظاهر علیهم. (شرح السیر الکبیر ج:۳ ص:۱۸۶)[۲]

ترجمہ:- مسلمان اگر اہلِ شرک کے مقابلے میں دُوسرے اہلِ شرک سے مدد لیں تو اس میں اس وقت کچھ حرج نہیں ہے جب اسلام کا حکم ان پر غالب ہو۔

دُوسری طرف اگر کوئی غیرمسلم قوم کسی دُوسری غیرمسلم قوم سے لڑنے کے لئے مسلمانوں کو دعوت دیں تب بھی اصل حکم یہی ہے کہ مسلمانوں کے لئے ان میں سے کسی بھی فریق کی مدد کرنا جائز

(۱) باب استتابة المرتد (تحت آیة) بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (الآیة) ج:۲ ص:۳۶۱ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت).

(۲) باب الاستعانة بأهل الشرک واستعانة المشرکین بالمسلمین.

نہیں ہے۔ البتہ اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر غیر مسلموں کی یہ دعوت قبول نہ کی گئی تو وہ خود مسلمانوں کو بھی قتل کرڈالیں گے تب ان کی مدد کرنا جائز ہوگا۔ اِمام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

لا ينبغي للمسلمين أن يقاتلوا أهل الشرک مع أهل الشرک .... ولو قال أهل الحرب لاسراء فيهم قاتلوا معنا عدوّنا من المشركين وهم ..... فاذا كانوا يخافون اولٰئک الآخرين علىٰ أنفسهم فلا بأس بأن يقاتلوهم.[1]

ترجمہ:- مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ اہلِ شرک کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر دُوسرے اہلِ شرک سے جنگ کریں اور اگر اہلِ حرب نے مسلمان قیدیوں سے کہا کہ ہمارے مشرک دُشمن سے ہمارے ساتھ لڑو اور وہ خود بھی مشرک ہے، تو اگر ان قیدیوں کی ان مشرکوں کی طرف سے اپنی جان کا خوف ہو تو ان کے لئے جائز ہوگا کہ وہ ان کے ساتھ مل کر ان کے دُشمن مشرکوں سے لڑیں۔

(شرح السير الكبير ج:۳ ص: ۱۲۴۱، ۱۲۴۲)[2]

یہ سب کچھ اس وقت ہے جب غیر مسلموں کے ساتھ مل کر دُوسرے غیر مسلموں سے جنگ کی جارہی ہو، لیکن اگر غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمان ہوں اور پھر غیر مسلم اپنے ساتھ مل کر اپنے مدِمقابل مسلمانوں سے لڑنے کی دعوت دیں، تو اس دعوت کا قبول کرنا حالتِ اِضطرار میں بھی جائز نہیں ہے، یعنی اگر مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہو کہ اگر ہم نے غیر مسلموں کا یہ مطالبہ نہ مانا کہ ان کے ساتھ مل کر دُوسرے مسلمانوں سے لڑا جائے، تو یہ غیر مسلم خود ہمیں قتل کرڈالیں گے، تب بھی ان کا یہ مطالبہ ماننا مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے، خواہ اسے خود اپنی جان دے دینی پڑے۔ اِمام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

وان قالوا لهم قاتلوا معنا المسلمين وإلّا قتلناكم، لم يسعهم القتال مع المسلمين.

ترجمہ:- اور اگر وہ یہ کہیں کہ ہمارے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑو ورنہ ہم تمہیں قتل کردیں گے، تب بھی ان کے لئے مسلمانوں سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اِمام سرخسی رحمہ اللہ اس کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

لأنّ ذٰلک حرام على المسلمين بعينه فلا يجوز الاقدام عليه بسبب

(۱ و ۲) باب ما يسع من الرجل أن يفعل ايهما شاء.

التھدید بالقتل کما لو قال له: اقتل ھٰذا المسلم وإلّا قتلتک.

(شرح السیر ج:۳ ص:۲۴۲)[1]

ترجمہ:- اس لئے کہ مسلمانوں کے لئے دُوسرے مسلمانوں سے جنگ حرام لعینہ ہے، لہٰذا قتل کی دھمکی کی صورت میں بھی ایسا اِقدام جائز نہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ اس شخص کو قتل کرو ورنہ میں تمہیں قتل کرتا ہوں (کہ اس دھمکی کی وجہ سے دُوسرے کو قتل کرنا جائز نہیں)۔

خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان کی افواج کو جن کے مقاصدِ وجود اور بنیادی اُصولوں میں ''جہاد'' شامل ہے اور جن کے ملک کے دستور میں عالمِ اسلام کے مسلمانوں سے وفاداری کا عہد شامل ہے، عراق کے ان مسلمانوں کے خلاف صف آراء کردینا جو امریکا کے جبر و اِستبداد اور اس کے ظالمانہ تسلط کے خلاف جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں، قرآن و سنت کی صریح نصوص اور اُمت کے اِجماعی ضمیر کے خلاف تو ہے ہی، خود پاکستان کے دستور اور اَفواجِ پاکستان کے مقاصد کے بھی خلاف ہے۔ اور اگر خدانخواستہ یہ سراسر ناجائز قدم اُٹھایا گیا تو اَفواجِ پاکستان کی عزّت و وقار اور ان کی نیک نامی پر ایک بدترین دھبّہ لگانے کے مرادف ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	محمد تقی عثمانی
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	احقر محمود اشرف غفر اللہ لہٗ	۱۴۲۴/۶/۱۲ھ
۱۴۲۴/۶/۱۲ھ	۱۴۲۴/۶/۱۳ھ	(فتویٰ نمبر ۸۶/۶۳۶)

تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے جلوسوں میں مرنے والے ''شہید'' ہیں یا نہیں؟

سوال:- آج کل جو مسلمان نظامِ مصطفیٰ کی تحریکوں میں پولیس کی گولی سے مر رہے ہیں، یہ شہید ہیں یا نہیں؟ ایسے لوگوں کو غسل و کفن دیا جائے گا یا نہیں؟ یا اُنہی کپڑوں میں دفن کیا جائے گا جو وہ پہنے ہوئے ہیں؟

جواب:- جن لوگوں نے کسی عالم کے فتویٰ یا ترغیب کی بناء پر ان جلوسوں میں حصہ لیا اور نیک نیتی سے یہ سمجھ کر حصہ لیا کہ اسلام کے لئے جدوجہد کا یہی راستہ ہے، اور وہ ہلاک ہوگئے اِن شاء اللہ اُخروی اَحکام کے اعتبار سے وہ شہید ہوں گے، البتہ دُنیوی اَحکام کے لحاظ سے شہید قرار پانے کے

(۱) حوالہ سابقہ۔

لئے شرط یہ ہے کہ گولی لگنے یا زخمی ہونے کے فوراً بعد ان کی موت واقع ہوگئی ہو، اور زخمی ہونے کے بعد انہوں نے کچھ کھایا پیا نہ ہو، نہ کسی سے کوئی طویل بات چیت کی ہو، نہ ایک نماز کا پورا وقت پایا ہو، ایسے لوگوں کو غسل اور کفن کے بغیر نماز پڑھ کر دفن کیا جاسکتا ہے،(۱) اور اگر یہ شرائط نہ پائی گئیں تو پھر غسل وکفن ضروری ہے،(۲) وهٰذا لأن الخروج على الحكومات اليوم أمر مجتهد فيه، وحكمه على الاجتهاد، كما أن حجر بن عدى رحمه الله خرج علىٰ معاوية رضى الله عنه بعد استقرار خلافته وكان ذٰلك اجتهادًا منه وقد صرّح السرخسى فى المبسوط أنّه دفن فى ثيابه۔(۳)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۷/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۷۷۷/۲۸ ج)

خلیج کی لڑائی کی شرعی حیثیت اور اس میں کس فریق کی جانب سے لڑنا ''جہاد'' تھا؟

سوال:- آپ صاحبان کو علم ہوگا کہ خلیج کے بحران کے بعد اَب عراق اور امریکا اور اس کے اتحادیوں کی افواج کے درمیان جنگ جاری ہے، اور اس جنگ کے حقائق سے آپ صاحبان بخوبی

(۱ و ۲) وفى الدّر المختار، باب الشهيد ج:۲ ص:۲۵۰ (طبع سعيد) .... فينزع عنه ما لا يصلح للكفن ويزاد ان نقص ما عليه عن كفن السُنّة وينقص ان زاد لأجل ان يتم كفنه المسنون ويصلى عليه بلا غسل ويدفن بدمه وثيابه لحديث زملوهم بكلومهم ... الخ.

وفيه أيضًا ص:۲۵۰ الىٰ ۲۵۱ ويغسل من وجد قتيلًا فى مصر ...... او جرح وارتث وذٰلك بان اكل او شرب او نام او تداوىٰ ولو قليلًا او اوىٰ خيمة أو مضى عليه وقت صلٰوة وهو يعقل ..... أو باع او اشترىٰ او تكلّم بكلامٍ كثير .... وكل ذٰلك فى الشهيد الكامل وإلّا فالمرتث شهيد الآخرة.

وفى الشامية تحته ج:۲ ص:۲۵۲ (قوله فى الشهيد الكامل) وهو شهيد الدُنيا والآخرة وشهادة الدُنيا بعدم الغسل إلّا لنجاسة أصابته غير دمه كما فى أبى السعود وشهادة الآخرة بنيل الثواب الموعود للشهيد .....الخ.

وكذا فى بدائع الصنائع ج:۱ ص:۳۲۴ (طبع سعيد).

وفى المبسوط للسرخسىؒ، باب الشهيد ج:۲ ص:۵۱ (طبع مطبع السعادة مصر) وقد ورد الأثر بغسل المرتث ومعناه ..... والأصل فيه أن عمر رضى الله عنه لمّا طعن حمل الى بيته فعاش يومين ثم غسل وكان شهيدًا على لسان رسول الله صلى الله عليه وسلم وكذٰلك على رضى الله عنه حمل حيًّا بعد ما طعن ثم غسل وكان شهيدًا وأمّا عثمان رضى الله عنه فاجهز عليه فى مصرعه ولم يغسل فعرفنا بذٰلك ان الشهيد الّذى لا يغسل من أجهز عليه فى مصرعه دون من حمل حيًّا .... الخ. وكذا فى البحر الرّائق، باب الشهيد ج:۲ ص:۱۹۸ (طبع سعيد).

(۳) وفى المبسوط للسرخسىؒ، باب الشهيد ج:۲ ص:۵۰ (طبع مطبع السعادة مصر) قال ويكفن فى ثيابه الّتى هى عليه لقول رسول الله صلى الله عليه وسلم زمّلوهم بدمائهم وكلومهم ...... ولما استشهد عمار بن ياسر بصفين قال: لا تغسلوا عنى دمًا ولا تنزعوا عنّى ثوبًا فانّى التقى ومعاوية بالجادة وهٰكذا نقل عن حجر بن عدى غير أنّه ينزع عنه السلاح والجلد والفرو والحشو والخف والقلنسوة .....الخ.

واقف ہوں گے، ایک طرف عراق ہے جو کہ ایک اسلامی مملکت ہے، اور دُوسری طرف مختلف ممالک ہیں جن میں امریکا سرِفہرست ہے، اسی طرح برطانیہ اور فرانس بھی، لیکن ان کے علاوہ ان ممالک میں مسلم مملکتیں بھی عراق کے سامنے صف بستہ ہیں، جن میں سعودی عرب، مصر، ترکی وغیرہ ممالکِ اسلامیہ شامل ہیں، کیا ایک پاکستانی مجاہد ان کی جنگ میں شرکت کرسکتا ہے یا نہیں؟ یعنی یہ جنگ اس مجاہد کے لئے جہاد فی سبیل اللہ ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کس طرف سے؟ یعنی سعودی عرب کی طرف سے یا عراق کی طرف سے؟ خیال رہے کہ جو ممالک عراق کا ساتھ دے رہے ہیں ان میں غیرمسلم مملکت کوئی نہیں ہے، براہِ کرم شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- خلیج کے علاقے میں جو جنگ جاری ہے وہ عالمِ اسلام کے لئے ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ابتداءً عراق نے کویت پر قبضہ کرکے ایک سنگین غلطی کا ارتکاب کیا، جس کا شرعاً کوئی جواز نہ تھا، اور سعودی عرب کے لئے ایک مظلوم کی حیثیت سے کویت کی مدد کرنا اور اگر خود اس کے اپنے علاقے کو اسی قسم کے حملے کا خطرہ ہو تو اس کے دِفاع کے لئے لڑنا بھی برحق تھا، بشرطیکہ جنگ کی قیادت خود اس کے یا کسی مسلمان ملک کے ہاتھ میں ہوتی، لیکن عملاً ہوا یہ کہ سعودی عرب نے جنگ کی مکمل کمان اور اس کی پالیسی کلی طور پر امریکا کے حوالے کردی، اس لئے اب عراق کی حمایت میں لڑنا تو اس لئے دُرست نہیں کہ اصلاً ظلم کی ابتدا اس کی طرف سے ہوئی، اور اگر وہ اس ظلم کا اِزالہ کرتے ہوئے کویت سے اپنا قبضہ اُٹھالے تو جنگ بند کرنا اس کے اختیار میں ہے۔ اور دُوسری طرف اس کے خلاف حملے میں شریک ہونا اس لئے دُرست نہیں کہ اس جنگ کی کمان اب امریکا کے ہاتھ میں ہے جس نے اپنا یہ مقصد واضح کیا ہے کہ صرف کویت کو خالی کرانا مطمحِ نظر نہیں بلکہ عراق کی طاقت کو مکمل طور پر تباہ کرنا پیشِ نظر ہے، جس سے پورے عالمِ اسلام کی کمزوری لازمی ہے۔ اور جس جنگ میں کسی بھی طرف شرکت کرنا محذوراتِ شرعیہ سے خالی نہ ہو اسی کو اِصطلاح میں "فتنہ" کہا جاتا ہے، اور ایسے ہی فتنے کے موقع پر دونوں فریقوں سے علیحدہ رہنے کا حکم ہے۔ البتہ اس موقع پر یہ دُعا ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا فرمائے اور ان کی جان و مال اور عزّت و آبرو اور ان کی تنصیبات کی حفاظت فرمائے، اور ان کے دُشمنوں کو تباہ و برباد فرمائے، آمین۔

لقولہٖ تعالیٰ: وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا، فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللهِ، فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا، اِنَّ اللهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ.

(الحجرات:۹)

ولقوله تعالیٰ: وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا. (النساء:۱۴۱)

وفی مشكوٰة المصابيح عن أبی سعيد قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: يوشك ان يكون خير مال المسلم غنم يتبع بها شعف الجبال ومواقع القطر يفر بدينه من الفتن. (رواه البخاری ص:۴۶۲)[۱]

وعن المقداد بن الأسود قال: سمعت رسول الله صلی الله عليه وسلم يقول: ان السعيد لمن جنب الفتن، ان السعيد لمن جنب الفتن، ان السعيد لمن جنب الفتن، ولمن ابتلیٰ فصبر فواهًا. (رواه ابو داؤد ص:۴۶۴)[۲]

وعن أبی موسیٰ عن النبی صلی الله عليه وسلم انه قال: ان بين يدی الساعة فتنًا كقطع الليل المظلم (الیٰ قوله) ثم قالوا: فما تأمرنا؟ قال: كونوا احلاس بيوتكم. وفی رواية الترمذی ان رسول الله صلی الله عليه وسلم قال: فی الفتنة كسّروا فيها قسيكم وقطعوا فيها اوتاركم والزموا فيها اجواف بيوتكم وكونوا كابن آدم. (ص:۴۶۴)[۳]

وعنه (حذيفة) قال: (الیٰ قوله) قلت: يا رسول الله! صفهم لنا. قال: هم من جلدتنا ويتكلمون بألسنتنا، قلت: فما تأمرنی ان أدركنی ذٰلك؟ قال: تلزم جماعة المسلمين وامامهم. قلت: فان لم يكن لهم جماعة ولا امام؟ قال: فاعتزل تلك الفرق كلها ولو ان تعض بأصل شجرة حتّی يدركك الموت وأنت علیٰ ذٰلك. (متفق عليه ص:۴۶۲)[۴]

وفی شرح السير الكبير: باب الاستعانة بأهل الشرك واستعانة المشركين بالمسلمين:- ما نصه:- ولا بأس بأن يستعين المسلمون بأهل الشرك علی أهل الشرك اذا كان حكم الاسلام هو الظاهر (الیٰ ان قال) والذی روی أنّ النبی صلی الله عليه وسلم يوم أُحد رأی كتيبًا حسنا قال: من هٰؤلاء؟ فقيل: يهود بنی فلان حُلفاء بن ابی فقال: انّا لا نستعين بمن ليس علیٰ ديننا تأويله انهم كانوا أهل منعة وكانوا لا يقاتلون تحت رأية رسول الله صلی الله عليه وسلم وعندنا اذا كانوا بهٰذه الصفة فانه يكره الاستعانة بهم (الیٰ قوله) وانما كره ذٰلك لأنهٗ كان معه سبعمأة من يهود بنی قينقاع من

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب الايمان، باب من الدين الفرار من الفتن ج:۱ ص:۷ (طبع قديمی كتب خانه).
(۲) سنن ابی داؤد، كتاب الفتن، باب النّهی عن السعی فی الفتنة ج:۲ ص:۲۳۰ (طبع سعيد).
(۳) سنن ابی داؤد، كتاب الفتن، باب النّهی عن السعی فی الفتنة ج:۲ ص:۲۲۹ (طبع سعيد).
(۴) مشكوٰة المصابيح ص:۴۶۱.

حلفائه فخشي ان يكونوا على المسلمين ان احسوا بهم زلة قدم فلهٰذا ردهم (وفيه بعد ذٰلك) حديث الزبير حين كان عند النّجاشي فنزل به عدوه فأبلىٰ يومئذٍ مع النّجاشي بلاءً حسنًا (الىٰ قوله) ان النّجاشي كان مسلمًا (وبعد أسطر) قلنا ان ظهر على النّجاشي لم يعرف من حقنا ما كان النّجاشي يعرف فاخلصنا الدعاء الىٰ ان يمكن الله النّجاشي[1] اهـ ملخصًا.

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح — محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح — بندہ عبدالرؤف سکھروی

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۱/۷/۱۴۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۴۸/۷۲)

ضیاء الحق مرحوم کی موت شہادت ہے یا نہیں؟

سوال:- زید یہ کہتا ہے کہ ہمارے ملک کے مرحوم صدر جنرل محمد ضیاء الحق کا سانحہ مسلمانوں کے لئے باعثِ عبرت ہے، اس واقعے سے ہمیں سبق لینا چاہئے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے جو کہ ہمارے ملک کے شہید صدر اور ان کے رُفقاء پر نازل ہوا، اس طرح صدر ضیاء الحق کی موت شہادت نہیں ہے، بلکہ ہلاکت کی موت کہلائے گی۔ کیا زید کا یہ خیال دُرست ہے؟

جواب:- صدر مرحوم ایک ہوائی جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہوئے، اگر یہ حادثہ کسی شخص نے جان بوجھ کر انہیں قتل کرنے کے لئے کیا، تب تو وہ دُنیا و آخرت دونوں کے لحاظ سے شہید ہیں[2]۔ اور اگر یہ اتفاقی حادثہ تھا تو دُنیا کے لحاظ سے تو نہیں، البتہ اُخروی اَجر کے لحاظ سے شہید ہیں[3]، کیونکہ اُخروی اَجر کے لحاظ سے جو شخص آگ سے جل کر یا کسی چیز کے گرنے سے ہلاک ہو وہ بھی شہید ہوتا ہے[4]۔ اور

---

(۱) شرح السير الكبير، باب الاستعانة بأهل الشرك واستعانة المشركين بالمسلمين ج:۳ ص:۱۸۶ و ۱۸۷.

(۲) وفي الهندية، فصل في الشهيد ج:۱ ص:۱۶۸ (طبع رشيديه) ولو كان المسلمون في سفينة فرماهم العدوّ بالنّار ...... فاحترقوا فهم كلهم شهداء كذا في الخلاصة.

(۳ و ۴) وفي الشامية، باب الشهيد ج:۲ ص:۲۴۸ (طبع سعيد) لو مات حتف أنفه أو بترد أو حرق أو غرق أو هدم لم يكن شهيدًا في حكم الدنيا وان كان شهيد الآخرة.

وفي الدّر المختار، باب الشهيد ج:۲ ص:۲۵۲ وإلّا فالمرتث شهيد الآخرة وكذا الجنب ونحوه ...... الغريق والحريق والغريب والمهدوم عليه ..... الخ.

وفي المبسوط للسرخسيّ، باب الشهيد ج:۲ ص:۵۲ (طبع مطبع السعادة مصر) ومن قتله السبع أو احترق بالنّار أو تردى من جبل أو مات تحت هدم أو غرق غسل كغيره من الموتىٰ ..... الخ.

وفيه أيضًا ج:۲ ص:۵۱ ..... فيغسل وان كان له ثواب الشهداء كالغريق والحريق والمبطون والغريب يغسلون وهم شهداء علىٰ لسان رسول الله صلى الله عليه وسلم ..... الخ.

کسی شخص کے بارے میں اپنی طرف سے یہ فیصلہ کرنا کہ اس پر عذاب نازل ہوا ہے،[۱] بڑی جسارت کی بات ہے، جس سے ہر مسلمان کو پرہیز لازم ہے۔[۲]

واللہ اعلم
۱۴۰۹/۱/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۴/۴۰ الف)

وسائل نہ ہونے کی صورت میں دعوت و تبلیغ اور وسائل میسر ہونے کی صورت میں جہاد کیا جائے گا اور جہاد کے لئے اِمام مہدیؒ کے انتظار اور تبلیغی جماعت کے نظریے کا حکم

سوال:- مکرمی جناب مفتی تقی عثمانی صاحب　　السلام علیکم!

اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے، حضرت! میں نے سوچا تھا کہ خود آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضری دُوں گا، لیکن مقام کی دُوری اور مصروفیات کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہوسکا، اس لئے بذریعہ مکتوب آپ سے رُجوع کیا ہے۔

پہلے اپنا تعارف اور مکتوب کا مقصد بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ میرا تعلق کسی دِینی تحریک یا جماعت سے باضابطہ طور پر نہیں ہے، لیکن آپ جیسے جید علمائے کرام اور بزرگانِ دِین کی زیارت اور صحبت کی نسبت سے دِین حاصل کرنے، اسے پھیلانے، اس کی حفاظت و بقاء اور نفاذ کا شوق دِل میں موجزن ہے۔

حضرت! میں کچھ عرصے سے تذبذب کا شکار ہوں کہ دِین کی کماحقہٗ اشاعت اور حفاظت کا دُرست اور مسنون راستہ کون سا ہے؟ اس بارے میں آپ کی رہنمائی چاہئے۔

پہلے چند باتیں جو ذہن میں ہیں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، آپ جیسے جید علمائے کرام اور بزرگانِ دِین کی صحبت، تصانیف اور قرآن و حدیث کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکے میں دعوتِ دِین کا جو راستہ اور طریقہ اللہ ربّ العزّت کے حکم سے اختیار کیا، اس کے نتیجے کے طور پر تین سے چار سو کے لگ بھگ لوگ دِین میں داخل ہوئے، لیکن ہجرتِ مدینہ کے بعد جب جہاد کا حکم نازل ہوا اور صحابہؓ نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر اس حکم کو پورا کیا تو بارہ سال میں مختلف علاقوں کی فتوحات سے مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ تک جا پہنچی۔ اسی طرح خلفائے

(۱ و ۲) وفی مرقاۃ المفاتیح ج:۱ ص:۲۶۷ فلا یحکم لأحدٍ بانه من أهل الجنّة ...... ولا یجزم فی حق أحدٍ بأنّهٗ من أهل النّار والعقوبات ولو صدر منهٗ جمیع السیئات والمظالم والتبعات فان العبر بخواتیم الحالات ولا یطلع علیها غیر عالم الغب. وفیها أیضًا ج:۱ ص:۲۶۸ فرُبّ کافر متعند یسلم فی آخر عمره ورُبّ مسلم متعبد یکفر فی غایة أمره لا یجوز الشهادة لأحدٍ بالجنّة والنّار ..... الخ.

راشدینؓ کے زمانے میں بڑے بڑے ممالک کی فتوحات سے اسلام کا دائرہ وسیع ہوگیا تھا، اور چودہ سو سالہ تاریخ اس بات کی شاہد نظر آتی ہے کہ اسلام کی حفاظت و بقاء کے لئے صرف جہاد یعنی قتال ہی کارآمد ثابت ہوا۔

اسلام کی زیادہ سے زیادہ اور کما حقہٗ اشاعت بھی اسی سے ہوئی، جب کوئی علاقہ یا ملک فتح ہوا تو وہاں مبلغینِ اسلام کو آزادی سے اشاعتِ دِین کا موقع ملا۔

اب موجودہ دور میں قتال فی سبیل اللہ کے پہلے کی طرح کما حقہٗ اثرات نظر نہیں آرہے، جبکہ علمائے دیوبند سے منسلک تحریک تبلیغی جماعت جو اَسّی (۸۰) سال سے اِشاعتِ دِین کی محنت کر رہی ہے اور جس کی محنت سے نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونی ممالک میں بھی بہت زیادہ مثبت اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

اسی بات کے پیشِ نظر میں اِشاعتِ دِین اور حفاظتِ دِین کے متعلق مذکورہ بالا اپنی رائے یا دُوسرے الفاظ میں قرآن و حدیث کی چودہ سو سالہ تاریخ اور علمائے اُمت کی اکثریت کے موقف اور تبلیغی جماعت والوں کے موقف کے بارے میں تذبذب کا شکار ہوں کہ آیا اس دور میں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء اور حفاظت نیز اِشاعتِ اِسلام کے لئے کونسا عمل مؤثر اور مفید ہے اور قرآن و سنت کے مطابق ہے؟

تبلیغی جماعت والوں کے موقف اور نظریات کو جو مجھ تک ''تبلیغی بزرگوں'' علماء اور کارکنوں کی زبانی پہنچے ہیں تفصیلاً سلسلہ وار بیان کرتا ہوں:-

۱:- بقول تبلیغیوں کے دِین کی اصل رُوح اور حقیقت ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' ہے، یہی تمام انبیاء کا کام تھا، اور اس میں اُمت کی نجات اور کامیابی ہے۔ (اس بات پر کما حقہٗ تبلیغی کتنا عمل کرتے ہیں؟ اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا)۔

۲:- یہ دور جہاد و قتال کا دور نہیں ہے، بلکہ دعوت باللسان کا دور ہے۔

۳:- جب تک مہدی کا ظہور نہیں ہوتا، اس وقت تک جہاد اور اس سے منسلک تمام سرگرمیوں کو موقوف کر کے تبلیغی جماعت کے نظریے کے مطابق محنت کرنا تمام اُمت کے لئے ضروری ہے۔

۴:- اس دور میں جہادی سرگرمیوں میں حصہ لینا حکمت کے خلاف ہے، دِین کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔

۵:- قرآن و حدیث میں جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کی اِصطلاحات دو اَلگ معنوں میں استعمال ہوئی ہیں۔

۶:- تبلیغِ دِین اور اِصلاحِ نفس کے مروّجہ طریقے جو اُمت کی اکثریت میں رائج ہیں، مثلاً خانقاہی نظام، دِینی رسائل و اخبارات، اِصلاحی مواعظ، تحریر و تصنیف اور مدارس کا قیام وغیرہ یہ طریق

نبوّت سے مشابہت نہیں رکھتے، اور ''تبلیغی جماعت'' کا طریقِ دعوت نہ صرف دُرست اور منشائے خداوندی کے مطابق ہے بلکہ طریقِ نبی سے مماثلت اور مطابقت بھی رکھتا ہے۔

۷:- اگر اُمت میں بدری صحابہؓ کی تعداد کے بقدر لوگ انہی جیسے اعمال، ایمان، تقویٰ اور تعلق مع اللہ کے حامل ہوجائیں تو خودبخود دُنیا کی کایہ ہی پلٹ جائے گی اور تبلیغی جماعت کا مقصد ہی ایسے لوگ پیدا کرنا ہے۔

۸:- دِین کو نافذ کرنے کا اور ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کا طالبان والا طریقہ حکمت کے خلاف اور دِین کی منشاء کے بھی خلاف ہے۔

۹:- دِین کا کوئی کام اس وقت تک مؤثر ثابت نہیں ہوتا جب تک سنتِ رسول کے علاوہ بقول ''تبلیغیوں'' کے وہ عمل صفاتِ نبوی کے ساتھ نہ کیا جائے۔

۱۰:- اس دور میں دِین کی حفاظت، اسلام اور مسلمانوں کی بقاء اور اِسلام کے نفاذ کے لئے جہادی اور دُوسری تمام سرگرمیاں غیرمؤثر ثابت ہوچکی ہیں، لہٰذا مہدی کی آمد تک انہیں ترک کرکے ''تبلیغی جماعت'' والا کام شروع کیا جائے۔

۱۱:- اُمت ماسوائے ''تبلیغی جماعت'' کے کسی اور پلیٹ فارم پر متحد نہیں ہوسکتی۔

۱۲:- تبلیغی جماعت مہدی کا لشکر تیار کر رہی ہے۔

مندرجہ بالا بارہ عام پائے جانے والے ''تبلیغی نظریات'' میں نے گزشتہ چھ سال کے دوران رائے ونڈ اجتماع اور اپنے علاقے کے شبِ جمعہ کے بیانات اور بہت سے تبلیغی علماء اور کارکنوں سے نقل اور اَخذ کئے ہیں۔

ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ''تبلیغی'' مذکورہ بالا نظریات ''غیرتبلیغیوں'' کے سامنے عموماً بیان نہیں کرتے، اور اگر کرتے بھی ہیں تو اشارۃً یا کنایۃً بیان کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ''غیرتبلیغی'' علماء تبلیغی جماعت کے نظریات کو جان نہیں سکتے۔

آپ حضرات (جو اس پُرآشوب اور پُرفتن دور میں اِستقامت کے ساتھ اِشاعتِ دِین، تعلیمِ دِین اور مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کام کر رہے ہیں) سے گزارش ہے کہ اس مسئلے کی طرف بھرپور توجہ فرمایئے، اور اس کی اپنی تقاریر، رسائل اور اپنے حلقۂ اَثر میں وضاحت فرمایئے کہ اس دور میں دِین کا کونسا عمل زیادہ مؤثر اور مفید نیز قرآن وسنت کے مطابق ہے جس کے ذریعے اِشاعتِ دِین، حفاظتِ دِین اور نفاذِ دِین کا عمل ہوسکے، اور آیا کہ تبلیغی جماعت کے مذکورہ نظریات اور موقف دُرست ہیں؟ دِین کے مطابق ہیں یا نہیں؟

ایک جید عالمِ دِین اور بزرگ ہونے کے ناطے آپ کا حلقۂ اَثر بھی زیادہ ہے اور آپ کے دلائل اور بات میں اللہ تعالیٰ نے قوت اور اَثر رکھا ہے، اس لئے لوگ آپ کی بات کو آسانی سے سمجھتے

اور قبول کرتے ہیں، جبکہ میرے جیسے ناقصِ علم وعمل والوں کی بات کو ایک تو کوئی قبول نہیں کرتا، دُوسرے فتنہ وفساد پھیلنے کا اندیشہ بھی ہے۔

ان تمام گزارشات کے علاوہ عرض ہے کہ اپنی مہر اور دستخط کے ساتھ مدلل اور مفصل جواب اِرسال فرماکر میری رہنمائی فرمایئے کہ آیا میری رائے دُرست ہے یا کہ تبلیغی جماعت والوں کی؟ یا ان دونوں سے الگ قرآن و سنت میں کوئی دُوسرا عمل اور طریقہ جس کے ذریعے اُمت کی اِصلاح، مسلمانوں اور اِسلام کی حفاظت اور اِشاعت ونفاذِ دِین کا کام کماحقہٗ ہوسکے، موجود ہے؟ فقط

حافظ سمیع اللہ خان الیاس

جواب:- مختصر بات یہ ہے کہ جب جہاد کے ضروری وسائل مہیا نہ ہوں، دعوت وتبلیغ اور اَفراد سازی کے کام پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے، اس کے ساتھ جہاد کے ضروری وسائل مہیا کرنے کی فکر بھی جاری رکھنی چاہئے،[۱] جب وسائل مہیا ہوجائیں تو جہاد کرنا چاہئے۔[۲] یہ کہنا دُرست نہیں ہے کہ امام مہدی کے آنے تک جہاد موقوف ہے، یہ غلط نظریہ ہے، اور اس کی تردید و اصلاح کے لئے اکابرِ تبلیغی جماعت سے بات بھی ہوئی ہے۔ جب بھی ضروری وسائل مہیا ہوجائیں، جہاد کرنا چاہئے،[۳] چاہے امام مہدی ابھی نہ آئے ہوں۔ البتہ ضروری وسائل مہیا کرنے میں آج کے حالات کے مطابق ایک طویل حکمتِ عملی کی ضرورت ہے، جو ایک مختصر خط میں بیان نہیں کی جاسکتی۔

والسلام

۱۴۲۳/۲/۱۷ھ

(۱ تا ۳) "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ" (الأنفال: ۶۰).

وفی تفسير القرطبی ج:۸ ص:۳۵ (طبع دار احياء التراث العربی بيروت) أمر الله سبحانه المؤمنين باعداد القوّة للأعداء بعد أن أكّد تقدمة التقوىٰ .... قال ابن عباس: القوّة هاهنا السلاح والقسيّ ......الخ.

وفی تفسير ابن كثير ج:۲ ص:۳۲۸ (طبع قديمی كتب خانه) ثم أمر تعالىٰ بإعداد آلات الحرب لمقاتلتهم حسب الطّاقة والامكان والاستطاعة فقال (وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ) أی مهما أمكنكم ......الخ.

وفی تفسير المدارک ج:۱ ص:۵۹۷ (طبع قديمی كتب خانه) (ما اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ) من كل ما يتقوّىٰ به فی الحرب من عددها .....الخ.

وفی تفسير أبی السعود ج:۳ ص:۱۰۹ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) أعدّوا لقتال الّذين نبذ اليهم العهد وهيّئوا لحرابهم .... ما استطعتم من قُوّة من كل ما يتقوّىٰ به فی الحرب كائنًا ما كان ......الخ.

وفی الدر المختار ج:۴ ص:۱۲۷ (طبع سعيد) وشرط لوجوبه القدرة على السّلاح لا أمن الطّريق.

وفی الشامية تحته: أی وعلى القتال وملک الزّاد والرّاحلة كما فی قاضی خان وغيره قهستانی ......الخ.

وفی تفسير رُوح المعانی ج:۶ ص:۲۴ (طبع مكتبه امداديه ملتان) (وَاَعِدُّوْا لَهُمْ) خطاب لكافة المؤمنين لما أن المأمور به من وظائف الكل أی أعدّوا القتال الذين نبذ اليهم العهد وهيئوا لحرابهم (مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ) أی من كل ما يتقوّىٰ به فی الحرب كائنًا ما كان وأطلق عليه القوّة مبالغة، وانما ذكر هذا لأنه لم يكن له فی بدر استعداد تام فنبّهوا على أنّ النّصر من غير استعداد لا يتأتى فی كل زمان. وعن ابن عباس رضی الله تعالىٰ عنهما تفسير القوة بأنواع الأسلحة.

وفی التفسير الكبير للامام الرازیؒ ج:۵ ص:۴۹۹ (طبع دار الحديث ملتان) أمرهٗ فی هٰذه الآية بالاعداد لهؤلاء الكفّار ..... وأن يعدوا للكفّار ما يمكنهم من آلة وعدة وقوّة والمراد بالقوّة ههنا ما يكون سببًا لحصول القوّة وذكروا فيه وجوهًا الأوّل المراد من القوّة أنواع الأسلحة ..... قال أصحاب المعانی الأولىٰ أن يقال هٰذا عام فی كل ما يتقوّىٰ به علىٰ حرب العدوّ وكل ما هو آلة للغزو والجهاد فهو من جملة القوّة ...... الخ.

(حکومت و اِمارت اور سیاست کے مسائل کا بیان)

دِین میں سیاست و اِقتدار کی حیثیت اور شرعی مقام اور دِین کا اصل مقصد

سوال :- فضائل مآب حضرتِ اقدس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے، ناچیز مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے فاضلیت کے علاوہ شعبۂ اِفتاء سے فراغت حاصل کر کے عرصے سے وادیٔ کشمیر کی مشہور شخصیت علامہ کشمیریؒ کے ننھیال رودھوان کپواڑہ میں ایک مدرسے میں تدریس و اِفتاء کا کام انجام دے رہا ہے۔

میں اور میرے دُوسرے رُفقاء جو الحمدللہ دارالعلوم دیوبند سے ہی فراغت حاصل کر چکے ہیں، تدریس و افتاء کے علاوہ مختلف مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں، الحمدللہ آپ کی تمام وہ کتابیں شوق و محبت سے پڑھی ہیں جو ہندوستان میں شائع ہوئی ہیں، اور اس کی وجہ سے بربناء محبت دست بوسی ہی نہیں بلکہ قدم بوسی کو دِل چاہتا ہے۔ عرصے سے خط لکھنے کا ارادہ تھا لیکن "عـرفـت ربّـی بـفـسـخ الـعـزائـم" کا بار بار تجربہ ہوا، پھر سالِ گزشتہ حضرت تھانویؒ پر سیمینار کے سلسلے میں جناب کی دیوبند تشریف آوری کا چرچا ہوا، لیکن عین وقت پر جناب کے پروگرام کے ملتوی ہونے کی اطلاع ملی، اس لئے ملاقات بھی نہ ہوسکی۔ دِل تو بہت کچھ لکھنے کو چاہ رہا ہے، لیکن طولِ کلام کو بے ادبی پر محمول کرتے ہوئے مختصراً اپنا مدّعا عرض کر رہا ہوں، اُمید ہے کہ حضرتِ والا اپنے بے حد قیمتی وقت کا خون کر کے جواب باصواب بلکہ وقت کے تقاضے کے مطابق پوری کتاب لکھ کر سرگرداں لوگوں کی تشویش اور پریشانی کو دُور فرمائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اُمت میں دو بڑے قلم کار صاحبِ طرزِ انشاء پرداز کی فکر عوام وخواص میں دو مستقل متضاد ذہن بنائے ہوئے ہے، ایک صاحب نے دِین کی تعبیر میں مقصود کو تقاضا، اور تقاضے کو مقصود بنا کر دِین کو اس انسان کی طرح جس کے پیر اُوپر اور سر نیچا ہو عوام الناس کے سامنے پیش کیا، اور ایک اچھی خاصی بھیڑ اس نظریے پر جم گئی ہے۔ پھر اسی فکر کے ایک فعال شخص نے اس کے رَدّ میں ایک الگ اور مستقل فکر کی بنیاد ڈالی اور اپنے گمان کے مطابق وہ مقصود اور تقاضے کو اپنے اپنے مقام پر رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں، اور الحمدللہ دونوں حضرات کے لٹریچر کو کافی غور وخوض سے پڑھتے رہتے ہیں۔ جہاں تک اوّل الذکر فکر کا تعلق ہے، اس کے متعلق ہمارے اکابر مرحومین اور موجود حضرات نے

بہت کچھ لکھا ہے، لیکن اصل فکر کے تعلق سے صرف دو حضرات، مولانا منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن ندوی، نے لکھا ہے۔ اپنے اکابر کی، اس رَدّ میں جتنی کتابیں زیرِ مطالعہ ہیں، اس سے اندازہ ہوا کہ وہ ثانی الذکر کی تعبیر سے متفق ہیں بلکہ ثانی الذکر کی ''تعبیر کی غلطی'' کا ذہن ہی ہمارے ناقص خیال کے مطابق ان میں کام کر رہا ہے، یہ بات الگ ہے کہ ثانی الذکر کے دیگر معاملات مسائل وغیرہ میں ہمارے اکابر کا ان سے اختلاف ہے، لیکن دِین کی تعبیر کی حد تک ہمارے اکابران سے متفق نظر آ رہے جیسا کہ جناب کی تصنیفِ لطیف تکملة فتح الملهم کی یہ عبارت بھی اس پر دال ہے: "ولـكن بعض المسلمين الذين قاموا بالردّ على العلمانية في عصرنا قد أفرطوا في ذٰلك الخ"۔ (تکملة فتح الملهم ج:۳ ص:۲۷۰)

لیکن معاملہ حل طلب یہ ہے کہ ثانی الذکر نے اپنی فکر کو اپنی کتاب ''تعبیر کی غلطی'' یا ''الرسالہ'' وغیرہ میں جس مدلل انداز میں پیش کیا ہے، کیا اُسے مکمل صحیح اور دُرست فکر قرار دیا جاسکتا ہے یا افراط میں مبتلا شخص کو دیکھ کر خود یہ صاحب تفریط میں مبتلا ہوگئے ہیں؟ ہم اپنے مطالعے کی حد تک اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایک ان میں سے اگر اِفراط کا شکار ہے تو دُوسرا یقیناً تفریط میں مبتلا ہے، لیکن پریشان کن معاملہ یہ ہے کہ ان دو فکروں کے درمیان راہِ اِعتدال گم ہے جو تلاشِ بسیار کے باوجود نظر نہیں آ رہا ہے، کافی کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن تشنہ لبی باقی ہے، اور آخرکار تسکینِ خاطر کے لئے جناب کی خدمت میں باہم مشورے سے یہ رُقعہ ارسال کیا جارہا ہے۔

حال ہی میں ایک کتاب ''دِین کا متوازی تصوّرِ عبادت اور خلافت کی جامعیت'' مصنفہ ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی زید مجدہٗ بہت آب و تاب خاص طور پر اپنے اکابر کی تقریظ اور تاثرات کے ساتھ شائع ہوئی تھی، بہت شوق سے اس کو منگایا، بے تابی سے اس کو پڑھا، لیکن راہِ اعتدال تاہنوز گم ہے۔ بہت سے اہلِ علم سے گفتگو ہوئی، باہمی مذاکرہ بھی ہوتا رہتا ہے، لیکن اُلجھن اپنی جگہ باقی ہے۔

ممکن ہے کہ ہم اپنا مدعا واضح کرنے میں ان مختصر اَلفاظ میں اچھی طرح کامیاب نہ ہوئے ہوں، لیکن جناب جیسے صاحبِ علم سے اُمید قوی ہے کہ مدعا سمجھ گئے ہوں گے، مکرّر عرض ہے کہ ثانی الذکر کے دُوسرے دعاوِی سے اگرچہ اختلاف ہے، لیکن دِین کی ان کی بیان کردہ تعبیر سے ہمارا بلکہ اسلام کا کہاں تک اختلاف ہے؟ اور کہاں تک اتفاق؟ اور ان دونظریوں کے درمیان راہِ اعتدال کیا ہے؟ اس کی وضاحت ہم جناب کی ذاتِ اقدس سے جناب کے حکمت ریز قلم سے ہی چاہتے ہیں۔

اطلاعاً عرض ہے کہ یہ دو فکر اور ان کی ردّ و تصدیق میں جتنی کتابیں شائع ہوکر ہمارے علم میں آچکی ہیں، ان کا مطالعہ ہم کرچکے ہیں لیکن تشفی نہیں ہوئی۔ جناب کو معلوم ہی ہوگا کہ ان دو مختلف متضاد

فکروں کا اثر عوام میں کہاں تک پہنچ چکا ہے اور اعتدال کی راہ کی اگر آج نشاندہی ہوسکی تو آگے شاید کسی ایک کو غلبہ حاصل ہوگا جیسا کہ ثانی الذکر کے امکانات ہیں تو پھر یہ غالب نظریہ اپنی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ چھا جائے گا اور راہِ اعتدال پر پھر ایسے دبیز پردے پڑیں گے، ان کے ہٹانے والے کو (جو یقیناً خدا کی طرف سے آئے گا) کافی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ فقط والسلام

مظفر حسین القاسمی
خادم التدریس والافتاء
دارالعلوم رودھوان، کپواڑہ کشمیر

جواب:- مکرمی جناب مولانا مظفر حسین قاسمی صاحب زید مجدہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا، سفروں کی وجہ سے جو تاخیر ہوئی اس پر معذرت خواہ ہوں۔ میں نے وحیدالدین خان صاحب کی کتاب ''تعبیر کی غلطی'' پوری نہیں پڑھی، البتہ حضرت مولانا علی میاں مدظلہم کی کتاب پوری پڑھی ہے، اور احقر کی رائے میں صحیح صورتِ حال وہ ہے جو احقر نے اپنی کتاب ''حکیم الأمتؒ کے سیاسی افکار'' میں بیان کی ہے، اور اس کا خلاصہ تکملہ فتح الملہم میں بھی آیا ہے۔ یعنی سیاست و اقتدار، دین کا اصل مقصد نہیں[1] بلکہ مقصد کے حصول کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے، اور دین کے اجتماعی اَحکام کی تنفیذ کے لئے اس کی اہمیت بھی ناقابلِ انکار ہے، مگر دین کے اصل مطمحِ نظر ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک ذریعہ اور دین کا ایک اہم شعبہ ہونے کی حیثیت سے۔ یہی راہِ اعتدال ہے جو قرآن و سنت کے متعلقہ اَحکام سے واضح ہوتی ہے، اگر کوئی شخص اس کو مقصدِ دین سمجھے تو وہ غلو کا شکار ہے، اور اگر کوئی اس کی تردید میں اس کے دین کا حصہ ہونے ہی سے انکار کردے تو یہ بھی غلط اور دُوسری جانب کا غلو ہے۔ والسلام

۱۴۲۰/۱/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۴۸/ ۳۵۷)

---

(۱) وفی سورة الذّاریات : "وَمَا خلَقتُ الجِنّ وَالانسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْن".
وفی تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۵۰ (طبع مکتبه حقانیه) ......وقال علی رضی الله عنه أی وما خلقت الجن والانس الّا لأمرهم بالعبادة واعتمد الزّجاج علی هذا القول ویدلّ علیه قوله تعالیٰ "وَمَآ اُمِرُوْا الّا لیَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَاحِدًا" (التوبة: ۳۱) ...... الّا لیعرفونی الثعلبی، وهذا قول حسن لأنّه لو لم یخلقهم لما عرف وجوده وتوحیدهٗ ...... والعبادة الطاعة والتعبد التنسّک فمعنی (لِیَعْبُدُوْن) لیذلوا ویخضعوا ویعبدوا.
وفی تفسیر الکشاف ج:۴ ص:۴۰۸ (طبع قدیمی کتب خانه) (وَمَا خلَقتُ الْجِنّ .... الآیة) ای وما خلقت الجن والانس الّا لأجل العبادة ولم أرد من جمیعهم الّا ایاها.
وفی تفسیر ابن کثیر ج:۴ ص:۲۳۸ (طبع قدیمی کتب خانه) (وما خلقتُ الجِنّ والاِنْس الّا لیعْبُدُوْن) ای انّما خلقتهم لامرهم بعبادتی لا لاحتیاجی الیهم ......الخ.
وفی التفسیر المنیر ج:۱۴ ص:۵۱ (طبع مکتبه رشیدیه کوئته) أی ما خلقت الثقلین الانس والجن الّا للعبادة ولمعرفتی لا لاحتیاجی الیهم......الخ.

۱:- ''مغربی جمہوریت'' کی شرعی حیثیت
۲:- عہدہ اَز خود طلب کرنا جائز نہیں
۳:- اکثریت کو فیصلوں کی بنیاد بنانے کا حکم

سوال:- میری اور اس ملک کے سب مکینوں کی زندگی کا ایک مشترک مسئلہ ہے ''انتخاب یا جمہوریت'' جس کو اِسلامی رسائل اور کتب بلکہ عام درس و وعظ میں بھی ''دورِ حاضر کا ایک عظیم بت'' قرار دیا جاچکا ہے۔ دریافت طلب اُمور یہ ہیں کہ:-

۱:- کیا واقعی یہ بات صحیح ہے کہ موجودہ طرزِ اِنتخاب (مغربی جمہوریت) دورِ حاضر کا عظیم بت ہے؟

۲:- اگر یہ بات دُرست ہے تو جو لوگ یہاں سجدہ ریز ہیں ان کے لئے شرعی حکم کتاب وسنت میں کیا ہے؟

۳:- جو شخص وقت کی مجبوری کی آڑ میں یہاں جبہہ فرسائی اِسلام کا اہم کام بلکہ عین اسلام قرار دے تو اس کے لئے قرآن وسنت کی روشنی میں کیا حکم ہے؟

مسئلے کا دُوسرا رُخ:-

۱:- اگر فی الحقیقۃ مغربی جمہوریت کو دورِ حاضر کا عظیم بت کہنا دُرست نہیں ہے، تو ایسا کہنے والوں کے لئے اسلام میں کیا حکم ہے؟

۲:- جو لوگ اِنتخاب میں حصہ لینے کے لئے خود اُمیدواری کی درخواست دیں گے اور خود اپنی تشہیر حصولِ اِقتدار کی کریں گے، وہ اپنے قول وفعل سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کہ ''انا واللہ ما نولی علیٰ ھٰذا العمل أحد اسألہ ولا أحد أحرص علیہ'' اور آپ کا حکم: ''لا تسئل الامارۃ'' کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے یا نہیں؟

۳:- جو لوگ قانونی طور پر حق اور ناحق کی پہچان کے لئے اکثریت کے فیصلے کو وقتی طور پر معیار قبول کرلیں کیا وہ ''اِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ'' جیسی قرآن مجید کی صاف اور صریح تعلیم کے خلاف کرنے کے مرتکب ہوں گے یا نہیں؟

قرآن وسنت کے مطابق مکمل اور مدلل جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

السائل: عبدالکریم
جامع مسجد (العنائیہ) جناح
اسٹریٹ گجرات
۱۴ رمئی ۱۹۹۰ء

جواب:- درحقیقت آپ کے سوالات کا مدلل اور مفصل جواب ایک مستقل کتاب کی وسعت چاہتا ہے، جس کا ایک مختصر خط میں احاطہ مشکل ہے، تاہم مختصراً سوالات کے جوابات مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- مغربی جمہوریت جس کی بنیاد ''عوام کی حکمرانی'' کے تصوّر پر ہے، اسلام کے قطعی خلاف ہے، کیونکہ اسلام کی بنیاد ''اللہ کی حاکمیتِ اعلیٰ'' کے عقیدے پر ہے، جسے قرآنِ کریم نے: "اِنِ الْحُکْمُ لِلّٰہِ"[۱] کے مختصر جملے میں ارشاد فرمایا ہے۔ لہٰذا مغربی جمہوریت کو اپنے تمام تصوّرات کے ساتھ برحق سمجھنا عہدِ حاضر کی بدترین گمراہیوں میں سے ہے، اور ایسے لوگوں کو شرعی طور پر گمراہ کہا جائے گا۔ اور اگر کوئی شخص اس تفصیل کے ساتھ مغربی جمہوریت کو برحق سمجھے کہ پارلیمنٹ اگر کوئی قانون قرآن کریم کے کسی صریح حکم کے خلاف نافذ کردے تو (معاذ اللہ) پارلیمنٹ کا قانون ہی برحق ہوگا، تو ایسا اعتقاد کفر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلوں کو قرآن وسنت کے تابع قرار دے تو اُس کو کفر یا گمراہی نہیں کہہ سکتے، مگر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ مغربی جمہوریت کو جوں کا توں قبول نہیں کرتا۔

۲:- عام اسلامی حکم یہی ہے کہ اَزخود کسی سرکاری عہدے یا منصب کو اپنے لئے طلب کرنا جائز نہیں،[۲] اور ایسا شخص مطلوبہ منصب کا اہل نہیں ہوتا،[۳] لیکن بعض اِستثنائی صورتوں میں جہاں یہ بات واضح ہو کہ اگر کوئی شخص خود اس منصب کو طلب نہیں کرے گا تو نااہل اور ظالم لوگ اس پر قبضہ کرکے لوگوں پر ظلم کریں گے، تو ایسے وقت میں عہدے کو طلب کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کا: "اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ"[۴] کہنا اسی صورت پر محمول ہے۔ اِس شرعی اُصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے موجودہ اِنتخابات کا حکم معلوم کیا جاسکتا ہے کہ طلبِ اِقتدار کی بنیاد پر پورا نظامِ حکومت قائم کرنا اصلاً جائز نہیں ہے، اور اگر منشاء صرف طلبِ اِقتدار ہو، یا دُوسرے اہل لوگ موجود ہوں، یا کسی اور طریقے سے غلط نظام کو بدلنا ممکن ہو تو ایسے نظامِ انتخابات میں اُمیدوار بننا جائز نہیں۔ لیکن اگر موجودہ غلط نظام کو بدلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہو، تو صالح اور اہل اَفراد اگر طلبِ اِقتدار کے جذبے کے بجائے اصلاحِ حال کی غرض سے اس میں شامل ہوں تو اس کی گنجائش ہے، بشرطیکہ مفاسد سب وشتم، غیبت اور دُوسرے محرّمات ومنکرات سے مکمل پرہیز کا اہتمام ہو، جو اس دور میں شاذ ونادر ہے۔

---

(۱) سورۃ یوسف آیت:۴۰.

(۲ و ۳) وفی صحیح البخاری، کتاب الأحکام، باب من سأل الامارۃ وکل الیھا ج:۲ ص:۱۰۵۸ (طبع قدیمی) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "لا تسئل الامارۃ فان اعطیتھا عن مسئلہ وکلت الیھا، وان اعطیتھا من غیر مسئلۃ اعنت علیھا.

وکذا فی صحیح مسلم، باب النھی عن طلب الامارۃ والحرص علیھا. ج:۲ ص:۱۲۰ (طبع قدیمی).

(۴) سورۃ یوسف آیت:۵۵.

۳:- اکثریت کے فیصلے کو منصوص شرعی معاملات کے تصفیے کے لئے معیار بنانا گمراہی ہے، بلکہ جیسا کہ نمبر۱ میں گزرا، بعض حالات میں کفر ہے، لیکن اگر انتظامی معاملات میں مباحات کی حد تک، یا مجتہد فیہ اُمور میں کسی ایک جانب کی ترجیح کے لئے اگر اکثریت کو بنیاد بنایا جارہا ہے تو اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے جانشین کی نامزدگی مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کی بنیاد پر کرنے کا حکم دیا۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۲/۱/۱۴۱۲ھ

سیاست میں دِین اور ملک وملت کے مفاد کی حامل جماعت کی حمایت کی جائے

سوال:- موجودہ ملکی حالات میں بھٹو کا ساتھ دینا کفر کا ساتھ دینے اور اپوزیشن کا ساتھ دینا اسلام کا ساتھ دینے کے مترادف ہے، یہ آواز مسجدوں اور اکثر علماء کی طرف سے سنائی دے رہی ہے، اس کے بارے میں راہنمائی فرمائی جائے۔

جواب:- شریعت کا حکم تو اتنا ہے کہ نیکی وتقویٰ میں تعاون کیا جائے اور فسق وفجور اور اِثم و عدوان میں تعاون نہ کیا جائے،[2] نیز سیاست میں اس شخص یا جماعت کی حمایت کی جائے جس کی حمایت میں دِین اور ملک وملت کا مفاد زیادہ ہو، اب یہ واقعات اور بصیرت و رائے کا مسئلہ ہے کہ کس کی جماعت میں ملک وملت کا مفاد دِینی اعتبار سے زیادہ ہے، یہ دارالافتاء سے پوچھنے کی بات نہیں، بلکہ اپنے ضمیر اور اپنی بصیرت کے مطابق ہر شخص کو اس کا فیصلہ خود کرنا چاہئے، مفتی کا منصب شخصیات سے بحث کرنا نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۶/۶/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۲۰۲ ج)

برما میں تمام مسلمانوں یا مخصوص مسلم قبائل کے لئے جدوجہد کرنے والی دو جماعتوں میں سے کس کی حمایت کی جائے؟

سوال:- برما میں مظلوم مسلمانوں کی دادرسی اور حصولِ آزادی کے لئے برمیز مسلم آرگنائزیشن (B.M.O) اور روہنگیا پیٹریوٹک فرنٹ (R.P.F) یعنی ''محبِ رُوہنگیا محاذ'' نامی دو

---

(۱) سیرة عمر بن الخطاب ص: ۵۰۹ مصنفه: علی محمّد محمّد الصّلابی.

(۲) لقوله تعالى: ''وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ'' الآية. سورة المائدة: ۲.

جماعتیں کام کر رہی ہیں، اوّل الذکر برما کے تمام مسلمانوں کو شامل کر کے اسلام کے نام پر (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) جدوجہد کر رہی ہے، جبکہ مؤخر الذکر برما میں مسلمانوں کے متعدد قبیلوں میں سے ایک قبیلہ ''روہنگیا'' قبیلے یا قومیت کے نام پر (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) جدوجہد کر رہی ہے، ہمیں بتائیں کہ شرعی اعتبار سے ہم کس کی حمایت کریں؟

جواب:- جو جماعت اسلام کا نام ہی نہ لیتی ہو بلکہ واقعۃً اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتی ہو، اس کے ساتھ تعاون علی التقویٰ کیا جائے، اور جو جماعت قبائلی عصبیت کی دعوت دیتی ہو اس کے ساتھ تعاون دُرست نہیں،[1] البتہ اگر قبائلی عصبیت کی داعی نہ ہو،[2] لیکن اس نے اپنی جدوجہد کا دائرہ کسی خاص خطے یا قبیلے کے ساتھ محدود کر رکھا ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے، اور مسلمان اس کے ساتھ بھی تعاون علی التقویٰ کر سکتے ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۹۵۸/۲۸ ج)

اِنتخابات میں کسی اُمیدوار کے بارے میں ''فلاں کو ووٹ دے کر ہم اللہ کے اِحتساب سے بچ سکتے ہیں'' کے الفاظ کا حکم

سوال:- بعض اِشتہاروں میں جو اِنتخابات کے سلسلے میں جاری ہوچکے ہیں، یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں کہ: ''فلاں اُمیدوار کو ووٹ دے کر ہم روزِ محشر اللہ تعالیٰ کے اِحتساب سے بچ سکتے ہیں'' اور اس کا مقصد یہ ہے کہ نیک اور اچھے آدمی کو ووٹ دینے سے آخرت میں غلط ووٹ کی جواب دہی اور اِحتساب سے آدمی بچ سکتا ہے۔

اس پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں نبوّت کا دعویٰ ہے۔ آپ کا ان الفاظ کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب:- مذکورہ مقصد کے تحت یہ الفاظ لکھنے سے نبوّت کا دعویٰ لازم نہیں آتا، اور اگر مقصد وہی ہے جو سوال میں لکھا گیا ہے اور جس آدمی کے حق میں یہ جملہ لکھا گیا ہے، وہ لکھنے والے کے نزدیک واقعۃً حلقے کے دُوسرے تمام اُمیدواروں سے زیادہ نیک اور اہل ہے، تو ان الفاظ کے لکھنے میں

---

(۱) لقوله تعالى: "وتعاونوا على البرّ والتّقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" الآية. سورة المائدة: ۲.

(۲) فی سنن النسائی ج:۲ ص:۱۷۴ و ۱۷۵ (طبع مکتبه الحسن لاهور) "عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات مات ميتة جاهلية ..... ومن قاتل تحت راية عمية يدعوا الى عصبية أو يغضب لعصبية فقتل فقتلة جاهلية." رقم الحديث: ۴۰۲۵.

شرعاً کوئی حرج نہیں، البتہ کسی شخص کے بارے میں جزم اور وثوق کے ساتھ اتنا بڑا دعویٰ کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

واللہ اعلم
۱۴۰۳/۱۲/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۰/۵۲۴)

چہرے کے پردے کی شرعی حیثیت اور خاتون اُمیدوار کا اِنتخابی پوسٹروں میں فوٹو شائع کرنے کا حکم

سوال ا:- قومی اتحاد کے جلسوں میں بیگم نسیم ولی خان اور بیگم صفیہ شکیل اسٹیج کی زینت بنتی ہیں، اخبارات میں اُن کا فوٹو چھپتا ہے، لوگ اخباروں میں ان کی تصویریں دیکھ لیتے ہیں اور تقریریں بھی پڑھتے ہیں، سنا ہے کہ غیرمحرَم عورت کی تصویر دیکھنا بھی اتنا ہی گناہ ہے جتنا اُس کو دیکھنا، غیرمحرَم عورت کی آواز بھی پردہ ہے، اگر ایسی اُونچی آواز سے تلاوتِ قرآن پاک بھی کرے جس کو کوئی غیرمحرَم مرد سنے تو بھی گناہ ہے۔ اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

۲:- یہ ٹھیک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نابینا رشتہ دار سے پردہ کرایا ہے؟

۳:- حضرت خالد بن ولیدؓ کی اہلیہ محترمہ اُن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹوپی مبارک میدانِ جہاد میں دے کر واپس ہونے لگیں تو انہوں نے فرمایا: اے سوار! تم نے مجھ پر بڑا اِحسانِ عظیم کیا، اپنا نام بتا، اُس وقت پتہ چلا کہ یہ میری بیوی ہے، گویا چہرے کے پردے کا بھی اتنا اہتمام تھا کہ خاوند کو پتہ نہ لگا کہ میری بیوی ہے؟

۴:- مفتی محمود، بھٹو صاحب کو اِقتدار پر لائے تھے، اور جن لوگوں نے اِن کی مخالفت کی تھی مفتی محمود صاحب نے اُن کی مخالفت کی تھی، اب جو مفتی محمود صاحب کے لگائے ہوئے پودے کو کاٹنا نہیں چاہتے اُن کی مفتی محمود صاحب مخالفت کرتے ہیں، اب بھٹو صاحب کی تائید کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۵:- جو شخص جمہور اہلِ سنت والجماعت کے سلف صالحین پر تنقید کرے، اس شخص کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب ا تا ۳:- عورت پر پردے کا وجوب ایک اِجماعی اور غیرمختلف فیہ مسئلہ ہے، اور یہ پردہ چہرے کا بھی ہے،[۱] اور اس کا فوٹو شائع کرنا بھی شرعاً جائز نہیں، ان مسائل میں کسی عالمِ دِین کا کوئی اختلاف نہیں ہے، اور اس کے خلاف کسی کا عمل شریعت میں حجت نہیں۔

---

(۱) وفي الدّر المختار، كتاب الصلٰوة ج:۱ ص:۴۰۶ (طبع سعيد) وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين رجال لا لأنّه عورة بل لخوف الفتنة.

۴:- اشخاص و ذوات سے متعلق سوالات فتویٰ سے متعلق نہیں۔

۵:- اس مسئلے پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مفصل فتویٰ ''جواہر الفقہ'' میں شائع ہو چکا ہے، اسے ملاحظہ فرمالیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۷/۳/۱۸ھ

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۹۷/۳/۲۱ھ

(اِنتخابات میں قرآنی آیات و احادیث کو مخالف اُمیدواروں پر چسپاں کرنے کی مختلف صورتوں کا حکم)

۱:- ''وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ'' الآیۃ میں ۹ مفسدوں کو قومی اِتحاد کے ۹ لیڈروں پر چسپاں کرنا

۲:- قرآنِ کریم کے لفظ ''هَلْ'' کو سیاسی جماعت کے انتخابی نشان پر چسپاں کرنا

۳:- تلاعب بالقرآن کی مختلف صورتیں اور ایسی مجالس میں شرکت کا حکم

سوال:- گزشتہ انتخابی مہم کے دوران جس طرح سے مخالف جماعتوں نے ایک دُوسرے کے خلاف جائز و ناجائز طوفان برپا کیا، جناب بھی پورے طور پر واقف ہوں گے، بلکہ غلط انداز سے قرآنِ کریم اور اَحادیث شریفہ کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر ایک سیاسی پارٹی کے مقرّرین صاحبان اور اَخبار نے یہ کہا کہ: ''وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ'' الخ، اس آیتِ کریمہ میں مفسد اَفراد کا ذکر ہے، لہٰذا قومی اِتحاد کے چونکہ ۹ لیڈر ہیں اس کی طرف اشارہ تھا۔ دُوسری پارٹی کے ایک مقرّر صاحب نے جلسۂ عام میں نو ستاروں کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے قرآنِ کریم کی آیت: ''وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ'' اور ''رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ'' وغیرہ سے اِستدلال کیا، نیز ''ہل'' کا نشان منتخب کرنے پر فرمایا کہ ''هَلْ'' کا ذکر قرآن میں چالیس مقام پر آیا ہے، پھر چند آیات پڑھیں جن میں لفظ ''هَلْ'' کا استعمال ہوا ہے۔ جناب سے اِستدعا ہے کہ اس کا شرعی حکم بتائیں۔

۱:- کیا قومی اتحاد کے ۹ لیڈروں پر آیت: "وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ" منطبق کی جاسکتی ہے؟

۲:- اسی طرح لفظ "هَلْ" کا استعمال؟

۳:- کیا اپنے مقصد کے لئے قرآنی آیات کا ذکر مناسب ہے؟

۴:- کیا تلاعب بالقرآن یا تحریفِ قرآن کے زُمرے میں یہ نہیں آتا؟

۵:- ایسے مجمع میں شامل ہونے والے سامعین کا کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- آیتِ قرآنی: "وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ ..... الخ" کا واقعہ بالکل دُوسرا ہے، اگر اس آیت کو موجودہ دور کی سیاسی پارٹیوں پر اس نیت سے چسپاں کیا جائے کہ یہ آیت انہی کے بارے میں ہے تو یہ صریح تحریفِ قرآن ہے، اور اگر یہ مقصد ہو کہ آیت تو دُوسرے واقعے میں اُتری تھی لیکن یہاں بھی صادق آتی ہے تو یہ آیت کا غلط استعمال ہے اور سیاسی مخالفت کی بناء پر کسی شخص کو کفار کی صف میں شامل کرنا بدترین غلطی ہے۔[1]

۲:- ہرگز نہیں، قرآنِ کریم کے لفظ "هَلْ" کو اِنتخابی نشان پر چسپاں کرنا نری جہالت ہے، اور اگر اس نیت سے ہو کہ قرآن میں لفظ "هَلْ" سے مراد ہی انتخابی نشان ہے تو صریح تحریف ہے۔[2]

۳:- ہرگز صحیح نہیں، قرآنِ کریم کی آیات کو اس طرح سیاسی یا انتخابی جنگ میں استعمال کرنا جس سے عوام میں غلط تأثر ہو، انتہائی بے ادبی اور گستاخی کی بات ہے جس سے پرہیز لازم ہے۔[3]

۴:- ایسی باتوں کے بارے میں قوی خطرہ ہے کہ وہ تلاعب بالقرآن میں داخل ہوں، جو لوگ ایسا کریں وہ سخت غلطی کے مرتکب ہیں، البتہ اُنہیں کسی بُرے لقب سے پکارنے کے بجائے اُنہیں سمجھانے کی کوشش کریں۔[4]

۵:- ایسی مجلسوں میں جہاں قرآنی آیات کو اس طرح غلط استعمال کیا جاتا ہو، شرکت نہ کرنا

---

(۱) فی الاشباہ والنظائر لابن نجیمؒ "وکذا قولهم بكفره اذا قرأ القرآن في معرض كلام الناس، كما اذا اجتمعوا فقرأ فجمعناهم جمعًا، وكذا وكأسًا دهاقًا، عند رؤية كأسٍ. رقم: ۱۴۸۔

قال في شرحه: ذكر في القاموس أن معنى قول الزهري لا تناظروا بكتاب الله ولا بكلام رسوله لا تجعلوا شيئًا نظيرًا لهما، معناه لا تجعلوهما مثلًا لشيء يعرضه به كقول القائل جئت على قدر يا موسى لمسمّى بموسىٰ جاء في وقت مطلوب.

(۲) حوالہ سابقہ۔

(۳) حوالہ سابقہ۔

(۴) قال الله تعالىٰ في القرآن الكريم: "اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ....." الآية: ۱۲۵ (سورة النحل) "وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ....." الآية (سورة القصص: ۷۷).

چاہیئے، اور شرکت ہو جائے تو ایسا کرنے والوں کو اُن کی غلطی پر متنبہ کرنا چاہیئے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۸/۶/۲۷ھ

مرد اُمیدوار کی موجودگی میں عورت کو ''ووٹ'' دینے کا حکم

سوال:- مرد اُمیدوار کی موجودگی میں جو بہتر نمائندگی کر سکتے ہوں، عورت کو سردار تسلیم کرنا اور اُسے ووٹ دینا اسلام کی روشنی میں جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- مرد اُمیدواروں کی موجودگی میں جو بہتر نمائندگی کر سکتے ہوں، عورت کو سردار تسلیم کرنا اور اُسے ووٹ دینا شرعاً جائز نہیں۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۴۷/ ۲۸ ج)

پاکستان سے اِلحاق کرنے والے ریاست کے ایک حکمران کو معاہدے کے تحت دی گئی مراعات واپس لینے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین ومفتیانِ شرع متین اس صورتِ حال کے بارے میں کہ ایک ریاست ''الف'' جو کہ اَز رُوئے قانون آزادیٔ ہند مجریہ ۱۹۴۷ء ۱۴/اگست سلطنتِ برطانیہ کے تسلط سے آزاد ہوگئی اور اس کا حکمران بموجب قانون اس اَمر کا حق دار ہوگیا کہ وہ آزاد مملکت ہندوستان یا نوزائیدہ مملکت پاکستان میں سے کسی ایک میں شمولیت اختیار کرلے یا آزاد رہے۔ چنانچہ ریاست ''الف'' کے حکمران نے مطابق دستاویزِ شمولیت (جس کا اُردو ترجمہ منسلک ہے) پاکستان میں محض جذبۂ اِسلامی و جذباتِ دِینی وملّی کی بناء پر شمولیت اختیار کرلی، جس کے نتیجے میں حکمرانِ مذکور اور اس کے اہلِ خاندان کو ہندوستان کے حملے اور ظلم وستم کا نشانہ بننا پڑا، اور اپنی ریاست اور جملہ املاک و جائیداد سے محروم ہونا پڑا، دستاویزِ شمولیت کے مطابق شق نمبر۱ میں حکمران مذکور نے اپنی ریاست کا الحاق پاکستان میں کرنے کا عہد کیا ہے، اور اسے پاکستانی مقنّنہ اور سپریم کورٹ کا پابند کیا ہے، بشرطیکہ دستاویز

(۱) فی الشامیة ج:۲ ص:۳۴۸ (طبع سعید) لو دعی الیٰ دعوة فالواجب الاجابة ان لم یکن هناک معصیة ولا بدعة والامتناع أسلم فی زماننا إلّا اذا علم یقینا أن لا بدعة ولا معصیة اهـ.

(۲) فی صحیح البخاری، کتاب المغازی، کتاب النبی صلی اللہ علیه وسلم إلی کسریٰ وقیصر، رقم:۴۰۷۳ ج:۲ ص:۶۷۳ (طبع قدیمی کتب خانه) "..... لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم أن أهل فارس قد ملکوا علیهم بنت کسریٰ قال: لن یفلح قوم ولّوا أمرهم امرأة". نیز دیکھئے کفایت المفتی، کتاب السیاسیات ج:۹ ص:۳۴۹ (طبع جدید دارالاشاعت)۔

میں دی گئی شرائط کوملحوظ رکھا جائے۔

شق نمبر۶ و ۷ میں آئندہ بنائے جانے والے قوانین و آئین کے ذریعے کوئی تبدیلی یک طرفہ نوعیت کی جس کی منظوری حکمرانِ مذکور سے حاصل نہ کرلی جائے عمل میں نہ لائی جائے۔

اس شمولیت کے تحت حکومتِ پاکستان کی جانب سے تحفظات و مراعات خصوصی نوعیت کی حکمرانِ مذکور کو حاصل تھیں اور جو ۴۷-۹-۲۴ سے رائج تھیں، مگر سابقہ حکومت نے حکمرانِ مذکور کی منظوری کے بغیر یک طرفہ طور پر ان تمام مراعات اور تحفظات کو سلب کرلیا اور حکمرانِ مذکور کو ان سے محروم کردیا۔

۱:- اَز رُوئے شریعتِ محمدی اور قرآن وسنت اسلامی حکومت پاکستان کا یہ یک طرفہ قدم جو کہ دستاویز شمولیت کی صریح خلاف ورزی ہے، کیا شرع اور دِینی اِعتبار سے اس کا کوئی جواز ہے؟ اور کیا اَز رُوئے فقہِ اسلامی یہ یک طرفہ تبدیلیٔ معاہدہ جائز ہے یا ناجائز؟

۲:- اگر یہ فعل ناجائز ہے تو کیا ایسی کوئی حکومت جو کہ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کی مدعی اور علی الاعلان دعوے دار ہو سابقہ حکومت کی اس پالیسی اور فیصلے کی پابند ہے جو کہ اس نے دِینی اور اَخلاقی حدود سے تجاوز کرکے کیا ہو؟

۳:- کیا شرعی اعتبار سے حکمرانِ مذکور اس یک طرفہ انحرافِ معاہدہ کی بنا پر کسی ہرجانے اور تاوان کا مستحق ہے؟ اس نقصان اور اذیت کے بدلے میں جو اس بنا پر اسے اور اس کے اہلِ خاندان کو پہنچا ہو؟

چنانچہ گزارش ہے کہ مذکورہ بالا اُمور میں فتویٰ و فیصلہ قرآن وسنت اور اَحادیثِ نبوی کی روشنی میں صادر فرمایا جائے۔

از طرف
غلام معین الدین

تنقیح

اِستفتاء کے ساتھ معاہدے کی دستاویز منسلک نہیں ہے، جواب اس دستاویز کے مطالعے پر موقوف ہے، اس لئے اس اِستفتاء کے ساتھ معاہدے کی دستاویز اِرسال کی جائے تو اصل سوال کا جواب دیا جاسکتا ہے۔

محمد تقی عثمانی

جوابِ تنقیح

سوال کے ساتھ دستاویز منسلک ہے۔

جواب:- حکومتِ پاکستان کے لئے شرعاً ضروری ہے کہ وہ اس معاہدے کی پابندی کرے،[1] جو کسی ریاست کے اِلحاق کے وقت والیٔ ریاست سے کیا، لیکن منسلکہ دستاویزِ شمولیت میں والیٔ ریاست کے لئے کسی قسم کی خصوصی مراعات وتحفظات کا ذکر نہیں، البتہ اگر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء اور قانونِ آزادیٔ ہند ۱۹۴۷ء میں جن کا ذکر دستاویزِ شمولیت کی دفعہ نمبر ۱ ۲ میں ہے، والیٔ ریاست کو کچھ خصوصی مراعات وتحفظات دیئے گئے ہوں تو ان مراعات وتحفظات کی پابندی حکومتِ پاکستان پر اس وقت تک لازم ہے جب تک ریاست کا اِلحاق پاکستان کے ساتھ باقی ہے، اور اگر مذکورہ دو قوانین میں بھی کوئی مراعات وتحفظات موجود نہیں ہیں یا معاہدے کے بعد کسی اور دستاویز کے ذریعے طے پائے ہیں تو ان کی تبدیلی سے معاہدۂ شمولیت کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی، اس صورت میں اس دُوسری دستاویز کو دیکھ کر ہی اس کا شرعی حکم بتایا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۰۰/۴/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۵۶۴/۳۱ ب)

سرکاری ملازمتوں اور املاک واراضی میں ترجیح کی بنیاد علاقائی وجغرافیائی عصبیت ہے یا اہلیت؟

سوال:- مکرمی ومحترمی جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، واضح ہو کہ مندرجہ ذیل مسئلے پر اپنی علمی رائے اور دلائل سے مطلع فرمادیں، ممنون ہوں گا، مطلوبہ جواب فتویٰ تصوّر نہ ہوگا۔

۱:- قرآن مجید، سنتِ نبوی وخلفائے راشدین یا فقہائے عظام کے اِرشادات کی روشنی میں ایک اسلامی مملکت کے مختلف علاقوں (صوبوں) کے باشندوں کو، دُوسرے علاقوں کے باشندوں کے حق برائے حصول صوبہ جاتی سرکاری ملازمت، املاک واراضی میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے یا مختلف علاقوں کے باشندوں کے ان حقوق کو اس خاص علاقے کے باشندوں تک محدود رکھا گیا ہے؟

۲:- کیا اگر ایک اسلامی مملکت میں ایک علاقے کے باشندوں کو دُوسرے علاقوں میں معاشی حقِ اِنتفاع کے سلسلے میں ایسا یکساں اِستحقاق نہ دیا جائے تو یہ شرعاً دُرست ہوگا؟

۳:- کیا اسلامی نظریۂ عدل کی رُو سے ایسے یکساں معاشی اِستحقاق کی پالیسی بنانا اسلامی حکومت کے لئے شرعاً ضروری اور لازمی ہے؟

---

(۱) قال اللہ تعالیٰ: "وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" وفی سورۃ المائدۃ: "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" الآیۃ.

۴:- جب ایک اسلامی مملکت میں حقوق کے تحفظ کے نام پر علاقائی قومی عصبیت پیدا کی جارہی ہو تو اس وقت اس عصبیت کو روکنے کے لئے مختلف علاقوں (صوبوں) کے درمیان معاشی تحفظ کی وہ کونسی منصفانہ حکمتِ عملی بنانی چاہئے جو اسلامی نظریۂ عدل کے بھی مطابق ہو اور اِسلامی مملکت کی وحدت اور اِستحکام کے لئے بھی مفید ہو؟

اُمید ہے کہ آنجناب اس اہم مسئلے پر ہماری راہنمائی فرمائیں گے، شکریہ۔ آپ کی ذاتی رائے مطلوب ہے نہ کہ دارالافتاء کا فتویٰ۔

والسلام

خاکسار عبدالخالق سہریانی بلوچ

ایم اے ایل ایل بی

جواب:- محترمی ومکرمی

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا، آپ نے سرکاری ملازمتوں اور املاک و اراضی میں جغرافیائی اور علاقائی مساوات کے بارے میں جو سوال کیا ہے، اس کا جواب احقر کی رائے میں یہ ہے کہ اسلام نے کسی بھی منصب یا ملازمت کے سلسلے میں بنیادی طور پر یہ اُصول پیشِ نظر رکھا ہے کہ جس شخص کا تقرّر مقصود ہو اس میں اس منصب کی پوری اہلیت پائی جانی ضروری ہے، اور جو شخص جس منصب کی زیادہ اہلیت رکھتا ہو، وہ اس منصب کا زیادہ اہل ہے، خواہ جغرافیائی اعتبار سے اس کا تعلق کسی خطے سے ہو،[1] لہٰذا اس معاملے میں ترجیح کی بنیاد اہلیت ہے، نہ کہ جغرافیائی تعصبات،[2] یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومتوں میں ایک خطے کے باشندوں کو بلاتکلف دُوسرے خِطوں میں متعین کیا جاتا رہا ہے۔

لہٰذا یہ بات تو شریعت میں کسی طرح جائز نہیں ہوسکتی کہ جس شخص میں کسی منصب کی اہلیت نہ ہو، اس کو محض اس لئے کسی منصب پر فائز کردیا جائے کہ وہ کسی خاص علاقے کا باشندہ ہے،[3] البتہ اگر مختلف خِطوں کے لوگ اہلیت کے اعتبار سے مساوی ہوں تو اس صورت میں انتظامی سہولت کی خاطر یہ اُصول مقرّر کرنا جائز ہے کہ ہر علاقے میں اسی علاقے کے اہل اَفراد کو ترجیح دی جائے، کیونکہ وہ اس علاقے کے مسائل اور لوگوں کی نفسیات سے بھی زیادہ واقف ہوگا، اور اس علاقے کے لوگ اس سے مانوس بھی زیادہ ہوں گے۔

اسی طرح اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ کسی علاقے کے لوگ باہر کے کسی عہدہ دار کو دِل سے قبول نہیں کریں گے اور اس سے ملک وملت میں انتشار پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہوجائے تو اس صورت

(۱ تا ۳) تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر ”معارف القرآن“ ج:۲ ص:۴۴۹ (طبع ادارة المعارف کراچی)۔

میں اس بات کی بھی گنجائش ہوسکتی ہے کہ ملت کو انتشار سے بچانے کے لئے کسی ایسے شخص کا تقرّر کر دیا جائے جو فی نفسہٖ اہل تو ہو، لیکن دُوسرے علاقے کے لوگوں میں اس سے زیادہ اہلیت رکھنے والے موجود ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا تھا کہ حکمران قریش ہی میں سے ہوں گے،(۱) اس کی حکمت علامہ ابنِ خلدونؒ نے یہی بیان فرمائی ہے کہ اہلِ عرب کا قریش کے سوا کسی اور پر جمع ہونا مشکل تھا۔(۲)

لیکن اس بات کی شرعاً ہرگز گنجائش نہیں کہ لوگوں کے متعصبانہ خیالات کی وجہ سے نااہل افراد کو ذمہ دارانہ منصب حوالے کر دیئے جائیں،(۳) ایسی صورت میں لوگوں کی خواہشات کے اِتباع کے بجائے ان کے خیالات کی اِصلاح ضروری ہے۔(۴)

اُمید ہے کہ اس تفصیل سے آپ کے تمام سوالات کا جواب ہوگیا ہوگا، اگر پھر بھی کوئی اُلجھن باقی ہو تو دوبارہ ارشاد فرمادیں، اِن شاء اللہ اپنی بساط کے مطابق جواب عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

والسلام

۱۴۰۵/۷/۱ھ

---

(۱) وفي صحيح البخاري كتاب الأحكام ج:۲ ص:۱۰۵۷ (طبع قديمي كتب خانه) باب الأمراء من قريش ..... سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول أن هذا الأمر في قريش لا يعاديهم أحدٌ الّا كبّه الله علىٰ وجهه ما أقاموا الدين. وفيه أيضًا عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يزال الأمر في قريش ما بقي منهم اثنان .... الخ. وكذا في صحيح مسلم ج:۲ ص:۱۱۹ (طبع سعيد).

وفي مصنف ابن ابي شيبة رقم الحديث:۳۳۰۵۵ ج:۱۷ ص:۲۸۵، ۲۸۶ (طبع ادارة القرآن كراتشي) عن أنس رضي الله عنه قال: أتانا رسول الله صلى الله عليه وسلم ونحن في بيت رجل من الأنصار فأخذ بعضادتي الباب ثم قال: "الأئمة من قريش."

(۲) وفي تاريخ ابن خلدون، الفصل السادس والعشرون في اختلاف الأمّة في حكم هذا المنصب وشروطه ج:۱ ص:۲۰۲ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) ولنتكلم الآن في حكمة اشتراط النسب ليتحقق به الصّواب في هذه المذاهب فنقول ان الأحكام الشرعية كلها لا بدّ لها من مقاصد وحكم تشتمل عليها ...... وذلك ان قريشًا كانوا عصبة مضر وأصلهم وأهل الغلب منهم وكان لهم علىٰ سائر مضر العزّة بالكثرة والعصبية والشرف فكان سائر العرب يعترف لهم بذلك ويستكينون لغلبهم فلو جعل الأمر في سواهم لتوقع افتراق الكلمة بمخالفتهم وعدم انقيادهم ولا يقدر غيرهم من قبائل مضر أن يردهم عن الخلاف ولا يحملهم على الكرّة فتفترق الجماعة وتختلف الكلمة والشارع محذّر من ذلك حريصٌ علىٰ اتفاقهم ورفع التنازع والشتات بينهم لتحصل اللحمة والعصبية وتحسن الحماية بخلاف ما اذا كان الأمر في قريش لأنهم قادرون علىٰ سوق الناس بعصا الغلب الىٰ ما يراد منهم فلا يخشى من أحد خلاف عليهم ولا فرقة لأنهم كفيلون حينئذٍ بدفعها ومنع الناس منها فاشترط نسبهم القرشي في هذا المنصب وهم أهل العصبية القوية ليكون أبلغ في انتظام الملّة واتفاق الكلمة ..... الخ.

(۳) وفي صحيح البخاري كتاب العلم ج:۱ ص:۱۴ (طبع قديمي كتب خانه) اذا وسد الأمر الى غير أهله فانتظر الساعة. وفيه أيضًا كتاب الرّقاق ج:۲ ص:۹۶۱ (طبع قديمي) اذا أسند الأمر الىٰ غير أهله فانتظر الساعة.

وراجع للتفصيل الىٰ شرحه في فتح الباري ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع قديمي كتب خانه) وعمدة القاري ج:۲ ص:۴ (طبع مكتبه رشيديه).

(۴) وفي التفسير الكبير تحت آية رقم:۵۸ من سورة النّساء: ويدخل فيه عدل الأمراء مع رعيتهم وعدل العلماء مع العوام بأن لا يحملوهم على التعصّبات الباطلة بل يرشدونهم الىٰ اعتقادات وأعمال تنفعهم في دنياهم وأُخراهم.

کسی سیاست دان کا اِنتخابات کے موقع پر سیاسی جماعت سے کئے ہوئے وعدے کو توڑنے کا حکم

سوال:- حالیہ اِنتخابات کے نتیجے میں رحیم یارخان میں چند کونسلروں نے اپنا ایک گروپ تشکیل دیا، جس میں فلاں فلاں کونسلر شریکِ اجلاس ہوئے، اور تمام گروپ کے کونسلروں نے بالاتفاق حلفاً خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کیا کہ ہم آئندہ اِنتخاب میں بلدیہ رحیم یارخان کا چیئرمین چودھری عبدالحمید گاندھی کو اور وائس چیئرمین ہارون باجوا کو بنائیں گے، لیکن چند روز کے بعد دُوسرا حلف قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر کرلیا کہ ہم سب میاں عبدالخالق گروپ میں ہیں اور جس کو میاں عبدالخالق جہاں چاہیں استعمال کریں، لیکن پھر اس کے علاوہ اخبارات اور دُوسرے ذریعے سے یہی اعلان کیا جاتا رہا کہ ہمارا نامزد چیئرمین عبدالحمید گاندھی ہے، لیکن آخری دن جبکہ چیئرمین کا اِنتخاب تھا تو دانستہ ان ممبران نے عبدالخالق کو چیئرمین کا ووٹ دیا، اور عبدالحمید گاندھی کو نظرانداز کیا گیا، جبکہ عبدالحمید گاندھی نے ان ممبران سے کہا کہ تم نے میری چیئرمینی کے لئے حلف دیا ہے، تو اَب مجھ کو چیئرمین بناؤ تو اس پر ممبران نے کہا کہ یہ سیاسی حلف تھا اور ہم نے تمہارا ووٹ صرف اس لئے استعمال کیا کہ ہمیں مزدور اور خاتون کی نشست مل جائے، اب وہ نشستیں ہم نے حاصل کرلیں، اب تمہاری ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ اِنتخابات کے ایام ہی میں ان میں سے بعض ممبران نے عوام سے مسجدوں میں بیٹھ کر یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم کامیابی کے بعد اپنا ووٹ عبدالخالق کو نہ دیں گے، لیکن ان لوگوں کے اس واضح متضاد عمل اور حلف شکنی اور جان بوجھ کر قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر وعدہ خلافی سے جو دِینی اقدار پامال ہوئے اور لوگ اب قرآن پر حلف اُٹھانے کو مزاح سمجھنے لگ گئے ہیں، اس کے لئے علمائے دِین ومفتیانِ کرام فتویٰ صادر فرماویں کہ اگر ان کا یہ عمل دانستہ اور جان بوجھ کر تھا تو شریعتِ مطہرہ کی رُو سے ایسے لوگوں کا کیا مقام ہے؟ ایک اسلامی معاشرے میں یہ لوگ عوام کے نمائندہ بن سکتے ہیں؟ (مرزا محمد رفیق)

جواب:- پہلا معاہدہ تحریری صورت میں ہوا تھا، اس تحریر کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس میں حلف یا قسم نہیں تھی، البتہ ایک عہد تھا، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ اس عہد میں شامل افراد کے لئے اس عہد کی خلاف ورزی بلاعذر جائز نہیں تھی[1]، البتہ اگر اس عہد کے بعد ان کو دیانت سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو منتخب کرنے کا عہد کیا گیا ہے، دُوسرا اس کے مقابلے میں بہتر ہے، تو اس عذر کی وجہ سے ان کے لئے جائز تھا کہ اس عہد کو منسوخ کرکے اس شخص کو منتخب کرتے جو ان کے نزدیک زیادہ بہتر تھا۔ صورتِ

(۱) فی القرآن الکریم: "وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" سورۃ الاسراء آیۃ: ۳۴.

مسئولہ میں اگر ان لوگوں نے اس قسم کے صحیح عذر کے بغیر عہد شکنی کی تو سخت گناہگار ہوئے اور ایسے لوگ نمائندگی کے اہل نہیں، اور اگر فیصلے کی تبدیلی کسی عذر کی بناء پر تھی تب بھی آخر وقت تک اپنے دِلی ارادے کے خلاف اعلان کرتے رہنا جھوٹ ہے، اور وہ بھی سخت گناہ ہے، لہٰذا جو لوگ اس جھوٹ کے مرتکب ہوئے وہ بھی سخت گناہگار ہوئے[1] اور ایسے لوگ بھی نمائندگی کے اہل نہیں تاوقتیکہ وہ اپنے ان گناہوں سے صدقِ دِل کے ساتھ توبہ نہ کریں۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

جماعتِ اسلامی، جمہوریت اور جمعیت علمائے اسلام کے بارے میں ایک سوال کا جواب

سوال:- "تحریکِ جمہوریت" کے نام سے جو جماعت معرضِ وجود میں آئی ہے، جماعتِ اسلامی بھی جس کی حامی ہے، آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کیا جماعتِ اسلامی اور اس کے امیر مودودی صاحب اسلامی نظام کی آڑ لے کر اس ملک کو امریکا کی گود میں ڈالنا چاہتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ جماعتِ اسلامی کا یہ موقف کیا دُرست ہے کہ جمہوریت کی بحالی دراصل اسلامی نظام لانے کی کوشش کا ذریعہ ہے، جس طرح پاکستان حاصل کرنے کا ذریعہ جداگانہ اِنتخاب ہی تھا۔

۲:- دُوسرا مسئلہ جو آج کل ملک میں بڑی شد و مد کے ساتھ پھیلایا جارہا ہے اور شد و مد کے ساتھ مخالفت بھی کی جارہی ہے، وہ ہے "سوشلزم" اس نظام کی داعی نیشنل عوامی پارٹی ہے، لیکن تائید میں جمعیت علمائے اسلام کے بعض ذمے دار حضرات بھی بیان دے رہے ہیں، جماعتِ اسلامی اس کی مخالفت میں پیش پیش ہے، جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے سوشلزم کا نعرہ کیونکر دُرست اور مطابق عین اسلام ہوگا؟ جمعیت علمائے اسلام اس سلسلے میں جو کچھ کر رہی ہے اس میں آنجناب اور دیگر علماء کس حیثیت سے شامل ہیں؟

جواب:- جہاں تک جماعتِ اسلامی میں شمولیت و عدمِ شمولیت کا تعلق ہے، اس کا جواب اس مطبوعہ ورق میں موجود ہے، جو آپ کو پہلے اِرسال کیا جاچکا ہے۔

رہی تحریکِ جمہوریت کی بات! سو جب متحدہ حزبِ اختلاف نے یہ مہم شروع کی تھی تو حسین شہید سہروردی مرحوم نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کو اس تحریک میں شامل ہونے کی

(۱ و ۲) قال اللہ تعالیٰ: "اِنَّ اللہَ یَأْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا" الآیۃ: ۵۸ سورۃ النساء.
فی صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۲۶ (طبع قدیمی کتب خانہ) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "علیکم بالصدق! فان الصدق یھدی الی البر وان البر یھدی الی الجنّۃ .... وایاکم والکذب! فان الکذب یھدی الی الفجور وان الفجور یھدی الی النّار ....." الحدیث: ۴۷۲۱.

دعوت دی تھی، اس کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا کہ: ''ہمارا اصل مطالبہ اسلامی نظام کا قیام ہونا چاہئے، پھر اگر اسلام میں کسی درجے کے اندر جمہوریت ہے تو وہ خودبخود اس مطالبے کے اندر آجائے گی، لیکن نری جمہوریت کی تحریک میں شمولیت سے معذور ہوں۔'' اس جملے سے آپ تحریکِ جمہوریت کے بارے میں ان کے موقف کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

اب سوشلزم کی بات رہ جاتی ہے، تو اس میں کوئی ایسا مسلمان جو اسلام اور اشتراکیت سے واقف ہو، شک نہیں کرسکتا کہ سوشلزم اسلام کے یکسر منافی نظام ہے، اسلام اپنا الگ معاشی نظام رکھتا ہے جو سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے مختلف ہے، جو شخص اسلام کے بارے میں تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہو وہ سوشلزم کو اسلام کے مطابق نہیں کہہ سکتا۔ موجودہ جمعیت علمائے اسلام کا بھی کوئی ایسا بیان ہمارے علم میں نہیں ہے جس میں اُس نے سوشلزم کی حمایت کی ہو۔ بلکہ اس الزام کی بعض تردیدیں نظر سے گزری ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ موجودہ جمعیت علمائے اسلام وہ جمعیت نہیں ہے جس نے قیامِ پاکستان کی جدوجہد کی تھی اور جس کی بنیاد علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی تھی، اس جمعیت کا مارشل لاء کے بعد احیاء نہیں کیا گیا، موجودہ جمعیت علمائے اسلام ایک دُوسری جماعت ہے جو قیامِ پاکستان کے بہت بعد قائم ہوئی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم اس جماعت کے کبھی رُکن نہیں رہے، اور نہ اس کی پالیسی میں حضرت مدظلہم کے مشوروں کا کوئی دخل ہے، لہٰذا اس کے کسی قول وفعل کی ذمہ داری اُن پر عائد نہیں ہوتی۔

والله سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

***

کتاب الدّعویٰ والشهادات والقضاء

(دعویٰ، گواہی اور فیصلوں کے مسائل کا بیان)

قانون ''میعادِ سماعت'' کی شرعی حیثیت

(قانون ''میعادِ سماعت'' کی حقیقت، تاریخ، شرعی تصوّر، دلائل، پچھلے زمانوں میں اس کی موجودگی، اور اس قانون کی حکمت پر مفصل فتویٰ)

سوال:- بعض جدید ترقی یافتہ ممالک میں "Limitation Act" کے نام سے جو اُصول وقوانین رائج و نافذ ہیں، ان کی تاریخ کیا ہے؟ اور کیا وہ سراسر غیر اسلامی اُصول ہیں؟ اگر یہ اُصول وقوانین غیر اِسلامی ہیں تو دیوانی و فوجداری مسائل و اُمور میں چارہ جوئی کی میعاد کا عدم تعین جو عملی خرابیاں پیدا کرتا ہے اس کا تدارک کیونکر کیا جاسکتا ہے خصوصاً اگر اس عدم تعین کو کاٹ کے "Categonical Imperatin" کی حیثیت دی جائے تو جائیداد غیر منقولہ کے برسوں پُرانے معاملات متأثر ہوتے ہیں، اگر یہ اُصول وقوانین غیر اِسلامی نہیں تو ان کے اِسلامی ہونے کا کیا جواز ہے جبکہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں شفعہ چھوڑ کر اس نوعیت کے قوانین کبھی نافذ نہیں رہے؟

اگر عنقریب قومی اتحاد برسرِ اِقتدار آجائے تو پورا کا پورا اسلام کیونکر نافذ ہوگا اور "Limitation Act" کو کس طرح مشرف بہ اسلام کیا جائے گا؟ یا پھر اُسے کس بناء پر ایک کلمہ گو قانون کی حیثیت حاصل ہوگی؟

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں، آمین۔

گرامی نامہ باعثِ مسرّت و اِفتخار ہوا، آپ کے سوال کے بارے میں عرض یہ ہے کہ قانونِ میعادِ سماعت (Limitation Act) سراسر غیر اِسلامی قانون نہیں ہے، اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ''اسلام کی تاریخ میں شفعہ کو چھوڑ کر اس نوعیت کے قوانین کبھی نافذ نہیں رہے۔'' واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عدالتیں بھی میعادِ سماعت کا لحاظ کرتی رہی ہیں، خاص طور سے ترکی خلافت کے دور میں عالمِ اسلام کے تمام قاضی خلیفۂ وقت کی مقرّر کردہ میعادِ سماعت پر عمل کرتے رہے ہیں۔ اور فقہائے اسلام نے اُن کے اس عمل کی نہ صرف توثیق و تائید کی ہے بلکہ خلیفۂ وقت کے منشور کے جاری ہونے کے بعد اس کو واجب العمل قرار دیا ہے۔ ''الاشباہ والنظائر'' کے مشہور شارح علامہ حمویؒ نے اپنے دور کے بارے میں لکھا ہے کہ ہمارے زمانے کے سلاطین نے تمام قاضیوں کو یہ حکم دیا ہوا ہے کہ وہ وقف اور وراثت کے سوا کوئی

دعویٰ بناءِ دعویٰ قائم ہونے کے پندرہ سال بعد قابلِ سماعت نہ سمجھیں، اور فتاویٰ حامدیہ میں (جس کی تنقیح علامہ ابنِ عابدین شامیؒ نے کی ہے) اس مسئلے پر چاروں مذاہب (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کے فقہاء کے فتاویٰ نقل کئے ہیں جو اس بات پر یک زبان ہیں کہ سلطان کی طرف سے اس ممانعت کے اجراء کے بعد پندرہ سال بعد کوئی مقدمہ داخل نہ کیا جائے۔[1] البتہ علامہ خیرالدین رملیؒ نے فتاویٰ خیریہ میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ اس بارے میں ہر خلیفہ کی طرف سے ازسرِنو حکم جاری ہونا میعادِ سماعت کی پابندی کے لئے ضروری ہے۔

البتہ مختلف زمانوں میں مختلف میعادیں مقرّر کی گئی ہیں، فقہِ حنفی کی کتابوں میں بعض مقدمات کے پندرہ سال، بعض کے لئے تینتیس سال اور بعض کے لئے چھتیس سال کی مدتیں مقرّر کی گئی ہیں، مثلاً درمختار میں ہے:[2] "القضاء مظهر لا مثبت ويتخصص بزمان ومكان وخصومة حتّٰى لو أمر السلطان بعدم سماع الدعوىٰ بعد خمسة عشر سنة فسمعها لم ينفذ، قلت: فلا تسمع الآن بعدها الا بأمر."

اس کے تحت علامہ شامیؒ نے اس مسئلے پر کافی مفصل بحث کی ہے، اور اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ: "قال المتأخرون من أهل الفتوىٰ: لا تسمع الدعوىٰ بعد ست وثلاثين سنة الّا أن يكون المدعي غائبًا أو صبيًّا ....الخ."[3]

بلکہ علامہ شامیؒ نے شمس الائمہ سرخسیؒ کی مبسوط سے نقل کیا ہے کہ: "اذا ترک الدعوىٰ ثلاثًا وثلاثين سنة ولم يكن مانع من الدعوىٰ ثم ادّعى لا تسمع دعواه." (ردّ المحتار، کتاب القضاء مطلب في عدم سماع الدعوىٰ بعد خمس عشرة سنة ج:۲ ص:۳۴۴، مطبوعہ دیوبند)۔[4]

(۱و۲) ج:۵ ص:۴۱۹ (طبع سعید) نیز دیکھئے حاشیہ نمبر۴۔

(۳) رد المحتار ج:۵ ص:۴۲۲ (طبع سعید)۔

(۴) کتاب القضاء ج:۵ ص:۴۲۲ (طبع سعید)۔

وفي الفتاوى تنقيح الحامدية، كتاب الدّعوىٰ ج:۲ ص:۳ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ) وقال المتأخرون من أهل الفتوىٰ لا تسمع الدّعوىٰ بعد ست وثلاثين سنة الّا أن يكون المدعي غائبًا أو صبيًّا أو مجنونًا أو المدعى عليه أميرًا جائرًا يخاف منه كذا في الفتاوىٰ العتابيه.

وقال في البحر عن المبسوط ترک الدّعوىٰ ثلاثًا وثلاثين سنة ولم يكن مانع من الدّعوىٰ ثم ادعىٰ لا تسمع دعواه لأنّ ترک الدّعوىٰ مع التمكن يدلّ علىٰ عدم الحق ظاهرًا .... والحاصل من هذه النقول أن الدّعوىٰ بعد مضى ثلاثين سنة أو بعد ثلاثة وثلاثين لا تسمع اذا كان التّرک بلا عذرٍ من الأعذار المارة لأن تركها هٰذه المدة مع التمكن يدلّ علىٰ عدم الحق ظاهرًا ....الخ.

وفي الفتاوىٰ الكاملية كتاب الدّعوىٰ ص:۱۱۳.

وفي مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر فصل قضاء المرأة في غير حد وقود ج:۲ ص:۸۸ لو أمر السلطان بعدم سماع الدعوىٰ بعد خمس عشرة سنة يجب عليه عدم سماعها ولو سمعها وقضى لا ينفذ لأنّه لا يصير قاضيًا بالنّسبة الىٰ تلک الحادثة كما في المنح.

.........................(باقی اگلے صفحے پر)

شمس الائمہ سرخسیؒ خلافتِ عباسیہ کے دور کے ہیں، جس سے واضح ہوا کہ میعادِ سماعت کا یہ تصوّر خلافتِ عباسیہ میں بھی موجود تھا، افسوس ہے کہ میں اس وقت پاؤں کے ایک زخم کی وجہ سے صاحبِ فراش اور چلنے سے معذور ہوں، اس لئے دُوسری کتابوں کی مراجعت اس وقت ممکن نہیں، ورنہ اس پر شاید اور بھی قدیم حوالے دستیاب ہوجاتے، تاہم صرف علامہ شامیؒ کی مذکورہ تصریحات سے بھی اتنا واضح ہوجاتا ہے کہ میعادِ سماعت کا تصوّر نہ صرف غیر اِسلامی نہیں، بلکہ اسلامی عدالتیں ہر دور میں اس پر کسی نہ کسی شکل میں عمل پیرا رہی ہیں۔

البتہ یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے، اور شاید آپ کو بھی یہی شبہ ہوا ہو کہ محض تأخیر کی بنا پر ایک صاحبِ حق کو حق سے محروم کرنے کا کیا جواز ہے؟

موجودہ قوانین میں اس سوال کا جواب نصفت (Equity) کے ان مقولوں کے ذریعے دیا گیا ہے کہ:-

"The Law aids the diligent and not the indolent."

قانون چوکس لوگوں کی مدد کرتا ہے، غافلوں کی نہیں۔

"Ther Should be an end to Litigation"

عدالتی مخاصمتوں کی کوئی انتہا ہونی چاہئے۔

لیکن یہ مقولے موجود قوانین کے حق میں اس لئے پورے اطمینان بخش نہیں ہوتے کہ وہاں دیانت اور قضاء کی کوئی تعریف کم از کم عملاً نہیں ہے، بلکہ جو حق عدالت سے مسترد ہوگیا، عملاً وہ حق ہی نہیں رہا۔ اس کے بجائے اسلامی فقہ میں دیانت اور قضاء کے اَحکام ساتھ ساتھ چلتے ہیں لہٰذا اگر عدالت نے کسی حق کا تصفیہ کرنے سے انکار کردیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حق نہیں رہا، بلکہ وہ حق موجود ہے اور جس کے ذمے حق ہے اُس پر دیانۃً فرض ہے کہ وہ اُسے صاحبِ حق تک پہنچائے، خواہ کتنا

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) وفی الفتاوی الأنقرویة ج:۲ ص:۵۸ وفی المبسوط رجل ترک الدعویٰ ثلاثًا وثلاثین سنة ولم یکن لهٗ مانع من الدعویٰ ثم ادعی لهٗ لا تسمع دعواهٗ لأنّ ترک الدعویٰ مع التمکن علیه یدلّ علیٰ عدم الحق ظاهرًا.

وفی درر الحکام المادّة: ۱۶۶۰ ج:۴ ص:۲۶۱ (طبع مکتبه علمیه) اذا ادّعیٰ أحد بأنّ العقار کالدّار والکرم الّذی فی تصرّف شخصٍ آخر مدّة خمس عشرة سنة بلا نزاع بأنّه ملکه أو انّ لهٗ حصة فیه فلا تسمع دعواهٗ اهـ.

(وکذا فی الشامیة ج:۵ ص:۴۲۲ طبع سعید).

وفی شرح المجلّة للأتاسیؒ رقم المادّة: ۱۶۶۳ ج:۵ ص:۱۷۷ قال المتاخرون من أهل الفتوی لا تسمع الدعویٰ بعد ست وثلاثین سنة الّا أن یکون المدعی غائبًا أو صبیًا أو مجنونًا ولیس لهما ولی او المدّعی علیه أمیرًا جابرًا.

وفیها أیضًا رقم المادّة: ۱۶۷۰ ج:۵ ص:۱۸۷ اذا ترک المورث الدعویٰ مدّة یترکها الوارث أیضًا مدّة وبلغ مجموع المدتین حدّ مرور الزمان فلا تسمع.

زمانہ بیت چکا ہو، اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو عدالت خواہ اُسے کچھ نہ کہے، لیکن وہ گنہگار ہوگا، اسی لئے فقہاءؒ کا یہ مقولہ ''الاشباہ والنظائر'' وغیرہ میں درج ہے کہ: ''الحق لا یسقط بتقادم الزمان''[1] یعنی ''حق زمانہ گزر جانے کی بناء پر ساقط نہیں ہوتا'' اس سے مراد یہی ہے کہ میعادِ سماعت گزر جانے کے باوجود وہ حق موجود ہے جس کا ایک اثر تو اُخروی ہے کہ اس حق کو تلف کرنے والا گنہگار ہے، دُوسرا اثر دُنیوی ہے کہ جس شخص کو بھی اس حق تلفی کا یقینی علم ہوگا وہ اس پر فاسق کے اَحکام جاری کرے گا، جس سے اس کے ساتھ اس کے سارے معاملات متأثر ہوں گے، تیسرا اثر یہ ہے کہ اگرچہ عدالت اس مسئلے کو سننے سے انکار کرچکی، لیکن اگر خلیفہ کے پاس اپیل پہنچے اور وہ محسوس کرے کہ مقدمہ جان دار ہے اور اس میں چال بازی بظاہر نہیں ہے تو فقہاءؒ نے لکھا ہے کہ وہ اسے کسی قاضی کے پاس بھیج سکتا ہے، اس صورت میں قاضی اس کی سماعت کرے گا (شامی ج:۴ ص:۳۴۳)[2]۔

نیز ایسی صورت میں صاحبِ حق قاضی کو ثالث بنا کر بھی فیصلہ کرا سکتا ہے۔

اس سے صاف واضح ہے کہ صرف زبانی طور پر نہیں بلکہ عملاً بھی میعادِ سماعت سے حق ساقط

---

(۱) وفی ردّ المحتار ج:۵ ص:۴۲۰ (طبع سعید) قد استفید من کلام الشارح أن عدم سماع الدعوی بعد هذه المدّة انّما هو للنهی عنه من السلطان فیکون القاضی معزولًا عن سماعها لما علمت من ان القضاء یتخصص فلذا قال اِلّا بأمر أی فاذا أمر بسماعها بعد هذه المدّة تسمع وسبب النهی قطع الحیل والتزویر فلا ینافی ما فی الاشباه وغیرها من أن الحق لا یسقط بتقادم الزمان ولذا قال فی الاشباه أیضًا ویجب علیه سماعها أی یجب علی السلطان الّذی نهیٰ قضاته عن سماع الدعویٰ بعد هذه المدّة أن یسمعها بنفسه أو یأمر بسماعها کی لا یضیع حق المدّعی والظّاهر أن هذا حیث لم یظهر من المدّعی امارة التزویر .....الخ.

وفی شرح المجلّة رقم المادّة:۱۶۷۴ ص:۹۹۶ لا یسقط الحق بتقادم الزّمان فاذا أقرّ المدعیٰ علیه واعترف صراحة فی حضور الحاکم بأن حق المدعی عنده فی الحال علی الوجه الّذی یدعیه وکان قد مرّ الزّمان علی الدّعویٰ فلا یعتبر مرور الزّمان ویحکم بموجب اقرار المدعیٰ علیه.

وفی تکملة حاشیة ردّ المحتار ج:۱ ص:۳۳۲ ثم اعلم ان عدم سماعها لیس مبنیًّا علیٰ بطلان الحق حتّی یرد أن هذا قول مهجور لأنّه لیس ذٰلک حکمًا ببطلان الحق، وانّما هو امتناع عن القضاة عن سماعها خوفًا من التّزویر ولدلالة الحال کما دل علیه التّعلیل واِلّا فقد قالوا ان الحق لا یسقط بالتقادم کما فی قضاء الاشباه فلا تسمع الدّعویٰ فی هذه المسائل مع بقاء حقّ للآخرة ولذا لو أقرّ به یلزمه کما فی مسئلة عدم سماع الدّعویٰ بعد مضی خمس عشرة سنة اذا نهی السلطان عن سماعها کما تقدّم قبیل باب التحکیم فاغتنم ....الخ.

وفی تکملة حاشیة ردّ المحتار ج:۷ ص:۴۸۷ (طبع سعید) ثم اعلم أن عدم سماع الدّعویٰ بعد مضی ثلاثین سنة أو بعد الاطلاع علی التّصرف لیس مبنیًّا علیٰ بطلان الحق ذٰلک وانّما هو مجرّد منع للقضاة عن سماع الدّعوی مع بقاء الحق لصاحبه حتّی لو أقرّ به الخصم یلزمه ولو کان ذٰلک حکمًا ببطلانه لم یلزمهٗ ویدلّ علیٰ ما قلناهٗ تعلیلهم للمنع بقطع التّزویر والحیل کما مرّ فلا یرد ما فی قضاء الاشباه من أن الحق لا یسقط بتقادم الزّمان ثم رأیت التصریح بما نقلناهٗ فی البحر قبیل فصل دفع الدّعویٰ ......الخ.

(۲) وفی رد المحتار ج:۵ ص:۴۲۰ یجب علی السلطان الذی نهی قضاته عن سماع الدعوی بعد هذه المدة ان یسمعها بنفسه أو یأمر بسماعها کی لا یضیع حق المدعی والظاهر ان هذا حیث لم یظهر من المدعی امارة التزویر ...الخ.

نہیں ہوتا، میعادِ سماعت مقرّر کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مدّتِ دراز گزرنے کے بعد بھی اگر حقِ سماعت باقی رکھا جائے تو اس سے ایک طرف تو مقدمات میں مکر وفریب اور جھوٹی گواہیوں کا امکان بڑھ جائے گا، کیونکہ مدّتِ دراز گزرنے کے بعد واقعے کے عینی گواہ ملنے مشکل ہوتے ہیں، اور مل بھی جائیں تو واقعے کی پوری تفصیلات ذہن میں نہیں رہتیں، اس لئے اس قسم کے مقدمات عدالتوں میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مقدمات میں غیر ضروری تعویق ہو اور لاینحل مسائل کھڑے ہوجائیں، میعادِ سماعت کی یہی حکمت ہمارے فقہاء نے بھی بیان فرمائی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی فقہ میں اس کی بنیاد موجود ہے، اور جب کبھی شریعت کی بنیاد پر موجودہ قوانین کی تدوینِ نو کی جائے گی تو اس قانون کو بالکلیہ مسترد یا منسوخ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس پر مذکورہ فقہی بنیادوں پر نظرِ ثانی کی جائے گی، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس قانون میں اتنی ترمیم کی ضرورت نہیں ہوگی جتنی دُوسرے بہت سے قوانین میں ضرورت پیش آئے گی۔[1] والسلام

۲۳ر رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۸۷/۲۸ ج)

مسجد کو منہدم ہونے سے بچانے کے لئے بھی دعوے میں جھوٹ اور خلافِ واقعہ بات کہنا جائز نہیں

سوال:- جنابِ محترم!

دُوسرا اِستفتاء مذکورہ مسجد کے متعلق کچھ اس طرح مطلوب ہے، چونکہ علاقے کے کچھ لوگ اس کو مسجد ہی تسلیم نہیں کرتے، ان کا موقف یہ ہے کہ اس علاقے میں مسجد کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس پلاٹ پر لائبریری یا اسی قسم کا کوئی سینٹر وغیرہ علاوہ مسجد کے قائم ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں حضرات نے اپنا اثر ورُسوخ استعمال کرکے مسجدِ ھٰذا منہدم کرانے کا حکم جاری کرادیا، اس صورتِ حال کے پیشِ

---

(۱) ''قانون میعادِ سماعت'' سے متعلق مزید اہم تفصیلات کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب ''عدالتی فیصلے'' ج:۲ ص:۲۱۹ تا ص:۲۳۶ میں حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کا ایک اہم فیصلہ بعنوان ''غاصبانہ قبضہ اور حقِ ملکیت'' ملاحظہ فرمائیں۔

نظر اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ اس معاملے کو عدالت میں پیش کیا جائے، اور فوری طور سے مسجد کو منہدم نہ کرنے کا حکمِ امتناعی عدالت سے لے لیا جائے، چنانچہ مسجد کمیٹی کے ایک عہدے دار نے ایک وکیل صاحب سے مل کر تمام حالات بتائے اور انہیں متعلقہ تمام کاغذات دِکھائے، وکیل صاحب نے اطمینان دِلایا کہ ان شاء اللہ مسجد منہدم نہیں ہوگی۔ عدالت سے میں کوشش کر کے مسجد کو منہدم نہ کرنے کا حکم جاری کراؤں گا۔ پھر انہوں نے کئی صفحات پر مشتمل ایک دعویٰ نامہ تیار کر کے اسے ٹائپ کروایا، اس تحریری دعوے کو عدالت میں داخل کرنے سے قبل مسجد کمیٹی کے ایک عہدے دار سے دستخط کروائے اور خود وکیل صاحب نے بھی اس پر دستخط کئے۔

مذکورہ عہدے دار کے دستخط کرنے کے بعد وکیل صاحب نے بتایا کہ میں نے اس تحریر میں ایک پوائنٹ یہ بھی دِکھایا ہے کہ اس پلاٹ پر جس پر اب مسجد قائم ہے اس پر علاقے کے لوگ گزشتہ کئی سالوں سے نمازیں ادا کر رہے ہیں، جبکہ حقیقۃً ایسا نہیں، لیکن اِستفسار پر وکیل صاحب نے کہا کہ مسجد کو منہدم ہونے سے بچانے کے لئے میں نے ایک قانونی اور عدالتی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ پوائنٹ رکھا ہے۔ الحمدللہ وکیل صاحب بھی مسلمان اور پابندِ صوم وصلوٰۃ ہیں، اور پھر وکیل صاحب نے مزید وضاحت کی کہ ہمارے اس بیان سے قائم شدہ مسجد اِن شاء اللہ اُمید قوی ہے کہ عدالت کی جانب سے مسجد کو منہدم نہ کرنے کا حکمِ امتناعی جاری کر دیا جائے گا۔ انہوں نے مزید تقویت دِلائی کہ ہمارے اس بیان سے کسی کو ذاتی نقصان پہنچانا یا کسی کا حق مارنا مقصود نہیں، بلکہ صرف اور صرف اللہ کے گھر کو شہید ہونے سے بچانا مقصود ہے، اللہ تعالیٰ ہماری نیت کو جانتا ہے۔

چونکہ حکامِ بالا کی جانب سے مسجد کو منہدم کرنے کا حکم جاری ہو چکا تھا، ان کا عملہ کسی بھی وقت آ کر اسے منہدم کر سکتا تھا، اب صرف یہی صورت تھی کہ عدالت کا حکم ہی انہیں اس کو منہدم کرنے سے روک سکتا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہوتے ہوئے مسجد کمیٹی کے یہ عہدے دار خاموش رہے اور وکیل صاحب نے عدالت میں کاغذات داخل کر دیئے، عدالت نے حکمِ امتناعی جاری کرنے سے انکار کر دیا اور ہمارا پیش کردہ مقدمہ خارج کر دیا۔ اس کے بعد مسجد کو منہدم کرنے کے لئے سرکاری عملہ موقع پر پہنچ گیا، لیکن ان پر کیا ہیبت طاری ہوئی کہ وہ مسجد کو منہدم کئے بغیر واپس چلے گئے، اور ابھی تک اللہ کے فضل سے مسجد قائم و دائم ہے، لوگ باجماعت پنج وقتہ نمازیں ادا کر رہے ہیں۔

جواب:- دعوے میں جھوٹ اور خلافِ واقعہ بات کہنا ہرگز جائز نہیں تھا۔ اس ناجائز کام پر صدقِ دِل سے توبہ ضروری ہے، مسجد کی ہر قیمت پر تعمیر فرض نہیں، جھوٹ سے بچنا فرض ہے۔[۱]

واللہ اعلم

۱۴۰۸/۹/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۹۶/۳۹ و)

حضرت ولید بن عقبہؓ کے واقعۂ حد میں خلیفۂ راشد حضرت عثمانؓ پر ایک اِشکال کا جواب

سوال:- بخدمتِ اقدس مخدومی المعظم اُستاذی المحترم زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے کہ جنابِ والا بخیر و عافیت ہوں گے، دُعا ہے اللہ تعالیٰ جناب کے سایہ کو دائم قائم

---

(۱) وفي الآية: "ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ" (آل عمران: ۶۱).

وفي مشكوة المصابيح ج:۱ ص:۱۷ كتاب الايمان، باب الكبائر وعلامات النفاق الفصل الأوّل (طبع قديمي كتب خانه) عن أبي هريرة رضي الله عنه: آية المنافق ثلاث، زاد مسلم: وان صام وصلّى وزعم انّه مسلم ثم اتفقا: اذا حدّث كذب واذا وعد أخلف واذا اؤتمن خان. (متفق عليه).

وفي مشكوة المصابيح ج:۲ ص:۴۱۲ (طبع قديمي) اياكم والكذب وانّ الكذب يهدى الى الفجور وانّ الفجور يهدى الى النّار، وما يزال الرّجل يكذب ويتحرّى الكذب حتّى يُكتب عند الله كذّابًا. (متفق عليه).

وفي مشكوة المصابيح كتاب الامارة والقضاء باب الأقضية والشهادات، الفصل الأوّل (طبع قديمي)

عن أمّ سلمة رضى الله عنها أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: انّما انا بشر وانكم تختصمون الىّ ولعلّ بعضكم ان يكون ألحن بحجته من بعض فاقضى له على نحو ما أسمع منهُ فمن قضيت له بشيء من حق أخيه لا يأخذنه فانّما أقطع له قطعة من النار. (متفق عليه).

وفي الدّر المختار ج:۶ ص:۴۲۷ (طبع سعيد) الكذب مباح لاحياء حقه ودفع الظّلم عن نفسه والمراد التعريض لأنّ عين الكذب حرام قال وهو الحق قال تعالىٰ: "قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ"

وفي الشامية والضابط فيه كما في تبيين المحارم وغيره عن الأحياء ان كل مقصود محمود يمكن التوصل اليه بالصدق والكذب جميعًا فالكذب فيه حرام. وفيها أيضًا بعد أسطر قال عليه الصلاة والسلام: كل كذب مكتوب لا محالة الّا ثلاثة الرجل مع امرأته أو ولده والرّجل يصلح بين اثنين والحرب فانّ الحرب خدعة. قال الطحاوى وغيره وهو محمول على المعاريض لأنّ عين الكذب حرام قلت وهو الحق قال تعالىٰ: "قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ" وقال عليه الصلاة والسلام: الكذب مع الفجور وهما في النار، ولم يتعيّن عين الكذب للنّجاة وتحصيل المرام .....الخ.

وفي الدّر المختار أيضًا بعده ج:۶ ص:۴۲۸ (طبع سعيد) وللصلح جاز الكذب أو دفع ظالم .....الخ.

وفي خلاصة الفتاوىٰ ج:۴ ص:۳۴۶ (طبع رشيديه كوئٹه) يجوز الكذب في ثلاثة مواضع في الصلح بين النّاس وفي الحرب، ومع امرأته ....الخ.

وفي سكب الأنهر كتاب الكراهية فصل في المتفرقات ج:۲ ص:۵۵۲ (طبع داراحياء التراث العربي بيروت) والكذب حرام الّا في الحرب للخدعة وفي الصلح بين اثنين وارضاء الأهل، وفي دفع الظّالم عن الظّلم والمراد التعريض لأنّ عين الكذب حرام، قال في المجتبى وهو الحق قال تعالىٰ: "قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ".

فرمائے آمین۔ آپ سے اس دور کے اندر اللہ تعالیٰ نے دِین کی حفاظت کا جو کام لیا ہے اور لے رہے ہیں، اس کی مثال ملنا مشکل ہے، یہ پوری اُمت پر آپ کا احسان ہے، مشکل سے مشکل مسئلے کا حل آپ کی کتب میں ملتا ہے، بہت دِل خوش ہوتا ہے، اللّٰھم زد فزد، آمین۔

اس وقت حدِ شربِ خمر کی بحث میرے زیرِ مطالعہ ہے، جنابِ والا کی عظیم تالیف ''تکملہ'' سے بہت رہنمائی ملی ہے، اس وقت ایک ذہنی اُلجھن پیدا ہوگئی ہے، جس کو حل کرانے کے لئے خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ساتھ نادم بھی ہوں کہ آپ کا وقت ضائع کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ جنابِ والا کو اَجرِ عظیم عطا فرمائے، آمین۔

میری پریشانی یہ ہے کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پرورش میں رہ چکے ہیں، ان کے کردار سے واقف ہیں، جب کوفہ کے حاکم بنائے گئے تو ان کے خلاف سازش تیار کی گئی کہ انہوں نے شراب پی ہے، اور وہی سازشی لوگ شراب پینے کی شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس ولید بن عقبہؓ کے خلاف دیتے ہیں، اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ولیدؓ کو طلب کر کے اس شہادت کے حوالے سے ان سے جواب طلبی کرتے ہیں، اور وہ جواب دیتے ہیں کہ ''فواللہ انھما لخصمان موتوران'' لیکن اس جواب کو پذیرائی نہیں بخشی گئی اور ان پر حد جاری کی گئی۔

اس پر میرا شبہ ہے جو یقیناً غلط ہوگا، لیکن اپنی غلطی مجھ پر واضح نہیں ہے، اس لئے جناب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

شبہ یہ ہے کہ جب مدعا علیہ گواہان کو مجروح اور جرح بھی خصوصاً مجرد نہ ہو بلکہ وجہ بھی بیان کرے کہ گواہان ان کے سخت دُشمن ہیں، تو پھر اِنصاف کا تقاضا یہ ہے کہ صفائی کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ان کی دُشمنی کو ثابت کرے، خصوصاً حدود کے اندر احتیاط بہت ضروری ہے جو شبہات سے ٹل جاتی ہے۔

فقہاء نے بھی عدالتی طریقۂ کار میں ملزم کو صفائی کا موقع دینے کا ذکر کیا ہے۔

حضرتِ والا نے تکملہ فتح الملہم ج:۲ ص:۴۹۸ تا ۵۰۲ میں اس واقعے پر تفصیل سے بحث کی ہے، جنابِ والا کا یہی رُجحان ہے کہ محض شہادت کی بناء پر ان پر حد جاری ہوئی ہے، ورنہ وہ اس کردار کے آدمی نہیں تھے، اور آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابتداء کے اندر خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی حد جاری کرنے میں تردّد تھا، بلکہ تکملہ کے پیرا نمبر ۷ ص:۵۰۱ پر لکھا ہے کہ ''أنّ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ لم یزل یشک فی صحّۃ شھادۃ الشھود علی الولید'' اس وضاحت سے میرا شبہ مزید مضبوط ہوجاتا ہے کہ ان کو صفائی کا موقع ملنا چاہئے تھا کہ گواہان کی دُشمنی کو ثابت کرتے اور حد سے بچ جاتے،

مگر ایسا نہ ہوا۔

مجھے اس شبہ کے اظہار پر بھی تردّد لگتا ہے کہ چونکہ یہ عظیم ہستی کا فعل ہے جو یقیناً صحیح ہوگا، اور میرا شبہ کرنا غلط ہوگا، اس پر توبہ کرتا ہوں، چونکہ ایک عرصہ تک عدالتی کام سے واسطہ رہا ہے، وہاں ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۳۴۲ کے تحت ملزم کو صفائی کا موقع دیا جاتا ہے، اس عادت کی وجہ سے یہ شبہ پیدا ہوا ہے، جس کا ذکر کر دیا ہے، آخر میں دُعا کی درخواست ہے۔

والسلام
جناب کا شاگرد
(قاضی) بشیر احمد عفا اللہ عنہ
باغ، آزاد کشمیر
۲۰۰۵/۳/۱۴ء

جواب:- گرامی قدر مکرّم جناب مولانا قاضی بشیر احمد صاحب زید مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ موصول ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ تاریخی روایات سے اس دور کے کسی مقدمے کی مکمل کارروائی اور اس کی تفصیلات کا پورا علم نہیں ہوتا۔ راوی اپنی ترجیحات کے مطابق جو حصہ روایت کرنا مناسب سمجھتے ہیں، روایت کرتے ہیں، باقی چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ بات ممکن نہیں ہے کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو صفائی کا موقع نہ دیا گیا ہو، قاعدے سے اگر انہوں نے گواہوں پر جرح کی تو اُس جرح کا بارِ ثبوت بھی اُن پر ہونا تھا، اور شاید وہ اسے مکمل طور پر ثابت نہ کر سکے ہوں، اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ہمارے لئے ایک خلیفۂ راشد کے فیصلے کے بارے میں مطمئن ہونے کے لئے یہ احتمال بھی کافی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۲۶/۲/۲۱ھ

مدعا علیہ کی غیر موجودگی میں مدعی سے رقم لے کر اس کے حق میں فیصلہ نافذ نہیں ہوگا

سوال:- تحصیل مولوی صاحب کے پاس کسی قسم کا تنازعہ آگیا، جناب کے پاس فیصلۂ شریعت کی درخواست کی گئی، مولوی صاحب نے مدعی اور مدعا علیہ کو بلا کر بیان لئے، بیان لے کر ہر دو فریقین کو تاریخ دے دی، تاریخ سے قبل مدعی نے جا کر مولوی صاحب کو تھوڑی رقم روپیہ دیا، اور مدعا علیہ

(۱) تفصیل کے لئے تکملة فتح الملهم ج:۲ ص:۴۹۸ تا ۵۰۲ ملاحظہ فرمائیں۔

کے کوئی آدمی مخاصم تھے، یعنی دُشمن مخاصمان سے شہادت لے کر عدم موجودگیٔ مدعاعلیہ کے مولوی صاحب نے مدعی کے حق میں فیصلہ لکھ دیا، مدعی نے تاریخ سے قبل مدعاعلیہ کو پڑھ کر سنایا، مدعاعلیہ نے وہ فیصلہ نہ مانا، لہٰذا علاء الدین نے آگے دوبارہ درخواست کی کہ اس مسئلے پر غور فرمائیں چونکہ یہ مسئلہ غور کے قابل ہے، عند شریعت محمدی و مذہب حنفیہ کے مولوی صاحب کا حکم یک طرفہ نافذ ہوگا یا نہیں؟

(مقامی دار الافتاء کی طرف سے جواب)

الجواب: "وَمَنْ يَّعْصِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ" الآية، "وَمَنْ يَّعْصِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خٰلِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ"۔ [1] دُوسری جگہ ہے: ولا تصح ولاية القاضي حتّى يجتمع في المولّى شرائط الشهادة ويكون من أهل الاجتهاد۔ [2] دُوسری جگہ ہے: ولو كان القاضي عدلا ففسق بأخذ الرشوة أو غيره كالزنا وشرب الخمر۔ [3] تیسری جگہ ہے: وينبغي للمقلد أن يختار من هو الأقدر والاولىٰ لقوله عليه السلام: من قلد انسانًا عملا وفي رعيته من هو اولى منه فقد خان الله ورسوله وجماعة المسلمين، وفي حد الاجتهاد كلام عرف في اصول الفقه حاصله أن يكون صاحب حديث له معرفة بالفقه ليعرف معاني الآثار او صاحب فقه له معرفة بالحديث لئلا يشتغل بالقياس في المنصوص عليه. (الهداية مع الدراية ص: ۱۳۲، كتاب ادب القاضي)۔ [4]

چوتھی جگہ: قال ولا يقضي القاضي علىٰ غائب الّا ان يحضر من يقوم مقامه وقال الشافعيؒ يجوز لوجود الحجة وهي البينة فظهر الحق ولنا ان العمل بالشهادة لقطع المنازعة ولا منازعة بدون الانكار ولم يوجد، ولأنه يحتمل الاقرار والانكار من الخصم فيشتبه وجه القضاء لأنّ أحكامهما مختلفة. (الهداية مع الدراية ص: ۱۴۲، كتاب ادب القاضي)۔ [5]

والعدو لا تقبل شهادته علىٰ عدوه اذا كانت دنيوية ولو قضى القاضي بها لا ينفذ ذكره يعقوب باشا فلا يصح قضاؤه عليه۔ [6] دُوسری جگہ: اخذ القضاء برشوة للسلطان أو لقومه وهو عالم بها أو بشفاعة، جامع الفصولين وفتاوىٰ ابن نجيم أو ارتشى وهو أو أعوانه بعلمه شرنبلالية وحكم لا ينفذ حكمه. (الدر المختار كتاب القضاء ص: ۳۰۶)۔ [7]

---

(۱) سورة النساء آية: ۱۴۔
(۲) الهداية ج:۳ ص: ۱۳۹ كتاب ادب القاضي (طبع رحمانيه)۔
(۳) حوالہ سابقہ۔
(۴) الهداية ج:۳ ص: ۱۴۰ كتاب ادب القاضي (طبع رحمانيه)۔
(۵) الهداية ج:۳ ص: ۱۵۰ (طبع رحمانيه)۔
(۶) الدر المختار ج:۵ ص: ۳۵۶، ۳۵۷ (طبع سعيد)۔
(۷) الدر المختار ج:۵ ص: ۳۶۲، ۳۶۳ (طبع سعيد)۔

ھٰذا مشتمل علیٰ ثلاثۃ صوَر: ۱-رشوت ستانی، ۲-شہادت دُشمن بردُشمن، ۳-عدم موجودگی مدعاعلیہ، جبکہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر تین صورتوں میں سے ایک صورت قاضی کے لئے ہو تو قضاءِ قاضی منعدم کی جاتی ہے، لہٰذا تین صورتوں کا اِجراء من القاضی ہوجائے تو اس کی قضاء بطریقِ اَوْلیٰ نافذ نہیں ہوگی، بحوالہ ہدایہ، درمختار اور تمام کتب الفقہاء اور مع نص کے قضاء رَدّ کی جاتی ہے۔

المجیب مصیب

احقر العباد مظفر الدین عفی عنہ

(جواب از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

جواب:- جوابِ بالا دُرست ہے، صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان دُرست ہے تو تین وجوہ سے مولوی صاحب کا فیصلہ شرعاً نافذ نہیں ہے، ایک یہ کہ انہوں نے مدعاعلیہ کی عدم موجودگی میں فیصلہ کیا، وفی الدر المختار: **ولا یقضی علیٰ غائب ولا له ای لا یصح بل لا ینفذ علی المفتی به** بحر (الشامی ج:۴ ص:۵۲)[۱]۔ دُوسرے یہ کہ مدعاعلیہ کے دُشمن سے اس کے خلاف گواہی قبول کی گئی، **والعدو لا تقبل شهادته علیٰ عدوه اذا كانت دنيوية ولو قضٰی القاضی بها لا ینفذ ذكره یعقوب باشا.** (درمختار مع الشامی ص:۴۶۵)[۲]۔ تیسرے یہ کہ رشوت لی گئی، اور اگرچہ قاضی مرتشی کے فیصلوں کے نفاذ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، لیکن جس مقدمے میں رشوت لی گئی ہو اس کے بارے میں اکثر فقہاء کا مسلک یہی ہے کہ اس میں فیصلہ نافذ نہیں ہوتا، **خلافًا للبعض ومال الشامی الیٰ ترجیح قول البعض لضرورة الزمان.** (شامی ج:۴ ص:۴۷۱)[۳] **ولا ضرورة هنا۔**

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

۱۳۹۱/۴/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۳۳۷ الف)

(۱) الدر المختار ج:۵ ص:۴۰۹ (طبع سعید).

(۲) در مختار ج:۵ ص:۳۵۶ (// //).

(۳) در مختار ج:۵ ص:۳۵۸ (// //).

﴿کتاب الحدود﴾

(حدود کا بیان)

اِقرار کے ذریعے زنا کی شرعی سزا نافذ ہونے کی شرائط

سوال:- کیا ایک مرد اور عورت کا یہ اقرار کہ نکاح کے تین ماہ بعد پیدا شدہ بچہ اُن کا ہے، زِنا کا اقرار سمجھا جائے گا۔

۲:- کیا اس مرد اور عورت پر اس جرم میں زِنا کی حد نافذ ہوگی؟

جواب ۱،۲:- صرف اتنے اقرار سے حدِ زِنا جاری نہیں ہوسکتی، حدِ زِنا کے لئے ضروری ہے کہ عدالت میں غیر مبہم الفاظ کے ساتھ زِنا کا اقرار کرے، اور اِمام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایک مرتبہ اقرار کرنا بھی کافی نہیں، چار مرتبہ اسی طرح اِقرار کرنا ضروری ہے،[1] لہٰذا مذکورہ اقرار پر حد جاری نہ ہوگی، البتہ تعزیر ہوسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷۱۳ ج)

اقرار اور گواہی میں سے کچھ نہ ہونے کی صورت میں ''زنا'' کا جرم ثابت نہ ہوگا

سوال:- زید نے عمر کو بمعہ اہلیہ کے اپنے گھر پر مدعو کیا، عمر بمعہ اہلیہ کے جب زید کے گھر پہنچا تو زید کے اہل و عیال دُوسرے مہمانوں کے ساتھ کہیں گئے ہوئے تھے، اس کے بعد زید اور عمر دونوں نمازِ عصر کے لئے مسجد میں چلے گئے، نماز کے بعد زید نے عمر کو مٹھائی لانے کے لئے پیسے دیئے، عمر مٹھائی لینے کے لئے بازار گیا، مٹھائی لائے بغیر عمر، زید کے گھر پر واپس آگیا، اور عمر نے زید کو گھر پر نہیں پایا، اس کے بعد عمر اپنی اہلیہ کے ساتھ اپنے گھر واپس آگیا، اس کے بعد عمر کی بیوی کا الزام ہے کہ زید نے میرے ساتھ بدفعلی کی، مگر زید اس الزام کا انکار کرتا ہے اور اس فعل کا کوئی عینی شاہد نہیں ہے، عمر کی بیوی حلفیہ کہتی ہے کہ ایسا ہوا ہے، اور زید بھی حلفیہ کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا، تو ایسی صورت میں شریعت کیا حکم دیتی ہے؟

---

(۱) فی فتح القدیر کتاب الحدود ج:۵ ص:۴ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) الزنا یثبت بالبینة والاقرار ..... وعلیٰ ص:۸ والاقرار ان یقر البالغ العاقل علیٰ نفسہ بالزنا أربع مرات فی اربعة مجالس من مجالس المقر.

فی الجوھرة النیرة کتاب الحدود ج:۲ ص:۲۲۴ (طبع قدیمی کتب خانہ) الزنا یثبت بالبینة والاقرار ..... (وبعد أسطر فی المتن) والاقرار أن یقر البالغ العاقل علیٰ نفسہ بالزنا أربع مرات فی أربعة مجالس من مجالس المقر.

جواب :- صورتِ مسئولہ میں جب عمر کی بیوی حلفیہ اقرار کر رہی ہے اور ایسے اِکراہ کا بھی ذِکر نہیں کرتی جس سے وہ بالکل مجبور ہوگئی ہو، تو اس کا گناہ تو ثابت ہوگیا، جس کا علاج بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ توبہ و اِستغفار کرے، صدقِ دِل کے ساتھ توبہ کرلے گی تو اِن شاء اللہ گناہ معاف ہوجائے گا۔[1] لیکن زید چونکہ نہ اقرار کرتا ہے نہ اس کے گناہ پر کوئی گواہ ہے، لہٰذا اس کے خلاف جرم ثابت نہیں ہوا۔[2]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۵۹۷/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

صرف ایک گواہی سے زنا کی شرعی سزا جاری نہیں ہوسکتی، البتہ گواہ کے معتبر ہونے کی صورت میں تعزیری سزا جاری کی جاسکتی ہے

سوال :- اگر کوئی شخص کسی مجاہد یا علاقے کے کمانڈر کو یہ اطلاع دیدے کہ فلاں پرانے گھر میں ایک جوان اور لڑکی کو زنا کرتے ہوئے دیکھا اور اس خبر کی ایک شخص تائید بھی کرے، تو یہ مجاہد اور کمانڈر وہاں جاکر دیکھے تو وہ جوان وہاں سے نکل رہا ہو اور پرانے گھر میں لڑکی موجود ہو اور جو بھی ان سے سوال کرے جواب نہ دے، تو وہ مجاہد اور کمانڈر اس جوان کو بے تحاشا بے دردی بڑی عزتی کے ساتھ مارے لیکن وہ جوان اس مار سے مرا بھی نہیں اور نہ اس کا کوئی عضو ٹوٹا، تو کیا اس مجاہد اور کمانڈر پر شرعی طور پر کچھ عائد ہوتا ہے یا نہیں؟

---

(۱) وفی فتح الباری ج:۱۲ ص:۱۶۹ (طبع مکتبة الرشد) ..... وقد یتمسک به من قال أنه اذا جاء تائبًا سقط عنه الحد .... وقوّاه بأن الحسنة التی جاء بها من اعترافه طوعًا بخشیة الله وحدهٗ تقاوم بالسیئة الّتی عملها لأن حکمة الحدود الرّدع عن العود وصنیعه ذٰلک دالّ علی ارتداعه فناسب رفع الحدّ عنه لذٰلک .....الخ.

وفی ردّ المحتار مطلب التوبة تسقط الحد قبل ثبوته ج:۴ ص:۴ (طبع سعید) الظاهر أن المراد انّها لا تسقط الحد الثابت عند الحاکم بعد الرّفع الیه امّا قبله فیسقط الحد بالتّوبة .... (وبعد أسطر) رجل أتی بفاحشة ثم تاب وأناب الی الله تعالٰی فانه لا یعلم القاضی بفاحشته لاقامة الحد علیه لأنّ الستر مندوب الیه وفی شرح الاشباه للبیری عن الجوهر رجل شرب الخمر وزنی ثم تاب ولم یحد فی الدنیا هل یحد له فی الآخرة؟ قال الحدود حقوق الله تعالیٰ الا انّه تعلق بها حق الناس وهو الانزجار فاذا تاب توبة نصوحًا أرجو أن لا یحد فی الآخرة فانّه لا یکون أکثر من الکفر والرّدة وانّه یزول بالاسلام والتّوبة.

(۲) وفی الدّر المختار کتاب الحدود ج:۴ ص:۷ و ۸ (طبع سعید) (ویثبت بشهادة أربعة) رجال فی مجلس واحد ...... بلفظ الزنا .... ویثبت أیضًا باقراره صریحًا صاحیًا ولم یکذبه الآخر .....الخ.

وکذا فی البحر الرّائق کتاب الحدود ج:۵ ص:۷ و ۱۲ (طبع رشیدیه).

وفتح القدیر کتاب الحدود ج:۵ ص:۴ و ۸ (طبع رشیدیه کوئٹه).

جواب:- صرف ایک شخص کی گواہی سے زنا کی حدِ شرعی (سو کوڑے یا سنگساری) تو کسی حال نہیں دی جاسکتی[1]، البتہ اگر ایک معتبر شخص کی گواہی اور دُوسرے معتبر قرائن سے یہ غالب گمان ہوجائے کہ مرد وعورت مشتبہ حالت میں پائے گئے ہیں، تو ان کو تعزیری سزا دی جاسکتی ہے[2]، لیکن اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مجاہدین کی متعینہ حکومت کی طرف سے اس کمانڈر کو ایسے معاملات کی سزا دینے کا اختیار دیا گیا ہے تو وہ خود سزا دے سکتا ہے، ورنہ خود سزا دینے کے بجائے اپنے اس افسر کے سپرد کردے جسے سزا دینے کا اختیار حاصل ہو۔

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۷/۴۰ الف)

حدود ترمیمی بل میں زنا بالجبر کی سزا سے متعلق سورۂ نور کی آیت نمبر۳۳ سے اِستدلال کی وضاحت

سوال:- محترم مفتی تقی عثمانی صاحب السلام علیکم

حدود قوانین کے بارے میں جو بحث اِس وقت ملک میں جاری ہے، اُس کے حوالے سے آپ کا تفصیلی نقطۂ نظر ''جنگ'' کے کالموں میں پڑھنے کا موقع ملا۔ اِس ضمن میں میں آپ سے چند باتوں کی وضاحت چاہتا ہوں، اُمید ہے آپ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

پہلی بات یہ ہے زنا بالجبر موجب حد جس کے لئے حدود قوانین میں چار گواہ پیش کرنے کی شرط تھی، کیا پچھلے ۲۷ سال میں کسی مجرم کو دی جاسکی ہے؟ جب یہ ممکن ہی نہیں تو پھر اگر اس کو بل میں سے نکال دیا گیا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ جب ایک بات بعید از عقل ہے تو پھر اُس کے لئے اصرار کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟

دُوسری بات یہ ہے کہ اگر ایک غیرشادی شدہ شخص زنا بالجبر کا مرتکب ہوتا ہے تو اُسے کیا سزا دی جائے گی؟ اگر اُس کی سزا بھی سو کوڑے ہے تو پھر یہ سزا تو اُس غیرشادی شدہ کے لئے بھی ہے جو زنا بالرضا کا مرتکب ہوتا ہے جبکہ آپ لکھتے ہیں: ''یہ عقل عام کی بات ہے کہ زنا بالجبر کا جرم رضامندی سے کئے ہوئے زنا سے زیادہ سنگین جرم ہے، لہٰذا اگر رضامندی کی صورت میں یہ حد عائد ہو رہی ہے تو جبر کی صورت میں اس کا اطلاق اور زیادہ قوت کے ساتھ ہوگا۔'' (جنگ مؤرخہ ۲۳رنومبر ۲۰۰۶ء) کیسے؟

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے سابقہ ص:۵۳۸ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) دیکھئے الدر المختار مع رد المحتار ج:۴ ص:۶۲ و۶۳ (طبع سعید)۔

میری تیسری گزارش یہ ہے کہ سورۂ نور کی جس آیت کو آپ نے زنا بالجبر کا شکار ہونے والی خاتون کی بریت کے حوالے سے بطورِ دلیل پیش کیا ہے اُس کا اِس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ آیت تو اُن لونڈیوں کے بارے میں ہے جن سے اُن کے مالک زبردستی پیشہ کرواتے تھے، اُن کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے کہ چونکہ اُنہیں اِس فعلِ بد پر مجبور کیا جارہا ہے اِس لئے اللہ تعالیٰ اُنہیں معاف فرمادے گا۔ اگر آیت کو سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو دُوسرا کوئی معنی لینا ممکن ہی نہیں ہے۔ شاید یہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ ہمارے ہاں قرآن پاک کی آیات کو سیاق وسباق میں رکھ کر مطالعہ کرنے کا رُجحان بہت کم ہے، دُوسری کوئی وجہ میری سمجھ میں تو نہیں آرہی ہے۔

موجودہ حکومت نے حدود قوانین میں جو ترمیمات کی ہیں وہ بھی حرفِ آخر نہیں ہیں، یہ بھی ایک اِنسانی کام ہے جس میں بہتری کی گنجائش موجود رہے گی۔ اسی طرح حدود آرڈی نینس مجریہ ۱۹۷۹ء بھی ایک انسانی کام تھا جس کے اندر بنیادی خامیاں موجود تھیں، میں تو حیران ہوتا ہوں کہ مجھ جیسا ایک عام طالبِ علم بھی سمجھتا ہے کہ اُن قوانین میں بنیادی نوعیت کی خامیاں تھیں اور انہیں بہت جلد دُور ہوجانا چاہئے تھا، لیکن ہمارے مذہبی حلقے اُسے حدود اللہ میں مداخلت کا رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں جذبات وتعصبات سے بالاتر ہوکر سوچنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں مقلدانہ اندازِ فکر سے آزاد ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

والسلام علیکم

ناصر مصطفیٰ

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

سفروں کی وجہ سے آپ کے خط کے جواب میں تاخیر ہوئی، معذرت خواہ ہوں۔

سورۂ نور آیت ۳۳ کے بارے میں عرض ہے کہ جن لونڈیوں سے زبردستی پیشہ کرایا جارہا ہے، اُن سے زبردستی زنا کرنے والے، خواہ پیسے دے کر کرتے ہوں، زنا بالجبر ہی کے مرتکب تو ہیں۔[1] اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے لونڈیوں کی تو مغفرت کا اِعلان فرمادیا، لیکن جن لوگوں نے ان سے زنا بالجبر کیا، اُن کی معافی کا تو کوئی اِعلان نہیں،[2] لہٰذا سورۂ نور کی آیت نمبر۲ میں بیان کی ہوئی سزا اُن پر بھی عائد ہوگی۔ میرے اِستدلال کی یہ وجہ تھی۔

والسلام

۱۴۲۸/۴/۷ھ

(۱ و ۲) وفی أضواء البیان سورة النور ج:۵ ص:۵۳۲ (طبع دار الفکر بیروت) فإن اللہ من بعد إکراھھن (لھن) غفور رحیم، ذکرہ عنہ القرطبی، وذکرہ الزمخشری عن ابن عباس رضی اللہ عنھم جمیعا.

فزیادة لفظة لھن فی قراءة من ذکرنا استشھاد بقراءة شاذة لبیان بقراءة غیر شاذة أن الموعود بالمغفرة والرّحمة، ھو المعذور بالإکراہ دون المکرہ؛ لأنہ غیر معذور فی فعلہ القبیح. ....(باقی اگلے صفحے پر)

صرف توبہ اور ستر سے حد ساقط ہوسکنے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خاتون نے اِقرارِ زِنا کیوں کیا؟ نیز زانی کے لئے ستر افضل ہے یا اِقرار؟

سوال:- مکرمی ومحترمی تقی عثمانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''معارف القرآن'' سورۂ مائدہ کی آیت نمبر۳۳ کے مسائل کے مطالعے کے دوران ذہن میں ایک اِشکال نے جنم لیا، جو عرض کرتا ہوں۔ محترم محترم محترم مولانا شفیع صاحب دامت برکاتہم نے شرعی سزاؤں کے ضمن میں پانچ حدود ذِکر کی ہیں اور لکھا ہے کہ ان سزاؤں کی صورت میں توبہ کرنے سے اُخروی حساب معاف ہوجاتا ہے لیکن دُنیوی سزا نہیں۔ اس سے یہ بات ذہن میں پیدا ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک زانی عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اِعترافِ جرم (خود حاضر ہوکر، حالانکہ آپؐ کو علم نہیں تھا) کرکے سزا چاہی۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے بیان کو سامنے رکھتے ہوئے اگر وہ عورت مخلصانہ توبہ کرلیتی اور اپنے گناہ کو پوشیدہ رکھتی تو نہ صرف اُخروی عذاب سے بچ جاتی بلکہ دُنیاوی ذِلت ورُسوائی اور سزا سے بھی۔ اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ اس مسئلے سے لاعلم تھی؟ کیا وہ ضمیر کے ہاتھوں تنگ آکر جذباتی رو میں بہہ کر سزا چاہنے لگی تاکہ اس کے دِل کا بوجھ ہلکا ہوجائے؟ اگر نہیں تو سزا سے پہلے حضور

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)..........

وفی الدر المنثور ج:۷ ص:۳۹۷ باب:۳۳ (طبع موقع التفاسیر) (فإن الله من بعد إكراههن غفور رحيم) قال: للمكرهات على الزنا.

وأخرج عبد بن حميد عن قتادة (فإن الله من بعد إكراههن غفور رحيم) قال: لهن وليست لهم.

وفی اللباب باب:۳۳ ج:۱۲ ص:۱۰۰ (ومن يكرههن فإن الله من بعد إكراههن غفور رحيم) اى غفور رحيم للمكرهات والوزر على المكره، وكان الحسن إذا قرأ هذه الآية قال: لهنّ والله لهن.

وفی كتاب الأم ج:۵ ص:۱۷۴ (طبع بيروت) (فإن الله من بعد إكراههن غفور رحيم) نزلت في الإماء المكرهات أنه مغفور لهن بما أكرهن عليه وقيل غفور أى هو أغفر وأرحم من أن يؤاخذهن بما أكرهن عليه وفى هذا كالدلالة على إبطال الحد عنهن إذا أكرهن على الزنىٰ.

وفى تفسير ابن أبى حاتم سورة النور ج:۱۰ ص:۱۲۷ عن ابن عباسؓ رقم:۱۵۳۲۰ أن جارية لعبدالله بن ابى كانت تزنى فى الجاهلية فولدت أولادًا من الزنا فقال لها مالك لا تزنين قالت: لا والله لا أزنى فضربها فأنزل الله تعالىٰ ولا تكرهوا فتياتكم. وكذا فى تفسير ابن كثير باب:۳۲ ج:۶ ص:۵۵ (طبع مجمع الملك فهد) وكذا فى تفسير الآلوسى باب:۳۳ ج:۱۳ ص:۴۲۷.

وفى التفسير الكبير ج:۱۱ ص:۳۲۳ (طبع موقع التفاسير) فإن الله غفور رحيم بهن لأن الإكراه أزال الإثم والعقوبة لأن الإكراه عذر للمكرهة أما المكره فلا عذر لهٗ فيما فعل الثانى.

وفى تفسير الشعراوى باب:۳۳ ج:۱ ص:۶۳۲۷ لا تكرهوا الإماء على البغاء وقد كن يبكين ويرفضن هذا الفعل وكن يؤذين ويتعرضن للغمز واللّمز ويتجرأ عليهن الناس.

وفى تفسير روح البيان، سورة النور ج:۶ ص:۱۰۸ (طبع دار النشر) غفور رحيم أى لهن وفيه دلالة على أن المكرهين محرومون منهما بالكلية. نیز دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج:۶ ص:۴۱۷۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو یہ مسئلہ بتایا نہیں؟ کہ اس طرح تم بچ سکتی تھیں، یا پھر اس میں کوئی شرعی حکمت ہے؟

جواب:- مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ درست ہے کہ اگر کسی شخص سے اس قسم کا گناہ خدانخواستہ سرزد ہوجائے تو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ اسے چھپائے،[1] اور توبہ کرے۔[2] لیکن جب ایسا شخص قاضی کے پاس آجائے اور اعتراف کرلے تو قاضی اُسے صراحۃً چھپانے کا مشورہ نہیں دے سکتا،[3] البتہ سنت یہ ہے کہ ایک مرتبہ اقرار کرنے پر قاضی منہ موڑ لے،[4] جو ایک خفیف سا اِشارہ ہے کہ تم واپس چلے جاؤ،[5] لیکن تین بار[6] منہ موڑنے کے بعد جب چوتھی بار وہ اِقرار کرے تو پھر سزا جاری کی جائے گی۔[7] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاتون کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔[8] بحیثیتِ قاضی آپؐ اس سے صراحۃً یہ نہیں فرماسکتے تھے کہ تمہارے اِقرار کرنے سے چھپانا بہتر ہے۔ اُس خاتون کے قلب پر آخرت کا خوف اس درجہ طاری تھا کہ وہ ان خفیف اِشاروں کو نہ سمجھی، اور سزا جاری کرنے پر اِصرار کیا۔[9] اور تکوینی طور پر اس میں اللہ تعالیٰ کی یہ مصلحت تھی کہ اُس کے ذریعے دِین کے ایک اہم حکم کا عملی نفاذ کراکے ہمیشہ کے لئے قانون اور سنت کو محفوظ کرنا تھا۔[10]

واللہ اعلم

۱۴۲۲/۱/۷ھ

(۱ و ۲) وفی فتح الباری، باب لا یرجم المجنون والمجنونة ج:۱۲ ص:۱۵۸ (طبع مکتبة الرّشد، مکة المکرّمة) ویؤخذ من قضیته أنه یستحب لمن وقع فی مثل قضیته أن یتوب إلی الله تعالیٰ ویستر نفسه ولا یذکر ذٰلک لأحد کما أشار به أبوبکر وعمر علی ماعز وان من اطلع علی ذٰلک یستر علیه بما ذکر ولا یفضحهٗ ولا یرفعه إلی الإمام کما قال صلی الله علیه وسلم فی هٰذه القصة لو سترته بثوبک کان خیرًا لک وبهٰذا جزم الشافعیؒ فقال أحب لمن أصاب ذنبًا فستره الله علیه أن یستر علیٰ نفسه ویتوب.

وفیه أیضًا ج:۱۲ ص:۱۵۹ وفیه أنه یستحب لمن وقع فی معصیة وندم أن یبادر إلی التوبة منها ولا یخبر بها أحدًا ویستتر بستر الله وان اتفق انه یخبر أحدًا فیستحب أن یأمره بالتوبة وستر ذٰلک عن الناس کما جریٰ لماعز مع أبی بکر ثم عمر وقد أخرج قصته معهما فی المؤطا .... وفی القصّة أن النبی صلی الله علیه وسلم قال لهزال لو سترتهٗ بثوبک لکان خیرًا لک .... قال الباجی المعنیٰ خیرًا لک ممّا أمرتهٗ به من إظهار أمره وکان ستره بأن یأمرهٗ بالتوبة والکتمان کما أمرهٗ ابوبکر وعمر وذکر الثوب مبالغة أی لو لم تجد السبیل إلی ستره إلّا بردائک ممن علم أمرهٗ کان أفضل مما أشرت به علیه من الإظهار ... الخ.

وراجع أیضًا إلی شرح البخاری لابن بطّال ج:۸ ص:۴۴۳ (طبع دار النشر مکتبة الرشد).

وفی عمدة القاری (باب من أصاب ذنبًا دون الحد فأخبر الإمام فلا عقوبة علیه بعد التوبة إذا جاء مستفتیًا) ج:۲۳ ص:۴۴۵ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت) إذا تاب قبل أن یقام علیه الحد سقط عنه.

(۳ و ۷) وفی عمدة القاری ج:۲۳ ص:۴۴۵ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت) ولا یجوز للإمام العفو عنه إذا بلغهٗ.

وفی الهندیة ج:۲ ص:۱۴۴ (طبع رشیدیه) فإذا بین ذٰلک وظهر زناهُ سألهٗ عن الإحصان .... فإن وصفه بشرائطه حکم برجمه کذا فی التبیین.

(۴ و ۶) وفی صحیح المسلم رقم الحدیث:۴۴۸۴ عن أبی هریرةؓ قال: أتی رجل من المسلمین رسول الله صلی الله علیه وسلم وهو فی المسجد فناداهُ فقال: یا رسول الله! انی زنیتُ، فأعرض عنه حتّٰی ثنیٰ ذٰلک علیه أربع مرات فلما شهد علی نفسه أربع شهادات دعاه رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال: أبک جنون؟ قال: لا، .... (باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) قال: فهل أحصنت؟ قال: نعم، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذهبوا به فارجموهٗ.
نیز مزید احادیث کے لئے دیکھئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب تکملة فتح الملهم ج:۲ ص:۴۳۷ تا ص:۴۶۳۔
وفي الهندية ج:۲ ص:۱۴۴ (طبع رشيديه) وينبغي للإمام أن يزجر المقر عن الإقرار ويظهر الكراهة ويأمر بتنحيته كذا في المحيط.
وفي فتح الباري، كتاب الحدود ج:۱۲ ص:۱۵۶ (طبع مكتبة الرشد) ان رجلًا من أسلم قال لأبي بكر الصديق ان الآخر زنى قال: فتب إلى الله واستتر بستر الله، ثم أتى عمر كذلك، فأتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فأعرض عنه ثلاث مرار حتى إذا أكثر عليه بعث إلى أهله.
(۵) وفي عمدة القاري ج:۲۳ ص:۲ (طبع دار إحياء التراث العربي بيروت) يقول الإمام للمقر لعلك لمست المرأة أو غمزتها بعينيك أو بيديك وفي بعض النسخ بعد هذا أو نظرت ...الخ.
وفي فتح الباري ج:۱۲ ص:۱۵۹ (طبع مكتبة الرشد) وفيه التثبت في ازهاق نفس المسلم والمبالغة في صيانته لما وقع في هذه القصة من ترديده والايماء اليه بالرجوع والإشارة إلى قبول دعواه ان ادعىٰ اكراهًا واخطاءً في معنى الزنا أو مباشرة دون الفرج مثلًا أو غير ذلك.
وفي عمدة القاري ج:۲۳ ص:۴۴۰ (طبع دار إحياء التراث) وقال عياض فائدة سؤاله أبك جنون استقراء لحاله واستبعاد أن يلح عاقل بالإعتراف بما يقتضي اهلاكهٗ أو لعله يرجع عن قوله.
وفي الهندية ج:۲ ص:۱۴۴ (طبع رشيديه) وندب تلقينه لعلك قبلت أو لمست أو وطئت بشبهة وقال في الأصل لعلك تزوجتها أو وطئتها بشبهة والمقصود أن يلقنه ما يكون دارئًا كائنًا ما كان.
(۸) وفي حديث المسلم رقم:۴۴۹۴ .... ثم جائته إمرأة من غامد من الأزد فقالت: يا رسول الله! طهرني، فقال: ويحك ارجعي فاستغفري الله وتوبي إليه (الحديث). (راجع للتفصيل إلى تكملة فتح الملهم ج:۲ ص:۴۴۸ طبع دار العلوم كراچي).
(۹و۱۰) نیز اس اصل حکمت کے علاوہ اس خاتون کی طرف سے ستر کے بجائے اقرار کو اختیار کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض اوقات ستر اُس وقت افضل ہوتا ہے جبکہ کوئی ایسی چیز نہ پائی جائے جو ستر کے مخالف ومتضاد ہو، اور اُس متضاد امر کے پائے جانے کی وجہ سے ستر مشکل ہو۔ جیسا کہ غیر منکوحہ کا حاملہ ہونا۔ ایسی صورت میں بعض حضرات نے فرمایا کہ ستر کے بجائے اقرار اور مرافعہ افضل ہے چنانچہ فتح الباري ج:۱۲ ص:۱۵۸ و ۱۵۹ (طبع مكتبة الرشد) میں ہے:
أنّ الغامدية كان ظهر بها الحبل مع كونها غير ذات زوج فتعذر الإستتار للإطلاع على ما يشعر بالفاحشة ومن ثم قيد بعضهم ترجيح الإستتار حيث لا يكون هناك ما يشعر بضده وان وجد فالرّفع إلى الإمام ليقيم عليه الحد أفضل.
اور چونکہ یہ خاتون حاملہ ہوچکی تھیں لہٰذا انہوں نے اقرار کو افضل سمجھا، اسی لئے اس واقعے کی کئی احادیث میں یہ بات موجود ہے کہ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اشارۃً لوٹ جانے اور توبہ واستغفار کرنے کا فرمایا تو خاتون نے عرض کیا کہ میں یہ سمجھتی ہوں کہ آپ نے جس طرح حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو تعریض وغیرہ کے ذریعے ردّ فرمانا چاہا تھا تو شاید مجھے بھی اسی طرح تعریض فرمار ہے ہیں، جبکہ میرا معاملہ ماعز سے یوں مختلف ہے کہ ان کے پاس تو صرف اقرار تھا اور اُن کے لئے آپؐ کی تعریض کی بناء پر اقرار سے رُجوع ممکن تھا مگر میرے معاملے میں واضح قرینہ موجود ہے کہ میں تو باقاعدہ حاملہ ہوچکی ہوں لہٰذا مجھے پاک فرمادیجئے۔
خلاصہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے انہیں توبہ واستغفار کرنے، لوٹنے اور تعریض وتردید کے کئی اشارے پائے جانے کے باوجود اس خاتون نے مذکورہ اسباب (جس کا حاصل خوفِ آخرت ہی ہے جیسا کہ حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے تحریر فرمایا) کی بناء پر حد پر اصرار فرمایا۔
وفي حديث صحيح المسلم رقم الحديث:۴۴۹۴ ...... ثم جاءته إمرأة من غامد من الأزد فقالت: يا رسول الله طهرني، فقال: ويحك ارجعي فاستغفري الله وتوبي إليه، فقالت: أراك تريد أن ترددني كما رددت ماعز بن مالك، قال: وما ذاك؟ قالت: انها حبلى من الزنا، فقال: آنت؟ قالت: نعم، فقال لها: حتّى تضعي ما في بطنك. (الحديث)
وفي فتح الباري ج:۱۲ ص:۱۶۰ (طبع مكتبة الرشد)
وأما قول الغامدية تريد أن ترددني كما رددت ماعزًا فيمكن التمسك به لكن أجاب الطيبي بأن قولها انها حبلى من الزنا فيه إشارة إلى أن حالها مغايرة لحال ماعز لأنهما وان اشتركا في الزنا لكن العلة غير جامعة لأن ماعزًا كان متمكنًا من الرجوع عن إقراره بخلافها فكانها قالت أنا غير متمكنة من الإنكار بعد الإقرار لظهور الحمل بها بخلافه ...الخ.
وفي شرح سنن أبي داوٗد ج:۲۵ ص:۴۰۶ فالترداد بالنسبة لها قد حصل ولكنها طلبت منه ألا يفعل كما فعل بماعز ...الخ.

فصل فی القصاص والدّیات

(قصاص اور دیت کے مسائل کا بیان)

گاڑی کی ٹکر سے کسی کے مرجانے پر قصاص ودیت کا حکم

سوال:- گاڑی کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے کوئی مرجائے تو کیا ڈرائیور سے قصاص لیا جائے گا یا اس پر دیت واجب ہوگی؟

جواب:- اگر ایکسیڈنٹ ڈرائیور کی غلطی سے ہوا ہے، ارادہ مارنے کا نہیں تھا تب تو قصاص نہیں، صرف عاقلہ پر دیت آئے گی اور کفارہ واجب ہوگا،[1] اور اگر قتل کرنے ہی کا ارادہ تھا تو قصاص ہوگا۔

واللہ اعلم

۱۴۲۴/۳/۲۲ھ

ایکسیڈینٹ میں موت واقع ہونے کی صورت میں ذمہ دار ڈرائیور کی انشورنس کمپنی سے حاصل ہونے والی رقم ''دیت'' میں شمار کرکے وصول کرنے کا حکم

سوال:- امریکا میں پھوپھی کی بیٹی کو راستہ پار کرتے ہوئے ایک ٹرک کی خاتون ڈرائیور نے سگنل توڑتے ہوئے بچی کو ماردیا، جس سے وہ انتقال کرگئی، ٹرک انشورڈ کی ہوئی تھی، اب انشورنس کمپنی سے بچی کے والدین کو ہرجانہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ کیا یہ ہرجانہ دیت ہے یا نہیں؟ کیا دیت کی رقم سے زیادہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ انشورنس کمپنی سے ملنے کی صورت میں حلال ہے یا نہیں؟

بندہ محمد عامر عفی عنہ

خادم جامعۃ الرشید، احسن آباد

جواب:- اصل ہرجانہ ٹرک ڈرائیور کے ذمے لازم تھا، جس کے بقدرِ دیت مطالبے کا حق

---

(۱) فی الدر ج:۶ ص:۵۲۷ (طبع سعید) القتل ..... عمد، وھو أن یتعمد ضربه أی ضرب الآدمی فی أیّ موضع من جسده ..... وموجبه القود عینا .... والثالث خطاء ...... وموجبه ...... الکفارة والدّیة علی العاقلة والاثم دون اثم القتل .....اھ.

تھا، اس سے زائد مطالبے کا حق نہیں، لیکن قاتلِ خطا خود زائد دے تو لینا جائز ہے۔ رہا انشورنس کمپنی سے وصول کرنا، تو انشورنس کرانے والے نے اب تک کسی بھی مد میں جتنا پریمیم جمع کرایا ہو اس حد تک تو وصول کرنا بے غبار طور پر جائز ہے، اس سے زائد میں یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ انشورنس کمپنی اس کی عاقلہ کے قائم مقام سمجھی جائے[۱]، اس کو عاقلہ بنانے کے لئے جو عقدِ ناجائز کیا گیا وہ دونوں کا اپنا عمل ہے، جس کے وہ خود ذمہ دار ہیں، لیکن جب عرفاً و قانوناً وہ عاقلہ کے قائم مقام بن گئی تو اس سے وصول کرنے کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور اگرچہ انشورنس کمپنی کا مال اکثر عقودِ فاسدہ کی وجہ سے حرام ہونے کا گمان غالب ہے، لیکن کفار اہلِ حرب کے مخاطب بالفروع نہ ہونے کی بنا پر گنجائش معلوم ہوتی ہے[۲]، مگر اس پر پورا جزم نہیں، غور کرلیا جائے، اور دُوسرے علماء سے بھی رُجوع کرلیا جائے۔ والسلام

۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

۱:- موجودہ دور میں قتلِ شبہ عمد کی صاحبینؒ کی بیان کردہ تعریف اِختیار کرنے کا حکم

۲:- صلح عن دم العمد یا دیتِ عمد میں تین سال کی مہلت ضروری نہیں

سوال:- اِمام ابوحنیفہؒ نے قتلِ شبہ عمد کی تعریف یہ کی ہے کہ ”عمداً ایسی چیز سے قتل کیا جائے جو نہ ہتھیار ہو اور نہ ہی ہتھیار کے قائم مقام ہو۔“ (ہدایہ ج:۴ ص:۵۶۰، کتاب الجنایات)۔

صاحبینؒ نے یہ تعریف کی ہے: ”شبہ العمد ان یتعمد ضربہ بمالا یقتل بہ غالبًا“ (ہدایہ ج:۴ ص:۵۶۰)۔ اِمام شافعیؒ بھی صاحبینؒ کی تائید فرماتے ہیں لہٰذا بڑے پتھر اور بڑی لاٹھی سے قتل یا زیادہ پانی میں غرق کرکے یا پہاڑی سے گراکر غرضیکہ ہر اس چیز سے جو اَجزاء کو جدا نہ کرسکے، اِمام صاحبؒ کے نزدیک یہ قتلِ شبہ عمد ہوگا اور صاحبین کے نزدیک قتلِ عمد ہوگا۔

اِمام صاحبؒ نے آلۂ قتل ”سلاح“ کو نیتِ قتل کا مظہر قرار دیا ہے، لہٰذا ”سلاح“ سے قتل عمداً قتل ہوگا، اور ”بما لیس بسلاح ولا اجری مجرح السلاح“ سے قتلِ شبہ عمد ہوگا، اور صاحبینؒ کے نزدیک آلۂ قتل ”ما یقتل بہ غالبًا“ سے قتلِ عمد ہوگا اور ”بما لا یقتل بہ غالبًا“ سے شبہ عمد ہوگا۔

---

(۱) وفی الهداية ج:۴ ص:۲۲۸ و ص:۲۲۹ کتاب المعاقل (طبع مکتبہ رحمانیہ) والأصل فی وجوبها علی العاقلة قوله علیه السلام فی حدیث حمل بن مالک رضی الله عنه للأولیاء قوموا فدوه .... وانما خصّوا بالضم لأنه انما قصر لقوة فیه وتلک بأنصاره وهم العاقلة فكانوا هم المقصرین فی ترکهم مراقبته فخصوا به .... لأن العقل كان علی أهل النصرة وقد كانت بأنواع بالقرابة والحلف والولاء والعد. وفی عهد عمر رضی الله عنه قد صارت بالدیوان فجعلها علی أهله اتباعًا للمعنی ولهذا قالوا: لو كان الیوم قوم تناصرهم بالحرف فعاقلتهم أهل الحرفة ... الخ.

(۲) دیکھئے الدر المختار مع رد المحتار ج:۴ ص:۱۲۸ و ۱۲۹ (طبع سعید).

۱- اب قابلِ استفسار بات یہ ہے کہ اس دور میں قتل بالمثقل کے واقعات بکثرت ہیں، اسی طرح آلہ غیر جارحہ سے بھی قتل روزمرہ کا معمول ہے، اِمام صاحبؒ کی تعریف کو اگر ملکی قانون کا درجہ دیا جائے تو ڈر یہ ہے کہ قتل کے واقعات میں اضافہ ہوجائے گا، کیونکہ شبہِ عمد کی سزا دیت ہے، آج کل لوگوں کے پاس روپیہ عام ہے، پھر روپیہ ادا کرنے میں بھی سہولت ہے کہ اوّل تو عاقلہ دیت ادا کرے گی، پھر اس پر مستزاد یہ ہے کہ تین سال تک ادا کرنے کی مہلت بھی ہے، اس کے مقابلے میں صاحبینؒ کی تعریف اس دور کے مناسب ہے اور عقود رسم المفتی کی عبارت سے واضح ہے کہ قضاء کے معاملات میں اِمام ابویوسفؒ کے قول پر فتویٰ ہوگا۔ وفي القنية من باب المفتي الفتوىٰ علىٰ قول أبي يوسفؒ فيما يتعلق بالقضاء لزيادة تجربته كذا في البزازية من القضاء. (ص:۲۹، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)۔ اور اس بات کی اس کتاب میں تصریح ہے کہ صاحبینؒ کا قول درحقیقت امام صاحبؒ ہی کی کسی بنیاد کی فرع ہوتا ہے (ص:۱۷) اور خود اِمام صاحب بھی شبہ عمد ہونے کی شرط لگاتے ہیں کہ مارنے والے کا "قصد تادیب کا ہو اِتلافِ نفس کا نہ ہو" جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر قصد اتلافِ نفس کا ہو تو ان کے نزدیک بھی قتل بالمثقل سے قتلِ عمد ہوگا، عبارت یہ ہے: "يشترط عند أبي حنيفةؒ أي في شبه العمد ان يقصد التأديب دون اتلاف" (الدر المختار ج:۵ ص:۳۵۱ فصل فيما يوجب القود وما لا يوجبه بولاق مصر)۔[1]

اعلاء السنن جز:۱۸ میں بھی قتل بالمثقل بشرط القصد سے قصاص واجب ہونے کا ذکر موجود ہے۔[2]

اس پس منظر کے پیشِ نظر گزارش یہ ہے کہ کیا اس دور میں صاحبینؒ کے قول پر فتویٰ دینے کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اگر جواب اِثبات میں ہو تو اِمام صاحبؒ کے مستدل کا جواب کیا ہوگا؟ ان کی ایک دلیل یہ حدیث ہے: "قتيل السوط والعصا شبه العمد" نیز "الا اِنّ قتيل خطاء العمد بالسوط والعصا والحجر فيه الدية مغلظة مأة من الابل منها أربعون خلقة في بطونها اولادها" (بحوالہ احکام القرآن للجصاص ج:۲ ص:۲۲۹، ۲۳۰، باب شبه العمد، مطبوعہ بیروت)۔ ان روایات میں آلۂ غیر سے قتل کو شبہِ عمد میں شمار کیا گیا ہے۔

۲:- دُوسرا سوال یہ ہے کہ کیا قاضی دیتِ قتل کی مہلت نہ دے تو کیا اس کی کوئی گنجائش پیدا ہوسکتی ہے یا نہیں؟ شبہ یہ ہے کہ ایک تو ایک شخص کا قریبی قتل ہوا، یہ الگ اس کو صدمہ ہوگا، پھر تین سال

---

(۱) رد المحتار ج:۶ ص:۵۳۰ (طبع سعید).
(۲) اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۸۷ (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامية).
وفي كنز العمال: لا عمد الا بالسّيف ج:۱۵ ص:۱۱ كتاب القصاص حديث:۳۹۸۴۲.
وفي اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۸۱ (طبع ادارة القرآن) ليس معناه ان آلة القود ليس الا السيف كما توهمه الطحاوي.

تک وہ دیت کا انتظار کرے گا، اس سے اس کی تسلی نہ ہوگی۔ راقم کو باوجود تلاش کے مہلت ختم کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔

المستفتی

بندہ بشیر احمد

قاضی عدالت باغ، آزاد کشمیر

جواب ۱:- موجودہ حالات میں قتلِ شبہ العمد کی وہ تعریف اختیار کی جائے جو صاحبینؒ نے اختیار فرمائی ہے، تو وہ مناسب اور مستساغ ہے،[1] آپ نے اس کے جو دلائل ذکر فرمائے ہیں وہ کافی ہیں، اور شاید اس سے قبل میں نے انہی دلائل کی بناء پر آپ سے اپنی رائے ظاہر کردی تھی۔

۲:- صلح عن دم العمد یا دیتِ عمد جو خود قاتل پر ہوتی ہے، اس میں تو تین سال کی مہلت ضروری نہیں، بلکہ باہمی اتفاق سے جو مدّت بھی مقرّر ہوجائے وہ دُرست ہے، صرّح بہ فی البدائع،[2] بلکہ شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک مہلت دینا جائز نہیں، لیکن شبہ العمد اور خطاء کی دیت چونکہ عاقلہ ادا کرتی ہے، اس لئے اس میں مہلت دینا عین موافقِ حکمت ہے اور اس کے خلاف فقہاء کا کوئی قول نظر سے نہیں گزرا، اور شبہ العمد میں صاحبینؒ کا قول اختیار کرنے کے بعد اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷/۱۰/۳۰ د)

قتلِ شبہ عمد میں اِمام ابوحنیفہؒ کا مسلک اور اُن کے دلائل کی تحقیق اور موجودہ دور میں شبہ عمد میں صاحبینؒ کی تعریف اختیار کرنے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین درج ذیل مسئلے میں:-

۱:- احناف کے نزدیک قتل بالمثقل موجبِ قصاص نہیں ہے، بشرطیکہ دھاری دار نہ ہو، دلیل میں حدیث "لا قود الا بالسیف" پیش فرماتے ہیں۔

۲:- پھر استیفاء قصاص میں بھی اسی حدیث کو اپنا مستدل بنا کر فرماتے ہیں کہ قصاص مثل فصل دم میں ہوگا بلکہ بہر حالت میں سیف سے ہوگا۔

حدیثِ بالا کا محمل موجب قصاص ہے (یعنی قصاص کن حالات کن آلات کی ضرب سے واجب ہوتا ہے) یا استیفاء قصاص ہے؟

---

(۱) تفصیل کے لئے اگلا فتویٰ اور اس کے حوالے ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) دیکھئے: بدائع الصنائع ج:۷ ص:۲۴۷ (طبع سعید)۔

جواب ا:- تمام ائمہ احناف نہیں بلکہ صرف امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قتل بالمثقل موجبِ قصاص نہیں ہوتا، صاحبینؒ اس سے اختلاف فرماتے ہیں، اور امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں بھی علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ صرف اس صورت میں قتل بالمثقل کو غیر موجبِ قصاص کہتے ہیں جبکہ قاتل کا مقصد قتل کرنا نہ ہو، وہ لکھتے ہیں:-

بل مذهبه ان القتل بالمثقل غير موجب للقود إذا لم يكن القتل مقصودًا للقاتل كما نص عليه في المجتبىٰ ونقل عن العيني في البناية. (اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۷۵)۔[۱]

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل میں عموماً حدیث: "لا قود الا بالسيف" پیش کرتے ہیں، لیکن ان کے پاس اس بارے میں متعدد صریح دلائل بھی ہیں، مثلاً:-

ا:- مسندِ احمد میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: "ولا عمد الا بالسيف" (كنز العمال ج:۷ ص:۲۸۴ حديث:۳۱۳۲ كتاب القصاص)۔[۲]

۲:- طبرانی اور بیہقی میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ہی سے مرفوعاً مروی ہے: "كل شيء خطاء الا الحديد والسيف" اورعبدالرزاق کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "كل شيء سوى الحديد خطاء وللكل خطا أرش." (حوالہ بالا)۔[۳]

لہٰذا امام ابوحنیفہؒ کے اس ارشاد کی تائید میں مرفوعاتِ صریحہ موجود ہیں، البتہ زمانۂ حاضر میں جبکہ قتلِ نفس ایک کھیل بن کر رہ گیا ہے، اور قتل کی وارداتیں بے حد بڑھ گئی ہیں، اور قتل کے نت نئے طریقے ایجاد ہوگئے ہیں، احقر کا طبعی رُجحان یہ ہے کہ ملکی قانون بناتے وقت امام شافعیؒ یا کم از کم صاحبینؒ کا قول اختیار کیا جائے تو بہتر ہے، احقر نے اس کا تذکرہ کراچی کے بعض اہلِ فتویٰ علماء سے کیا تو انہوں نے اس سے اتفاق فرمایا، اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ زہر سے ہلاک کرنے کی صورت میں علامہ حمویؒ وغیرہ نے قصاص واجب ہونے پر فتویٰ دیا ہے، اور علامہ رافعیؒ نے علامہ سمرقندیؒ سے نقل کیا ہے کہ العمل علىٰ هٰذه الرواية في زماننا لأنه شاع في الأرض بالفساد فيقتل دفعا لشره (التحرير المختار ج:۲ ص:۳۲۳)۔ تاہم دُوسرے اہلِ فتویٰ علماء سے بھی استصواب مناسب ہے۔[۴]

---

(۱) اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۸۷ (طبع ادارة القرآن).

(۲و ۳) كنز العمال ج:۱۵ ص:۱۱ كتاب القصاص حديث:۳۹۸۴۲.

(۴) اب چونکہ پاکستان میں قصاص کا قانون جمہور کے مسلک کے مطابق بنایا گیا ہے، اس لئے اس پر عمل متعین ہے، لأن حكم الحاكم رافع للخلاف۔ (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ)

۲:- "لا قـود الّا بـالسّیف" کے جملے میں دونوں معنی کا احتمال ہے، یہ بھی کہ قصاص اس صورت کے سوا واجب نہیں ہوتا جبکہ تلوار سے قتل کیا گیا ہو، اور یہ بھی کہ قصاص کا استیفا سوائے تلوار کے کسی اور چیز سے نہ ہونا چاہئے، اعلاء السنن میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، وہ لکھتے ہیں: "لیس معناه أن آلة القود لیس الّا السّیف کما توهمه الطحاوی" (اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۷۰)۔[1]

لیکن علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ: "فالظاهر انهما حدیثان احدهما فی ایجاب القود انه لا یجب الا بالسیف والثانی فی استیفائه به لا لتوفی الا بالسیف والمراد به اسلام." (ایضاً ج:۱۸ ص:۷۹)۔[2]

بہرحال! حدیث میں دونوں معنوں کا احتمال ہے، اور اس کے معنی متبادر یہی ہیں کہ استیفاءِ قصاص صرف تلوار سے ہونا چاہئے، اور قتل بالمثقل کے موجبِ قصاص نہ ہونے پر اس حدیث سے استدلال صریح نہیں ہے اور دُوسری احادیث کی موجودگی میں اس حدیث سے استدلال کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ هذا ما عندی واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۴/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۴۳۵/۲۹ الف)

قتلِ خطأ میں قاتل پر گناہ ہے یا نہیں؟
(مختلف عبارات کی تحقیق)

سوال:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد از سلام مسنون عرض ہے کہ بندہ لاہور کے ایک دارالافتاء میں بطور معاون دارالافتاء کام کرتا ہے، ہمارے دارالافتاء میں قتلِ خطأ سے متعلق ایک مرتبہ ایک سوال آیا جس کے جواب میں من جملہ قتلِ خطأ کے دیگر اَحکام کے یہ حکم بھی لکھا گیا کہ قاتل اس قتل کی وجہ سے گناہگار بھی ہوا ہے، لہٰذا توبہ واستغفار کرے، اگرچہ یہ گناہ قتلِ عمد کے گناہ جیسا نہیں جیسا کہ کتبِ فقہ میں یہ مسئلہ واضح طور سے موجود ہے۔

اس موقع پر بندے کے خیال میں حدیث: "ان اللہ تجاوز عن امتی الخطأ الخ" کی وجہ سے اشکال پیدا ہوا، وجہ اِشکال یہ تھی کہ حدیث میں خطا کے مرفوع ہونے سے مراد حکمِ اُخروی کا مرفوع ہونا ہے، جو کہ عقاب ہے۔

جب حدیث کی رُو سے خاطی سے حکمِ اُخروی یعنی عقاب مرفوع ہے تو قتلِ خطأ کی صورت میں

---

(۱) اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۸۱ (طبع ادارة القرآن)۔
(۲) اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۹۲ (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامیة)۔

قاتل پر گناہ کیوں؟ اور اس سے حکمِ اُخروی مرفوع کیوں نہیں؟

اس اِشکال کا جواب تلاش کرنے کے لئے بندے نے اپنی سی بساط کے مطابق کتبِ فقہ وفتاویٰ اور کتبِ تفسیر وشروحِ حدیث کو دیکھا لیکن جو توجیہات ان حضرات نے قتلِ خطأ میں قاتل کو گناہگار قرار دینے کی اِختیار فرمائی ہیں، ان میں سے کسی توجیہ سے تسلی نہیں ہوئی بلکہ بعض عبارات سے قاتل کے گناہگار ہونے کے خیال کو مزید تقویت پہنچی، چنانچہ اَحکام القرآن للجصاص میں ہے:

ليست هذه الكفارة مستحقة بالمأثم فيعتبر عظم الاثم فيها لأن المخطی غير آثم فاعتبار الاثم فيه ساقط.

مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے:

والمعنى أنه عفا عن الاثم المستوجب عليه بالنسبة الٰى مأثر الاثم وإلا فالمواخذة المالية كما في قتل النفس خطأً وإتلاف مال الغير ثابتة شرعًا ولذا قال علماءنا في أصول الفقه: الخطأ عذر صالح لسقوط حق الله اذا حصل من اجتهاد ولم يجعل عذرًا في حقوق العباد حتى وجب عليه ضمان العدوان. (ج:۱۰ ص:۲۶۳ طبع کوئٹہ)

حاشیہ مشکوٰۃ میں لمعات سے منقول ہے:

ولعل المراد بالتجاوز عدم الاثم فيها لا عدم المواخذة عليهما مطلقًا لأنه يثبت الدية والكفارة في قتل الخطأ ومع ذٰلك الاثم مرفوع في الكل وهو المراد بالتجاوز. (مشکوٰۃ ج:۲ ص:۵۸۴ طبع قدیمی کتب خانہ)

ہدایہ میں ہے:

والخطأ علٰى نوعين .... وموجب ذٰلك الكفارة والدية على العاقلة .... ولا اثم فيه. (ج:۴ ص:۵۲۱)

اگرچہ صاحبِ ہدایہ نے "لا اثم فيه" سے قتل کا گناہ مراد لیا ہے، باقی ترکِ عزیمت اور ترکِ مبالغہ فی التثبت کا گناہ مرفوع نہیں ہوگا۔

لیکن اِشکال تو یہی ہے کہ خطأ میں ترکِ عزیمت اور ترکِ مبالغہ فی التثبت تو ہوتا ہی ہے اس کے باوجود شارع نے اس سے گناہ کو رفع فرمایا ہے۔

نیز بعض حضرات نے کفارہ کی مشروعیت کو بھی گناہ کی دلیل بنایا ہے، لیکن اس کا جواب اَحکام القرآن للجصاص کی عبارت سے ہوجاتا ہے کہ یہ کفارہ گناہ کی وجہ سے نہیں۔

بندے کو فقہائے کرام پر کوئی اعتراض نہیں ہے، البتہ ان حضرات کی بات سمجھنے میں اپنے قصورِ فہم کا اعتراف ہے۔

اس لئے بندہ بڑوں کی بات کو بڑوں سے سمجھنے کی غرض سے تکلیف دہی پر انتہائی معذرت خواہی کے ساتھ آنجناب سے راہنمائی کا متمنی ہے۔ وللأرض من كاس الكرام نصيب۔

فقط والسلام
عرض کنندہ
محمد رفیق
معاون دارالافتاء والتحقیق
چوبرجی پارک لاہور

جواب:- قتلِ خطأ میں قاتل پر گناہ ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں فقہائے کرامؒ کی عبارتیں مختلف ہیں، بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس میں گناہ ہے، اگرچہ قتلِ عمد کے گناہ سے کم ہے، اور کفارہ اسی کے ازالے کے لئے مشروع ہوا ہے، چنانچہ درمختار میں فرمایا گیا ہے:

والاثم دون اثم القتل اذ الكفارة تؤذن بالاثم لترك العزيمة.

اس کے تحت علامہ شامیؒ نے فرمایا ہے کہ:

قوله لترك العزيمة، وهي هنا المبالغة في التثبت. قال في الكفاية: وهذا الإثم إثم القتل، لأن نفس ترك المبالغة في التثبت ليس بإثم، وانما يصير به آثما اذا اتصل به القتل، فتصير الكفارة لذنب القتل، و إن لم يكن فيه اثم قصد القتل اهـ تأمل. (رد المحتار ج:٦ ص:٥٣١)[١]

اور بعض فقہائے کرامؒ نے گناہ کی نفی کی ہے، جیسا کہ امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت آپ نے خود نقل کی ہے، اور امام طحاویؒ کی عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ان الكفارات قد تجب في الأشياء التي لا آثام فيها على من كانت منه، من ذلك قوله تعالى في كتابه: "ومن قتل مؤمنًا خطأً" الآية.

(مشكل الآثار ج:١ ص:٣٩٢)[٢]

اور بعض فقہاء نے گناہ کے ذکر سے سکوت فرمایا ہے۔

لیکن درحقیقت دونوں قسم کے اقوال میں یہ تطبیق بھی ممکن ہے کہ جنہوں نے گناہ کی نفی کی ہے،

(١) طبع سعيد
(٢) مشكل الآثار للطحاويؒ باب من اقتطع مال امرئ مسلم بيمين كاذبة. ج:١ ص:٤٥٠ رقم:٣٨٣.

اس سے مراد قتل کے گناہ کی نفی ہے، اور جنہوں نے اِثبات کیا ہے اس سے مراد عدمِ تثبت کے گناہ کا اثبات ہے، اور اختلاف کو حقیقی بھی مانا جائے تو یہ محض نظریاتی اختلاف ہے، جس کا کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلتا، اس لئے کہ:

۱- اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ کفارہ واجب ہے۔
۲- اس بات پر کسی کا اختلاف نہیں کہ کفارہ نہ دیا جائے تو گناہ ہوگا۔
۳- اس بات پر بھی سب کا اِتفاق ہے کہ کفارہ ادا کرنے کے بعد اس پر کوئی اُخروی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

ان تمام عملی نتائج پر متفق ہونے کے بعد تعبیر میں یہ اختلاف ہے کہ بعض حضرات نے فرمایا کہ گناہ تھا، مگر کفارے سے ختم ہوگیا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ گناہ ہی نہ تھا، اور کفارہ ایک اَمرِ تعبدی کے طور پر واجب ہوا۔

البتہ قرآنِ کریم کے الفاظ سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ تھا، مگر کفارہ سے معاف ہوگیا، اس لئے کہ قرآنِ کریم نے کفارہ کا ذِکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ''توبةً من الله'' (النساء:۹۲)۔

اس آیت کا ترجمہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرۂ نے اس طرح فرمایا ہے:

''(یہ آزاد کرنا، اور وہ نہ ہوسکے تو روزے رکھنا) بطریق توبہ کے (ہے) جو اللہ کی طرف سے مقرّر ہے۔''

اس آیتِ کریمہ میں صراحت ہے کہ کفارہ بطور توبہ کے مشروع ہوا ہے، اور ظاہر یہی ہے کہ توبہ کسی گناہ پر ہوتی ہے، اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ کفارہ سے توبہ ہوجائے گی، اس لئے الگ سے توبہ واستغفار کی ضرورت نہ رہی۔

اب صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ قتلِ خطأ پر گناہ کا ہونا حدیث ''رفع عن أمتی الخطأ والنسیان''[1] کے معارض معلوم ہوتا ہے، اس کے دو جواب ممکن ہیں:

ایک یہ کہ اس حدیث کا مقصود یہ ہے کہ اُس فعل کا اصل گناہ خطا کی صورت میں مرفوع ہے، چنانچہ قتل کی صورت میں اصل گناہ قتلِ عمد کا گناہ تھا جو خطا کی وجہ سے مرفوع ہوگیا، لیکن کسی اور جہت سے گناہ ہونا، اس کے معارض نہیں، مثلاً قلّتِ تثبت کا گناہ پھر بھی ہوسکتا ہے جو ایک جان کی ہلاکت کا سبب بنا۔

---

(۱) وفی جامع الأحادیث حرف الرّاء ۱۲۷۶۳ رفع عن أمتی الخطاء والنّسیان.
وکذا فی الجامع الکبیر للسیوطیؒ ۱۲۹۱۱ أخرجه الطبرانی ج:۲ ص:۹۷ رقم:۱۴۳۰.

دُوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ قتلِ خطا اس کلیہ سے بنصِ قرآن مستثنیٰ ہے، اور اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ کسی معصوم جان کا ہلاک ہوجانا انتہائی سخت معاملہ ہے۔ اور اس میں بلاقصد تسبّب بھی موجبِ گناہ ہے۔ اور ترکِ مبالغہ فی التحرز والتثبت دُوسرے معاملات میں چاہے موجبِ گناہ نہ ہو، لیکن اس سنگین معاملے میں موجبِ گناہ قرار دیا گیا ہے۔ البتہ عدمِ قصد کے عذر کی وجہ سے معافی کے لئے صرف کفارہ کو توبہ کے قائم مقام قرار دے دیا گیا ہے، الگ سے توبہ کی ضرورت نہیں قرار دی گئی۔

ھٰذا ما ظھر لی
واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی
۱۰؍شعبان ۱۴۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۸۶/۳۴)

﴿فصل فی التّعزیر﴾
(تعزیر اور سزا دینے کے مسائل کا بیان)

بہتان اور اِلزام تراشی پر تعزیری سزا کا اِختیار صرف عدالت کو ہے، عوام کو نہیں

سوال:- زید اور بکر ایک تنظیم کے ذیلی ادارے کے عہدے داران تھے، زید بکر کے ماتحت کام کرتا تھا، بکر نے زید کے خلاف کچھ باتیں کیں اور زید نے بکر پر الزامات لگائے، انتظامی کمیٹی نے بکر کے خلاف الزامات کا کوئی نوٹس نہ لیا اور فیصلہ کردیا کہ چونکہ زید اور بکر کے درمیان اختلافات کی وجہ سے اعتماد کی فضا باقی نہیں رہی، اس لئے ماتحت ملازم زید کو ادارے سے برطرف کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد زید اپنا چارج چھوڑ کر گھر چلا گیا۔ اس کے چند دن بعد بکر نے ایک پریس ریلیز جاری کر کے اخبارات میں شائع کروایا اور مختلف ذمہ داروں کو دیا، اور بھجوایا کہ میں نے انتظامی کمیٹی کے مشورے سے زید کو مالیات میں خورد بُرد کرنے، قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کرنے اور نظم کی پابندی نہ کرنے، غلط بیانی اور ڈائری میں فرضی اندراج کرنے کی بناء پر برطرف کردیا ہے۔ زید نے جب رسائل و اخبارات میں پڑھا تو اس نے ان بہتانات کے خلاف تنظیم کے مجاز سربراہ کے پاس تحریری شکایت اپیل کی، مجاز سربراہ نے اپنا نمائندہ انکوائری کے لئے مقرّر کیا، انکوائری اور تحقیقات کے دوران بکر زید پر لگائے گئے بہتانات ثابت نہ کرسکا، اور انکوائری آفیسر کے متنبہ کرنے اور کہنے کے باوجود بکر نے اس صریح ظلم پر زید سے معافی مانگنے سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ زید اگر چاہے تو عدالت میں میرے خلاف دعویٰ کردے، میں خود بھگت لوں گا۔ اور کہا کہ ''اس شخص سے تو معذرت نہیں کروں گا'' اس پر انکوائری آفیسر نے اپنی رپورٹ میں شدید دُکھ کا اظہار کیا ہے، اور مزید لکھا ہے کہ مجلسِ عاملہ کے فیصلے میں جو اِلزامات درج نہیں وہ بھی پریس ریلیز میں بلاوجہ اور بغیر کسی معقول ثبوت کے اپنے غصّے کی

وجہ سے اور اپنی توہین کا انتقام لینے کی غرض سے شامل کردیئے گئے۔ انہوں نے ایسی سنگین غلطی کی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ انکوائری آفیسر نے بدیں وجوہ بکر کے خلاف تادیبی کارروائی کی سفارش کی ہے۔ بکر نے پریس ریلیز میں مزید دروغ گوئی یہ کی کہ اس نے زید کو برطرف کیا ہے، مزید یہ کہ انتظامی کمیٹی کے مشورے سے برطرف کیا ہے۔

زید کا کہنا ہے کہ جب یہ ثابت ہوگیا ہے کہ بکر نے اس پر بہتانات (قذف) لگائے ہیں، نیز خلافِ واقعہ دروغ گوئی کر کے زید کو خود برطرف کرنے انتظامی کمیٹی کے مشورے سے برطرف کرنے اور اخبارات وغیرہ کے ذریعے مشتہر کر کے صریح ظلم کر کے اُسے چاردانگِ عالم میں رُسوا کیا ہے، جس سے اس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے، اور مزید یہ کہ بکر نے تنظیم کے سربراہ کے نمائندے کی عدم اطاعت کی ہے، تو ان جرائم کی وجہ سے جو کہ قابلِ تعزیر ہیں بکر مردود الشہادت اور ساقط الاعتبار اور منصب کے لئے نااہل ہوگیا ہے، اس لئے تادیب کے طور پر بکر کی بنیادی رُکنیتِ تنظیم ختم کی جانی چاہئے، اور ادارے کے عہدے سے برطرف کیا جانا چاہئے، اور تعزیر کے طور پر سزا دی جانی چاہئے۔

براہِ کرم شرعی نقطۂ نگاہ سے صراحت فرمائیں کہ زید کا یہ مطالبہ کہاں تک حق بجانب ہے؟

جواب:- اگر واقعاتِ مندرجہ دُرست ہیں اور زید اُن الزامات سے واقعۃً بَری ہے جو بکر نے اس پر لگائے ہیں، تو بکر نے بہتان طرازی کا ارتکاب کر کے سخت گناہ کا ارتکاب کیا ہے،[1] اگر وہ اپنے اس گناہ سے تائب نہ ہو اور زید سے معافی نہ مانگے،[2] تو کسی ایسے عہدے کا مستحق نہیں ہے جس

(۱ و ۲) وفی سنن أبی داؤد ج:۲ ص:۳۲۷ (طبع مکتبہ رحمانیہ) قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: کل المسلم علی المسلم حرامٌ ماله وعرضه ودمهُ حسب امرئ من الشر أن یحقر أخاه المسلم.

وفی سنن أبی داؤد کتاب الأدب باب من ردّ عن مسلم غیبة ج:۲ ص:۳۲۷ (طبع رحمانیه) عن سهل بن معاذ بن أنس الجهنی عن أبیه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: من حمیٰ مؤمنًا من منافق أراهُ قال بعث الله ملکًا یحمی لحمه یوم القیامة من نار جهنّم، ومن رمی مسلمًا بشیءٍ یرید شینه به حبسه الله علیٰ جسر جهنّم حتّی یخرج ممّا قال.

وکذا فی مسند أحمد حدیث معاذ بن أنس الجهنی رقم الحدیث: ۱۵۵۸۶ ج:۱۲ ص:۲۵۸ (طبع دار الحدیث القاهرة) ومشکوة المصابیح ج:۵ ص:۴۲۴ (طبع قدیمی) وفی مرقاة المفاتیح ج:۹ ص:۲۳۸ (طبع امدادیه ملتان) أی قذف مسلمًا ..... بشیءٍ أی من العیوب یرید به شینه أی عیبه حبسه الله أی وقفهُ علیٰ جسر جهنّم وهو صراط ممدود ..... حتّی یخرج ممّا قال أی من عهدته والمعنی حتّی ینقی من ذنبه ذٰلک بارضاء خصمه أو بشفاعة أو بتعذیبه بقدر ذنبه وکذا فی بذل المجهود ج:۵ ص:۲۵۵ (طبع معهد الخلیل کراچی).

وفی شرح الفقه الأکبر مسئلة فی التوبة وشرائطها ص:۱۵۹ و ۱۶۰ (طبع قدیمی) امّا اذا قال بهتانًا بأن لم یکن ذٰلک فیه فانه یحتاج الی التوبة ...... فلیس شیء من العصیان أعظم من البهتان .....الخ.

سے ماتحتوں کے حقوق وابستہ ہوں۔ ایک اسلامی عدالت اس بہتان طرازی پر اُسے تعزیری سزا بھی دے سکتی ہے، لیکن یہ تعزیری سزا عام لوگوں کو دینے کا اختیار نہیں ہے، صرف عدالت کے ذریعے دِلوائی جاسکتی ہے۔[1]

واللہ اعلم
(فتویٰ نمبر ۱۰۲۵/۳۹ د)

مجلسِ گناہ میں شرکت نہ کرنے کا وعدہ توڑنے پر شرعاً کوئی تعزیر مقرّر نہیں، نیز تعزیری سزائیں جاری کرنے کا اختیار صرف قاضیٔ شرعی کو ہے

سوال:- برادری نے ایک ماتم کے موقع پر فیصلہ کیا کہ آئندہ شادیوں میں ڈھول بجانے اور لاؤڈ اسپیکر میں گانوں پر پابندی کی جائے، اور جو نہ مانے اس کا بائیکاٹ کیا جائے، تمام برادری اس پر متفق ہوگئی، اس موقع پر اِمامِ مسجد نے بھی بطورِ دھمکی و تنبیہ کہا کہ جو یہ حرکت کرے گا اس کا نکاح نہیں پڑھایا جائے گا۔ کچھ دن بعد برادری میں ایک شادی ہوئی جس میں ڈھول کا بجانا اور لاؤڈ اسپیکر پر گانے شروع ہوگئے، اِمامِ مسجد نے لوگوں کو بتایا کہ وعدہ خلافی ہو رہی ہے، اِمام نے ذمے دار لوگوں کو بھیجا کہ ان کو عدہ خلافی سے منع کریں، لیکن اہلِ تقریب نہ رُکے، ڈھول بجاتے رہے، اس کے بعد جب موقع نکاح کا آیا تو یہاں سوشلسٹ آدمی جو اپنے نظریے میں سوشلزم کو دِین سمجھتا ہے، وہ اِمام کو کہتا ہے کہ نکاح مت پڑھاؤ کیونکہ تم نے کہا ہے کہ جو ایسا کرے گا اس کا نکاح نہیں پڑھایا جائے گا، اِمام نے کہا کہ میں نے یہ بطورِ دھمکی کہا ہے، حقیقت میں یہ کام مانعِ نکاح نہیں ہے، نکاح کے جواز کی شرائط اور ہیں، اِمام نے نکاح پڑھایا اور نکاح کے وقت ڈھول بند کردیا گیا۔ اب وہ اِشتراکی لیڈر یہ افواہ پھیلا رہا ہے کہ اِمام نے چونکہ وعدہ خلافی کی، اس وجہ سے اس کو تعزیر دی جائے۔ اِمامِ مسجد فرما رہا ہے کہ میں سرکاری نکاح رجسٹرار ہوں، مجبوری کی وجہ سے میں نے نکاح پڑھایا ہے، اس کے علاوہ اگر نکاح نہ پڑھاتا تو فساد کا خطرہ تھا، کیونکہ ساری برادری نکاح میں شرکت کرچکی تھی، اور اِمامِ محلّہ بھی ہے نہ پڑھانے کی صورت میں اِمامت سے نکالنے کا بھی خطرہ تھا، تو کیا اس صورت میں اِمام کے لئے تعزیرِ شرعی ہے؟

جواب:- پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اِمام نے لوگوں کے سامنے جو یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ کوئی نکاح

---

(۱) وفي الهندية كتاب الحدود ج:۲ ص:۱۴۳ (طبع رشيديه) وركنة اقامة الامام أو نائبه في الاقامة.
وفي بدائع الصنائع كتاب الحدود ج:۷ ص:۵۷ (طبع سعيد) ...... امّا الّذي يعم الحدود كلها فهو الامامة وهو أن يكون المقيم للحد هو الامام او من ولاه الامام وهٰذا عندنا.

نہیں پڑھائے گا جس کی تقریب میں ڈھول باجا، یا گانا بجانا ہو، تو اَب کسی ایسی مجلس نکاح میں جاکر نکاح پڑھانا اس کے لئے دو وجہ سے ناجائز تھا، ایک اس وجہ سے کہ جس مجلس میں یہ لہو ولعب ہو رہے ہوں اس میں جان بوجھ کر شرکت کرنا ناجائز ہے،(۱) دُوسرے اس وجہ سے کہ یہ وعدہ خلافی ہے، جہاں تک پہلی وجہ کا تعلق ہے وہ تو صورتِ مسئولہ میں محقق نہیں ہوئی کہ جس وقت امام صاحب نکاح پڑھانے گئے اس وقت ڈھول باجا موقوف کردیا گیا تھا۔ اب دُوسری وجہ رہ جاتی ہے، سو درحقیقت امام صاحب کا یہ وعدہ پوری برادری کے ساتھ ایک معاہدے کی حیثیت رکھتا تھا، جب پوری برادری نے یہ معاہدہ پہلے توڑ دیا تو اَب امام صاحب کے لئے بھی بحیثیتِ معاہدہ اس کی خلاف ورزی کی گنجائش تو نکل آئی، لیکن اگر امام صاحب کا اعلان برادری کے ساتھ معاہدے پر موقوف نہیں تھا، بلکہ انہوں نے ذاتی طور پر لوگوں کے سامنے یہ وعدہ کیا تھا تو انہیں اس وعدہ خلافی پر توبہ و استغفار کرنا چاہئے، اس قسم کے معاملات میں شریعت کی طرف سے کوئی تعزیر مقرّر نہیں ہے، اور نہ قاضیٔ شرعی کے سوا کسی اور کو تعزیر جاری کرنے کا اختیار ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۰/۱۱/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۱۲/۲۱ الف)

---

(۱) وفی مرقاة المفاتیح شرح المشکوة ج:۶ ص:۲۵۴ و ۲۵۵ (طبع امدادیه ملتان) عن سفینة انّ رجلًا ضاف علیّ بن ابی طالب رضی اللہ عنه فصنع لهٔ طعامًا فقالت فاطمة: لو دعونا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فاکل معنا، فدعوهٔ فجاء فوضع یدیه علیٰ عضادتی الباب فرأی القرام قد ضرب فی ناحیة البیت فرجع قالت فاطمة رضی اللہ عنها فتبعته فقلت: یا رسول اللہ! ما ردّک؟ قال: انه لیس لی - أو - لنبی أن یدخل بیتًا مزوقًا. رواه أحمد وابن ماجة. قال المُلّا علی القاری رحمه اللہ وفیه تصریح بانّه لا یُجاب دعوة فیها منکر وفیه انّه لو کان منکرًا لأنکر علیها ولکن نبه بالرّجوع الیٰ انّه ترک الاولیٰ فانّه من زینة الدنیا وهی موجبة لنقصان الأخریٰ.

وفی تبیین الحقائق کتاب الکراهیة فصل فی الأکل والشرب ج:۷ ص:۲۹ و ۳۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) وان کان هناک لعب وغنا قبل أن یحضرها فلا یحضرها لأنّه لا یلزمه اجابة الدّعوة اذا کان هناک منکر.

وفی الهندیة کتاب الکراهیة الباب الثانی عشر فی الهدایا والضیافات ج:۵ ص:۳۴۲ و ۳۴۳ (طبع رشیدیه).
ومن دعی الی ولیمة فوجد ثمة لعبًا أو غناء فلا بأس ان یقعد ویأکل فان قدر علی المنع یمنعهم وان لم یقدر یصبر وهذا اذا لم یکن مقتدیٰ به امّا اذا کان ولم یقدر علیٰ منعهم فانّه یخرج ولا یقعد ولو کان ذٰلک علی المائدة لا ینبغی أن یقعد وان لم یکن مقتدیٰ به وهذا کلّه بعد الحضور وامّا اذا علم قبل الحضور فلا یحضر .... الخ.

وفی الهدایة کتاب الکراهیة ج:۴ ص:۴۵۵ (طبع شرکت علمیه) هذا اذا لم یکن مقتدیٰ فان کان ولم یقدر علی منعهم یخرج ولا یقعد لأنّ فی ذٰلک شین الدین وفتح باب المعصیة علی المسلمین. (وفی طبع رحمانیه ص:۴۵۳ و ۴۵۴)

وفی الهدایة ج:۴ ص:۴۵۴ (طبع مکتبه رحمانیه) ومن دعی الیٰ ولیمة أو طعام فوجد ثمه لعبًا أو غناءً فلا بأس بأن یقعد ویأکل .... وهذا اذا لم یکن مقتدی فان کان ولم یقدر علی منعهم یخرج ولا یقعد لأنّ فی ذٰلک شین الدین وفتح باب المعصیة علی المسلمین والمحکی عن أبی حنیفة فی الکتاب کان قبل أن یصیر مقتدی ولو کان ذٰلک علی المائدة لا ینبغی ان یقعد وان لم یکن مقتدیٰ لقوله تعالیٰ: "فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ" وهذا کله بعد الحضور ولو علم قبل الحضور لا یحضر لأنّه لم یلزمه حق الدعوة.

وفی الفتاویٰ البزازیة علی الهندیة ج:۶ ص:۳۵۹ (طبع رشیدیه) استماع صوت الملاهی کالضرب بالقضیب ونحوه حرام قال علیه السلام استماع الملاهی معصیة والجلوس علیها فسق والتلذذ بها کفر أی بالنعمة.

لواطت کی شرعی سزا جاری کرنے کا اختیار حکومت کو ہے

سوال:- ایک صاحب کا ابتلاء باللواطت بمعہ تعیین مقام یہ صاحب امامِ مسجد تھے، آخر پکڑے گئے، اور نکال دیئے گئے، اور رُوپوش ہوکر کہیں دُور دراز مقام میں ملازمت کرلی۔ سائل اس امام صاحب کے تعاقب میں ہے، اور شرعی سزا معلوم کرکے اُس پر جاری کرنا چاہتا ہے ....الخ۔

جواب:- لواطت کا مرتکب فاسق ہے، اور جب تک وہ اس عمل سے صدقِ دل سے توبہ نہ کرے، اس کو امام بنانا جائز نہیں۔ البتہ شرعی سزائیں جاری کرنے کا حق صرف اسلامی حکومت کو ہوتا ہے،[1] اور موجودہ قوانین میں چونکہ شرعی حدود نافذ نہیں ہیں اس لئے اس عمل کی سزا معلوم کرنا بے کار ہے۔

نوٹ:- اس قسم کے سوالات میں کسی معین شخص کا نام و نشان اِستفتاء میں ذکر نہ کرنا چاہئے۔

واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۱۸/ ۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع
۱۳۸۷/۱/۲۷ھ

❊❊❊

(۱) وفی الهندیة کتاب الحدود ج:۲ ص:۱۴۳ (طبع رشیدیه) ورکنه اقامة الامام أو نائبه فی الاقامة.
وکذا فی بدائع الصنائع ج:۷ ص:۵۷ کتاب الحدود ومثله فی کتاب الفقه علی المذاهب الأربعة ج:۵ ص:۲۴۹ کتاب الحدود.

﴿فصل فی القسامة﴾

(قسامت یعنی کسی جگہ پائے جانے والے مقتول پر اہلِ محلّہ سے قسم لینے کا بیان)

کسی بستی کی طرف منسوب اُس کی مخصوص شارعِ عام میں پائی جانے والی لاش کی قسامت اُس بستی والوں پر ہوگی

سوال:- ایک لاش ایک بستی کے قریب اُس کی سڑک پر ملی، وہ سڑک ایسی ہے کہ اُسے اسی بستی کی طرف ہی مکمل طور پر منسوب کیا جاتا ہے۔ تو کیا اس سڑک پر اگر لاش ملے تو اس بستی والوں پر قسامت آئے گی یا نہیں؟ واضح رہے کہ اس سڑک سے اس بستی کا کچھ فاصلہ بھی ہے لیکن بہت زیادہ نہیں ہے، نیز یہ سڑک اسی بستی کے لئے تقریباً مخصوص ہے، پہلے ایک فتویٰ دیا گیا تھا جس میں لکھا گیا تھا کہ اس بستی والوں پر قسامت نہیں آئے گی، صحیح شرعی صورتِ حال سے برائے کرم آگاہ فرمائیں۔

جواب:- مخدوم گرامی قدر و مکرّم جناب مولانا تاج محمد صاحب مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں نہایت شرمندہ ہوں کہ آنجناب نے جو اِستفتاء دستی طور پر احقر کو دیا تھا، اس کے جواب میں بہت تأخیر ہوئی، اس سے آنجناب کو جو تکلیف پہنچی، اس پر معذرت کے لئے احقر کے پاس الفاظ نہیں، اُمید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔ اب آنجناب نے دوبارہ سوال و جواب متعلقہ عبارتوں کے ساتھ ارسال فرمائے تو مسئلے پر غور کرنے کا موقع ملا، دونوں سوال و جواب اور متعلقہ عبارتیں دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ دونوں فتووں میں اصل حکم کے اعتبار سے کوئی تعارض نہیں۔ یہ مسئلہ غیر مختلف فیہ ہے کہ اگر شارعِ عام پر ایسی جگہ لاش ملے جو کسی بستی سے اتنی قریب ہو کہ وہاں تک مقتول کی آواز پہنچ سکتی ہو تو اس بستی والوں پر قسامت ہوگی، لیکن اگر وہ جگہ بستی سے اتنی دُور ہے کہ مقتول کی آواز بستی تک نہیں پہنچ سکتی تو اس صورت میں بستی والوں پر قسامت نہیں، چنانچہ متعلقہ تمام مسائل کو نہایت جامع انداز میں علامہ رافعیؒ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:-

وظهر منه انه كما لا يناسب العمل بإطلاق المتون لا يناسب الإفتاء بوجوب القسامة والدّية على أهل ادنى الحال مطلقًا، والحاصل أن القتيل إن وجد في الشارع الأعظم ونحوه فان وقع عند الازدحام فلا قسامة، وديته علىٰ بيت المال، وإن وقع في موضع لو صيح فيه يسمعه أهل العمران فالقسامة والدّية على أدنى المحال، وفي موضع بعيد منتفع به بين المسلمين فهي علىٰ بيت المال، وإلا فهدر اهـ."

(تقريرات الرافعي ج:٦ ص:٣٣٩)(طبع جديد، ط سعيد)

لہٰذا اس عبارت میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ جس استفتاء کے جواب میں ابتداءً فتویٰ جاری ہوا، اس میں یہ صراحت تھی کہ جس جگہ مقتول پایا گیا وہ بستی سے ۵۰۰ میٹر دُور تھی، اور اس جگہ اور بستی کے درمیان کھیت اور کنویں بھی حائل تھے، لہٰذا جواب دینے والے صاحب نے سمجھا کہ ۵۰۰ میٹر یعنی نصف کلومیٹر کے فاصلے سے عام طور پر آواز نہیں پہنچتی، بالخصوص جبکہ درمیان میں کھیت اور کنویں بھی حائل ہوں، البتہ مناسب یہ تھا کہ وہ جواب میں یہ صراحت کردیتے کہ یہ جواب اس صورت میں ہے جب واقعۃً فاصلہ اتنا ہو کہ آواز نہ پہنچے۔

دراصل حکم کا مبنیٰ یہ ہے کہ شارعِ عام اگر بستی والوں کی طرف اس طرح منسوب کی جاسکتی ہو کہ اس کی حفاظت اور اس کی نگہداشت کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہو، تو شارعِ عام کے اس حصے پر پائے جانے والے مقتول کے سلسلے میں قسامت ان پر عائد ہوگی، اس بات کی علامت کے طور پر فقہائے کرام نے چیخ کی آواز پہنچنے کو ذکر فرمایا ہے۔

لہٰذا نفسِ مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، سارا مدار صورتِ مسئولہ کے صحیح صحیح تعین پر ہے، ظاہر ہے کہ آپ وہاں سے قریب ہیں، اور آپ تمام باتوں کو مدِنظر رکھ کر فیصلہ فرماسکتے ہیں، اگر وہ جگہ واقعۃً ایسی ہے کہ اسے آواز پہنچنے کی وجہ سے بستی سے منسوب کیا جاسکتا ہو تو بے شک قسامت ہوگی، ورنہ نہیں۔ یہ بات آپ خاص طور پر ملاحظہ فرمالیں کہ اگر واقعۃً فاصلہ ۵۰۰ میٹر کا ہے، اور بیچ میں کھیت وغیرہ حائل ہیں تو بظاہر آواز کا پہنچنا بعید معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ جو سوال سب سے پہلے آیا تھا، اس میں غیر واضح انداز میں یہ بھی تذکرہ تھا کہ دو گروہوں کے درمیان لڑائی ہوئی تھی، اور اس جگہ پر کوئی خون بھی نہیں پایا گیا، ان پہلوؤں پر بھی تحقیق اور غور کی ضرورت ہے۔ والسلام

(حضرت مولانا) محمد تقی عثمانی (مدظلہم)

بقلم: عبداللہ میمن

۲۳/۱۲/۱۴۱۴ھ

﴿کتاب الجنایات﴾
(جنایت کے مسائل کا بیان)

مالک کی اجازت کے بغیر اس کے باڑے میں کسی کا اپنا اُونٹ لے جانا اور اس جانور کا دُوسرے جانوروں کو ہلاک کرنے کا حکم

سوال:- زید کا ایک اُونٹ ہے، اور عمرو کا اُونٹوں کا ایک گلہ، ایک دن زید نے چاہا کہ وہ اپنا اُونٹ عمرو کے اُونٹوں کے گلے کے ساتھ کردے، لیکن عمرو نے یہ کہتے ہوئے کہ تمہارا (یعنی زید کا) اُونٹ بہت بدمعاش ہے اور خطرہ ہے کہ وہ میرے اُونٹوں کو ہلاک نہ کردے منع کردیا، مگر زید نے عمرو کے منع کرنے کے باوجود اپنا اُونٹ عمرو کے گلے میں چھوڑ دیا، دُوسری صبح عمرو کے اُونٹوں میں سے دو اُونٹ مُردہ پائے گئے اور زید کا اُونٹ ان کے ساتھ پایا گیا، (واضح رہے کہ زید کے اُونٹ کے ساتھ عمرو کا صرف ایک ہی اُونٹ برابر ہے باقی سب چھوٹے ہیں) مردہ اُونٹوں کے جسموں کے مختلف مقامات پر اُونٹ کے دانتوں کے نشاناتِ اور کف پایا گیا، اس کے علاوہ اُونٹوں کے رگیدنے کے نشانات بھی پائے گئے ہیں، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرو کے اُونٹوں کو زید کے اُونٹ نے ہلاک کیا ہے جو مندرجہ ذیل شک کو یقین میں بدلنے کے موجب ہیں۔

۱:- زید کا اُونٹ بدمعاشی اور نقصان رسانی میں مشہور ہے، اور علاقے کے لوگ اس سے خوف زدہ رہتے ہیں۔

۲:- بقول بکر (جس سے زید نے یہ اُونٹ خریدا تھا) اُس نے اپنا یہ اُونٹ اسی لئے بیچا تھا کہ اس کی عادات بد تھیں اور خطرہ تھا کہ کہیں کسی انسان کو ہلاک یا زخمی نہ کردے۔

۳:- اس وقوعہ سے چند دن قبل علاقے کے نمبردار نے ایک ایسی پنچائت میں جس میں زید بھی حاضر تھا اُونٹوں کی نگرانی کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے زید کا نام بطورِ خاص لیا اور صریح الفاظ میں اُس کو تنبیہ کی کہ وہ اپنے اُونٹ کی خطرناکی کے پیشِ نظر کسی بھی متوقع حادثے سے بچنے کے لئے اپنے اُونٹ کی نگرانی کرے۔

۴:- معزّزینِ قوم نے مردہ اُونٹوں کا موقع پر معائنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ زید کے اُونٹ نے ہلاک کیا ہے۔

الف:- شرع کی رُو سے زید پر عمرو کے اُونٹوں کا ضمان آئے گا یا نہیں؟ اگر آئے گا تو کس شرعی اُصول کی رُو سے؟

ب:- اُونٹ کی ہلاکت کے عینی شاہد نہیں ہیں، کیا زید کے اُونٹ کا بدمعاش مشہور ہونا ثبوت کے لئے کافی ہے یا کوئی اور ثبوت دینا ہوگا؟

ج:- کیا بکر کا بیان اور نمبر۳ میں نمبردار کی تنبیہ زید کے اُونٹ کا عمرو کے اُونٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے؟

جواب:- اگر سوال میں مندرجہ تمام واقعات دُرست ہیں، اور زید نے واقعۃً عمرو کی اجازت اور اِطلاع کے بغیر اپنے شریر اُونٹ کو عمرو کے اُونٹوں کے باڑے میں چھوڑا تھا تو صورتِ مسئولہ میں زید پر عمرو کے ہلاک شدہ اُونٹوں کا ضمان واجب ہے، بشرطیکہ سوال میں مندرج قرائن اس قدر واضح ہوں کہ بستی کے تجربہ کار لوگوں کو اس بات کا گمان غالب ہوجائے کہ عمرو کے اُونٹوں کو زید کے اُونٹ ہی نے ہلاک کیا ہے، اس مسئلے میں فقہائے کرامؒ کی متعلقہ تصریحات حسبِ ذیل ہیں:-

فتاویٰ بزازیہ میں ہے: ”فی دارہ أبعرۃ أدخل علیھا آخر بعیرًا مغتلما أو غیر مغتلم بإذن صاحبھا فقتل الداخل ذٰلک الابل لا یضمن، وإن بلا اذنہ یضمن.“ (بزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج:۶ ص:۴۰۳)[1]۔

---

(۱) ھامش الھندیۃ (الرابع فی الجنایۃ علیٰ غیر بنی آدم ...الخ) (طبع رشیدیہ کوئٹہ).

وفی ردّ المحتار، کتاب الجنایات، باب جنایۃ البھیمۃ والجنایۃ علیھا ج:۶ ص:۶۱۲ (قبیل باب جنایۃ المملوک والجنایۃ علیہ) (طبع سعید) اذا کان فی دارہ بعیر فأدخل علیہ آخر بعیرًا مغتلمًا أو لا فقتل بعیرہٗ ان بلا اذن صاحبھا یضمن کما فی البزازیۃ أقول ویظھر أرجحیۃ ھذا القول لموافقتہ لما مرّ أوّل الباب من أنّہ یضمن ما أحدثتہ الدّابۃ مطلقًا اذا أدخلھا فی ملک غیرہ بلا اذنہ لتعدیہ .....الخ.

وفی مجمع الضّمانات الفصل الخامس فی جنایۃ البھیمۃ ج:۴ ص:۴ وان أدخل بعیرًا مغتلمًا فی دار رجل وفی الدّار بعیر صاحب الدّار فوقع علیہ المغتلم اختلفوا فیہ قال بعضھم لا یضمن صاحب المغتلم وقال الفقیہ أبو اللّیث ان أدخلہ باذن صاحب الدّار لا یضمن وان أدخلہ بغیر اذنہ ضمن وعلیہ الفتویٰ لأنّ صاحب المغتلم وان کان مسببا فاذا أدخلہ باذنہ لم یکن متعدّیا وان أدخل بغیر اذنہ کان متعدّیا فیضمن کمن ألقیٰ حیّۃ علیٰ انسان فقتلہٗ کان ضامنًا.

وفی الھندیۃ، کتاب الجنایات، الباب الثانی عشر فی جنایۃ البھائم والجنایۃ علیھا ج:۶ ص:۵۲ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) رجل أدخل بعیرًا مغتلمًا فی دار رجل وفی الدّار بعیر صاحبھا فوقع علیہ المغتلم فقتلہ اختلف المشائخ رحمھم اللہ فیہ منھم من قال لا ضمان علیٰ صاحب المغتلم وقال بعضھم ان أدخل صاحب المغتلم بغیر اذن صاحب الدّار فعلیہ الضّمان وان کان أدخلہ بلا اذنہ فلا ضمان وبہ أخذ الفقیہ أبو اللّیث رحمہ اللہ تعالیٰ وعلیہ الفتویٰ کذا فی المحیط.

وفی الھندیۃ، کتاب الغصب، الباب الرّابع عشر فی المتفرّقات ج:۵ ص:۱۵۲ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) وان أدخل فی دار رجل بعیرًا مغتلمًا وفی الدّار بعیر صاحب الدّار فوقع علیہ المغتلم اختلفوا فیہ قال الفقیہ أبو اللّیث ان أدخلہ باذن صاحب الدّار لا یضمن وان أدخلہ بغیر اذنہ یضمن وعلیہ الفتویٰ .....الخ.

ربط حماره في سارية فجاء آخر بحماره وربطه، فعض أحدهما الآخر وهلك إن في موضع لهما ولاية الربط لا يضمن، وإلّا ضمن، بأن لم يكن ذلك الموضع طريقا ولا ملكا لأحد لا يضمن اذا كان في المكان سعة، وفي الطريق يضمن لأن الربط ثمه جناية. (حوالہ مذکورہ[1] و شامی ج:۴ ص:۳۹۲)[2]۔

اور ایسے مواقع پر ایسے قرائن کی بنیاد پر ضمان عائد کیا جاسکتا ہے جن کی موجودگی میں ظنِ غالب قائم ہوجائے، چنانچہ معین الحکام میں ہے:"علی الناظر أن يلحظ الأمارات والعلامات إذا تعارضت، فما ترجح منها قضى بجانب الترجيح وهو قوة التهمة، ولا خلاف في الحكم بها وقد جاء العمل بها في مسائل اتفق عليها الطوائف الأربع من الفقهاء." (معين الحكام ص:۲۰۳، باب:۵۱، في القضاء بما يظهر من قرائن الأحوال والامارات). هذا ما عندى

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۵۷۰/۲۸ ب)

---

(۱) البزازية على هامش الهندية، كتاب الجنايات (الرّابع في الجناية على غير بني آدم ....الخ) ج:۶ ص:۴۰۳ (طبع رشيديه كوئٹه).

(۲) وفي الشامية، باب جناية البهيمة والجناية عليها قبيل باب جناية المملوك والجناية عليه ج:۶ ص:۶۱۲ (طبع سعيد) ربط حماره في سارية فربط آخر حماره، فعض حمار الأوّل ان في موضع لهما ولاية الرّبط لا يضمن والّا ضمن ملخصًا والله تعالى أعلم.

﴿کتاب الصلح﴾
(صلح کے مسائل کا بیان)

کلیم کے ذریعے حاصل کی گئی جائیداد سے بدلِ صلح لے کر دستبردار ہونے والے کو دوبارہ مطالبے کا اختیار نہیں

سوال:- الف:- محمد اسماعیل ولد حاجی اللہ دیا، ساکن سرگودھا (داماد)

ب:- ملک دین محمد، ساکن کراچی (سسر)۔

ج:- اصل دُکان دار جس سے پگڑی پر ''الف'' نے عارضی طور پر دُکان خریدی۔

''الف'' نے ''ج'' سے تقریباً تین ہزار روپے میں پگڑی پر دُکان خریدی، (تحقیق معلوم نہیں) یہ صرف ''الف'' کی زبانی ہے، یہ سرکاری طور پر بیع نہیں ہوسکتی تھی لیکن ایک شرط پر کہ مہاجر کو متروکہ جائیداد کے بدلے پاکستان کی متروکہ جائیداد مل سکتی ہے، چونکہ ''الف'' کے پاس کوئی جائیداد نہیں تھی، بدیں وجہ ''الف'' نے ''ب'' کی متروکہ جائیداد کا کلیم حاصل کیا، جو کہ پانچ ہزار کا تھا۔ ''ب'' نے اس شرط پر کلیم دیا کہ آدھی دُکان ''الف'' کی ہوگی اور آدھی ''ب'' کی ہوگی، یہ سب زبانی اقرار ہوا جس کو ''الف'' نے بخوشی قبول کیا۔

لیکن سرکاری طور پر یہ دُکان بہ قیمت پانچ ہزار میں مل جانے پر ''الف'' نے بدعہدی کی، اور پانچ ہزار کے کلیم کا آدھا حصہ دینا چاہا، لیکن ''الف'' کے والد کے ڈانٹنے پر کلیم یعنی پانچ ہزار نقد ادا کردیا (بذریعہ اَقساط) چونکہ ''ب'' کی مالی حالت اچھی نہ تھی دُوسرے رشتہ داری کا معاملہ، تیسرے بوجہ مجبوری کلیم کی رقم وصول کرلی، اب جواب طلب امر یہ ہے کہ کیا ''ب'' کا آدھا حصہ برقرار ہے (بشرطیکہ پورے خرچ کا آدھا حصہ ادا کردے) یا کہ نہیں؟

کیا ''الف'' اَز رُوئے شرع بدعہدی کا گنہگار ہے یا کہ نہیں؟ اگر ہے تو کیا اپنے آپ کو اللہ کی پکڑ سے بچنے کے لئے آدھی دُکان دیدے، اس دُکان سے برسوں سے تین سو، چار سو، پانچ سو ماہوار

کرایہ کھا رہا ہے، اب مرتے وقت مسجد کے نام اللہ کے نام پر دُکان دے رہا ہے، کیا یہ جائز ہے؟

جواب: - کلیم کے ذریعے حکومت جو جائیداد کسی کو دیتی ہے وہ حکومت کی طرف سے اُس کو عطیۂ ابتدائی ہوتا ہے، اور اُس کا مستحق وہی شخص ہوتا ہے جس کے کلیم پر وہ جائیداد عطا کی گئی، لہٰذا کلیم میں حاصل ہونے والی اس دُکان کا اصل مستحق ''ب'' تھا، لیکن اس نے ''الف'' کو آدھی دُکان دینے کا جو معاہدہ کرلیا، یہ درحقیقت کلیم حاصل کرنے کی اُجرت تھی (جو جعالہ یا سمسرہ کے اُصول پر دُرست ہوسکتی ہے)، لہٰذا ''الف'' پر واجب تھا کہ وہ دُکان کا آدھا حصہ خود رکھے، اور آدھا حصہ ''ب'' کو دے، اُس نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کرکے بدعہدی کا گناہ کیا، لیکن جب اس نے پانچ ہزار روپے کی رقم ''ب'' کو دے دی اور ''ب'' نے وہ رقم بغیر کسی اعتراض کے رکھ لی اور اس وقت دُکان کے نصف حصے کا مطالبہ نہیں کیا، تو فقہی اعتبار سے وہ بدلِ صلح لے کر دُکان سے دستبردار ہوگیا،[1] اب پوری دُکان ''الف'' کی ہوگئی،[2] ''الف'' کو چاہئے کہ اس نے شروع میں جو بدعہدی کی تھی اُس پر توبہ و استغفار کرے، اور ''ب'' سے بھی اس پر معافی مانگے، لیکن بدلِ صلح وصول کرنے کے بعد ''ب'' اس دُکان سے دستبردار ہوچکا ہے، لہٰذا اب دُکان ''الف'' ہی کی ہے،[3] اب اس پر اس کا نصف حصہ ''ب'' کو دینا واجب نہیں۔[4]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۵۰/۲۷ و)

(۱ تا ۴) وفی الدّر المختار، کتاب الصُلح ج:۵ ص:۶۲۹ (طبع سعید) وحکمه وقوع البرأة عن الدّعوی ووقوع الملک فی مصالح علیه وعنه لو مقرًا او هو صحیح مع اقرار او سکوت او انکار فالأوّل حکمه کبیع ان وقع عن مال بمال وحینئذٍ فتجری فیه أحکام البیع. وفی الشامیة تحته (قوله کبیع) أی فتجری فیه أحکام البیع فینظر ان وقع علیٰ خلاف جنس المدعی فهو بیع وشراء کما ذکر هنا وان وقع علیٰ جنسه فان کان بأقل من المدعی فهو حط وابراء .... اعتبر بیعًا ان کان علیٰ خلاف الجنس ...... الخ.

﴿کتاب الوکالۃ﴾
(وکالت کے مسائل کا بیان)

عقدِ وکالت میں مضاربت کے طور پر اُدھار چیز فروخت کرنے اور وکیل سے فوری ثمن کی ادائیگی کا مطالبہ کرنے کا حکم

سوال:- فضيلة القاضي محمد تقي العثماني المحترم

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

تنوي شركة تيباستي لتجارة السيّارات شراء سيّارات من شركة تويوتا اليابانية بطريقة الدفع المؤجل بعد ۱۸۰ يومًا من تاريخ استلام البضاعة وترغب المضاربة الاسلامية الدخول في هٰذه الصفقة حسب الخطوات التالية:-

۱- تقوم شركة تويوتا بتعيين المضاربة الإسلامية وكيلة لها فيما يتعلق بتداول ومعالجة جميع وثائق إتمام العملية بما في ذٰلك سندات الدفع والضمانات والأمور الأخرىٰ المتعلقة بها.

۲- تقوم المضاربة الاسلامية بإبلاغ شركة تيباستي بأمر تعيين المضاربة وكيلة لتويوتا لهٰذه العملية وتحصل علىٰ قبولها بذٰلك.

۳- تقوم المضاربة بدفع قيمة السيّارات إلىٰ شركة تويوتا فور تسلم شركة تيباستي لهٰذه السيّارات وذٰلك بعد خصم نسبة مئوية من هٰذه القيمة كعمولة للمضاربة بصفتها وكيلة للشركة البائعة.

۴- تقوم المضاربة بتحصيل كامل قيمة السيّارات لحسابها من شركة تيباستي بعد ۱۸۰ يومًا من تاريخ استلامهم لهٰذه السيّارات.

أرجو من فضيلتكم التكرم بابداء رأيكم بصحة هٰذه العملية من الوجهة الشرعية ليسنى اعتمادها أو تعديلها بما هو مناسب وذٰلك قبل الشروع بها.

زياد علي صبري

مدير برج المؤسسة العربية المصرفية المنطقية المنامة دولة البحرين

جواب:-

الیٰ سیادة الأخ زیاد علی صبری

مدیر المضاربة الاسلامیة فی المؤسسة العربیة

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

استلمت رسالتکم الّتی سئلتم فیها عن شرعیة عقد الوکالة مع شرکة تویوتا ونظرت فی شرط هذا العقد، فتبین لی أن هذا العقد یمکن بطریقتین، أحدهما جائز، والآخر غیر جائز.

الأوّل أن تلتزم المضاربة الاسلامیة فی عقد الوکالة مع شرکة تویوتا (وهی البائعة) أنها ستقوم بدفع الثمن إلیها من قبل شرکة تیباستی (وهی المشتریة) فور استلامها للسیّارات. وباستلام الثمن منها عند حلول أجل ۱۸۰ یومًا فهذا الشرط فی عقد الوکالة شرط فاسد لا یجوز شرعًا، وذلک لأن مقتضی هذا الشرط من قبل الموکل أنه توکیل ببیع السیّارات بثمن مؤجل علی أن یدفع الوکیل الثمن إلی المؤکل حالًا. وهذا مناقض لعقد الوکالة.[1]

والطریق الثانی: أن لا یشترط ذلک فی عقد الوکالة مع شرکة تویوتا بل توکل شرکة تویوتا المضاربة الاسلامیة ببیع السیارات بیعًا حالًا وتعقد المضاربة الاسلامیة البیع الحال مع شرکة تیباستی، کوکیل عن شرکة تویوتا، ثم تستقرض شرکة تیباستی مبلغ الثمن من المضاربة الاسلامیة بعقد منفصل من عقد البیع، وحینئذٍ تدفع المضاربة الاسلامیة ثمن السیّارات إلیٰ شرکة تویوتا بعد خصم أجرة الوکالة منه ثم تدفع شرکة تیباستی المبلغ المستقرض من المضاربة بکامله.

وهذا الطریق جائز شرعًا ما دام کلّ من عقد الوکالة وعقد البیع وعقد الاستقراض منفصلًا عن الآخر.[2]

والله سبحانه وتعالیٰ أعلم

۱۴۰۸/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۲۴۹۳ ج)

❊❊❊

---

(۱) فی الدر ج:۵ ص:۵۲۲ (طبع سعید) وصح بالنسیئة ان التوکیل بالبیع للتجارة وان کان للحاجة لا یجوز ..... لکنه لا یطالب الا بعد الأجل کما فی تنویر الأبصار.

(۲) فی مسند أحمد بن حنبلؒ رقم:۳۷۸۳ ج:۴ ص:۳۰ (طبع دار الحدیث القاهرة) نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن صفقتین فی صفقة واحدة. نیز دیکھئے ص:۸۷ کا حاشیہ نمبر ۱ و ص:۵۷ کا حاشیہ نمبر ۱و۲۔

﴿کتاب القسمۃ﴾
(تقسیم کے مسائل کا بیان)

چار بھائیوں کے درمیان زمین کی تقسیم پر تنازعے کا حل

سوال:- حاجی علی محمد صاحب ۱۹۴۸ء میں فوت ہوئے، ان کے چار بیٹے محمد علی، محمد شریف، محمد عارف اور انور علی تھے، ۱۹۲ ایکڑ رقبہ بذریعہ ثالثان چار حصوں میں برابر تقسیم کر کے قرعہ اندازی سے خانگی تقسیم کی گئی، محکمہ مال میں مشترکہ کھاتہ رہا، محمد علی اپنے قرعے کے مطابق اپنے حصے کا رقبہ لے کر جدا ہوگیا، باقی تین بھائی دو سال اکٹھے رہنے کے بعد ان میں سے ایک بھائی محمد عارف بھی قرعہ والا رقبہ لے کر جدا ہوگیا، رقبے میں کوئی فرق تاحال نہ آیا تھا، اس کے بعد پتہ چلا کہ محمد شریف کے حصے والے رقبے میں ۱۱۵ یکڑ کا پانی نہیں ہے جو کہ بارانی قسم کا ہے، باقی تین بھائیوں کے حصے میں تمام نہری قسم کا رقبہ ہے، محمد شریف نے پنچایت کی کہ بارانی قسم والا رقبہ حصہ رسدی تقسیم ہونا چاہئے جو کہ لاعلمی کی وجہ سے اکیلے محمد شریف کے حصے میں ان کی قدر رقبہ یعنی بارانی قسم کا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ تین بھائیوں کے حصے میں پندرہ پندرہ ایکڑوں میں کہیں کہیں کلر والا رقبہ تھا، محمد شریف کے حصے میں (پندرہ ایکڑ میں) بھی کہیں کہیں ٹیلہ تھا، پنچایت نے فیصلہ کیا کہ دوبارہ تقسیم کرلی جائے، لیکن دو بھائی محمد علی اور محمد عارف نے کہا کہ اب ہم دوبارہ تقسیم نہیں کرتے، اور نہ ہی خرچہ ان کی مد کا ادا کرتے ہیں، لہٰذا محمد شریف اور انور علی دو بھائی اکٹھے رہ رہے تھے اور ان کے قبضے کے رقبات بھی اکٹھے تھے، ان دونوں نے مل کر محکمہ انہار میں دعویٰ کردیا، دونوں بھائیوں نے اپنے خرچے سے ان ٹیلوں کو آباد کیا، محکمہ انہار میں ۱۵ سال دعویٰ دائر رہا، فیصلہ ہوا کہ بارانی قسم کی بری قسم میں منظور کیا جاتا ہے۔ دونوں بھائی اتفاق و محبت سے کئی سال تک اکٹھے رہے اب جھگڑا پڑ گیا ہے، محمد شریف کہتا ہے کہ میں وہی رقبہ جو کہ آج سے پچیس سال پہلے میرا حصہ تھا وہی لے کر جدا ہوں گا، انور علی کہتا ہے کہ ہم دونوں بھائیوں والا حصہ ازسرِنو تقسیم ہو، کیونکہ رقبے میں کافی فرق آچکا ہے، محمد شریف کے سوا تمام ۱۲۳ ایکڑ اراضی اچھی حالت میں ہیں، انور علی کے پندرہ ایکڑ کلر ہوچکے ہیں، شرعاً کیا فیصلہ ہے کہ چاروں بھائی ازسرِنو تقسیم کریں یا صرف ہم شریف اور انور علی کی زمین ہی ازسرِنو تقسیم ہو، یا بالکل نہ ہو؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں محمد شریف اور انور علی کو صرف اپنے اپنے حصوں کی تقسیم ازسرِنو کرنی چاہئے، دراصل جب چاروں بھائیوں کے درمیان زمین تقسیم ہوئی اُس وقت یہ غلطی رہ گئی کہ

لاعلمی کی وجہ سے ایک حصے میں پندرہ ایکڑ رقبہ بارانی آ گیا، جبکہ باقی تمام حصوں میں رقبہ نہری تھا، اُس وقت محمد شریف نے تقسیم پر جو اِعتراض کیا وہ دُرست تھا، اور چاروں بھائیوں کو چاہئے تھا کہ تقسیم ازسرِنو کرتے (كما يفهم من العبارة الأولىٰ)۔ لیکن جب دُوسرے بھائیوں نے ازسرِنو تقسیم کرنے سے انکار کیا تو محمد شریف زمین کو نہری قرار دینے کی درخواست دے کر اور انور علی کے ساتھ شرکت کر کے عملاً دوبارہ تقسیم کے حق سے دستبردار ہوگیا، اب انور علی کے ساتھ شرکت قائم کرنے سے ان دونوں کے درمیان جو تقسیم ہوئی تھی وہ فسخ ہوگئی، اور محمد شریف اور انور علی کے حصوں کی زمین ان دونوں کے درمیان پھر سے مشترک ہوگئی، (كما يفهم من العبارة الثانية)۔ اب جبکہ یہ دونوں الگ ہونا چاہتے ہیں انہیں ازسرِنو تقسیم کر کے الگ ہونا چاہئے، اس سلسلے میں عباراتِ فقہیہ درج ذیل ہیں:-

العبارة الأُولىٰ:- "اذا اقتسما دارًا فلما وقعت الحدود بينهما اذا أحدهما لا طريق له فإن كان يقدر علىٰ أن يفتح لنصيبه في حيزه طريقًا آخر فالقسمة جائزة وإن كان لا يقدر على أن يفتح لنصيبه طريقًا إن علم وقت القسمة أن لا طريق له فالقسمة جائزةٌ وان لم يعلم فالقسمة فاسدة." (عالمگیریة ج:۵ ص:۲۱۱، كتاب القسمة، باب:۳)[1]۔

العبارة الثانية:- "القسمة تقبل النقض، فلو اقتسموا وأخذوا حصتهم ثم تراضوا على الاشتراك بينهم صح) وعادت الشركة في عقار أو غيره لأن قسمة التراضي مبادلة ويصح فسخها ومبادلتها بالتراضي" (درمختار مع شامی ج:۵ ص:۱۷۰، كتاب القسمة)[2]۔

هذا ما ظهر لي

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۲۳/۲۷ و)

---

(۱) وفي الهداية ج:۴ ص:۴۱۷، كتاب القسمة (طبع شركت علميه).

وفي البحر الرائق، كتاب القسمة (طلب بعض الشركاء القسمة) ج:۸ ص:۱۵۳ (طبع سعيد) ولو اقسموا دارًا فاذا لا طريق لأحدهم وقدر على أن يفتح في نصيبه طريقًا يمرّ فيه الرّجل دون الحمولة جازت القسمة لأنّها لم تتضمن تفويت منفعة وان لم يقدر ينظر ان لم يعلم أنّه لا طريق لهٗ فالقسمة فاسدة وان علم انه لا طريق له جازت القسمة لأنّه رضي بهذه القسمة.

وفي المحيط البرهاني، كتاب القسمة، فصل في بيان ما يقسم وما لا يقسم ...الخ ج:۱۱ ص:۱۵۰ (طبع ادارة القرآن) واذا اقتسم الرّجلان دارًا فلمّا وقعت الحدود بينهما فاذا أحدهما لا طريق لهٗ فان كان يقدر علىٰ أن يفتح في حيّزه طريقًا في القسم جائز وان كان لا يقدر أن يفتح لنصيبه طريقًا فان لم يعلم وقت القسم أن لا طريق لهٗ فالقسمة فاسدة لأنها تضمنت تفويت منفعة على بعض الشركاء بغير رضاهٗ وان علم وقت القسمة أن لا طريق لهٗ فالقسمة جائزة ....الخ.

(۲) الدّر المختار ج:۶ ص ۲۶۸ (طبع سعيد)

وفي بدائع الصنائع، كتاب القسمة، فصل وامّا صفات القسمة ....الخ ج:۷ ص:۲۸ (طبع سعيد)

وأمّا في قسمة التراضي فيجوز الرّجوع لأنّ قسمة التّراضي لا تتمّ الّا بعد خروج السهام كلّها وكل عاقد بسبيل من الرّجوع عن العقد قبل تمامه كما في البيع نحوه.

وفيه أيضا ج:۷ ص:۲۲ (طبع سعيد) ان قسمة الجمع في الدّور بالتّراضي جائزة بلا خلاف ومعنى المبادلة وان كان لازمًا في نوعي القسمة لكن هذا النوع بالمبادلات أشبه واذا تحققت المبادلة صح البناء ....الخ.

تبصرے

متعدد کتابوں پر تحریر کئے گئے تبصروں کا مجموعہ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

ترتیب

مولانا محمد حنیف خالد

استاذ جامعہ دار العلوم کراچی

مکتبہ معارف القرآن کراچی